سفرنامہ

غیر ملکی اسفار

(حصہ دوم)

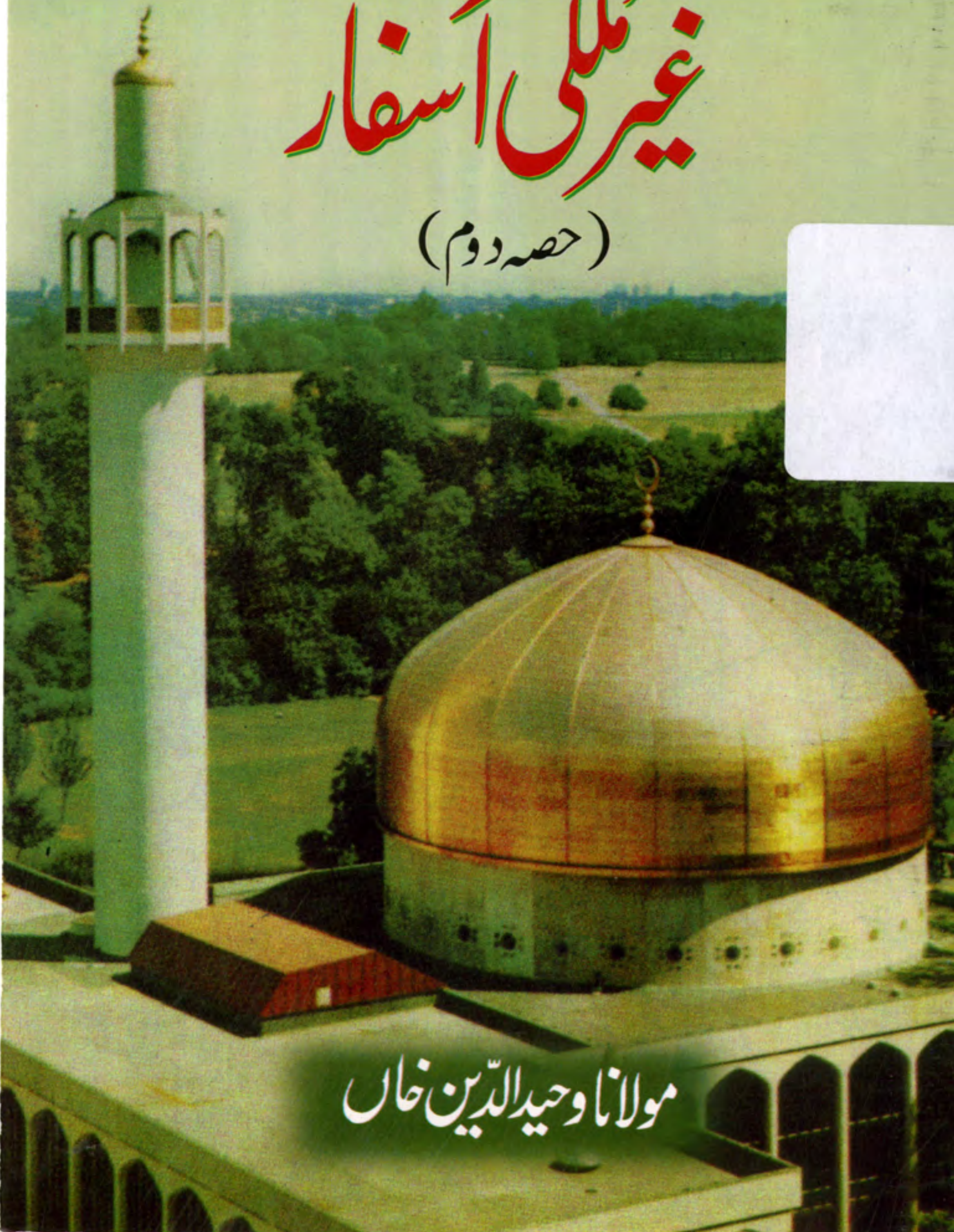

مولانا وحید الدّین خاں

بسم الله الرحمن الرحيم

سفرنامہ
غیر مُلکی اسفار

(حصہ دوم)

مولانا وحید الدّین خاں

Safarnama: Ghayrmulki Asfar (Vol. 2)
by Maulana Wahiduddin Khan

First published 2000
Reprinted 2010
© Goodword Books 2010

This book is copyright free.

Goodword Books
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013
email: info@goodwordbooks.com
Printed in India

see our complete catalogue at

www.goodwordbooks.com
www.goodword.net

فہرست

سفر نامہ طرابلس 5

سفر نامہ اردن 47

سفر نامہ دکار 88

سفر نامہ روس 144

سفر نامہ ٹوکیو، لاس اینجلس 178

سفر نامہ امریکہ 247

سفر نامہ طرابلس 264

سفر نامہ روم، مالٹا، اور قاہرہ 296

سفر نامہ لاہور 365

سفر نامہ ایشیا، یورپ اور افریقہ 400

سفر نامہ امریکہ 502

سفر نامہ مراکو 572

سفر نامہ اٹلی اور انگلینڈ 617

ایک سفر

۲۵ سے ۲۹ ستمبر ۱۹۸۹ تک طرابلس (لیبیا) میں ایک انٹرنیشنل سیمنار رہوا۔ اس سیمنار کا موضوع تھا ـــــ الدعوۃ الاسلامیۃ علیٰ ابواب قرن جدید

Islamic call in the threshold of a new century.

اس سیمنار کے دعوت نامہ پر ایک سفر ہوا۔ وہاں پیش کرنے کے لئے میں نے جو مقالہ تیار کیا، اس کا عنوان یہ تھا:

Islam in the 21st century

یہ مقالہ انشاء اللہ انگریزی اور اردو الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔ یہاں سفر کی روداد درج کی جاتی ہے۔

۲۳ ستمبر ۱۹۸۹ کی شام کو دہلی سے پی آئی اے کی فلائٹ ۲۹۳ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز کی سروس انٹرنیشنل اسٹینڈرڈ کے مطابق تھی۔ کراچی تک ایک گھنٹہ ۵۴ منٹ کی پوری پرواز نہایت ہموار رہی۔ جہاز کے اندر مطالعہ کے لئے پاکستان کے اردو اور انگریزی اخبار موجود تھے۔

اخبارات کا مطالعہ میرے لئے کچھ زیادہ خوشی کا باعث نہ ہوسکا۔ اخبارات میں لفظی کشتی کا منظر دکھائی دیا۔ پنجاب کے ریاستی وزیر کی تقریر اسلام آباد کے مرکزی وزیر کے خلاف۔ اور مرکزی وزیر کی تقریر پنجاب کے ریاستی وزیر کے خلاف۔ جماعت اسلامی کے لیڈر کا بیان مہاجر لیڈر کے خلاف اور مہاجر لیڈر کا بیان جماعت اسلامی کے لیڈر کے خلاف۔ اسی قسم کی خبریں اخبارات کے صفحہ اول کی زینت بنی ہوئی تھیں۔ اس سے یہ تو اندازہ ہوا کہ موجودہ پاکستان میں جمہوریت ہے مگر اہل پاکستان شعوری اعتبار سے شاید ابھی اس درجہ کو نہیں پہنچے کہ وہ جمہوریت کا تحمل کر سکیں۔

پاکستان ہندو اور مسلم اختلاف سے بچنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ مگر جب پاکستان بن گیا تو معلوم ہوا کہ "خداداد ملک" میں مسلم اور مسلم اختلاف اس سے بھی شدید صورت میں موجود ہے۔

ہوائی جہاز میں میری سیٹ کے قریب ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ وہ ہوابازی کے انجنیئر ہیں اور انھوں نے پائلٹ کی ٹریننگ لی ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ

یہ بتایئے کہ جہاز کیسے اڑتا ہے۔ انھوں نے اس کی کچھ تشریح کی۔ اس کے بعد کہا کہ جہاز کے اڑنے کا اصول اگرچہ بے حد سادہ ہے مگر اس کو قطعی صورت میں صرف ریاضیاتی زبان میں بیان کیا جاسکتا ہے، غیر ریاضیاتی زبان میں اس کو قطعیت کے ساتھ بیان کرنا ممکن نہیں۔

یہی اصول دوسرے معاملات کے لئے بھی ہے۔ مثلاً قومی تعمیر یا اسلامی احیاء کے معاملہ کو بھی صحیح طور پر شعر وخطابت کی زبان میں یا چڑیا چڑے کی کہانی کے طور پر بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس کو لازماً علمی زبان میں بیان کرنا پڑے گا۔

آجکل یہ حالت ہے کہ ملی تعمیر یا اسلامی احیاء کے کام کو اگر زیادہ گہرائی کے ساتھ بتایا جائے تو بعض لوگ کہنے لگتے ہیں کہ یہ تو فلسفہ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے ایک معاملہ کو صحیح طور پر "فلسفہ" ہی کی زبان میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ جو لوگ اس کو فلسفہ کی زبان میں سمجھنا نہ چاہیں وہ ہمیشہ کے لئے اس کی حقیقی معرفت سے محروم رہیں گے۔

جہاز میں ایک رفیق سفر نے کہا کہ قرآن میں صرف دو سفروں کا ذکر ہے۔ خشکی کا اور سمندر کا (وحملناهم في البر والبحر) مگر موجودہ زمانہ میں ہوائی سفر بھی ایک مستقل سفر بن گیا ہے۔ اس کا مطلب کیا یہ لیا جاسکتا ہے کہ قرآن "دو سفروں" کے دور کی کتاب ہے، وہ "تین سفروں" کے دور کی کتاب نہیں۔

میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں سفر کی قسمیں تین ہی نہیں ہیں بلکہ اس سے زیادہ ہیں۔ مثلاً انڈر گراؤنڈ ریلوں کا تحت زمین سفر، یا راکٹ کا بالائے خلا سفر۔ اصل یہ ہے کہ یہ ایک عام اسلوب کلام ہے کہ ایک معروف چیز کا ذکر کر کے اس کے ذیل کی دوسری چیزوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے، کیوں کہ وہ اس کے تابع ہونے کی بنا پر خود بخود سمجھ میں آجاتی ہیں۔ مثلاً آپ کہیں کہ "جمہوری نظام میں حکمراں کو اپوزیشن کی طرف سے بہت سی تلخ باتیں سننی پڑتی ہیں۔" اس فقرہ میں بظاہر صرف "سننے" کا ذکر ہے مگر تبعیت کے اصول کے تحت اس میں "پڑھنا" بھی اپنے آپ شامل ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ بہت سی تلخ باتیں سننا اور پڑھنا پڑتا ہے۔

یہی معاملہ قرآن کی مذکورہ آیت کا ہے۔ اس میں بظاہر اگرچہ صرف بَرّ اور بحر میں سفر کا ذکر ہے مگر سفر کے ذیل کے دوسرے تابع مفہوم بھی اس میں اپنے آپ شامل ہیں۔ مثلاً بر کی تابعیت میں تحت زمین سفر، اور بحر کی تابعیت میں فوق زمین (ہوائی اور خلائی) سفر۔

اس سے پہلے ایک سفر کے دوران میں نے کراچی ایرپورٹ کی مسجد میں نماز ادا کی تھی (الرسالہ مئی ۱۹۸۷، صفحہ ۲۲) اس سفر میں دوبارہ کچھ وقت اس خوب صورت مسجد میں گزارنے کا اتفاق ہوا۔ اس مسجد کو دیکھ کر خیال ہوا کہ ایرپورٹ کے اندر مسجد کا ہونا شاید اسی وقت ممکن ہے جب کہ وہ ایرپورٹ کسی مسلم ملک میں واقع ہو۔ مگر پھر یاد آیا کہ اب زمانہ غیر معمولی طور پر بدل چکا ہے چنانچہ اب اٹلی اور اسپین جیسے ملکوں میں بھی شاندار مسجدیں بن رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے حالات میں ایسی تبدیلی کی ہے کہ اب خود سیکولر ملک محسوس کر رہے ہیں کہ "مسجد" ان کے سیکولرزم پر دھبہ نہیں۔ بلکہ مسجد ان کی سیکولرزم کی قبا پر ایک تصدیقی تمغہ ہے۔ چنانچہ فرانس میں پاکستان کا واقعہ دہرایا جارہا ہے۔ فرانس کی راجدھانی پیرس میں اورلی ہوائی اڈہ (Orly International Airport) ہے۔ وہ دنیا کے ان ۴۲ بڑے ہوائی اڈوں میں شمار ہوتا ہے جہاں سالانہ ایک کروڑ سے زیادہ مسافر چڑھتے اور اترتے ہیں۔ تازہ خبر یہ ہے کہ اس فرانسیسی ہوائی اڈہ پر ایک مسجد بنائی گئی ہے تاکہ یہاں سے گزرنے والے مسلمان مسافروں کو عبادت گزاری کی سہولت حاصل ہوسکے۔

کراچی ایرپورٹ پر کئی گھنٹے انتظار میں گزرے۔ میں ایک سیٹ پر بیٹھا ہوا کچھ یادداشتیں نوٹ کرنے میں مشغول تھا۔ میرے پاس کی سیٹ پر ایک مسلمان لڑکی آکر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد وہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولی: "انکل، آپ شاعر ہیں۔" میں نے سر ہلا کر نفی میں جواب دیا۔ میں نے اس سے مزید کچھ نہ کہا اور نہ کچھ پوچھا۔ تاہم میں سوچتا رہا کہ اس نے ایسا سوال کیوں کیا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ لوگ لکھنے کے نام سے صرف تفریحی لکھنے کو جانتے ہیں، وہ سمجھ نہیں پاتے کہ کوئی شخص کسی سنجیدہ مقصد کے لئے بھی قلم کاغذ میں مشغول ہوگا۔

کراچی ایرپورٹ کے اندر داخل ہوتے ہوئے میں امیگریشن کی کھڑکی پر کھڑا تھا۔ میں کئی آدمیوں کے پیچھے تھا۔ پولیس کے آدمی نے مجھے آگے کر دیا۔ ایک مسافر نے کہا کہ یہ تو پیچھے تھے۔ "یہ بزرگ ہیں" اس نے جواب دیا۔ اس نے فوراً میرے پاسپورٹ پر ضروری اندراج کرایا اور مجھے دیتے ہوئے کہا: ہمارے لئے دعا کیجئے گا۔" یہ میرے بڑھاپے کی قیمت تھی۔ میں نے سوچا کہ اس دنیا میں اگر "طاقت ور" ہونا اپنے اندر کچھ ایڈوانٹج رکھتا ہے تو یہاں "کمزور" ہونے کے بھی کچھ ایڈوانٹج ہیں۔ مگر اس کا فائدہ اسی شخص کو ملتا ہے جو فطرت کو اپنا عمل کرنے کا موقع دے اور عاجلانہ مداخلت کرکے فطرت کا نقشہ بگاڑ

نہ ڈالے۔

کراچی سے طرابلس کے لئے لیبین ایرویز کی فلائٹ نمبر ۲۶۳ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ دروازہ پر پہنچا تو مسافروں کے کاغذات اور سامان کی زبردست چیکنگ ہو رہی تھی۔ میرا حلیہ دیکھ کر جہاز کے عملہ کے ایک عرب رکن نے پوچھا کہ آپ کانفرنس میں جا رہے ہیں۔ میں نے کہا ہاں۔ اس کے بعد اس نے کسی قسم کی چیکنگ کئے بغیر اندر داخل کر دیا۔

دل سے دعا نکلی کہ کاش آخرت میں بھی ایسا ہی معاملہ ہو۔ صرف نام پوچھ کر آگے بڑھا دیا جائے۔ رحمتوں کے دروازہ میں بلاحساب کتاب داخلہ مل جائے۔ اور بلاشبہ یہ اللہ کے لئے مشکل نہیں۔

کراچی سے طرابلس کا سفر متواتر سات گھنٹہ کا تھا۔ شروع میں خیال آیا کہ یہ بڑا تکلیف دہ سفر ہوگا۔ مگر دوران پرواز نیند آتی رہی۔ اس لئے اس کا بڑا حصہ سونے میں گزر گیا۔ صبح کو ہمارے پیچھے کی طرف شفق کا اجالا ظاہر ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد پورا اجالا ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر جہاز گھنٹوں تک اسی حالت میں پرواز کرتا رہا۔ جب بھی میں باہر کی طرف دیکھتا تو محسوس ہوتا کہ اجالا بے حد سست رفتار کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارا یہ سفر مشرق سے مغرب کی طرف ہو رہا تھا۔ یعنی طلوع آفتاب کے الٹی طرف۔ یہی "سمت سفر" کا معاملہ تھا جس نے اجالا ہونے میں اتنی تاخیر کر دی۔ زمین کی گردش اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ ہے۔ اگر آپ اپنے مقام پر صبح کے وقت کسی ٹیلہ پر کھڑے ہوں تو سورج آپ کی طرف ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آ رہا ہوگا۔ چنانچہ بہت جلد اجالا ظاہر ہو جائے گا۔ لیکن ہوائی جہاز کے ذریعہ جب آپ مشرق سے مغرب کی طرف آٹھ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ رہے ہوں تو اس وقت آپ کے لئے سورج کے سفر کی رفتار گھٹ کر صرف دو سو میل فی گھنٹہ رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی حالت میں اجالے کے ظہور میں تاخیر ہو جاتی ہے۔

واپسی کے وقت ۳۰ ستمبر ۱۹۸۹ کو اس کے برعکس صورت پیش آئی۔ یہ سفر مغرب سے مشرق کی طرف تھا۔ صبح کو شفق کی سرخی ظاہر ہوئی۔ اور نہایت تیزی کے ساتھ اجالا ہونے لگا۔ ایسے وقت میں اگر آپ ہوائی جہاز کے ذریعہ آٹھ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مغرب سے مشرق کی طرف اڑ رہے ہوں تو صبح کا اجالا آپ کی طرف ۱۸ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آتا ہوا دکھائی دینے لگے گا۔

وقت کی سمت کے خلاف چلنا بھی سفر ہے، اور وقت کی سمت کی طرف چلنا بھی سفر۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دونوں میں اتنا فرق ہو جاتا ہے کہ ایک شخص اگر "۲۰۰ میل" فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہا ہو تو دوسرے کے سفر کی رفتار "۱۸۰۰ میل" فی گھنٹہ تک پہنچ جائے گی۔

لیبین ایرویز کا مخفف ایل اے (L.A.) ہے۔ اس سلسلہ میں بعض لیبیوں کے درمیان ایک لطیفہ مشہور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایل اے کا مطلب ہے Late Always ۔ ان کا کہنا ہے کہ لیبین ایر لائنز کے جہاز اکثر کافی لیٹ رہتے ہیں۔ مگر موجودہ سفر میں وہ تقریباً صحیح وقت پر پہنچا۔ اس دنیا میں ہر عموم میں استثناء ہے اور ہر استثناء میں عموم۔

لیبیا کے پاس دولت کی افراط ہے، اس کے باوجود لیبین ایر لائنز خستہ حالت میں ہے۔ اس کے پاس جہازوں کی بے حد کمی ہے۔ موجودہ جہاز پرانے ہو چکے ہیں۔ فاضل پرزے نہ ہونے کی وجہ سے ان کی مرمت سخت مشکل ہو رہی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ امریکہ نے لیبیا کو جہازوں کی سپلائی بند کر دی ہے۔ دوسری طرف خلیج کی ہوائی کمپنیاں نہایت اچھی حالت میں ہیں۔ کیونکہ امریکا ان کے اوپر اپنی مشینی عنایتیں جاری کئے ہوئے ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے جو مسائل ہیں، ان کا سبب اغیار کا ظلم و تعصب نہیں۔ اس کا اصل سبب مسلمانوں کی ہی پس ماندگی ہے۔ موجودہ مسلمان ہر جگہ پانے کی حد (Receiving end) پر ہیں۔ اور جن لوگوں کا یہ حال ہو جائے ان کا انجام وہی ہوگا جو اس وقت ساری دنیا میں مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔

موجودہ حالت یہ ہے کہ افغانستان میں امریکہ نے ہتھیار دیا تو اس کی مدد سے افغانی مجاہدین نے روسیوں کو ملک سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ فلسطین میں امریکہ مدد نہیں کر رہا ہے تو وہاں عرب مجاہدین اور سارا عالم اسلام نصف صدی سے بالکل عاجز ثابت ہو رہا ہے۔ پاکستان کو امریکہ نے اپنی سرپرستی میں لے رکھا ہے تو وہاں خوش حالی ہے۔ بنگلہ دیش کو امریکہ نے نظر انداز کر دیا تو وہ بدترین بدحالی کی تصویر بنا ہوا ہے۔ مسلمان اس وقت ساری دنیا میں "حبل من الناس" کے تحت جی رہے ہیں نہ کہ "حبل من اللہ" کے تحت (آل عمران ۱۱۲)

۲۴ ستمبر ۱۹۸۹ کو میں طرابلس پہنچا۔ یہاں میرا قیام فندق باب البحر (کمرہ ۹۳۰) میں تھا۔

ہوٹل میں سب سے پہلی چیز جو پڑھنے کو ملی وہ اخبار الدعوۃ الاسلامیہ (۲۰ ستمبر ۱۹۸۹) تھا۔ اس میں پہلے صفحہ پر ایک خبر تھی۔ یہ خبر فائننشل ٹائمز سے نقل کی گئی تھی۔ لندن کے اس اخبار نے اپنی ایک رپورٹ میں بتایا ہے کہ انڈونیشیا میں بڑی تعداد میں غیر مسلم افراد اسلام قبول کر رہے ہیں۔ مسیحی مبلغین کی زبردست مخالفانہ کوشش کے باوجود وہاں اسلام میں داخل ہونے والوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔ فائننشل ٹائمز نے لکھا تھا کہ وہاں اس طرح اسلام کی اشاعت کی وجہ یہ ہے کہ اسلام زندگی کی تمام مانگوں کی تکمیل کرتا ہے:

The reason for such increase, is that
Islam fulfills all requirements of life.

ہر سچا مذہب ابتداءً انھیں صفات کا حامل تھا جو آج اسلام میں پائی جاتی ہیں۔ مگر تحریف اور تبدیلی کے نتیجہ میں اب یہ تمام صفات صرف اسلام میں رہ گئی ہیں۔ دوسرے مذاہب کو انسان کی تحریفات نے ان صفات سے محروم کر دیا۔ لوگوں پر اگر یہ بات واضح ہو جائے تو وہ اسلام کی طرف آنے کو تبدیلیٔ مذہب نہ سمجھیں۔ بلکہ اس کو خود اپنے ہی اصل مذہب کی طرف واپسی کے ہم معنی قرار دیں۔

سفر کے لئے روانگی سے ایک دن پہلے دہلی میں ہفت روزہ الجمعیۃ (۲۲ ستمبر ۱۹۸۹) دیکھا۔ اس کی ایک سرخی یہ تھی: قذافی کے رویہ میں حیرت ناک تبدیلی۔ مضمون میں بتایا گیا تھا کہ اب ایک سال سے معمر قذافی اپنی پالیسیوں میں زبردست تغیر کرتے جا رہے ہیں۔ انھوں نے اب امن اور مصالحت اور دوستی کی راہ اپنائی ہے۔ اس قسم کی باتوں کی وجہ سے عرب ملکوں کے ساتھ قذافی کے تعلقات میں سدھار آیا ہے۔ اور لوگوں کی طرف سے عام طور پر مثبت ردعمل کا اظہار کیا گیا ہے (صفحہ ۲)۔

یہ "تبدیلی" لیبیا کے سفر میں مختلف اعتبار سے محسوس ہوئی۔ اس کو جوش سے ہوش کی طرف واپسی کہا جا سکتا ہے۔ پہلی عالمی جنگ تک ترکی عالم عرب کا قائد تھا۔ عثمانی خلافت کے خاتمہ کے بعد کچھ لوگوں نے ناکام طور پر اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی۔ جمال عبد الناصر کا عالم عرب کا قائد بننے کا خواب نہ صرف بے تعبیر رہا بلکہ انھوں نے عرب دنیا کی بربادی میں مزید اضافہ کیا۔ اس کے بعد آیات اللہ خمینی اسی خوش فہمی میں مبتلا ہوئے۔ مگر انھوں نے بھی اپنے پیچھے بربادی کے سوا کوئی تاریخ نہیں چھوڑی۔ بظاہر

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لیبی لیڈروں کو بھی اپنے بارہ میں یہی خوش گمانی ہوگئی تھی جواب اپنے آپ ختم ہو رہی ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حالات میں صرف دو میں سے کوئی ایک چیز ممکن ہے۔ یا تو تمام مسلم ممالک اپنے اپنے دائرہ میں محدود ہو کر رہیں۔ اور اگر وہ کسی بھی درجہ میں اپنے آپ کو متحدہ بلاک کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں تو عملی طور پر اس کی صرف ایک ہی ممکن صورت ہے۔ وہ یہ کہ تمام ملک سعودی عرب کی علامتی قیادت کو تسلیم کر لیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سعودی عرب کے پاس "مکہ مدینہ" ہے۔ مسلمانوں کے پاس عالمی اتحاد کی یہی ابدی بنیاد ہے۔ مذہبی سطح پر آج بھی یہی چیز ان کو متحدہ ملت کا شعور دئے ہوئے ہے۔ اسی طرح یہی وہ چیز ہے جو سیاسی سطح پر ان کے لئے اتحاد کی ممکن بنیاد بن سکتی ہے۔

اٹلی نے ۱۹۱۱ میں طرابلس پر حملہ کیا۔ وہ ۱۹۴۳ تک اس پر قابض رہے۔ اس وقت یہاں ترکوں کی حکومت تھی۔ ایچ جی ویلز (H.G. Wells) نے اپنی کتاب "آؤٹ لائن آف ہسٹری" میں لکھا ہے کہ اٹلی کے سامراجیوں نے اپنے ہم وطنوں کو ابھارا کہ وہ مزینی کو بھول جائیں اور جولیس سیزر کو یاد رکھیں:

The Italian imperialists exhorted their countrymen to forget Mazzini and remember Julius Caesar (p. 1058).

جی مزینی (Giuseppe Mazzini) ۱۸۰۵ میں پیدا ہوا، اور ۱۸۷۲ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ اٹلی کا مشہور قومی ریفارمر تھا۔ وہ لبرل نیشنلزم کا علم بردار تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ قوموں کے درمیان ہتھیار کا استعمال بند ہو جانا چاہئے اور ہمشیرگی اقوام (Sisterhood of nations) کے اصول پر باہمی تعلق قائم ہونا چاہئے (14/692)

مگر اٹلی کے پرجوش حکمراں اپنے حال کے لیڈر کو بھول گئے۔ انھوں نے دو ہزار سال پہلے کے حکمراں جولیس سیزر (Julius Caesar) کی سنت پر چلنا چاہا۔ جولیس سیزر ۱۰۰ ق م میں روم میں پیدا ہوا، اور ۴۴ ق م میں اس کو قتل کر دیا گیا۔ اس نے رومی سلطنت کی توسیع کے لئے مختلف ملکوں پر حملے کئے۔ اور بالآخر ایک کمزور روم چھوڑ کر دنیا سے چلا گیا۔ (3/579)

یہی اکثر قوموں کا حال ہے۔ انھیں اپنے جنگ جو ہیرو زیادہ پسند آتے ہیں۔ اصلاحی اور تعمیری

بات کرنے والوں کو وہ اکثر غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتی ہیں۔ خواہ جنگ جو افراد نے انھیں بربادی کے سوا کچھ اور نہ دیا ہو۔

ہندستان جیسے ملکوں میں یہ مسئلہ ہے کہ ملک کی معیشت کو چلانے کے لئے پیسہ کہاں سے لایا جائے۔ لیبیا میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں، لیبیا کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ تیل سے ملنے والی بے پناہ دولت کو کس طرح بہتر طور پر قوم کی ترقی کے لئے خرچ کیا جائے:

> The main problem of the oil boom is how best to use the large sums of money available to promote the well-being of the nation as a whole (10/882).

رابطۂ عالم اسلامی کے تحت مکہ مکرمہ سے ایک انگریزی پرچہ نکلتا ہے جس کا نام مسلم ورلڈ لیگ جرنل ہے۔ اس کے شمارہ مارچ ۔ اپریل ۱۹۸۹ میں چار صفحہ کا ایک باتصویر مضمون چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے:

Libya's New Oil Era

اس مضمون میں ایک بڑی سبق آموز بات کہی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ نے لیبیا پر تجارتی پابندیاں لگائیں اور اس کے تیل کے کارخانوں سے اپنے آدمیوں کو واپس بلالیا۔ بظاہر اس کا مقصد یہ تھا کہ لیبیا کی اقتصادیات تباہ ہو جائیں۔ مگر نتیجہ برعکس صورت میں برآمد ہوا۔ خود امریکی کانگرس کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ لیبیا سے امریکی کمپنیوں کی واپسی کا انھیں کوئی نقصان نہیں ہوا۔ بلکہ ان کی آمدنی میں اور اضافہ ہو گیا۔ مشکل آسانی میں تبدیل ہو گئی۔

مسلم ورلڈ لیگ جرنل کے مذکورہ مضمون میں بتایا گیا ہے کہ امریکی کمپنیوں کی واپسی سے لیبیا کو مختلف فائدے پہنچے۔ اس سے انھیں موقع ملا کہ وہ ضروری ٹکنالوجی کو خود حاصل کریں، اس سے ان کی حب الوطنی اور محنت میں اضافہ ہوا۔ انھوں نے لیبیا کی تیل کی صنعت کو مکمل طور پر لیبی بنا لیا۔ اس کے ذریعہ سے لیبیا میں تیل کی صنعت کا ایک نیا دور آ گیا (صفحہ ۶۱)

سعودی عرب کے "فیصل انعام" کی طرح لیبیا میں سالانہ "قذافی انعام" ۱۹۸۹ سے شروع کیا گیا ہے۔ لیبی حکومت نے اس مقصد کے لئے دس ملین ڈالر کا فنڈ سوئزرلینڈ کے ایک بینک میں جمع کیا ہے۔ مئی ۱۹۸۹ میں اس کے پہلے انعام کا اعلان کیا گیا۔ یہ انعام ساؤتھ افریقہ کے نیلسن منڈیلا (Nelson Mandela)

کو ان کی آزادی کی کوششوں (Liberation struggles) کے اعتراف میں دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ 250,000 ڈالر کی رقم شامل ہے۔ ٹائم میگزین (۸ مئی ۱۹۸۹) نے اس واقعہ کی خبر دیتے ہوئے معنی خیز طور پر اس کی سرخی ان الفاظ میں قائم کی ہے ــــ اور انعام پانے والا ہے . . .

And the winner is .... (p. 21).

سعودی عرب کا فیصل انعام کسی شخص کی "اسلامی خدمات" کے اعتراف کے طور پر کسی مسلمان کو دیا جاتا ہے۔ اس معاملہ میں لیبیا اگر سعودی عرب کی تقلید کرے تو وہ اس کے لئے زیادہ اچھا ہوگا۔

یہاں میں نے اپنی گھڑی میں مقامی وقت کے مطابق تبدیلی نہیں کی تھی۔ جب مجھے وقت معلوم کرنا ہوتا تو میں ایسا کرتا کہ اپنی گھڑی میں ساڑھے تین گھنٹہ کا فرق کر لیتا تھا۔ اس طرح مجھے مقامی وقت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ ہندستان کے مقابلہ میں لیبیا کا وقت ساڑھے تین گھنٹہ پیچھے ہے۔ وقت کے آگے پیچھے ہونے کا مطلب کیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان نے اپنی سہولت کے لئے رات اور دن کی مدت کو ۲۴ گھنٹے میں تقسیم کیا ہے۔ یہ مان لیا گیا ہے کہ ہر ملک میں دوپہر کا وقت ۱۲ بجے کا وقت ہوگا۔ اب چونکہ زمین کی محوری گردش کی بنا پر "دوپہر" کا لمحہ ہر ملک میں الگ الگ وقت پر آتا ہے، ہر ملک کا وقت الگ الگ ہو گیا ہے۔ مثلاً ہندستان میں جس وقت دوپہر ہوگا، اس وقت لیبیا میں ابھی دوپہر کا وقت آنے میں تقریباً ساڑھے تین گھنٹہ باقی ہوں گے۔ ہر ملک دوپہر کے وقت کو ۱۲ بجے کا وقت مان کر اپنی گھڑی کا آغاز کرتا ہے، اس لئے ہر ملک کا وقت نسبتی طور پر الگ الگ ہو جاتا ہے۔

وقت کا یہ فرق قدرت کا ایک سبق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "فرق" اس دنیا کی لازمی حقیقت ہے۔ اس دنیا میں ہمیں فرق کے باوجود مل کر رہنا ہے۔ یہاں اختلاف کے باوجود اتحاد قائم کرنا ہے۔

اپنے عام طریقہ کے مطابق، میں کانفرنس کے بارہ میں "رپورٹ" کے انداز میں کچھ نہیں لکھوں گا۔ کانفرنس کے اندر اور کانفرنس کے باہر پیش آنے والی صرف کچھ باتوں کو یہاں نقل کروں گا۔

کویت کے شیخ راشد عبد اللہ الفرحان نے حقوق الانسان فی الاسلام پر عربی میں تقریر کی۔ اس دوران انھوں نے غلامی کا ذکر کیا اور کہا کہ اسلام کے مخالفین اس پر سب سے زیادہ اعتراض کرتے ہیں۔ مگر قرآن و حدیث میں کہیں بھی یہ ہدایت نہیں کہ تم لوگوں کو غلام بناؤ۔ اسلام نے غلامی کو شروع نہیں کیا۔ وہ پہلے سے دنیا میں موجود تھی۔ اسلام نے ایسے احکام دئے جن کے ذریعہ وہ کمیت و کیفیت

کے اعتبار سے ختم ہو سکے۔ غلامی کے بارہ میں اسلام نے جو احکام وضع کئے ہیں، وہ دو مقصد کے تحت تھے۔ مزید غلام بنانے کو روکنا، اور موجودہ غلاموں کو ختم کرنا (النوع الذی شُرعت لہ الاحکام کلہا تدور حول مبدأین مُہمین ہما: تضییق المدخل وتوسیع المخرج)

غلامی کے مسئلہ کی یہ تشریح نہایت صحیح اور عین شریعت کے مطابق ہے۔ تضییق المدخل اور توسیع المخرج کا یہی اصول اسلام نے دوسری برائیوں کے استیصال کے لئے بھی اختیار کیا ہے۔

کانفرنس کی تقریریں اور مقالے زیادہ تر اصل موضوع سے غیر متعلق تھے۔ اس لئے ان کی کوئی تفصیل یہاں درج نہیں کی جارہی ہے۔ ایک صاحب نے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: صرف آپ کا مقالہ مقررہ موضوع کے پوری طرح مطابق تھا۔ یہی اکثر کانفرنسوں کا حال ہوتا ہے۔

۲۸ ستمبر کی نشست میں فلپائن کی مورو لبریشن فرنٹ کے نوجوان چیرمین مسٹر نوری مسواری (NUR MISVARI) نے تقریر کی۔ ان کی انگریزی تقریر انتہائی جوشیلے انداز میں تھی۔ انھوں نے بتایا کہ فلپائن کی مسلم آبادی کے علاقے میں آزادی کی جو لڑائی ہو رہی ہے، اس میں اب تک کم از کم ۱۳۵ ہزار مسلمان اپنی جانیں قربان کر چکے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ فلپائن کے سابق صدر مارکوس کے ساتھ ہماری میٹنگ ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ لوگوں کو میں ہر چیز دینے کے لئے تیار رہوں۔ مگر میں آپ کو آزادی دینے کے لئے تیار نہیں:

I am ready to give you anything except independence.

مگر مسلم لیڈروں نے جواب دیا کہ ہماری لڑائی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ ہم کو صرف آزادی چاہئے، اس کے سوا کوئی اور چیز ہم کو منظور نہیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی جدوجہد ہر مقام پر اسی صورت حال کا شکار ہے۔ مسلمان ہر جگہ بے فائدہ قومی جنگ لڑ رہے ہیں، جس کا نام انھوں نے غلط طور پر جہاد فی سبیل اللہ رکھ لیا ہے۔ وہ دوسروں سے ایسی چیز کا مطالبہ کر رہے ہیں جس کو دوسرے لوگ انھیں دینے کے لئے تیار نہیں۔ اور دوسرے لوگ جو کچھ انھیں دے رہے ہیں وہ مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں۔ اس قسم کی جنگ سراسر بے فائدہ ہے۔ اس کا تعلق عقل سے بھی نہیں، اسلام سے اس کا تعلق ہونا تو درکنار۔

اس دنیا میں زندگی کی صورت صرف ایک ہے۔ ممکن (Possible) پر راضی ہوکر اس کو وقفۂ عمل کے طور پر استعمال کرنا ، تاکہ مستقبل میں ناممکن (Impossible) تک پہنچنے کی راہ ہموار ہوسکے۔ ممکن پر راضی ہونے سے ناممکن ملتا ہے۔ جو شخص ممکن پر راضی نہ ہو اس کا سفر ہی شروع نہ ہوگا۔ پھر وہ کسی منزل تک کس طرح پہنچ سکتا ہے۔

۴ ستمبر کی شام کو کانفرنس کے تمام شرکا خصوصی ہوائی جہاز کے ذریعہ بن غازی لے جائے گئے۔ وہاں انھوں نے رات کا کھانا کھایا اور صدر قذافی سے ان کی ملاقات ہوئی۔ تاہم میں طبیعت کی خرابی کی بنا پر بن غازی نہ جا سکا اور اس پروگرام میں شرکت نہ کر سکا۔ اس اجتماعی ملاقات کا اہتمام معمر قذافی کے روایتی خیمہ میں کیا گیا تھا۔ اس خیمہ کو اور وہاں کے آداب کو اس سے پہلے میں دیکھ چکا ہوں۔

عربی کی ایک مثل ہے : خَالِفْ تُعْرَفْ (رواج کے خلاف کام کرو ، تم مشہور ہو جاؤ گے) معمر قذافی اس اصول کی دلچسپ مثال ہیں۔ وہ اپنے کو " فرزند صحرا " کہتے ہیں اور اکثر حالات میں وہ اس مثل کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ ستمبر کے پہلے ہفتہ میں بلغراد (Belgrade) میں ناوابستہ ممالک (NAM) کی نویں کانفرنس ہوئی۔ اس موقع پر معمر قذافی اس طرح پہنچے کہ وہاں ان کے لئے چار اونٹ ، دو عربی گھوڑے اور اسی کے ساتھ ان کا مخصوص عربی خیمہ بھی لے جایا گیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان چیزوں کے ذریعہ انھیں بلغراد میں قیام کے دوران سادگی کو برقرار رکھنے میں مدد ملے گی۔ معمر قذافی ہر روز صبح کو اونٹ کا دودھ ایک گلاس پیتے ہیں۔ اس کو وہ حیات بخش اور اکسیر سمجھتے ہیں۔ ان کی قیام گاہ باب العزیزی کے پاس ، ہر وقت کچھ اونٹ چرتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔

سری لنکا کے ڈاکٹر محمد شکری (۴۸ سال) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مسلم ڈولپمنٹ بنک جدہ کے تعاون سے کولمبو میں ایک بڑا تعلیمی ادارہ قائم کیا ہے جس کا نام الجامعۃ النظیمیہ الاسلامیہ ہے۔ میں نے کہا کہ ہندستان کے اردو اخبارات میں میں نے اس قسم کے مضامین پڑھے ہیں جن سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ سری لنکا میں مسلمانوں کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے۔ انھوں نے اس سے مکمل انکار کیا۔ انھوں نے کہا کہ سری لنکا میں اس قسم کی کوئی منظم کارروائی کا قطعاً کوئی وجود نہیں :

There is no organised oppression against Muslims in Sri Lanka.

انھوں نے بتایا کہ سری لنکا ریڈیو میں "مسلم سکشن" کے نام سے ایک مستقل شعبہ ہے۔ اس کے تحت ریڈیو سیلون پر روزانہ دو گھنٹہ کے لئے اسلامی پروگرام ہوتے ہیں۔ میں خود ہر جمعہ کو ریڈیو میں اسلامی تعلیمات کے بارہ میں تقریر کرتا ہوں۔ ہمارے یہاں کثرت سے مسلم اسکول ہیں۔ مسلم معاملات کے لئے باقاعدہ "قاضی" مقرر ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے کہا کہ کہا جاتا ہے کہ مسلمان آزاد مسلم لینڈ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس قسم کی خبریں بالکل بے بنیاد ہیں۔ آزاد لینڈ کا مطالبہ تامل لوگوں کا ہے نہ کہ مسلمانوں کا۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان (شمالی ہند) میں اسلام سلاطین کے ذریعہ آیا۔ وہاں جو ہندو مسلم کش مکش ہے وہ اسی تاریخی بیک گراؤنڈ کی وجہ سے ہے۔ اس کے برعکس سری لنکا میں اسلام تاجروں کے ذریعہ پہنچا۔ اس لئے وہاں کی تاریخ مختلف ہے اور اسی بنا پر وہاں کے دونوں فرقوں میں کوئی کش مکش بھی نہیں۔

طرابلس میں ایک افریقی خاتون بھی آئی ہوئی تھیں۔ ان کا نام ڈاکٹر زینب سعید کبیر ہے۔ وہ بیرو یونیورسٹی (Bayero University) کی سوشیالوجی ڈپارٹمنٹ میں پروفیسر ہیں۔ یہ یونیورسٹی کانو (نائجیریا) میں واقع ہے۔ انھوں نے بتایا کہ میں انگریزی الرسالہ منگاتی ہوں اور اس کی مستقل قاری ہوں۔ انھوں نے مزید بتایا کہ ہم انگریزی الرسالہ کے مضامین کو کانو (Kano) کے پرچوں میں دوبارہ چھپواتے ہیں تاکہ وہ عوام تک پہنچ سکیں۔ ان میں سے دو انگریزی زبان کے پرچے یہ ہیں:

1. The Pen Weekly
2. The Sunday Triumph Weekly

اس کے علاوہ وہ انگریزی الرسالہ کے مضامین کا مقامی زبان (Hausa) میں ترجمہ کرتی ہیں اور ان کو مقامی ہوسا زبان کے پرچوں میں چھپواتی ہیں۔ مثلاً:

1. Al-Kalam Bi-weekly
2. Al-Fijr Weekly

ایک صاحب کناڈا سے آئے تھے۔ انھوں نے کچھ لٹریچر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کناڈا میں سرکاری سطح پر ایک تحریک چلائی جا رہی ہے جس کو وہ لوگ ملٹی کلچرلزم (Multiculturalism) کہتے ہیں۔ یہ اسی قومی ایکتا کے لئے ہے جس کو ہندستان میں نیشنل انٹگریشن (National integration)

کہا جاتا ہے۔ مگر مجھے کناڈا کی اصطلاح ، ہندستان کی اصطلاح سے زیادہ پسند آئی ۔ہندستان کی اصطلاح میں بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ مختلف گروہوں کے درمیان یک جہتی کو کلچرل یکسانیت کے ذریعہ حاصل کرنا مقصود ہے۔ جب کہ کناڈا کی اصطلاح واضح طور پر کلچرل تعددیت کو تسلیم کرتے ہوئے سماج کے اندر ہم آہنگی لانا چاہتی ہے۔

جس طرح ہندستان میں مختلف تہذیبی گروہ ہیں ، اسی طرح کناڈا (اور دوسرے ملکوں) میں بھی مختلف تہذیبی گروہ ہیں۔ اس "اختلاف" کو "اتحاد" میں تبدیل کرنے کا راز یہ نہیں ہے کہ خود اختلاف کو ختم کرنے کی ناکام کوشش کی جائے۔ اس کا راز صرف ایک ہے ، وہ یہ کہ اختلاف کو بطور واقعہ تسلیم کیا جائے اور اسی کے ساتھ لوگوں کے اندر یہ مزاج پیدا کیا جائے کہ وہ باہمی طور پر رواداری اور احترام کے ساتھ رہ سکیں۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ پاکستانی ہیں مگر آجکل یورپ کی ایک یونیورسٹی میں کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں آپ کا الرسالہ پڑھتا ہوں۔ آپ ہندستانی مسلمانوں کے لئے مکی دور کو ماڈل قرار دیتے ہیں۔ اس سے مجھے اتفاق نہیں۔ کیوں کہ مکی دور کا مسلمان مظلومیت کی حالت میں تھا۔ اس کا کوئی قانونی اور سیاسی حق نہیں تھا۔ جب کہ ہندستانی مسلمانوں کی یہ پوزیشن نہیں ہے۔ ہندستان ایک جمہوری ملک ہے۔ وہاں دستور اور قانون کا نظام ہے جو مسلمانوں کے لئے یکساں شہری حقوق کی ضمانت دیتا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ مکی دور کو ہم اپنے لئے ماڈل سمجھتے ہیں۔ مگر اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ بھی مظلوم تھے اور ہم بھی مظلوم ہیں۔ ہندستانی مسلمان اور مکہ کے مسلمانوں میں جو مشابہت ہے وہ مرحلۂ دعوت کے اعتبار سے ہے نہ کہ مرحلۂ مظلومی کے اعتبار سے۔ مکہ میرے نزدیک دارِ دعوت تھا۔ وہاں مسلمان داعی کی حیثیت میں تھے اور اہل مکہ مدعو کی حیثیت میں۔ اسی طرح ہندستان میں بھی مسلمان داعی کی حیثیت رکھتے ہیں اور بقیہ اہل ملک ان کے لئے مدعو کا درجہ رکھتے ہیں۔ جب میں کہتا ہوں کہ ہندستانی مسلمانوں کو یک طرفہ طور پر صبر و اعراض کی پالیسی اختیار کرنا چاہئے تو اس سے مراد مظلومانہ اخلاق نہیں ہوتا بلکہ داعیانہ اخلاق ہوتا ہے۔ کیوں کہ داعی کے لئے یہی حکم ہے کہ وہ مدعو کی زیادتیوں سے اعراض کرتے ہوئے اس کو اپنی دعوت حق کا مخاطب بنائے۔ اس وضاحت کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔

شیخ محمد عبدہ (۱۹۰۵ - ۱۸۴۹) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ فرانس گئے۔ وہاں انھوں نے چند سال قیام کیا۔ جب وہ اپنے وطن مصر واپس آئے تو ان سے تاثرات پوچھے گئے۔ انھوں نے کہا کہ میں

نے پایا کہ مغربی ممالک میں اسلام ہے مگر مسلمان نہیں۔ اور یہاں مسلم ملک میں مسلمان ہیں مگر اسلام نہیں (رأیت فی بلاد الغرب اسلاماً بلا مسلمین۔ ثم عدتُ ھنا فوجدت مسلمین بلا اسلام)

اس سفر میں میری ملاقات ڈکتور عبد المنعم خطاب سے ہوئی۔ وہ مصری عالم ہیں اور ۲۰ سال سے امریکہ کی ریاست اوہائیو کے شہر ٹالیڈو میں رہتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ شیخ محمد عبدہ نے جو کچھ کہا ہے اس کے بارہ میں آپ کی رائے کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ بالکل درست ہے (ھذا حق)

شیخ محمد عبدہ نے یہ بات کردار کے اعتبار سے کہی۔ میرے ذاتی تجربہ کے مطابق بھی یہ ایک حقیقت ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ انھوں نے کردار کی طاقت کھودی ہے۔ اور مغربی قوموں کی خاص صفت یہ ہے کہ وہ کردار کی طاقت سے مسلح ہیں۔ یہی وہ فرق ہے جس نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو مغلوب اور اہل مغرب کو غالب بنا دیا ہے نہ کہ وہ نام نہاد سازشیں (مو امرات) جن کا ذکر مسلمانوں کی ہر تقریر و تحریر میں جوش و خروش کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

موریس بکائی کی کتاب (بائبل قرآن اور سائنس) کا عربی ترجمہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ بڑی تعداد میں عربوں نے اس کو پڑھا ہے۔ ایک تعلیم یافتہ عرب نے کہا کہ موریس بکائی نے قرآن کا تو پوری طرح اعتراف کیا ہے، مگر انھوں نے حدیث کا انکار کر دیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس انکار کی وجہ یہ ہے کہ موریس بکائی نے ایک نکتہ کو نہیں سمجھا۔

اصل یہ ہے کہ جس زمانہ میں قرآن اترا اس زمانہ میں ساری دنیا میں تمثیلی اسلوب رائج تھا۔ اس بنا پر حدیث میں زمانی رعایت کی بنا پر کہیں کہیں تمثیل کا اسلوب بھی ملتا ہے۔ مگر قرآن میں تمثیل کا اسلوب موجود نہیں۔ مثلاً حدیث میں ہے کہ آگ کی شدت جہنم کی سانس کی وجہ سے ہے (ان شدۃ الحر من فیح جھنم) یہ تمثیل ہے نہ کہ حقیقت۔ چنانچہ قرآن میں یہی بات ان لفظوں میں کہی گئی: قل نار جھنم اشد حراً (التوبہ ۸۱)

موریس بکائی نے اس قسم کی حدیثوں کو حقیقت پر محمول کیا اور ان کا انکار کر دیا۔ کیوں کہ سائنسی اعتبار سے یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی کہ مئی جون کی گرمی جہنم کی پھونک سے ہو سکتی ہے۔

یہ سن کر ایک صاحب نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول کے کلام میں زمانی تاثر پایا جاتا ہے۔

میں نے کہاکہ یہ تاثر نہیں ہے بلکہ رعایت ہے۔ " رعایت " کالفظ اگرچہ ایک عربی لفظ ہے۔ مگر مذکورہ عرب دوست اس کو نہ سمجھ سکے۔ آخر کار میں نے " مراعاۃ " کا لفظ استعمال کیاتو وہ فوراً سمجھ گئے۔ جس مفہوم کے لئے ہم رعایت کالفظ بولتے ہیں، اس کے لئے موجودہ عرب مراعاۃ کالفظ استعمال کرتے ہیں۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتاہے کہ بات وہی ہے جو مخاطب کی فہم سے مطابقت کرے۔ جو بات مخاطب کی فہم کے مطابق نہ ہو، وہ کہے جانے کے باوجود مخاطب کے لئے لامعلوم بنی رہے گی۔ ایسی بات متکلم کی نسبت سے کہی جاچکی ہوگی، مگر مخاطب کی نسبت سے وہ ابھی تک ان کہی پڑی ہوئی ہوگی۔

شیخ امجد حیدرآبادی (۳۱ سال) طرابلس میں ایک جاپانی فرم میں کام کرتے ہیں۔ وہ اس سے پچھلے ۴ سال سے وابستہ ہیں۔ میں نے ان سے پوچھاکہ جاپانیوں کی ترقی کا راز کیاہے۔ انھوں نے کہاکہ میں چار سال سے جاپانیوں کو بہت قریب سے دیکھ رہا ہوں۔ ان لوگوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ کام کرتے ہیں۔ وہ تھکنے کو کوئی عذر نہیں سمجھتے۔ مقررہ وقت سے زیادہ کام کریں گے۔ رات کو اپنے گھر میں ہیں، کوئی کام یاد آجائے تو رات کو اٹھ کر دفتر میں آجائیں گے۔

انھوں نے کہاکہ انڈیا اور پاکستان کے لوگوں کا حال یہ ہے کہ اگر وہ چند آدمی ایک کمرہ میں ہوں تو بات زیادہ کریں گے اور کام کم۔ مگر کئی جاپانی ایک کمرہ میں ہوں تو وہ کبھی بات نہیں کریں گے۔ ہر ایک صرف اپنے کام میں مشغول ہوگا۔ جب تک وہ کام کی میز پر ہیں، وہ کام کے سوا کبھی اور کچھ نہیں کریں گے۔ ان کا ماٹو ہے — کرو یا مرجاؤ:

Do or die

میں نے پوچھاکہ آپ نے چار سال کے اندر جاپانیوں کو کبھی آپس میں جھگڑتے دیکھا۔ انھوں نے کہاکہ کبھی نہیں۔ اس کے برعکس ہندستان اور پاکستان کے جو تھوڑے سے مسلمان یہاں آباد ہیں، ان میں کوئی اتحاد نہیں۔ مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں ان کی یہی کمی رکاوٹ ہے نہ کہ کسی غیر قوم کی سازش یا عناد۔

۲۷ ستمبر کو مسٹر فضل اللہ ولموٹ (۴۵ سال) سے ملاقات ہوئی۔ آجکل وہ مالیزیا کی انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں رجسٹرار ہیں۔ وہ آسٹریلیا میں پیدا ہوئے۔ ان کا ابتدائی نام کلائیو ولموٹ (Clive Wilmot) تھا۔ اس کے بعد انھوں نے اسلام کا مطالعہ کیا اور اسلام قبول کرلیا۔ وہ انگریزی

الرسالہ کے مستقل قاری ہیں ۔انھوں نے الرسالہ کے بارے میں اپنا تاثر بتایا جس کا ایک حصہ یہ تھا:

The approach of Al-Risala to Islam is the right one, as it emphasises the position. It does not condemn others for our problems and asks Muslims to contribute to solving the problems facing Muslim men and women.

لیبیا کی سرحد پر چاڈ (Chad) ملک واقع ہے۔ یہاں مسلمان تقریباً ۴۵ فی صد کی تعداد میں آباد ہیں۔ یہاں کی آبادیوں میں اسلام بہت تیزی سے پھیلا ہے :

It has attracted a wide variety of ethnic groups (4/15).

افریقہ کے دوسرے علاقوں کی طرح ، چاڈ میں بھی مسیحی مبلغوں نے مسلمانوں کو مسیحیت میں داخل کرنے کی بہت کوششیں کیں۔ مگر وہ مسلم آبادی کو متاثر کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے :

In Chad, as elsewhere, Christian missionary work has not affected the Muslim population (4/15).

لیبیا اور چاڈ کے درمیان ایک صحرائی پٹی ہے جس کے نیچے معدنی ذخائر بڑی مقدار میں موجود ہیں۔ اس کو اوزو پٹی (Aouzou Strip) کہا جاتا ہے۔ پندرہ سال پہلے لیبیا نے اس کے اندر اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ اس کا دعویٰ تھا کہ یہ لیبیا کا حصہ ہے۔ اس کے بعد دونوں ملکوں میں جنگ ہوئی۔ اس میں بے شمار جانی و مالی نقصان ہوا۔ ۱۹۸۹ میں لیبیا نے اس جنگ کے خاتمہ کا اعلان کر دیا ہے۔ وہ اس اس پر راضی ہو گیا ہے کہ ہیگ کی انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس جو فیصلہ کرے ، وہ اس کو مان لے گا۔

یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہی صورت حال ہے جو ہندستان کے نام نہاد لیڈروں نے اجودھیا کی بابری مسجد کے معاملہ میں اختیار کی ۔ ابتداءً انھوں نے ریلی اور جلوس کے مظاہرے کئے ۔ مارچ اور بائیکاٹ کی دھمکیاں دیں ۔ لاؤڈ اسپیکر پر نعرے لگائے کہ ہم بابری مسجد لے کر رہیں گے۔ اب جب کہ اس احمقانہ سیاست کے نتیجہ میں ملک کے فرقہ پرست ہندو اپنی تمام انتہا پسندی اور متشددانہ ارادوں کے ساتھ جاگ اٹھے تو اب وہ مسلمانوں سے اپیل کر رہے ہیں کہ مسجدوں میں اس کے لئے دعا کرو ۔ اور یہ کہ کورٹ جو فیصلہ دے وہ ہمیں منظور ہے ۔ یہی وہ چیز ہے جس کے بارہ میں فارسی

شاعر نے کہا تھا:

ہرچہ داناکند کند ناداں لیک بعد از خرابیٔ بسیار

طرابلس سے ایک ہفتہ وار عربی اخبار نکلتا ہے جس کا نام ہے الدعوۃ الاسلامیہ۔ اس کے شمارہ ۲۹ مارچ ۱۹۸۹ میں صفحہ اول کی پہلی سرخی یہ تھی: نصف ملیون کاثولیکی فی ایطالیا یدخلون الاسلام (اٹلی کے پانچ لاکھ کیتھولک مسیحی اسلام میں داخل ہوگئے) یہ خبر ایک اطالوی ہفت روزہ میگزین ایسپریسو (Espresso) کے حوالہ سے دی گئی ہے۔

اطالوی میگزین کی یہ رپورٹ اٹلی کے مسلمانوں کے بارہ میں ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اٹلی میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے، حال میں ان کی تعداد نصف ملین افراد تک پہنچ گئی ہے۔ اٹلی میں مسلمانوں کی تعداد اب وہاں کے یہودیوں سے زیادہ ہوگئی ہے۔ اس طرح اب اٹلی میں اسلام تعداد کے اعتبار سے مسیحیت کے بعد نمبر ۲ پر ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان نکاح کی صورت میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ مسیحی (عورت یا مرد) اپنے دین کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیتے ہیں (فی حالات الزواج بین المسلمین والمسیحیین، فان المسیحیین ھم الذین یتخلون عن دینھم)

اسلام کی فکری اور نظریاتی طاقت ناقابل تسخیر حد تک عظیم ہے۔ مگر اسلام کا یہی وہ امتیازی وصف ہے جس سے موجودہ زمانہ کے فریادی مسلم رہنما سب سے زیادہ بے خبر ہیں۔

۲۴ ستمبر کی شام کو میری طبیعت خراب ہوگئی۔ کانفرنس کے منتظمین مجھ کو قریب کے ایک اسپتال میں لے گئے۔ یہ نسبتاً ایک چھوٹا اسپتال تھا۔ وہاں ایک مصری ڈاکٹر نے میرا بلڈ پریشر وغیرہ دیکھا اور ایک انجکشن اور ایک دوا تجویز کی۔ پورا اسپتال تو میں نہ دیکھ سکا۔ تاہم اسپتال کے اندر چلتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ وہاں کوئی مریض نہیں۔ ڈاکٹر اور کمپاؤنڈر وغیرہ تو مجھے نظر آئے۔ مگر وہاں مجھے کوئی مریض دکھائی نہ دیا۔ ہندستان میں مریض ہیں مگر اسپتال نہیں۔ یہاں اسپتال ہیں مگر مریض نہیں۔

۲۴ ستمبر کو دن کا کھانا کلیۃ الدعوۃ الاسلامیہ میں تھا۔ یہ بہت بڑے رقبہ میں جدید طرز پر بنائی گئی ہے۔ آجکل "کلیۃ الدعوۃ" کے نام پر اکثر مسلم ملکوں میں تعلیمی ادارے قائم ہیں جن کا مقصد اسلام کے داعی تیار کرنا ہے۔ یہ بلاشبہ ایک نہایت مفید کام ہے۔ مگر موجودہ صورت میں وہ عیسائی مبشرین

اور مبلغین کے رد عمل میں شروع ہوا ہے۔ اس لئے کسی بھی کلیہ میں پورے معنی میں صحیح دعوتی ماحول موجود نہیں۔

کانفرنس کی طرف سے ہوٹل کے ایک کمرہ میں رزرویشن آفس کھلا ہوا تھا۔ ۲۷ستمبر کو میں وہاں گیا تاکہ واپسی کے رزرویشن کے لئے ان کو اپنا ٹکٹ دے دوں۔ انھوں نے کہا کہ واپسی کے لئے ہم آپ کا رزرویشن کویت کے راستہ سے کر رہے ہیں۔ چوں کہ کویت میں اگلی پرواز کے لئے اچھا کنکشن نہیں تھا، اس لئے میں نے کہا کہ نہیں۔ اس کے بجائے آپ کراچی کے راستہ سے میرا رزرویشن کریں۔ انھوں نے دوبارہ کویت کے راستہ سے رزرویشن کرانے کی بات کی اس پر میری زبان سے نکل گیا:

لا ابداً۔

اس کے بعد اچانک مجھے خیال آیا کہ دنیا کے سفر میں تو میں اپنی پسند کے خلاف، راستہ پر سفر کرنے کے لئے " لا ابداً " کہہ کر انکار کر رہا ہوں۔ مگر آخرت کے سفر کا معاملہ سراسر اس سے مختلف ہوگا۔ وہاں کسی شخص کے لئے انکار کا کوئی حق نہیں ہوگا۔ آخرت کا سفر، دنیا کے سفر سے کتنا زیادہ مختلف ہوگا۔ مگر کتنے کم لوگ ہیں جو اس حقیقت کو جانتے ہوں۔

ہوٹل کے رسپشن میں ایک بہت بڑی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس کے ایک طرف معمر قذافی کا مسکراتا ہوا چہرہ تھا۔ پس منظر میں "مصنوعی دریا" کا پانی موجیں مارتا ہوا بہتا ہوا دکھایا گیا تھا۔ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا ــــ انسانی دریا بنانے والا عظیم انسان :

The great man-river builder.

لیبیا میں پانی سپلائی کا نیا تجربہ کیا گیا ہے۔ چشموں کے پانی کو ذخیرہ کرکے اس کو بہت بڑے پائپ میں داخل کیا جاتا ہے۔ یہ پائپ صحراؤں سے گزرتا ہوا سیکڑوں میل دور کے مقام پر پہنچتا ہے اور خشک زمینوں کی آبپاشی کرتا ہے۔

پہلی نظر میں دیکھئے تو یہ "مصنوعی دریا" ایک انسان (معمر قذافی) نے بنایا۔ مزید غور کیجئے تو یہ پڑو ڈالر کا کارنامہ نظر آئے گا۔ اور زیادہ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ سراسر خدا کی قدرت کا کرشمہ ہے۔ کیوں کہ اسی نے پانی کے ذخائر پیدا کئے۔ پھر اسی نے وہ تمام امکانات پیدا کئے جن کو استعمال کرکے کوئی شخص اس قابل ہوتا ہے کہ وہ صحراؤں میں دریائیں اور نہریں جاری کرے۔ ہر واقعہ بالآخر خداوند ذوالجلال کا کارنامہ ہے۔ مگر بے خبر انسان اس کو دوسری دوسری چیزوں

کے خانہ میں ڈال دیتا ہے۔ موجودہ دنیا کے تمام واقعات اپنی حقیقت کے اعتبار سے شکر کی طرف لے جارہے ہیں۔ مگر دنیا میں سب سے کم وہ لوگ ہیں جو واقعات سے شکر کی غذا لیتے ہوں۔

ہوٹل میں میرا قیام اس کی نویں منزل میں تھا۔ ۲۸ ستمبر کی صبح کو مجھے نیچے اترنا تھا۔ لفٹ میں داخل ہو کر میں نے نمبر ۹ کا بٹن دبایا۔ مگر لفٹ حرکت میں نہیں آئی۔ میں بار بار دباتا رہا مگر وہ مطلق متحرک نہ ہو سکی۔ میں نے سمجھا کہ یہ خراب ہے۔ اور ارادہ کیا کہ اس کو چھوڑ کر دوسری لفٹ میں چلا جاؤں۔ اچانک خیال ہوا کہ میں غلط بٹن دبا رہا ہوں۔ نمبر ۹ تو اس منزل کا بٹن تھا جس پر بر وقت میں موجود تھا۔ مجھ کو دراصل صفر (۰) والا بٹن دبانا چاہئے تھا۔ چنانچہ اگلے لمحہ میں نے صفر کا بٹن دبایا تو فوراً لفٹ نے مجھے نیچے پہنچا دیا۔

اس دنیا میں کوئی حقیقی نتیجہ پیدا کرنے کے لئے صرف حرکت کافی نہیں۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ حرکت صحیح ہو۔ غیر صحیح حرکت کبھی اس دنیا میں نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی، خواہ اس کو سیکڑوں سال تک جاری رکھا جائے۔

۲۸ ستمبر کو جمعہ تھا۔ جمعہ کی نماز مسجد مولای محمد میں پڑھی۔ وہاں پہنچ کر مسجد کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا کہ ایک صاحب تیزی سے چلتے ہوئے میری طرف آئے۔ انھوں نے میرے قریب آکر کہا:

یاشیخ ادع لی ولذریتی ... اسمی محمد الحمّال

اصل یہ ہے کہ ہر شخص کی زندگی میں کوئی نہ کوئی گوشہ ایسا ہوتا ہے جہاں وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ جہاں اس کے وسائل اس کو ناکافی نظر آتے ہیں۔ جہاں وہ کسی برتر مدد کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اس جذبہ کا صحیح استعمال اللہ کو پکارنا ہے۔ مگر انسان جب اللہ کو نہیں پاتا تو وہ زندہ یا مردہ انسانوں کو پکارنے لگتا ہے۔

امام صاحب نے طویل خطبہ دیا۔ اس عربی خطبہ میں انھوں نے مختلف باتیں بتائیں۔ مثلاً انھوں نے یہ حدیث سنائی: قلیل العلم خیر من کثیر العبادۃ (تھوڑا علم زیادہ عبادت سے بہتر ہے) اس کی تشریح انھوں نے خالص روایتی اور تقلیدی انداز میں کی۔ اس قسم کی تشریح آج کے انسان کے ذہن کو نہیں جھنجھوڑتی۔ وہ اس کے فکر کا جز نہیں بنتی۔ وہ تقدس اور احترام کے جذبہ کے تحت اس کو سن لیتا ہے، اور اس کے بعد اٹھ کر چلا جاتا ہے۔

اس حدیث میں علم سے مراد عام علم نہیں، بلکہ اس سے مراد دینی شعور یا معرفت حق ہے۔ یہ حدیث دراصل یہ بتاتی ہے کہ اسلام میں اصل اہمیت کی چیز کیا ہے۔ اسلام میں اصل اہمیت کی چیز کیفیت (Quality) ہے۔ مجرد کمیت یا مقدار (Quantity) کی اسلام میں کوئی اہمیت نہیں۔

سبراتہ (Sabratha) دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ ایک تاریخی شہر ہے جو طرابلس کے مغرب میں واقع ہے۔ اس کو قرطاجنہ والوں (Carthaginians) نے تجارتی مرکز کے طور پر چوتھی صدی قبل مسیح میں آباد کیا تھا۔ ۱۴۶ ق م میں یہاں رومی آئے۔ انھوں نے یہاں اپنا مشہور تھیٹر تعمیر کیا جس کے عظیم کھنڈر اب بھی سمندر کے کنارے موجود ہیں۔ عربوں نے اس کو ۶۴۳ء میں فتح کیا۔

یہ تھیٹر وہ مقام ہے جہاں رومی لوگ شاہانہ تفریح کیا کرتے تھے۔ آج اس کے ٹوٹے ہوئے کھنڈر صرف تاریخی عبرت کا سامان بنے ہوئے ہیں۔ شاید اسی طرح کی یادگاروں کے بارہ میں قرآن میں کہا گیا ہے کہ زمین میں چلو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا (الانعام ۱۱)

یہاں کے کچھ حضرات مجھ کو مالٹا لے جانا چاہتے تھے۔ یہ طرابلس اور روم کے درمیان ایک جزیرہ ہے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ وہاں عرب نوجوانوں کا ایک اجتماع کریں اور اسلامی دعوت کے موضوع پر ان سے گفتگو کی جائے۔ مگر وقت کی کمی کی بنا پر میں ان لوگوں کی اس پیش کش کو قبول نہ کر سکا۔ آئندہ کسی موقع پر ان شاء اللہ مالٹا جانے کی کوشش کروں گا۔

کچھ لوگوں نے تیونس جانے کی بھی پیش کش کی۔ وہاں بہت سے عرب نوجوان الرسالہ کے مشن سے متاثر ہیں۔ وہ عربی اور فرانسیسی زبان میں الرسالہ کے مضامین کا ترجمہ شائع کر رہے ہیں۔ مگر اس سفر کے تحت میں تیونس کا پروگرام بھی نہ بنا سکا۔ ان شاء اللہ آئندہ کسی وقت وہاں جانے کی کوشش کروں گا۔ کچھ لوگ دمشق سے آئے تھے، وہ واپسی میں مجھ کو دمشق لے جانا چاہتے تھے۔ مگر میں اس فرمائش کو بھی پورا نہ کر سکا۔

تیونس میں ایک تاریخی شہر ہے جس کا نام سوسہ ہے۔ یہاں تاریخی یادگاریں ہیں جن کو دیکھنے کے لئے یورپ کے سیاح کثرت سے آتے ہیں۔ عبد المنعم محمد الماقوری (۲۱ سال) نے بتایا کہ وہ اگست ۱۹۸۹ میں سوسہ گئے۔ ان کے ساتھ جمعیۃ الدعوۃ کی طرف سے چھپی ہوئی انگریزی اور فرانسیسی

کتابیں (قرآن کا ترجمہ، موریس بکائی کی کتاب، وغیرہ) تھیں۔ وہ ان کتابوں کو یورپی سیاحوں کے درمیان تقسیم کرنے لگے۔ دو دن تقسیم کرنے کے بعد جب وہ تیسرے دن وہاں گئے تو کچھ لوگ ان پر غضب ناک ہو گئے۔ وہ عبدالمنعم باتوری کو مارنے لگے۔

میں نے پوچھا کہ جس وقت وہ لوگ مار رہے تھے، اس وقت آپ کے اندرونی احساسات کیا تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے مار کی کوئی پروا نہیں کی اور اپنے عمل (اسلامی کتابوں کی تقسیم) کو جاری رکھا۔ اور میں اس کو اپنی سعادت سمجھ رہا تھا (لكنني لم ابال بالضرب وواصلت عملي وكنت سعيدا أبذا الك) انھوں نے کچھ یورپی نوجوانوں کو اسلام میں داخل کیا ہے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دعوت کا عمل آدمی کے اندر کس طرح دوسرے تمام عمدہ اوصاف پیدا کر دیتا ہے۔ یہ احساس کہ میرے پاس نجات انسانی کا پیغام ہے اور میں اس کو دوسروں تک پہنچا رہا ہوں، وہ اعلیٰ ترین احساس ہے جس سے اعلیٰ احساس اور کوئی نہیں۔ جن لوگوں کے اندر داعیانہ جذبہ جاگ اٹھے، وہ اسی کے ساتھ خود بخود شریف اور خیر خواہ اور جری اور بہادر اور حوصلہ مند انسان بن جائیں گے۔ حق کو پانے کا احساس ان کو ہر دوسری چیز کو کھونے کے قابل بنا دے گا، خواہ وہ کتنی ہی بڑی چیز کیوں نہ ہو۔

عرب نوجوانوں میں بہت بڑی تعداد میں ایسے لوگ پیدا ہو چکے ہیں جو اسلامی مرکز اور الرسالہ مشن سے بخوبی واقف ہیں۔ چنانچہ وہی سوالات وہاں بھی کئے گئے جو ہندستان میں اس کے بارہ میں کئے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک مجلس میں الجزائر کے ایک نوجوان نے پوچھا کہ آپ باتیں تو بہت صحیح اور اچھی کہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی عملی پروگرام (برنامج) نہیں۔

میں نے کہا کہ وہ چیز جس کو عملی پروگرام کہا جاتا ہے، اس سے زیادہ آسان اور کوئی کام نہیں۔ ہر آدمی جس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ہو، وہ کاغذ پر ایک ایسا نظام مرتب کر کے پیش کر سکتا ہے جو لوگوں کو پروگرام دکھائی دینے لگے۔ مگر حقیقی اسلامی دعوت اس سے زیادہ بڑا کام ہے کہ وہ کسی پروگرام کے اندر سما سکے۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت اور حدیث کی کتابوں میں ہم نہیں دیکھتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کو موجودہ مفہوم میں کوئی پروگرام تلقین کرتے ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ تخریب کے لئے پروگرام بنائے جا سکتے ہیں، لیکن تعمیر کے لئے کوئی لگا بندھا

پروگرام نہیں۔ گہری تعمیر کے کام میں لوگوں کے شعور کو اتنا ابھارنا پڑتا ہے وہ خود حالات کے اعتبار سے پروگرام کی تخلیق کرسکیں۔ ہمارا پروگرام یہ ہے کہ ہم پروگرام ساز انسان تیار کریں (برنامجنا هو اعداد المبرمجين)

ایک مجلس میں میں نے اپنی "غیرعرب عربی" پر معذرت کی۔ ایک تعلیم یافتہ عرب نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ آپ کی عربی، زبان کے اعتبار سے، عربوں جیسی نہیں ہوتی۔ مگر وہ ہم کو زیادہ سمجھ میں آتی ہے۔ کیوں کہ وہ محدّد زبان (Precise language) میں ہوتی ہے۔ جب کہ عام بولنے والوں کا مفہوم ان کی خطابت اور الفاظ کی کثرت میں گم ہوجاتا ہے۔ آدمی ان کی لمبی چوڑی تقریر سن کر اس حال میں اٹھتا ہے کہ اس کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کہنے والے نے کیا کہا۔

اس سفر میں بہت سے عربوں سے اسلامی دعوت کے بارہ میں گفت گو کرنے کا موقع ملا تعلیم یافتہ عرب نوجوانوں کی ایک مجلس میں تقریباً تین گھنٹہ تک گفتگو رہی۔ گفتگو کا موضوع زیادہ تر موجودہ زمانہ میں دعوت کے مسائل اور حکمت دین تھا۔ اس سلسلہ میں میں نے ایک بار کہا: نصف العلم ان تعرف الفرق وبقية نصفه ان تعرف المماثلة۔ یعنی نصف علم یہ ہے کہ آدمی دو چیزوں کے درمیان فرق کو جانے، علم کا بقیہ نصف یہ ہے کہ آدمی دو چیزوں کے درمیان مشابہت کو جانے۔

لوگوں کے مزید سوالات کے درمیان میں نے اس فقرہ کی تفصیلی وضاحت کی۔ میں نے کہا کہ پہلے "فرق" کو جاننے کے معاملہ کو لیجئے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ پچھلے زمانہ میں جو پیغمبر توحید کی دعوت لے کر اٹھے، ان کا اپنے زمانہ کے حکمرانوں سے ٹکراؤ ہوگیا۔ اس بنا پر آج کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی دینی دعوت کے پیغمبرانہ دعوت ہونے کی پہچان یہ ہے کہ وقت کے حکمراں طبقہ کے ساتھ فوراً ہی اس کا ٹکراؤ پیش آجائے۔ اب الرسالہ مشن (یا تبلیغی جماعت) کا چونکہ حکومت سے ٹکراؤ نہیں ہو رہا ہے اس لئے ان کے نزدیک یہ اس کے غیر پیغمبرانہ نہج پر ہونے کی دلیل ہے۔

یہ غلط فہمی "فرق" کو نہ جاننے کی بنا پر ہے۔ قدیم زمانہ کے بادشاہ اپنا حق حکومت مشرکانہ عقائد کے ذریعہ حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ توحید کی دعوت انہیں براہ راست اپنی حاکمانہ حیثیت سے ٹکراتی ہوئی نظر آتی تھی، وہ فوراً توحید کی دعوت کو کچلنے کی کوشش کرتے تھے۔ موجودہ زمانہ

میں جمہوری انقلاب کے نتیجہ میں یہ صورت حال ختم ہو چکی ہے۔ اس بنا پر اب قدیم طرز کے ٹکراؤ کا کوئی سوال نہیں۔ جو لوگ قدیم بادشاہت اور موجودہ حکومت کے فرق کو نہ جانیں وہ اس معاملہ میں صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے۔

اب اس مشابہت کے معاملہ کو لیجئے۔ موجودہ زمانہ کے اسلام پسند لوگ سیکولرزم کو اسلام کا دشمن نظریہ سمجھتے ہیں اور غیر ضروری طور پر اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ عین صلح حدیبیہ کے مثل ایک واقعہ ہے۔ حدیبیہ کا واقعہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے یہ تھا کہ وقت کے اقتدار نے دس سال کے لئے اپنے آپ کو اس کا پابند کر لیا تھا کہ وہ اسلامی دعوت کے مقابلہ میں عدم مداخلت کی پالیسی پر کاربند رہے گا۔ عین یہی موجودہ زمانہ میں سیکولر حکومت کا مطلب بھی ہے۔ موجودہ زمانہ میں جدید افکار کے زیر اثر دنیا کی تمام حکومتوں نے اپنے آپ کو اس کا پابند کیا ہے کہ وہ مذہب کے معاملہ میں عدم مداخلت کا طریقہ اختیار کریں گے۔ اقوام متحدہ کی سطح پر اسی عالمی عہد کا نام "حقوق انسانی کا منشور" ہے۔ یہ صورت حال گویا ابدی صلح حدیبیہ ہے۔ دونوں کے درمیان "حدیبیہ اسپرٹ" مشترک طور پر موجود ہے۔ مگر اس مشابہت کو نہ جاننے کی وجہ سے لوگ اس کے خلاف بھڑک اٹھے۔

ایک مجلس میں کچھ لوگوں نے کہا کہ آپ کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ آپ لوگوں کے اندر غیر جہادی اور غیر انقلابی ذہن بنا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بالکل لغو اور سطحی بات ہے۔ ایسا کہنے والوں نے ابھی تک ہمارے مشن کو نہیں سمجھا۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے نام نہاد اسلامی مفکرین نے اپنی سیاسی تعبیر کے ذریعہ دعوت کا نشانہ بدل دیا ہے۔ انھوں نے انقلاب نظام کو اسلامی دعوت کا نشانہ بنا دیا ہے۔ حالاں کہ انقلابِ انسان اسلامی دعوت کا نشانہ ہے۔ اسی تعبیری فرق کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے دعوتی عمل میں "سیاسی انقلاب" بطور نشانہ حذف ہے، دوسری طرف ان کے دعوتی عمل میں توجہ الی اللہ بطور نشانہ حذف ہے۔

اب جو لوگ سیاست رخی تعبیر سے متاثر ہیں، وہ ہمارے معاملہ کو سمجھ نہیں پاتے اور ہمارے اوپر غیر انقلابی ہونے کا الزام دینے لگتے ہیں۔ مگر یہ غلط فہمی قرآن کے زیر تاثر نہیں بنی ہے بلکہ بعض لوگوں کی سیاسی تعبیر دین کے زیر تاثر بنی ہے۔ ایسی حالت میں ہمیں ان الزامات سے غیر متاثر

رہ کر اپنا کام جاری رکھنا ہے۔ انشاءاللہ لوگوں کی یہ بے جا بدگمانیاں اپنے آپ ختم ہو جائیں گی۔

ایک تعلیم یافتہ عرب نوجوان نے کہا کہ میں نے آپ کی تمام عربی کتابیں پڑھی ہیں۔ میں نے پوچھا کہ ان کتابوں کے پڑھنے سے آپ پر کیا اثر ہوا۔ انھوں نے کہا کہ ان کتابوں نے مجھ کو نہایت اونچے مقام تک پہنچا دیا (انھا رفعتنی الیٰ مقام عظیم)

ایک عرب نوجوان نے کہا کہ میں ایک کمپنی میں کام کرتا ہوں جس میں بڑی تعداد میں غیر مسلم یوروپین موجود ہیں۔ میں ان کو آپ کی انگریزی کتابیں پڑھا رہا ہوں۔ ایک مسیحی خاتون جو مذکورہ کمپنی میں سکریٹری کے درجہ پر ہیں۔ ان کو "پرافٹ آف ریولیوشن" انھوں نے پڑھنے کے لئے دی۔ اس کو پڑھ کر خاتون نے جو کچھ کہا وہ عرب نوجوان کے الفاظ میں یہ تھا کہ میں نے جو کتابیں پڑھی ہیں، ان میں یہ بہترین کتاب ہے (انہ احسن کتاب قرأتہ)

ایک مجلس میں ایک عرب نوجوان نے دعوت کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ تکمیلی اعتبار سے اسلامی دعوت کے چار مراحل ہیں۔ اعلان، ہجرت، جہاد، حکومت۔ میں نے کہا کہ اسلامی دعوت کی یہ تعبیر صحیح نہیں۔ صحیح تعبیر وہ ہوتی ہے جو دوسرے متعلق حقائق سے نہ ٹکرائے، جب کہ یہ تعبیر دوسری معلوم حقیقتوں سے ٹکرا رہی ہے۔ مثلاً ہمارے عقیدہ کے مطابق، تمام انبیاء کامل معنوں میں داعی تھے۔ مگر اس تعبیر میں بیشتر انبیاء ناقص داعی قرار پاتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی دعوت ان چاروں مراحل سے نہیں گزری۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا نے پیغمبر کی مخاطب امتوں کو جو عذاب دیا وہ عین عدل تھا۔ مگر اس تعبیر میں وہ غیر عادلانہ قرار پاتا ہے۔ کیوں کہ اس کے مطابق بیشتر مثالوں میں خدا نے ان قوموں کو قبل از وقت عذاب دے دیا۔

اصل یہ ہے، کہ دعوت تمام تر اعلان ہی کا نام ہے۔ البتہ اعلان کے شرائط ہیں مثلاً مدعو کے لئے خیر خواہ ہونا، اس کی ایذاء پر صبر کرنا، اس کی سرکشی کے باوجود مسلسل اس کو پکارتے رہنا۔ اس کی اپنی لغت میں دعوت کو اس کے لئے قابل فہم بنانا، مدعو سے اجر دنیوی کا طالب نہ ہونا وغیرہ۔ اسی کا نام دعوت ہے۔ اس کے بعد ہجرت یا جہاد، یا قتال یا حکومت جیسے واقعات جو کبھی پیش آتے ہیں اور کبھی پیش نہیں آتے، وہ سب تاریخ کے مراحل ہیں نہ کہ دعوت کے مراحل۔

ایک مجلس میں موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں کا ذکر آیا۔ پھر یہ سوال ہوا کہ یہ تمام تحریکیں اپنے

مقصد میں ناکام کیوں ہوگئیں۔ایک صاحب ان رکاوٹوں کی فہرست بتانے لگے جنھوں نے ان اسلامی تحریکوں کو ناکام کر دیا۔ میں نے کہا کہ یہ سوچ صحیح نہیں۔اس دنیا میں تو لازماً یہی ہونا ہے کہ یہاں رکاوٹیں پیش آئیں۔ ہمیں رکاوٹوں کے باوجود اپنے مقصد کو حاصل کرنا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ایک مستشرق کے الفاظ میں، آپ نے رکاوٹوں کو اپنے لئے زینہ بنالیا۔حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام تحریکیں صرف اس لئے ناکام ہوگئیں کہ وہ رکاوٹوں یا ڈس ایڈوانٹج کو اپنے لئے ایڈوانٹج نہ بنا سکیں (ھذہ الحرکات الاسلامیہ کلھا فشلت بسبب واحد۔ انہا لم تستطع ان تستغل الموانع لھم کفرص)

ایک عرب نوجوان مختار احمد (۲۶ سال) سے ملاقات ہوئی۔وہ اس سے پہلے سیاسی اسلامی جماعتوں سے متاثر تھے۔ان کے دماغ میں مار دھاڑ والا اسلام بسا ہوا تھا۔انھوں نے کہا کہ اس کے بعد آپ کی عربی کتابیں پڑھنے کو ملیں۔ان کو پڑھنے کے بعد میرا ذہن بالکل بدل گیا۔ان کو پڑھ کر میرے دماغ کا بوجھ اتر گیا۔اب میں اپنے ماضی اور حال کو سوچتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کہ میں قید خانے سے باہر آگیا ہوں (کانی خرجتُ من السجن)

عرب ممالک میں بہت بڑا دعوتی موقع پٹرو ڈالر کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔آجکل کثرت سے بیرونی ملکوں کے غیر مسلم ماہرین اور کارکن عرب ملکوں میں کام کر رہے ہیں۔ان کے درمیان آسانی کے ساتھ دعوتی کام کیا جا سکتا ہے۔

ایسے کئی عرب نوجوان ملے جو اس دعوتی امکان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔محمد المجانی (۳۰ سال) نے بتایا کہ وہ جس کمپنی میں کام کرتے ہیں، اس میں ایک برطانی اکسپرٹ ہے جس کا نام برائن کوپنگ (Brain Copping) ہے۔محمد المجانی نے اس برطانی مسیحی کو گاڈ ارائزز اور دوسری کتابیں پڑھنے کے لئے دیں۔اس کے بعد اس کا تاثر پوچھا۔سوال سن کر وہ کچھ دیر خاموش رہا۔اس کے بعد بولا: جو کچھ اس میں لکھا ہے وہ بالکل حق ہے۔اس نے مزید کہا کہ مجھے برطانیہ کا کوئی شخص نہیں معلوم جو اتنی طاقت کے ساتھ خدا اور مذہب کے اثبات پر کتاب لکھ سکے۔

طارق الکردی (۲۷ سال) ایک عرب نوجوان ہیں۔ وہ الجزائر میں تھے۔ وہاں انھوں نے آئرلینڈ کی ایک عیسائی لڑکی سے شادی کر لی۔اس کا نام گرالڈین (Geraldine Sheehen) ہے۔

شادی کے بعد وہ برابر اس کو ترغیب دیتے رہے کہ وہ اسلام قبول کر لے۔ مگر وہ راضی نہ ہو سکی۔ حتی کہ اسلام سے نفرت کا اظہار کرتی رہی۔

۲۷ ستمبر کو ایک ملاقات میں طارق الکردی نے بتایا کہ پہلے میں اسلام کو اس کے سامنے فقہی اور تقلیدی انداز میں پیش کرتا تھا۔ اس کے بعد مجھے انگریزی الرسالہ ملا۔ میں نے اس کو انگریزی الرسالہ کے کچھ شمارے پڑھائے۔ ان کا بیان ہے کہ جب میں نے اس کو انگریزی الرسالہ پڑھایا تو اس کو پڑھ کر وہ رو پڑی (فبکت) اب اسلام اس کو عین فطرت کا دین نظر آیا۔ اس نے پوری رضامندی کے ساتھ اسلام قبول کر لیا اور کہا:

I feel I knew this before. It's not a new thing for me.

مذکورہ خاتون کو تعدد ازواج کے مسئلہ پر سخت اعتراض تھا۔ طارق الکردی نے اس کو انگریزی الرسالہ (اگست ۱۹۸۹) پڑھنے کے لئے دیا۔ اس کو پڑھ کر خاتون نے کہا کہ اب میں نے اسلام کے اس مسئلہ کو مان لیا۔ اب مجھے اسلام کے بارہ میں کوئی شک نہیں۔

۲۸ ستمبر کو دوپہر کا کھانا "ذات العماد" میں تھا۔ کھانے کی میز پر میرے علاوہ تین عرب تھے۔ ایک عرب بزرگ نے اپنی گفتگو کا آغاز اس عربی مثل سے کیا: ان کان الکلام من الفضة فالسکوت من الذهب (بولنا اگر چاندی ہے تو چپ رہنا سونا ہے) اس کے بعد انھوں نے بولنا شروع کیا تو وہ مسلسل بولتے رہے۔

کافی دیر تک وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ آخر میں میں نے ان سے کہا: یا اخی اتحبُّ الذهب ام الفضة (آپ سونا پسند کرتے ہیں یا چاندی) انھوں نے ایک لمحہ سوچا۔ اس کے بعد سنجیدگی کے ساتھ بولے: اُفَضِّلُ الذهب ولکن عندی الفضة (میں سونے کو اچھا سمجھتا ہوں، مگر میرے پاس چاندی ہے)

یہ عربوں کی ممتاز خصوصیت ہے کہ وہ فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ مگر یہی بات ہندستان اور پاکستان میں تقریباً معدوم کے درجہ میں ہے۔ یہاں ہر آدمی اسلام کے نام پر بے تکان بول رہا ہوگا۔ لیکن اس کی کسی کمزوری یا غلطی کی طرف توجہ دلایئے تو وہ کبھی اس کا اعتراف نہیں کرے گا، خواہ

اس کو کتنے ہی طاقت ور دلائل سے ثابت کر دیا گیا ہو۔

۲۹ ستمبر ۱۹۸۹ کو طرابلس سے پی آئی اے کی فلائٹ ۱۴ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں جہاز ایک بار نیچے اوپر ہونے لگا۔ ہوائی جہاز کے ساتھ جب یہ صورت پیش آتی ہے تو اکثر وہ دو ہزار فٹ تک نیچے چلا جاتا ہے۔ مگر بلندی پر اڑتے ہوئے مسافر کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ۱۰۔۲۰ فٹ نیچے اوپر ہو رہا ہے۔ ہوائی جہاز جب ۳۰ ہزار فٹ کی اونچائی پر پہنچ جاتا ہے تو وہ اسی طرح ہلکا ہو جاتا ہے جیسے کوئی آدمی پانی پر تیرتے ہوئے اپنے آپ کو ہلکا محسوس کرتا ہے۔ اس ہلکے پن کی وجہ سے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ جہاز دو ہزار فٹ کے بقدر نیچے اوپر ہو رہا ہے۔

جہاز جب اس طرح ہلتا ہے اور جھٹکے کے ساتھ نیچے اوپر ہوتا ہے تو عام مسافر اس کو دیکھ کر گھبرا اٹھتے ہیں۔ مگر یہ کوئی خطرہ کی بات نہیں۔ کم از کم ہوابازی کی تاریخ میں اب تک صرف اس کی وجہ سے کوئی جہاز حادثہ کا شکار نہیں ہوا۔

واپسی کے سفر میں ہماری پہلی منزل دمشق تھی۔ جہاز دمشق کے ہوائی اڈہ پر اترا تو اس "قدیم ترین شہر" کی نسبت سے بہت سی یادیں تازہ ہو گئیں۔

"دمشق" کے نام کے ساتھ اتنی زیادہ یادیں وابستہ ہیں کہ ان کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ مکہ اور مدینہ کے بعد اصحاب رسول کی سب سے زیادہ تعداد جہاں مدفون ہے وہ شام، خاص طور پر دمشق ہے۔ اس کے علاوہ علماء اسلام اور مختلف قسم کی اسلامی شخصیتوں کی بہت بڑی تعداد یہاں مدفون ہے۔

دمشق نے اپنی تاریخ کے طویل دور میں بڑے عجیب عجیب منظر دیکھے ہیں۔ قدیم عہد کو چھوڑ کر دیکھا جائے تو حضرت حسین کا سر کاٹ کر اسی دمشق میں یزید کے پاس لایا گیا۔ فتح اسپین (۷۱۱ء) کے چار سال بعد موسیٰ بن نُصیر دمشق واپس آئے تو ان کے ساتھ تقریباً ۴۰۰ کی تعداد میں اسپینی شہزادے تھے جن کے سروں پر تاج تھے اور کمر میں سونے کے پٹکے بندھے ہوئے تھے۔ دمشق اُس قدیم تقریباً پانچ سو سالہ مسلم عہد کی یاد دلاتا ہے جب کہ دمشق سے لے کر فرانس کی سرحد تک عثمانی ترکوں کی حکومت قائم تھی، وغیرہ وغیرہ۔

جدید فلسطینی تحریک کے ایک لیڈر خلیل الوزیر تھے۔ ان کو عام طور پر ابو جہاد کہا جاتا تھا۔ وہ

فلسطین میں پیدا ہوئے۔ آخری دنوں میں وہ پی ایل او کے فوجی کمانڈر کی حیثیت سے تیونس میں مقیم تھے۔ ان کی تدفین دمشق میں ہوئی۔

ابوجہاد اپنی خطرناک سرگرمیوں کی وجہ سے اسرائیل کے لئے دردسر بنے ہوئے تھے۔ وہ اسرائیل کے خلاف فلسطینیوں کی گوریلا جنگ کے کمانڈر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مارچ ۱۹۷۸ میں انھیں کے منصوبہ کے مطابق ایک اسرائیلی سڑک سے ایک بس کا اغوا کیا گیا تھا اور اس کے ۳۵ یہودی مسافر قتل کردئے گئے تھے۔

اس طرح کے مختلف واقعات کی بنا پر اسرائیل کے حکمراں ابوجہاد سے بگڑے ہوئے تھے۔ آخرکار ایک نہایت منظم منصوبہ کے تحت ۱۶ اپریل ۱۹۸۸ کو انھیں قتل کر دیا گیا۔ اس خفیہ منصوبہ کی تفصیل امریکی ہفتہ وار ٹائم ۲۵ اپریل ۱۹۸۸ اور ۲ مئی ۱۹۸۸ میں شائع ہوئی ہے۔ ٹائم (۲ مئی ۱۹۸۸) کے مطابق اسرائیلی پارلیمنٹ کے ایک ممبر یوسی سرید (Yoshi Sarid) نے کہا کہ ایک کے بعد ایک ابوجہاد ختم کئے جاسکتے ہیں مگر یہ چیز فلسطینی مسئلہ کو ختم نہیں کرسکتی:

> Abu after Abu can be liquidated. But this will not liquidate the Palestinian problem (p.17).

ہندستان کے وزیر اعظم راجیو گاندھی نے جون ۱۹۸۸ کے پہلے ہفتہ میں شام کا دورہ کیا تھا۔ دمشق میں انھوں نے ۴ جون ۱۹۸۸ کو ایک تقریر کی۔ اس تقریر میں انھوں نے دمشق کی خصوصیت بتاتے ہوئے کہا کہ محمد بن قاسم یہاں سے روانہ ہو کر ہندستان پہنچے تاکہ وہاں اسلام کے پیغام کو پھیلائیں:

> Mohammad bin Qasim set sail from here to India to spread the message of Islam.

راجیو گاندھی کے اس بیان پر ہندستان کے کچھ فرقہ پرستوں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا تھا دہلی کے انگریزی ہفت روزہ آرگنائزر (۱۹ جون ۱۹۸۸) نے لکھا تھا کہ راجیو گاندھی اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے ایسا کہہ رہے ہیں۔ ورنہ محمد بن قاسم ہندستان میں اسلام کی اشاعت کے لئے نہیں آیا۔ وہ قتل اور لوٹ اور زناکاری کے لئے یہاں آیا تھا (صفحہ ۱۶)۔ یہی بات ہندو مہاسبھا کے

صدر جَینت پاٹل نے اپنے ایک مراسلہ میں کہی جو ٹائمس آف انڈیا (۲۰ جون ۱۹۸۸) میں چھپا تھا۔

مسٹر جَینت پاٹل نے اپنے دعوے کی تائید میں مورخ بلاذری کا حوالہ دیا تھا۔ مگر یہ حوالہ سراسر غلط ہے۔ احمد بن یحییٰ البلاذری (م ۸۹۲ء) کی کتاب فتوح البلدان میں اس قسم کی کوئی بات موجود نہیں۔ بلکہ اس کتاب میں محمد بن القاسم کی تصویر اس سے یکسر مختلف نظر آتی ہے جو مذکورہ مضامین میں اس کی بتائی گئی تھی۔

عربوں نے سندھ کو آٹھویں صدی عیسوی (۷۱۲ء) میں فتح کیا تھا۔ اور البلاذری کا زمانہ نویں صدی عیسوی ہے۔ اس طرح وہ ایک قریب العہد مورخ ہے۔ البلاذری نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں ایک بات یہ ہے کہ دمشق میں اندرونی سازشوں کی وجہ سے نوجوان محمد بن القاسم کو دمشق واپس بلا لیا گیا جہاں اس کو قید کر دیا گیا۔ تاہم سندھ میں وہ نہایت نیک نام تھا۔ چنانچہ سندھ کے مقامی باشندوں کے ردعمل کا ذکر کرتے ہوئے البلاذری نے لکھا ہے کہ ان کو جب اس کی خبر ملی تو ہندستان کے لوگ روئے اور انھوں نے کیرج کے مقام پر محمد بن القاسم کا بت بنایا (فبکیٰ اهلُ الهندِ وصَوَّروه بالكيرَج، صفحہ ۴۴۶)

محمد بن القاسم کا کردار اگر وہ ہوتا جو ہندو مہاسبھا کے صدر یا آرگنائزر کے مضمون نگار بتا رہے ہیں تو یہ ناممکن تھا کہ اہل سندھ کے درمیان اس کو یہ محبوبیت اور مقبولیت حاصل ہو کہ وہ اس کے سندھ سے جانے کے بعد اس کا ماتم کریں، حتیٰ کہ اس کا بت بنائیں اور اس کے سامنے غیر معمولی عقیدت واحترام کا اظہار کریں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ - ۱۹۷۹) نے ۱۹۵۹ کے آخر میں بعض عرب ممالک کا دورہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں وہ شام (دمشق) میں بھی چند دن ٹھہرے۔ اس سفر کی روداد مولانا موصوف کے رفیق سفر مولانا محمد عاصم صاحب نے مرتب کی ہے جو "سفر نامہ ارض القرآن" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کا ایک اقتباس یہ ہے:

"مولانا ان کے سوالات کا اطمینان اور تفصیل سے جواب دیتے رہے۔ ہندستان کے مسلمانوں کے متعلق مولانا نے بتایا کہ ان کی حالت ویسی ہی ہے جیسے اسرائیل میں عربوں کی۔ یہ مختصر جواب نہایت موثر رہا۔ اس مثال کے بغیر اگر ہندستان میں مسلمانوں کی حالت کے متعلق کوئی مفصل تقریر بھی کی جاتی

تو شاید وہ اتنی موثر نہ ہوتی" صفحہ ۳۳

سید ابو الاعلیٰ مودودی کا یہ جواب غیر ذمہ دارانہ حد تک غلط ہے۔ مزید غیر ذمہ داری کی بات مولانا موصوف کے رفیق کا یہ جملہ ہے کہ "یہ جواب نہایت موثر رہا" گویا مسئلہ سنجیدہ حقیقت بیانی کا نہیں بلکہ مجلسی اثر آفرینی کا ہے۔ کیسی عجیب ہے یہ بات۔

جواب کے اس انداز کو میں حد درجہ غیر اسلامی اور غیر اخلاقی سمجھتا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کو بعض مسائل درپیش ہیں۔ مگر وہ کونسا ملک ہے جہاں کسی نہ کسی قسم کے مسائل درپیش نہ ہوں۔ پھر ہندستان ہی کو ان مسائل کے لئے مطعون کرنا کس طرح درست ہوسکتا ہے۔

مارچ ۱۹۸۴ کا واقعہ ہے۔ اس وقت میں ایک عرب ملک میں تھا۔ ایک عرب شیخ نے اپنے مکان پر دعوت کا اہتمام کیا۔ بہت سے لوگ مدعو تھے۔ یہاں میری ملاقات ہندستان کے ایک اسلام پسند رہنما سے ہوئی۔ ایک عرب شیخ سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہندستان میں تو مسلمانوں کو مسجد کے اندر بھی سجدہ کرنے کی اجازت نہیں۔

میں نے آہستہ سے پوچھا : حضرت، آپ کس ہندستان کی بات کر رہے ہیں۔ وہی ہندستان جہاں میں رہتا ہوں یا کوئی اور۔ انھوں نے فوراً صفدر جنگ (دہلی) کی مسجد کا نام لیا۔ میں نے کہا، پھر مطلق انداز میں ممانعتِ سجدہ کی بات کیوں کر رہے ہیں۔ آپ کو کہنا چاہئے کہ ہندستان میں لاکھوں مسجدیں ہیں جن میں مسلمانوں کو نماز کی آزادی ہے۔ البتہ ایک مسجد (صفدر جنگ) میں انھیں یہ آزادی حاصل نہیں جو بہت پہلے سے آثار قدیمہ کے ماتحت ہے۔

دمشق سے جہاز پر ۱۸۰ مسافر سوار ہوئے۔ یہ سب "زیارت" کے لوگ تھے۔ وہ پاکستان سے دمشق اور بغداد برائے زیارت گئے۔ وہاں حضرت زینب، حضرت حسین وغیرہ کے مزارات ہیں۔ اب وہ پاکستان واپس جارہے تھے۔

میرے پاس کی سیٹ پر ایک صاحب آکر بیٹھ گئے۔ ان کا نام محمد عباس کاظمی تھا۔ وہ لاہور میں کتابوں کی دکان کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ میں وہ لاہور چلے آئے۔ ان کے بال سفید ہوچکے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے دونوں زمانوں کو دیکھا ہے۔ یہ بتائیے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے والی زندگی میں اور موجودہ پاکستان کی زندگی میں کیا فرق ہے۔ انھوں نے

درد مندانہ لہجہ میں کہاکہ بس یہ فرق ہے کہ پہلے ملک میں ہندو مسلم جھگڑے ہوا کرتے تھے، اب ہمارے یہاں شیعہ سنی جھگڑے ہوتے ہیں۔

"زیارت" سے لوٹنے والے یہ تمام لوگ شیعہ تھے۔ ان میں زیادہ تر عورتیں تھیں۔ میں نے محمد عباس کاظمی صاحب سے پوچھا کہ اس سفر میں فی کس کتنا خرچ آیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ فی کس ۱۶ ہزار روپیہ۔ ۱۸۰ آدمی ہمارے جہاز میں دمشق سے سوار ہوئے۔ مگر اس سے زیادہ تعداد ابھی دمشق اور بغداد میں موجود تھی۔ یہ لوگ جہاز کے اندر بار بار نعرہ لگا رہے تھے ــــ نعرۂ تکبیر، نعرۂ رسالت، نعرۂ حیدری۔ نعرہ دینے والا پہلے دونوں الفاظ نسبتاً دھیرے بولتا تھا۔ مگر جب وہ "نعرۂ حیدری" بولتا تو اس کی آواز غیر معمولی طور پر تیز ہو جاتی۔

جہاز کے اندر پی آئی اے کی فلائٹ میگزین "مسافر" ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۸۹ مطالعہ کے لئے موجود تھی۔ اس کے انگریزی حصہ میں پی آئی اے کے بارہ میں ایک مضمون تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ پی آئی اے ۱۹۵۴ میں قائم ہوئی۔ اس دوران اس نے کیا ترقی کی اور آئندہ اس کے کیا منصوبے ہیں، اس ذیل میں یہ نقرہ درج تھا کہ جمہوریت کے احیاء کی وجہ سے ملک مسکراہٹوں سے بھرا ہوا ہے اور پی آئی اے بھی ترقیاتی پرواز کے لئے اپنے بازو پھیلا رہی ہے:

> Since the revival of democracy, the country is full of smiles, and PIA too is flexing its wings (p. 29).

دوسری طرف جہاز کے اندر اردو اخبارات تھے۔ ان میں اپوزیشن لیڈروں کے بیانات ملک کے بارہ میں اس سے مختلف کہانی سنا رہے تھے ــــ موجودہ دنیا میں کوئی زندگی کبھی آئیڈیل نہیں ہوتی۔ کوئی شخص زندگی کو مثبت رخ سے دیکھتا ہے تو اس کو زندگی امکانات سے بھری ہوئی نظر آتی ہے۔ دوسرا شخص اس کو منفی رخ سے دیکھتا ہے تو اس کو نظر آتا ہے کہ زندگی مصائب اور مشکلات کے سوا اور کچھ نہیں۔

۳۰ ستمبر ۱۹۸۹ کی صبح کو کراچی پہنچا۔ میں نے دہلی سے یہاں کا ویزا لے لیا تھا۔ چنانچہ کراچی میں ۱۲ گھنٹے قیام رہا۔ کراچی میں میرا قیام "فضلی سنز لمٹڈ" کے یہاں تھا۔ وہ لوگ گلشن اقبال (123-D) میں رہتے ہیں۔

جہاز سے اتر کر ایرپورٹ کی بس پر سوار ہوا تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ بس میں زیادہ تر مسافر پاکستان (کراچی) کے تھے۔ زیادہ عمر کے ایک بزرگ اندر داخل ہو کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ایک شخص نے ان کو دیکھ لیا اور اپنی طرف بلاتے ہوئے کہا کہ آئیے، یہاں بیٹھ جائیے۔ وہ بدستور کھڑے رہے اور کہا: میاں، بیٹھنے کا وقت کہاں، اب تو لیٹنے کا وقت ہے۔

ان کی زبان سے یہ فقرہ سن کر دل تڑپ اٹھا۔ مجھے اپنا معاملہ یاد آگیا۔ میری عمر اب ۷۵ سال ہو چکی ہے۔ بڑھاپا اپنی تمام علامتوں کے ساتھ آنا شروع ہو گیا ہے۔ اب وہ وقت قریب آگیا ہے جب کہ دنیا کی سیٹ پر بیٹھنے کے بجائے مجھے قبر کے تختہ پر لٹا دیا جائے۔

یہ دن ہر شخص کے لئے مقدر ہے۔ ہر شخص کے ساتھ ایسا ہونے والا ہے کہ اس کی موت آجائے۔ اس کو "اپنی دنیا" سے نکال کر "خدا کی دنیا" میں داخل کر دیا جائے۔ کتنا سنگین لمحہ ہر شخص پر آنے والا ہے۔ مگر ہر شخص کتنا زیادہ اس سے غافل پڑا ہوا ہے۔

ڈاکٹر خالد انعام اللہ صاحب بھی اسی جہاز سے اترے تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اکثر سفر میں رہتے ہیں اور بے شمار کانفرنسوں میں شرکت کی ہے۔ ان کے ساتھ ان کے محترم والد ڈاکٹر انعام اللہ خاں (۷۵ سال) کے مکان پر آیا۔ یہاں تقریباً آدھ گھنٹہ قیام رہا۔

ڈاکٹر انعام اللہ خاں صاحب موتمر العالم الاسلامی کے سکریٹری جنرل ہیں۔ اس کو مولانا محمد علی وغیرہ نے قائم کیا تھا۔ ۱۹۲۴ میں جب خلافت تحریک سیاسی حیثیت سے ختم ہو گئی تو مولانا محمد علی وغیرہ کے سامنے سوال آیا کہ "اب کیا"۔ حکومتی سطح پر خلافت کا نظام قائم کرنے کے مواقع نہیں تھے۔ چنانچہ انھوں نے "ادارہ" کی سطح پر اس کام کو جاری رکھنے کے لئے ۱۹۲۶ میں مذکورہ موتمر قائم کی۔ اس کے پہلے صدر مفتی اعظم فلسطین اور نائب صدر علامہ اقبال تھے۔

ڈاکٹر انعام اللہ خاں صاحب نے اپنے والد حاجی عبدالکریم خاں غازیپوری (وفات ۱۹۶۴) کے بارہ میں بتایا کہ وہ نہایت نیک نفس آدمی تھے۔ اپنے ملازموں کو جاہل دیکھنا انھیں گوارا نہ تھا۔ چنانچہ وہ خود انھیں پڑھایا کرتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ لوگوں کو کھلانے پلانے میں کوتاہی نہ کرو، اور جو کچھ تمہارے گھر میں موجود ہے بس وہی پیش کر دو، کیوں کہ جو تمہارے کھانے کے قابل ہے، وہ تمہارے مہمان کے کھانے کے قابل بھی ہے۔

حافظ عبد الکریم صاحب کا ایک خاص نظریہ تھا جس کو وہ "تطہیر فکر اول" کے لفظوں میں بیان کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ عمل ہمیشہ فکر کے تحت ہوتا ہے۔ فکر اگر صحیح نہ ہوگا تو عمل بھی صحیح نہ ہوگا۔ میں نے کہا کہ یہی جڑ کی بات ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہماری تمام تحریکیں ناکام ہوگئیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ ان کے رہنماؤں نے تطہیر فکر کا اول کام کئے بغیر عملی اقدام کے ثانوی کام سے اپنے سفر کا آغاز کرنا چاہا۔ ایسی تحریک کے لئے موجودہ اسباب کی دنیا میں ناکامی کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں ——— خلافت تحریک کی ناکامی کا سبب بھی یہی ہے۔

"پاکستان ابھی تک پاکستان نہ بن سکا" ایک "اسلام پسند" پاکستانی نے کہا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان اس لئے بنا تھا کہ وہاں اسلامی نظام قائم کیا جائے، مگر ابھی تک پاکستان میں اسلامی نظام قائم نہ کیا جا سکا۔ اگر آپ پاکستان جائیں یا پاکستان کے اخبارات پڑھیں تو یہ بات آپ کو بے شمار لوگوں کی زبان سے سنائی دے گی۔

وہ کون ہے جس نے نصف صدی گزرنے کے باوجود ابھی تک پاکستان کو پاکستان بننے نہیں دیا۔ اس کے جواب میں لوگ مختلف طاقتوں یا شخصیتوں کا نام لیں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس المیہ کے سب سے بڑے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جو پاکستان کے وجود میں آتے ہی "مطالبہ نظام اسلامی" کا جھنڈا لے کر کھڑے ہوگئے۔

۱۹۴۷ میں جو چیز وجود میں آئی وہ صرف ایک جغرافی خطہ تھا۔ اس جغرافی خطہ میں وہ مسلم معاشرہ موجود نہ تھا جو اسلامی نظام کے قیام کا تحمل کر سکے۔ یہاں "اسلام پسند" لوگوں کو صرف یہ کرنا تھا کہ وہ افراد کی ایمانی بیداری اور معاشرہ کی دینی اور اخلاقی اصلاح میں لگ جاتے۔ سیاست کو وہ کچھ عرصہ کے لئے اپنے حال پر چھوڑ دیتے۔ یعنی الکشن میں جو لوگ ووٹوں کی اکثریت حاصل کرتے انھیں موقع دیا جاتا کہ وہ حکومت کریں۔ ایک طرف انفرادی سطح پر اصلاح کا عمل چلتا رہتا اور دوسری طرف الکشن پروسس اپنی فطری رفتار سے جاری رہتا۔ اگر ایسا کیا گیا ہوتا تو اب تک یقینی طور پر وہ منزل آجاتی جو مطالباتی اسلام کے نتیجہ میں مزید دور ہوتی ہوئی نظر آرہی ہے۔

کراچی پاکستان کا سب سے بڑا شہر اور پاکستان کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ وہ بحر

عرب کے کنارہ واقع ہے۔ ۱۸ویں صدی کے آغاز میں کراچی صرف ایک معمولی گاؤں تھا۔ یہاں زیادہ تر مچھیرے رہتے تھے۔ ۱۸۳۹ میں انگریزوں نے اس پر قبضہ کیا۔ یہ قبضہ بے حد اہم تھا۔ یہ واقعہ آخری مغل حکمراں بہادر شاہ ثانی کے زمانہ حکومت (۱۸۵۷-۱۸۳۷) میں ہوا۔ اس وقت ہندستان میں بہت سے علماء اور مصلحین موجود تھے۔ مگر مطبوعہ ریکارڈ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ ان میں سے کوئی شخص "کراچی" کی اہمیت کو جانتا ہو۔ کراچی کی اہمیت کو جاننے کے لئے سمندری شعور درکار تھا، اور اس وقت مسلم زعماء میں سے ہر ایک صرف "سیاسی طاقت" کو جانتا تھا، ان میں سے کسی کو "سمندری طاقت" کی خبر نہ تھی۔ بدقسمتی سے یہی صورت حال ظاہری فرق کے ساتھ آج بھی باقی ہے۔

انگریزوں نے کراچی پر قبضہ کرکے وہاں اپنی فوجیں رکھ دیں۔ ۱۸۴۳ میں انھوں نے کراچی اور ملتان کے درمیان دریائے سندھ کے راستہ سے پہلی اسٹیمر سروس شروع کی۔ اب کراچی بندرگاہ کی حیثیت سے ترقی کرنے لگا۔ ۱۸۶۴ میں کراچی سے لندن کے لئے براہ راست ٹیلی گراف کا نظام قائم کیا گیا۔ ۱۸۶۹ میں نہر سوئز کھلنے کے بعد کراچی کی اہمیت مزید بڑھی۔ ۱۸۷۳ تک کراچی ایک مکمل بندرگاہ بن چکا تھا۔ ۱۸۷۸ میں یہاں ریلوے لائن بچھائی گئی۔ ۱۹۱۴ میں کراچی پوری برطانی شہنشاہیت میں گیہوں برآمد کرنے کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ ۱۹۲۴ میں یہاں ایک ہوائی اڈہ بنایا گیا جو اب توسیع کے بعد انٹرنیشنل ایرپورٹ کی حیثیت حاصل کرچکا ہے۔ ۱۹۴۷ سے ۱۹۵۹ تک وہ پاکستان کی پہلی راجدھانی تھا۔

سندھ میں توڑ پھوڑ کی سیاست لامتناہی طور پر جاری ہے۔ اس سیاست کے نتیجہ میں کچھ لیڈروں کو شہرت اور مقبولیت مل رہی ہے۔ مگر خود سندھ اور اس کے عوام تیزی سے بدحالی کی طرف جا رہے ہیں۔ اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ تاجر طبقہ (ملکی اور غیر ملکی دونوں) سندھ میں اپنا کاروبار سمیٹ رہا ہے اور پنجاب کی طرف اپنا رخ کرنے لگا ہے۔ آج ۳۰ ستمبر ۱۹۸۹ کے اخبار جنگ میں ایک اڈیٹوریل نوٹ (سندھ سے سرمایہ کاروں کی نقل مکانی) نظر سے گزرا۔ اس کے تحت درج تھا:

" ایک اخباری اطلاع میں بتایا گیا ہے کہ سندھ میں ڈکیتی اور اغوا کے واقعات میں اضافے

کے بعد وہاں کے بالخصوص کراچی کے سرمایہ کاروں نے پنجاب کی طرف نقل مکانی شروع کردی ہے اور اب سندھ کے بجائے پنجاب میں نئے صنعتی یونٹ لگانے کے لئے قومی بینکوں اور مالیاتی اداروں سے رجوع کرنے کا آغاز کر دیا ہے اور پنجاب کے بڑے شہروں کے قرب وجوار میں اپنے عزیز و اقارب کے توسط سے صنعتی یونٹ لگانے اور دیگر کاروبار کرنے کے لئے آراضی کی خرید میں مصروف ہیں۔ سرمائے کی گردش اور سرمایہ کاری صرف پرامن فضا میں ہی ممکن ہوتی ہے اور سرمائے کی منڈی اتنی حساس ہوتی ہے کہ محض ایک افواہ ہی اس کے کونے کونے تک ہلچل مچا کر رکھ دیتی ہے، صوبہ سندھ میں ایک عرصے سے اغوا و ڈکیتیوں کے جو واقعات رونما ہوئے ہیں وہ یقیناً سرمایہ کاری کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے والے ہیں اور اس بات کا امکان ہے کہ اس سے سرمایہ کاروں میں نقل مکانی کا رجحان پیدا ہوا ہو۔"

ایک پاکستانی مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ خلیج کے ایک ملک میں کچھ دنوں رہ چکے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک روز وہ وہاں کے پوسٹ آفس میں ایک خط کی رجسٹری کرنے گئے۔ لفافہ پر انھوں نے ہندستانی قاعدہ کے مطابق، بھیجنے والے کا پتہ لفافہ کے نیچے بائیں طرف لکھا تھا۔ جب کہ خلیجی قاعدہ کے مطابق، اس پتہ کو لفافہ کے اوپر بائیں طرف لکھا جانا چاہئے۔

پوسٹ آفس کے عرب کلرک نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ یہ غلط ہے، دوسرے لفافہ پر صحیح پتہ لکھ کر لاؤ۔ آدمی نے کہا کہ میرے پاس دوسرا لفافہ نہیں، اور اس وقت بازار سے بھی دوسرا لفافہ حاصل کرنا مشکل ہے، آپ اسی لفافہ کو قبول کرلیں۔ بات بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ کلرک نے بگڑ کر کہا: اتخالف النظام (کیا تم نظام کی خلاف ورزی کرنا چاہتے ہو) یہ جملہ وہاں کے لحاظ سے ایک قسم کی دھمکی تھی۔ اس کا مطلب، دوسرے لفظوں میں یہ تھا کہ خاموش رہو، ورنہ تم کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلیجی ممالک میں کتنا سخت گیری کا ماحول ہے۔ خلیجی ممالک میں جو امن ہے، وہ دراصل اسی پابند نظام کا نتیجہ ہے، اور ہندستان میں جو بے امنی ہے، وہ یہاں کے آزاد نظام کا نتیجہ۔ اس دنیا میں اکثر اوقات یہ ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی بیک وقت دونوں چیزوں کو لے سکے۔ ایک کو لینے کے لئے اسے دوسرے کو چھوڑنا

پڑتا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہندستان نے تقسیم کو دل سے قبول نہیں کیا، اسی لئے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات خراب ہیں اور دونوں جگہ ترقی کا عمل رکا ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تو عین وہی نفسیات ہے جس میں خود پاکستان کے لوگ بہت بڑے پیمانے پر مبتلا ہیں۔ یہاں جب بھی الکشن ہوتا ہے اور کچھ لوگ جیت کر اوپر آتے ہیں تو ہارنے والے لوگ ان کی جیت کو قبول نہیں کرتے۔ وہ فوراً فاتح کے خلاف تخریبی کارروائیاں شروع کر دیتے ہیں۔ تخریب کاری کی اس سیاست میں اسلام پسند لوگ بھی پوری طرح شریک ہیں۔ اس کے نتیجہ میں پاکستان کے ماحول میں منفی ذہنیت اور تخریبی مزاج اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ اب اس کے ختم ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ "تم جیتے، میں ہارا" ایک سادہ سا جملہ ہے، مگر پاکستان کے بے ریش اور باریش رہنماؤں میں کوئی بھی شخص اب تک اس جملہ کو کہنے کی جرأت نہ کر سکا۔

کراچی کے ہفت روزہ تکبیر (۱۴ ستمبر ۱۹۸۹) میں ایک پورے صفحہ پر نمایاں انداز میں ایک مضمون نظر سے گزرا۔ یہ "ایک خادم ملت" کی طرف سے ہے اور اس کے اوپر قرآن کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ یہ مضمون ایک آیت کے ترجمہ اور اس کے عنوان پر مشتمل ہے جو اس طرح ہے:

ہرگز نہ دبو ایسے شخص سے

ہرگز نہ دبو کسی ایسے شخص سے جو بہت قسمیں کھانے والا بے وقعت آدمی ہے۔ طعنے دیتا ہے۔ چغلیاں کھاتا پھرتا ہے۔ بھلائی سے روکتا ہے۔ ظلم و زیادتی میں حد سے گزرنے والا ہے۔ سخت بد اعمال ہے۔ جفا کار ہے اور ان سب عیوب کے ساتھ بد اصل ہے۔ (القلم ۱۰-۱۶)

ولا تطع کا ترجمہ "ہرگز نہ دبو" اور اس کے اوپر مذکورہ جلی سرخی سے بظاہر یہ تاثر ہوتا ہے کہ یہ آیت ایسے لوگوں سے لڑائی لڑنے کا حکم دے رہی ہے۔ حالانکہ آیت کا یہ مفہوم نہیں۔ اسی قسم کے ترجموں اور تفسیروں نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا یہ مزاج بنا دیا ہے کہ ہر جگہ وہ لڑنے بھڑنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ حکمت اور ہم آہنگی کو انھوں نے بزدلی سمجھ لیا ہے اور نزاع اور تصادم کو جہاد۔

اس آیت میں " اطاعت نہ کرو " کا مطلب یہ ہے کہ ان کا اثر نہ لو۔ ان کی باتوں پر دھیان نہ دو۔ ان کی رعایت کرتے ہوئے اپنی دعوت کے انداز میں تبدیلی نہ کرو۔ یہاں " اطاعت " کا لفظ اسی مفہوم میں شدت پیدا کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے نہ کہ یہ بتانے کے لئے کہ ان سے " ہرگز نہ دبو " اس عسکری مفہوم کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔

ایک مسلم نوجوان جو کالج میں پڑھ رہے ہیں، ان سے میں نے یہاں کے تعلیمی اداروں کے حالات پوچھے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے یہاں اسکولوں اور کالجوں میں سیاست بازی اور دہشت گردی اتنی عام ہوگئی ہے کہ وہاں اب پڑھنے کا ماحول باقی نہیں رہا۔ مزید یہ کہ یہاں مہلک ہتھیار (کلاشنکوف، پستول) بالکل عام ہیں۔ کسی بھی وقت ایک شخص آکر ایک طالب علم کو گولی کا نشانہ بنا کر بھاگ جائے گا اور اس کا کچھ نہیں ہوگا۔

انھوں نے بتایا کہ اس صورت حال کی بنا پر اب یہ حال ہے کہ جو لڑکے واقعی پڑھنا چاہتے ہیں، وہ امریکہ چلے جاتے ہیں۔ اور جب وہ امریکہ میں تعلیم حاصل کرتے ہیں تو اس کے بعد وہ وہیں رہ جاتے ہیں۔ دوبارہ وہ پاکستان واپس نہیں آتے۔ میں نے کہا کہ یہ تمام نقصانوں میں سب سے بڑا نقصان ہے۔ جو نوجوان مجبوراً یہاں ٹھہریں وہ اچھی تعلیم حاصل نہ کرسکیں گے اور جن کے پاس وسائل ہوں یا جو زیادہ ہونہار ہوں وہ باہر چلے جائیں گے۔ اکبر الہ آبادی نے انگریزوں کے جاری کردہ نظام تعلیم پر طنز کرتے ہوئے کہا تھا:

بچوں کے کبھی قتل سے بدنام نہ ہوتا　　افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اکبر الہ آبادی اور ان کے جیسے دوسرے رہنماؤں کو معلوم نہ تھا کہ اصل مسئلہ قوم کی بے شعوری ہے نہ کہ انگریزوں کا تعلیمی نظام۔ اس بے شعوری کی حالت میں " انگریز " کو یہ ضرورت نہیں کہ وہ ان کے ملک میں آکر ان کے نوجوانوں کو " قتل " کرے۔ وقت کا فرعون اپنے ملک میں رہے گا اور ہماری قوم کے نوجوان خود بھاگ کر اس کے یہاں پہنچیں گے اور اس کے سامنے اپنے آپ کو پیش کردیں گے تاکہ وہ انھیں قتل کرسکے۔

ایک صاحب جو الرسالہ پڑھتے ہیں، انھوں نے راقم الحروف کے انداز پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ کا انداز پرو گورنمنٹ (pro-government) انداز ہے۔ میں نے

کہا کہ یوں نہ کہئے۔ بلکہ اس طرح کہئے کہ آپ کا انداز پرو ریلیٹی (pro-reality) انداز ہے۔ میرا کسی حکومت سے کوئی تعلق نہیں۔ میں صرف یہ کرتا ہوں کہ میں حقیقت پسندی کی بات کرتا ہوں۔ مگر لوگوں کے منفی ذہن کی وجہ سے وہ انھیں حکومت پسندی کی بات معلوم ہوتی ہے۔

الرسالہ میں ایک بار ہندستان اور پاکستان کی جنگ کا ذکر تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ اس جنگ میں پاکستان کامیاب نہ ہوسکا، اور اس کی وجہ اس کی کمتر تیاری تھی۔ اس کے مقابلہ میں ہندستانی فوج نے زیادہ بہتر منصوبہ بندی کا ثبوت دیا، اس لئے وہ پاکستان کی پیش قدمی کو روک دینے میں کامیاب رہے۔ یہ تذکرہ صرف بطور سبق تھا۔ مگر الرسالہ کے بہت سے پاکستانی خریدار اس پر سخت ناراض ہوئے حتی کہ انھوں نے الرسالہ کو پڑھنا بند کر دیا۔

یہاں اخبار نوائے وقت ۲۵ ستمبر ۱۹۸۹ میں ایک مضمون (اصل حقائق) پڑھنے کو ملا۔ یہ اخبار بیک وقت لاہور، راولپنڈی، ملتان، کراچی سے شائع ہوتا ہے۔ ایک سابق فوجی افسر ابوذر غفاری نے جو کچھ لکھا تھا، اس کا ایک حصہ عبرت کے طور پر یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"پاک فوج کے چیف آف دی آرمی سٹاف جنرل مرزا محمد اسلم بیگ نے ۱۲ ستمبر ۱۹۸۹ کو جی ایچ کیو آڈیٹوریم میں ملک بھر کے ایڈیٹروں اور سینئر صحافیوں کے سوالوں کے جوابات دئے تھے۔ انھوں نے جب یہ کہا کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ ہم نے نہ جیتی نہ ہاری اور یہ کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ ہم ہار گئے تو اس نے ہر فوجی کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہوگا کہ وہ ان دونوں جنگوں کا دوبارہ جائزہ لیں۔

جنرل صاحب کا یہ کہنا حقائق کے عین مطابق ہے کہ ۱۹۶۵ کی جنگ ہم نے نہیں جیتی تھی اور نہ ہی ہم اسے ہارے تھے۔ ۱۶ ستمبر تک پاکستان اور بھارت دونوں یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ان میں سے کوئی بھی اس جنگ کو نہیں جیت سکتا۔ اسی لئے دونوں کی یہ کوشش تھی کہ کوئی اس جنگ کو بند کروادے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جنگ بچوں کا کھیل نہیں۔ جنگ لڑنے کے لئے امن کے زمانے میں بہت زیادہ تیاری کرنا پڑتی ہے۔ تیزی سے ختم ہوتے ہوئے گولہ بارود کے ذخائر اور فوجی ساز وسامان کی توڑ پھوڑ نے دونوں ممالک کے جرنیلوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ بہتر یہی ہوگا کہ جنگ جلد از جلد بند کر دی جائے۔ اسی لئے جب سلامتی کونسل نے جنگ بندی کے لئے کہا تو دونوں ممالک نے اسے تسلیم کر لیا۔

بدقسمتی سے سیاست دانوں کو اپنے عوام کو ساتھ رکھنے کے لئے قدم قدم پر جھوٹ بولنا پڑتا ہے اسی پاکستان کے حکمرانوں نے یہ اعلان کیا کہ انھوں نے بھارت کی کئی گنا افواج کو شکست دے دی ہے اس طرح پاکستان کے عوام نے یہ یقین کر لیا کہ انھوں نے یہ جنگ جیت لی ہے۔ شاعروں ادیبوں اور گانے والوں نے پاک افواج کے بہت گن گائے۔

سیاست دانوں نے نہ صرف عام لوگوں کو گمراہ کیا تھا بلکہ فوج بھی یہ سمجھنے لگی کہ اس نے بھارتی فوج کو شکست دے دی ہے۔ فوجی تقریبات میں گانے والوں کو بلایا گیا جنھوں نے "میرا ماہی چھیل چھبیلا" "کرنیل نی جرنیل نی" جیسے گانے گائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فوجی خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ یہ صورت حال حساس فوجی افسروں کے لئے بہت تکلیف دہ تھی۔ اس جنگ کے چند ہفتوں بعد جب جنرل موسی خاں سیالکوٹ تشریف لائے اور انھوں نے وہاں دو ڈویژنوں کے افسروں سے خطاب کرتے ہوئے اس جنگ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تو میں نے ان سے سب کے سامنے جب دوران جنگ ہونے والی چند غلطیوں کا ذکر کیا تو ہر طرف سے شور اٹھا کہ بیٹھ جاؤ۔ میری تنقید تعمیری تھی۔ میں چاہتا تھا کہ ہم جذبات کی رو میں بہنے کی بجائے سوچیں تاکہ ہم اپنی غلطیوں سے سبق حاصل کر سکیں۔ لیکن میں ابھی اس وقت اتنا باہوش نہیں تھا کہ یہ سمجھتا کہ انسان اپنی غلطی کو تسلیم کرنے کے لئے نہیں ہوتا۔ اور وہ اپنی غلط بات پر اصرار کرتا رہتا ہے۔"

کراچی کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے جگہ جگہ "یوم شہداء" کا بورڈ نظر آیا۔ آج ۳۰ ستمبر کے اخبارات (مثلاً حریت، ۳۰ ستمبر ۱۹۸۹) کے صفحہ اول پر اس قسم کی سرخیاں تھیں: آج پورے سندھ میں یوم شہداء حیدرآباد منایا جا رہا ہے۔" اسی کے ساتھ آج ہی کے اخبار (نوائے وقت ۳۰ ستمبر ۱۹۸۹) میں صفحہ اول پر جلی سرخی تھی کہ" اترپردیش اور مقبوضہ کشمیر میں ۴۲ مسلمان شہید کر دئے گئے۔ مسلمان ہندستان میں بھی "شہید" ہو رہے ہیں اور پاکستان میں بھی۔

کراچی کے اخبار حریت (۳۰ ستمبر ۱۹۸۹) اور اسی تاریخ کے وفاق اور نوائے وقت میں جو خبریں پڑھیں، ان کا خلاصہ یہ تھا کہ " ۳۰ ستمبر کو مہاجر قومی موومنٹ کے زیر اہتمام پورے سندھ میں یوم شہداء حیدرآباد منایا گیا۔ پچھلے سال ۳۰ ستمبر ۱۹۸۸ کو یہ واقعہ ہوا تھا کہ مسلح دہشت گرد (پٹھانوں) نے کلاشنکوف اور دیگر جدید خود کار ہتھیاروں سے اندھا دھند فائرنگ کر کے

حیدرآباد سندھ میں دوسو سے زیادہ (مہاجر) شہریوں کو شہید کر دیا تھا۔ ان میں بوڑھے، جوان، عورتیں، بچے سب شامل تھے۔ ان شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے مہاجر قومی موومنٹ نے شہیدوں کی پہلی برسی کے موقع پر یوم شہداء حیدرآباد منانے کا اعلان کیا ہے۔ دیگر کارروائیوں کے علاوہ پورے حیدرآباد میں جگہ جگہ سیاہ بینر آویزاں کئے گئے جن پر ۳۰ ستمبر کے شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کیا گیا تھا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی یہ انوکھی خوش قسمتی ہے کہ وہ اگر غیر مسلموں کی گولی سے مارے جائیں تب بھی وہ شہید ہوتے ہیں، اور اگر وہ آپس میں لڑ کر مریں تب بھی شہید ہوتے ہیں۔ خوش قسمتی کی یہ قسم اس سے پہلے کسی دور کے مسلمانوں کے حصہ میں نہیں آئی۔

نوائے وقت (۳۰ ستمبر ۱۹۸۹) سے معلوم ہوا کہ پاکستان میں ایک طرف جئے سندھ کے نعرے ہیں، اور دوسری طرف جئے مہاجر کے نعرے۔ صفحہ اول پر مہاجر تحریک کے لیڈر الطاف حسین کی تقریر کی رپورٹ تھی۔ اس کے چند جملے یہ ہیں: ایم کیو ایم کے ارکان قومی اسمبلی نے جس طرح ایوان میں مہاجروں کے حقوق کے لئے آواز بلند کی ہے، اس کی مثال ۴۲ سالہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ انھوں نے کہا کہ مہاجروں میں جوش و جذبہ برقرار رہا تو مہاجروں کو سمندر میں دھکیلنے کا دعویٰ کرنے والے کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ کسی کو حق نہیں کہ وہ یہ کہنا شروع کر دے کہ جو سندھی نہیں ہے، وہ سندھ سے چلا جائے۔ ہم نے سندھی بن کر رہنے کے لئے نہیں، بلکہ پاکستانی بن کر رہنے کے لئے پاکستان بنایا تھا"۔

الفاظ میں معمولی تبدیلی کر دیجئے تو ہندستان کا مسلمان لیڈر بھی عین یہی تقریر کر رہا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کا مسئلہ " ہندو ظلم" کا مسئلہ نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ٹھیک یہی واقعہ پاکستان میں کیوں پیش آتا۔ اصل یہ ہے کہ یہ بے دانشی کا مسئلہ ہے۔ مسلمان (یا صحیح تر لفظوں میں ان کے رہنما) دانش کو کھو بیٹھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک ہی قسم کے مسائل سے دونوں جگہ دوچار ہیں، ہندستان میں بھی اور پاکستان میں بھی۔

اخبار نوائے وقت (۳۰ ستمبر ۱۹۸۹) میں صفحہ اول پر ایک خبر تھی۔ جماعت اسلامی پاکستان کے موجودہ امیر قاضی حسین احمد صاحب نے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی

مسلمان امت کو ایک سازش کے تحت پچاس قوموں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس وقت اولین ضرورت اس امر کی ہے کہ (زبان، علاقہ، برادری، فرقوں میں) منتشر اس امت کو مجتمع کر کے ایک قوت بنایا جائے۔" اسی طرح جماعت اسلامی کے دوسرے رہنماؤں، چودھری رحمت الٰہی اور پروفیسر غفور احمد نے پاکستان کے موجودہ حالات کی نہایت تاریک تصویر پیش کی۔

میں نے جماعت اسلامی کے ایک صاحب سے کہا کہ آپ لوگ سید ابوالاعلیٰ مودودی کو عہدساز شخصیت کہتے ہیں، پھر جو عہد انھوں نے بنایا ہے، وہ کہاں ہے۔ وہ نہ ہندستان میں نظر آتا اور نہ پاکستان اور بنگلہ دیش میں۔ نہ کسی دوسرے چھوٹے یا بڑے مقام پر۔ اگر آپ کسی ایسے مقام کا پتہ بتائیں جہاں یہ عہدسازی ہوئی ہے تو میں وہاں پہنچ کر اس کو دیکھوں گا۔ مگر وہ کسی ایسے مقام کا نام نہ لے سکے۔

قدیم زمانہ کے لوگ اپنے بادشاہوں کی تعریف میں مبالغہ آمیز اشعار کہا کرتے تھے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنے مفروضہ اکابر کی شان میں اسی قسم کی شاعرانہ لفاظی کر رہے ہیں۔ یہ ذوق سب سے زیادہ ان دو ملکوں میں ہے جس کا نام ہندستان اور پاکستان ہے۔

پاکستانی اخبارات میں ہندستان کے فساد کی خبریں تھیں۔ ان میں اس قسم کی سرخیاں نظر پڑیں ـــــ بھارت میں مسلم کشی، بھارت میں مسلمانوں کا قتل عام۔ ان سرخیوں کو پڑھ کر ہندستان کے بارہ میں عجیب خونیں تصور قائم ہوا۔ شبہ ہوا کہ دہلی ایرپورٹ پر اترنے کے بعد میں زندہ گھر پہنچوں گا یا میری لاش گھر لے جائی جائے گی۔

مگر ظاہر ہے کہ یہ مبالغہ اور تعمیم کی بات تھی۔ بدقسمتی سے دونوں ملکوں میں یہی غیر معتدل صورت حال قائم ہے۔ ہندستان کے اخبارات پاکستان کے بارہ میں اسی قسم کی مبالغہ آمیز خبریں شائع کرتے ہیں۔ اور پاکستان کے اخبارات ہندستان کے بارہ میں اسی طرح مبالغہ اور تعمیم کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ اس ناگوار صورت حال کو ختم کرنے کی صورت صرف ایک ہے۔ دونوں میں سے کوئی ایک ملک یک طرفہ طور پر اسے ختم کر دے۔ اس کے بعد دوسرے ملک میں اپنے آپ اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

کراچی سے دہلی کا سفر پی آئی اے کے ذریعہ طے ہوا۔ اور میں ۳۰ ستمبر ۱۹۸۹ کی رات کو

دہلی پہنچا۔ میرے ساتھ سفر میں ہمیشہ صرف ایک چھوٹا سا ہینڈ بیگ ہوتا ہے۔ نہ مزید لگیج اور نہ کسٹم کا کوئی سامان۔ اس لئے جہاز سے اترنے کے بعد مجھے ایرپورٹ پر رکنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ میں فوراً "گرین چینل" کی طرف سے باہر آجاتا ہوں۔ آج بھی ایسا ہی پیش آیا۔

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ جس کو دنیا میں سامان کم ملا، اس کا حساب آخرت میں بھی کم ہوگا (قلّۃ المال اقلّ للحساب) دل نے کہا کاش دنیا کا یہ واقعہ آخرت میں پیش آنے والے معاملہ کی علامت ہو۔ جس طرح دنیا کے ایرپورٹ نے مجھے آسانی کے ساتھ گزار دیا، اسی طرح آخرت کے "ایرپورٹ" پر بھی مجھ کو آسانی کے ساتھ گزار دیا جائے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

انسانی جہاز مجھ کو وطن سے اٹھا کر لے گیا اور افریقہ کی زمین پر اتار دیا۔ اور پھر دوبارہ وطن کی طرف واپس لایا۔ موت کا جہاز مجھ کو لے جا کر آخرت کی دنیا میں اتار دے گا جہاں سے واپسی کے لئے کوئی سواری ملنا ممکن نہیں۔ ایک سفر ختم ہوگیا، دوسرا سفر شروع ہونے والا ہے۔ پہلے سفر کی تاریخیں معلوم تھیں، دوسرے سفر کی کوئی تاریخ معلوم نہیں۔ کتنا فرق ہے ایک سفر میں اور دوسرے سفر میں۔ اسی فرق کو جاننے کا نام ایمان ہے اور اسی فرق کو نہ جاننے کا نام کفر۔

سفرنامہ بہت لمبا ہوگیا۔ مگر اس کی آخری سطریں لکھتے ہوئے مجھے احساس ہو رہا ہے کہ وہ سراسر ناتمام ہے۔ شاید جو بات لکھنے کی تھی، وہی اس میں لکھنے سے رہ گئی۔ کوئی انسان دوسروں کی کہانی کیا لکھے گا، وہ خود اپنی کہانی بھی تحریر نہیں کرسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ پڑھنے والے صرف وہ ہیں جو نہ لکھے کو پڑھیں۔ جاننے والے صرف وہ ہیں جو نہ بتائے ہوئے کو جانیں۔ مگر آج کی دنیا میں لکھے ہوئے کو پڑھنے والے بھی موجود نہیں۔ پھر نہ لکھے ہوئے کو پڑھنے والے اس دنیا میں کہاں ملیں گے۔ خدا اس بندے پر رحم فرمائے جو زبان رکھتے ہوئے بے زبان ہے۔ جس کے پاس قلم ہے۔ مگر جب اس نے قلم اٹھایا تو وہ صرف یہ لکھ سکا کہ میں نے لکھنا چاہا تھا، مگر میں لکھنے میں ناکام رہا۔

ایک سفر

ایک بین اقوامی اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لئے مارچ ۱۹۹۰ میں ایک سفر ہوا۔ مہینہ کے آخر میں دوبارہ دہلی واپسی ہوئی۔

۷ ارمارچ کو فجر سے پہلے گھر سے ایر پورٹ جانے کے لئے نکلا تو ایک حدیث یاد آگئی جس کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ جس آدمی کو اندیشہ ہوتا ہے وہ صبح سویرے سفر کے لئے نکلتا ہے۔ اور جو آدمی سویرے سفر کے لئے نکلتا ہے وہی اپنی منزل پر پہنچتا ہے (مشکاۃ المصابیح الجزء الثالث، صفحہ ۱۴۶۹)

حدیث میں ادلاج کا لفظ ہے جس کے معنی رات کے آخری حصہ میں یا صبح کے اندھیرے میں سفر کے لئے نکلنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب آغاز سفر میں جلد روانگی کا اہتمام کرنا ہے تاکہ سفر کامیابی کے ساتھ طے ہوسکے۔ یہی معاملہ آخرت کے سفر کا بھی ہے۔ آخرت کے سفر میں کامیابی کے ساتھ منزل پر پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے تقاضوں کو سمجھ کر اس کا پورا اہتمام کیا جائے۔

دہلی سے جہاز کی روانگی کا وقت صبح ساڑھے چھ بجے تھا۔ فجر سے پہلے گھر سے روانہ ہوا۔ راستہ میں لال بتی پر گاڑی رکی تو مجھے قرآن کی آیت وقفوھم انھم مسئولون (الصافات ۲۴) یاد آگئی۔ آخرت میں وہی شخص پار ہوگا جس کو روکا نہ جائے۔ جس آدمی کو جانچ کے لئے روکا گیا وہ ہلاک ہوا۔

میرے بڑے بھائی عبدالعزیز خاں صاحب مرحوم نے ایک بار ایک ٹرک خریدا۔ جلد ہی بعد انھوں نے اس کو بیچ دیا۔ انھوں نے بتایا کہ ٹرک کے بارہ میں حکومت نے اتنے زیادہ قانون اور قاعدے بنا رکھے ہیں کہ اس کا پکڑ سے بچنا سخت مشکل ہے۔ پولیس والوں نے جس ٹرک کو جانچ کے لئے روکا اس کا چالان ہونا لازمی ہے۔ آخرت میں ٹکنکل قسم کے ضابطوں پر تو کسی کی پکڑ ہونے والی نہیں ہے۔ البتہ عمل کے خالص پن (purity) پر ضرور وہاں جانچ ہوگی۔ جس آدمی کا عمل خالص اللہ کے لئے ہو وہ بچے گا اور جس آدمی کا عمل خالص اللہ کے لئے نہ ہو، اس کے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

ایر پورٹ کے اندر امیگریشن پر بڑی لمبی لائن تھی۔ کھڑے کھڑے طبیعت گھبرا اٹھی۔ میں

نے سوچا کہ آخرت میں اگر کوئی اور سزا نہ ہو، صرف اتنا ہو کہ کروروں انسانوں کی قطار کے درمیان تیز سورج میں کھڑا کر دیا جائے تو آدمی کا کیا حال ہوگا۔

دہلی سے ۱۷ مارچ ۱۹۹۰ کی صبح کو ارون ایر لائنز (فلائٹ ۱۹۳) کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ وقت پر جہاز کا گیٹ بند ہو گیا اور جہاز اپنا پر پھیلائے ہوئے رن وے پر چلنے لگا۔ اتنے میں کچھ ہندستانی مسافروں نے جہاز کے عملہ سے بحث شروع کر دی۔ ان کا کہنا تھا کہ ہماری فیملی کا ایک آدمی باہر رہ گیا ہے اور ہمارا ٹکٹ اسی کے پاس ہے۔ کچھ دیر کی بحث کے بعد آخر کار جہاز دوبارہ گیٹ کی طرف واپس روانہ ہوا۔ آدمی کو تلاش کر کے اس کو دوبارہ اندر لا کر بٹھایا گیا۔ اس کے نتیجہ میں جہاز تقریباً دو گھنٹہ لیٹ ہو گیا۔

یہ سطحیت اور نادانی کی ایک مثال ہے۔ اس قسم کی سطحیت اگر ایک آدمی اپنی ذاتی زندگی میں کرے تو وہ حماقت ہے، وہ جرم نہیں ہے۔ مگر اجتماعی زندگی میں اس طرح کی سطحیت ایک سنگین جرم بن جاتی ہے۔ کیوں کہ اجتماعی زندگی میں ایسی سطحی حرکت کی سزا پوری قوم کو بھگتنی پڑتی ہے۔

جہاز کے اندر امریکی میگزین نیوز ویک (۱۲ مارچ ۱۹۹۰) دیکھنے کا موقع ملا۔ اس کے صفحہ ۵۰ پر ایک فرانسیسی خاتون گروٹ (Groult) کی کتاب پر تبصرہ تھا۔ اس میں کتاب کے حوالہ سے بتایا گیا تھا کہ فرانس میں تحریک نسواں (Feminism) مایوسی کے دور سے گزر رہی ہے۔ مثلاً کتابوں کے ناشرین نے تحریک نسواں کے متعلق لٹریچر چھاپنا بند کر دیا ہے، کیوں کہ اس کی فروخت میں بہت کمی آگئی ہے:

have stopped printing feminist literature
because of poor sales.

فرانس میں تحریک نسواں کی مشہور خاتون لیڈر بیور (Simone de Beauvoir) چار سال پہلے مر گئیں۔ ان کے بعد کوئی خاتون لیڈر ابھر نہ سکی۔ فرانس کی تحریک نسواں کو زندہ رہنے کے لئے ایک لیڈر کی تلاش ہے۔ ایک فرانسیسی خاتون نے اس صورت حال پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے ملک کی عورتیں ایک غالب شوہر سے دور بھاگ سکی ہوں گی، مگر آخری چیز جو وہ چاہتی ہیں وہ دوسرا غالب ہے:

They may have escaped from a domineering husband
and the last thing they want is another dominator.

مرد کو اللہ تعالیٰ نے فعال صفات کے ساتھ پیدا کیا ہے اور عورت کو منفعل صفات کے ساتھ۔ دونوں صنفوں کے فریضۂ حیات کے اعتبار سے یہی فطری تقسیم ہے۔ مغرب میں اس تقسیم کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر آخر کار فطرت غالب آئی۔ انسان کے خود ساختہ نظریات بے حقیقت ہو کر رہ گئے۔

جہاز میں ایک صاحب آکر میرے قریب کی خالی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ عملہ کے ایک آدمی نے ان کے بورڈنگ کارڈ کو دیکھ کر کہا کہ یہ اوپر کا درجہ ہے، آپ کا ٹکٹ اکانومی کلاس کا ہے۔ اس لئے آپ پیچھے کی سیٹ پر جائیں۔ وہ صاحب نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی سیٹ پر بیٹھے رہے۔ دیر تک بحث کرنے کے بعد آخر کار وہ اٹھے اور جہاز کے آدمی کو برا بھلا کہتے ہوئے دوسرے درجہ میں چلے گئے۔ موجودہ سیٹ پر بیٹھنے کے لئے ان کی دلیل یہ تھی کہ وہاں تو کوئی شخص بیٹھا ہوا نہیں ہے:

Nobody is sitting here.

مسافر کو معلوم نہ تھا کہ اس دنیا میں کوئی سیٹ آدمی کو اس لئے نہیں ملتی کہ وہ خالی ہے۔ یہاں کوئی سیٹ آدمی کو ملتی ہے تو اس لئے ملتی ہے کہ اس نے اس کی ضروری قیمت ادا کی ہے۔ جہاں دوسرے لوگ قیمت ادا کر کے بیٹھے ہیں وہاں آپ قیمت ادا کئے بغیر اپنے لئے نشست نہیں پا سکتے۔ یہ زندگی کی ایک سادہ حقیقت ہے۔ مگر بہت سے لوگ اس سادہ حقیقت کو نہیں جانتے۔

مارچ ۱۹۹۰ کی ۱۷ تاریخ ہے۔ گھڑی میں دن کے ایک بجے ہیں۔ ہمارا جہاز تقریباً ۳۰ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑ رہا ہے۔ میں نے جہاز کی کھڑکی کے باہر دیکھا تو سورج کی تیز روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ جہاز کے نیچے گہرے بادلوں کی تہیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس وقت اگر آپ نیچے زمین کی سطح پر کھڑے ہوئے ہوں تو آپ کو اپنے چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا نظر آئے گا۔ مگر عین اسی وقت بادلوں کے اوپر مکمل سورج اپنی پوری تابانی کے ساتھ چمک رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ اسی طرح زندگی کے مطالعہ کی بھی دو سطحیں ہیں۔ زندگی کے معاملہ کو ایک رخ سے دیکھئے تو آپ کو اپنے ماحول میں ہر طرف مشکلات کے اندھیرے پھیلے ہوئے دکھائی دیں گے۔ مگر ٹھیک اس وقت ایک اور سطح موجود ہوتی ہے، اگر آپ اس دوسری سطح سے دیکھیں تو زندگی روشن امکانات سے بھری ہوئی دکھائی دینے لگے گی۔

مثال کے طور پر جو لوگ آج مسلمانوں کے معاملہ کو مادی اور سیاسی اعتبار سے دیکھتے ہیں ان کو

مسلمان ہر طرف مشکلات و مسائل سے گھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر ان کے معاملہ کو دعوتی امکانات کے نقطۂ نظر سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کے لئے آج کی دنیا میں دعوت کے نئے شاندار مواقع کھل گئے ہیں جن کو استعمال کرکے وہ اسلام کا نیا مستقبل بنا سکتے ہیں، اور اسی کے ساتھ خود اپنا مستقبل بھی۔ ایک زاویۂ نگاہ سے دیکھنے میں مسلمان تاریخ کا معمول نظر آتے ہیں۔ مگر دوسرے زاویۂ نگاہ سے دیکھئے تو مسلمان تاریخ کا عامل بننے کے مقام پر کھڑے ہوئے نظر آئیں گے۔

چھ گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد جہاز کے اناؤنسر نے اپنے اعلان میں بتایا کہ سوف تھبط الطائرۃ (جلد ہی جہاز زمین پر اترے گا) اس جہاز کے کیپٹن (قائد الطیارۃ) ایک عرب عصام الناصر تھے۔ جہاز ایرپورٹ کے علاقہ میں داخل ہوا تو میں نے سوچا کہ دیکھوں وہ جہاز کو کس طرح اتارتے ہیں۔ کیوں کہ جہاز میں سب سے زیادہ مشکل کام لینڈنگ ہوتا ہے۔ بعض پائلٹ جہاز کو اس طرح اتارتے ہیں جیسے اس کو زمین پر گرا دیا جائے۔ مگر عصام الناصر نے جہاز کو اس طرح اتارا کہ کوئی جھٹکا نہیں لگا اور جہاز تقریباً غیر محسوس طور پر زمین پر اتر کر دوڑنے لگا۔

ایران۔ عراق جنگ نے عرب ملکوں کی مالیات کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ مگر اس نقصان میں فائدے کے بھی کچھ پہلو ہیں۔ اس نے انھیں جگا دیا ہے۔ وہ اپنے نوجوانوں کو ہر قسم کی اعلیٰ تربیت دے رہے ہیں۔ تاکہ وہ بیرونی ملکوں کے ماہرین سے مستغنی ہو سکیں۔

عمان ایئر پورٹ ایک چھوٹا ایئر پورٹ ہے مگر خوبصورت ہے۔ اس کا نام مطار الملکۃ علیاء الدولی (Queen Alia International Airport) ہے۔ اسی طرح دہلی کے ہوائی اڈہ کا نام اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایئر پورٹ ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اس طرح کا نام پسند نہیں۔ ہوائی اڈوں کے نام سادہ طور پر دہلی ایئر پورٹ یا عمان ایئر پورٹ ہونے چاہئیں۔

اردن ایک چھوٹا ملک ہے۔ اردن ایئر لائن بھی ایک چھوٹی ایئر لائن ہے، مگر اس کی ہر چیز ایئر انڈیا سے بہتر نظر آئی۔ اس کا راز یہ نہیں ہے کہ اردن، ہندستان کے مقابلہ میں زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ اردن کی ہر چیز مغربی ملکوں سے آئی ہوئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہاں وہ کرپشن نہیں ہے جو موجودہ ہندستان کی سب سے بڑی خصوصیت بن چکا ہے۔

ہندستان ٹائمس (۱۲ اگست ۱۹۸۶) کے صفحہ اول پر ایک روسی جہاز کی تصویر نمایاں طور پر چھپی

ہوئی تھی۔ اس تصویر کے نیچے حسب ذیل الفاظ درج تھے:

Prime Minister Rajiv Gandhi returned on a Soviet plane following engine trouble in the Air-India aircraft in which he left Prague for Delhi.

وزیر اعظم راجیو گاندھی ایک روسی جہاز سے واپس آئے۔ کیوں کہ ایئر انڈیا کے جہاز کے انجن میں خرابی پیدا ہوگئی تھی جس میں وہ پراگ سے دہلی کے لئے روانہ ہوئے تھے۔ اس کے بعد اس واقعہ پر تبصرے شروع ہوئے۔ ہندستان ٹائمس (۱۸ اگست ۱۹۸۶) صفحہ ۸ پر ایک تبصرہ میں کہا گیا تھا:

On one trip abroad the air-conditioning in the Prime Minister's plane fails. On another occasion something else in his aricraft fails and he is stuck on foreign soil for three hours. Now, due to a threat of fire in one engine his plane is diverted to Moscow and he returns home in a soviet aircraft. Is that the standard of maintenance of Air India?

ایک بیرونی سفر میں وزیر اعظم کے جہاز میں ایئر کنڈیشننگ کا نظام خراب ہوگیا۔ ایک اور موقع پر ان کے جہاز میں کوئی اور خرابی پیدا ہوگئی اور وہ ایک بیرونی سرزمین میں تین گھنٹے کے لئے رکنے پر مجبور ہوگئے۔ اب ان کے جہاز کے ایک انجن میں آگ لگنے کا خطرہ پیدا ہوا اور وہ ماسکو کی طرف موڑ دیا گیا اور وزیر اعظم ایک روسی جہاز میں دہلی واپس آئے۔ کیا ایئر انڈیا میں کارکردگی کا معیار یہی ہے۔

میرا تجربہ ہے کہ بہت سے چھوٹے ملکوں کا معیار کارکردگی ہندستان سے نمایاں طور پر بہتر ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان ملکوں میں وہ کرپشن نہیں جو آج ہندستان کے ہر شعبہ میں آخری حد تک سرایت کر گیا ہے۔

اردن ایک چھوٹا ملک ہے۔ ۱۹۶۷ کی جنگ میں اس کے رقبہ کا ۶ فی صد حصہ اسرائیل کے قبضہ میں چلا گیا۔ یہ ۶ فی صد حصہ اردن کی زرعی زمین کا ۵۰ فیصد حصہ تھا۔ عمان اردن کی راجدھانی ہے اور ملک کا سب سے بڑا شہر ہے۔ پورا شہر پہاڑیوں پر آباد ہے۔ یہ ایک تاریخی شہر ہے۔ یہاں قبل مسیح زمانہ کے آثار اب تک کھنڈر کی صورت میں موجود ہیں۔ ۶۳۵ء میں یزید بن ابی سفیان نے عمان کو فتح کر کے اس کو اسلامی مملکت میں شامل کیا تھا۔

اردن کے علاقہ میں تاریخی آثار بہت ہیں۔ مثلاً اسی ملک میں بطرا (Petra) اور جراش واقع ہیں۔ یہاں قدیم سلطنتوں کے چھوڑے ہوئے نشانات پائے جاتے ہیں۔ ایک سیاح کے لئے یہ مقامات صرف تفریح کے مقامات ہیں۔ مگر مومن کی نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ عبرت اور نصیحت میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ یہی بات قرآن میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے : قل سیروا فی الارض ثم انظروا کیف کان عاقبۃ المکذبین (الانعام)

اردن کے ایک میگزین میں ایک اشتہار دیکھا۔ اس میں عالمی سیاحوں کو ترغیب دلائی گئی تھی کہ وہ اردن آئیں اور یہاں کے تاریخی مناظر دیکھیں۔ اس کا عنوان تھا:

Discover Jordan: the jewel of the Middle East

اس مضمون میں سیاحوں کو متوجہ کرنے کے لئے خاص طور پر بطرہ کے سنگی مکانات کی تصویریں دی گئی تھیں۔ قدیم زمانہ میں سنگ تراشی کی ایک صنعت پیدا ہوئی۔ اس کے تحت پہاڑوں کو تراش کر انھیں مکان کی صورت میں تبدیل کر دیا جاتا تھا۔ بطرہ میں اسی قسم کی عمارتیں ہیں۔ ایلورا اور اجنتا بھی اسی قسم کی سنگ تراشی کے نمونے ہیں۔

ایک عرب قبیلہ نے یہاں ایک سلطنت قائم کی تھی جن کو نبطی (Nabataeans) کہا جاتا ہے۔ یہ ۳۱۲ ق م کا واقعہ ہے۔ یہاں انھوں نے پہاڑوں کو تراش کر خوبصورت مکانات بنائے اور اس کو اپنی راجدھانی قرار دیا۔ رومیوں نے اس کو ۱۰۶ء میں فتح کیا۔ ۶۳۵ء میں وہ اسلامی علاقہ میں شامل کیا گیا۔

مغربی مورخین جب اس کا ذکر کرتے ہیں تو وہ رومیوں کے تذکرہ کے ذیل میں رومی عہد (Roman times) کا لفظ لکھتے ہیں، اور مسلمانوں کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس کے لئے اسلامی حملہ (Islamic invasion) کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ فرق بلاشبہ قابل شکایت ہے۔ مگر بدقسمتی سے مسلمان جب اپنی تاریخ اور دوسروں کی تاریخ پر لکھتے ہیں تو وہ بھی اسی طرح دہرا انداز اختیار کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں کم از کم مسلمانوں کو اس شکایت کا حق نہیں۔

اردن کی آمدنی کا ایک خاص ذریعہ سیاحت ہے۔ اور سیاحوں کے لئے یہاں سب سے زیادہ پرکشش چیز بطرا وغیرہ کے قدیم آثار ہیں۔ یہ آثار جو تاریخی اور اقتصادی دونوں اعتبار سے اتنے قیمتی ہیں، ان کو پہلی بار سوئزرلینڈ کے ایک سیاح برخارٹ (John Lewis Burckhardt) نے ۱۸۱۲ء میں دریافت کیا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے بارہ میں ایک یہودی روایت ہے جس کا تعلق اسی عمان (عمون) سے ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ـــــ داؤد نے بادشاہی محل کی چھت سے ایک عورت کو دیکھا جو نہا رہی تھی۔ وہ نہایت خوبصورت تھی۔ داؤد نے اس عورت کو اپنے محل میں بلایا اور اس سے صحبت کی۔ اس کے بعد وہ حاملہ ہوگئی۔ اب داؤد نے اس عورت کے شوہر حتی اوریاہ کو عمون کی جنگ میں بھیج دیا اور سردار فوج سے کہا کہ اس کو گھسان میں سب سے آگے رکھنا اور تم اس کے پاس سے ہٹ جانا تاکہ وہ مارا جائے۔ چنانچہ حتی اوریاہ مارا گیا اور پھر وہ عورت داؤد کی بیوی ہوگئی۔ اس کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ پر اس کام سے جسے داؤد نے کیا تھا خداوند ناراض ہوا (۲۔ سموئیل باب ۱۱) حضرت داؤد کے یہی فرزند ہیں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کہے جاتے ہیں۔

یہ لغو قصہ قرآن (ص ۲۳) کے تحت خود ہماری تفسیروں میں بھی آگیا ہے۔ مفسرین نے اس پر لمبی بحثیں کی ہیں۔ چنانچہ مستشرقین کو موقع مل گیا کہ وہ اس کو قرآن کے ساتھ منسوب کردیں۔ ایک مستشرق نے لکھا ہے کہ داؤد نے اوریا حتی کو ایک جنگ میں قلعہ کی دیوار تک بھیج دیا تاکہ وہ مارا جائے اور وہ اس کی بیوی سے نکاح کرسکیں۔ یہ واقعہ مسلم کہانیوں کا بھی ایک حصہ ہے :

....the incident is also a part of Muslim folklore (I/317)

عمان کی آبادی تقریباً ۶ لاکھ ہے۔

۴۹ - ۱۹۴۸ میں عربوں اور اسرائیل کے درمیان جو جنگ ہوئی، اس کے بعد فلسطینی پناہ گزیں عمان میں آنے لگے۔ ۱۹۶۷ کی جنگ کے بعد دریائے اردن کے مغرب کا پورا علاقہ اسرائیل کے قبضہ میں چلا گیا۔ اب فلسطینی پناہ گزیں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ عمان جو پہلے ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، اب بہت بڑا شہر بن گیا۔

غالباً ۱۹۶۹ کی بات ہے۔ میری ملاقات اردن کے ایک فلسطینی سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اردن میں ہماری طاقت اتنی بڑھ چکی ہے کہ ہم جب چاہیں اردن کی حکومت پر قبضہ کرلیں۔ فلسطینیوں کا یہی ذہن تھا جس کی بنا پر ۱۹۷۰ میں فلسطینیوں اور حکومت اردن کے درمیان باقاعدہ سول وار چھڑ گئی۔ اردن نے نہایت فیاضی کے ساتھ فلسطینیوں کو اپنا مہمان بنایا تھا۔ مگر جب یہ نوبت آئی تو حکومت نے نہایت سختی کے ساتھ ان کو کچل دیا۔ حتی کہ فلسطینی کیمپوں پر بمباری کی گئی۔

ہر آدمی کی ایک حد ہے۔ آدمی اگر اپنی حد پر رہے تو اس کو ہر جگہ کام کے مواقع ملتے ہیں۔ اور اگر وہ اپنی حد سے آگے بڑھ جائے تو اس کو ہر جگہ رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے گا، خواہ وہ کسی مسلم ملک میں ہو یا غیر مسلم ملک میں۔

عمان سے طرابلس کے لئے اردن ایئر لائنز کی فلائٹ نمبر ۱۴۵ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں جہاز کے اندر ایک فلسطینی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا نام ناصر عبد الفتاح عامر بتایا۔ ان کی عمر تقریباً ۱۲ سال تھی۔ ان کا خاندان غزہ (فلسطین) میں رہتا ہے۔ فلسطین کے بارہ میں انھوں نے بہت سی باتیں بتائیں۔ آخر میں میں نے پوچھا کہ فلسطین کے مستقبل کے بارہ میں آپ کیا امید رکھتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا: تحریر ارض فلسطین و ان اری بلادی تنعم تحت حکم اسلامی (سرزمین فلسطین کی آزادی، اور یہ کہ میں اپنے ملک کو اسلامی حکومت کے تحت خوش حال ہوتا ہوا دیکھوں)

فلسطین کے مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں اپنا بہت کچھ کھو دیا ہے، مگر انھوں نے اپنا حوصلہ نہیں کھویا۔ اور حوصلہ بلاشبہہ کسی قوم کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔

اس جہاز میں اردن ایئر لائنز کا انگریزی میگزین رائل ونگ (Royal Wings) کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ اس میں ایک مضمون چھٹی حس (sixth sense) سے متعلق تھا۔ اس میں مختلف نمبر لکھے ہوئے تھے۔ اور ہر نمبر کو دیکھنے سے ایک متعین جواب نکلتا تھا۔ میں نے سرسری طور پر نمبر ۲ کو دیکھا۔ اس نمبر کے تحت حسب ذیل الفاظ لکھے ہوئے ملے:

You are blessed with a remarkable ability.
Your powers are alert and working for you.
Don't be afraid of your "sixth sense" but explore it.

میں اس قسم کی چیزوں میں عقیدہ نہیں رکھتا۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس نوعیت کے مجھے کئی عجیب تجربے ہوئے ہیں۔ مثلاً مجھے یاد ہے کہ مدرسہ کی تعلیم کے زمانہ میں وہاں کے کتب خانہ میں مصر کا ایک عربی مجلہ المقتطف آتا تھا جس کو میں دل چسپی سے پڑھا کرتا تھا۔ ایک بار المقتطف میں اسی قسم کا ایک مضمون آیا۔ اس میں ایک طلسماتی لفظ "ابرا کادا بیسن کاتن" کو پڑھ کر خاص انداز سے اپنے بارہ میں کوئی جواب معلوم کیا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں میرا امتحان قریب تھا۔ میں نے اسی کے بارہ میں معلوم کیا۔ جواب آیا: ستنجح نجاحاً کبیرا (تم ایک بڑی کامیابی حاصل کرو گے) عجیب بات ہے کہ

اس کے بعد امتحان ہوا تو میں پورے درجہ میں اول آیا۔ اس وقت ہمارے درجہ میں غالباً ۲۴ طالب علم تھے۔

اردن ایئرلائنز کا عربی میگزین " الاجنحة " کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کے شمارہ آذار ۱۹۹۰ (صفحہ ۵۸) میں ایک عرب خاتون لیما نبیل کا ایک مضمون تھا جس کا عنوان تھا: غرناطة الفردوس المفقود (غرناطہ، فردوس گم شدہ)

موصوفہ سیاح کے طور پر غرناطہ گئیں۔ وہاں انھوں نے عرب عہد کے آثار کو دیکھا۔ وہ لکھتی ہیں کہ غرناطہ میں میں نے عرب تاریخ کو اپنے سامنے پایا اور اپنے ماضی کی عظمت کا مشاہدہ کیا۔ ان چیزوں کو دیکھ کر وہ رو پڑیں۔ وہ وہاں کے ایک ایک پتھر سے پوچھتی رہیں کہ یہاں عرب کی عظمت تھی اور یہیں سے پانچ سو سال پہلے عرب کی ذلت شروع ہوئی (هنا كان المجد العربي وهنا ايضاً بدأ الذل العربي قبل خمس مائة عام)

وہ جذباتی انداز میں لکھتی ہیں کہ عربوں نے یہاں اپنے قلعوں اور محلوں اور مسجدوں کو چھوڑ دیا۔ وہ اس شہر سے عورتوں کی طرح روتے ہوئے نکلے۔ وہ مردوں کی طرح اس کی حفاظت نہ کر سکے (تركوا قلاعهم وقصورهم ومساجدهم۔ خرجوا من هٰذه المدينة يبكون مثل النساء۔ ملكا لم يحافظوا عليه مثل الرجال۔ وخرجتُ من غرناطة اطأطئ راسي۔ واسأل نفسي الى متى سيستمر هٰذا الليل العربي وماذا سيكتب التاريخ عنّا)

عرب خاتون نے اپنے اس تاثراتی جملہ میں غرناطہ کے آخری سلطان کی ماں کے قول کو دہرایا ہے۔ مگر یہ سادہ معنوں میں مرد اور عورت کا مسئلہ نہیں۔ یہ قومی استعداد کا مسئلہ ہے۔ ۱۷۹۹ میں ٹیپو مرد کی جنگ لڑے مگر وہ ہار گئے۔ ۱۹۷۱ میں اندرا گاندھی ایک عورت تھی مگر وہ پاکستان کے مقابلہ میں جیت گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مرد اور عورت کا معاملہ نہیں، بلکہ قومی استعداد اور حالات کا معاملہ ہے۔ اگر حالات موافقت نہ کر رہے ہوں تو کوئی شخص خواہ کتنی ہی زیادہ بہادری کے ساتھ لڑے، وہ مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

جہاز کا بیشتر سفر خشکی کے اوپر ہوا۔ بالائی فضا میں پرواز کرتا ہوا ہمارا جہاز ہندستانی وقت

کے لحاظ سے پانچ بجے بحر روم کے اوپر پہنچ گیا۔ اس کے سفر کو نہ خشکی کی پستی اور بلندی نے روکا، اور نہ سمندر اس کی راہ میں حائل ہوا۔ وہ شہری آبادیوں کے اوپر سے بھی اسی طرح تیزی سے گزر گیا جس طرح کھلے میدانوں کے اوپر سے۔

بے شمار لوگ روزانہ ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہیں۔ مگر مسافروں کے چہرے اور ان کی گفتگوئیں بتاتی ہیں کہ اس قدرتی معجزہ کو سوچ کر کسی کے اندر تموج کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ مذہبی انسان ہو یا سیکولر انسان، دونوں قسم کے لوگ ہوائی جہاز کا سفر تو کر رہے ہیں، مگر ہوائی جہاز کے سفر کے دوران ان کا شعور ربانی مسافت طے نہیں کرتا۔ ان کا حال تقریباً اس چوپایہ کا سا ہے جس کو ایک مقام پر جہاز میں بیٹھا یا جائے اور لے جا کر اس کو دوسرے مقام پر اتار دیا جائے۔

اردو کے ایک مرثیہ گو نے قدیم زمانہ میں حضرت حسین اور ان کے خاندان کے لوگوں کے سفر کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا تھا کہ خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ زمین کو مختصر کر کے ان کا راستہ آسان بنا دو:

طنابیں کھینچ کر کم کر زمیں کو   کہ ہووے راہ کم ان مہ جبیں کو

آج اللہ تعالیٰ نے ہر آدمی کے لئے زمین کی طنابیں کھینچ کر سفر کو مختصر بنا دیا ہے۔ مگر قرآن کے مطابق انسانوں میں سب سے کم وہ لوگ ہیں جو قابل شکر باتوں کو شدت کے ساتھ محسوس کریں اور شکر کے جذبات سے سرشار ہو جائیں (سبا ۱۳)

ہوائی جہاز کی سواری آج بہت زیادہ عام ہو چکی ہے۔ اس لئے لوگوں کو اس کے غیر معمولی پن کا احساس نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہوائی جہاز اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے۔ ہوائی جہاز نے آج لمبے سفروں کو ہر آدمی کے لئے ممکن بنا دیا ہے۔ ورنہ قدیم زمانہ میں بہت ہی کم افراد لمبے سفر کا حوصلہ کر سکتے تھے۔

لارڈ کرزن ایک بے حد امیر خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ انیسویں صدی کے آخر میں ہندستان کا بڑے جاہ و جلال کا وائسرائے بنا۔ مگر ۱۸۹۸ء میں جب وہ ہندستان کا وائسرائے ہو کر روانہ ہوا تو لندن سے کلکتہ تک کا سفر طے کرنے میں اس کو سترہ دن لگ گئے۔ اس وقت تک ہوائی جہاز کا سفر رائج نہیں ہوا تھا۔ آج ایک عام آدمی ہوائی جہاز میں بیٹھ کر چند گھنٹوں میں ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم میں پہنچ جاتا ہے۔

۷ امارچ کو میں نے فجر کی نماز دہلی کے ہوائی اڈہ پر پڑھی تھی۔ اسی دن میں عصر کی نماز کے وقت طرابلس کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ موجودہ زمانہ میں تیز رفتار سواریوں نے سفر کے معاملہ کو کتنا زیادہ آسان بنا دیا ہے۔ ہوائی جہاز اپنے اندر سیکڑوں مسافروں کو بیٹھا کر ہوا میں اڑتا ہے اور خشکی اور پہاڑ اور سمندر کی ہر رکاوٹ کو عبور کرتے ہوئے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ لوگوں کو ان کی منزل پر پہنچا دیتا ہے۔ یہ کتنا حیرت ناک واقعہ ہے۔ آج بے شمار لوگ اس سفری سہولت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مگر ان میں شاید ہی کوئی ہو جس کا حال یہ ہو کہ خدا کی اس عظیم نعمت کو سوچ کر اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور وہ استعجاب (awe) کے سمندر میں غرق ہو کر کہہ اٹھے: فبأی آلاء ربکما تکذبان۔

فلپائن کے ایک صاحب (احمد نوح) سے ائیر پورٹ پر ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ فلپائن میں سات ملین مسلمان ہیں۔ مسلمان تعلیمی اعتبار سے بہت پیچھے ہیں۔ حتی کہ ان کے بیان کے مطابق سارے فلپائن میں ایک بھی مسلمانوں کا پریس موجود نہیں۔

فلپائن کے ایک علاقے میں مسلمان آزادی کی تحریک چلا رہے ہیں۔ اس تحریک آزادی کے لیڈر پہلے صرف مسٹر نور میسواری تھے۔ ہاشم سلامات ان کے نائب تھے۔ اب دونوں میں سخت اختلاف ہو گیا ہے۔ دونوں الگ الگ اپنی تحریکیں چلا رہے ہیں۔ احمد نوح صاحب دونوں لیڈروں سے ملے۔ انھوں نے نور میسواری سے کہا کہ اگر آپ نے اپنی سیاست کو نہ بدلا تو انقلاب ناکام ہو جائے گا۔ (ان لم تغیر سیاستك الآن فالثورة ستفشل) مگر دونوں کو متحد کرنے کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔

ان کی گفتگو سے میں نے اندازہ کیا کہ فلپائن کے دونوں لیڈر اگرچہ اپنے اختلاف اور علیحدگی کے لئے اصولی الفاظ بولتے ہیں، مگر اصلاً یہ قیادت کا جھگڑا ہے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ وہی جھگڑا ہے جو ہندستان سمیت تمام ملکوں میں پیش آرہا ہے۔ لوگ اسلام کے نام پر اٹھتے ہیں۔ کام شروع کرتے ہیں۔ مگر جلد ہی بعد ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کی سرگرمیاں حقیقۃً اسلام کے لئے ہوتیں تو اختلاف کے وقت ایک شخص پیچھے ہو جاتا اور پھر اختلاف اپنے آپ ختم ہو جاتا۔ مگر جب اصل مقصد لیڈری ہو اور اسلام کا نام محض نعرہ کے طور پر استعمال کیا جائے تو ہمیشہ ایسا ہی

پیش آتا ہے۔

طرابلس میں میرا قیام فندق المھاری (کمرہ ۷۱۲) میں تھا۔ یہ ہوٹل بحر روم کے کنارے واقع ہے۔ ایک طرف خشکی کے مناظر ہیں، اور دوسری طرف سمندر کی موجیں حد نظر تک متحرک نظر آتی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کیسا عجیب احسان ہے۔ انسان کو پانی کی ضرورت تھی۔ پانی کو اگر سطح ارض پر پھیلا دیا جاتا تو انسان کے لئے رہنے کی جگہ باقی نہ رہتی۔ اللہ تعالیٰ نے زمین میں بڑی بڑی گہرائیاں پیدا کیں اور ان میں پانی کو بھر دیا۔ مزید یہ کہ اس پانی میں نمک کا جزء شامل کر دیا تاکہ وہ کبھی خراب نہ ہونے پائے۔ اس سمندر کے بے شمار فائدے ہیں۔ جن کو کسی انسائیکلو پیڈیا میں بھی شمار کرنا ممکن نہیں۔ آدمی اگر اس معاملہ کا احساس کرے تو اس کے سینہ میں وہی تلاطم مزید شدت کے ساتھ پیدا ہو جائے جو سمندر کی سطح پر ہر آن جاری رہتا ہے۔

اس ہوٹل میں ایک خاص بات یہ تھی کہ اس کے عین سامنے سڑک کے دوسری طرف ایک خوبصورت مسجد تھی۔ اذان کی آواز کمرہ تک پہنچتی تھی۔ اور یہ ممکن تھا کہ بآسانی وہاں جاکر جماعت کے ساتھ نماز ادا کی جاسکے۔ دنیا کے ساتھ دین کا یہ جوڑ اگر مسلمان کی پوری زندگی میں آجائے تو زندگی ہر اعتبار سے کتنی بہتر ہو جائے۔

سفر کے دوران ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے موجودہ زمانہ میں جو نئے وسائل انسان کے قبضہ میں دئے ہیں، وہ ابھی تک دین کی اشاعت کے لئے استعمال نہ ہو سکے۔ مثال کے طور پر ہوائی جہاز نے سفر کو کتنا زیادہ تیز رفتار بنا دیا ہے، مگر وہ عام طور پر صرف دنیوی اغراض کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔

مذکورہ بزرگ نے ایک "عالمی تحفظ نبوت کانفرنس" میں شرکت کی تھی۔ وہ کہنے لگے کہ آپ ایسا کس طرح کہتے ہیں۔ دیکھئے فلاں مقام پر مسلمانوں نے بڑے پیمانہ پر تحفظ نبوت کانفرنس کی۔ اس میں ساری دنیا کے مسلم علماء جمع ہوئے۔ اگر ہوائی جہاز کا استعمال نہ کیا جاتا تو اتنی وسیع انداز کی عالمی کانفرنس منعقد کرنا ممکن نہ ہوتا۔

میں نے کہا کہ "تحفظ نبوت کانفرنس" کو میں کوئی اسلامی کام نہیں سمجھتا۔ اس پر وہ حیرت میں پڑ گئے۔ میں نے کہا کہ اس دین کی حفاظت کی ذمہ داری تو خود خدا نے لے لی ہے۔ اس دین کو لانے

والے پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے ابدی طور پر مقام تعریف (مقام محمود) پر کھڑا کر دیا ہے۔ اس کی حفاظت آپ کیا کریں گے۔ اسلام اور پیغمبر اسلام آپ کے تحفظ سے مستغنی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ "تحفظ نبوت کانفرنس" کرنا اتنا ہی بے معنی ہے جتنا "تحفظ آفتاب کانفرنس" کرنا۔ پیغمبر اسلام کو اس کی ضرورت نہیں کہ مسلمان ان کا تحفظ کریں۔ پیغمبر اسلام کے امتی ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ آپ کی تعلیمات کو دوسروں تک پہنچائیں (بلغوا عنی ولو آیۃ) آج مسلمانوں کی ذمہ داری اشاعت نبوت ہے نہ کہ تحفظ نبوت۔ مگر موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ جو کرنا ہے اس کو کرتے نہیں، اور جو نہیں کرنا ہے اس کے لئے دوڑتے ہیں۔

اس سفر میں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ایک عرب نوجوان نے ۱۸ مارچ کی ملاقات میں بڑی عجیب بات بتائی۔ انھوں نے راقم الحروف کی عربی کتابیں پڑھی ہیں اور الرسالہ مشن سے واقف ہیں۔ تاہم وہ میرے احوال اور میری مشکلات سے مکمل طور پر ناواقف تھے۔ انھیں کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ میرے خلاف لوگوں نے مخالفت کا طوفان برپا کر رکھا ہے۔ حتی کہ مجھے "اہانت امت" کی سزا دینے کا فتویٰ دیا جا رہا ہے۔

مذکورہ عرب نوجوان نے بتایا کہ فروری ۱۹۹۰ میں انھوں نے ایک خواب دیکھا۔ انھوں نے دیکھا کہ وہ میرے ساتھ ایک مکان میں ہیں۔ ہم لوگ سخت خطرے میں گھرے ہوئے ہیں اور بے حد پریشان ہیں۔ اس دوران مذکورہ عرب نوجوان گھر سے باہر نکلے تاکہ حالات کا اندازہ کریں۔ اتنے میں انھوں نے دیکھا کہ سامنے کی سڑک سے حضرت عمر فاروق گزر رہے ہیں۔ وہ خاموشی سے چلتے ہوئے آگے نکل گئے۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق وہاں سے گزرے۔ وہ وہاں ٹھہر گئے اور مذکورہ عرب نوجوان سے کہا:

قل لوحید الدین و اصحابہ، اخرجوا و لا تخافوا، انتم فی حمایۃ اللہ

ایک اور عرب جنھوں نے اپنا نام العیساوی بتایا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے آپ کی اکثر عربی مطبوعات پڑھی ہیں۔ میں نے کہا کہ ہمارے مشن کا خلاصہ آپ نے کیا سمجھا ہے۔ انھوں نے کہا: ھٰذہ الرسالۃ تقدم الھدف الاساسی للانسان۔ نحن مخلوقون للآخرۃ، والامور الاخریٰ تخضع للاحوال والظروف۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے خود اس سے کیا تاثر لیا۔ ان کا جواب یہ تھا: حوّلتنی من مسلم مادی الی مسلم صرف۔ یعنی اس نے مجھے مادی سوچ والے مسلمان سے

بدل کر خالص مسلمان بنا دیا۔

کئی عربوں نے میرے بارہ میں اور اسلامی مرکز کے مشن کے بارہ میں اپنے خواب بتائے جو نہایت عجیب اور بظاہر ناقابل قیاس تھے۔ مثلاً ایک عرب نوجوان نے کہا کہ میں نے آپ کو خواب میں دیکھا۔ خواب میں آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ میرے پاس عربی لباس نہیں۔ اس پر عرب نوجوان نے کہا کہ میرے پاس دو عربی لباس ہیں۔ ان میں سے ایک میں آپ کو دے دیتا ہوں۔

ایک اور عرب نے بتایا کہ خواب میں ان سے میری ملاقات ہوئی۔ اس وقت میں نے ان سے جو گفتگو کی وہ انگریزی زبان میں تھی۔ میں نے انگریزی داں قوموں میں اسلام کی اشاعت کی ضرورت پر زور دیا۔ وغیرہ۔

پاکستان کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو الرسالہ پابندی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ فکری تطہیر کا کام تو بہت اچھا کر رہے ہیں، مگر عملی انقلاب کے لئے ابھی تک آپ نے کوئی پروگرام شروع نہیں کیا۔

میں نے کہا کہ "عملی انقلاب" نتیجہ کا نام ہے نہ کہ کوشش کا۔ میں نے کہا کہ ہر انقلاب در اصل حالات کے انفجار کا نام ہے۔ مثلاً ایران کا انقلاب اینٹی شاہ جذبات کے ابل پڑنے کا نام تھا۔ وہ تمام واقعات جن کو انقلاب کہا جاتا ہے، ان کی صورت یہی تھی کہ رائج الوقت نظام کے خلاف ناراضی پیدا ہوئی۔ یہ ناراضی اندر اندر پکتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ تخریبی لاوا کی صورت میں ابل پڑی۔

تمام انقلابات تخریبی لاوا کے ابل پڑنے کے نتیجہ میں ظہور میں آئے ہیں۔ تاریخ میں ایک ہی انقلاب اس سے مستثنیٰ ہے، اور وہ پیغمبر اسلام کا انقلاب ہے۔ پیغمبر اسلام کا لایا ہوا انقلاب بھی ایک لاوا کے پھٹنے سے ظہور میں آیا۔ مگر یہ تعمیری لاوا تھا، نہ کہ دوسرے انقلابات کی طرح تخریبی لاوا۔

پیغمبر اسلام کے انداز کا انقلاب لانے کے لئے تعمیری لاوا تیار کرنا ہوتا ہے۔ اور یہ صرف تعمیر شعور کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ الرسالہ مشن اس وقت یہی کام کر رہا ہے۔ یہ مشن گویا ایک تعمیری لاوا پکا رہا ہے۔ جس دن یہ لاوا پک کر تیار ہوگا وہ اپنے آپ پھٹ پڑے گا۔ مگر اس کا پھٹنا خاموش تعمیری انقلاب کی صورت میں ہوگا نہ کہ پرشور تخریب کاری کی صورت میں جس کے نمونے آج جگہ جگہ نظر آرہے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ اس "تعمیری لاوا" کو پکانے کے لئے الرسالہ کا مسلسل جاری رہنا ضروری ہے، پھر آپ نے اپنے بعد اس کا کیا انتظام کیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ مشن آج بھی اللہ کی مدد سے جاری ہے، اور آئندہ بھی اللہ نے چاہا تو اسی کی مدد سے وہ جاری رہے گا۔ تاہم اسباب کے درجہ میں میں کہہ سکتا ہوں کہ جس قسم کے افراد دوسری تحریکوں کے پاس ہیں اور ان تحریکوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں، اس قسم کے افراد ہمارے پاس بھی موجود ہیں۔ پھر جس درجہ کے افراد دوسری تحریکوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں، اسی درجہ کے افراد اس تحریک کو کیوں جاری نہیں رکھ سکتے۔

اس کانفرنس میں میں نے کوئی مقالہ پیش نہیں کیا۔ یہ کانفرنس مقالات کے لئے نہیں تھی۔ اس میں کسی کا بھی کوئی مقالہ پیش نہیں ہوا۔ اس کانفرنس کا خاص موضوع دو چیزوں پر غور کرنا تھا۔ ایک مختلف علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں کا اتحاد۔ دوسرے، عالم اسلام کو پیش آنے والے خطرات ومسائل۔

لوگوں نے اپنے اپنے ذہن کے مطابق مختلف باتیں کہیں۔ میری رائے یہ تھی کہ مسلم دنیا کا اتحاد محض ایک کانفرنس کرکے حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے مستقل اور متواتر کوشش کرنا ہوگا۔ اس کوشش کا خاص نکتہ یہ ہونا چاہئے کہ مسلمانوں کے اندر یہ ذہن بنایا جائے کہ وہ اختلاف کے باوجود متحد ہونا جانیں۔ اس دنیا میں کبھی اتحاد کی بنیاد پر اتحاد نہیں ہوتا بلکہ اختلاف کی بنیاد پر اتحاد ہوتا ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان اس نکتہ سے بے خبر ہیں۔ اس لئے وہ جگہ جگہ لڑ رہے ہیں۔ وہ اعراض کرنے والی باتوں میں ٹکراؤ کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے اندر جس دن "اختلاف کے باوجود اتحاد" کا مزاج آجائے گا اسی دن ان کے درمیان عملاً اتحاد قائم ہوچکا ہوگا۔

خطرات ومسائل کے بارے میں میں نے کہا کہ خطرات ومسائل اگرچہ بظاہر ہمارے باہر نظر آتے ہیں۔ مگر خطرات ومسائل کے اسباب ہمارے اپنے اندر ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی بے شعوری، ان کے اندر مقابلہ کی استعداد کی کمی، زمانی قوت میں ان کا پیچھے ہوجانا، یہ اصل اسباب ہیں جنھوں نے موجودہ مسلمانوں کو ہر جگہ خطرات ومسائل میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس لئے اس بظاہر بیرونی مسئلہ کے لئے بھی ہمیں سب سے زیادہ اپنے داخلی محاذ پر محنت کرنا چاہئے۔

ہوٹل کے طعام گاہ میں ایک میز پر ہم تین آدمی دن کا کھانا کھا رہے تھے۔ میرے سوا ایک شارجہ

کے تھے اور دوسرے مصر کے۔ کچھ دیر بعد ایک اور مصری دکتور آئے۔ وہ ہمارے قریب والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے ایک منٹ انتظار کے بعد ہوٹل کے آدمی کو مخاطب کرتے ہوئے مزاحیہ انداز میں کہا: هل المتأخرون يأكلون ام لا؟ يأكلون (بعد کو آنے والے کھائیں گے یا نہیں) تھوڑی ہی دیر میں آدمی نے کھانے کی پلیٹ لاکر ان کے سامنے رکھ دی۔ حالانکہ عام حالت میں انھیں دیر میں کھانا پہنچنا چاہئے تھا۔ انھوں نے کہا کہ مزاح اکثر حالات میں بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ وہ کھانے کے پورے وقت میں مزاحیہ انداز میں باتیں کرتے رہے۔

اکثر لوگوں کا انداز یہی ہوتا ہے۔ مگر مجھے ذاتی طور پر یہ انداز بالکل پسند نہیں۔ جس وقت کھانا سامنے رکھا ہوا ہو، وہ انتہائی سنجیدگی کا وقت ہوتا ہے۔ کھانا اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان نعمت ہے۔ یہ وقت وہ ہوتا ہے جب کہ آدمی پر سب سے زیادہ شکر کا جذبہ طاری ہونا چاہئے۔ ایسے موقع پر مزاحیہ کلام شکر کے احساسات کا قاتل ہے۔ دسترخوان کے اوپر سب سے بڑا کلام یہ ہے کہ آدمی خاموش رہے اور اللہ کو یاد کرتے ہوئے کھانا کھائے۔

ایک مشہور عرب شخصیت کے بارہ میں ایک صاحب نے بتایا کہ وہ آپ کی الاسلام یتحدی جیسی کتابوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ ان کا کہنا ہے کہ وحید الدین خاں آخرت پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں، مگر قرآن میں آخرت کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں پائی جاتی (الشیخ وحيد الدين يركز على الآخرة، و الآخرة ليس لها اهمية فى القرآن)

میں نے کہا کہ قرآن کے بارہ میں یہ ایک ایسے شخص کا تاثر ہے جو مسلمان ہے۔ دوسری طرف ہندستان میں ایک ہندو تعلیم یافتہ شخص کو قرآن کا ہندی ترجمہ دیا گیا۔ اس نے پڑھنے کے بعد اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ قرآن کو پڑھ کر تو میں بہت ڈر گیا۔ کیوں کہ اس میں تو سب آخرت اور حساب وکتاب کی باتیں لکھی ہوئی ہیں۔

ایک مجلس میں ایک صاحب نے کہا کہ مسلم ملکوں میں ہر جگہ جبر ہے۔ مگر اس جبر کو ختم کرنے کے لئے کوئی طاقت ور تحریک نہیں اٹھتی۔ میں نے کہا کہ یہ تفکیر پیغمبرانہ تفکیر کے مطابق نہیں۔ پیغمبر کا طریقہ یہ ہے کہ وہ جبر (سیاست میں بگاڑ) کو برداشت کرتا ہے۔ وہ اپنی ساری کوشش شرک (عقیدہ میں بگاڑ) کو درست کرنے پر لگا دیتا ہے۔ جبر کو ختم کرنے کا کام خود خدا نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ البتہ شرک

کوختم کرنے کی ذمہ داری داعی کے اوپرڈالی گئی ہے۔

جبر کو قانون خداوندی کے تحت بہرحال ختم ہونا ہے۔ اس لئے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ عقیدہ کی اصلاح، ذہن کی تربیت اور اخلاق کی تعمیر پر محنت صرف کی جائے۔ تاکہ جب خدا جابروں کے اقتدار کو توڑے تو صالح افراد کا ایک قابل اعتماد گروہ اس کی جگہ لینے کے لئے معاشرہ میں موجود ہو۔

موجودہ زمانہ میں مسلم قائدین کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے سیاسی جبر کے نظام کو توڑنے کو اولین اہمیت دے دی۔ وہ اپنی ساری توجہ اور محنت اسی محاذ پر صرف کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ایک سیاسی جبر ٹوٹا تو اس کی جگہ دوسرے سیاسی جبر نے لے لی، کیونکہ اس کی جگہ لینے کے لئے کوئی قابل اعتماد صالح گروہ وہاں موجود نہ تھا۔

مثلاً مصر کے اسلام پسندوں نے شاہ فاروق کے سیاسی جبر (۱۹۵۲) کو توڑا تو اس کے فوراً بعد جمال عبدالناصر کا سیاسی جبر قائم ہوگیا۔ پاکستان کے اسلام پسندوں نے ایوب خاں کے سیاسی جبر (۱۹۶۹) کو توڑا تو اس کے بعد جو چیز وہاں قائم ہوئی وہ مسٹر بھٹو کا سیاسی جبر تھا۔

ایک صاحب نے جنرل محمد ضیاء الحق کی بہت تعریف کی۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے خیال میں جنرل ضیاء الحق صاحب کا خاص کارنامہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرے نزدیک ان کا سب سے بڑا تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اقوام متحدہ کے ایوان میں حق کی آواز بلند کی۔

میں نے کہا کہ جنرل محمد ضیاء الحق نے اپنے ساڑھے گیارہ سالہ دور حکومت (۸۸ - ۱۹۷۷) کے دوران میرے نزدیک اسلام یا ملت اسلام کا کوئی حقیقی کام نہیں کیا۔ جو کام ان کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں (مثلاً اقوام متحدہ میں تقریر کرنا) وہ سب اخباری اہمیت کے کام ہیں نہ کہ حقیقی اہمیت کے کام۔ البتہ صدر ضیاء الحق کے ذریعہ ایک کارنامہ ضرور انجام پایا ہے۔ اور وہ ہے ایک افسانہ کا خاتمہ۔ ان کے ذریعہ پاکستان کا اسلام پسند طبقہ مکمل طور پر اکسپوز (expose) ہوگیا۔ ضیاء الحق صاحب نے حکومت کے اندر اور حکومت کے باہر وہاں کی اسلام پسند جماعت اور وہاں کے علماء کو مکمل مواقع دئے۔ مگر ان لوگوں نے صرف یہ ثابت کیا کہ وہ لوگ اس کام کے لئے آخری حد تک نااہل ہیں۔ وہ نہ حکومتی عہدوں کو اسلامی انداز پر سنبھالنے کی استعداد رکھتے ہیں اور نہ حکومت کے باہر کوئی گہرا تعمیری کام کرنے کی صلاحیت ان کے اندر موجود ہے۔

موجودہ حالت میں کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ خاموش فکری مہم کے ذریعہ ذہنوں کو بدلا

جائے ۔اس کو "تعمیر شعور" کی مہم کہا جا سکتا ہے ۔ یہ کام اگر صحیح انداز میں کیا جائے تو کچھ عرصہ کے بعد ایک طرف اعلیٰ صلاحیت کے افراد کی ایک باشعور ٹیم تیار ہو جائے گی جو ذمہ دارانہ مناصب کو چلانے کی اہل ہو۔ دوسری طرف عمومی سطح پر معاشرہ میں صالح تعمیری فضا پیدا ہو جائے گی۔ یہی دونوں وہ چیزیں ہیں جو ایک جابرانہ نظام کے ٹوٹنے کے بعد دوسرے صالح نظام کے قیام کی ضمانت بن سکتی ہیں۔ یہی وہ "صبر" ہے جس کا قرآن کی اس آیت میں ذکر ہے: وجعلنا منهم أئمة يهدون بأمرنا لما صبروا۔

یہاں جس نشست یا جس مجلس میں بھی مجھ کو بولنے کا موقع ملا، میں نے دعوت کی بات کہی۔ ایک نشست میں میں نے کہا کہ اللہ کی سب سے بڑی مرضی، قرآن و حدیث کے مطابق، یہ ہے کہ اس کے بندے آگ میں جانے سے بچیں۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ اس کے دین کا پیغام ہر ملک میں اور ہر گھر میں پہنچ جائے۔ اس کام کی تکمیل دور آخر میں ہونے والی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ لا یبقی علی ظهر الارض بیت مدر ولا وبر الا ادخله الله كلمة الاسلام۔ حدیث کے راوی اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ اس وقت دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے گا (قلت فيكون الدين كلّه لله)

اس کے ساتھ اس واقعہ کو ملا لیجئے کہ موجودہ زمانہ میں پہلی بار وہ وسائل اعلام انسان کے قبضہ میں آئے ہیں جو اس قسم کی عالمی اشاعتِ دین کو ممکن بنا دیں۔ ان دونوں باتوں کو سامنے رکھنے کے بعد یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آج اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی مرضی یہ ہے کہ اللہ کے سچے دین کی آواز تمام دنیا اور ہر گھر میں پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام اتنا اہم ہے کہ مسلمانوں کو ہر دوسرا کام چھوڑ کر اس کو انجام دینا ہوگا۔ کیوں کہ اس کے بغیر اس کام کو موثر طور پر انجام نہیں دیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر اگر ہم اسلام کی مخاطب قوموں سے غیر دعوتی عنوانات پر ٹکراؤ کرتے رہیں تو وہ فضا درہم برہم ہو جائے گی جب کہ کسی شخص تک دین کا پیغام پہنچایا جائے اور وہ اس کو سنجیدگی کے ساتھ سنے اور اس پر غور کرے۔

ایک اور نشست میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں جو مسلم جماعتیں مسلم حکمرانوں سے ٹکراؤ کر رہی ہیں، اس کو میں سراسر لغو سمجھتا ہوں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اسلام

کا مقصد صالح نظام بنانا ہے۔ اور صالح نظام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ موجودہ زمانہ کی مسلم حکومتیں ہیں جو سیاسی جبر کے اوپر قائم ہیں۔ اگر ہم اس سیاسی جبر کا خاتمہ نہ کریں تو ہم کبھی بھی صالح نظام قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔

میں نے کہا کہ جبر (اجباری نظام) کو توڑنے کے لئے، ہمیں براہ راست جدوجہد کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کام خود خدا کی طرف سے زیادہ موثر طور پر انجام دیا جارہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس دنیا کو خدا نے امتحان کی مصلحت کے تحت بنایا ہے۔ امتحان کی مصلحت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ لوگوں کو اپنے عمل کی آزادی ہو۔ اگر کسی آدمی کا ہاتھ پاؤں باندھ دیا جائے تو اس پر یہ الزام نہیں لگایا جاسکتا کہ اس نے مسجد میں جاکر نماز ادا نہیں کی۔

رات کا اندھیرا ضرور ختم ہوتا ہے۔ رات کو ختم کرنے کے لئے ہمیں اس سے براہ راست لڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اپنے اندر یہ استعداد پیدا کریں کہ جب رات ختم ہو کر دن آئے تو ہم اس کو پوری طرح استعمال کرسکیں۔ اسی طرح نظام جبر کے دوران ہمیں یہ تیاری کرنا چاہئے کہ جب خدا اس کو ختم کرے تو ہم نئے مواقع کو استعمال کرکے صالح نظام کی تعمیر کرسکیں۔

۹۰-۱۹۸۹ کے درمیان روس میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ خدا کے اسی قانون کی بنا پر ہے۔ سوویت یونین نے زمین کے ایک بڑے رقبہ پر کامل جبر کا نظام قائم کر دیا تھا۔ یہ صورت حال خدا کی مصلحت کے سراسر خلاف تھی۔ یہ خدا کی دی ہوئی امتحانی آزادی کو ساقط کرنے کے ہم معنی تھا۔ چنانچہ خدا کی طاقت ظاہر ہوئی اور اس نے حیرت انگیز طور پر سوویت ایمپائر کو توڑ دیا۔

موجودہ زمانہ کے اسلام پسند رہنما اپنے حصہ کا کام نہیں کرتے۔ وہ خدا کے حصہ کا کام کرنے کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب خدا نظام جبر کو توڑتا ہے تو اسلام پسند قائدین اس حیثیت میں نہیں ہوتے کہ وہ سابق نظام کی جگہ لے سکیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک جبر کے بعد دوسرا جبر اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ یا نظام جبر ٹوٹنے کا فائدہ صرف ان لوگوں کے حصہ میں چلا جاتا ہے جو آزادی کو بے راہ روی کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

کھانے کی میز پر دو آدمی بات کر رہے تھے۔ ایک قبرص کے تھے۔ دوسرے سرینام کے۔ دونوں میں تعارف ہوا۔ گفتگو ہونے لگی۔ ایک صاحب اپنے ملک کی پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ دوسرے

صاحب ایک تنظیم کے سکریٹری تھے۔ ایک نے دوسرے سے کچھ معلومات اپنے ملک کے بارہ میں بھیجنے کے لئے کہا۔ دوسرے نے کہا کہ ضرور بھیجوں گا۔ آپ اپنا فیکس (Fax) نمبر دیدیجئے۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جدید وسائل کے ظہور نے موجودہ زمانہ میں مواصلات کو کتنا تیز رفتار بنا دیا ہے۔ ڈاک اور تار اور ٹیلکس اب "فرسودہ" چیز بن چکے ہیں۔ اب آدمی "فیکس" کی رفتار سے مواصلاتی تعلق قائم کرنا چاہتا ہے۔

ہمارے اسلامی ادارے ابھی اس سے بہت دور ہیں کہ ان کے یہاں فیکس کا طریقہ استعمال ہونے لگے۔ اگر کسی ادارہ میں کسی "شیخ" کی فیاضی سے فیکس کی مشین لگ گئی ہو، تب بھی وہ عملاً بے فائدہ ہے۔ مواصلاتی ذرائع کا مشینی ارتقاء جس بلندی تک پہنچا ہے، اسلامی اداروں کا شعوری ارتقاء بھی جب تک اس بلندی تک نہ پہنچے، اس وقت تک فیکس جیسی چیزوں کا صحیح استعمال ان اداروں میں ممکن نہیں۔

عربوں کی ایک مجلس میں میں نے اسلام کے روحی پہلو پر گفتگو کی۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال اس آیت جیسا ہو رہا ہے کہ یعلمون ظاهراً من الحياة الدنيا وهم عن الآخرة هم غافلون (الروم ۷) وہ عظمت ظاہری کو جانتے ہیں مگر وہ عظمت معنوی کو نہیں جانتے۔ دین کا معنوی پہلو ہی اس کا اصل پہلو ہے۔ مگر اپنی اس کمی کی بنا پر وہ اس کے ادراک سے عاجز ہو رہے ہیں اور ظاہری پہلوؤں میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔

ایک بار کا واقعہ ہے۔ مجھے یورپ کے ایک بڑے ہوٹل میں کھانا کھانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ لوگ کھانوں سے بھری ہوئی میز کے سامنے بے فکری کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ چھری کانٹے کی دھیمی موسیقی میں لوگوں کے قہقہے بلند ہو رہے ہیں۔ ہر آدمی تفریحی باتیں کر کے اپنی بے فکری کا اظہار کر رہا ہے۔ میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک عرب ساتھی سے کہا کہ لوگوں کو جنت کیسے مل سکتی ہے جب کہ ان کا یہ حال ہو کہ اس کے لئے عمل کرنا تو درکنار، انھوں نے خدا سے اس کو مانگا بھی نہیں۔

(كيف تكون لهم الجنة وهم لم يسألوا الله الجنة فضلاً عن ان يعملوا لها)

میں نے کہا کہ جنت کا مستحق بننے کے لئے کم سے کم جو چیز درکار ہے، وہ یہ کہ آدمی کے دل میں اس کی شدید طلب پیدا ہو۔ ایک طرف اپنی بے مائگی کا احساس اور دوسری طرف جنت کا اشتیاق،

اس دوطرفہ احساس کے نتیجہ میں اس کی زبان سے بے اختیارانہ نکل پڑے کہ خدایا، میرے پاس کوئی عمل نہیں جو مجھ کو جنت میں لے جائے۔ لیکن خدایا، میں عاجز ہوں۔ جہنم کو برداشت کرنے کی طاقت میرے اندر نہیں۔ میں تجھ سے جنت کا سوال کرتا ہوں۔ تو مجھے جنت دیدے، اس لئے نہیں کہ میں نے اس کے لئے عمل کیا، بلکہ اس لئے کہ میں نے تجھ سے اسے مانگا:

یارب لیس عندی عمل یوٗدی بی الی الجنۃ، ولکن انا عاجز لا استطیع الصبر علی النار۔ فانا اسأ لک الجنۃ۔ رب ھب لی الجنۃ، لا لِاَنّی عملتُ لھا بل لانی سأ لتُھا منک۔

اکثر بالواسطہ نتیجہ زیادہ بڑا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن لوگ اپنی ظاہر پسندی کی وجہ سے صرف براہ راست واقعات کو دیکھ پاتے ہیں۔ اور اسی کی بابت بحث ومباحثہ میں الجھے رہتے ہیں۔ مثلاً جمال عبدالناصر کے سوشلزم اور قوم پرستی کے نظریات مسلم پریس میں زیادہ تنقید کا موضوع رہے ہیں۔ حالانکہ اس سے زیادہ دوررس نتائج وہ ہیں جو جمال عبدالناصر کی لایعنی پالیسیوں کے ذریعہ بالواسطہ طور پر برآمد ہوئے۔

ایک صاحب نے کہا کہ میں نے سید قطب اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابیں پڑھیں ہیں اس کے بعد گفتگو کے دوران جمال عبدالناصر کا ذکر آیا تو وہ جمال عبدالناصر کی پالیسیوں پر سخت تنقید کرنے لگے۔

میں نے کہا کہ مجھے جمال عبدالناصر کے سوشلزم اور ان کے قوم پرستی کے نظریات سے اتفاق نہیں۔ تاہم یہ جمال عبدالناصر ہی کی "برکت" ہے کہ ان شخصیتوں کو عرب دنیا میں وہ مقبولیت حاصل ہوئی جن کا آپ نے ذکر کیا۔ یہ گویا ناصرازم کا بالواسطہ نتیجہ تھا۔

جمال عبدالناصر نے سوشلزم کا نعرہ لگایا اور روس سے اپنا رشتہ جوڑا۔ وہ عالم عرب کا لیڈر بننے کا خواب دیکھنے لگے۔ اپنے اس جوش کے تحت انھوں نے یہ حماقت کی کہ انھوں نے کمیونسٹ یمن کی تائید کی اور یمن کے راستہ سے اپنی فوجیں سعودی عرب میں داخل کر دیں۔

ناصر کی ان پالیسیوں کے نتیجہ میں ناصر اور سعودی حکمرانوں کے درمیان شدید رقابت قائم ہوگئی۔ مشہور ہے کہ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔ چونکہ سید ابوالاعلیٰ مودودی فکری حیثیت سے اور

سید قطب سیاسی رقیب کی حیثیت سے ناصر کے مخالفین میں تھے ، اس لئے ان دونوں (اور بعض دوسرے افراد کو) سعودی عرب میں پذیرائی حاصل ہوگئی۔ ان کی کتابیں سعودی عرب کی قیمت پر ہر زبان میں بڑی تعداد میں پھیلائی جانے لگیں۔

سید ابو الاعلیٰ مودودی اور سید قطب کی کتابوں کے بڑے پیمانہ پر پھیلنے کا خاص سبب یہی سعودی تعاون ہے۔ حالانکہ استدلالی اعتبار سے دونوں صاحبان کی کتابیں سطحی تھیں۔ ان کی اہمیت زیادہ تر ان کی انشاء پردازی میں تھی نہ کہ ان کی علمی حیثیت میں۔ خریداری کی بنیاد پر یہ کتابیں کبھی نہ پھیلتیں۔ مگر مفت تقسیم کی بنا پر وہ ہر جگہ پہنچ گئیں۔

ایک عرب عالم اخوان سے تعلق رکھتے تھے اور مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی تحریروں سے کافی متاثر تھے۔ انھوں نے میرے بارہ میں کہا کہ آپ کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ اسلام دعوت کا نام ہے۔ اسلام کا سیاست اور حکومت سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر انھوں نے مولانا مودودی کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ مودودی سے پہلے اسلام صرف نماز اور عبادت کا نام تھا۔ مودودی نے بتایا کہ اسلام ایک کامل اور شامل نظام ہے۔

میں نے کہا کہ آپ جیسے لوگ دین کو ایک ڈھانچہ کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ آپ نماز کو بھی ایک ظاہری ڈھانچہ سمجھتے ہیں اور نظام حکومت کو بھی ایک ظاہری ڈھانچہ۔ اس لئے آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ نماز دین کا جزئی ڈھانچہ ہے اور نظام حکومت دین کا مکمل ڈھانچہ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دین ایک معنوی حقیقت کا نام ہے نہ کہ ظاہری ڈھانچہ کا۔ یہ ایک ہی معنوی حقیقت ہے جو مسجد میں نماز کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور سیاست میں اسلامی نظام حکومت کی صورت میں۔

میرے فکر اور دوسروں کے فکر میں آپ کا یہ تقابل صحیح نہیں۔ دونوں میں اصل فرق یہ ہے کہ ہم دین کو ایک معنوی حقیقت سمجھتے ہیں جس کو شریعت میں تقویٰ کہا گیا ہے۔ اور آپ نے دین کو ایک ظاہری ڈھانچہ سمجھ رکھا ہے۔ ہم دین کے احیاء کے لئے اس کی معنویت کے احیاء کی کوشش کر رہے ہیں، اور دوسرے لوگ دین کے احیاء کے لئے اس کے خارجی نظام کا احیاء کرنا چاہتے ہیں۔

طرابلس کے ہندستانی سفارت خانہ میں بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ جناب ذکر الرحمٰن صاحب

وہاں سکنڈ سکریٹری کے طور پر ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ مسٹر رحمٰن کو سفارت خانہ میں بہت باعزت مقام حاصل ہے۔ ہر ایک ان کا احترام کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنا کام نہایت مستعدی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ اور اکثر اپنی واقعی ڈیوٹی سے زیادہ کام کرتے ہیں۔ شاید یہی وہ حقیقت ہے جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان لفظوں میں بیان کیا: ان قیمة المرء ما یحسنه۔

آدمی جب کوئی برا کام کرے تو لوگوں کو صرف اس کی برائی یاد رہتی ہے۔ ہر آدمی اس کو بری نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس آدمی جب کوئی اچھا کام کرے تو وہ صرف اس اچھے کام کے واسطہ سے جانا جانے لگتا ہے۔ اس کا اچھا کام ہی اس کی تصویر بن جاتا ہے۔ اس کی زندگی میں اگر کچھ کمتر پہلو ہیں، تو وہ سب پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔

ایک عرب عالم سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہمارے مشن سے پوری طرح واقف ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے نہایت تاثر کے ساتھ کہا کہ آپ کا یہ مشن عربوں کے لئے رحمت ہے۔ کیوں کہ اگر وہ اس فکر کو اختیار کر لیں تو ان کے لئے ممکن ہو جائے گا کہ وہ انٹگریٹی کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔ کیوں کہ موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں نے عالم عربی میں جو حالات پیدا کر دئے ہیں، اس کے بعد ان کے لئے دو برائیوں میں سے ایک برائی کو اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ یا قید یا نفاق۔ اگر وہ چاہیں کہ وہ اپنے موجودہ دینی خیالات کے ساتھ زندہ رہیں تو انھیں عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اور اگر وہ سیاسی نظام کے ساتھ موافقت کرکے زندہ رہیں تو یہ ان کے لئے منافقت ہوگی، کیونکہ ان کے دل میں کچھ ہوگا اور عمل میں کچھ :

ان رسالتك هٰذه رحمة للعرب لان بهٰذه الرسالة هم يستطيعون أن يعيشوا بشخصية انسجامية ، ففي الاحوال القائمة التي توجد في العالم العربي اليوم بسبب الحركات الاسلامية المعاصرة ، لم يبق لهم الا الاختيار بين الشرين ، اما السجن واما النفاق۔ بحيث انهم اذا ارادوا ان يعيشوا طبقاً لمشاعرهم الدينية عُذّبوا وان ارادوا ان يعيشوا وفق النظام ينافقوا

ایک عرب ملک کے متعلق مجھے معلوم ہوا کہ وہاں ایک اسلامی جماعت کے افراد گھریلو انداز پر اپنا اجتماع کیا کرتے تھے۔ اس پر حکومت کی طرف سے پابندی لگا دی گئی۔ بعد کو ان لوگوں نے ذمہ داروں

سے مل کر اس کی اجازت حاصل کر لی۔ مگر یہ اجازت انھیں صرف اس وقت ملی جب کہ انھوں نے اقرار کیا کہ ان کا کوئی تعلق سیاست سے نہیں ہے۔ یہ اقرار ان کے تصور دین کے مطابق سراسر خلاف واقعہ تھا۔ کیوں کہ ان کا جو تصور اسلام ہے اس کی بنیاد ہی سیاست پر قائم ہے۔

۲۱ مارچ ۱۹۹۰ کی شام کو عربوں کی ایک مجلس میں میں نے کہا کہ امت مسلمہ کا اصل مقصد شہادت علی الناس ہے۔ یعنی خالص دعوتی انداز میں وہ کام کرنا جس کو قرآن میں انذار و تبشیر کہا گیا ہے۔ یہ از اول تا آخر ایک فکری مہم ہے، اس کا کوئی تعلق جنگ اور قتال سے نہیں۔ حتیٰ کہ فریق ثانی اگر اشتعال انگیزی کرے تب بھی ہمیں ٹکراؤ سے یک طرفہ اعراض کرنا ہے تاکہ داعی اور مدعو کے درمیان معتدل فضا باقی رہے۔ مسلمان اگر اس کام کو نہ کریں تو وہ خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔

اس سلسلہ میں میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ ۱۹۶۲ میں چین نے آسام کی سرحد پر ہندستان کے علاقہ میں اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ اس وقت تیز پور (آسام) کا کمشنر اپنے دفتر سے بھاگ کر اپنے گھر آگیا۔ گھر پر اپنے بچوں کے ساتھ قیام کرنا عام لوگوں کے لئے کوئی جرم نہیں۔ مگر مذکورہ کمشنر کے لئے یہ چیز جرم بن گئی۔ کیوں کہ اس نے اپنی ڈیوٹی چھوڑ دی تھی۔ جب کسی آدمی کو کسی خاص ڈیوٹی پر مقرر کیا جائے تو اس کی ساری قیمت اس ڈیوٹی کے مقام پر ہوتی ہے۔ کسی اور مقام پر بظاہر وہ کوئی درست کام کر رہا ہو تب بھی اس کے کام کی کوئی قیمت نہیں۔

اس پر ایک عرب نوجوان نے کہا کہ آپ کی مثال سے قتال کا حکم ثابت ہوتا ہے۔ کیوں کہ تیز پور کے کمشنر کی غلطی یہی تھی کہ اس نے قتال کے محاذ کو چھوڑ دیا اور غیر قتال کے میدان میں واپس آگیا۔

میں نے کہا کہ مثال کا یہ مطلب نہیں۔ اصل یہ ہے کہ مثال کی دو قسمیں ہیں، ایک مثال برائے استدلال۔ دوسری مثال برائے توضیح۔ آپ کا اعتراض اس وقت صحیح ہو سکتا تھا جب کہ میں نے یہ مثال برائے استدلال دی ہو، حالاں کہ میں نے یہ مثال برائے توضیح دی ہے۔

جب آپ ایک نقطۂ نظر کو قرآن وحدیث سے ثابت کر دیں اور اس کے بعد ایک مثال بطور توضیح نقل کریں تو اس مثال کا صرف وہ جزء وہاں چسپاں ہوگا جو آپ کی بات سے متعلق (relevant) ہے۔ دوسرے پہلو جو غیر متعلق (irrelevent) ہیں وہ اپنے آپ حذف ہو جائیں گے۔

میں نے اپنے نقطۂ نظر کو اولاً قرآن و حدیث سے ثابت کیا۔ اس کے بعد توضیح کے لئے تیز پور کے کمشنر کی مثال دی۔ اس مثال میں صرف ڈیوٹی کا پہلو میری گفتگو سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے اس کا ڈیوٹی کا پہلو لیا جائے گا، اور قتال کا پہلو اپنے آپ حذف ہو جائے گا۔ میری بات کی تردید کے لئے آپ کو قرآن وحدیث سے دلیل لانی ہوگی، کیونکہ میرا ابنائے استدلال قرآن وحدیث ہے نہ کہ کمشنر کی مثال۔

ایک عرب ملک کے کچھ عرب نوجوانوں سے ملاقات ہوئی۔ یہ ملک وہ ہے جو عام طور پر بدنام ہے کہ وہاں جبر ہے۔ وہاں کے حکمراں بے دین ہیں۔ وہاں اسلامی کام کے مواقع نہیں ہیں۔ مگر ان نوجوانوں کا تجربہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کام کرنے والوں کے لئے ہر جگہ کام کے مواقع ہیں۔

ان عرب نوجوانوں نے راقم الحروف کی عربی مطبوعات پڑھیں اور انگریزی الرسالہ کا مطالعہ کیا۔ اس سے ان کے اندر دعوتی کام کا ذہن پیدا ہوا۔ ان کے ملک میں باہر کے ملکوں کے بہت سے غیر مسلم لوگ کام کرتے ہیں۔ ان کارکن غیر مسلموں کے درمیان انھوں نے دعوتی کام کرنا شروع کیا۔ اب تک وہ بہت سے لوگوں کو اسلام میں داخل کر چکے ہیں۔

انھوں نے مجھے کچھ عربی کے فارم دکھائے۔ یہ فل اسکیپ سائز میں عمدہ کاغذ پر عمدہ چھپے ہوئے فارم تھے۔ ان میں ایک تصویر کا خانہ تھا جہاں نومسلم کی تصویر لگائی جاتی تھی۔ اسی کے ساتھ فارم میں مختلف خانے تھے جن کو نومسلم بھر کر اپنا دستخط کرتا تھا۔ یہ فارم اس ملک کی حکومت نے نومسلموں کے لئے چھپوا رکھے ہیں۔ مذکورہ نوجوانوں نے سرکاری دفتر سے ربط قائم کرکے یہ فارم حاصل کئے اور اسلام قبول کرنے والوں پر اس کو استعمال کرنا شروع کیا۔

اس طرح ایک بد نام ملک میں آزادانہ طور پر ایک دینی کام انجام پا رہا ہے۔ مزید یہ کہ یہ دینی کام وہ ہے جس کی بابت حدیث میں آیا ہے کہ وہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔

ایک عرب نوجوان عمر الہادی سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک عرب یونیورسٹی میں میڈیکل سائنس کے طالب علم ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ الرسالہ انگریزی اور مرکز کی عربی مطبوعات کو پڑھ کر ان کے اندر دعوت کا جذبہ پیدا ہوا۔ اپنی یونیورسٹی کے غیر مسلم پروفیسروں سے انھوں نے ربط قائم کیا۔ اور ان کو انگریزی کتابیں، مثلاً قرآن کا انگریزی ترجمہ، گاڈ ارائزز، پرافٹ آف ریوولیوشن وغیرہ۔

پڑھنے کے لئے دیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بڑے حوصلہ افزا تجربات بتائے۔ مثلاً انھوں نے کہا کہ ان کی یونیورسٹی میں فزیالوجی کے ایک پروفیسر ڈاکٹر "بی آر" ہیں۔ انھوں نے پروفیسر موصوف کو کتابیں پڑھائیں۔ پڑھنے کے بعد ایک ملاقات میں انھوں نے عمر الہادی سے کہا کہ میرے بیٹے، یقین کرو، اگر تم نے اس حقیقت کو دنیا کے سامنے پہنچا دیا، تو تم دیکھو گے کہ دنیا کے ۹۰ فیصد لوگوں نے اسلام قبول کر لیا ہے:

My son, believe me, if you can introduce this truth to the world as you have done to me, you will see that 90% of the world will become Muslim.

نائجیریا کے ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا نام نمدی (Namdi) بتایا۔ ان کی تعلیم بیرونی ملکوں میں ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرا خاندان مسلمان ہے۔ مگر مجھے مسلمانوں کی اس بات سے سخت اختلاف ہے کہ وہ لڑائی (جہاد) کو بہت زیادہ گلوریفائی کرتے ہیں۔ میں کسی بھی قسم کی لڑائی کے سخت خلاف ہوں۔ اسلام اگر سچا مذہب ہو تو وہ لڑائی کا مذہب نہیں ہو سکتا۔ اس معاملہ میں اپنے خاندان سے میرا اتنا اختلاف ہوا کہ میں نے خاندان کو چھوڑ دیا۔ اسلام اگر یہی ہے تو میں اس کو نہیں مانتا۔

میں نے سوچا کہ انسان کی فطرت ایسا دین چاہتی ہے جس میں امن ہو۔ مگر موجودہ مسلمانوں کے ماحول میں اس کو ایسا اسلام نہیں ملتا۔ یہاں وہ دیکھتا ہے کہ اسلام جنگ کا مبلغ ہے۔ وہ اپنی فطرت کی آواز پر چلے تو اس کو اپنے مسلم خاندان کو چھوڑنا پڑتا ہے، وہ اگر خاندان پر چلے تو اپنی فطرت کو۔

عرب اخبارات میں آجکل روزانہ دعوت اسلام اور قبول اسلام کی خبریں ہوتی ہیں۔ مثلاً طرابلس کے اخبار الدعوۃ الاسلامیہ کے صرف ایک شمارہ (۲۱ مارچ ۱۹۹۰) میں اس قسم کی کئی خبریں موجود تھیں۔ ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ پچھلے سات سال میں ہانگ کانگ کے سات ہزار باشندوں نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا ہے (۷ آلاف مواطن فی ھونج کونج یشهرون اسلامهم فی سبعة اعوام)

ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ فرانس میں حال میں ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام اسلام اور فرانس (de I'Islam en France) ہے۔ اس کتاب کے مصنف ایک فرانسیسی بران تیان (Brand Tiyan) ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ فرانس میں اسلام اٹھارویں صدی عیسوی میں داخل ہوا۔ اب فرانس میں مسلمانوں کی تعداد ایک ملین سے زیادہ ہو چکی ہے۔ اس نے مزید لکھا ہے کہ اسلام کے خلاف چرچ کا پروپگنڈہ اب بعد از وقت ہو چکا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ فرانس کے اسکولوں اور کالجوں میں اسلام کو داخل نصاب کیا جائے اور ریڈیو اور ٹیلیویژن کے ذریعہ اسلام کا صحیح تعارف کرایا جائے۔

یہاں ایک عربی کتاب دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کے مصنف کا نام فہمی ھدیدی ہے۔ کتاب کا نام القرآن و السلطان ہے۔ وہ دار الشروق بیروت سے ۱۹۸۱ میں چھپی ہے اور ۲۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف لکھتے ہیں: غایۃ الامر ان المسلمین یسمّون امۃ الاجابۃ وغیرھم یسمون امۃ الدعوۃ (۱۸۹) یعنی اصل حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو اُمتِ اجابت کہا گیا ہے اور ان کے علاوہ کو امتِ دعوت۔

مسلمانوں اور دوسری قوموں کے درمیان یہی اصل تقسیم ہے۔ بقیہ تمام تقسیمات اضافی ہیں۔ مثلاً "دار الحرب" کی اصطلاح اضافی حالت کو بتاتی ہے نہ کہ مستقل حالت کو۔ عام حالات میں تمام غیر مسلم قومیں مسلمانوں کے لئے امت دعوت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یعنی ان کے سلسلہ میں مسلمانوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ان کے اوپر اسلام کا پیغام پہنچائیں۔ البتہ اگر کوئی قوم یک طرفہ طور پر مسلمانوں پر حملہ کر دے، اور اعراض اور صبر کی تمام تدبیروں کے باوجود جنگ سے بچنے کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو اس وقت اہل اسلام بطور دفاع جنگ کریں گے۔

ایک عرب نوجوان نے بتایا کہ ان کی شادی حال میں ایک عرب خاتون سے ہوئی ہے۔ عرب نوجوان نے اپنی تعلیم یافتہ اہلیہ کو راقم الحروف کے کچھ مضامین پڑھنے کے لئے دئے۔ ان مضامین میں اسلام کی سیاسی تعبیر پر اور اسلام کے نام پر سیاسی تحریکیں چلانے والوں پر تنقید تھی۔ خاتون الاخوان المسلمون کے طرز فکر سے متاثر تھیں۔ چنانچہ انھوں نے راقم الحروف کے مضامین کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ تاہم مذکورہ عرب نوجوان ان کو میری تحریریں پڑھانے کی کوشش کرتے رہے۔

انھوں نے بتایا کہ اب ان کی اہلیہ کا ذہن بالکل بدل گیا ہے۔ اور اسلامی مرکز کے فکر سے مکمل اتفاق کر رہی ہیں۔

کچھ عربوں نے یہ تجویز پیش کی کہ تعلیم یافتہ عرب خواتین کا ایک اجتماع کیا جائے اور میں انھیں خطاب کروں۔ میں نے منع کر دیا۔ میں نے کہا کہ میں اپنے ملک میں بھی خواتین کے اجتماعات کو خطاب کرنا پسند نہیں کرتا۔ اب تک میری عام پالیسی یہی ہے۔

"خواتین کا اجتماع" موجودہ صورت میں مجھے اسلامی روح کے مطابق نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ خواتین سے خطاب کرنے کی مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تو ملتی ہے، مگر صحابہ کرام کے یہاں نہیں ملتی۔ مجھے اب تک اس کی مثالیں نہیں ملی ہیں کہ صحابہ عورتوں کا اجتماع کرکے ان سے خطاب کرتے ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں اس کی مثال ملنا اور صحابہ کے یہاں اس کی مثال نہ ملنا ظاہر کرتا ہے کہ یہ طریقہ صرف پیغمبر کے لئے خاص تھا، بعد کے لوگوں کو ایسا کرنا مناسب نہیں۔ بعد کے لوگوں کے لئے یہ ہے کہ وہ مردوں میں کام کریں اور مرد اپنے اپنے گھروں میں اپنی خواتین پر کام کریں۔

اس قسم کا فرق دوسرے امور میں بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے بیعت ایمان لیتے تھے۔ مگر صحابہ و تابعین نے بیعت ایمان نہیں لی۔ وہ صرف کلمۂ شہادت پڑھا کر لوگوں کو اسلام میں داخل کرتے تھے۔

۲۳ مارچ ۱۹۹۰ کو طرابلس سے واپسی ہوئی۔ طرابلس سے کراچی تک کا سفر پی آئی اے کی فلائٹ ۷۱۴ کے ذریعہ ہوا۔ راستہ میں اخبار جسارت (۲۳ مارچ ۱۹۹۰) پڑھا۔ یہ اخبار جماعت اسلامی کے فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کے صفحہ اول پر ۲۳ مارچ (یوم پاکستان) کی مناسبت سے مینار پاکستان کے پاس ہونے والے ایک جلسہ کا اعلان تھا۔ جلی حرفوں میں یہ الفاظ چھپے ہوئے تھے:

اب لینا ہے کشمیر، ٹوٹے شملہ کی زنجیر

پاکستانی کشمیر کے مسلمان شملہ معاہدہ کو زنجیر بتا کر اس کو توڑنے کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ دوسری طرف ہندستانی کشمیر کے مسلمان شیخ عبداللہ کو غدار ٹھہرا کر ان کا گھر جلا رہے ہیں اور ان کی قبر کھودنے پر تلے ہوئے ہیں۔

ان واقعات پر سوچتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ غالباً یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس میں کہا گیا کہ آخر زمانہ میں امت کے بعد کے لوگ اپنے پہلے کے لوگوں پر لعنت کریں گے (لعن آخر هذه الامة اولها) اس روایت میں امت کے اول حصہ سے صحابہ و تابعین کا زمانہ مراد نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ دور اول کے لوگ تو بعد والوں کے لئے فخر بن چکے ہوں گے۔ پھر وہ ان پر لعنت کیسے کرسکتے ہیں۔ اس میں لعنت کا مطلب سادہ معنوں میں تنقید بھی نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ تنقید تو خود صحابہ کے معیاری دور میں جاری تھی۔ پھر تنقید کو نامحمود چیز کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث میں زوال کے دور میں پیدا ہونے والے قومی مزاج کی بات کہی گئی ہے۔ دور زوال میں مسلمانوں کا حال یہ ہوجاتا ہے کہ ان کی اپنی کمزوریوں کے نتیجہ میں ان کے لئے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں، ان کا ذمہ دار وہ دوسروں کو بتاتے ہیں۔ وہ دوسروں کے خلاف دھوم مچاکر ایک "انقلاب" لاتے ہیں۔ بعد کو جب یہ نام نہاد انقلاب ان کے مسائل کو حل نہیں کرتا تو ان کے درمیان دوسرے لیڈر ابھرتے ہیں، جو پچھلے لیڈر کو برا بتاکر دوبارہ ایک اور منفی قیادت ظہور میں لاتے ہیں۔ یہی مطلب ہے حدیث کے ان الفاظ کا کہ امت کا آخر اپنے اول کو ملعون ٹھہرائے گا۔

راستہ میں جہاز دمشق میں اترا۔ اچانک اپنے آپ کو دمشق میں پاکر اس علاقہ کے بارہ میں بہت سی باتیں ذہن میں تازہ ہوگئیں۔

دمشق غالباً دنیا کا سب سے زیادہ پرانا شہر ہے جو سمندر سے تقریباً ۵۰ میل دور آباد ہے۔ قدیم زمانہ سے وہ مختلف حکمرانوں کے قبضہ میں رہا ہے۔ چوتھی صدی عیسوی میں جب کہ وہ رومی (بازنطینی) قبضہ میں تھا، یہاں کے اکثر باشندے عیسائی ہوگئے۔ جو پیٹر کا مندر گرجا گھر میں تبدیل کردیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ جگہ اب جامع اموی میں شامل ہے۔ مسلم خلیفہ نے یہ جگہ عیسائیوں سے خرید کر حاصل کی تھی:

The Christian cathedral was purchased by the caliphate and turned into a mosque. (5/447)

۶۳۵ء میں دمشق عربوں کے قبضہ میں آیا۔ ۷۵۰-۶۶۱ء کے درمیان وہ اسلامی خلافت کا مرکز رہا۔ ۱۵۱۶ء میں ترکوں نے اس پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد سے چار سو سال تک وہ ان کے قبضہ میں رہا۔ ۱۸۹۴ میں دمشق اور بیروت کے درمیان ریلوے لائن بچھائی گئی۔ ۱۹۰۸ میں دمشق اور مدینہ

کے درمیان ریلوے لائن قائم کی گئی۔ ۱۹۴۶ میں اس کو مغربی قبضہ سے آزادی حاصل ہوئی۔

موجودہ دمشق تقریباً ایک سو مربع کیلومیٹر کے رقبہ میں آباد ہے۔ دمشق کا انٹرنیشنل ایئرپورٹ اس کے مشرق میں وسط شہر سے تقریباً ۱۹ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ۱۹۷۱ کی مردم شماری کے مطابق، شہر کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ ہے جس میں تقریباً سوا لاکھ فلسطینی مہاجرین شامل ہیں۔ دمشق کی آبادی میں ۹۱ فیصد مسلمان، ۸ فی صد عیسائی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ یہودی بھی یہاں آباد ہیں۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے قریش پر اپنی اس نعمت کا ذکر فرمایا ہے کہ اس نے ان کے لئے جاڑے اور گرمی میں پر امن تجارتی سفروں کا انتظام کیا (قریش ۱)۔ یہاں گرمی کے زمانہ کے سفر سے مراد قریش کا وہ تجارتی سفر ہے جو گرمی کے موسم میں مکہ سے دمشق وغیرہ کی طرف ہوتا تھا جو کہ حجاز کی نسبت سے ٹھنڈے علاقے تھے۔ قدیم زمانہ میں دمشق ایک عرصہ تک بین اقوامی تجارت کا مرکز رہا ہے۔

موجودہ دمشق کو بین اقوامی تجارتی نقشہ میں کوئی قابل ذکر مقام حاصل نہیں۔ البتہ وہ اپنے تاریخی آثار کی بنا پر بین اقوامی سیاحوں کی کشش کا مرکز ضرور ہے۔ اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ دمشق کی اہمیت آج کے انسان کے لئے صرف اپنے "ماضی" کی بنا پر ہے، وہ اپنے "حال" کے اعتبار سے لوگوں کے لئے اہم نہیں۔ یہی آج تمام دنیا کے مسلمانوں کا معاملہ ہے۔ مسلمان اب دنیا کے لئے گزری ہوئی تاریخ کا موضوع ہیں، جدید انسان کے لئے وہ حال اور مستقبل کے عنوان کی حیثیت نہیں رکھتے۔

دمشق کی بہت سی خصوصیات میں سے ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ روایات کے مطابق، یہی وہ مقام ہے جہاں خروج دجال کے وقت حضرت مسیحؑ دوبارہ اتریں گے۔ یہ روایت مسلم، ابوداؤد ترمذی، ابن ماجہ وغیرہ میں آئی ہے۔ یہاں ہم صحیح مسلم سے متعلقہ الفاظ نقل کرتے ہیں:

قال مسلم في صحيحه عن النواس بن سمعان قال: ذكر رسول الله ﷺ الدجال فبينما هو كذلك إذ بعث الله (المسيح بن مريم) عليه السلام، فينزل عند المنارة البيضاء شرقي دمشق بين مهرودتين واضعا كفيه على أجنحة ملكين، إذ رفعه تحدّر منه كجمان اللؤلؤ، ولا يحل لكافر يجد ريح نفسه إلا مات، ونفسه ينتهي حيث ينتهي طرفه، فيطلبه حتى يدركه بباب لد، فيقتله، ثم يأتي عيسى عليه السلام قوما قد عصمهم الله منه فيمسح عن وجوههم، و يحدثهم بدرجاتهم في الجنة،

حضرت نواس بن سمعان کہتے ہیں کہ اسی دوران اللہ مسیح بن مریمؑ کو بھیجے گا، وہ سفید مینار کے پاس دمشق کے مشرقی حصہ میں اتریں گے، دو زرد کپڑے کے درمیان، دو فرشتوں کے بازوؤں پر اپنے ہاتھ

رکھے ہوئے۔ جب وہ اپنا سر جھکائیں گے تو قطرہ ٹپکے گا اور جب وہ سر کو اٹھائیں گے تو اس سے موتی کی مانند (آنسو) گریں گے۔ جس منکر تک بھی ان کی سانس کی ہوا پہنچے گی وہ مرجائے گا، اور ان کی سانس وہاں تک پہنچے گی جہاں تک ان کی نظر پہنچے گی۔ حضرت مسیح دجال کا پیچھا کریں گے، یہاں تک کہ وہ اس کو لُد کے دروازہ پر پکڑ لیں گے، پھر وہ اس کو قتل کر دیں گے۔ اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام ایک ایسے گروہ کے پاس آئیں گے جس کو اللہ نے ان سے بچایا ہوگا۔ وہ ان کے چہروں کا مسح کریں گے اور جنت میں ان کے درجات کو بتائیں گے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت مسیح جامع دمشق کے منارہ پر اتریں گے۔ مگر یہ بات الفاظ حدیث میں موجود نہیں۔ صبح کی نماز کے وقت اترنے کا ذکر تو روایات میں ملتا ہے مگر مسجد کے منارہ پر اترنے کا ذکر کسی روایت میں نہیں۔ اصل یہ ہے کہ ۷۴۱ھ میں دمشق کی جامع اموی میں پتھروں کے ذریعہ ایک سفید مینار بنایا گیا، کیوں کہ سابقہ مینار آگ لگنے کی وجہ سے گر گیا تھا۔ اس پر کچھ لوگوں نے گمان کر لیا کہ یہی وہ "سفید مینار" ہے جس کے اوپر حضرت مسیح قیامت کے قریب اتریں گے (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، ۵۸۳) حالاں کہ حدیث میں جو لفظ ہے وہ صرف "مشرقی دمشق کے سفید منارہ کے پاس" ہے نہ کہ "مسجد کے سفید منارہ پر"۔

عیسائی حضرات کے یہاں بھی اس قسم کا ایک عقیدہ ہے جس کو ان کی مذہبی اصطلاح میں پاروسیا (Parousia) کہا جاتا ہے۔ یہ یونانی زبان کا ایک لفظ ہے جس کے معنی آمدِ ثانی (Second Coming) کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے وقت حضرت مسیح دوبارہ انسانوں کے درمیان آئیں گے۔ بائبل میں ہے: یہی یسوع جو تمہارے پاس سے آسمان پر اٹھایا گیا ہے، اسی طرح پھر آئے گا جس طرح تم نے اسے آسمان پر جاتے دیکھا ہے (رسولوں کے اعمال ۱: ۱۱)۔

تاہم حضرت مسیح کی دوبارہ آمد کے بارہ میں عیسائی حضرات کا عقیدہ بہت زیادہ واضح نہیں۔ مثلاً اس کی ایک تعبیر یہ کی گئی ہے کہ حضرت مسیح بشکل روح دوبارہ دنیا میں آچکے ہیں، وہ ہر وقت اور ہر جگہ موجود رہتے ہیں۔ اور ہر مسیحی کو اس کی چیزوں میں برکت عطا کرتے ہیں۔

مولانا شمس الدین ندوی سے ملاقات ہوئی۔ وہ دمشق میں دو سال تک رہے ہیں اور شام کے مختلف علاقوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ انھوں نے شام کے مسلمانوں کے اخلاق کی بہت

تعریف کی اور ان کے بہت سے اخلاقی واقعات بتائے۔ جو ہندستان جیسے ملکوں میں ناقابل تصور ہیں۔ انھوں نے مزید بتایا کہ شام میں اگرچہ سخت حکومت قائم ہے۔ مگر اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ وہاں بہت امن وامان ہے۔ اور رجان وہاں کا کوئی خطرہ کسی آدمی کو نہیں رہتا۔

ٹیکسی والا اگر کچھ پریشان کرے تو صرف یہ کہنا کافی ہوتا ہے کہ میں شُرطہ (پولس) کو ٹیلیفون کرتا ہوں۔ ایک شریر آدمی نے سڑک پر کسی لڑکی کو چھیڑ دیا۔ ایک آدمی آتا ہے جو بظاہر عام لباس میں ہے۔ وہ چھیڑنے والے کی سرزنش کرتا ہے۔ وہ شخص اس آدمی سے بھی لڑنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اب اگر وہ آدمی صرف اتنا کہہ دے کہ تعرف مین انا (تعرف من آنا) یعنی تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں۔ اتنا کہتے ہی شریر آدمی دہشت زدہ ہو کر رک جائے گا۔

انھوں نے بتایا کہ شام کے لوگ بہت مہمان نواز ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک بار وہ چند اور طالبعلموں کے ساتھ شام کے دیہات میں گئے۔ ایک زمیندار نے اپنے باغ میں انھیں ہر قسم کے پھل کھلائے۔ گھر پر دعوت کی۔ کہا کہ آپ لوگ کئی دن ٹھہرئے۔ جب وہ لوگ ٹھہرنے پر راضی نہیں ہوئے تو ریل کا فرسٹ کلاس کا کرایہ اور ہر ایک کو ۵۰۰ لیرا دے کر رخصت کیا۔

۲۴ مارچ کو صبح ۷ بجے ٹھیک وقت پر جہاز کراچی کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ پاکستان ایئر ویز پر جب بھی میں نے سفر کیا ہے، میں نے پایا ہے کہ وہ وقت کے بہت پابند ہیں۔ اس کے برعکس ایئر انڈیا کم از کم میرے تجربہ میں وقت کے معاملہ میں پاکستان ایئر لائنز سے پیچھے ہے۔

اس سفر میں ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب کا ساتھ تھا۔ ان کی امامت میں تین نمازیں (مغرب، عشا، فجر) ہوائی جہاز کے اندر جماعت کے ساتھ ادا کی۔ اڑتے ہوئے جہاز میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا بڑا عجیب معلوم ہوا جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے سوچا کہ زمین بھی تو ایک اڑتا ہوا قدرتی جہاز ہے۔ مگر زمین کے جہاز میں بچپن سے سوار ہونے کی وجہ سے استعجاب کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن جہاز کے اندر آدمی اپنے شعور کے تحت چڑھتا ہے، اس لئے جہاز کی نماز استعجاب کی کیفیت پیدا کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔

کراچی میں سوسائٹی آف فزیشنز کے تحت ایک سمپوزیم ہوا۔ اس کا عنوان تھا: "بے صبرا معاشرہ اور قومی اتحاد کے مسائل" اس موضوع پر مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔ علامہ اقبال کے صاحبزادے

ڈاکٹر جاوید اقبال نے کہا : افق پر زیادہ روشنی نہیں ہے۔ لیکن بقاء کی موہوم امید موجود ہے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ ہم ...... (جنگ ۲۴ مارچ ۱۹۹۰)

" بے صبرا معاشرہ" موجودہ زمانہ کے مسلم معاشرہ کے لئے صحیح ترین لفظ ہے۔ موجودہ زمانہ میں ساری دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ پیش آرہا ہے، اس کی واحد وجہ یہی ہے کہ مسلمانوں نے صبر کو کھو دیا ہے۔

زندگی کار از صبر ہے۔ صبر کا مطلب ہے، موجودہ صورت حال میں جو مواقع حاصل نہیں ہیں، ان پر صبر کرتے ہوئے ممکن مواقع کے میدان میں جدوجہد کرنا۔ مگر مسلمان ممکن مواقع کے استعمال پر قناعت نہیں کر پاتے۔ وہ ناممکن مواقع کی طرف دوڑتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔ مسلمان نہ ممکن مواقع کو استعمال کر پاتے ہیں اور نہ ناممکن مواقع کو۔

پاکستان میں مہاجر اور غیر مہاجر نے ایک دوسرے کے مقابلہ میں صبر کو کھو دیا ہے۔ ہندستان میں ہندو اور مسلمان، مسلم ملکوں میں اسلامی جماعتیں اور مسلم حکمراں، فلپائن جیسے ملکوں میں مسلم اقلیت اور مقامی حکومت، ایک دوسرے کے خلاف بے صبر ہو رہے ہیں۔ یہی بے صبری موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام مصیبتوں کا اصل سبب ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا راز صبر ہے۔ موجودہ دنیا میں مختلف اسباب سے لازمی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے ناگواری کا تجربہ ہوتا ہے۔ حتی کہ ایک خاندان کے مختلف افراد کے درمیان بھی بار بار اس قسم کے تلخ تجربات پیش آتے ہیں۔ یہ خدا کا قانون ہے۔ اور یہ صورت حال اس وقت تک باقی رہے گی جب تک قیامت نہ آجائے۔ اس لئے اس پر صرف صبر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

پاکستان کے مہاجر اب ایک علیحدہ قومیت کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ مہاجر قومیت کے ایک شارح مولانا وصی مظہر ندوی نے لکھا ہے کہ :

" بھارت سے آنے والے مسلمان ۴۰ سال کے عرصہ میں قدیم باشندگان سندھ کے ساتھ گھل مل نہ سکے۔ اب خواہ اس صورت حال کی ذمہ داری خود آنے والوں پر ہو یا سندھ کے پرانے رہنے والوں کی قیادت پر ہو۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ مہاجرین سندھ کے معاملات میں وہ اندازِ فکر نہیں

رکھتے جو اندازِ فکر پرانے سندھی بھائیوں کا ہے۔ اس وجہ سے مہاجرین اب نفسیاتی طور پر ایک علیٰحدہ وجود بن چکے ہیں۔ اور اگر ان کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش نہ کی گئی تو اس کے نتائج سندھ اور پاکستان کے حق میں بے حد خطرناک نکل سکتے ہیں۔" (ہفت روزہ تکبیر، ۱۲ مارچ ۱۹۸۷ صفحہ ۸)

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں مہاجر اور سندھی کے درمیان جو شدید مسئلہ پیدا ہو گیا ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عین وہی ہے جو ہندستان میں مسلم اور ہندو کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ دونوں جگہ عدم برداشت نے یہ مسئلہ پیدا کیا ہے، اور برداشت کا اصول اختیار کرکے ہی اس کو حل کیا جا سکتا ہے۔

مہاجر جب پاکستان گئے وہ اس احساس فخر کے ساتھ گئے کہ ہم پاکستان کے خالق ہیں۔ مزید یہ کہ سندھ کے اقتصادی وسائل پر زیادہ تر انھیں مہاجرین کا قبضہ ہو گیا۔ اس نے ایک طرف مہاجرین میں احساس برتری کو ابھارا اور دوسری طرف مقامی سندھی مسلمانوں میں احساس کمتری کی صورت میں ردعمل پیدا ہوا۔ مہاجرین کی نوجوان قیادت نے اس مسئلہ کو پُرتشدد قسم کی مہاجر قومی تحریک کے ذریعہ حل کرنا چاہا۔ یہ پٹرول پر آگ ڈالنے کے ہم معنی تھا۔ چنانچہ مسئلہ پہلے سے زیادہ شدید صورت اختیار کر گیا۔

میرے نزدیک اس کا حل صرف یہ ہے کہ مہاجرین سندھی مسلمانوں کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کا معاملہ کریں۔ "وہ مہاجر قومیت" کا علیٰحدگی پسند نظریہ چھوڑ کر سندھیوں سے مل کر بھائی بھائی بن جائیں۔ دوسری ہر تدبیر صرف الٹا نتیجہ پیدا کرنے والی ثابت ہوگی۔

اخبار جسارت کے اندر کے صفحہ پر ایک مضمون (مسلمانان برصغیر کی منزل مراد) درج تھا۔ اس مضمون کا آغاز ان الفاظ سے ہوا تھا: "تحریک پاکستان کا ایک طویل پس منظر ہے۔ جو لوگ قیام پاکستان کو چند برسوں کی جدوجہد کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، وہ شدید قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ یہ جدوجہد صدیوں پر محیط ہے۔" دوسری طرف روزنامہ جسارت (۲۳ مارچ ۱۹۹۰) کے صفحہ اول پر جماعت اسلامی کے نائب امیر مولانا جان محمد عباسی کی تقریر چھپی ہوئی تھی۔ انھوں نے پاکستانی عوام سے کہا: "قوم کی اکثریت نے نفسیاتی خواہشات سے مغلوب ہو کر اسلام سے نابلد قیادت منتخب کرکے اپنے تمام اختیارات انسانی خون سے سیاسی پیاس بجھانے والوں کے سپرد کرکے اپنی تباہی

و بربادی کو خود دعوت دی ہے۔"

میں نے سوچا کہ صدیوں کی اسلامی جدوجہد کے بعد تو یہ نتیجہ سامنے آیا ہے۔ اگر کہیں ہمارے اکابر کی یہ جدوجہد صرف چند برسوں پر محیط ہوتی تو اس کا نتیجہ کتنا بھیانک ہوتا۔

کراچی کے اخبار جنگ (۲۳ مارچ ۱۹۹۰) کے ایڈیٹوریل کے صفحہ پر ایک ادارتی نوٹ کا عنوان تھا: " بھارت میں مسلم کشی کی نئی سازش " اس نوٹ میں بتایا گیا تھا کہ " بھارت میں بے گناہ مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوگیا ہے۔" اس سلسلہ میں بتایا گیا تھا کہ " نئی دہلی میں نظام الدین اولیاء کے مزار مبارک کے قریب انتہا پسند ہندوؤں نے ایک نئے مندر کی تعمیر شروع کر دی ہے تاکہ مسلمانوں کو اشتعال دلایا جاسکے۔

میں اسی " نظام الدین " میں رہتا ہوں جس کی بابت یہ خبر دی گئی تھی کہ وہاں نیا مندر بنا کر مسلمانوں کو مشتعل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ قدرتی طور پر مجھے تجسس ہوا کہ معلوم کروں کہ یہ نیا مندر نظام الدین میں کہاں بن رہا ہے۔ چنانچہ میں نے دہلی پہنچ کر معلوم کرنا شروع کیا۔ پتہ چلا کہ یہ " نیا مندر " بنانے کا مسئلہ نہ تھا۔ بلکہ قبرستان اور شمشان بھومی کا مسئلہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس موقع پر فرقہ پرست ہندوؤں نے زیادتی سے کام لیا۔ مگر انھیں اس زیادتی کا موقع خود مسلمانوں کی نادانی نے فراہم کیا تھا۔

کراچی میں میرا قیام مسٹر طارق (فضلی سنز لیمٹڈ) کے یہاں تھا۔ ان کے والد جناب فضل الرحمٰن صاحب (وفات ۸ فروری ۱۹۸۹) کو الرسالہ مشن سے نہایت گہرا تعلق تھا۔ انھوں نے ہماری تمام مطبوعات کو اپنے یہاں سے شائع کیا۔ اب ان کے صاحبزادے جناب طارق رحمٰن صاحب ان کے مشن کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

یہاں جناب عبد الرحمٰن چھابڑا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے فاران کلب انٹرنیشنل کا سنٹر دکھایا جو کراچی میں زیر تعمیر ہے۔ وہ اور ان کے ساتھی تعمیری مزاج رکھتے ہیں اور سیاست وغیرہ سے دور رہ کر تعمیری انداز میں ملی خدمت کا کام انجام دے رہے ہیں۔

گفتگو کے دوران ایک واقعہ کا ذکر آیا جس میں افتتاحی تقریب کا کیک کاٹنے پر دو شخصوں کا جھگڑا ہوگیا۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ میں کاٹوں۔ عبد الرحمٰن چھابڑا صاحب نے کہا کہ اس طرح کے معاملہ کو

حل کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہترین نمونہ موجود ہے۔ وہ یہ کہ دونوں آدمی ایک ساتھ چھری کا دستہ پکڑتے اور دونوں مل کر کیک کاٹ دیتے جیسا کہ آپ نے حجر اسود کو نصب کرنے کے لئے کیا اور جھگڑا ختم ہو گیا۔ میں نے کہا کہ آپ کا یہ استنباط نہایت بامعنی ہے۔ پیغمبر اسلام کی زندگی میں ہر بات کے لئے نمونہ ہے خواہ وہ چھوٹا معاملہ ہو یا بڑا معاملہ۔

پیغمبر اسلام کی زندگی میں ہر بات کا نمونہ موجود ہے، حتی کہ کسی تقریب کی کیک کاٹنے کے معاملہ کے لئے بھی۔ یہی مطلب ہے اسلام کے مکمل دین ہونے کا۔ نہ یہ کہ مکمل قانون نافذ کرنے کے نام پر حکمرانوں سے ٹکراؤ شروع کر دیا جائے۔

کراچی میں مسٹر طارق رحمٰن نے بتایا کہ انشاء اللہ مارچ ۱۹۹۰ سے الرسالہ کا پاکستان اڈیشن چھپنا شروع ہو جائے گا۔ ان کے والد مرحوم فضل الرحمٰن صاحب الرسالہ کے بہت قدر داں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان میں دعوتی اور تعمیری ذہن پیدا کرنے کے لئے بہت ضروری ہے کہ الرسالہ کو پاکستان سے شائع کیا جائے۔ وہ کئی سال تک اس کا ڈکلیریشن حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر فوجی قوانین کی وجہ سے وہ ڈکلیریشن حاصل نہ کر سکے۔ یہاں تک کہ ۸ فروری ۱۹۸۹ کو ان کا انتقال ہو گیا۔

مرحوم کے بعد ان کے صاحبزادہ طارق رحمٰن صاحب نے کوشش جاری رکھی۔ پاکستان میں جمہوریت کی بحالی ان کے لئے معاون ثابت ہوئی۔ چنانچہ وہ ڈکلیریشن حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی دوران جناب عبد القادر صاحب (کراچی) نے بھی الگ سے الرسالہ کے لئے ڈکلیریشن حاصل کر لیا۔ تاہم مشورہ سے یہ طے ہوا کہ جناب طارق رحمٰن صاحب پاکستان اڈیشن کا انتظام کریں۔ چنانچہ وہ مارچ ۱۹۹۰ میں انشاء اللہ اس کا پہلا پرچہ شائع کر رہے ہیں۔ پاکستان کا اڈیشن کسی حذف یا اضافہ کے بغیر الرسالہ کے دہلی اڈیشن کی نقل ہوگا۔ اس معاملہ میں فارسی کا قدیم مثل پوری طرح صادق آتا ہے کہ پدر نہ کند پسر تمام کند۔

ایک صاحب نے کہا کہ پاکستان مسائل کو ختم کرنے کے لئے بنایا گیا تھا، مگر پاکستان بننے کے بعد یہاں نئے نئے مسائل پیدا ہو گئے۔ مثلاً دیکھئے، جو جنگ پہلے ہندو اور مسلمان کے درمیان جاری تھی، وہ اب مسلمان اور مسلمان کے درمیان جاری ہو گئی۔

میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل معاملہ یہ ہے کہ وہ مسائل کے لئے لڑتے ہیں۔ حالاں کہ ان کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ مسائل پر صبر کرکے دعوت اور اشاعت اسلام کا کام کریں ۔ مسلمانوں نے اپنی ذمہ داری ادا نہیں کی ، اس لئے خدا کا انعام بھی ان پر نازل نہ ہوسکا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا کیس ، ایک لفظ میں یہ ہے کہ جن باتوں پر انھیں صبر کرنا تھا ان باتوں پر وہ جہاد کر رہے ہیں۔ دنیا میں ہمیشہ مادی اور سیاسی اور سماجی مسائل رہتے ہیں۔ ان مسائل کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ ان مسائل کو نظر انداز نہ کریں تو آپ اپنے اصل منصبی فرض کو انجام نہیں دے سکتے۔ مسائل کا حل اپنے فرض منصبی کو انجام دینے میں ہے نہ کہ خود مسائل سے لڑنے میں۔

مسلمانوں کو پہلا کام یہ کرنا ہے کہ وہ "مسائل" سے نظریں ہٹائیں اور اپنی ساری توجہ "فرض" کے اوپر لگا دیں۔ جب تک وہ ایسا نہیں کریں گے۔ ان کے مسائل کبھی حل نہیں ہوسکتے۔ اور پاکستان اس کی زندہ مثال ہے۔ پاکستان کے تجربہ کے بعد بھی مسلمان اگر بدستور اپنے آپ کو مسائل میں الجھائے رہیں تو اس سے بڑی نادانی اور کوئی نہیں ہوگی۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ پاکستان میں اسلام کا نام جتنا زیادہ لیا جاتا ہے اتنا اور کہیں نہیں لیا جاتا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ پاکستان میں اسلام کی جتنی زیادہ خلاف ورزی کی جاتی ہے اتنی کہیں اور نہیں کی جاتی۔ اس عجیب ظاہرہ کا سبب کیا ہے۔

میں نے کہا کہ اس کا سب سے بڑا سبب وہ نام نہاد اسلام پسند ہیں جنھوں نے پچاس برس تک یہ نمونہ پیش کیا گویا اسلام کی خلاف ورزی کا دوسرا نام اسلام ہے۔

میں نے کہا کہ اس معاملہ میں سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے حامیوں کو لیجئے۔ ان لوگوں نے پہلے کہا کہ اسلام کا نظام ایک درخت کی طرح فطری عمل کے تحت ظہور میں آتا ہے، اس کے بعد مطالبات کے ذریعہ اسلام کو قائم کرنے کا نعرہ لگانے لگے۔ انھوں نے پہلے جلوس کے طریقہ کو غلط بتایا ، بعد کو خود غلاف کعبہ اور دوسرے ناموں پر جلوس کے ہنگامے برپا کرنے لگے۔ انھوں نے اسلام کو محمڈنزم کہنے کی مخالفت کی۔ بعد کو خود نظام اسلام کو نظام مصطفی کہنا شروع کر دیا۔ انھوں نے صدارت کے عہدہ کے لئے مس فاطمہ جناح کو کھڑا کیا اور عورت کو صدر حکومت بنانے کے حق میں دلائل دئے ، اب بے نظیر

بھٹو وزیر اعظم بن گئیں تو یہی لوگ عورت کی حکمرانی کو ناجائز بتا رہے ہیں۔ پہلے وہ کہتے تھے کہ جمہوریت اسلام کے خلاف ہے، بعد کو وہ خود " بحالیٔ جمہوریت " کے علمبردار بن گئے۔ پہلے انھوں نے اعلان کیا کہ اسلام ایک اصول کا نام ہے نہ کہ قومیت کا، اب وہ اپنی پوری تحریک قومی انداز پر چلا رہے ہیں جس کا الزام اس سے پہلے وہ مسلم لیگ کو دیتے تھے۔

پاکستان بننے کے بعد اگر یہ اسلام پسند ظاہر نہ ہوئے ہوتے بلکہ یہاں کے معاملات کو اپنی فطری رفتار سے چلنے دیا جاتا تو مجھے یقین ہے کہ پاکستان کی دینی اور اخلاقی حالت کہیں زیادہ بہتر ہوتی۔ مگر ان نام نہاد اسلام پسندوں نے جس طرح اسلام کو کھیل بنایا، اس نے لوگوں کو اسلام کی خلاف ورزی پر جری کر دیا۔ انھوں نے اسلامی اصول کے تقدس کو توڑ دیا۔ اب وہ تمام دینی اور اخلاقی حدیں ٹوٹ گئیں جو روایات کے زور پر قائم چلی آ رہی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف پاکستان بلکہ ساری دنیا میں اسلام کے سب سے بڑے قاتل وہ لوگ ہیں جو اپنے کو مکمل اسلام کا علم بردار بتا کر اسلام کو سیاسی نعرہ کا عنوان بنائے ہوئے ہیں۔

"تکبیر" کراچی کا ایک مشہور اردو ہفت روزہ ہے۔ اس کی چار قسطوں (۱۴ دسمبر ۱۹۸۹ تا ۲۵ جنوری ۱۹۹۰) میں ایک جائزہ چھپا ہے۔ اس کا موضوع ہے " سندھ میں ہندوؤں کا کردار "۔ اس مفصل جائزہ میں بتایا گیا ہے کہ سندھ (پاکستان) میں اس وقت تقریباً چودہ لاکھ ہندو آباد ہیں۔ تقسیم کے بعد ان ہندوؤں نے عارضی طور پر اپنے کردار کو تبدیل کر لیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ تعلیم اور تجارت کے شعبوں میں مشغول ہو گئے۔

پاکستانی جائزہ نگار مسٹر ظہیر احمد کے الفاظ میں "سندھ کے ۱۴ لاکھ ہندو اب پس ماندہ یا غیر ترقی یافتہ نہیں ہیں، بلکہ ترقی اور معیشت کی نبض پر بعض جگہ ان کا ہاتھ اتنا گہرا اور مضبوط ہے کہ دَور رفتہ کا گمان ہوتا ہے۔ معاشی طور پر مستحکم اور سماجی طور پر محفوظ ہونے کے ساتھ ساتھ ہندو اب سندھ میں سیاسی کردار بھی سنبھال رہا ہے۔ اور قریباً تیس برس کی منصوبہ بندی اسے ایک اہم موڑ پر لے آئی ہے۔ یہ سب کچھ اس طرح ہوا کہ قیام پاکستان کے بعد سندھ میں ہندو نے اپنے کردار کو تبدیل کر لیا۔ وقتی طور پر ہندو کا سیاسی کردار ختم ہو گیا۔ وہ اپنے سابقہ کردار کے سبب نفرت سے بچنے کے لئے پس پشت چلا گیا۔ تعلیم کے میدان، ملازمتوں اور تجارت میں اس

نے اپنے استحکام کے لئے خاموش اور ٹھوس کام کیا۔ اس نے اس طرح اپنے آپ کو اس پوزیشن میں کرلیا کہ وہ اپنی مستحکم معاشی حیثیت کا فائدہ اٹھاکر تعلیمی اداروں اور ملازمتوں میں قدم جمائے اور پھر ان دو محاذوں سے سماجی اور سیاسی تحریکوں کو کنٹرول کرے (تکبیر ۱۴ دسمبر ۱۹۸۹)

رپورٹ میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ "۴۰ سالہ" خاموش تعمیری عمل کا یہ نتیجہ ہے کہ آج سندھ کے ہندو اپنے علاقہ میں تعلیم، سیاست، زراعت، تجارت، صحافت، ایڈمنسٹریشن، غرض ہر چیز پر اپنے عددی تناسب سے بہت زیادہ قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ وہ مسلمانوں سے زیادہ کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ حتی کہ " ان کے علاقہ میں بھارتی کرنسی کے استعمال کی خبریں بھی آتی رہتی ہیں"۔ (صفحہ ۱۶، ۴ جنوری ۱۹۹۰۔

عجیب بات ہے کہ اس پورے مضمون میں وہی احتجاجی زبان استعمال کی گئی ہے جو ہندستان میں مسلمانوں کے بیانات اور تقریروں میں نظر آتی ہے۔ پورے مضمون میں کوئی ایک سطر بھی ایسی نہیں ہے جس سے یہ اندازہ ہو کہ مضمون نگار نے اس تجربہ سے کوئی سبق نکالا ہو۔ میں نے اس احتجاجی رپورٹ کو پڑھا تو میری زبان سے نکلا ــــ پھر تو پاکستانی لیڈروں کو اپنا پاکستان آسمان میں بنانا چاہئے تھا۔

۲۴ مارچ ۱۹۹۰ کی شام کو پی آئی اے کی فلائٹ ۲۹۲ کے ذریعہ دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔ کراچی ایرپورٹ پر بہت سے مسلمان نظر آئے جو عمرہ کرنے جارہے تھے۔ ان کے جسم پر صرف دو بغیر سلے ہوئے کپڑے تھے جن کو احرام کہا جاتا ہے۔ ایک نیچے تہمد کی طرح، دوسرا اوپر چادر کی طرح۔ یہ عین وہی کپڑا تھا جو ہندوؤں کے مذہبی لوگ پہنتے ہیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ مسلم کپڑے کا رنگ سفید تھا اور ہندو کپڑے کا رنگ زرد ہوتا ہے۔ ایرپورٹ کا مسلم عملہ ان احرام پوشوں کو " بابا" کہتا تھا اور " آجائیں بابا " کے لفظوں میں انھیں پکار رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ ہندو مذہب اور مسلم مذہب میں اگر کچھ اختلاف کی باتیں ہیں تو اسی کے ساتھ ان میں کچھ اتفاق کی باتیں بھی ہیں۔ اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ آپس کے تعلقات میں " کلمۂ سواء" کو بنیاد بنایا جائے۔ یعنی اختلاف کو سنجیدہ غور وفکر کے خانہ میں رکھ کر اتفاق کو عمومی تعلق کی بنیاد بنایا جائے۔ فکری اختلاف کے باوجود عملی موافقت کا۔ یہی وہ اصول ہے جس کو رواداری

کہاجاتاہے، اور مشترک سماج میں رواداری ہی کامیاب زندگی کا واحد راز ہے۔
کراچی سے جہاز کا وقت ۶ بجے تھا۔ ابتدائی طور پر ایئر پورٹ نے اطلاع دی تھی کہ جہاز اپنے ٹھیک وقت پر روانہ ہوگا۔ مگر آخر وقت میں کسی نامعلوم سبب سے اس کی روانگی ملتوی ہوگئی۔ اس قسم کا انتظار بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ چنانچہ مجھ کو سخت جھٹکا لگا۔ اضمحلال کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس کے بعد ذہن اگلی دنیا کی طرف منتقل ہوگیا۔ دنیا کے دکھ کو سوچ کر آخرت کا دکھ یاد آنے لگا۔ دل نے کہا: خدا اپنے اس عاجز بندے پر رحم فرمائیے۔ کاش مجھے بخش دیا جائے، کاش دنیا کا ستایا ہوا آخرت میں نہ ستایا جائے۔

۲۴ مارچ ۱۹۹۰ کی شام کو دہلی ایئر پورٹ پر اترا۔ دل نے کہا کہ خدایا، آپ نے ایک سفر کرایا اور خیریت کے ساتھ واپس گھر پہنچا دیا۔ اسی طرح آخرت سے دنیا میں آنا بھی ایک سفر ہے۔ اس سفر کو بھی خیریت کے ساتھ پورا فرمائیے اور آخرت کی منزل پر اپنی رحمتوں کے ساتھ پہنچا دیجئے۔
حسب معمول میں گرین چینل سے گزر کر باہر جانے لگا۔ دروازہ پر "گیٹ مین" نے روکا۔ اور مجھ سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ میں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ خاموشی کے ساتھ دروازہ پر کھڑا ہوگیا۔ اتنے میں کسٹم آفیسر نے دیکھ لیا کہ گیٹ مین مجھ سے غیر ضروری قسم کی پوچھ گچھ کر رہا ہے۔ اس نے دور ہی سے کہا: "باباجی کو جانے دو"۔ گیٹ مین نے کہا کہ جب صاحب کہہ رہے ہیں تو آپ جائیے۔
باہر نکلا تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک صاحب مجھ سے لپٹ کر بے اختیار رونے لگے۔ وہ دیر تک کچھ کہے بغیر روتے رہے۔ مولانا انیس لقمان ندوی اور ڈاکٹر ثانی اثنین خاں جو میری آمد کی وجہ سے ایئر پورٹ پر آئے تھے، انھوں نے بتایا کہ ہم لوگ ایئر پورٹ پر انتظار میں بیٹھے تھے۔ الرسالہ اپریل ۱۹۹۰ ہمارے ہاتھ میں تھا۔ اس کو دیکھ کر مذکورہ صاحب ہماری طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا کہ کیا یہ تازہ الرسالہ ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے بیگ سے "اسلامی زندگی" نکالی اور کہا کہ راستہ میں پڑھنے کے لئے میں نے اس کو اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ جودھپور کے جناب محمد خالد صاحب ہیں وہ چار سال سے الرسالہ پڑھ رہے ہیں۔ ان کے بھائی آج سعودی عرب سے آنے والے تھے۔ اس کی وجہ سے وہ ایئر پورٹ آئے ہوئے تھے۔
دنیا کے مختلف ملکوں میں اللہ کے بہت سے بندے ہیں جو راقم الحروف سے اس قسم کا

حسن ظن رکھتے ہیں۔ دل سے دعا نکلی کہ خدایا، یہ سفر جو میں نے کیا ہے، اس کو میں اپنی قیمت پر نہیں کر سکتا تھا، دوسروں کی ادا کی ہوئی قیمت پر یہ طویل سفر طے ہوا۔ اسی طرح میں اپنے عمل کی بنیاد پر جنت میں داخلہ کا استحقاق نہیں رکھتا۔ جو لوگ مجھ سے حسن ظن رکھتے ہیں، ان کے حسن ظن کی قیمت پر مجھ کو جنت میں داخل کر دیجئے۔

ایک سفر

بین اقوامی سفر آج کل ہوائی جہاز کی تیز رفتاری کے ساتھ کئے جاتے ہیں۔ مگر میں ذہنی طور پر ایک "سست رفتار" آدمی ہوں۔ اس بنا پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک سے زیادہ سفر قریب کی تاریخوں میں پیش آجائیں تو میں صرف ایک کو اختیار کر پاتا ہوں۔ اور بقیہ مجھ سے چھوٹ جاتا ہے۔

یہی واقعہ موجودہ سفر کے موقع پر پیش آیا۔ مئی ۱۹۹۰ کی ابتدائی تاریخوں کے لئے میرے پاس دو بیرونی دعوت نامے آئے تھے۔ دونوں کا ٹکٹ بھی آچکا تھا۔ مگر میں صرف ایک سفر کر سکا۔ دوسرا سفر مجھے چھوڑ دینا پڑا۔

پہلا سفر مجھے جنیوا (سوئٹزرلینڈ) کے لئے کرنا تھا۔ جنیوا میں سید جمال الدین افغانی کے مجلہ العروۃ الوثقی کے سلسلہ میں ایک تقریب تھی۔ یہ تقریب انٹرنیشنل ہوٹل (جنیوا) میں ۲ مئی ۱۹۹۰ کو ہوئی۔ سید جمال الدین افغانی نے پیرس سے العروۃ الوثقی کے نام سے ایک ماہانہ پرچہ عربی زبان میں نکالا تھا۔ وہ چھ مہینہ جاری رہ کر بند ہو گیا۔ اب ڈاکٹر عبد الحکیم طبیبی (افغانی) اسی نام سے جنیوا سے ایک پرچہ نکال رہے ہیں۔ یہ عربی اور انگریزی، دونوں زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ جنیوا میں اسی پرچہ (العروۃ الوثقی) کی دسویں سالگرہ (anniversary) کے سلسلہ میں ایک تقریب تھی۔

مجھے اس تقریب میں شریک ہونا تھا اور وہاں اپنے خیالات کا اظہار کرنا تھا۔ منتظمین کے رزرویشن کے مطابق، اس کے لئے میری روانگی ۳۰ اپریل کو مقرر تھی۔ دوسری کانفرنس ڈکار (سینیگال) میں ۷ - ۱۰ مئی ۱۹۹۰ کو تھی۔ اس میں شرکت کے لئے مجھے رزرویشن کے مطابق، ۴ مئی کو جنیوا سے روانہ ہونا تھا۔ مگر اپنی ذہنی سست رفتاری کی بنا پر میں بیک وقت دونوں سفروں کا پروگرام نہ بنا سکا۔ چنانچہ جنیوا کا پروگرام مجھ سے چھوٹ گیا۔ دہلی سے ۳۰ اپریل کو روانہ ہونے کے بجائے میں ۴ مئی کو روانہ ہوا۔ اور اسی دن جنیوا ہوتے ہوئے شام کو ڈکار پہنچا۔

اتنا لمبا سفر ایک دن میں طے ہونے کا سبب وقت کا فرق تھا۔ انڈیا اور سینیگال کے وقت میں

ساڑھے پانچ گھنٹہ کا فرق ہے۔ اس فرق کی بنا پر دن کو پورا کرنے کے لئے مجھے ساڑھے پانچ گھنٹے مزید مل گئے۔

ایک ملک اور دوسرے ملک میں وقت کا فرق زمین کی محوری گردش کی بنا پر ہے۔ آدمی زمین کے "وقت" میں فرق نہیں کر سکتا، اس لئے اس نے اپنی گھڑی کے وقت میں فرق کرلیا۔ حقیقت سے اسی مطابقت کا نام ایڈجسٹمنٹ ہے۔ اور اسی ایڈجسٹمنٹ میں تمام کامیابیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔ جو لوگ حقیقتِ واقعہ سے مطابقت پر راضی نہ ہوں، ان کو اس دنیا میں صرف اپنی بربادی پر راضی ہونا پڑتا ہے، خواہ وہ اس کو پسند کریں یا ناپسند۔

اس سفر کا پہلا مرحلہ ۲۴ اپریل ۱۹۹۰ کو پیش آیا۔ کانفرنس کے منتظمین کی طرف سے جو کاغذات آئے تھے، اس میں درج تھا کہ روانگی سے پہلے زرد بخار (yellow fever) کا انجکشن لگوالیں۔ اس سلسلہ میں ۲۴ اپریل کو نئی دہلی میونسپل کمیٹی کے دفتر میں جانا ہوا۔ یہاں ہفتہ میں دو بار (بدھ، جمعہ) کو باہر جانے والے مسافروں کے لئے ٹیکہ (vaccination) کا انتظام ہے۔ وہاں پہنچا تو پورا ہال مردوں اور عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ تمام لوگ باہر جانے کے لئے ٹیکہ لگوانے آئے تھے۔ میں مسٹر شاستری کے پاس بیٹھ گیا جو رجسٹر میں ہر ایک کے نام کا اندراج کر رہے تھے۔ نام سے اندازہ ہوا کہ آنے والوں میں چند عیسائی اور بیشتر ہندو تھے۔ میرے سوا وہاں کوئی بھی مسلمان نظر نہ آیا۔

اس کا مطلب واضح طور پر یہ تھا کہ "انٹرنیشنل ٹریول" میں مسلمانوں کا حصہ بہت کم ہے۔ ہمارے نام نہاد مسلم رہنما روزانہ کوئی نہ کوئی "تاریخ ساز" اجتماع کرتے رہتے ہیں۔ آپ ان میں شرکت کریں تو آپ کو نظم و نثر میں اس قسم کی باتیں سننے کو ملیں گی:

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی   ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

مگر اصل صورت حال اس کے برعکس ہے۔ لفظی پرواز میں مسلمان سب سے آگے ہیں، اور حقیقی پرواز میں سب سے پیچھے۔

نئی دہلی میونسپل کمیٹی کے مذکورہ دفتر جانے سے پہلے میں ایک عربی جریدہ پڑھ رہا تھا۔ اس میں ایک مضمون تھا جس کا عنوان تھا: مقیاس التقدم والتخلف (آگے اور پیچھے ہونے کا معیار) اس مضمون میں ان لوگوں کو برا کہا گیا تھا جو "مستشرقین" کی تقلید میں مسلمانوں کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ ایک پچھڑی

ہوئی قوم ہیں۔ یہ لوگ مسلمانوں کو مادی معیار سے جانچتے ہیں۔ یہ معیار بجائے خود غلط ہے۔ مسلمان کی نظر میں اصل معیار ایمان ہے۔ اور مسلمانوں کو چوں کہ ایمان کی دولت حاصل ہے، اس لئے وہ سب سے آگے ہیں۔ اور دوسری تمام قومیں ان سے پیچھے ہیں۔ کیوں کہ وہ کفر والحاد میں مبتلا ہیں۔ اور کفر والحاد اور مادیت ہی دراصل وہ چیز ہے جو کہ پچھڑا پن ہے (وان الکفر والالحاد والمادیات ھو التخلف)

یہ تقابل درست نہیں۔ تقدم سے مراد مادی تقدم بھی ہو سکتا ہے اور ایمانی تقدم بھی۔ اگر مسلمانوں کو مادی تقدم کے اعتبار سے جانچنا ہو تو انھیں مغربی قوموں کے معیار سے جانچا جائے گا۔ اور اگر مسلمانوں کو ایمانی تقدم کے اعتبار سے جانچنا ہو تو ان کو اصحاب رسول کے معیار سے جانچا جائے گا۔ کیوں کہ اس دوسرے معاملہ میں "قدوة" وہی ہیں۔

مضمون نگار اگر چاہتے ہیں کہ تقدم کے لئے ایمان کو معیار بنائیں تو ان کو چاہئے کہ موجودہ مسلمانوں کے ایمان کا تقابل اصحاب رسول کے ایمان سے کریں اور موجودہ مسلمانوں کی مادیات کا تقابل موجودہ ملحدین کی مادیات سے۔ یہ ایک غیر منطقی تقابل ہے کہ تقدم کا معیار ایمان کو قرار دیا جائے اور پھر ایمان کو ملحدین کے معیار سے جانچا جائے۔ اس قسم کے مضامین بلاشبہہ مضر ہیں۔ کیوں کہ وہ مسلمانوں میں جھوٹا فخر پیدا کر کے انھیں بے عمل اور بے تدبیر بنا رہے ہیں۔

نئی دہلی میں سینیگال کی ایمبیسی موجود ہے۔ جو صاحب سینیگال ایمبیسی میں میرا ویزا لینے کے لئے گئے تھے، انھوں نے بتایا کہ ویزا افسر نے پاسپورٹ میں میری تصویر دیکھی تو کہا کہ میں ان کو جانتا ہوں۔ ہم کو خوشی ہے کہ وہ ہمارے ملک میں جا رہے ہیں۔

ویزا افسر کے اس طرح "پہچاننے" کا سبب یہ تھا کہ ٹائمس آف انڈیا (۱۰ دسمبر ۱۹۸۹) میں میرا انٹرویو چھپا تھا۔ اس میں انٹرویو رنے میری تصویر بھی چھاپ دی تھی۔ مذکورہ افسر نے کہا کہ میں نے اس انٹرویو کو پڑھا تھا اور اس میں ان کی تصویر دیکھی تھی۔ یہ تصویر اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ موجودہ زمانہ کے نئے امکانات میں سے ایک امکان یہ ہے کہ ایک شخص کسی آدمی کو براہ راست نہ دیکھے، اس کے باوجود وہ اس کو اس کی صورت سے پہچانتا ہو۔

اس زمانہ میں تصویری صحافت نے انسان کے اوپر جو نئے مواقع کھولے ہیں، ان کی یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ ہندستان کے علماء تصویر کو ناجائز بتاتے ہیں، مگر یہی علماء عرب شخصیتوں کا اپنے اداروں

یں استقبال کر رہے ہیں، جب کہ یہ عرب لوگ تصویر کو عین جائز سمجھتے ہیں۔

ہندستان کے دو عالموں کے درمیان اگر اختلاف ہو تو دونوں کے درمیان نزاع قائم ہوجاتی ہے۔ مگر یہی اختلاف ہندستانی عالم اور عرب عالم کے درمیان ہو تو ہندستانی عالم اس کو خندہ پیشانی کے ساتھ گوارا کر لیتا ہے۔ اس فرق کا سبب کیا ہے، یہ ایک نازک معاملہ ہے۔ مگر اس سے پردہ اٹھانا شاید خدا کے سوا کسی اور کے اختیار میں نہیں۔

دہلی سے لفتھانسا کی فلائٹ ۷۶۱ کے ذریعہ رات کو ۳ بجے (۴ مئی۔ ۱۹۹) روانگی ہوئی۔ تقریباً آٹھ گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد فرینکفرٹ (جرمنی) پہنچا۔ پورا سفر نہایت ہموار گزرا۔ سفر کا وقت بڑا عجیب تھا۔ یعنی نصف شب کے وقت رات کو ساڑھے گیارہ بجے گھر سے ایر پورٹ کے لئے روانہ ہونا تھا۔ ایک صاحب نے مشورہ دیا کہ رات کی نیند خراب ہوجائے گی۔ اس لئے دن کو سولیں۔ مگر میں ایسا نہ کر سکا۔

یہ مشورہ درست نہ تھا۔ میں دہلی میں برابر اپنا کام کرتا رہا۔ اس کی وجہ سے کچھ زیادہ تکان آگئی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ جہاز کے اندر پہنچا تو جلد ہی نیند آگئی۔ دیر تک گہری نیند سوتا رہا۔ اس طرح نیند بھی ایک اور شکل میں پوری ہوگئی۔ وقت بھی استعمال ہوگیا اور آٹھ گھنٹہ کا لمبا سفر آسانی کے ساتھ گزر گیا۔ بہت سے مشورے بظاہر ٹھیک نظر آتے ہیں مگر حقیقۃً وہ بے ٹھیک ہوتے ہیں۔

فرینکفرٹ ایرپورٹ پر میں نے ۴ مئی کو فجر کی نماز پڑھی۔ ایک جرمن خاتون میری نماز کو غور سے دیکھتی رہی۔ جب میں فارغ ہو کر اٹھا تو اس نے معذرت کے ساتھ پوچھا "کیا آپ یوگا کا عمل کر رہے تھے"۔ میں نے کہا نہیں، میں صلاۃ کا عمل کر رہا تھا۔ وہ یوگا کو جانتی تھی، مگر وہ صلاۃ کو نہیں جانتی تھی۔ اس نے پوچھا کہ صلاۃ کیا چیز ہے۔ میں نے کہا، کیا آپ خدا کو مانتی ہیں۔ اس نے کہا ہاں، میں نے کہا کیا آپ مانتی ہیں کہ خدا ہمارا خالق اور رب ہے۔ اس نے کہا ہاں۔ میں نے کہا پھر نماز اسی خالق اور مالک کی عظمت اور اس کے احسان کا اعتراف ہے۔

خدا صبح لاتا ہے تو ہم جھک کر کہتے ہیں کہ خدایا تیرا شکر ہے کہ تو نے میرے لئے دن کو روشن کیا تاکہ میں کام کروں۔ خدا شام لاتا ہے تو ہم جھک کر کہتے ہیں کہ خدایا تیرا شکر ہے کہ تو میرے لئے رات لایا تاکہ میں آرام کروں۔ اس طرح ہم رات اور دن میں پانچ بار خدا کی عظمت اور اس کے انعامات کا

اعتراف کرتے ہیں۔ جرمن لیڈی بہت غور سے میری بات کو سنتی رہی۔ اس کے بعد تھینک یو، تھینک یو کہتی ہوئی چلی گئی۔

فرینکفرٹ سے جینوا کے لئے لفتھانساکی فلائٹ ۸۴۶ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ گیٹ ۳۲ بی کی تلاش میں نکلا تو ایک بورڈ پر لکھا ہوا نظر آیا کہ اپنی پرواز کے لئے اپنی مدد آپ کریں :

For your flight — Please help yourself.

میں نے دیکھنا شروع کیا تو مکمل نشانات اتنی زیادہ مقدار میں جگہ جگہ لگے ہوئے تھے کہ وسیع ایرپورٹ پر اپنے مطلوبہ گیٹ پر پہنچنا بالکل آسان تھا۔ سینکڑوں آدمی انھیں نشانات کی مدد سے اپنے مطلوبہ مقام پر چلے جارہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانے پر خدا نے اپنی معرفت کے نشانات کائنات میں جگہ جگہ نصب کر رکھے ہیں۔ مگر کوئی شخص ان سے رہنمائی حاصل نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ " ایرپورٹ " کے نشانات کے بارہ میں لوگ سنجیدہ ہیں۔ مگر خدا کے نشانات کے بارہ میں لوگ سنجیدہ نہیں۔ اور نشانات سے رہنمائی حاصل کرنے کے لئے آدمی کا سنجیدہ ہونا انتہائی ضروری ہے۔

فرینکفرٹ ایرپورٹ پر ایک جرمن پروفیسر سے ملاقات ہوئی۔ وہ پروفیسر کارل ٹرال (Carl Troll) کے شاگرد تھے۔ انھوں نے بتایا کہ کارل ٹرال یونیورسٹی آف بون میں جغرافیہ کے پروفیسر تھے۔ وہ ۱۸۹۹ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷۵ میں وفات پائی۔ وہ اپنے فن میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کو جغرافیہ دانوں کی عالمی یونین (International Union of Geographers) کا پریسیڈنٹ بنایا گیا۔

انھوں نے بتایا کہ ۱۹۶۴ میں وکٹوریہ البرٹ ہال (لندن) میں پروفیسر کارل ٹرال کی اسپیچ تھی۔ اس میں مختلف ملکوں کے ممتاز سائنس داں جمع تھے۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے پروفیسر ٹرال نے کہا کہ سائنس داں کی حیثیت سے ان کی زندگی کا بنیادی تجربہ یہ ہے کہ وہ خالق کے زیادہ سے زیادہ احسان مند ہوتے چلے گئے اور تخلیقی عمل میں خدا کی عظمت کو دیکھ کر وہ حیران کن احساس سے بھر گئے :

The basic experience of his life as a scientist has been that he became more and more grateful to the Creator and full of wonders at God's greatness in His works of creation.

انھوں نے بتایا کہ پروفیسر کارل ٹراں کے الفاظ پر حاضرین میں سے کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ اکثر سائنس داں اٹھ کر ان کے پاس آئے اور اظہار مسرت میں ان سے ہاتھ ملایا۔

یہ احساس ان تمام اہل علم کا ہے کہ جو نیچر کا مطالعہ کرتے ہیں۔ کوئی جرأت مند اس کا اعلان کر دیتا ہے۔ اور کچھ لوگ اس کو اپنے دل میں لئے ہوئے اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

لفتھانساکی فلائٹ میگزین (Bordbuch) کے شمارہ مئی ۱۹۹۰ کے ایک مضمون میں بتایا گیا تھا کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد ایسٹ جرمنی اور ویسٹ جرمنی میں ہوائی پرواز پر پابندیاں عائد ہوگئی تھیں۔ دونوں کے بیچ ایک درمیانی علاقہ قائم کر دیا گیا تھا جس کو مختصر طور پر اے ڈی آئی زڈ کہا جاتا تھا:

Air Defence Identification Zone (ADIZ)

مگر آج یہ حد بندی ٹوٹ گئی ہے۔ اب دونوں جرمن ریاستوں کے درمیان صرف لفتھانساکی ہفتہ میں ۲۸ پروازیں قائم ہو چکی ہیں۔

آج کی دنیا میں لوگ جغرافی حدود کو توڑ رہے ہیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے تعلقات کو بڑھائیں مگر اسی دنیا میں مسلمان ہر جگہ اپنی جغرافی حدود کو گھٹانا چاہتے ہیں تاکہ اپنے چھوٹے چھوٹے گھروندے بنا سکیں۔

اس کو وہ بطور خود "اسلامستان" کہتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں اس ظاہرہ کا ظہور دراصل احساس شکست کی علامت ہے۔ مسلمان بڑھتے ہوئے کامپٹیشن کی اس دنیا میں دوسروں سے مقابلہ کر کے ان کے درمیان زندہ رہنے کی طاقت اپنے اندر نہیں پاتے۔ اس لئے وہ چاہتے کہ اپنی حد بس کھینچ کر اس کے اندر اپنے لئے زندہ رہنے کا موقع تلاش کریں۔ موجودہ زمانہ کی وہ تحریکیں جن کو مسلمان بطور خود آزادی کی تحریکیں کہتے ہیں، وہ صرف ان کی شکست خوردہ نفسیات کے مظاہر ہیں۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

موجودہ زمانہ میں ہوٹلوں اور بینکوں کی عالمی تنظیم نے اس کو ممکن بنا دیا ہے کہ آدمی دنیا کے کسی بھی حصہ میں اپنے لئے ہر قسم کی آسودگی اور مواقع اطمینان بخش طور پر پا سکے۔ میگزین میں "ایکسپرس کارڈ" کا اشتہار ان لفظوں میں ایک پورے صفحہ پر چھپا ہوا تھا:

Whatever your destination, all you need to get into 880 of Europe's best hotels is the American Express Card.

یعنی آپ کی جو بھی منزل ہو، یورپ کے ۸۸۰ بہترین ہوٹلوں میں سے کسی ہوٹل میں جگہ حاصل کرنے کے لئے آپ کو صرف ایک چیز کی ضرورت ہے اور وہ امریکی بینک کا امریکن اکسپرس کارڈ ہے۔

اس کو میں نے پڑھا تو قرآن کی وہ آیت یاد آگئی جس میں اہل جنت کی زبان سے جنت کے بارہ میں کہلایا گیا ہے کہ شکر ہے اس اللہ کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ پورا کیا اور ہم کو اس زمین کا وارث بنا دیا۔ ہم جنت میں جہاں چاہیں مقام کریں۔(الزمر ۷۴)

جہاز میں سوئزرلینڈ کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص سے ملاقات ہوئی۔ ان کی مادری زبان کچھ اور تھی، مگر انگریزی زبان روانی کے ساتھ بول رہے تھے۔ گفتگو کے دوران انڈیا کا ذکر آیا۔ انھوں کہا کہ انڈیا اتنا بڑا ملک ہے کہ کسی ایک حکومتی اقتدار کے تحت اس کا انتظام نہیں کیا جاسکتا:

India is too big to be managed.

ان کا خیال تھا کہ انڈیا کا وہی انجام ہوگا جو سوویت یونین کا ہو رہا ہے۔ وہ disintegrate ہو جائے گا۔ میں نے کہا کہ مگر ہمارے سامنے دوسری مثال یو ایس اے (امریکہ) کی ہے۔ وہ انڈیا سے بھی زیادہ بڑا ہے۔ اس کے باوجود اس کا انتظام چل رہا ہے۔ انھوں کہا کہ امریکہ کے وسائل بہت زیادہ ہیں۔ وہ ایک امیر ملک (rich country) ہے۔ اس لئے وہاں وہ عوامی بے چینی نہیں جو کہ انڈیا میں بہت بڑے پیمانہ پر پائی جاتی ہے۔

میں نے کہا کہ سوویت یونین کو جو چیز منتشر کر رہی ہے وہ اس کا سائز نہیں ہے، بلکہ اس کا جبر ہے۔ اسی طرح امریکہ کو جو چیز کامیاب بنائے ہوئے ہے وہ اس کی دولت نہیں ہے بلکہ آزادی ہے۔ انڈیا میں بھی آزادی ہے۔ مگر انڈیا میں اسی کے ساتھ جہالت ہے۔ انڈیا اگر تعلیم کے معاملہ میں امریکہ کے برابر ہو جائے تو اس کی سالمیت کو کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ میں نے کہا کہ ۱۹۴۷ کے بعد انڈیا میں جو حکومتیں آئیں، بد قسمتی سے ان میں سے کسی حکومت نے بھی تعلیم کو وہ اہمیت نہ دی جو اس کو دینا چاہئے۔ چنانچہ آج بھی انڈیا میں ۸۰ فی صد سے زیادہ افراد ناخواندہ یا نیم خواندہ ہیں۔ یہی انڈیا کا اصل مسئلہ ہے۔

یہ جہاز (b-747) ساخت کا تھا۔ ایک کارڈ پر دوران پرواز حفاظتی تدابیر درج تھیں۔ اس سے پہلے پندرہ زبان میں لکھا ہوا تھا: آپ کی حفاظت کے لئے (for your safety) سب سے آخر میں پندرہویں نمبر پر عربی میں "من اجل سلامتك" درج تھا۔ عربی فقرہ کا آخر میں اندراج کسی تعصب کی بنا پر نہ تھا۔ اس قسم کی تجارتی کمپنیاں صرف یہ دیکھتی ہیں کہ ان کے مسافروں میں کتنے آدمی کس زبان والے ہیں۔ اسی کے لحاظ سے وہ ترتیب مقرر کرتی ہیں۔

یہ تعصب کی بات نہیں بلکہ حقیقت کی بات ہے کہ مسلمان انٹرنیشنل اسفار میں "پندرہویں نمبر" پر ہیں۔ مسلم مسافرین میں زیادہ تر افراد وہ ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی نوعیت کا مذہبی سفر کر رہے ہوتے ہیں۔ جب کہ موجودہ زمانہ میں زیادہ تر سفر سیاحت، تجارت، سیاست اور حکومتی تعلقات کے تحت ہوتا ہے اور اس قسم کے سفروں میں مسلمانوں کا بہت کم حصہ ہے۔

میرے قریب کناڈا کے ایک سیاح (Dr Thomas Raye) تھے۔ وہ ہندستان سے آرہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ کناڈا میں اور انڈیا میں کیا فرق ہے۔ انھوں نے مسکرا کر کہا کناڈا میں طرح طرح کی مادی ترقیاں ہیں اور انڈیا میں طرح طرح کے انسان۔ انھوں نے اپنی جیب سے دو درجن رنگین تصویریں نکالیں جو انھوں نے انڈیا کے قیام کے دوران کھینچی تھیں۔ اس میں عجیب عجیب صورتیں تھیں۔ کسی میں کوئی بندر نچا رہا ہے۔ کہیں کوئی نعرہ لگا رہا ہے، کہیں کوئی بھیک مانگ رہا ہے۔ کہیں کوئی برقع پوش عورت ہے، کہیں کوئی رکشا کھینچ رہا ہے۔ وغیرہ۔

ترقی یافتہ ملکوں کی نظر میں انڈیا ایک بچھڑا ہوا ملک ہے۔ انڈیا کے لوگ اس کو مغرب کا تعصب کہتے ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ یہ درست ہے کہ انڈیا میں ترقیاں ہوئی ہیں۔ مگر یہ ترقیاں اس درجہ سے بہت کم ہیں جہاں پہنچ کر آدمی کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ اعتراف کا عملی اصول یہ ہے کہ آپ سو درجہ ہوں تو لوگوں کو آپ دس درجہ دکھائی دیں گے۔ اس لئے دنیا نے اگر آپ کا اعتراف نہ کیا ہو تو دوسروں کی شکایت کرنے کے بجائے اپنے آپ کو مزید اٹھائیے یہاں تک کہ آپ کی بلندی اس اعلیٰ درجہ تک پہنچ جائے کہ کوئی شخص اس کو دیکھے بغیر نہ رہ سکے۔

چالیس سال پہلے جاپان کی تصویر دنیا کی نظر میں نہایت حقیر تھی۔ حتی کہ ابتدائی ترقی کے بعد بھی کوئی اس کو ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ مگر آج جب کہ جاپان کی ترقی کا پیالہ بھر کر ابل پڑا تو اب ہر آدمی اس

کا اعتراف کر رہا ہے۔ میری سیٹ کے پاس تھیلے میں ایک خوبصورت سا پمفلٹ تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا: آسمان میں خریداری (shopping in the sky) اس پمفلٹ میں بتایا گیا تھا کہ دوران پرواز آپ جہاز کی " مارکٹ " سے کیا کیا چیز خرید سکتے ہیں۔ میں نے مذکورہ جملہ پڑھا تو معاً مجھے خیال آیا کہ دوسرے مسافروں کا کیس اگر " شاپنگ ان دی اسکائی " ہے تو میرا کیس " تھنکنگ ان دی اسکائی " کہا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ میرا ذہن ہمیشہ سوچنے میں لگا رہتا ہے۔

پھر خیال آیا کہ دنیا کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ دنیا میں بیشتر لوگ " شاپنگ " کو اصل کارنامہ سمجھتے ہیں۔ یعنی دنیا کی مارکیٹ میں جو چیزیں مل رہی ہیں، اس کا زیادہ سے زیادہ ذخیرہ اپنے لئے سمیٹ لیں۔ کچھ لوگ ظاہری مادی سامان خریدتے ہیں اور کچھ لوگ اخباری شہرت، عوامی مقبولیت، اسٹیج کی لیڈری کو سب سے بڑی چیز سمجھ کر اس کو حاصل کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ سب سے بڑی چیز جو اس دنیا سے حاصل کی جائے وہ سوچنا ہے جس کو قرآن میں ذکر و فکر (آل عمران) کہا گیا ہے۔ ذکر و فکر کسی قسم کے الفاظ کی تکرار نہیں ہے۔ یہ دراصل ذہنی تخلیق کا ایک عمل ہے۔ آدمی مرئی حقیقتوں کو غیر مرئی حقیقتوں میں تبدیل کرتا ہے۔ وہ دنیا کے مادی کارخانہ سے روحانی پیداوار نکالتا ہے۔ وہ عالم ظاہر سے ایک عالم باطن کی تعمیر کرتا ہے۔ اسی کا نام ذکر و فکر ہے۔

فرینکفرٹ سے جنیوا جاتے ہوئے جہاز میں مختلف یورپی اخبارات تھے۔ میں نے ایک اخبار (USA Today) لیا۔ اس کے صفحہ ۱۲ پر ایک رپورٹ تھی جس کا عنوان تھا: نیا جنگی میدان (The new war zone) اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ جب سے امریکہ اور سوویت روس نے اپنی بندوقیں رکھ دی ہیں، اقتصادی طاقت ایک طاقت ور ہتھیار بن گئی ہے۔ اور اس نے چھوٹی طاقتوں مثلاً جاپان اور جرمنی کے لئے اس بات کا دروازہ کھول دیا ہے کہ وہ عالمی اہمیت حاصل کرنے کی طرف آگے بڑھ سکیں:

Since the USA and Soviet Union have put down their guns, economic strength has become a powerful weapon. And that has opened the door for smaller powers—such as Japan and West Germany—to move into positions of global prominence.

ان سطروں کو پڑھتے ہوئے مجھے معاہدہ حدیبیہ کی حکمت یاد آ گئی۔ معاہدہ حدیبیہ میں یہی ہوا تھا کہ قریش دس سال تک کے لئے تلوار میان میں رکھنے پر راضی ہوگئے تھے۔ چنانچہ جیسے ہی ایسا ہوا، اسلام نے دعوتی طاقت کی حیثیت سے ابھرنا شروع کردیا۔ رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ میں آج کل ایک لطیفہ (joke) مشہور ہو رہا ہے کہ سرد جنگ ختم ہوگئی اور جاپان جیت گیا:

The Cold War is over — and Japan won.

فرینکفرٹ سے جنیوا کی پرواز تقریباً ایک گھنٹہ کی تھی۔ جہاز نے کافی نیچے نیچے پرواز کیا۔ چنانچہ اس سفر کے دوران جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کے دیہات بہت صاف نظر آتے رہے۔ دیہات کے مکانات انتہائی منظم تھے۔ صاف ستھرا ماحول، ہر طرف سڑکیں نظر آ رہی تھیں۔ باغوں اور کھیتوں کے ہرے بھرے قطعات اتنے خوب صورت تھے جیسے وہ قدرتی آرٹ کے نمونے ہوں۔ ترقی یافتہ ملکوں میں دیہات کی زندگی نہایت خوشگوار ہوتی ہے۔ یہاں وہی تمام سہولتیں موجود ہوتی ہیں جو شہروں میں ہوتی ہیں۔ مزید یہ کہ وہاں قدرت کا ماحول ہوتا ہے جو شہروں میں نہیں پایا جاتا۔

اخبار میں گھوڑ دوڑ (Derby) کا ایک صفحہ تھا۔ ایک تصویر میں ایک شخص گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا اس کو شاندار طور پر دوڑا رہا تھا۔ دوسری طرف میری نظر جہاز کے مسافروں پر گئی جو اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے اور جہاز ان کو اڑاتا ہوا ان کو ان کی منزل کی طرف لے جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر بے اختیار مجھے قرآن کی وہ آیت یاد آ گئی جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور تری میں سوار کیا۔ (بنی اسرائیل۔ ۷)

یہ انتہائی عجیب بات ہے کہ گھوڑے کو انسان کے بیٹھنے کے لئے نہایت موزوں بنایا گیا۔ اور پھر اس کے اندر یہ صفت رکھ دی گئی کہ وہ انسان کو اپنی پیٹھ پر لے کر دوڑے۔ اسی طرح مادہ کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صفت رکھ دی کہ وہ ریل اور کار اور ہوائی جہاز کی صورت میں انسان کو تیزی کے ساتھ اِدھر سے اُدھر لے جائے۔ انسان کی یہ تکریم وعزت بلاشبہہ انسان کے اوپر اللہ کا عظیم احسان ہے۔ مگر شاید ہی آج کی دنیا میں ایسے کچھ آدمی ہوں جن کا یہ حال ہو کہ خدائی انعامات کے احساس سے ان کے جسم پر تھرتھری پیدا ہو جائے اور ان کا پورا وجود خدا کے آگے ڈھ پڑے۔

۱۳ مئی کی سہ پہر کو سوئس ایئر کی فلائٹ ۲۴۴۲ کے ذریعہ جنیوا سے دکار کے لئے روانگی ہوئی۔ میری سیٹ کھڑکی سے ملی ہوئی تھی۔ باہر کی طرف دیکھا تو جہاز کا "پر" لمبا پھیلا ہوا تھا۔ پر کے اوپر انگریزی میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے کہ اس کے آگے نہ چلیں:

Do not walk outside this area.

ہوائی جہاز جب ایئرپورٹ پر کھڑا ہوتا ہے تو کارکن حضرات اس کو چیک کرتے ہیں۔ اس وقت کوئی شخص چلتا ہوا پر کے اوپر پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے اس کو پر کے اوپر چلنے سے منع کر دیا گیا۔ کیونکہ ہوائی جہاز کا پر اس کا کمزور حصہ ہے۔ وہ انسانی بوجھ کا تحمل نہیں کر سکتا۔

پر کے اوپر مذکورہ الفاظ پڑھتے ہوئے مجھے وہ حدیث یاد آگئی جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ کی کچھ حدیں ہیں تم ان حدوں سے تجاوز نہ کرو۔ "حد" کا معاملہ دنیا اور آخرت دونوں قسم کے معاملات میں انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ دونوں عالموں میں وہی لوگ کامیاب رہیں گے جو حد کو جانیں۔ مثلاً کسی سے آپ کو اختلاف ہو تو علمی تردید کی حد تک آپ جا سکتے ہیں۔ اس کے آگے الزام تراشی اور کردارکشی اور سب وشتم کے لئے زبان وقلم کو استعمال کرنے کی کسی کو اجازت نہیں۔ اسی طرح عمل کے معاملہ میں جائز حدود میں سرگرم ہونے کی ہر ایک کو اجازت ہے۔ مگر جائز حدود کے باہر کسی کو اجازت نہیں۔

دکار ایئرپورٹ سے شہر جاتے ہوئے ہماری گاڑی جہاں کہیں لال بتی پر کھڑی ہوتی، فوراً ہی "سیاہ فام" چھوٹے اور بڑے افراد گاڑی کے گرد جمع ہو جاتے۔ یہ عین وہی منظر ہے جو دہلی کی سڑکوں پر نظر آتا ہے۔ مگر دہلی میں جو لوگ اس طرح گاڑی کو گھیرتے ہیں وہ زیادہ تر بھیک مانگنے والے ہوتے ہیں۔ یہاں اس کے برعکس منظر تھا۔ یہ لوگ اپنے ہاتھوں میں مختلف قسم کے سامان لئے ہوئے ہوتے اور ان کو فروخت کرتے تھے۔ یورپ کے شہروں میں آپ جائیں تو وہاں آپ کو دونوں میں سے کوئی منظر بھی دکھائی نہیں دے گا۔

دکار میں میرا قیام ہوٹل نووٹل (Novotel) میں کمرہ نمبر ۲۳۸ میں تھا۔ پہلی نماز جو میں نے اس ہوٹل میں پڑھی وہ مغرب کی نماز تھی۔ کسی نئے مقام پر نماز پڑھنا ہمیشہ میرے لئے ایک عجیب تجربہ ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر اکثر یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ شاید میں پہلا شخص ہوں جو اس مقام

پر رب العالمین کے آگے سجدہ ریز ہو رہا ہے۔

یہ ہوٹل کسی بیرونی کمپنی نے بنایا ہے۔ وہ سمندر کے عین کنارہ ہے۔ پورا ماحول نہایت خوش منظر ہے۔ ہوٹل کے طعام خانہ میں فرانسیسی گانے کا ریکارڈ دھیمی آواز سے بجتا رہتا تھا۔ یہ غالباً یورپی سیاحوں کی رعایت سے ہے، جن میں اکثریت فرانسیسیوں کی ہوتی ہے۔

اس مجبورانہ سماعت کے دوران سمجھ میں آیا کہ کیا وجہ ہے کہ اردو نہ جاننے والے لوگ بھی اردو غزل سننا پسند کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرانسیسی یا انگریزی گانے میں سننے والوں کے لئے وہ کیفیت نہیں جو غزل کے نغمہ میں پائی جاتی ہے۔

دکار (Dakar) سینیگال کی راجدھانی ہے۔ وہ افریقہ کی مغربی سرحد پر واقع ہے۔ اپنی جغرافی اہمیت کی بنا پر دکار افریقہ کے اہم شہروں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ ۱۹۰۴ سے ۱۹۵۹ تک وہ مغربی افریقہ میں فرانس کا سیاسی مرکز تھا۔ شہر کی آبادی ایک ملین سے کچھ زیادہ ہے۔ سینیگال کی آبادی میں ۹۵ فی صد سے زیادہ مسلمان ہیں۔

دکار میں ڈچ ۱۶۱۷ میں آگئے تھے۔ فرانسیسیوں نے ۱۶۷۷ میں اس پر قبضہ کیا۔ ایک زمانہ میں دکار غلاموں کی تجارت کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ فرانسیسیوں نے ۱۸۶۶ میں یہاں اسٹیم شپ کارخانہ قائم کیا۔ ۱۸۸۵ میں یہاں پہلی ریلوے لائن بچھائی گئی۔ یہ ریلوے لائن سینٹ لوئی اور دکار کے درمیان تھی۔ ۱۹۱۴ میں دکار ایک ترقی یافتہ شہر بن چکا تھا۔

دوسری عالمی جنگ کے زمانہ میں اور اس کے بعد یہاں صنعت کو کافی ترقی ہوئی۔ فرانسیسی اقتدار کے تحت پورا مغربی افریقہ اس کو وسیع مارکٹ کے طور پر حاصل تھا۔ ۱۹۵۹ اور ۱۹۶۱ کے درمیان مغربی افریقہ کی فرانسیسی حکومت ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد یہ علاقہ آٹھ آزاد ریاستوں میں بٹ گیا۔ اب اس کا مارکٹ کا میدان بہت کم ہوگیا ہے۔ (5/437)

دکار سے فرانسیسی قبضہ ختم ہوچکا ہے۔ مگر فرانسیسی تہذیب کے آثار اب بھی نمایاں طور پر باقی ہیں۔ یہاں کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ تاہم عربی جاننے والے لوگ بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔

سینیگال کا رقبہ ۷۵۸۶۴ مربع میل ہے۔ اور آبادی تقریباً ۳۷۵۵۰۰۰ لوگوں پر مشتمل

ہے۔ وہ ۱۹۶۰ میں آزاد ہوا۔ اس سے پہلے وہ فرانس کے قبضہ میں تھا۔ اس کے اثر سے اب بھی سینیگال کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔

سینیگال دراصل یہاں کے سرحدی دریا کا نام ہے جو ۱۰۱۵ میل لمبا ہے۔ اہل یورپ تک اس کا تعارف سونے کا دریا (River of Gold) کی حیثیت سے پہنچا۔ ۱۶ ویں صدی سے لیکر ۲۰ ویں صدی تک یہی دریا فرانس کے نوآبادیاتی اثرات کو سینیگال تک پہنچانے کا ذریعہ بنا رہا۔

سینیگال مغربی افریقہ کا ساحلی ملک ہے۔ عربوں نے اس کو ابتدائی دور میں کامیابی کے ساتھ فتح کیا اور اس علاقہ کی تجارت پر قابض ہو گئے۔ ایک مورخ نے لکھا ہے کہ نویں صدی اور چودھویں صدی عیسوی کے درمیان عرب دنیا میں جغرافیہ دانی اور تاریخ دانی کو کافی فروغ ہوا۔ اس سے عربوں کو اس علاقہ کے بارہ میں مفصل معلومات حاصل ہوئیں جس کو وہ بلاد السودان کہتے تھے:

The lively school of geographers and historians that flourished in the Arab world from about the 9th to the 14th century thus secured access to growing amounts of information about what they called the biladas-sudan, the territory of the Negro peoples south of the Sahara. (19/761)

اسلام جب اپنی صحیح صورت میں زندہ ہوتا ہے تو وہ صرف معروف مذہبی پہلوؤں کو زندہ نہیں کرتا بلکہ اسی کے ساتھ وہ انسانیت کے تمام ضروری پہلوؤں کو بھی زندہ کر دیتا ہے۔

ویسٹ انڈیز اور امریکہ کی دریافت کے بعد وہاں زراعت کا کام بڑھا۔ وہاں زمینیں تھیں مگر انسان نہ تھے۔ اس لئے زرعی مزدور کے طور پر غلاموں کی تجارت میں زبردست اضافہ ہوا۔ ۱۷۸۰ اور اس کے بعد کے سالوں میں تقریباً ۰۰۰ ، ۷ غلام ہر سال افریقہ سے لے جا کر ویسٹ انڈیز اور امریکہ کے ساحل پر اتارے جا رہے تھے (19/768)

غلاموں کی اس تجارت کو جس چیز نے ختم کیا وہ مشین کی ایجاد ہے۔ بعد کو جب زرعی مشینیں تیار ہو گئیں تو انسانی مزدوروں کی ضرورت اپنے آپ ختم ہو گئی۔ بعض اوقات کسی برائی کو ختم کرنے کے لئے صرف اخلاقی تبلیغ کافی نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ ضرورت ہوتی ہے کہ مروجہ برائی کی اقتصادی یا سیاسی اہمیت کو ختم کر دیا جائے۔ اس کے بعد وہ برائی اسی طرح ختم ہو جائے گی جس طرح کسی زندہ چیز سے

پانی نکال لیا جائے اور وہ اپنے آپ ہلاک ہو جائے۔

سینیگال کی ایک عجیب جغرافی صفت ہے جو دنیا کے کسی دوسرے ملک میں نہیں پائی جاتی۔ وہ یہ کہ ایک اور ملک اٹلانٹک کے ساحل سے ایک لمبے انکلیو (enclave) کی صورت میں سینیگال کے اندر گھسا ہوا ہے۔ یہ دوسرا ملک گامبیا ہے جو انگلی کی مانند تقریباً ۲۰ میل چوڑا اور ۲۰۰ میل لمبا اٹلانٹک کے ساحل سے سینیگال کے اندر تک چلا گیا ہے:

The Gambia constitutes a finger of territory 20 miles wide and 200 miles long that thrusts from the cost eastward deep into Senegal (16/531).

سینیگال ایک خوش حال ملک ہے اور گامبیا ایک غریب ملک۔ سینیگال میں غلہ کے علاوہ فاسفیٹ، لوہا، پٹرول وغیرہ پیدا ہوتا ہے۔ جب کہ گامبیا کی حالت تقریباً وہی ہے جو برصغیر میں بنگلہ دیش کی۔

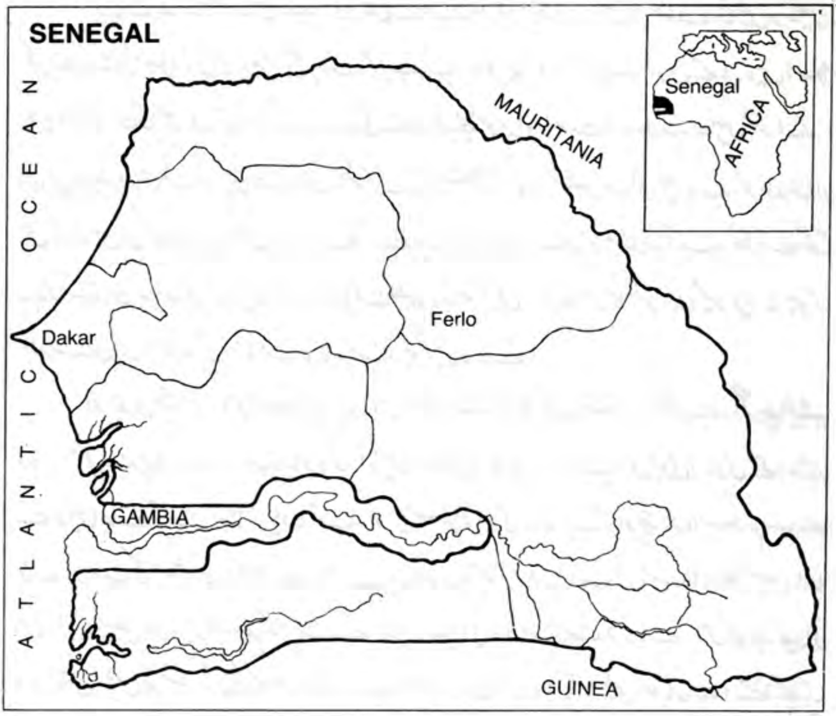

یہ نو آبادیاتی طاقتوں کی دین ہے۔ پچھلی صدی میں ایسا ہوا کہ فرانسیسی سینیگال میں داخل ہوئے اور انگریز گامبیا میں۔ دونوں میں ایک دوسرے پر غلبہ پانے کے لئے کئی لڑائیاں ہوئیں۔ آخر یہ سمجھوتہ ہوا کہ انگریز گامبیا کے کچھ علاقے فرانسیسیوں کو دیدیں۔ اور اس کے بدلے فرانسیسی صومالیہ کے کچھ علاقے انگریزوں کے حوالے کر دیں۔ اس طرح گامبیا کا موجودہ عجیب وغریب ملک بنا۔

افریقہ کے لئے روانگی سے پہلے میں نے ہندستان کے ایک اسلامی پرچہ (۱۰ اپریل ۱۹۹۰) میں ایک مضمون پڑھا۔ اس کا عنوان تھا "افریقہ میں اسلام" اس مضمون میں بتایا گیا تھا کہ افریقہ کے لوگوں نے نہایت آسانی کے ساتھ اسلام قبول کر لیا اور وہاں مسلمانوں نے بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ :

"عیسائیت کے مقابلہ میں اسلام کی تعلیمات بہت سادہ تھیں۔ اسلام نے مقامی افراد کی تہذیبی اقدار کو کم سے کم چھیڑا۔ اسلام نے وہ تمام باتیں قائم رہنے دیں جو اسلامی تعلیمات کے خلاف نہیں تھیں۔ اور افریقیوں کو ان کے اپنے طور طریقوں کے ساتھ رہنے دیا"

یہ بات بذات خود صحیح ہے۔ اور میں نے اپنے سفر افریقہ میں اس کی مختلف مثالیں دیکھیں۔ مگر ہندستانی مسلمانوں کا یہ مزاج بہت عجیب ہے۔ افریقہ اور دوسرے ملکوں کے بارہ میں اسلام کا یہ تقاضا ان کی سمجھ میں آجاتا ہے کہ زندگی کے طور طریقے جو براہ راست اسلام سے نہیں ٹکراتے، ان میں غیر ضروری طور پر اپنی شناخت قائم کرنے کی کوشش کرنا دانش مندی نہیں ہے۔ مگر ہندستان میں آتے ہی ان کا مزاج بالکل بدل جاتا ہے۔ یہاں ان کو اسلام کا مسئلہ نمبر ایک یہ نظر آنے لگتا ہے کہ مسلمان ہر معاملہ میں اپنی قومی شناخت علیحدہ قائم کریں۔ خواہ اس کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ ہندستان میں اسلام کی اشاعت کا کام بند ہو کر رہ جائے۔

افریقہ کی بیشتر آبادی مسلمان ہے۔ اس اعتبار سے افریقہ ایک مسلم بر اعظم ہے۔ اگرچہ ایشیا وہ بر اعظم ہے جہاں سب سے زیادہ تعداد میں مسلمان آباد ہیں۔ مگر ایشیا میں مجموعی آبادی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہاں نسبتاً زیادہ تعداد غیر مسلم اقوام کی ہے۔ جب کہ افریقہ میں اسلام سب سے بڑے مذہب کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم چند ملکوں کو چھوڑ کر بقیہ ممالک میں مسلمان کافی پس ماندہ ہیں۔ حتی کہ بعض ملکوں میں مسلم اکثریت کے باوجود عیسائی فرقہ حکومت کر رہا ہے۔ اس کی وجہ "عیسائی سازش" نہیں بلکہ مسلمانوں کی پس ماندگی ہے۔ مسلمان ان ملکوں میں تعلیمی اعتبار سے اتنے پیچھے ہیں

کہ مقابلتہً وہ وہاں حکمراں بننے کی پوزیشن میں نہیں۔

حکومتوں کی دعوت پر یا انٹرنیشنل کانفرنسوں میں شرکت کے لئے جو سفر ہوتے ہیں، ان میں آدمی کو مصنوعی ماحول میں رہنا ہوتا ہے۔ مثلاً کاروں کے قافلہ میں خصوصی راستوں پر سفر کرایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کا سفر کرنے والے کسی ملک کی حقیقی تصویر کو بہت کم دیکھ پاتے ہیں۔

میں اکثر ان اہتمامات کو توڑ کر ملکی حالات کو جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ مثلاً ایک بار میں نے اپنی کار چھوڑ دی اور ایک عام بس پر بیٹھ گیا جو مطلوبہ منزل کی طرف جا رہی تھی۔ اس سفر کے دوران کئی نئی باتوں کا تجربہ ہوا۔ مثلاً میں نے دیکھا کہ عام افریقی بہت زیادہ بولتے ہیں، اور زیادہ بولنا ہمیشہ کم سوچنے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ ایک جگہ میں نے دیکھا کہ کئی خنزیر گھوم رہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہاں مذہبی رواداری بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اسی طرح اندازہ ہوا کہ اندرونی سڑکیں اتنی اچھی نہیں ہیں جتنی بیرونی سڑکیں اچھی ہیں۔ عام افریقیوں کے مکان بہت معمولی نظر آئے۔ وغیرہ

اسلام افریقہ میں داخل ہوا تو پہلے وہ اس کے شمالی حصہ میں پہنچا۔ کیوں کہ یہ حصہ عرب دنیا سے ملا ہوا تھا۔ مغربی افریقہ میں اسلام کسی قدر بعد میں پہنچا۔ کہا جاتا ہے کہ مغربی افریقہ کے مسلمانوں ہی نے سب سے پہلے امریکہ کو دریافت کیا۔ وہ برازیل تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ برازیل (جنوبی امریکہ) کا نام ایک افریقی قبیلہ کے نام پر ہے جس کا واحد برزلہ اور جمع برازل ہے۔ وغیرہ

ایک مورخ نے مغربی غلبہ کے زمانہ میں لکھا تھا کہ افریقہ میں کئی بڑے بڑے علاقے ہیں جہاں کبھی اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود اسلام وہاں پہنچا۔ حتی کہ اب بھی وہاں اسلام پھیل رہا ہے جب کہ وہاں کے یورپی حکمراں اس کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے میں مشغول ہیں:

> There are vast regions in the continent that never knew Islamic domination, and yet Islam is spreading there even in these dxays inspite of the vigilance kept and obstacles set up by their Occidental masters (p. 213).

حقیقت یہ ہے کہ اسلام فطرت کا دین ہے۔ وہ جہاں بھی پھیلتا ہے، فطرت کے زور پر پھیلتا ہے نہ کہ حکومت یا مادی طاقت کے زور پر۔

ہوٹل کے کمرہ کی میز پر ہوٹل کی طرف سے مختلف قسم کے اشتہاری کارڈ رکھے ہوئے تھے۔ ایک کارڈ پر لکھا ہوا تھا کہ نئے دن کے آغاز کے لئے اس سے بہتر طریقہ کیا ہے کہ آپ ہمارے بوفے ناشتہ سے اس کا آغاز کریں :

What better way to start a new day than our breakfast buffet?

اس کو پڑھتے ہوئے مجھے وہ حدیث یاد آگئی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے صبح کی نماز پڑھ لی وہ اللہ کی ذمہ داری میں آگیا (من صلی الصبح فھو فی ذمة الله) گویا ہوٹل کے مالک کی سوچ یہ ہے کہ آدمی اس کے تجارتی ناشتہ سے اپنی صبح کا آغاز کرے۔ اس کے برعکس پیغمبر کی سوچ یہ ہے کہ آدمی یادخداوندی سے اپنی صبح شروع کرے۔

ہوٹل کا مالک صلاۃ صبح سے اختلاف نہیں کرے گا۔ اسی طرح پیغمبر صبح کے ناشتہ سے کسی کو نہیں روکے گا۔ مگر ہوٹل والے کے ذہنی سانچہ میں یادخداوندی ثانوی چیز ہے اور پیغمبر کی فکر میں ناشتہ ثانوی چیز۔ اسی تقدیم وتاخیر کے نتیجہ میں ایک رویہ دنیا پرستی بن جاتا ہے اور دوسرا رویہ آخرت پسندی۔

۷ مئی کو صبح ۱۰ بجے کا وقت ہے۔ میں ہوٹل کے باہر کے حصہ میں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہوں۔ ایک طرف ہوٹل کی بلند و بالا عمارت ہے۔ دوسری طرف سمندر حد نظر تک پھیلا ہوا موجیں مار رہا ہے۔ درمیان میں سبزہ اور پھول اور درخت کے مناظر ہیں۔ موسم نہایت خوشگوار ہے۔ ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے لمس ربانی کی مانند ہر چیز کو چھوتے ہیں اور پھر گذر جاتے ہیں۔ چڑیوں کی آوازیں قدرتی نغمہ بکھیر رہی ہیں۔

" دنیا جب اتنی حسین ہے تو آخرت کتنی زیادہ حسین ہوگی " میری زبان سے نکلا۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا آخرت کی دنیا کا ایک ابتدائی تعارف ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اس کے ساتھ " حزن " رکھ دیا تاکہ کوئی شخص یہاں اپنا دل نہ لگا سکے۔ آدمی سے یہ مطلوب ہے کہ وہ موجودہ دنیا کے آئینہ میں آخرت کو دیکھے۔ لیکن اگر آدمی موجودہ دنیا ہی کو اصل سمجھ کر اس میں کھو جائے تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے آپ آئینہ میں ایک خوبصورت پھول دیکھیں اور اس پھول کو خود آئینہ کے اندر حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔

ایک صاحب نے گفتگو کے دوران بتایا کہ ڈکار میں دو ہزار مسجدیں ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا تمام مسجدیں آباد ہیں۔ انھوں نے پرمسرت لہجہ میں کہا: سنغالیون متدیّنون وھم متحمسون لدینھم الحنیف (سینیگال کے لوگ دین دار ہیں اور وہ اپنے دین میں پختہ ہیں)

ایک مرتبہ میں نے ڈکار کی ایک سڑک پر دیکھا کہ ایک فرانسیسی خاتون سڑک پر پیدل چل رہی ہے اور اس کی گود میں کتے کا ایک بچہ ہے جس کو وہ عین اسی طرح لئے ہوئے ہے جس طرح کوئی ماں اپنے بچہ کو اپنے سینہ سے چمٹائے ہوئے رہتی ہے۔ مغرب کی عورت نے انسانی بچہ کو گود میں لینا فیشن کے خلاف سمجھا۔ مگر اس کے بعد جو ہوا وہ صرف یہ کہ اس نے کتے کے بچے کو اپنی گود میں لے لیا۔ یہ دراصل فطرت کا تقاضا ہے جو عورت کو ایسا کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اس نے انسانی بچہ کو چھوڑا تھا مگر اس کے بعد فطرت نے اس کو حیوانی بچہ سنبھالنے پر مجبور کر دیا۔

روانگی سے پہلے دہلی میں میں نے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ڈکار (Dakar) کا صفحہ دیکھا۔ اس میں ایک نہایت خوب صورت عمارت کی تصویر بنی ہوئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ یہ صدارتی محل ہے جو سمندر کے کنارے بنا ہوا ہے۔ ۶ مئی کو شہر کے مختلف مقامات دیکھنے کے دوران مذکورہ "صدارتی محل" دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا۔ جب میں اس عمارت کے سامنے کھڑا تھا تو مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی محل ہے جس کی تصویر میں نے دہلی میں کتاب میں دیکھی تھی۔ تصویر میں جو عمارت نہایت عظیم نظر آئی تھی، وہ حقیقی طور پر دیکھنے میں مقابلۃً معمولی نظر آنے لگی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ حقیقت کے مقابلہ میں تصویر ہمیشہ زیادہ عظیم دکھائی دیتی ہے۔ بیشتر لوگ اس فرق کو نہیں سمجھتے۔ اس لئے وہ تصویر کو حقیقت سمجھ کر اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ مگر جب وہ اس کو پالیتے ہیں تو وہ مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ اب انھیں معلوم ہوتا ہے کہ جو حقیقت انھوں نے پائی ہے وہ اس سے بہت کم ہے جو "تصویر" کی صورت میں انھوں نے پہلے دیکھی تھی۔

ایک بات یہ محسوس ہوئی کہ یہاں وہ بدعت نہیں ہے جو ہندستان اور پاکستان میں عام طور پر پائی جاتی ہے۔ یعنی مسلم ملکوں کی سیاسی رقابتوں کا اثر دینی حلقوں پر۔ وہاں ہر دینی حلقہ کسی ایک کا قصیدہ خواں بن کر دوسرے کے اوپر "لوم وشؤم" کی لفظی بارش برسا رہا ہے۔ یہاں کے دینی لوگ سیاست سے قطع نظر کرتے ہوئے، ہر مسلم ملک سے یکساں تعلق قائم رکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً ڈکار

میں ایک اسلامی مرکز عراق کے تعاون سے بنا ہے، اگرچہ ابھی وہ ناتمام ہے۔ شیخ عبدالعزیز بزسی نے یہاں مجھے ایک مسجد دکھائی جو پہلے خستہ تھی، اب وہ شاندار طور پر بنی ہوئی کھڑی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس مسجد کی تعمیر نو کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میں سعودی عرب گیا، وہاں مجھے کافی مدد ملی۔ اس سے میں نے یہ مسجد تعمیر کرائی۔ اسی طرح ایک اور اسلامی ادارہ ہے جو لیبیا کے تعاون سے بنایا گیا ہے۔ دینی حلقوں کے لئے یہی انداز زیادہ مناسب ہے۔

یہ ہوٹل دس منزلہ ہے۔ اس اعتبار سے اس کی لفٹ میں ایک سے لے کر دس تک نمبر لگے ہوئے ہیں۔ ہر آدمی اپنا مطلوبہ نمبر دباکر اپنی مطلوبہ منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

ایک روز لفٹ میں جاتے ہوئے مجھ پر ایک تجربہ گزرا۔ میں لفٹ کے اندر داخل ہوا تو میرے ساتھ تین آدمی اور بھی آگئے۔ کسی کو نویں منزل پر جانا تھا، کسی کو دسویں منزل پر۔ ان لوگوں نے سبقت کرکے اپنا اپنا نمبر دبا دیا۔ بورڈ پر نمبر ۹ اور نمبر ۱۰ کی گھنٹیاں روشن ہوگئیں۔ مجھے نمبر ۲ پر جانا تھا۔ میں نے بعد کو اپنا بٹن دبا دیا۔ بٹن دبانے کی ترتیب کے لحاظ سے بظاہر لفٹ کو پہلے نویں اور دسویں منزل پر جانا چاہئے تھا۔ مگر لفٹ نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے پہلے مجھ کو دوسری منزل پر اتارا۔ اس کے بعد وہ نویں اور دسویں منزل کے مسافروں کو اتارنے کے لئے اوپر گئی۔

اونچی بلڈنگوں کے لئے یہ روزمرہ کا عام واقعہ ہے۔ لوگ اس کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ اس پر غور کریں۔ مگر میرا ذہن فوراً ٹھٹک گیا۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ لفٹ نے ایسا کیوں کیا کہ اس نے بٹن دبانے کی بے ترتیبی کو بطور خود درست کیا اور صحیح ترتیب کے ساتھ مسافروں کو ان کی منزل پر پہنچایا۔ میرے ذہن نے جواب دیا کہ اس کا سبب کمپیوٹر ہے۔ موجودہ زمانہ کی آٹومیٹک لفٹ کے ساتھ کمپیوٹر لگا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اپنے "مشینی دماغ" کے ذریعہ بے ترتیبی کو ترتیب میں بدلتا ہے۔ وہ لفٹ کو "حکم" دیتا ہے کہ بے ترتیب طور پر بٹن دبائے جانے کے باوجود وہ اپنے مسافروں کو حقیقی ترتیب کے ساتھ ان کی منزل پر اتارے۔

اس دنیوی منظر کو دیکھ کر اچانک میرا ذہن آخرت کی طرف چلا گیا۔ میں نے کہا کہ یہی واقعہ جو مخلوق کی سطح پر ابتدائی درجہ میں پیش آرہا ہے، یہی آئندہ خالق کی سطح پر کامل درجہ میں پیش آئے گا۔

موجودہ دنیا میں بظاہر حقیقی ترتیب بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ کہیں اول درجہ کا آدمی پیچھے ہے اور تیسرے درجہ کا آدمی آگے۔ اہل شخص بے زبان بنا ہوا ہے اور نااہل لوگ اخبار اور اسٹیج پر نمایاں ہو رہے ہیں۔ مستحق لوگ ناداری میں پڑے ہوئے ہیں اور غیر مستحق افراد ہر قسم کے وسائل پر قابض ہیں۔ یہ گویا مصنوعی ترتیب ہے جو موجودہ دنیا میں قائم ہو گئی ہے۔ آخرت میں خدا ظاہر ہو کر اس ترتیب کو ختم کر دے گا۔ وہ نمبر ایک کو نمبر ایک پر کر دے گا اور بقیہ نمبر والوں کو ان کے حقیقی نمبر کی طرف جانے پر مجبور کر دے گا۔

کھانے کے وقت ایک بار سینیگال کے ایک صاحب میری میز کی دوسری طرف تھے۔ انھوں نے اپنے ملک کے بارہ میں بہت سی باتیں بتائیں۔ ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ یہاں ایک درخت پایا جاتا ہے۔ اس کی پتی کو چائے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف ایک مشروب ہے بلکہ وہ نہایت مفید ہے (اوراق تغلی وتشرب کالشای وهی مفیدة جدا)

مشہور ہے کہ ایک شخص نازک بیماری میں مبتلا تھا۔ علاج سے وہ اچھا نہیں ہوا۔ ایک روز وہ گھبرا کر بستی کے باہر چلا گیا اور اس نے مذکورہ درخت کی بہت سی پتی کھالی۔ اگلے دن اسے اپنے مرض میں افاقہ محسوس ہوا۔ اس کے بعد وہ مزید کچھ دنوں تک اس کی پتی کھاتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ بالکل تندرست ہو گیا۔ یہ قصہ مشہور ہوا تو لوگ اس درخت کی پتی کو مختلف صورتوں میں استعمال کرنے لگے۔ اب اس کی مقبولیت کی بنا پر ایسے کارخانے بن گئے ہیں جہاں اس کی پتی کو پروسس کیا جاتا ہے اور اس کو پیک کر کے چائے کی طرح سپلائی کیا جاتا ہے۔ کھانے کے بعد میرے ساتھی نے کافی منگائی۔ مگر میں نے اس مقامی مشروب کا آرڈر دیا۔ یہ کافی لطیف اور مفید تھا۔ میں جب تک یہاں رہا میں اس کو پیتا رہا۔ اس کا نام کِن کلی با (Kinkelibah) ہے۔ اس کے پیکٹ پر حسب ذیل پتہ لکھا ہوا تھا:

Enterprise Senegalaise de, B.P. 10.101,
Ouagou Niayes, Dakar, Senegal, West Africa.

محمد مصطفیٰ سی (مفتش فی تعلیم اللغۃ العربیۃ) نے بتایا کہ سینیگال میں عیسائی اگرچہ بہت کم ہیں۔ پانچ فیصد سے بھی کم۔ مگر یہاں چرچ بہت منظم ہے۔ یہاں کے بہترین اسکول اور اسپتال انھیں لوگوں نے قائم کر رکھے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی بہت کوششیں کرتے ہیں۔ مگر اس میں وہ کامیاب نہیں۔

دوسری طرف مسیحی (ان کے غریب طبقہ کے لوگ) برابر مسلمان ہوتے رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے آج ہی ایک مسیحی کو مسلمان بنایا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق، یہ مسیحی کسی تبلیغ کے بغیر اپنے آپ مسلمان ہوتے رہتے ہیں۔

ہوٹلوں میں طرح طرح کی چیزیں کھانے کے لئے ہوتی ہیں۔ یہاں بھی یہی صورت حال تھی۔ مگر صبح کو اکثر میں ہنی پاپ (honey pops) لیا کرتا تھا۔ ۶ مئی کی صبح کو ناشتہ کے لئے ہوٹل کے طعام خانہ میں گیا تو وہاں ہنی پاپ کا ڈبہ دکھائی نہیں دیا۔ وہاں جو ڈبے رکھے ہوئے تھے ان پر ہنی پاپ کے بجائے میل پاپ (miel pops) لکھا ہوا تھا۔ میرے تجسس کو دیکھ کر ہوٹل کا آدمی قریب آیا۔ اس نے کہا آپ کیا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آج یہاں ہنی پاپ کے ڈبے نہیں ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ میل پاپ وہی چیز ہے۔ میل (miel) فرانسیسی زبان میں شہد (honey) کو کہتے ہیں۔

میں نے سوچا کہ اسی طرح اکثر آدمی لفظوں سے دھوکہ کھاتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی "مذہب امن" کی تلاش میں ہے۔ اب آپ اس کے سامنے "اسلام" پیش کرتے ہیں۔ وہ اس کو اپنے ذہنی تصور کے مطابق کوئی دوسری چیز سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے۔ حالاں کہ اگر وہ حقیقت حال سے واقف ہو تو اس کو معلوم ہوگا کہ مذہبِ امن کے نام سے وہ جس چیز کی تلاش میں ہے وہ عین وہی چیز ہے جس کا نام اسلام ہے۔ اگرچہ مسلمانوں نے اپنا قومی لیبل لگا کر اس کی ظاہری صورت مشتبہ بنادی ہے۔

سینیگال کے ایک صاحب نے بتایا کہ اس ملک میں اسلام گیارہویں صدی عیسوی میں آیا ہے۔ یعنی صحابہ کے دور کے بعد۔ یہاں کے مسلمان عام طور پر نہایت سادہ مزاج ہوتے ہیں۔ ان میں اکثر فطری اوصاف زندہ ہیں۔ مثلاً انھوں نے بتایا کہ کوئی سینیگالی اپنے وطن سے باہر ملک کی کسی دوسری بستی میں جائے تو وہاں وہ کبھی ہوٹل میں نہیں ٹھہرتا۔ کیوں کہ مقامی لوگ اس کو اپنا مہمان بنانا پسند کرتے ہیں۔ ہوٹلوں میں زیادہ تر باہر کے لوگ ٹھہرتے ہیں۔ ایک سینیگالی کھانا کھا رہا ہو تو اس وقت اس کو جو شخص بھی ملے وہ بے تکلف اس کو کھانے میں شریک کرلے گا۔

میں نے اپنے کمرہ میں کھڑے ہو کر سمندر کی طرف دیکھا۔ حد نظر تک سمندر کا پانی موجیں مار رہا تھا اور اس سے ایک قدرتی موسیقی فضا میں بلند ہو رہی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ آج کا زمانہ معلومات کے اعتبار سے، قدیم زمانہ سے کتنا مختلف ہے۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ زمین کا آدھا حصہ خشکی ہے

اور آدھا حصہ پانی۔ یہ اس خیال کا اعادہ ہے جو حکما یونان کے زمانہ سے ابن خلدون تک چلا آرہا تھا۔ مگر آج اسکول کا ایک طالب علم بھی جانتا ہے کہ نصف نصف کا یہ نظریہ درست نہیں۔ اصل یہ ہے کہ ہماری زمین کی سطح کے ۷۱ فی صد حصہ پر سمندر کا پانی پھیلا ہوا ہے اور بقیہ ۲۹ فی صد حصہ خشکی ہے۔

اس معلوماتی فرق کی بنا پر کچھ ترقی پسند لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اب انسان کو نئے مذہب کی ضرورت ہے۔ مگر یہ ایک لغو بات ہے۔ کیوں کہ مذہب کا تعلق اس مسئلہ سے نہیں ہے کہ زمین پر خشکی اور تری کا تناسب ۵۰-۵۰ فیصد ہے یا ۷۱-۲۹ فی صد۔ اس قسم کی معلومات کی کوئی حد نہیں۔ انسان نے جتنا آج جانا ہے، اس سے بہت زیادہ وہ ہے جس کو وہ ابھی تک جان نہ سکا۔ مثلاً بلیک ہول کا نظریہ بتاتا ہے کہ کائنات کا صرف تین فیصد انسان کے لئے قابل مشاہدہ ہے، بقیہ ۹۷ فیصد حصہ انسان کے لئے قابل مشاہدہ نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب کا انحصار اس قسم کی معلومات پر نہیں ہے۔ مذہب کا اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی خدا کی خالقیت اور مالکیت کو تسلیم کرکے اس کے آگے جھک جائے۔ اس اعتبار سے ہر دور کا مذہب صرف ایک ہے، اس میں زمانہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔

سینیگال کے عام لوگ مقامی بولی (اُلف) میں بات کرتے ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگ یا فرنچ بولتے ہیں یا عربی زبان۔ یہ زبانوں کا فرق بھی بڑا عجیب ہے۔ مثلاً ہوٹل کے آدمی کو کلمہ ترحیب اگر اردو میں کہنا ہو تو وہ کہے گا کہ ہم نوووٹل میں آپ کا استقبال کرتے ہیں۔ اس بات کو انگریزی اور فرنچ میں اس طرح کہا جائے گا:

We welcome you in Novotel. (English)
Nous vous souhaitons la bienvenve Novotel (French)

ایک مرتبہ میں سوچنے لگا کہ اگر ساری دنیا کی زبان ایک ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ پھر سمجھ میں آیا کہ کئی زبان ہونا ہی زیادہ بہتر ہے۔ کیوں کہ اس سے مسابقت کی تحریک ہوتی ہے اور ہر ایک آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جب کسی آدمی میں آگے بڑھنے کا جذبہ ابھرتا ہے تو وہ صرف ایک معاملہ تک محدود نہیں رہتا۔ وہ زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی اپنے آپ اپنا اثر ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً

ابتدائی دور کے مسلمانوں میں اولاً کتابت قرآن اور تدوین حدیث کے لئے علم کا جذبہ ابھرا۔ مگر جب علم کا جذبہ ابھر آیا تو پھر اس نے دوسرے تمام علوم میں بھی مسلمانوں کو آگے بڑھا دیا۔

انیسویں صدی کے کچھ مغربی مفکرین نے ایک معاشی یوٹوپیا بنانا چاہا جہاں ہر ایک کو برابر برابر رزق مل رہا ہو۔ یہ فرضی سوسائٹی موجودہ دنیا میں محال ہے کیونکہ وہ تخلیق کے نظام سے ٹکراتی ہے۔ تاہم اگر بالفرض ایسا سماج بن جائے تو تمام ترقیاں ٹھپ ہوکر رہ جائیں گی۔ کیونکہ ترقی کا جذبہ ہمیشہ "فرق" کو دیکھ کر ابھرتا ہے اور جب فرق ہی باقی نہ رہے تو ترقی کا جذبہ کیوں کر پیدا ہوگا۔

ایک بار ہوٹل کے لاونج میں کچھ افریقی مقامی زبان میں بات کر رہے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس کے بعد ہوٹل کے باہر نکلا تو جھاڑی میں ایک بلی تھی۔ اس نے "میاؤں میاؤں" کی آواز نکالی۔ اچانک خیال آیا کہ جانور تمام دنیا میں ایک ہی انداز پر بولتے ہیں۔ کوئی جانور جس طرح ہندستان میں بولتا ہے، ٹھیک اسی طرح وہ یورپ اور افریقہ میں بھی بولتا ہے۔ مگر انسان کی بولیاں الگ الگ ہیں۔ حتی کہ دنیا بھر میں ان کی کئی ہزار بولیاں ہوگئی ہیں۔

پھر خیال آیا کہ یہ انسان کے حالتِ امتحان میں ہونے کا ایک پہلو ہے۔ جانوروں کا کوئی امتحان نہیں۔ اس بنا پر ان کی ہر نوع کے لئے ایک ہی بولی مقرر کر دی گئی۔ مگر انسان اس امتحانی میزان پر کھڑا کیا گیا ہے کہ وہ خود اپنے ارادے سے متحد ہو۔ وہ اختلاف کے باوجود اتحاد کا ثبوت دے۔ جانوروں سے امتحان مطلوب نہ تھا، اس لئے انھیں ازاول تا آخر حالتِ اتحاد میں رکھا گیا۔ اس کے برعکس انسان سے امتحان مطلوب تھا۔ اس لئے انھیں حالت اختلاف میں ڈال دیا گیا۔ اور پھر کہا گیا کہ تم اپنے اختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے اتحاد کا ثبوت دو۔

الشیخ عبد العزیز سی (عمر ۶۳ سال) یہاں کی ممتاز دینی شخصیت ہیں۔ ان کی مادری زبان اگرچہ اُلف ہے۔ مگر وہ روانی کے ساتھ عربی بولتے ہیں۔ انھوں نے "تجول" کی پیش کش کی۔ چنانچہ ان کے ساتھ شہر گھومنے کے لئے نکلا۔

دکار کی سڑکیں نہایت عمدہ ہیں۔ ان کے دونوں طرف عمارتیں زیادہ تر فرانسیسی طرز کی نظر آتی ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ سڑکیں غالباً فرانسیسیوں نے اپنے دور اقتدار میں بنائی تھیں۔ انھوں نے

فوراً کہا : نعم ولکن بعد الاستقلال قمنا بالتجدید (ہاں، مگر آزادی کے بعد ہم نے ان کی تجدید کی ہے)

چلتے ہوئے ہم ڈکار کی سب سے بڑی مسجد جامع میں پہنچے۔ مگر وہ مکمل طور پر بند تھی۔ دروازہ پر تالا لگا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہاں عام مسجدوں میں پانچ وقت کی نماز ہوتی ہے اور وہ کھلی رہتی ہے۔ مگر " جوامع " صرف نماز جمعہ کے لئے ہوتی ہیں۔ جمعہ کی نماز کے بعد وہ بند کر دی جاتی ہیں اور پھر اگلے جمعہ کو کھلتی ہیں (یغلق بعد صلاۃ الجمعۃ الی جمعۃ الآخر) اسی طرح ایک اور بڑی مسجد پر پہنچے تو وہاں بھی تالا لگا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی جامع مسجد ہے اور وہ ہفتہ میں ایک بار صرف جمعہ کی نماز کے لئے کھولی جاتی ہے۔ یہ بات پہلی بار صرف یہاں دیکھی۔

کئی عام مسجدیں دیکھیں۔ ایک کا نام مسجد السید الحاج مالک سی تھا۔ یہ مسجد پہلی عالمی جنگ سے پہلے ۱۹۰۹ میں بنائی گئی تھی۔ پوری مسجد ایک بڑے ہال کی مانند تھی۔ سامنے خوبصورت انداز میں امام کے لئے کھڑے ہونے کی جگہ بنی ہوئی ہے۔ مسجد کا یہ انداز مجھے بہت پسند ہے۔

ایک بڑی دینی درس گاہ دیکھی۔ اس کا نام المعہد الاسلامی (ڈکار) تھا۔ اس وقت وہاں تعطیل تھی۔ تاہم عمارت کھلی ہوئی تھی۔ اس لئے اندر تک پورا حصہ دیکھا۔ اس کا طرز تعمیر بالکل مسلم اسپین کے انداز کا ہے۔

راستہ میں ایک مقام پر بہت بڑی عمارت نظر پڑی جو نامکمل تھی۔ میرے ساتھی نے بتایا کہ یہ مرکز عراق کے تعاون سے بن رہا تھا اور خود صدر صدام حسین نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ مگر اس کے بعد ایران عراق جنگ چھڑ گئی۔ اس بنا پر اس کی عمارت مکمل نہ ہو سکی۔ یہ مرکز میری نظر میں اس اصول کی ایک مثال تھا کہ : ایک کام کرنے کے لئے آدمی کو دوسرا کام چھوڑنا پڑتا ہے۔ آدمی کے وسائل ہمیشہ محدود ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ تعمیر اور تخریب دونوں کام ساتھ ساتھ کر سکے۔ ایران اور عراق دونوں اس اصول کے زندہ نمونے ہیں۔

الشیخ عبدالعزیز سی ڈکار شہر دکھاتے ہوئے آخر میں مجھ کو سمندر کے کنارے کی سڑک سے واپس لائے۔ ایک طرف سمندر کی موجیں تھیں۔ دوسری طرف سڑک کے کنارے دور تک سفیروں کے خوبصورت مکانات تھے۔ چکنی سڑک پر آٹو میٹک کار نہایت ہموار انداز سے چلی جا رہی تھی۔ مگر اتنی دیر میں میرے

سر میں درد شروع ہوچکا تھا۔ میرا یہ حال نہایت عجیب ہے۔ میرے وجود میں غم اتنا سرایت کئے ہوئے ہے کہ میں کسی بھی چیز سے محظوظ نہیں ہوسکتا۔ اپنی کمزوریوں اور نااہلیوں کے بارہ میں سوچتا ہوں تو اکثر میری زبان پر فارسی کا یہ مصرعہ آجاتا ہے:

درحیرتم کہ دہقاں بہ چہ کار کشت مارا

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ افغانی سے ملاقات ہوئی۔ وہ اب یورپ میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ آجکل اکثر تعلیم یافتہ افغانی بیرونی ملکوں میں چلے گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ افغانستان کا اصل مسئلہ روسیوں کا افغانستان میں آنا نہیں ہے، بلکہ تعلیم یافتہ افغانیوں کا افغانستان سے چلا جانا ہے۔ انھوں نے کہا کہ روسی جارحیت کی بنا پر ایسا ہوا۔ میں نے کہا کہ ایسا کہنا درست نہیں۔ کیوں کہ اسی قسم کا واقعہ پاکستان میں بھی ہوا ہے، جب کہ پاکستان میں کوئی بیرونی جارحیت نہیں ہوئی۔ پاکستان مسلم ہوم لینڈ کے طور پر بنا۔ مگر جب پاکستان بن گیا تو وہاں کے بیشتر اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد بیرونی ملکوں میں چلے گئے۔

میں نے کہا کہ اس ترک وطن کی اصل وجہ سیاسی نہیں بلکہ اقتصادی ہے۔ افغانستان یا پاکستان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ اس لئے باہر کے ملکوں میں چلے گئے کہ ان کے لئے اپنے ملک کے مقابلہ میں غیر ملک میں اقتصادی مواقع زیادہ تھے۔ ہمارے تمام رہنما سو برس سے بھی زیادہ عرصہ سے سیاسی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ تھی کہ وہ اقتصادی ترقی کے لئے جدوجہد کرتے۔ کیوں کہ اقتصادی ترقی کے بغیر سیاسی آزادی بے معنی ہے۔

جنوبی افریقہ کے ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ ایک پادری سے میری بحث ہوئی۔ پادری نے ایسا سوال کیا جس کا میں جواب نہ دے سکا۔ پادری نے مجھ سے پوچھا کہ آپ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ پیغمبر غلطی نہیں کرتا۔ میں نے کہا ہاں۔ پھر اس نے کہا کہ آپ آدم کو پیغمبر مانتے ہیں۔ میں نے کہا ہاں۔ پھر اس نے کہا کہ خود آپ کے قرآن کے بیان کے مطابق، آدم نے جنت میں ممنوعہ پھل کھایا اور غلطی۔ میں کنفیوزن میں پڑ گیا۔ میری سمجھ میں کچھ جواب نہیں آیا۔

میں نے کہا کہ ہمارا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ پیغمبر غلطی نہیں کرتا۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ پیغمبر غلطی پر قائم نہیں رہتا۔ اگر آپ پادری کے سوال پر پہلے ہی اس کی وضاحت کر دیتے تو اس کا اعتراض اپنے

آپ ختم ہوجاتا۔

ڈکتور اسماعیل عبد الحلیم (عمر ۵۰ سال) لندن میں رہتے ہیں۔ لندن کے مسلمانوں کے حالات بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ وہاں مسلمانوں میں سب سے زیادہ برصغیر ہند کے لوگ رہتے ہیں۔ ساؤتھ ہال میں ہندستانی، بریڈفورڈ میں پاکستانی اور ایسٹ اینڈ میں بنگلہ دیشی۔ یہ لوگ یہاں اپنے انھیں رواجوں اور انھیں عادتوں کے ساتھ رہتے ہیں جو وہ اپنے ملک سے لے آئے ہیں۔

میں نے کہا کہ پھر انگریز انھیں ناپسند نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا کہ انگریزوں میں ٹالرنس غیر معمولی حد تک پایا جاتا ہے۔ عرب ان کے اس مزاج کو البرودۃ الانجلیزیہ کہتے ہیں۔ انگریز کبھی آپ سے یہ نہیں کہے گا کہ وہ آپ کو پسند نہیں کرتا۔ یا یہ کہ تم اپنے ملک کو واپس چلے جاؤ، خواہ وہ آپ کے اوپر کتنا ہی زیادہ غصہ کیوں نہ ہو (لا یقول الانجلیزی انہ لا یحبك او علیك ان ترجع الی بلدك مهما كان هو غاضباً علیك)

یہی تحمل قوموں کی ترقی کا راز ہے۔ جو قوم تحمل اور برداشت کی صفت کھودے، وہ موجودہ دنیا میں کبھی اعلیٰ ترقی نہیں کرسکتی۔

طارق الکردی ایک عرب نوجوان ہیں۔ وہ ڈبلن (یورپ) میں رہتے ہیں۔ ان کے ایک واقف کار نے بتایا کہ وہ وہاں اسلامی مرکز کے طرز پر باقاعدہ دعوت کا کام کررہے ہیں۔ انھوں نے دو چھپے ہوئے انگریزی پمفلٹ مجھے دئے۔ یہ میرے دو مضامین کے انگریزی ترجمے تھے۔ ان کو چھاپ کر وہ وہاں تقسیم کررہے ہیں۔ ان کے عنوانات یہ ہیں:

1. What is Islam
2. Islam in the 21st Century

ایک اور صاحب جو بحرین سے تعلق رکھتے تھے، انھوں نے بحرین کا عربی مجلہ الھدایۃ (جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ، دسمبر ۱۹۸۹) دیا۔ یہ مجلہ بحرین کی وزارۃ العدل والشئون الاسلامیۃ کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔ مذکورہ شمارہ میں راقم الحروف کی کتاب "تجدید دین" کے عربی اڈیشن کا مفصل تعارف "تجدید علوم الدین" کے عنوان سے چھپا ہے۔ تبصرہ نگار دکتور بارم السید غنیم ہیں۔ آٹھ صفحہ کے مفصل تعارف کے بعد آخر میں لکھتے ہیں: ختاماً فانناانری الکتاب الحالی من

الاهمية بمكان عظيم ويتوجب على كل مسلم غيور ان يتعرف على ماجاء فيه
(صفحہ ۱۷)

الرسالہ مشن کی جتنی مخالفت کی گئی، اتنی شاید موجودہ زمانہ میں کسی بھی تحریک کی مخالفت نہیں کی گئی۔ اس کے باوجود یہ اللہ کا فضل ہے کہ یہ مشن ہندستان، پاکستان، عرب ممالک اور مغربی ممالک میں پھیل گیا۔ اور اب ان شاء اللہ کسی کی مخالفت اس فکری سیلاب کو روکنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔

ڈاکٹر اسماعیل عبدالحلیم مالیزیا (سلانگور) کے رہنے والے ہیں۔ اس وقت وہ لندن میں ایک کالج سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں جولائی ۱۹۹۰ میں اپنے وطن واپس چلا جاؤں گا۔ ہمارے یہاں حکومت میں امور مذہبی کا ایک شعبہ ہے۔ اس میں مجھے کام کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے مشورہ دیجئے کہ مالیزیا پہنچ کر میں کس طرح مسلمانوں کی اسلامی تعلیم وتربیت کا کام کروں۔

گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ ایک صورت یہ ہے کہ مسلمانوں میں زکوٰۃ کا نظام رائج کیا جائے۔ میں نے کہا کہ آپ زکوٰۃ کے نفاذ سے اپنے کام کا آغاز نہ کریں۔ یہ طریقہ ضیاء الحق صاحب کے زمانہ میں پاکستان میں ناکام ہوچکا ہے۔ موجودہ صورت میں زکوٰۃ ایک مسلمان کو دہرا ٹیکس معلوم ہوتی ہے۔ پھر وہ کیسے اس پر راضی ہوسکتا ہے۔ اس کے جواب میں انھوں نے جو کچھ کہا وہ میرے لئے نئی بات تھی۔ انھوں نے کہا کہ مالیزیا میں زکوٰۃ کی اداشدہ رقم کو ملکی ٹیکس میں محسوب کردیا جاتا ہے۔ اس لئے وہاں دہرا ٹیکس کی صورت نہیں پیدا ہوتی:

المسلم في ماليزيا عليه ان يدفع ضريبة الدخل السنوي وزكاة المال اذا كان غنيا۔ واذا دفع المسلم زكوٰة المال التي عليه فله الحق قانونيا أن يقول للحكومة عليك ان تحسب هٰذا المبلغ الذي دفعته باسم الزكاة، هو في حد ذاته جزء من ضريبة الدخل حقي۔

حسب پروگرام ۷ مئی کی شام کو کانفرنس کا افتتاح ہوا۔ یہ افتتاح صدر مملکت عبدہ ضیوف نے کیا۔ یہ پروگرام یہاں کے سب سے بڑے ہال میں کیا گیا تھا۔ وسیع ہال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ کثیر تعداد میں لوگ ہال کے باہر موجود تھے۔ یہاں اکثر پروگراموں میں میں نے دیکھا کہ عوام ہزاروں کی تعداد میں اکٹھا ہیں۔ عام طور پر اس طرح کی کانفرنسوں میں محدود تعداد میں صرف علماء اور دانشور

شریک ہوتے ہیں۔ مگر یہاں عوامی شمولیت کا منظر نظر آیا۔

میں نے سنا تھا کہ صدر عبدہ ضیوف افریقہ کے سب سے زیادہ لمبے آدمی ہیں۔ میرے ذہن میں ان کی تصویر کچھ اس طرح تھی کہ وہ جب آئیں گے تو تمام شرکا، باعتبار قد چھوٹے نظر آنے لگیں گے۔ ان کا قد کچھ لمبا ضرور ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قد کے بارہ میں جو شہرت ہے وہ "بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لئے" کے اصول کے تحت عمل میں آئی ہے۔

افتتاح رسمی انداز کا تھا۔ تاہم اس کی ایک چیز نے مجھ کو بہت متاثر کیا۔ اس افتتاح میں قرآن کی تلاوت ایک افریقی بچہ نے کی۔ اس کی عمر گیارہ سال تھی اور اس کا نام علی حرازم تھا۔ بظاہر دیکھنے میں اس کا چہرہ اور اس کی شخصیت نہایت غیر جاذب تھی۔ مگر اس نے جب قرآن کی تلاوت کی تو وہ اتنی موثر تھی کہ آنکھوں میں آنسو نکل آئے۔ میں نے سوچا کہ قرآن کی صورت میں مسلمانوں کو کتنی بڑی طاقت حاصل ہے۔ قرآن کے ذریعہ ایک بے حقیقت آدمی اپنے کو باحقیقت بنا سکتا ہے۔

کانفرنس کے ایجنڈے میں دو چیزیں میری خاص دلچسپی کی تھیں:

الدعوة الاسلامية ومتغيرات العصر

المستجدّات والتطورات فى العالم والعالم الاسلامى

اس موضوع پر لوگوں نے جو اظہار خیال کیا، اس سے اندازہ ہوا کہ لوگوں کے ذہنوں پر زیادہ تر سیاسی تبدیلیوں یا سیاسی نوعیت کے واقعات کا اثر ہے۔ مثلاً یہ کہ روس اور امریکہ (سپر پاورس) نے آپس میں مفاہمت کر لی ہے۔ اس کے نتیجہ میں عالمی سیاست میں زبردست قسم کی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ بہت سے ممالک جن کو امریکہ اپنی سرپرستی میں لئے ہوئے تھا، تاکہ ان کو روسی نفوذ سے بچا سکے، اب اس نے ان سے اپنی سرپرستی واپس لے لی ہے۔ کیوں کہ نئی پالیسی نے سرد جنگ یا گرم جنگ کا خاتمہ کر دیا۔ انہی میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ امریکہ جو اس سے پہلے مجاہدین کی زبردست مدد کر رہا تھا۔ اب اس نے اپنی مدد روک دی ہے۔ یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر نجیب حکومت کے خلاف افغانی مجاہدین کی مہم اچانک بے اثر ہو کر رہ گئی ہے۔

شرکا کی طرف سے اس قسم کے بہت سے مسائل کا ذکر کیا گیا۔ میں نے کہا کہ بلاشبہہ نئے حالات نے کچھ نئے سیاسی مسائل مسلمانوں کے لئے پیدا کئے ہیں۔ مگر اس کا اس سے بھی زیادہ بڑا پہلو یہ ہے کہ

ان تبدیلیوں نے جدید تاریخ میں پہلی بار اسلامی دعوت کے نئے مواقع کھول دئے ہیں۔

مثلاً سوویت روس میں اس سے پہلے مذہب پر مکمل پابندی لگی ہوئی تھی۔ وہاں کارل مارکس کا یہ کلمہ دہرایا جارہا تھا کہ "مذہب عوام کی افیون ہے۔" مگر آج روس کے دانشور اعلان کر رہے ہیں کہ خود مارکسزم ایک مزید بدتر قسم کی ذہنی افیون تھی جس کو مارکس نے ایجاد کیا۔ اور وہ اس قابل ہے کہ اس کو دفن کر دیا جائے۔ اس سے پہلے روس کے علاقہ میں قرآن کا کوئی نسخہ لے جانا قانوناً ممنوع تھا۔ آج خود ایروفلاٹ قرآن کے دس لاکھ نسخے جدہ سے ماسکو پہنچا رہی ہے۔ وغیرہ

میں نے کہا کہ ایسی حالت میں ہم کو چاہئے کہ مشکلات و مسائل کو نظرانداز کرتے ہوئے نئے دعوتی مواقع کو استعمال (avail) کریں۔

شیخ محمود احمد کفتارو (دمشق) نے اپنی تقریر میں ایک مسیحی مبلغ کا قول نقل کیا۔ اس نے کہا کہ مسلم دنیا کے بعض علاقوں میں ہماری تبلیغی کوششیں کسی حد تک کامیاب ہوئی ہیں جہاں کہ اسلام کا دائرۂ اثر گھٹنا شروع ہو گیا تھا۔ مگر حیرت ناک بات یہ ہے کہ اسلام اچانک خود ہمارے اپنے گھر کے اندر پھیلنے لگا (نجحنا نسبیاً بالتبشیر فی بعض نواحی العالم الاسلامی حیث بدء الاسلام ینحسر ولکنّنا فوجئنا بالاسلام فی عقر دارنا ینتشر)

اسلام اور دوسرے مذہبوں کا فرق یہ ہے کہ دوسرے مذاہب نے تبدیلی اور تحریف کی بنا پر اپنی اصل حیثیت کھو دی ہے۔ مگر اسلام اپنی فطری صورت پر قائم ہے۔ دوسرے مذاہب کی طرف جب انسان کو لانے کی کوشش کی جاتی ہے تو انسان اپنی فطری طلب اور موجودہ مذہب میں مطابقت نہیں پاتا۔ اس کے برعکس انسان جب اسلام سے متعارف ہوتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اسلام عین اس کی فطرت کے مطابق ہے۔ وہ فوراً اسلام کو اپنا لیتا ہے۔

بعض لوگ اپنے ذاتی مذہب پر چلتے ہیں اور اس کو اسلام کی اصطلاحوں میں بیان کرتے ہیں۔ اس قسم کی مثالیں یہاں بھی سامنے آئیں۔ مثلاً ایک صاحب نے کہا کہ تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ عوام کو متحرک کیا جائے:

Taqwa is to mobilize the people

میں نے اس کی مزید تشریح پوچھی تو اس کے جواب میں انھوں نے جو تقریر کی اس کے الفاظ سب کے سب

میرے لئے معلوم الفاظ تھے، مگر میں کچھ بھی سمجھ نہ سکا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

تفسیر اسلام اور تعبیر دین کا یہ طریقہ مشہور مسلم رہنماؤں کے یہاں بھی مکمل طور پر موجود ہے۔ مثلاً سفر سے پہلے میں نے سید ابو الاعلیٰ مودودی کی کتاب "جہاد فی سبیل اللہ" پڑھی۔ یہ کتاب اردو میں تھی۔ مگر پوری کتاب میرے لئے ناقابل فہم تھی۔ کیوں کہ اس کتاب میں خطابت اور انشا پردازی تو ضرور تھی، مگر دلیل کی نوعیت کی کوئی چیز اس میں میں نے نہیں پائی۔ اس کتاب میں جن آیتوں یا حدیثوں سے مصنف نے اپنا انقلابی نقطۂ نظر نکالا ہے وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ویسا ہی تھا جیسا مذکورہ انگریزی قول میں نظر آتا ہے۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا کارڈ دیا تو معلوم ہوا کہ وہ احمد خلیفہ نیاس ہیں۔ وہ المعہد الاسلامی الزراعی کے پریسیڈنٹ (رئیس) تھے۔ ان کے کارڈ پر "جنرل ڈی گال اسٹریٹ" لکھا ہوا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ دکار میں فرانس کے سابق حکمراں جنرل ڈی گال کے نام سے سڑک موجود ہے۔

جنرل ڈی گال کے نام سے گالزم (Gaullism) کی اصطلاح بنی ہے۔ ڈیگال کے زمانہ میں سینیگال اور دوسرے کئی افریقی ملکوں میں فرانس کی حکومت تھی۔ تاہم آزادی کی تحریکوں نے ان مقبوضات کو فرانس کے لئے ایک بوجھ بنا دیا تھا۔ ڈی گال نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے ان ملکوں کو یک طرفہ طور پر آزاد کر دیا۔ ڈیگال کے اس عمل نے فرانس کو نئی طاقت دے دی۔ تاہم فرانس کو زندہ کرنے کا یہ کام صرف اس قیمت پر ہوا کہ اس کے بعد ڈی گال کی سیاسی موت ہو گئی۔

اکثر حالات میں قوموں کے مسائل کا حل اسی حقیقت پسندانہ تدبیر میں ہوتا ہے۔ مگر قوموں کے رہنما افراد اپنی موت پر راضی نہیں ہوتے، اس لئے وہ قوموں کو زندگی دینے میں بھی کامیاب نہیں ہوتے۔

۶ مئی ۱۹۹۰ کی سہ پہر کو افریقی بچوں کا پروگرام تھا۔ یہ بے حد موثر پروگرام تھا۔ مگر وہ چوں کہ عملی نوعیت کا تھا اس لئے اس کو لفظوں میں پوری طرح بیان نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں ایک تنظیم دائرۃ المسترشدین والمسترشدات کے نام سے قائم ہے۔ سارے ملک میں اس کے مدارس موجود ہیں جن میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام ہے۔ یہ طلبہ اور طالبات ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوئے۔ انھوں نے کئی بڑے اثر انگیز پروگرام کئے۔

اس پروگرام کا انتظام دکار کے بڑے اسٹیڈیم میں کیا گیا تھا۔ اسٹیڈیم کے ایک طرف مہمان حضرات اونچی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ درمیان میں کھلا ہوا میدان تھا۔ میدان کے دوسری طرف ہمارے سامنے دوبارہ اونچی نیچی نشستوں پر ہزاروں کی تعداد میں افریقی لڑکے اور لڑکیوں کی قطاریں تھیں۔ سفید لباس یہاں کا قومی لباس ہے۔ چنانچہ سب کے سب مکمل طور پر سفید کپڑوں میں ملبوس تھے۔ سفید کپڑوں میں لپٹے ہوئے ان کے کالے چہرے اس طرح دکھائی دیتے تھے گویا یہ کوئی دوسری مخلوق ہے جو آسمان سے زمین پر اتر آئی ہے۔

ایک شخص سیٹی لئے ہوئے میدان کے درمیان کھڑا ہوا۔ اس کی سیٹی پر کنارہ کے گیٹ سے لڑکے اور لڑکیاں منظم ٹولیوں کی صورت میں سفید کپڑوں کے ساتھ مارچ کرتے ہوئے سامنے سے گزرنے لگے۔ باری باری ایک ایک ٹولی آرہی تھی اور مخصوص انداز میں مارچ کرتی ہوئی ایک طرف سے دوسری طرف جارہی تھی۔ ایک آدمی ماہرانہ انداز میں سیٹی بجاکر اور ہاتھ سے اشارہ کرکے ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اس طرح تقریباً ۲۰ مدرسوں کے طلبہ وطالبات گزرے۔

یہ منظر بڑا اثر انگیز تھا۔ وہ میرے لئے قیامت کے اس واقعہ کی تمثیل بن گیا جس میں کہا گیا ہے کہ وسیق الذین اتقوا ربھم الی الجنۃ زمرا (الزمر)، ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اہل جنت کے قافلے ایک کے بعد ایک آرہے ہیں۔ اور خدا کا نمائندہ بلندی پر کھڑا ہوا ان کو جنت کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔

سینیگال (اور مغربی افریقہ کے دوسرے ملکوں) میں بعض رواج بڑے عجیب ہیں جو قدیم قبائلی دور سے چلے آرہے ہیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ اگر آپ کسی افریقی عورت کو دیکھیں کہ اس کے سینہ کے اوپر کا حصہ کھلا ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ابھی غیر شادی شدہ ہے اور اگر سینہ کے اوپر کا حصہ ڈھکا ہوا ہے تو وہ شادی شدہ ہوگی (اذا وجدتَ او رأیتَ فتاۃً عاریۃً من فوق صدرھا فھٰذہٖ دلالۃٌ علیٰ اَنَّھا لاتزالُ بکراً والعکس ھوالصحیح)

اس جملہ میں والعکس ھوالصحیح انگریزی اسلوب (and vice versa) کا ترجمہ ہے۔ انگریزی اور فرانسیسی اسالیب اس طرح کثرت سے جدید عربی میں رائج ہوگئے ہیں۔

ایک صاحب سے ملنے کے لئے میں ان کے ہوٹل کے کمرہ میں داخل ہوا۔ ٹیلی ویژن کھلا ہوا تھا

اور وہ اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ آج ساری دنیا میں کروڑوں انسان روزانہ ٹیلی ویژن پر واقعات کی تصویریں دیکھتے ہیں اور اس کو دیکھ کر لطف اٹھاتے ہیں۔ مگر شاید ہی زمین پر کوئی انسان ہو جو ٹیلی ویژن دیکھے تو اس کو ٹیلی ویژن کے پردہ پر خود اپنا فلم دکھائی دینے لگے۔ وہ یہ سوچ کر تڑپ اٹھے کہ قیامت میں اگر خدائی ٹیلی ویژن پر میری زندگی کا ریکارڈ اسی طرح عیاں کر دیا گیا تو میرا انجام کیا ہوگا۔

ایک صاحب سے میں نے یہ بات کہی تو انھوں نے ایسا جواب دیا جس نے میری زبان کو بند کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم ان سب اندیشوں میں نہیں رہتے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہمارا راستہ سیدھا جنت کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اصحاب رسول کو جو ایمان ملا تھا وہ تو ان کو رجاء اور خوف کے درمیان رکھتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے ایسا اسلام دریافت کر رکھا ہے جس میں "خوف" حذف ہو گیا ہے۔ اب ان کے لئے ایمان صرف رجاء ہی رجاء ہے، اس میں خوف اور اندیشہ کا گزر نہیں۔

۸ مئی کی سہ پہر کو کانفرنس کے تمام شرکاء قافلہ کی صورت میں دکار کے باہر اس مقام پر لے جائے گئے جہاں المؤتمر الاسلامی کا مرکز زیر تعمیر ہے۔ یہ عظیم مرکز سعودی عرب، کویت، لیبیا، عرب امارات، اور دوسرے عرب ممالک کے مشترک مالی تعاون سے تعمیر کیا جا رہا ہے۔

دیو ہیکر مشینیں، اونچی دیواریں، بلند و بالا ستونوں کے درمیان آدمی اپنے قد کو چھوٹا محسوس کر رہا تھا۔ لوگ متحیر نگاہوں سے اس عمارتی پہاڑ کو دیکھ رہے تھے جو ان کی آنکھوں کے سامنے وسیع میدان میں ابھرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ مادی حقیقتوں کی اس ظاہری عظمت کے سامنے کون ہوگا جو معنوی حقیقتوں کی مخفی عظمت کو محسوس کرے اور اس کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس کے آگے جھکا دے۔ یہ بھی شاید خدا کے قانون التباس (انعام ۹) کا ایک پہلو ہے کہ اگرچہ اللہ کے نزدیک ساری عظمت اور ساری اہمیت صرف معنوی حقیقتوں کو حاصل ہے، مادی حقیقتیں اللہ کے نزدیک جناح بعوضہ (مچھر کے پر) کے برابر بھی وزن نہیں رکھتیں۔ مگر امتحان کی اس دنیا میں معاملہ کو عملاً بالکل الٹ دیا گیا ہے۔

کیسا عجیب ہے یہ امتحان، اور کیسے عجیب ہوں گے وہ لوگ جو اس امتحان میں پورے اتریں۔ یہی لوگ خدا کے قریب جگہ پائیں گے۔

۹ مئی ۱۹۹۰ کی شام کو "قصرالرئیس" میں جمہوریہ سینیگال کے صدر عبدہ ضیوف کے ساتھ اجتماعی ملاقات ہوئی۔ اس عمارت کی تصویر اس سے پہلے میں نے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں دیکھی تھی۔ اس لئے جب میں وہاں پہنچا تو مجھے اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ باہر سے وہ مجھے دیکھی ہوئی عمارت کی طرح نظر آئی۔ فرانسیسیوں کی بنائی ہوئی یہ عمارت انتہائی سادگی کے باوجود انتہائی پرشوکت ہے۔

جب میں اس "قصر" میں داخل ہوا اور اس کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا اس مخصوص ہال میں پہنچا جہاں صدر کے ساتھ ملاقات مقرر تھی تو میرا پہلا تاثر یہ تھا: اقتدار کی شان وشوکت اتنی زیادہ ہے کہ مشکل ہی سے کوئی شخص ایسا ہو سکتا ہے جو اس کو دیکھے، اس کے باوجود اس کا طالب نہ بنے۔

صدر سے ملاقات کے بعد کلچرل منسٹر کی رہائش گاہ پر ملاقات کا پروگرام تھا۔ وہاں پہنچے تو گانے کی ریکارڈنگ ہورہی تھی۔ صدر کی رہائش گاہ میں مکمل سکون تھا۔ مگر کلچرل منسٹر کی رہائش گاہ میں شاید عہدہ کی رعایت سے صوتی آرٹ کا مظاہرہ کیا جارہا تھا۔ یہاں ہم نے مغرب کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی۔

یہاں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں پاکستان اور ایران کے سفیر بھی تھے۔ میرا ارادہ ہندستان کے سفیر سے ملاقات کرنے کا تھا۔ مگر معلوم ہوا کہ ہندستان کا سفارت خانہ اس وقت بغیر سفیر ہے۔ سکنڈ سکریٹری ضروری فرائض انجام دے رہے ہیں۔

شام کا کھانا ایک لبنانی تاجر کے یہاں تھا۔ وہ لبنانی عرب ہیں اور ان کا نام فواد شقیری ہے۔ وہ یہاں امپورٹ اکسپورٹ کا بزنس کرتے ہیں۔ ان کا عالی شان مکان بتا رہا تھا کہ وہ اپنی تجارت میں نہایت کامیاب ہیں۔ آج کے کھانے پر پریسیڈنٹ مسٹر عبدہ ضیوف بھی مدعو تھے۔ مگر کسی وقتی سبب سے نہ آسکے۔ ان کی طرف سے ان کے ایک نمائندہ نے شرکت کی۔

۹ مئی کو تواون (Tivoouane) کا پروگرام تھا۔ یہاں سینیگال کے بہت بڑے شیخ عبدالعزیزی (الخلیفۃ العام للطائفۃ التیجانیۃ) رہتے ہیں۔ وہ نہ صرف بہت ضعیف ہو چکے ہیں، بلکہ دونوں آنکھوں سے معذور بھی ہیں۔ ان کا معاملہ یہاں تقریباً وہی ہے جو سعودی عرب میں شیخ باز کا ہے۔

صبح کو ۹ بجے دکار سے تواون کے لئے قافلہ کی صورت میں روانگی ہوئی۔ سڑک نہایت عمدہ اور کشادہ تھی۔ اس کا بیشتر حصہ سمندر (البحر المحیط) کے کنارے کنارے گزرتا ہے۔ درمیان میں بعض گاؤں دکھائی دئے۔ مکانات معمولی انداز میں بنائے گئے تھے۔ پختہ تعمیرات زیادہ تر قدیم فرانسیسی طرز کی نظر آئیں۔

درمیان میں ایک تعلیمی ادارہ (دارالعلوم) دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کے بورڈ پر اس کا نام معہد الازہر للدراسات الاسلامیۃ (Tel. 511554) لکھا ہوا تھا۔ ہم لوگ اس کے اندر گئے۔ اس کے کئی درجات دیکھے۔ کلاس کی صورت اسکولوں کی مانند تھی۔ ایک طرف دیوار کالی کرکے اس کو بلیک بورڈ کی صورت دی گئی تھی۔ یہاں استاد کھڑا ہوا تھا۔ سامنے ڈسک پر طلبہ بیٹھے ہوئے تھے۔ استاد عربی زبان میں لکچر کے انداز میں انھیں پڑھا رہا تھا۔

یہ طریقہ مجھے پسند آیا۔ ہندستان میں کثرت سے عربی مدارس قائم ہیں۔ مگر ان میں ذریعہ تعلیم اردو رکھا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آدمی عربی مدرسہ سے فارغ ہوجاتا ہے مگر عربی بولنے کی صلاحیت اس کے اندر پیدا نہیں ہوتی۔

اس کے بعد ہم تواون پہنچے۔ یہاں خلیفہ الحاج عبدالعزیز سی سے ملاقات ہوئی۔ یہ اندازہ ہوا کہ انھیں عوام میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے۔ آج ان کی اپیل پر بے شمار لوگ کانفرنس کے شرکاء کے استقبال کے لئے نکل پڑے تھے۔ اس سے پہلے دکار کے اجتماع میں میں نے دیکھا کہ وہاں خلیفہ کے نمائندہ نے تقریر کی اور پریسیڈنٹ نے تقریر کی۔ مگر خلیفہ کے نمائندہ نے جب خلیفہ کا ذکر کیا تو ان کے لئے پریسیڈنٹ سے بھی زیادہ تالیاں بجائی گئیں۔

یہاں کے سیاسی لیڈر اس راز کو سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ مذہبی رہنماؤں کو بالکل نہیں چھیڑتے۔ وہ ان کا احترام کرتے ہیں۔ شاہ ایران نے اسی معاملہ میں غلطی کی اور اس کی قیمت اسے یہ دینی پڑی کہ اس کا اقتدار ایران سے ختم ہوگیا۔ شاہ ایران کو جس چیز نے ختم کیا وہ خود شاہ کے غیر حکیمانہ اقدامات تھے، اور سینیگال کے سیاسی لیڈر اس غلطی سے اپنے آپ کو مکمل طور پر بچائے ہوئے ہیں۔

تواون کا اجتماع الحاج عبدالعزیز سی کی موجودگی میں ہوا۔ یہاں پریسیڈنٹ کا ایک نمائندہ بھی موجود تھا۔ اس نے ایک سے زیادہ بار یہ جملہ دہرایا: ذالك ببركة دعوات اسلافنا الكرام۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی یہ مشترک صفت ہے کہ وہ اپنے ملکوں کے شاکی رہتے ہیں۔ مگر یہی لوگ باہر کے ملکوں میں جاکر نہایت کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ مثلاً پاکستان اور ہندستان کے لوگ اپنے اپنے ملکوں میں یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ یہاں ظلم اور فساد ہے۔ مگر یہی لوگ مغرب میں یا خلیج کے ملکوں میں پہنچتے ہی ایک کامیاب زندگی حاصل کرلیتے ہیں۔ اسی طرح مصر اور شام کے اسلام پسند اپنے ملکوں میں اپنی حکومت سے ٹکراؤ کے سوا کوئی اور کام نہیں جانتے۔ مگر یہی لوگ سعودی عرب اور کویت میں آسودہ زندگی گزار رہے ہیں۔

اس کا راز ایک لفظ میں ایڈجسٹمنٹ ہے۔ یہ لوگ اپنے ملکوں میں ایڈجسٹمنٹ نہیں کرتے، اس لئے وہ اپنے ملک میں ناکام رہتے ہیں۔ اور دوسرے ملک میں، مجبورانہ طور پر نہ کہ شعوری طور پر، ایڈجسٹمنٹ کرلیتے ہیں۔ اس لئے وہ وہاں کامیاب رہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ملکوں میں "مجاہد" ہیں اور دوسرے ملکوں میں "بزدل"۔ اگر وہ اپنے ملکوں میں اسی طرح "بزدل" بن جائیں جس طرح وہ باہر کے ملکوں میں بنے ہوئے ہیں تو وہ خود اپنے ملک میں بھی وہ ساری کامیابیاں حاصل کرسکتے ہیں جو وہ باہر کے ملک میں حاصل کررہے ہیں۔

اس صورت حال کا اصل نقصان عوام کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ یہ باہر جانے والے ذہین لوگ اپنی زبان سے یہ اعلان نہیں کرتے کہ تجربہ کے بعد ہم نے اپنی پالیسی بدل لی ہے، اسی طرح تم بھی بدل لو۔ چنانچہ عملاً یہ ہورہا ہے کہ ان تمام نام نہاد مجاہدین کے لکھے یا بولے ہوئے الفاظ کی بنا پر ان کے ملکوں کے لوگ برابر مصیبتیں اٹھا رہے ہیں۔ اور وہ خود باہر کے ملک میں اپنے الفاظ کو عملاً ترک کرکے اپنا اور اپنے اہل وعیال کا مستقبل تعمیر کررہے ہیں۔

یہ سب سے بڑی برائی ہے جو موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان جاری ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اس برائی کو جاری کرنے والے وہ لوگ ہیں جن کو بے خبر عوام نے برائی مٹانے کا کریڈٹ دے رکھا ہے۔ ایک صاحب کے سوال پر میں نے یہ بات کہی۔

ایک صاحب نے گفتگو کے دوران کہا کہ اسلامی دنیا کو ہمارے دشمنوں نے پارہ پارہ کردیا ہے (ان العالم الاسلامی مزّقہ اعداؤنا)

۰ امئی کی شام کو موتمر ختم ہوگئی۔ اس کے بعد پریس کانفرنس ہوئی۔ اس میں سینیگال کے

اخباری نمائندے جمع ہوئے اور سوال وجواب کے انداز میں گفتگو ہوئی۔

مگر پریس کے نمائندوں نے جو سوالات کئے، وہ زیادہ تر سطحی نوعیت کے تھے۔ ایک صحافی نے یہ سوال کیا کہ کانفرنس نے سلمان رشدی کے بارہ میں کوئی تجویز پاس نہیں کی۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس سوال وجواب کو سن کر مجھے احساس ہوا کہ اس وقت پوری ملت اسلام قول بلا فعل کی سطح پر ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ہر مسلمان اس بات کو ثابت کرنے پر اپنے آخری الفاظ خرچ کردینا چاہتا ہے کہ سلمان رشدی واجب القتل ہے۔ حتی کہ وہ اس قابل ہے کہ کوئی بھی شخص اس پر قابو حاصل کرکے اس کو قتل کردے۔

مگر کیسی عجیب بات ہے کہ ہر شخص قتل کی بات کرتا ہے مگر کوئی شخص قتل کرنے کے لئے نہیں اٹھتا۔ حتی کہ ایران کی حکومت نے ایک سال پہلے اعلان کیا تھا کہ سلمان رشدی کے قتل کے لئے ایک اسکویڈ روانہ کردیا گیا ہے۔ مگر آج تک معلوم نہ ہوسکا کہ وہ اسکویڈ کہاں گیا۔ ہندستان پاکستان یا کسی بھی ملک کے کسی مسلم دانشور یا عالم نے ایسا نہیں کیا کہ وہ خود انگلینڈ جائے یا اپنے صاحبزادہ کو وہاں بھیجے اور پھر وہ یا تو سلمان رشدی کو مارنے میں کامیاب ہو یا اسی راہ میں اپنی جان دیدے۔

حقیقت یہ ہے کہ سلمان رشدی کے واقعہ نے سلمان رشدی سے زیادہ خود موجودہ زمانہ کے لکھنے اور بولنے والے مسلمانوں کو بے نقاب کردیا ہے۔ سلمان رشدی کی کتاب نے اگر سلمان رشدی کو شتم رسول کا مجرم ثابت کیا ہے تو مسلم لکھنے اور بولنے والوں کو قول بلا فعل کا مجرم ثابت کیا ہے۔ اور دوسرا جرم یقیناً پہلے جرم سے کسی طرح کم نہیں۔

اس سفر کے دوران مجھے ایک عرب ملک کی مطبوعہ رپورٹ (۱۹۸۹) دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں نام بنام دکھایا گیا تھا کہ کس ملک کو کس مد میں کتنی رقم دی گئی۔ ہندستان کے عنوان کے تحت اس رپورٹ میں حسب ذیل الفاظ درج تھے:

الهند: لجنة تعمير المساجد، لاصلاح المساجد المتضررة من الزلازل $20,000 اس اندراج کے مطابق، ہندستان میں تعمیر مساجد کے لئے ایک ادارہ قائم ہے۔ اس نے ۲۰ ہزار ڈالر ان مساجد کی مرمت کے لئے حاصل کیا ہے جن کو زلزلوں سے نقصان

ہنچا ہے۔

یہ پڑھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ "لجنۃ تعمیر المساجد" کے نام سے کوئی معروف ادارہ ہندستان میں موجود نہیں۔ اور اگر بالفرض "اسٹیمپ اور لیٹر پیڈ" کی سطح پر ایسا کوئی ادارہ کہیں موجود ہو تب بھی غالباً ۱۹۸۹ میں یا اس سے پہلے کے قریبی سال میں ہندستان میں کوئی ایسا زلزلہ نہیں آیا جس میں مسجدوں کو نقصان پہنچا ہو اور اس کی ضرورت پیش آئی ہو کہ باہر سے رقم لاکر ان کی مرمت کرائی جائے۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستان کے کچھ لوگ کتنے برے انداز میں عرب ملکوں کے جذبۂ انفاق کا استحصال کر رہے ہیں۔

عبد المغنی شمس الدین (عمر ۴۶ سال) کوالالمپور (ملیشیا) سے آئے تھے۔ وہ اخوانی تحریک سے متاثر ہیں۔ جامعہ ازہر کے پڑھے ہوئے ہیں، اس لئے عربی روانی کے ساتھ بولتے ہیں۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ الاخوان المسلمون اور جماعت اسلامی کی مشترک غلطی یہ ہے کہ وہ اختتام سے آغاز کرنا چاہتے ہیں، وہ آغاز سے اپنے عمل کی ابتدا کرنا نہیں چاہتے، یہی وجہ ہے کہ وہ لفظی شور و غل اور بے فائدہ ٹکراؤ کے سوا امت کو کوئی اور چیز نہیں دے سکے۔ وہ ہر جگہ "نظام" کو توڑنے کی باتیں کر رہے ہیں۔ حالانکہ سب سے پہلا کام یہ ہے کہ لوگوں کے مزاج اور طرز فکر کو بدلا جائے۔

انھوں نے کہا کہ مگر فکر بدلنے کے تمام بڑے بڑے ذرائع (اسکول، ریڈیو، ٹیلیویژن، اخبارات وغیرہ) سب حکومت کے قبضہ میں ہوتے ہیں۔ پھر حکومت کو بدلے بغیر طرز فکر کو بدلنے کا کام کیسے کیا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ ایک زبردست مغالطہ ہے جس میں موجودہ مسلم مفکرین پچھلی نصف صدی سے مبتلا ہیں۔ حالانکہ واقعات نے اس کا بے معنی ہونا آخری طور پر ثابت کر دیا ہے۔

میں نے کہا کہ جنرل محمد ضیاء الحق کو پاکستان میں مکمل اقتدار ملا۔ اور سید ابو الاعلیٰ مودودی سمیت تمام اسلام پسند لوگوں نے ان کی تائید کی۔ ضیاء الحق صاحب ساڑھے گیارہ سال تک، آپ کے الفاظ میں، فکر بنانے والے تمام اداروں پر مکمل قبضہ کر کے اس کو افکار بدلنے کے لئے استعمال کرتے رہے۔ حتیٰ کہ انھوں نے جماعت اسلامی کے افراد کو ان شعبوں کا چارج دیدیا۔

مگر ساڑھے گیارہ سال کی کوشش کے باوجود ادنیٰ درجہ میں بھی لوگوں کی فکر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی. آج پاکستان کا ذہن پہلے سے بھی زیادہ بگڑا ہوا ہے۔ مزید یہ کہ ضیاء الحق صاحب کی موت کے فوراً بعد جو عوامی الکشن ہوا، اس میں پاکستان کے عوام نے ضیاء الحق کے دور کے تمام افراد کے خلاف ووٹ دے کر انھیں ہرا دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دور اول کے مسلمانوں نے متفقہ طور پر حضرت ابو بکر صدیق کو خلیفہ بنایا۔ اس کا نام ذہن کی تبدیلی ہے۔ اس کے برعکس اگر ایسا ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مدینہ کے لوگ عبد اللہ بن ابی جیسے کسی شخص کو اپنا حکمراں بنا لیتے تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی تحریک وہاں کے لوگوں کے ذہن کو بدلنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے یہی صورت ضیاء الحق صاحب کے بعد ہونے والے انتخابات میں پیش آئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تعمیر فکر کا کام ایک خالص غیر سیاسی کام ہے۔ وہ حکومت واقتدار کے باہر انجام دیا جاتا ہے نہ کہ حکومت واقتدار کے اندر۔

۱۰ مئی کی صبح کو ہمارا قافلہ طوبیٰ (Touba) کے لئے روانہ ہوا۔ وہاں سینیگال کے سب سے بڑے صوفی رہتے ہیں۔ ان کا نام شیخ عبد القادر مباقی (M'Backe) ہے۔ وہ طائفہ مریدیہ کے پیر ہیں۔ اس حلقہ کو احمد بامبانے قائم کیا تھا۔ ان کی رہائش گاہ کے دروازہ پر مسکن الشیخ الخدیم لکھا ہوا تھا۔

بزرگ اپنے لباس اور حلیہ کے اعتبار سے اسی روایتی انداز میں تھے جو ہندستان کے بزرگوں کا انداز ہے۔ مگر ان کا وسیع مرکز پورے معنوں میں "ماڈرن" تھا۔ میز، قالین، صوفہ سیٹ ٹیلیفون، غرض ہر چیز موجود تھی۔ مجھے حمام (ٹائیلٹ) میں جانے کا اتفاق ہوا۔ حمام خالص مغربی طرز کا بنا ہوا تھا۔ جتنی دیر ہم لوگ شیخ کے پاس رہے، ٹیلی وزن کا عملہ مسلسل ہر چیز کو ریکارڈ کرتا رہا۔

وسیع کمرۂ ملاقات ٹیک لکڑی کا منقش انداز میں بنایا گیا تھا۔ ایک بڑی کرسی بزرگ کے لئے تھی جن کو یہاں الشیخ الاکبر کہا جاتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ آئے۔ ایک بات نے خاص طور پر مجھے سوچنے کا موقع دیا۔ وہ یہ کہ شیخ اپنی شخصیت (پرسنالٹی) کے اعتبار سے نہایت غیر جاذب تھے

میں نے سوچا کہ اس کا راز کیا ہے کہ سینیگال کے لاکھوں لوگ ان پر فدا ہیں اور صدر ریاست ان کو خصوصی سلام بھجواتے ہیں۔ اس کا راز کئی سو سال کی تاریخ ہے۔

پہلے شیخ جو اپنے کو خادم رسول اللہ کہتے تھے، وہ اس مقام (طوبیٰ) میں آئے۔ انھوں نے خدمت اور تقدس کی تاریخ بنائی۔ اس کے بعد مختلف بزرگ اس تاریخ میں اضافہ کرتے رہے۔ اس طرح تقدس کی ایک لمبی تاریخ ہے جس کے اوپر موجودہ بزرگ بیٹھے ہوئے ہیں۔

ہندستان کے موجودہ تمام "شیوخ" کا حال بھی یہی ہے۔ ہر ایک کسی قدیم ادارہ یا قدیم تحریک کی بنائی ہوئی تاریخی روایات کی زمین پر بیٹھا ہوا ہے۔ ایک ہے خود ایک تاریخ بنانا، اور دوسری چیز ہے سابقہ تاریخ کو استعمال کرنا۔ بعد کو آنے والا زمین کے اوپر جگہ پاتا ہے، مگر تاریخ بنانے والے کے حصہ میں جو چیز آتی ہے، وہ یہ کہ وہ زمین کے نیچے دفن ہو کر رہ جائے۔

طوبیٰ میں ایک افریقی احمد بکی میرے قریب آئے۔ انھوں نے پوچھا آپ کہاں سے آئے ہیں۔ میں نے بتایا کہ ہند سے۔ وہ عربی میں کلام کر رہے تھے۔ انھوں نے الاسلام یتحدی کی تعریف کی۔ پھر پوچھا کہ کیا آپ اس کتاب کے مصنف کو جانتے ہیں۔ کیا وہ زندہ ہیں (هل تعرف مولف هٰذا الكتاب، اهوحي)، میں خاموش رہا۔ انھوں نے کہا آپ عربی نہیں سمجھتے ہیں۔ آخر میں میں نے کہا کہ میں ہی اس کا مصنف ہوں۔ وہ بہت خوش ہوئے اور دعائیں دیتے رہے۔

اس قسم کے واقعات میرے ساتھ ہر سفر میں پیش آتے ہیں۔ یہاں "مکتبۃ الشیخ" میں جانا ہوا۔ اس کے لائبریرین ہم لوگوں کو لائبریری کا ایک حصہ دکھا رہے تھے۔ وہ ایک الماری کے سامنے کھڑے ہو گئے اور کہا کہ ہمارے پاس ہر موضوع کی کتابیں ہیں۔ یہ کہہ کر انھوں نے چند کتابیں نکال کر دکھائیں۔ پھر انھوں نے ایک کتاب نکالی اور دکھاتے ہوئے کہا: هٰذا الاسلام يتحدىٰ للمفكر الاسلامي الكبير وحيد الدين خان۔ لائبریرین کے اس جملہ کو سن کر میرے ساتھی ہنس پڑے۔ انھوں نے کہا کہ وہ مصنف یہ آپ کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں۔

اس لائبریری کے ایک حصہ میں شیخ کی تالیفات مجلد کر کے رکھی ہوئی ہیں۔ کچھ مطبوعہ اور بیشتر قلمی۔ یہ تالیفات عقائد اور تصوف وغیرہ موضوعات پر ہیں۔ ایک کتاب میں نے دیکھی۔ اس میں تصوف اور صوفی پر بحث تھی۔ صوفی کی تعریف یہ کی گئی تھی کہ صوفی وہ ہے جو انسانوں سے منقطع ہو کر اللہ سے متصل ہو جائے۔

(عربی الفاظ یاد نہیں)

۱۰ مئی کی شام کو کھانے کی میز پر دو افریقی نوجوان تھے۔ ایک کا نام شیخ احمد تیجانی کوتا تھا۔ دوسرے کا نام میں نہ پوچھ سکا۔ دوسرے ساتھی سے میں نے پوچھا کہ آپ تیجانیہ سے تعلق رکھتے ہیں یا مریدیہ سے۔ انھوں نے مسکرا کر کہا کہ دونوں میں سے کسی سے بھی نہیں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ اس وقت سینیگال کے گھروں کا یہ حال ہے کہ ماں اور باپ تو ان دو میں سے کسی ایک طائفہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر سینیگال کی نئی نسل ان باتوں میں یقین نہیں رکھتی۔ نوجوان نسل دونوں سے کٹتی جا رہی ہے۔

میں طوبیٰ کی مسجد کو دیکھ رہا تھا کہ ایک صاحب مجمع سے نکل کر میری طرف آئے۔ وہ میرا نام وغیرہ پوچھنے لگے۔ میں نے کہا کیا آپ نے میری عربی کتابیں پڑھی ہیں۔ انھوں نے کہا نہیں۔ میں نے کہا کہ پھر آپ کو میرے بارہ میں پوچھنے کا خیال کیوں آیا۔ انھوں نے کہا کہ یہاں جب میں نے مجمع کو دیکھا تو میں نے آپ کے چہرہ کو منتخب کر لیا۔ کیوں کہ آپ کے چہرہ میں مجھے اسلامی عظمت دکھائی دی (لما رأیت الوجوہ فقد اخترت وجهكم لما توحي من العظمة الاسلامية)

۱۱ مئی کی صبح کو جزیرہ گورے (Goree) دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ چھوٹا سا جزیرہ دکار سے پانچ کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ جدید طرز کی مشینی کشتی جب ہم لوگوں کو لے کر سمندر کی موجوں کے اوپر تیزی سے چلنے لگی تو بے اختیار میری زبان پر یہ آیت آ گئی: ولقد كرمنا بني آدم وحملناهم في البر والبحر (۱۷ / ۷۰)

جانور اپنے پیروں کے ذریعہ زمین پر چلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو گھوڑے کی پیٹھ پر سوار کر کے خشکی کا سفر کرایا۔ مچھلیاں اپنی جسمانی محنت سے سمندر میں تیرتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے انسان کو کشتیوں پر بٹھا کر سمندر کی سطح پر رواں دواں کیا۔ چڑیاں اپنے بازوؤں کے ذریعہ فضا میں اڑتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے ہوائی جہاز پر بیٹھ کر فضا میں اڑنے کا انتظام کیا۔ یہ کیسا عجیب "کرمنا" کا معاملہ ہے جو انسان کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مگر انسانوں میں سب سے کم وہ لوگ ہیں جو ان چیزوں کے لئے حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوں۔ شکر یہ ہے کہ آلاء اللہ کو سوچ کر آدمی کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں اور پھر زبان سے نکلے کہ خدایا تیرا شکر ہے۔ محض ش ک ر کو دہرانے کا نام شکر نہیں۔

جزیرہ میں کار وغیرہ نہیں ہوتی۔ یہاں لوگ پیدل چلتے ہیں۔ اس لئے یہاں فضائی کثافت کا وجود نہیں ہے۔ پورا جزیرہ نہایت پرسکون اور خوشگوار ہے۔ اس جزیرہ کے تمام مکانات قدیم یورپی طرز کے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں لوگوں نے سب سے پہلے اس جزیرہ کو آباد کیا تھا۔

سب سے پہلے ۱۴۴۴ء میں ہالینڈ کے لوگ اس جزیرہ میں آئے۔ پھر پرتگالی اور فرانسیسی آئے۔ سب سے آخر میں انگریز آئے۔ انگریزوں نے جزیرہ گورے پر قبضہ کرلیا۔ فرانس کا قبضہ گامبیا پر تھا۔ دونوں میں تبادلہ ہوا۔ گامبیا کو فرانس نے انگریزوں کے لئے چھوڑ دیا۔ اور اس کے بدلے میں انگریزوں نے جزیرہ گورے کو فرانس کے حوالہ کر دیا۔ آجکل اس جزیرہ میں کل دو ہزار آدمی رہتے ہیں۔

جزیرہ گورے میں جو چیزیں دیکھیں، ان میں ایک وہ مکان (سلیو ہاؤس) تھا جو غلاموں کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس میں نیچے کے حصہ میں نہایت تنگ قسم کی کوٹھریاں تھیں جن میں غلام پکڑ کر بند رکھے جاتے تھے اور سمندر کے راستہ سے روانہ کئے جاتے تھے۔ اور مکان کے اوپر کے حصہ میں کشادہ اور آرام دہ کمرے تھے۔ یہاں یورپ کے سفید لوگ ٹھہرتے تھے جو غلاموں کی خرید وفروخت کے کاروبار کے لئے یہاں آتے تھے۔

غلاموں کی کوٹھری کو میں نے ناپ کر دیکھا تو کوئی تین قدم چوڑی اور چار قدم لمبی تھی اور کوئی چار قدم چوڑی اور آٹھ قدم لمبی۔ ان چھوٹی کوٹھریوں میں ایک سو اور دو سو آدمی جانوروں سے بدتر انداز میں بھر دئے جاتے تھے۔ انھیں دن میں صرف ایک بار قضائے حاجت کے لئے نکالا جاتا تھا۔ یہاں اس زمانہ کے بہت سے سامان اب بھی موجود ہیں۔ مثلاً لوہے کی وہ ہتھکڑی جس میں انھیں باندھ دیا جاتا تھا۔ اس قسم کی بہت سی وحشیانہ چیزیں تھیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

غلاموں کا یہ گھر پندرھویں صدی میں بنایا گیا تھا۔ اس زمانہ میں امریکہ کی دریافت نے غلاموں کی تجارت (Slave trade) بہت بڑھا دی۔ امریکہ میں زرخیز زمین بہت تھی۔ مگر وہاں کام کے لئے آدمی نہیں تھے۔ چنانچہ یورپی قوموں نے افریقہ سے غلاموں کو پکڑ کر وہاں بھیجنا شروع کیا تاکہ وہ زرعی مزدور کے طور پر استعمال کئے جاسکیں۔ یہ لوگ کالے انسانوں کو ایک قسم کا حیوان سمجھتے تھے۔ اس لئے وہ افریقہ آکر اس طرح ان کو پکڑتے تھے جیسے جنگلوں میں جانور پکڑے جاتے ہیں۔ اور پھر نہایت وحشیانہ اور بے دردانہ انداز میں ان کو سمندری جہازوں میں بھر کر امریکہ لے جاکر انھیں

بیچتے تھے۔ اس غیر انسانی تجارت میں ڈچ، پرتگالی، فرانسیسی، انگریز سب شریک تھے۔

جزیرہ گورے میں قدیم طرز کی مگر صاف ستھری خوب صورت مسجد ہے۔ اس میں کوئی گنبد نہیں ہے۔ مسجد کے ایک طرف پہاڑی ہے اور دوسری طرف سمندر۔ یہاں دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھی۔ اور پھر امام سے ملاقات کی۔ امام صاحب نے بتایا کہ یہ مسجد افریقہ کی چند قدیم مسجدوں میں سے ایک ہے۔

نئی دہلی میں سینیگال کے سفارت خانہ کی طرف سے کچھ تعارفی لٹریچر دیا گیا تھا۔ ایک پمفلٹ میں جزیرہ گورے کے بارے میں بتاتے ہوئے لکھا تھا کہ یہاں غلام گھر ہے جس کا دروازہ سمندر کی طرف کھلتا ہے۔ یہ انسان کے اوپر انسان کے ظلم کی ایک دہشت ناک یاددہانی ہے:

The slaves house with its door opened on the ocean is a terrible reminder of the cruelty of men towards men.

ان الفاظ کو پڑھ کر صرف یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جزیرہ گورے میں کوئی عمارت ہے جس کو "غلام گھر" کہا جاتا ہے۔ مگر جب میں نے وہاں جا کر غلام گھر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور زنجیریں اور دوسری چیزیں دیکھیں تو اندازہ ہوا کہ واقعی سیاہ فام لوگوں کے ساتھ کتنا زیادہ ظلم کیا جاتا رہا ہے۔ تاہم یہ مشاہدہ بھی آخری نہیں۔ اس سے زیادہ دہشت ناک مشاہدہ وہ ہوگا جب کہ آدمی اس وقت وہاں موجود ہو جب کہ یہ انسانیت سوز واقعہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے سیاہ فام لوگوں کے ساتھ عملاً حیوانی سلوک ہوتے ہوئے دیکھے۔ موجودہ زمانہ میں اہل مغرب نے "نیگرو" اور دوسرے ناموں سے کچھ فلمیں بنائی ہیں۔ ان میں ایکٹنگ کے ذریعہ وہ تمام قدیم مناظر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

مگر یہ دیکھنا بھی آخری دیکھنا نہیں۔ اس سے بڑا اور آخری مشاہدہ وہ ہے جب کہ کوئی شخص دونوں کی اندرونی حالت کو دیکھ سکے۔ ایک طرف وہ سفید فام لوگوں کے اندرون کو دیکھے کہ کس شقاوت کے ساتھ وہ اس فعل کو انجام دے رہے ہیں۔ دوسری طرف وہ سیاہ فام مظلوموں کے دلوں کی حالت جان سکے کہ کس طرح ذلت اور ظلم کی اس ناقابل برداشت صورت کو وہ برداشت کر رہے ہیں۔

یہ آخری حقیقت صرف خدا دیکھ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ انسانوں کا عادلانہ حساب کرسکے۔

۱۱ مئی کو جمعہ کا دن تھا۔ نماز کے لئے ہم لوگ دکار کی جامع مسجد میں لے جائے گئے۔ یہ مسجد جامع قرویین کے طرز پر بنی ہوئی تھی، اس کا ہر جز دہلی کی مساجد سے مختلف تھا۔ اندر داخل ہوا تو وسیع مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ گیٹ پر عمومی اعلان ہو رہا تھا کہ جوتا اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ میں بھی جوتا اپنے ہاتھ میں لے کر اندر داخل ہوا۔

میزبانوں کی رہنمائی میں ہم لوگ آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک پہلی صف میں پہنچ گئے۔ اتنے میں ایک افریقی بزرگ نے جوتا میرے ہاتھ سے لے لیا۔ میں اس قسم کے تکلف سے گھبراتا ہوں۔ کیوں کہ نماز کے بعد اگر وہ صاحب مجھے نہ ملیں تو دوسرے کے رکھے ہوئے سامان کو تلاش کرنا میرے لئے سخت مشکل ہو جائے گا۔ مگر جب میں نماز سے فارغ ہو کر اٹھا تو مذکورہ افریقی میرا جوتا لئے ہوئے میرے پیچھے موجود تھے۔

میں اگلی صف میں امام کے قریب تھا۔ سنت پڑھ کر میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک گڑگڑاہٹ کی آواز ہوئی۔ میں نے سمجھا کہ مسجد کی چھت کے اوپر سے شاید کوئی ہیلی کاپٹر گزر رہا ہے۔ مگر دیکھا تو "دیوار" کے اندر سے ایک بہت بڑا لکڑی کا ڈھانچہ برآمد ہو رہا تھا۔ یہ منبر تھا۔ جو بھاری بھاری موٹی لکڑیوں سے منقش انداز میں بنایا گیا تھا۔ وہ ریل کے ڈبہ کی طرح لکڑی کے پہیہ پر ہوتا ہے۔ اس کو دیوار کے پیچھے ایک مخصوص کمرہ میں ڈال دیا جاتا ہے اور خطبہ کے وقت کھینچ کر نکالا جاتا ہے۔ یہ وہی طریقہ ہے جس کو اس سے پہلے میں نے جامع قرویین میں دیکھا تھا۔

امام صاحب منبر پر بیٹھے تو حسب معمول مسجد کے اندر موذن نے کھڑے ہو کر دوسری اذان دی۔ اذان ختم ہوئی۔ میں آغاز خطبہ کا منتظر تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ امام صاحب بدستور بیٹھے ہوئے ہیں۔ اتنے میں مسجد کے ایک گوشہ سے " اللہ اکبر اللہ اکبر کی آواز بلند ہوئی۔ میں متحیر تھا کہ یہ کیا ہے۔ میرے ساتھی نے اپنے ہاتھ کی تین انگلیاں اٹھا کر اشارہ کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں خطبہ سے پہلے تین اذانیں دی جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک کے بعد ایک تین اذانیں ہوئیں۔ اس کے بعد امام

نے خطبہ شروع کیا۔

خطبہ حسب معمول مقفیٰ انداز میں تھا۔ اس کا قافیہ " نا " تھا۔ امام نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور اس کو پڑھنا شروع کیا۔ اس میں قافیہ کے مطابق اس طرح کے الفاظ تھے۔ مثلاً سرّاً وعلنا ، مابَعْدَ و مادنیٰ ۔ وغیرہ۔

نماز کے بعد باہر نکلے تو مانگنے والوں کی قطار تھی۔ بھیک مانگنے کا رواج ہندستان ہی کی طرح سینیگال میں بھی پایا جاتا ہے۔ تاہم ہندستان کے مقابلہ میں غالباً کم ہے۔

۱۲ مئی کی صبح مجھے دکار سے واپس روانہ ہونا تھا۔ ہوٹل میں اپنے کمرہ کی کھڑکی کھول کر باہر کی طرف دیکھا تو سمندر اور آسمان اور اڑتی ہوئی چڑیوں اور سورج کی ہلکی روشنی کے مناظر تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے سمندر اپنی مسلسل اٹھتی ہوئی موجوں کے ساتھ اذا ذکر الله وجلت قلوبهم کی کیفیت کو ممثل کر رہا ہے۔ چڑیاں حمد خداوندی کے نغمے بکھیرتی ہوئی فضا میں اڑ رہی ہیں۔ سورج اپنا آفاقی ٹارچ جلا رہا ہے تاکہ خدا کی نشانیوں کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔ ٹھنڈی ہواؤں میں ہلتے ہوئے درخت زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ اگر خدا کے کرشموں (آلاء) کو دیکھ کر تمہارے اندر تموج (thrill) پیدا نہیں ہوتا تو تم نے اس دنیا میں نہ کچھ دیکھا اور نہ اس دنیا میں کچھ پایا۔

اس دنیا کی ہر چیز حمد خداوندی کی تسبیح میں مشغول ہے۔ مسبحین کے اس عظیم اجتماع میں صرف ایک انسان ہے جو رب العالمین کا تسبیح خواں نہ بن سکا۔ جو پتھر کی طرح سخت دل ثابت ہوا، بلکہ پتھر سے بھی زیادہ سخت۔

ہوٹل کے اس کمرہ میں میں ایک ہفتہ سے زیادہ مقیم رہا۔ آج جب اس کو چھوڑ کر باہر نکلا تو خیال آیا کہ اسی طرح مجھے ایک روز موجودہ دنیا کو چھوڑنا ہوگا۔ آج میں منتظمین کانفرنس کی مقرر کی ہوئی تاریخ کے تحت ہوٹل کا کمرہ چھوڑ رہا ہوں، کل خدا کی مقرر کی ہوئی تاریخ کی بنا پر مجھے دنیا کو چھوڑ کر آخرت کی طرف جانا ہوگا۔ کیسا عجیب ہے وہ وقت جو آچکا، اور کیسا عجیب ہوگا وہ وقت جو آنے والا ہے۔

دکار سے جنیوا جاتے ہوئے راستہ میں لندن کا انگریزی اخبار ٹیلی گراف

(The Daily Telegraph) ۱۱ مئی ۱۹۹۰ پڑھا۔ اس کے صفحہ اول پر ایک رپورٹ درج تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ برطانیہ کے متمدن شہر ۴۸ قسم کی آوازوں کے مسئلہ سے دوچار ہیں۔ مثلاً سوتے وقت لوگوں کا خراٹے لینا۔ وغیرہ۔ رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ مشہور گن فائٹر جان وسلی (John Wesley) ایک بار ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ملے ہوئے کمرہ سے خراٹے کی آواز آنے لگی۔ اس سے وہ اتنا بدحواس (upset) ہوا کہ وہ دیوار توڑ کر دوسرے کمرہ میں داخل ہوا اور اس آدمی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

ہیلتھ سروسز اسٹاف کے ایک ذمہ دار پیٹر پیلٹ (Peter pallot) نے لکھا ہے کہ ہماری آبادیوں میں روزانہ برپا ہونے والے ۴۸ قسم کے شور جو لوگوں کو پاگل بنا رہے ہیں، ان میں سب سے زیادہ برا شور کتوں کا بھونکنا ہے:

The sound of dogs barking is the worst of 48 everyday noises that drive people mad

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مہذب ممالک اپنی ظاہری رونقوں کے باوجود کس قسم کے مسائل سے دوچار ہیں۔ تاہم مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ اس قسم کی باتوں کو لے کر یہ کہا جائے کہ اس کا حل اسلامی نظام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں ہمیشہ ایک یا دوسری قسم کے مسائل باقی رہیں گے۔ خواہ یہاں اسلامی نظام ہو یا غیر اسلامی نظام۔ مسائل اور مصائب سے خالی دنیا صرف آخرت میں ممکن ہے۔ اور ہم کو اسی کی طرف دعوت دینا چاہئے۔

اسلامی قانون کا نفاذ حقیقۃً کسی معاشرہ کی اجتماعی اطاعت ہے، جس طرح عبادت ایک فرد کی انفرادی اطاعت ہوتی ہے۔ اسلامی قانون کے نفاذ کو مسائل سے آزاد دنیا کی تعمیر کا نام دینا صرف سطحیت ہے۔ مزید یہ کہ اس میں یہ اندیشہ ہے کہ کسی ملک میں اسلامی قانون کے نفاذ کے باوجود جب مسائل کا خاتمہ نہ ہو تو لوگ خود اسلام سے مایوس ہو جائیں یا اس کے بارہ میں بری رائے قائم کرنے لگیں۔ مسائل کے حل کی بات جزئی طور پر صحیح ہو سکتی ہے۔ مگر وہ کلی طور پر درست نہیں۔

دکار سے جنیوا جاتے ہوئے جہاز میں میرے قریب ایک صاحب تھے۔ تعارف کے بعد

معلوم ہوا کہ وہ امریکی ہیں۔ ان کا نام کانریڈ (Conrad) تھا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ کمیونی کیشن انجنیئر ہیں اور واشنگٹن میں رہتے ہیں۔

کھانے کے وقت انھوں نے "ریڈ وائن" کا آرڈر دیا۔ یہاں سے گفتگو شروع ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ آپ شراب کیوں پیتے ہیں۔ تفریح کے لئے یا غذا کے لئے۔ انھوں نے کہا کہ دونوں کے لئے۔ میں نے کہا کہ کچھ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ شراب صحت کے لئے مضر ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہر چیز کی زیادتی (excess) مضر ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ شراب ایک عادت ہے، اور جب کسی چیز کی عادت پڑ جائے تو آدمی ایسا نہیں کر پاتا کہ وہ ایک حد سے زیادہ اس کو استعمال نہ کر سکے۔

اس کے بعد میں نے پوچھا کہ آپ خدا اور مذاہب میں یقین رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا نہیں۔ وجہ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ مذہب لوگوں کو آپس میں لڑاتا ہے۔ میں نے کہا کہ لڑائی کا تعلق مذہب سے نہیں۔ انھوں نے کہا:

Why people kill each other in the name of God.

میں نے کہا کہ مذہبی لوگ نہیں لڑتے بلکہ سیاسی لوگ مذہب کے نام پر لڑائی کرتے ہیں۔ وہ مذہبی لوگوں کی برائیاں بتاتے رہے۔ میں نے کہا کہ مذہبی لوگ اگر غلط کریں تو اس سے خدا کا عقیدہ غلط ثابت نہیں ہوتا۔ میں نے کہا کہ میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں۔ آپ ایک انجنیئر ہیں۔ یہ بتائیے کہ اگر کچھ لوگ ایٹمی توانائی کا غلط استعمال کریں تو کیا آپ ایٹمی توانائی کے وجود کا انکار کر دیں گے۔ اس کے بعد ان کا لہجہ دھیما پڑ گیا۔ انھوں نے کہا کہ میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ مگر میں خدا کے وجود کو نہیں مانتا۔

ڈیلی ٹیلی گراف میں ایک ہوائی حادثہ (air crash) کی رپورٹ درج تھی۔ پچھلے دن ایک ہوائی جہاز (Midland 737) انگلینڈ میں گر کر تباہ ہو گیا۔ ۴۷ آدمی مر گئے۔ چند آدمی جو بچ گئے تھے۔ انھوں نے آخر وقت کی آنکھوں دیکھی کہانی بتائی۔ ایک بچے ہوئے مسافر نے کہا کہ آخر وقت میں جب کہ جہاز میں بیٹھے ہوئے تمام مسافر زندگی سے ناامید ہو چکے تھے، اس نے ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ یسوع مسیح، اب ہم مرنے والے ہیں:

Jesus, we are going to die.

ایک مسافر جو بچ گیا تھا، اس نے اخباری نمائندہ سے بات کرتے ہوئے کہا کہ میرا بھروسہ جہاز کے عملہ کے اوپر تھا:

My faith was in the crew.

ایک جہاز کے دو آدمی ایک طرح کے حالات میں پہنچ کر بالکل دو قسم کے تاثر کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک اپنے خدا کی طرف دیکھتا ہے، دوسرا، جہاز چلانے والے انسانوں کی طرف۔ یہ مشہور حدیث کے مطابق، غالباً تربیت کے فرق کا نتیجہ ہے۔ جس آدمی کی تربیت نے اس کے ذہن میں "مسیح" کی اہمیت بٹھائی تھی، اس کے ذہن نے اس کو مسیح کی یاد دلائی، اور جس آدمی کی تربیت نے اس کے ذہن میں "عملہ" کی اہمیت بٹھا رکھی تھی، اس کے ذہن نے اسے بتایا کہ اس کو اس نازک موقع پر اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ جہاز کا عملہ ہے۔

ظہر اور عصر کی نماز جنیوا ایئرپورٹ پر پڑھی۔ اِس وقت میں ایئرپورٹ کے گیٹ نمبر ۲۴ پر اگلے جہاز کے انتظار میں بیٹھا ہوا ہوں۔ میرے سامنے کھلے ہوئے میدان میں مختلف ہوائی کمپنیوں کے جہاز کھڑے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر پر گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی جہاز ایئرپورٹ پر اترا، یا کوئی جہاز یہاں سے روانہ ہوا۔

اسی طرح دنیا میں ہر وقت کوئی انسان آرہا ہے، اور کوئی یہاں سے رخصت ہو رہا ہے۔ دنیا آنے اور جانے کی جگہ ہے۔ بسنے اور آباد ہونے کی جگہ صرف وہ ہے جس کو آخرت کہا جاتا ہے۔

جنیوا سے فرینکفرٹ کے لئے سوئس ایئر ۴۴۵ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں سوئس ایئر کا میگزین (Swissair Gazette) مئی ۱۹۹۰ کا شمارہ دیکھا۔ اس شمارہ میں مصر اور دریائے نیل کے بارہ میں ایک مفصل مضمون شامل تھا۔ قدیم مصر میں بتوں کی پرستش ہوتی تھی، ان میں سے کچھ بتوں کی تصویریں اس میں دی گئی تھیں۔ ان تصویروں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قدیم مصر کے لوگوں نے بت تراشی میں غیر معمولی کمال حاصل کیا تھا۔

ایک بت کی تصویر کے نیچے بامعنی طور پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے — فرعون کے زمانہ میں وہ پوجے جاتے تھے۔ آج وہ ثقافتی ورثہ کا ایک حصہ ہیں:

In pharaonic times they were worshipped,
today they are part of a cultural patrimony.

ان الفاظ کی پوری معنویت اس وقت تک واضح نہیں ہوسکتی جب تک اس میں یہ اضافہ نہ کیا جائے کہ قدیم زمانہ میں شرک ساری دنیا میں تہذیبی طاقت بن کر چھایا ہوا تھا۔ توحید کی بنیاد پر برپا ہونے والے اسلامی انقلاب نے اس مشرکانہ غلبہ کو ختم کر دیا۔ اگر یہ مشرکانہ غلبہ ختم نہ کیا جاتا تو دنیا میں کبھی وہ دور نہیں آسکتا تھا جس کو آج سائنسی ترقی کا دور کہا جاتا ہے (ملاحظہ ہو: اسلام دور جدید کا خالق)

فرینکفرٹ ایرپورٹ پر حفاظتی ہدایت (security advice) کے عنوان کے تحت دیواروں پر لکھا ہوا تھا کہ اپنے سامان کو رکھوالی کے بغیر نہ چھوڑیں:

Do not leave your baggage unattended.

اس کو دیکھ کر خیال آیا کہ یہی معاملہ آدمی کو خود اپنے نفس کے ساتھ کرنا ہے۔ ہر آدمی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے نفس کا نگراں بنا رہے۔ ورنہ اس کا نفس اس کو تباہی کے راستہ پر ڈال دے گا اور پھر کوئی چیز اس کو خدا کی پکڑ سے بچانے والی نہ بن سکے گی۔

۱۲ مئی کی شام کو فرینکفرٹ پہنچا۔ یہاں مغرب اور عشاء کی نماز پڑھی اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے میرے جیسے عاجز انسان کے ساتھ نصرت کا خصوصی معاملہ فرمایا۔

میرا اندازہ تھا کہ فرینکفرٹ میں چند گھنٹہ انتظار کے بعد مجھے اگلی فلائٹ دہلی کے لئے مل جائے گی۔ مگر یہ میرے اندازہ کی غلطی تھی۔ یہاں دراصل مجھے پندرہ گھنٹہ انتظار کرنا تھا۔ میں لفتھانسا کے کاؤنٹر پر گیا کہ آپ مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں۔ انھوں نے پوچھا کہ آپ کے پاس جرمنی کا ویزا ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایسی حالت میں آپ جرمنی کے اندر داخل نہیں ہوسکتے۔ اگر آپ کے پاس ویزا ہوتا تو ہم شہر کے کسی ہوٹل میں آپ کے لئے ٹھہرنے کا انتظام کر دیتے۔ میں نے کہا کہ آپ میری مدد کریں کہ ایسی حالت میں میں کیا کروں۔

کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی خاتون نے ٹیلی فون پر کسی سے بات کی۔ بات کرنے کے بعد کہا کہ آپ یہاں ٹھہریئے۔ ابھی ایک لیڈی آرہی ہیں وہ آپ کو بتائیں گی۔ چند منٹ کے بعد ایک جرمن خاتون آگئیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں ٹکٹ تھا اور دوسرے ہاتھ میں ٹرے جس میں کھانے پینے کا سامان تھا۔ انھوں نے کہا کہ آپ شہر میں تو داخل نہیں ہوسکتے۔ یہاں ایر پورٹ کے لاونج میں ٹھہریئے۔ یہ آپ

کے لئے کھانے کا سامان ہے، اور یہ آپ کے اوڑھنے کے لئے کمبل ہے۔

میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ رات گزارنے کے بعد اگلی صبح کو یہ کمبل میں کس کو واپس کروں۔ انھوں نے کہا کہ اس کو واپس کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ آپ ہی کا ہے۔ یہ پوری گفتگو انگریزی زبان میں ہوئی۔

پھیلے ہوئے لاونج میں ہر قسم کی عمدہ کرسیاں سیکڑوں کی تعداد میں تھیں۔ بیٹھنے کے لئے بھی اور سونے کے لئے بھی۔ رات نہایت آرام اور سکون کے ساتھ گزری۔

اس واقعہ کے بعد مجھے ایک صاحب کا قصہ یاد آیا جو انھوں نے مجھے بتایا تھا۔ میں ہندستان کے ایک مشہور اسلامی ادارہ میں تین سال تک رہا ہوں۔ ۱۹۶۶ میں جب کہ میں اپنے وطن گیا ہوا تھا، وہ مجھ سے ملنے کے لئے مذکورہ ادارہ میں آئے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ اس وقت میں یہاں موجود نہیں ہوں تو انھوں نے سوچا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ یہ مغرب بعد کا وقت تھا۔ انھوں نے طے کیا کہ رات وہاں کی مسجد میں گزاریں اور صبح کو واپس چلے جائیں۔ چنانچہ عشاء کی نماز کے بعد وہ مسجد میں ایک طرف لیٹ گئے۔

کچھ دیر کے بعد ادارہ کا چوکیدار آیا۔ اس نے کہا کہ مسجد میں سونا منع ہے، اس لئے آپ یہاں نہیں سو سکتے۔ انھوں نے کہا کہ اچھا، میں بیٹھ کر رات گزار لوں گا۔ چنانچہ وہ دیوار کی ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد چوکیدار دوبارہ آیا۔ اس نے کہا کہ آپ مسجد میں بیٹھ کر بھی نہیں رہ سکتے۔ اس لئے آپ باہر جائیں۔ وہ باہر نکل کر ایک چبوترہ پر لیٹ گئے۔ چوکیدار پھر آیا۔ اس نے کہا کہ اجنبی آدمی کو ادارہ کے اندر ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لئے آپ یہاں سے چلے جائیں۔

انھوں نے چوکیدار سے کہا کہ تم مجھ کو یہاں کے ذمہ دار کے پاس لے چلو، میں ان سے بات کروں گا۔ اس کے بعد چوکیدار انھیں ایک کمرہ میں لے گیا۔ یہاں ادارہ کے اساتذہ رات کی چائے پی رہے تھے۔ وہ دروازہ پر کھڑے ہو گئے۔ نہ کسی نے ان کو بیٹھنے کے لئے کہا اور نہ چائے کی پیش کش کی۔ دروازہ پر کھڑے کھڑے انھیں حکم دے دیا گیا کہ آپ اس طرح ادارہ کے اندر رات نہیں گزار سکتے۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما مغرب کی جو تصویر پیش کرتے ہیں اس کے مطابق، مغرب کی برتری کا راز اس کی "دسیسہ کاری" ہے۔ اس نے سازشی تدبیروں کے ذریعہ دنیا کے اوپر اپنا غلبہ قائم

کر رکھا ہے۔ یہ بلاشبہ ایک لغو بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب اپنی اخلاقی طاقت کے بل پر قائم ہے۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے اخلاقی زوال کی بنا پر موجودہ زمانہ میں اپنی جگہ حاصل نہ کرسکے۔ قوموں کے عروج وزوال میں جو چیز فیصلہ کن ہے وہ اخلاق ہے نہ کہ سازش اور دسیسہ کاری۔

سفر میرے لئے تجرباتی مطالعہ کے ہم معنی ہے۔ ہر سفر میں کچھ نئی باتیں دریافت ہوتی ہیں۔ موجودہ سفر میں جو نئی باتیں سمجھ میں آئیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ مغربی قوموں کی اخلاقیات کا راز کیا ہے۔ یہ سوال بہت عرصہ سے کیا جاتا رہا ہے کہ مشرقی قوموں کے مقابلہ میں مغربی قوموں میں جو بلند اخلاقی پائی جاتی ہے، اس کا راز کیا ہے۔

اس کا راز نہایت سادہ ہے اور وہ تجارت ہے۔ مثلاً مذکورہ واقعہ میں لفتھانسا ہوائی کمپنی اور اسلامی تعلیمی ادارہ میں اخلاقیات کا فرق کیوں ہے۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ لفتھانسا ایک تجارتی ادارہ ہے اور مذکورہ اسلامی ادارہ (دوسرے تمام اسلامی اداروں کی طرح) ایک ایسا ادارہ جو چندہ اور تبرعات پر چلتا ہے۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ تجارت سے کردار پیدا ہوتا ہے اور چندہ سے بے کرداری۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان بحیثیت قوم تجارت میں داخل نہ ہوسکے۔ اس لئے ان کے اندر وہ کردار بھی پیدا نہ ہوسکا جو ایک تاجر کے اندر لازمی طور پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ فرق چھوٹے پیمانہ پر ہندستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں پایا جاتا ہے۔ ہندو ایک تاجر قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب کہ مسلمان موجودہ زمانہ میں تاجر قوم نہ بن سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں میں نسبتاً کردار ہے، جب کہ مسلمان ان کے مقابلہ میں کردار سے خالی ہیں۔

یہ فرق یورپ میں بہت زیادہ نمایاں ہوجاتا ہے۔ ہندو صرف ابتدائی درجہ کے تاجر ہیں۔ اس لئے ان میں ابتدائی درجہ کی اخلاقیات پائی جاتی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مغربی قومیں (اور جاپان) زیادہ بڑے درجہ کے تاجر ہیں۔ تجارت میں وہ تمام قوموں سے بہت زیادہ آگے جاچکے ہیں۔ اس لئے ان میں کردار کی طاقت بہت بڑے پیمانہ پر پائی جاتی ہے۔

مسلمانوں میں کردار پیدا کرنے کے لئے ان کا ایمان کافی تھا۔ مگر موجودہ مسلمان ایک زوال یافتہ قوم ہیں۔ ان کے اندر وہ زندگی نہیں جو جاندار قوموں میں ہوتی ہے۔ اس

لئے ان کا ایمان ایک بے روح ایمان بن کر رہ گیا۔ اور بے روح ایمان اسی طرح اخلاقیات کو پیدا کرنے سے عاجز رہتا ہے جس طرح بنجر زمین لہلہاتی ہوئی فصل اگانے سے۔

ایئر پورٹ کی انتظار گاہ میں میری کرسی کے قریب دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک شخص امریکی لہجہ میں بول رہا تھا۔ دوسرا کسی اور لہجہ میں۔ امریکی مسافر کسی تعلیمی ادارہ میں تھا اور بتا رہا تھا کہ میں اکثر کانفرنسوں میں جاتا رہتا ہوں۔ اس سلسلہ میں اس نے بتایا کہ میں فلاں فلاں کارروائیاں کرتا ہوں۔ اگر میں ایسا نہ کروں تو میرے پاس کانفرنسوں کے دعوت نامے نہیں آئیں گے۔ پھر میں کیا کروں گا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا کہ اس کے بعد تو میرے پاس کرنے کا کوئی کام ہی نہ ہوگا:

Otherwise I have no job.

عین یہی معاملہ زیادہ بری شکل میں ہمارے لیڈروں کا ہے۔ وہ ایک نہ ایک جھگڑے کا اشو کھڑا کرتے رہتے ہیں۔ کوئی مذہبی جھگڑا کرتا ہے، کوئی قومی جھگڑا، اور کوئی سیاسی جھگڑا۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر جھگڑے کا ماحول نہ ہو تو وہ بے روزگار (jobless) ہو جائیں گے۔

فرینکفرٹ میں ایک بہت بڑا تجارتی ادارہ "بزنس انفارمیشن سروس" کے نام سے قائم ہے۔ اس کا صدر دفتر ایئر پورٹ سنٹر کی نویں منزل پر ہے، اور اس کی شاخیں ساری دنیا میں قائم ہیں۔

فرینکفرٹ ایئر پورٹ پر اس تجارتی ادارہ کا ایک شاندار اشتہار تھا۔ اس میں یہ بتاتے ہوئے کہ ہم آپ کے بہترین تجارتی مشیر ہیں، یہ کہا گیا تھا کہ فلاں فلاں نمبر پر آپ ہم کو ٹیلیفون کر دیں، ہم خود آکر آپ کو اپنے مرکز میں لے جائیں گے:

Please call us... We will come to accompany you.

یہ دیکھ کر خیال آیا کہ کاش اسی طرح اسلامی دعوت کے مراکز جگہ جگہ قائم ہوتے اور ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا جاتا کہ —— آپ ہم کو مطلع کریں، ہمارے آدمی آپ کو اپنے ساتھ مرکز میں لائیں گے۔ تاکہ آپ یہاں آکر اسلام کا مطالعہ کر سکیں۔

فرینکفرٹ ایئر پورٹ پر فنانشیل ٹائمز (۱۲ مئی ۱۹۹۰) پڑھا۔ اس میں ایک رپورٹ ٹیکس کی

ادائگی کے بارہ میں تھی۔ اس کا عنوان تھا: جب شادی مفید ہوتی ہے (When marriage pays)
اس میں بتایا گیا تھا کہ افراد عام طور پر یہ چاہتے ہیں کہ انھیں سرکاری ٹیکس کم سے کم ادا کرنا پڑے۔ موجودہ قوانین کے تحت اس کی ایک صورت نکاح ہے۔ ایک مستحکم اور پرمسرت ازدواجی زندگی کم سے کم ٹیکس ادا کرنے کی ایک پیشگی شرط ہے:

> A stable and happy marriage may be a prerequisite for paying the smallest amount of income and capital gains tax.

مغرب میں غیر شادی شدہ ازدواجی زندگی گزارنے کا عام رواج ہوگیا تھا۔ اس کے نتیجے میں بے شمار سماجی خرابیاں پیدا ہوئیں۔ اب مغرب کے دانشور اپنے لوگوں کو اقتصادی محرک بتا کر انھیں ازدواجی زندگی کی طرف لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں تجربات نے ثابت کیا ہے کہ مذہبی طرز زندگی ہی صحیح طرز زندگی ہے۔ مگر اس کے باوجود ابھی تک مذہب کی عظمت جدید دور میں قائم نہ ہوسکی۔ اس کی وجہ مذہبی لوگوں کا داخلی زوال ہے۔ اہل مذاہب کے اخلاقی اور عملی زوال نے مذہب کی نظریاتی صداقت کی نفی کر رکھی ہے۔ اہل مذاہب کی عملی زبوں حالی مذہب کی نظریاتی عظمت کے اوپر ایک قسم کا پردہ بن گئی ہے۔

فرینکفرٹ سے دہلی کے لئے لفتھانسا کی فلائٹ نمبر ۷۶۰ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ یہ مسلسل ساڑھے سات گھنٹہ کی پرواز تھی۔ میں نے اپنے دہلی پہنچنے کا پیغام اگر چہ فیکس کے ذریعہ پہلے بھیج دیا تھا۔ تاہم مزید احتیاط کے لئے آج میں نے جہاز کے عملہ کو ایک پیغام لکھ کر دیا کہ اس کو دہلی کے ٹیلیفون نمبر پر منتقل کر دیں۔ انھوں نے فوراً میرا کاغذ لے لیا اور کہا کہ یہ پیغام ہم اپنے دہلی کے آفس کو دوران پرواز بھیج دیتے ہیں۔ وہ دہلی میں آپ کے آفس کے ٹیلیفون نمبر پر مطلع کر دیں گے۔

یہ ہوائی کمپنیوں کا عام دستور ہے۔ مسافر کی منزل پر اگر ہوائی کمپنی کا دفتر ہے تو وہ پرواز سے پہلے یا دوران پرواز مسافر کا پیغام بھیج دیتے ہیں۔ یہ سہولت صرف اس وقت ہے جب کہ منزل کے مقامی ٹیلیفون نمبر پر مطلع کرنا ہو۔ مثلاً وہ میرا پیغام دہلی کے ٹیلیفون نمبر پر بھیج سکتے ہیں۔ مگر وہ اس

کو بنارس کے ٹیلیفون نمبر پر نہیں بھیجیں گے۔ یہ سہولت لوکل کال کے لئے ہے۔ ٹرنک کال کے لئے نہیں۔

جہاز کے اندر لفتھانسا میگزین (Lufthansa Bordbuch) کا تازہ شمارہ مئی۔ جون ۱۹۹۰ دیکھا۔ اس کے صفحہ ۶۵ پر بتایا گیا تھا کہ لفتھانسا نے امریکہ کے لئے نان اسموکنگ پروازیں (non-smoking flights) حال میں شروع کی ہیں۔ اس میں مزید بتایا گیا تھا کہ امریکی حکومت نے حال میں اندرونی پروازوں پر تمباکو نوشی پر پابندی لگادی ہے:

> The U.S. Administration recently introduced a general ban on smoking on domestic routes under six hours.

ایک زمانہ تھا کہ تمباکو نوشی فیشن میں داخل ہوگئی۔ بڑے بڑے لوگ سگریٹ اور سگار کا دھواں نکالنے کو اپنی بڑائی کا نشان سمجھنے لگے تھے۔ مگر آج سائنسی تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ تمباکو نوشی صحت کے لئے سخت مضر ہے۔ چنانچہ اب مختلف طریقوں سے سگریٹ نوشی پر پابندی لگائی جارہی ہے۔

ہمارا جہاز ۲۹ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتا ہوا تیزی سے دہلی کی طرف چلا جارہا ہے۔ میں نے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا تو سورج روشن تھا اور چاروں طرف اجالا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے بعد اپنی گھڑی پر نظر گئی تو اس میں آٹھ بج رہے تھے۔ گویا اس وقت جب کہ ہندستان میں رات کے آٹھ بج چکے تھے، یہاں میں مکمل طور پر اجالے میں اپنا سفر طے کر رہا تھا۔

زمین پر اجالے اور اندھیرے کا یہ فرق سورج کے گرد زمین کی محوری گردش سے پیدا ہوتا ہے۔ اس دنیا میں ہر جگہ ایک ہی وقت میں شام یا ایک ہی وقت میں صبح نہیں ہوتی۔ بلکہ مختلف وقتوں میں ہوتی ہے۔ اس حقیقت کی طرف قرآن میں مختلف انداز میں اشارے کئے گئے ہیں۔ انھیں میں سے ایک رب المشارق والمغارب (۷۰/۴۰) ہے۔ یعنی اس مالک کائنات کی قسم، جو زمین پر بے شمار مشرق اور بے شمار مغرب پیدا کرتا ہے۔

سورج کے گرد زمین کی گردش بلاشبہہ حیران کن حد تک ایک عظیم واقعہ ہے۔ یہ واقعہ خاموش زبان میں اعلان کر رہا ہے کہ اس کائنات کا مالک بے پناہ حکمت والا اور بے پناہ قدرت والا

ہے۔ اگر ایسانہ ہو تو زمین کی یہ حیرت ناک گردش اتنی صحت کے ساتھ مسلسل قائم نہ رہ سکے۔

جہاز میں زیورک کا انگریزی اخبار انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون (۱۲-۱۳ مئی ۱۹۹۰) دیکھا۔ اس کے صفحہ ۶ پر ایک مضمون تھا جس کا عنوان ان الفاظ میں قائم کیا گیا تھا:

From Kuwait to Algiers, A new political openness

مضمون میں دکھایا گیا تھا کہ مسلم ملکوں میں ہر جگہ پرو ڈیموکریسی مومنٹ ابھر رہی ہے۔ ۲۲ سال کے بعد دسمبر ۱۹۸۹ میں اردن میں الکشن ہوا۔ امیر کویت نے ۱۹۸۶ میں پارلیمنٹ توڑ دی تھی، اب کویت میں دوبارہ الکشن کے انعقاد کا اعلان کیا گیا ہے۔ اسی طرح تیونس اور الجیریا میں جون ۱۹۹۰ء میں میونسپل الکشن کئے جارہے ہیں۔ وغیرہ۔

اس مضمون کے لکھنے والے مسٹر گولڈ اسٹین (Eric Goldstein) تھے۔ مذکورہ قسم کی مثالیں دیتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا کہ اکثر عرب حکومتیں آزادانہ سیاسی سرگرمیوں کو ایک ایسی حد تک گوارا کر رہی ہیں جو پچھلے سالوں تک لامعلوم تھا:

Many Arab governments are tolerating independent political activity to an extent unknown in recent years.

مغرب کے دانشور آج کل اپنے آپ کو ایک نئے یقین کی حالت میں پا رہے ہیں۔ سوویت یونین میں کمیونسٹ نظام کی ناکامی اور جمہوری نظام کی طرف جھکاؤ نے ان کو یہ یقین دیا ہے کہ ان کا نظام زیادہ بہتر ہے۔ اب مسلم ملکوں میں جمہوریت کی طرف رجحان ان کے یقین میں مزید اضافہ کر رہا ہے۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ کہہ رہے ہیں کہ تمام نظامات ختم ہو کر مغربی جمہوریت کے نظام کے لئے جگہ خالی کر دیں گے۔

اسلام نے انسانی تاریخ میں پہلی بار جمہوریت کے دور کا آغاز کیا تھا۔ مگر بعد کے دور میں مسلم حکمرانوں کے غیر جمہوری عمل نے غیر ضروری طور پر مغرب کو اس فخر کا موقع دے دیا کہ ان کے نظام کو (اسلام سمیت) تمام دوسرے نظاموں پر برتری حاصل ہے۔

اگر آپ جغرافی نقشہ کو اپنے سامنے رکھیں تو کاغذی نقشہ کے اعتبار سے میرے لئے سیدھی روٹ یہ نظر آئے گی: دکار۔ نیجر۔ جدہ۔ دہلی۔ یعنی افریقی علاقہ میں سفر کرتے ہوئے ایشیا میں داخل

ہو جاتا۔ مگر میں نے دکار۔ جنیوا۔ فرینکفرٹ۔ دہلی کا راستہ اختیار کیا۔ یعنی میں افریقہ سے یورپ گیا، اور یورپ سے لوٹ کر ایشیا کی طرف آیا۔

اس کی وجہ ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کا صنعتی پچھڑاپن ہے۔ آج کا زمانہ مواصلات (communications) کا زمانہ ہے۔ مگر مواصلات کے جدید ذرائع زیادہ تر مغربی ملکوں میں مہیا ہوتے ہیں۔ اس لئے ایشیا اور افریقہ کے درمیان روابط مغرب ہی کے واسطہ سے قائم ہوتے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما آخری جو چیز جانتے تھے، وہ صرف سیاست تھی۔ اپنے روایتی ذہن کی بنا پر انھوں نے سیاست ہی کو سب کچھ سمجھا۔ وہ سیاست کے میدان میں مغرب سے ٹکراؤ کرتے رہے۔ وہ سائنس کی اہمیت سے بالکل بے بہرہ تھے۔ چنانچہ سیاست کے علاوہ باتوں کو وہ سمجھ نہ سکے اور نہ ان باتوں میں انھوں نے مسلمانوں کو بر وقت رہنمائی دی۔ موجودہ زمانہ کی پوری مسلم تاریخ میں کوئی ایک رہنما بھی ایسا نہیں جس کے اقوال و اعمال سے ثابت ہو کہ وہ سائنسی ذہن رکھتا تھا یا سائنس کی اہمیت سے واقف تھا۔

اسی غفلت کا یہ نتیجہ ہے کہ سیاسی زنجیروں سے رہائی کے باوجود تمام مسلم ممالک مغرب کی غیر سیاسی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہیں۔ کیوں کہ سائنس اور ٹکنالوجی میں اپنے پچھڑے پن کی وجہ سے وہ تمام جدید شعبوں میں مغرب کی مدد لینے پر مجبور ہیں۔

۱۳ مئی ۱۹۹۰ کو دہلی پہنچا۔ ایئر پورٹ پر امیگریشن سے فارغ ہو کر آگے بڑھا تو کسٹم کے مقام پر لوگوں کی داروگیر ہو رہی تھی۔ ہر آدمی اپنا سامان لئے ہوئے کسٹم والوں کی پکڑ میں تھا۔ اور سامان کھول کھول کر ہر ایک کی جانچ کی جارہی تھی۔ میں وہاں ایک لمحہ کے لئے ٹھہرا۔ فوراً ہی کسٹم کا ایک آدمی میری طرف متوجہ ہوا اور کہا: آپ جائیے، آپ جائیے۔ گیٹ کے باہر آیا تو وہاں ایک صاحب گاڑی کے ساتھ مجھے لے جانے کے لئے موجود تھے۔

میں نے سوچا تو یہ پورا معاملہ میرے ذہن میں قیامت کے واقعہ کی صورت میں ڈھل گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے میں دنیا سے نکل کر قیامت کے میدان میں داخل ہوا ہوں۔ احتساب کے فرشتوں کو دیکھ کر رک جاتا ہوں۔ اچانک احکم الحاکمین کی طرف سے آواز آتی ہے کہ تم جاؤ، تم جاؤ۔ آگے بڑھتا ہوں

تو رحمت کے فرشتے استقبال کے لئے آجاتے ہیں تاکہ مجھ کو اپنے ساتھ لے جاکر " دار الخلد" میں پہنچا دیں۔
حدیث قدسی میں آیا ہے کہ انا عند ظن عبدی بی (میں بندہ کے گمان کے ساتھ ہوں)
کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اپنے عاجز بندے کے اس گمان کو پورا کر دے اور ایئر پورٹ کے دنیوی تجربے کو میرے لئے آخرت کے معاملے کی پیشگی خبر بنا دے۔

ایک سفر

سوویت یونین میں گلاسناسٹ (openness) کی پالیسی کے تحت حال میں کافی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اس کے تحت روسی حکومت چاہتی ہے کہ بیرونی دنیا سے اپنے تعلقات بڑھائے۔ چنانچہ مختلف طبقہ کے لوگوں کو سوویت یونین جانے کے مواقع دئے جا رہے ہیں۔

اسی میں سے یہ ہے کہ سوویت حکومت عالم اسلام کی مختلف شخصیتوں کو دعوت دے رہی ہے کہ وہ سوویت یونین جاکر اپنی آنکھ سے وہاں کے مسلمانوں کے حالات کو دیکھیں۔ مثلاً سعودی عرب کے شیخ محمد بن ناصر العبودی اسی سلسلہ میں روس جاچکے ہیں۔ چنانچہ سوویت حکومت نے مجھ کو بھی روس کے سفر کی دعوت دی۔ اس کے تحت جولائی۔ اگست ۱۹۹۰ میں سوویت یونین کا سفر ہوا۔

شیخ عبودی (رابطۂ اسلامی، مکہ) کی سرکردگی میں جو وفد پندرہ دن کے لئے سوویت یونین گیا تھا، اس نے وہاں کی مسلم جمہوریتوں کا دورہ کیا۔ روسی مسلمانوں کے حالات اور ضرورتوں کا جائزہ لیا۔ اس نے روسی مسلمانوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ اسلام کی راہ میں تنہا نہیں ہیں بلکہ دنیا کے دوسرے مسلمان ان کے ساتھ ہیں۔

وفد نے وہاں کی ان مسجدوں کا بھی جائزہ لیا جو حال میں واگذار کی گئی ہیں۔ اس نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ ان مسجدوں کی اصلاح ومرمت کافی ہے یا ان کو از سر نو تعمیر کرنے کی ضرورت ہے۔ مزید یہ کہ روسی حکومت نے جن مقامات پر نئی مسجدوں کی تعمیر کی اجازت دی ہے، ان کے لئے مناسب زمین حاصل کرنے کی بابت ذمہ داروں سے گفت گو کی۔

روس میں اشتراکی انقلاب ۱۹۱۷ میں آیا جب کہ ابھی میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ تاہم سن شعور کو پہنچتے ہی اشتراکی روس کی باتیں میرے کان میں پڑنے لگیں۔ غالباً ۱۹۳۶ کا واقعہ ہے۔ میں اعظم گڈھ میں مولانا اقبال احمد سہیل (۱۹۵۵ - ۱۸۸۴) کے مکان پر تھا۔ گفت گو کے دوران سوویت روس کا ذکر آیا۔ انھوں نے خاندان کے ایک نوجوان کا نام لے کر کہا کہ ان کے کورس میں روسی زبان کا بھی ایک پرچہ ہے۔ پڑھائی مکمل کرنے کے بعد امید ہے کہ وہ روس جائیں گے۔ پھر ان کے ذریعہ سے وہاں کی صحیح باتیں معلوم ہوں گی۔ مذکورہ نوجوان اب بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ چکے ہیں۔ تاہم وہ روس نہ جاسکے۔ سرکاری

ملازمت کے بعد اب وہ ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں۔

۱۹۳۶ میں میں ایک مدرسہ میں کتاب النحو اور کتاب الصرف کے اسباق پڑھ رہا تھا۔ اس وقت بظاہر ناقابل تصور تھا کہ میں کبھی روس کا سفر کر سکوں گا۔ مگر عجیب اتفاق کہ اس واقعہ کے تقریباً ۵۵ سال بعد یہ "قرعہ" میرے نام آیا۔ جولائی ۱۹۹۰ میں میں نے اس ملک کا سفر کیا جس کا پورا نام یونین آف سوویت سوشلسٹ ریپبلکس (USSR) ہے۔

۱۱ جون ۱۹۹۰ کو نئی دہلی کے روسی سفارت خانہ سے ٹیلیفون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ مجھ کو دس روزہ پروگرام کے تحت سوویت روس بھیجنا چاہتے ہیں تاکہ میں وہاں اسلام اور مسلمانوں کے حالات کو براہ راست دیکھوں، نیز یہ کہ ۲۸ جولائی کے لئے انھوں نے میری سیٹ ریزرو کرا دی ہے۔ اس سے پہلے بھی تاریخ کے تعین کے بغیر وہ اس پروگرام کی بابت مجھ کو اطلاع دے چکے تھے۔ جولائی کے مہینہ میں میری بعض مصروفیات تھیں۔ مگر میں نے ان مصروفیات میں تبدیلی کر کے ان کی پیش کش کو قبول کر لیا۔

کسی روسی آدمی کو پہلی بار میں نے پچاس سال قبل دیکھا تھا۔ اس وقت میں ایک عربی مدرسہ (الاصلاح، اعظم گڈھ) میں پڑھ رہا تھا۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ صدر مدرس مولانا امین احسن اصلاحی اپنے کمرہ کی طرف چلے تو ان کے ساتھ نئے حلیہ کا ایک آدمی تھا۔ صاف رنگ، بھاری جسم، سر پر غیر ہندستانی وضع کی ٹوپی۔ میری ان سے ملاقات تو نہ ہو سکی۔ البتہ مولانا امین احسن اصلاحی کے ساتھ انھیں کئی بار مدرسہ کے احاطے میں چلتے پھرتے دیکھا۔ اتنا یاد ہے کہ مولانا اصلاحی سے ان کی گفتگو عربی زبان میں ہوتی تھی۔ اس وقت مدرسہ کی آبادی میں وہ سب سے زیادہ پرشکوہ شخصیت والے نظر آئے۔

یہ علامہ موسیٰ جار اللہ روسی تھے۔ مجھے یاد تھا کہ اسی زمانہ میں مولانا امین احسن اصلاحی نے ان کی بابت اپنے ماہنامہ الاصلاح میں "شذرات" کے تحت کچھ لکھا تھا۔ میں نے چاہا کہ اس مضمون کو دیکھوں۔ میں نے مولانا عبد الرحمٰن ناصر اصلاحی کو خط لکھا کہ الاصلاح کے مذکورہ مضمون کی فوٹو کاپی روانہ کر دیں۔ خط لکھنے کے چند دن بعد پانچ صفحہ کے اس مضمون کی فوٹو کاپی مجھے بذریعہ ڈاک دہلی میں مل گئی۔ واضح ہو کہ دہلی اور سرائمیر (اعظم گڈھ) کے درمیان ۸۰۰ کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔

یہ بظاہر ایک سادہ سی بات ہے۔ مگر اس میں شکر کا عظیم الشان سرمایہ موجود ہے۔ یہ انسانی

ذہن کی کیسی عجیب خصوصیت ہے کہ ۵۰ سال پہلے کا واقعہ ایک سکنڈ میں اس کو یاد آجائے۔ حالانکہ مجھے یاد نہیں آتا کہ زمانہ طالب علمی کے بعد دوبارہ کبھی اس کا ذکر آیا ہو۔ پھر ڈاک کا یہ نظام انسان کے لئے کتنی بڑی سہولت ہے۔ اگر موجودہ وسائل نہ ہوں تو مذکورہ مضمون کو حاصل کرنے کے لئے مجھے سولہ سو کیلومیٹر کا سفر طے کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ اس میں غالباً دو ماہ لگ جاتے۔ پھر فوٹو کاپی کی مشینیں کتنی بڑی نعمت ہیں جن کی وجہ سے یہ ممکن ہوگیا ہے کہ کسی چیز کا ویسا کا ویسا ہی عکس بلاتاخیر حاصل کر لیا جائے۔

یہ باتیں بظاہر بالکل معمولی ہیں، مگر معمولی چیز کو غیر معمولی چیز کے روپ میں دیکھنے ہی کا نام شکر ہے۔ اگر آدمی جذبۂ شکر کے ابلنے کے لئے انوکھے معجزہ کا انتظار کرے تو وہ کبھی بھی خدا کا سچا شکر گزار نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ موجودہ دنیا میں ایسے اسباب شکر کسی کے لئے ظاہر ہونے والے ہی نہیں۔

علامہ موسیٰ جار اللہ ۱۹۳۸ کے وسط میں روس سے پناہ گزیں کے طور پر ہندستان آئے تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی کا ان کے بارہ میں مضمون الاصلاح کے شمارہ جون ۱۹۳۸ میں چھپا تھا۔

اس مضمون میں بتایا گیا تھا کہ علامہ موسیٰ جار اللہ عربی، فارسی، ترکی، روسی اور فرنچ زبانیں بخوبی جانتے ہیں۔ علوم مشرقیہ کی مختلف شاخوں میں اچھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ عالم اسلام کی اس زمانہ کی تمام سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں کو قریب سے جانتے ہیں۔ وہ دو دن مدرستہ الاصلاح (سرائمیر، اعظم گڈھ) میں مقیم رہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی کے مضمون کا ایک اقتباس یہ ہے: "علامہ موسیٰ جار اللہ نے مجھ سے سوال کیا کہ ہندستان میں علوم عربیہ کی تعلیم جس نہج پر ہو رہی ہے، تمہارے خیال میں اس کا آخری انجام کیا ہونے والا ہے۔ میں نے کہا کہ عربی تعلیم، مدارس عربیہ اور ساتھ ہی مذہب کی تباہی۔ مجھے خیال تھا کہ علامہ اس کی تردید کریں گے لیکن انھوں نے اس کی حرف حرف تائید کی۔"

میں نے اپنی تحریری زندگی شروع کی تو میں کیمونزم کا مخالف بن چکا تھا۔ کانگرس کا ڈائمنڈ جوبلی سشن جنوری ۱۹۵۵ میں آوڈی (مدراس) میں ہوا تھا۔ اس موقع پر جواہر لال نہرو کی تحریک پر کانگرس نے یہ تجویز منظور کی تھی کہ ہمارا مقصد ہندستان میں سوشلسٹ طرز کا سماج (socialistic pattern of society) بنانا ہے۔ اسی زمانہ میں میں نے اس کے بارہ

میں ایک مقالہ لکھا تھا جو" ہندستان کی منزل : سوشلزم یا اسلام" کے نام سے چھپا تھا۔ اس میں دونوں نظاموں کا تقابل کرنے کے بعد آخر میں میں نے لکھا تھا :

پنڈت نہرو نے کہا ہے کہ ہندستان کی منزل سوشلزم ہے۔

ہم کہتے ہیں : ہندستان کی منزل اسلام ہے۔

اس کے بعد میں نے اس موضوع پر زیادہ جامع کتاب لکھی جو اپریل 1959 میں شائع ہوئی۔ اس کا نام تھا : مارکسزم جس کو تاریخ رد کر چکی ہے۔ اس کے جلد ہی بعد اس موضوع پر میری دوسری کتاب اگست 1959 میں شائع ہوئی۔ اس کا نام تھا : سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ۔

پچھلے ۳۵ سال کے اندر اس موضوع پر میں کم از کم ایک سو مضامین اور کتابیں اردو، عربی اور انگریزی میں شائع کر چکا ہوں۔ ان تمام مضامین اور کتابوں میں ہمیشہ میں نے کیونزم اور سوشلزم کی مخالفت کی ہے۔ ایک زمانہ میں بہت سے اسلام پسند (مثلاً ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی وغیرہ) سوشلزم کی طرف مائل ہو چکے تھے اور اس کو اسلامی اصطلاحوں میں بیان کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر میں ہمیشہ اس نظریہ کا مخالف رہا۔

سوویت روس کی موجودہ حکومت کا میرے جیسے ایک "مخالف" کو اپنے ملک میں بلانا کوئی سادہ واقعہ نہیں۔ یہ ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید سیکولرزم کی وہ کون سی خصوصیت ہے جو اس کو سارے عالم پر غالب کئے ہوئے ہے۔ وہ یہی فراخ دلی اور برداشت ہے۔ مغربی جمہوریت جس کو اب روس اختیار کر رہا ہے، وہ موافق اور مخالف کی اصطلاحوں سے اوپر اٹھ کر لوگوں سے معاملہ کرتی ہے۔ وہ اپنے ایک مخالف کی پذیرائی کے لئے بھی تیار رہتی ہے۔ اس کی اسی صفت نے اس کو یہ طاقت دی ہے کہ وہ ساری دنیا پر غلبہ حاصل کر سکے۔

موجودہ زمانہ کے اسلامی اداروں کا حال اس معاملہ میں بالکل برعکس ہے۔ ان کے یہاں صرف اپنے موافق کے لئے جگہ ہے۔ جس شخص کو وہ اپنا مخالف سمجھ لیں، اس کے سایہ سے بھی وہ نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ایک شخص اگر کسی اسلامی ادارہ کے " اکابر" پر تنقید کر دے تو اس کی تنقید خواہ کتنی ہی علمی اور مدلل کیوں نہ ہو، اس کے بعد وہ شخص اس ادارہ کی نظر میں اتنا مبغوض ہو جائے گا کہ وہ معقول انداز میں اس کا نام بھی نہیں لے سکتے، کجا کہ اس کو اپنے ادارہ کے کسی پروگرام میں شرکت کے لئے بلائیں۔

موجودہ اسلامی اداروں کی یہی کمزوری ہے جس نے ان کو آج کی دنیا میں بالکل بے قیمت بنادیا ہے۔

اس کا مزید نقصان یہ ہے کہ یہ ادارے سطحی انسانوں کی سرائے بن کر رہ گئے ہیں۔ کم از کم پچھلے پچاس سال کی بابت میں کہہ سکتا ہوں کہ اس مدت میں غالباً کوئی ایک بھی ایسا انسان پیدا نہ ہوسکا جس کی آج کی دنیا میں کوئی اہمیت ہو۔ زندہ اور اعلیٰ انسان وہاں پیدا ہوتے ہیں جہاں کھلی تنقید اور آزادانہ اختلاف رائے کا ماحول ہو۔ ان اداروں میں یہ ماحول سرے سے موجود ہی نہیں، پھر وہاں اعلیٰ درجہ کے انسان کیوں کر پیدا ہوسکتے ہیں۔

آج اسلام کی نئی تاریخ بنانے کے لئے مجتہدانہ صلاحیت رکھنے والے افراد درکار ہیں۔ مگر موجودہ اسلامی اداروں میں اکابر پرستی اور تقلید شخصی کا ماحول اتنی گہرائی کے ساتھ چھایا ہوا ہے کہ وہاں صرف تنگ نظر اور مقلد انسان ہی بن سکتے ہیں۔ ان اداروں سے مجتہدانہ اوصاف والی شخصیت کا پیدا ہونا ممکن ہی نہیں۔ ان اداروں سے کسی اعلیٰ انسان کا ابھرنا ویسا ہی ایک عجوبہ ہوگا جیسا کسی قبرستان سے ایک زندہ انسان کا نکل آنا۔

روس کے لئے روانگی سے پہلے وہ لوگ "روس میں اسلام" کی بابت ایک "فلم شو" دکھانا چاہتے تھے۔ اس کے تحت ۲۱ جون ۱۹۹۰ کو پہلی بار نئی دہلی کے روسی کلچرل سنٹر کے دفتر میں جانا ہوا۔ وہاں انھوں نے ایک مخصوص ہال میں مذکورہ "فلم شو" دکھایا۔

میں سنٹر میں پہنچا تو ایک روسی افسر نے "السلام علیکم" کہہ کر استقبال کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہیں اور ان کا نام (Bolat K. Nurgaleyev) ہے۔ "فلم شو" میں تصویروں اور آوازوں کے ذریعہ روس کے مسلم علاقہ (سنٹرل ایشیا) کو دکھایا گیا تھا۔ ایک گھنٹہ کی فلم میں "مسلم روس" کا مکمل تعارف سامنے آگیا۔ اسلامی دور کے آثار، موجودہ اسلامی سرگرمیاں، روسی مسلمانوں کے رہن سہن کا طریقہ، غرض ہر چیز کامیاب تصویروں کے ذریعہ اس طرح دکھائی گئی کہ کچھ عرصہ کے لئے محسوس ہوا کہ ہم دہلی میں نہیں ہیں، بلکہ سنٹرل ایشیا میں گھوم رہے ہیں اور سارے مناظر کو براہ راست اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

"فلم شو" کو دیکھنے کے بعد جب ہم واپس آنے کے لئے لفٹ کے دروازہ پر پہنچے تو سنٹر کے روسی ڈائرکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا "اب تو روس جاکر دیکھنے کی ضرورت نہیں"۔ ان کے اس جملہ میں دراصل ان کا یہ احساس فخر جھلک رہا تھا کہ جو چیز آپ آئندہ روس میں جاکر دیکھیں گے، اس کو ہم نے کامیاب

"فلم شو" کی صورت میں آپ کو یہیں دکھا دیا ہے۔

اس "فلم شو" کو دیکھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ یہ بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ قرآن میں جنت کے بارہ میں کہا گیا کہ و اُتوبہ متشابھا (البقرہ ۲۵) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی چیزیں آخرت کی چیزوں کا تمثیلی تعارف ہیں۔ اسی کا ایک نمونہ یہ "فلم شو" بھی ہے۔ جدید ٹکنیک نے اس کو ممکن بنا دیا کہ "مسلم روس" کو واضح تصویروں کی صورت میں دہلی کے اندر پیشگی طور پر دیکھا جا سکے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا کو اس طرح بنایا ہے کہ دیکھنے والی آنکھیں موت سے پہلے کی دنیا میں موت کے بعد والی دنیا کو پیشگی طور پر تمثیل کے روپ میں دیکھ سکتی ہیں۔

۲۸ جولائی ۱۹۹۰ کی شام کو روانگی ہوئی۔ دفتر سے نکل کر گاڑی پر بیٹھا تو دل سے بے اختیار یہ دعا نکلی: خدایا خیریت کے ساتھ لے جائیے اور خیریت کے ساتھ واپس لائیے۔ دنیا اور آخرت میں خیریت کا معاملہ فرمائیے۔

دہلی میں میں ۱۹۶۷ سے ہوں۔ یہاں کی مانوس سڑکوں سے گزرتے ہوئے جب میں ایئر پورٹ کی طرف جا رہا تھا تو خیال آیا کہ زندگی نام ہے مانوس راہوں میں نامانوس سفر طے کرنے کا۔ خارجی ظواہر میں اندرونی حقائق کو پالینے کا۔ جو لوگ صرف دیکھے کو جانیں انھوں نے نہیں دیکھا۔ جو لوگ اَن دیکھے کو پالیں وہی دراصل وہ لوگ ہیں جن کو جاننے والا کہا جائے۔

قرآن کے مطابق، حیات دنیا کا ایک ظاہر ہے اور اسی کے ساتھ حیات دنیا کا ایک باطن ہے (الروم ۷) ایک مفسر نے اس آیت کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے کہ انھوں نے چھلکے کو جانا اور وہ مغز کو نہ جان سکے (انھم عرفوا القشور ولم یعرفوا اللُّباب) دنیا کے دکھائی دینے والے مناظر میں اللہ تعالیٰ نے نہ دکھائی دینے والی آخرت کی نشانیاں چھپا دی ہیں۔ وہی لوگ حقیقۃً آنکھ والے ہیں جنھوں نے دکھائی دینے والی دنیا میں نہ دکھائی دینے والی آخرت کا مشاہدہ کر لیا۔

مغرب اور عشاء کی نماز ایئر پورٹ پر وی آئی پی لاونج میں پڑھی۔ لاونج کے باہر دہلی کا موسم گرم تھا۔ مگر لاونج کے اندر مجھے سوئٹر پہننا پڑا۔ ایرکنڈیشنگ کے ذریعہ مصنوعی طور پر موسم کو بدل لینا بظاہر اچھی بات ہے۔ مگر یہ سہولت آدمی کو صرف اس قیمت پر ملتی ہے کہ وہ "نیچر" سے بے تعلق ہو جائے۔ اس کو انسانی مصنوعات کی خبر ہو، مگر خدائی مصنوعات اس کے لئے لامعلوم چیز بن جائیں۔

دہلی سے ایروفلاٹ کی پرواز ۵۳۶ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز میں ہر چیز کا معیار یورپ کی اچھی ہوائی کمپنیوں سے کم نظر آیا۔ اشتراکی روس نے جنگی صنعت کی ترقی میں بہت زیادہ توجہ دی۔ مگر انسان کے وسائل محدود ہیں۔ ایک شعبہ میں بہت زیادہ آگے بڑھنا ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ آدمی دوسرے شعبوں میں پیچھے رہ جائے۔ یہی روس کے ساتھ ہوا۔ جنگی صنعت میں تقدم کا نتیجہ اس کے لئے غیر جنگی شعبوں میں تخلف کی صورت میں برآمد ہوا۔ گورباچوف کا پروسترائیکا (re-structuring) روسی زندگی میں اسی عدم توازن کو ختم کرنے کی ایک کوشش ہے۔

جہاز میں ایروفلاٹ کا میگزین "سوویت ایئرلائنز" موجود تھا۔ ایک مضمون میں بتایا گیا تھا کہ سیکڑوں روسی ہوابازوں میں سے پانچ کو ہیروازم اور ہمت (courage) کی بنا پر خصوصی انعام دیا گیا۔ ناموں سے اندازہ ہوا کہ ان میں سے ایک مسلمان ہوا باز تھے۔ ان کا نام میجر رشید بتایا گیا تھا۔ ان کا جہاز فضا میں سخت حالات کا شکار ہو گیا۔ مگر انھوں نے غیر معمولی محنت اور مہارت سے کام لے کر جہاز کو اور اس کے مسافروں کو بچالیا۔ مگر جب ان کا جہاز زمین پر اترا تو ان کا حال یہ تھا کہ وہ اپنی سیٹ سے اپنے آپ نہیں اٹھ سکتے تھے۔ انھوں نے جہاز کو بچانے کے لئے اپنی ساری طاقت خرچ کر دی تھی:

> But when the plane came to a standstill he could not leave the cabin by himself. He had no strength left (p.3).

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ مسلمان یہاں کی اعلیٰ سروسوں میں ہیں۔ مزید یہ کہ انھوں نے اپنی غیر معمولی کارکردگی سے نمایاں درجہ حاصل کر لیا ہے۔

درمیان میں جہاز ایک گھنٹہ کے لئے تاشقند میں رکا۔ لینڈنگ اتنی اچھی تھی کہ یہ محسوس ہی نہیں ہوا کہ کب وہ اڑ رہا تھا اور کب زمین پر اتر گیا۔ اکثر مسافر تاشقند ایئر پورٹ دیکھنے کے لئے اترے۔ میں بھی اترا۔ یورپی معیار کے لحاظ سے ہوائی اڈہ کم تر معیار کا تھا۔ "ٹرانزٹ پاس" سے لے کر کرسیوں اور ٹوائلٹ تک ہر چیز نسبتاً معمولی تھی۔

ہوائی اڈہ موجودہ زمانہ میں قوموں کی ترقی کا معیار سمجھا جاتا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ روس کی موجودہ تبدیلیاں گویا فطرت انسانی کی چیخ ہیں۔ ستر برس کے ناکام تجربہ کے بعد

یہاں کے انسان کی فطرت چیخ اٹھی کہ ہم کب تک مارکس کے مصنوعی نظام کا بوجھ اپنے اوپر لادے رہیں جس نے ہمیں دنیا کی قوموں سے پیچھے کر دیا۔

تاشقند ازبیک علاقہ کی راجدھانی ہے۔ اس کی تاریخ دوسری صدی قبل مسیح تک جاتی ہے۔ ازبیک زبان میں تاشقند کے معنی "پتھر کا گاؤں" ہیں۔ مگر آج وہ ماسکو، لینن گراڈ اور خیف کے بعد سوویت یونین کا چوتھا سب سے بڑا شہر ہے۔ عربوں نے اس شہر کو آٹھویں صدی عیسوی میں فتح کیا تھا۔ تیرھویں صدی میں اس پر منگولوں نے قبضہ کرلیا۔ مگر منگولوں کے قبول اسلام کے بعد وہ بدستور مسلم سلطنت کا ایک جزء رہا۔ ۱۹۱۷ سے اس پر کمیونسٹ روس کا قبضہ ہے۔ سابق وزیر اعظم ہند لال بہادر شاستری نے اسی مقام پر پاکستان کے ساتھ ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ کو "تاشقند معاہدہ" پر دستخط کئے تھے جس کے اگلے دن حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے ان کا انتقال ہوگیا۔

تاشقند ہی میں قرآن کا وہ نسخہ موجود ہے جس کو مصحف عثمان کہا جاتا ہے۔ خلیفہ سوم عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کے پانچ مکمل نسخے تیار کرائے۔ اس کے بعد مکہ، بصرہ، کوفہ اور دمشق میں ایک ایک نسخہ رکھوایا، اور ایک نسخہ اپنے پاس رکھا۔

کہا جاتا ہے کہ یہی عثمانی نسخہ پہلی صدی ہجری میں سمرقند پہنچا۔ پھر ۱۸۶۹ء میں اس کو قیصر روس نے حاصل کیا اور اس کو پیٹرس برگ کی سرکاری لائبریری میں محفوظ کر دیا۔ تاہم اس سلسلہ میں دوسری روایتیں بھی ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ تیمور نے جب دمشق پر قبضہ کیا تو وہاں سے اس نے مصحف عثمان کو حاصل کیا اور اس کو اپنے ساتھ سمرقند لے آیا۔ ابن الخولی مصری جامعۃ الازہر کے استاد تھے۔ ان کی ایک عربی کتاب ہے جس کا نام ہے: الارتباطات بین النیل والفولغا۔ اس کتاب میں انھوں نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ مصحف عثمانی کس طرح تاشقند پہنچا۔ تاہم انھوں نے مختلف روایات کو جمع کر دیا ہے۔ کسی ایک روایت کو انھوں نے ترجیح نہیں دی۔

اس علاقہ کے مسلمان اول روز سے یہ چاہتے تھے کہ حکومت روس یہ مصحف ان کے حوالے کر دے۔ مگر قدیم دور میں انھیں کامیابی نہ ہوسکی۔ ۱۹۱۷ کے اشتراکی انقلاب کے بعد مسلمانوں نے دوبارہ مشورہ کیا اور ایک وفد اس سلسلہ میں لینن کے پاس بھیجا گیا۔ لینن نے مسلم وفد کی بات سننے کے بعد اس سے اتفاق کیا اور اسی وقت حکومت کے متعلقہ ذمہ دار کے نام مصحف کی واپسی کے

لئے ایک خط لکھا جس پر ۹ دسمبر ۱۹۱۷ کی تاریخ درج تھی۔ اس خط کا عربی ترجمہ میں نے المفتی ضیاء الدین خان بن ایشان بابا خان کی عربی کتاب الاسلام والمسلمون فی البلاد السوفیتیۃ میں دیکھا ہے (صفحہ ۸۶ - ۸۷)

اس مصحف کے کچھ صفحات ضائع ہوگئے ہیں۔ موجودہ مصحف میں کل ۳۵۲ صفحات ہیں۔ ۱۹۲۳ تک وہ شہر اوفا میں تھا۔ ۱۹۲۳ میں اس کو خصوصی اہتمام کے ساتھ سمرقند لایا گیا اور شہر کی جامع مسجد خوجہ احرار میں رکھا گیا۔ ۱۹۴۳ سے وہ ایک میوزیم میں ہے جو خاص اسی کے نام پر بنایا گیا ہے۔

تاشقند اس سوویت خطہ میں واقع ہے جس کو سنٹرل ایشیا کہا جاتا ہے۔ روس کے مشہور عالم المفتی ضیاء الدین خان بن ایشان بابا خان نے اپنی ۲۸۵ صفحہ کی کتاب (الاسلام والمسلمون فی البلاد السوفیتیہ) میں بتایا ہے کہ اسلام یہاں سب سے پہلے آذر بائیجان اور داغستان میں پہنچا۔ یہ خلیفہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ساتویں صدی عیسوی کا واقعہ ہے۔

اس کے بعد اسلام پورے سنٹرل ایشیا میں پھیل گیا جو اس زمانہ میں ماوراء النہر کہا جاتا تھا۔ خلفاء بنی امیہ نے اس علاقے میں کثرت سے ایسے مسلمان بھیجے جو یہاں اسلام کی اشاعت کریں اور لوگوں کو قرآن اور عربی زبان کی تعلیم دیں۔ انھیں میں سے ایک قثم بن عباس بن عبد المطلب بھی تھے جن کی قبر آج بھی سمرقند میں موجود ہے۔ دسویں صدی عیسوی تک اس علاقہ کے قبائل بہت بڑی تعداد میں اسلام قبول کر چکے تھے۔

سنٹرل ایشیا سے اسلام کی زبردست تاریخ وابستہ ہے۔ اس علاقہ سے اسلام کی نہایت ممتاز اسلامی شخصیتیں اٹھیں۔ مثلاً محمد بن اسماعیل البخاری، محمود الزمخشری، ابونصر الفارابی، ابوعلی بن سینا، ابوعیسی الترمذی، وغیرہ۔

۲۹ جولائی کی صبح کو ہمارا جہاز ماسکو ایئرپورٹ پر اترا۔ لینڈنگ حیرت انگیز حد تک "اسموتھ" تھی۔ جہاز کی خاتون اناؤنسر نے جب اعلان کیا کہ " اب آپ ماسکو میں ہیں" تو اچانک مجھے خیال آیا کہ اسی طرح ایک روز خدا کے فرشتے مجھے ایک سفر کرائیں گے اور منزل پر پہنچ کر اعلان کریں گے کہ " اب تم عالم آخرت میں ہو"۔ ماسکو بھی میرے لئے ایک نئی دنیا ہے اور آخرت بھی میرے لئے نئی

دنیا ہوگی۔ مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ "ماسکو" میرے سفرِ حیات کی صرف درمیانی منزل ہے، جب کہ "آخرت" میرے سفرِ حیات کی آخری منزل ہوگی۔ ماسکو ہوائی اڈہ پر تو میرے استقبال کے لئے حکومت کے نمائندے آئے ہوئے ہیں۔ یہاں میرے سفر کے لئے گاڑی موجود ہے اور قیام کے لئے ہوٹل کا کمرہ پیشگی طور پر رزرو کر دیا گیا ہے۔ مگر آخرت کی دنیا میں میرے اوپر کیا بیتے گی، اس کو احکم الحاکمین کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔

ماسکو کا ہوائی اڈہ تاشقند کے ہوائی اڈہ سے بہتر تھا۔ مگر جدید معیار جو جدہ، روم، فرینکفرٹ جنیوا وغیرہ میں نظر آتا ہے، اس کے لحاظ سے اس کو صرف دوسرے درجہ کا کہا جا سکتا ہے۔ ہوائی اڈہ کی ہر چیز اعلیٰ معیار سے کم تر تھی۔ سوویت روس نے جنگی طاقت میں امریکہ کی برابری (parity) حاصل کر لی ہے۔ مگر اس کی قیمت اس کو یہ دینی پڑی کہ وہ دوسری چیزوں میں غیر برابر ہو کر رہ گیا۔ یہ سوویت روس کو مارکسزم کا تحفہ ہے۔

ایرپورٹ سے ہوٹل کا راستہ تقریباً پون گھنٹہ کا تھا۔ مسٹر الکسی گالکن (Alexei Galkin) بطور گائڈ ساتھ تھے۔ ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ فضا میں کہر بھی تھا۔ اس لئے اطراف کے مناظر بہت زیادہ صاف نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ تاہم ایک چیز نمایاں تھی۔ سڑک کے دونوں طرف جو عمارتیں نظر آئیں وہ زیادہ تر کثیر منزلہ تھیں۔ اگر آپ دبئی ایئرپورٹ سے شارجہ کی طرف جائیں تو آپ کو وہاں کی بیشتر عمارتیں یک منزلہ یا دو منزلہ دکھائی دیں گی۔ یہاں کی بیشتر عمارتیں کثیر منزلہ تھیں۔ اس فرق کا سبب سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید وہاں کے لوگ افقی ترقی (horizontal growth) پر یقین رکھتے ہیں اور یہاں کے لوگ عمودی ترقی (vertical growth) پر۔

ماسکو میں میرا قیام جس ہوٹل میں تھا اس کا نام ازمائیلوف (Izmailovo) تھا۔ یہ ۲۸ منزلہ ہے۔ اس ہوٹل کے کمرہ نمبر ۱۰۲۹ میں مجھے ٹھہرایا گیا۔ کمرہ کافی اچھا تھا۔ تاہم اس کمرہ کی سب سے ممتاز چیز وہ تھی جس کو میں استعمال نہ کر سکا۔ اور وہ ٹی وی سیٹ تھا۔ بظاہر اس کی کوالٹی اچھی تھی۔ مگر بدقسمتی سے اس معاملہ میں میں بہت بے ذوق واقع ہوا ہوں۔ کمرہ میں ٹی وی کا خصوصی اہتمام یہاں کے نظام کی علامت تھا۔ کیوں کہ کمیونسٹ نظام کے تحت سوویت روس میں اسلحہ کی تیاری کے بعد دوسری جس چیز پر سب سے زیادہ توجہ دی گئی وہ پبلسٹی تھی۔

۲۹ جولائی کو ابھی ظہر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوا تھا کہ کمرہ کے دروازہ پر دستک ہوئی۔ سوٹ میں ملبوس ایک روسی اندر داخل ہوئے۔ آتے ہی انھوں نے اردو میں بولنا شروع کیا۔ ماسکو میں ایک اردو داں کو دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ معلوم ہوا کہ یہ ڈاکٹر گولب یف (Isaac Golobyev) ہیں۔ انھوں نے ماسکو یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا اور پھر اردو میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ وہ سوویت وومن کے ہندی اڈیشن کے اڈیٹر ہیں، جو سوویت ناری کے نام سے نکلتا ہے۔ وہ ایک سے زیادہ بار انڈیا کا سفر کر چکے ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ ماسکو یونیورسٹی کے علاوہ روس کے اور بہت سے تعلیمی اداروں میں اردو پڑھانے کا انتظام ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ اردو پڑھ لیتے ہیں۔ انھوں نے کہا " میں تو اردو کا دل دادہ ہوں"۔ ہوٹل کے کمرہ سے ہم لوگ باہر نکلے تو دو روسی عورتیں گزر رہی تھیں۔ وہ ڈاکٹر گولب یف کو جانتی تھیں۔ انھوں نے ہنستے ہوئے اپنی زبان میں کوئی بات کہی۔ ڈاکٹر گولب یف نے بتایا کہ وہ کہہ رہی ہیں: "اس غیر ملکی کو روسی زبان بہت اچھی آتی ہے"۔ انھوں نے بتایا کہ سوویت یونین میں ہر آدمی پڑھا لکھا ہے۔ سات سال کی عمر میں اسکول جانا لازم ہو جاتا ہے۔

میں نے پوچھا کہ آپ مذہب میں عقیدہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا: مذہب میں عقیدہ نہیں رکھتا ہوں، مگر جو عقیدہ رکھتے ہیں ان کی بہت عزت کرتا ہوں۔ انھوں نے بتایا کہ تین سال تک میں پاکستان میں تھا۔ میرے دفتر میں ایک مسلمان میرے ساتھ کام کرتا تھا" میں نے پاکستان میں مجبوراً روزہ رکھا۔ جب میرا ساتھی نہیں کھاتا تو میں کیسے کھا سکتا تھا" انھوں نے کہا۔

۲۹ جولائی کو دوپہر بعد ڈاکٹر گولب یف کے ساتھ ہوٹل سے نکلا۔ انھوں نے ماسکو شہر کا مختلف حصہ دکھایا۔ اس مشاہدہ میں ماسکو ایک باعظمت شہر نظر آیا۔ اس کو دیکھ کر محسوس ہو رہا تھا کہ واقعۃً میں ایک سپر پاور کی راجدھانی دیکھ رہا ہوں۔ ہم لوگ شہر دیکھنے کے لئے نکلے تو دھوپ ہو گئی۔ اس کی وجہ سے دیکھنے میں بڑی آسانی ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ دھوپ کو روسی زبان میں کیا کہتے ہیں۔ انھوں نے ایک کاغذ پر اپنے قلم سے یہ الفاظ لکھے: سون تسے۔ اسی طرح میں نے ان سے پوچھا کہ ماسکو بڑا ہے (Moscow is great) کو روسی میں کس طرح کہیں گے۔ انھوں نے کہا: مَسکوَا وِلی کیا۔

کریملن کو زیادہ تفصیل کے ساتھ دیکھا۔ یہ دہلی کے لال قلعہ کی مانند اس سے زیادہ بڑا ایک علاقہ

ہے۔ وہ زار کے زمانہ سے لے کر اب تک روسی سلطنت کا عظیم مرکز رہا ہے۔ ۱۹۵۶ تک اس کے اندر کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے بعد خروشچوف نے اس کے دروازے عام لوگوں کے لئے کھول دئے۔ چنانچہ آج بھی ہزاروں آدمی اس کے اندر گھومتے ہوئے نظر آئے۔ ان میں ملکی اور غیر ملکی دونوں تھے۔ تاہم اس پر ہیبت دنیا کی خصوصیات کو لفظوں میں بیان کرنا بے حد مشکل ہے۔

کریملن کے اندر کئی قدیم چرچ بھی ہیں۔ زار بادشاہوں کا مذہب عیسائیت تھا۔ اس لئے انھوں نے کریملن میں، جو گویا ان کا قلعہ اور محل تھا، چرچ بھی بنوائے۔ ایک تاریخی چرچ کو اندر سے دیکھا اس میں پیتل کے بڑے بڑے تابوتوں میں قدیم روسی بادشاہوں کی لاشیں رکھی ہوئی ہیں۔ کریملن کے پورے علاقے میں حیرت انگیز حد تک صفائی موجود تھی۔ جب کہ وہاں ہم کو صفائی کرنے والے دکھائی نہیں دئے۔ صفائی کا محکمہ صبح کو صفائی کرتا ہوگا۔ مگر اس کے بعد سارے دن اس کا صاف رہنا اس کے زائرین اور اس کے باشندوں کے نظم اور صفائی پسندی کا ثبوت ہے۔

کریملن کی تاریخی چیزوں میں ایک عظیم توپ ہے جو زار کے زمانہ میں بنائی گئی۔ اس کے بڑے بڑے گولے بھی اس کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ مگر یہ توپ کبھی استعمال نہیں ہوئی۔ اسی طرح ایک بہت بڑا لوہے کا گھنٹہ ہے جو چرچ کے لئے منقش انداز میں بنایا گیا تھا۔ وہ بھی عمارت کے اوپر لگایا نہ جاسکا۔ میں نے سوچا کہ اسی طرح کتنے انسان ہیں جو دنیا میں آتے ہیں۔ مگر وہ یہاں اپنی حقیقی جگہ نہیں پاتے۔ وہ استعمال ہوئے بغیر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

کریملن کے ایک حصہ میں لینن کا مقبرہ ہے۔ تاج محل میں حسن کا پہلو نمایاں ہے مگر لینن کا مقبرہ اس طرح بنایا گیا ہے کہ اس میں عظمت کا پہلو ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔ ہم مقبرہ کے سامنے پہنچے تو اس کے دروازہ کے باہر دو انسانی صورتیں اسٹیچو کی طرح کھڑی ہوئی نظر آئیں۔ دو فوجی جوان مکمل وردی کے ساتھ رائفل لئے ہوئے آمنے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ دونوں اس قدر ساکن اور صامت تھے کہ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ انسان کی مورتیں ہیں۔

بتایا گیا کہ یہ مورتیں یا اسٹیچو نہیں ہیں بلکہ زندہ فوجی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ لینن کے مقبرہ کے دروازہ پر ۲۴ گھنٹہ دو مسلح فوجی جوان رہتے ہیں۔ وہ ذرا بھی ہلے بغیر کھڑے رہتے ہیں۔ چوں کہ آدمی اس طرح زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتا، اس لئے ہر ایک گھنٹہ پر ان کی ڈیوٹی بدلتی رہتی ہے۔ جیسے ہی ایک

گھنٹہ پورا ہوتا ہے، دوسرے دو فوجی جو ان خاص انداز میں چلتے ہوئے آتے ہیں اور ان کی جگہ کھڑے ہوجاتے ہیں۔ روس میں لینن کو جو غیر معمولی عظمت حاصل ہے، یہ اس کا ایک مظاہرہ ہے۔

اس کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ مردہ انسان کے علامتی ڈھانچہ کی حفاظت پر اتنے زبردست پہرے لگے ہوئے ہیں، مگر دنیا میں وہ انسان کہیں نظر نہیں آتا جس نے اپنے زندہ وجود کو نفس اور شیطان سے بچانے کے لئے اپنے اوپر پہرہ بٹھا رکھا ہو۔ حالاں کہ یہ دوسرا پہرہ "مفت" میں حاصل ہوتا ہے۔ آپ اللہ سے دعا کیجئے اور اللہ کے فرشتے آپ کی پہریداری کے لئے فوراً آپ کے پاس آجائیں گے۔

ماسکو میں دنیا کا سب سے بڑا اسرکس ہے۔ آج اس کا مخصوص شو تھا۔ میرے نہ چاہتے ہوئے بھی میرے میزبان نے مجھ کو لے جاکر وہاں بٹھا دیا۔ بادل ناخواستہ وہاں جاکر بیٹھ گیا۔ اس کی عمارت سے لے کر ہر چیز تک غیر معمولی تھی۔ حد درجہ تربیت یافتہ قسم کے آدمی، گھوڑے، اونٹ، بندر، کتے بار بار آکر طرح طرح کے تماشے دکھاتے رہے۔ ہزاروں تماشائی محظوظ ہوکر تالیاں بجا رہے تھے۔

مگر مجھے ان چیزوں کا کوئی ذوق نہیں۔ میں بے رغبت بیٹھا ہوا کبھی آنکھ کھولتا اور کبھی آنکھ بند کرتا۔ تاہم اس کا ایک "آئٹم" بڑا عجیب تھا۔ درمیان میں کھلے ہوئے اسٹیج پر ایک بہت بڑا جالی دار پنجرہ کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے بعد پندرہ بڑے بڑے شیر اس کے اندر داخل کئے گئے۔ ایک تنہا آدمی کالا سوٹ پہنے ہوئے اس کے اندر موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں تقریباً ۴ فٹ لمبی چھڑی تھی جس کی سفیدی بتا رہی تھی کہ وہ لوہے کی ہے۔ تمام شیر اس آدمی کی چھڑی کے اشاروں پر حرکت کرنے لگے۔

جس طرح ہندستان میں ایک مداری بندر کو تربیت دے کر اس سے طرح طرح کے تماشے کراتا ہے، اسی طرح یہ آدمی پندرہ شیروں کے درمیان کھڑا ہوا ان سے عمل کروا رہا تھا۔ حاضرین سانس روکے ہوئے اس حیرت ناک "شو" کو دیکھتے رہے۔ شیر کبھی کبھی آدمی کی چھڑی پر غرّاتے اور دانت اور پنجہ نکالتے، مگر اس کے باوجود وہ مجبور مخلوق کی طرح اس کے "احکام" کی پابندی کرتے رہے۔ یہ شو اتنا عجیب تھا کہ جب میں اس کو سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں نے کوئی خواب دیکھا ہو۔

سرکس کا شو دیکھنے کے بعد ہم لوگ ہوٹل واپس آئے تو گھڑی میں دس بج چکے تھے۔ شام کو ۱۰ بجے ہندستان میں رات کا وقت ہوتا ہے۔ مگر یہاں ابھی فضا میں اجالا تھا اور مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔

یہ صورت حال ان ملکوں میں پیش آتی ہے جو قطبین کے قریب واقع ہوں۔ ان علاقوں میں ان دنوں رات چھوٹی ہوتی ہے اور دن بڑا۔ دوسرے موسم میں وہاں دن چھوٹا ہوتا ہے اور رات بڑی۔ جو ممالک خط استوا سے قریب ہیں وہاں یہ جغرافی مظہر دکھائی نہیں دیتا۔

۳۰ جولائی کو دوشنبہ کا دن تھا۔ میں نے ہوٹل میں ایک صاحب کو ٹیلیفون کرنا چاہا جن کا روم نمبر 1829 تھا۔ میں اپنے کمرہ کے ٹیلیفون پر یہ نمبر گھماتا رہا۔ مگر دوسرے کمرہ میں گھنٹی نہیں بجتی تھی۔ آخر ریسپشن ڈسک پر پوچھا تو معلوم ہوا کہ مذکورہ کمرہ کے ٹیلیفون کا نمبر 166-42-80 ہے۔ اسی طرح میرے کمرہ کا نمبر 1029 تھا۔ مگر اس کا ٹیلی فون نمبر یہ تھا: 166-42-06۔ آزاد دنیا کے تمام ملکوں میں یہ قاعدہ ہے کہ کمرہ کا جو نمبر ہوتا ہے وہی اس کا فون نمبر بھی ہوتا ہے۔ مگر یہاں کے نظام میں ہر چیز پر سادگی کے بجائے پیچیدگی کا انداز چھایا ہوا ہے۔

یہاں کے پیچیدہ سسٹم کے بارہ میں اس طرح کے کئی تجربے ہوئے۔ میں نے ایک روسی تعلیم یافتہ شخص سے پوچھا تو اس نے کہا کہ میں بہت سے ملکوں میں گیا ہوں۔ میں خود محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے یہاں کا نظام ہر جگہ سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ ہم کو بہت سی غیر ضروری مشکلیں پیش آتی ہیں۔ اور اس کی وجہ ہمارے یہاں کی حد درجہ بڑھی ہوئی بیورو کریسی ہے۔

۱۱ بجے سوویت روس کے کچھ ذمہ داروں سے ملاقات ہوئی۔ اس میں حسب ذیل افراد شریک تھے۔ مسٹر الکسی لون کوف (Alexei I. Lounko) ڈپٹی ہیڈ، ساؤتھ ایشین ڈپارٹمنٹ، اینڈری سوروکن (Andrei A. Sorokin) جنرل سکریٹری، سوویت انڈین فرینڈشپ سوسائٹی، ڈاکٹر جنادی اودیف (Gennady P. Avdeyed) سکریٹری، سوویت انڈین فرینڈشپ سوسائٹی، الکسی وی گالکن (Alexey V. Galkin) سکریٹری یو ایس ایس آر فرینڈشپ سوسائٹی۔ اس ملاقات میں زیادہ تر اس موضوع پر گفتگو ہوئی کہ سوویت یونین کے مسلمانوں اور انڈیا کے مسلمانوں کے درمیان تعلقات کس طرح بڑھائے جا سکتے ہیں۔

ماسکو میں قیام کے دوران بار بار شہر میں آنے جانے کا اتفاق ہوا۔ اس کے مختلف حصے دیکھے۔ یہاں کی ایک بات مجھے پسند آئی۔ سڑک پر اور فٹ پاتھ پر سامان بیچنے والے کہیں نظر نہیں آئے۔ جب کہ دہلی میں اور ہندستان کے دوسرے تمام چھوٹے اور بڑے شہروں میں یہ کاروباری مصیبت انتہائی عام

ہے۔ غالباً یہ بھی ایک وجہ ہے جس کی بنا پر شہر میں ہر جگہ صفائی نظر آئی۔

اسی طرح ماسکو میں کئی چیزیں میرے ذوق کے اعتبار سے بہت عمدہ تھیں، وہاں سڑکوں پر بے شمار گاڑیاں ہر وقت دوڑتی ہیں، مگر مجھے ایک بار بھی ہارن کی آواز سنائی نہیں دی۔ ایک بار بھی لاؤڈ اسپیکر کا شور سننے پر مجبور ہونا نہیں پڑا۔ سائرن کی آوازیں بھی وہاں نہیں تھیں۔ پھیری کرنے والوں اور خوانچہ والوں کے شور سے پورا شہر بالکل خالی تھا۔ شہر کے کسی حصہ میں مجھے وہ منظر دکھائی نہیں دیا جس کو ہندستان کے شہروں میں جھگی جھونپڑی کہا جاتا ہے جس کو آپ دہلی اور دوسرے بڑے شہروں میں ہر جگہ دیکھ سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسی جھونپڑیاں بھی کہیں پائی جاتی ہوں مگر مجھے آتے جاتے ہوئے وہ دکھائی نہیں دیں۔

مجھے خود تو یہاں ٹیکسی لینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ مگر ایک سیاح نے بتایا کہ ایک غیر ملکی جب یہاں ٹیکسی پر سوار ہوتا ہے تو ٹیکسی والا اس سے ڈالر کا تقاضا کرتا ہے، وہ روبل لینا پسند نہیں کرتا۔ اسی طرح ہر جگہ روبل کے مقابلہ میں ڈالر زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ کے مقابلہ میں سوویت یونین کی اقتصادی حالت کیا ہے۔ لوگ جانتے ہیں کہ روبل سے وہ صرف روسی مصنوعات خرید سکتے ہیں جو کوالیٹی میں اعلیٰ نہیں ہوتیں۔ جب کہ ڈالر کے ذریعہ ہر قسم کی اعلیٰ چیزیں خریدی جا سکتی ہیں۔

ہوٹل کا مغربی حصہ کھلا ہوا تھا۔ شیشوں کے اُس پار باہر کی دنیا صاف دکھائی دے رہی تھی۔ دیوار سے لگے ہوئے چوڑے شیشے میرے اور شہر کے درمیان مادی اعتبار سے حائل تھے لیکن نگاہ شفاف شیشوں کو پار کر کے دور تک ماسکو کا منظر دیکھ سکتی تھی۔ اگر اللہ تعالیٰ نے تمام مادے ایسے بنائے ہوتے جن سے روشنی پار نہ کر سکے تو ایسا مشاہدہ ناممکن ہوتا۔ مگر اللہ نے کثیف مادوں کے ساتھ شیشہ جیسی چیزیں پیدا فرمائیں جن سے روشنی گزر سکتی ہے اور اس بنا پر یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ہم شیشہ کے اُس پار کے منظر کو دیکھ سکیں۔

دنیا میں اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں جو بتاتے ہیں کہ اس دنیا کی تخلیق منصوبہ بند انداز میں ہوئی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ موجودہ دنیا کے وہ لوگ جنھوں نے کائنات کی اس منصوبہ بند نوعیت کو سب سے زیادہ کھولا، وہی یہ ثابت کرنے میں مشغول ہیں کہ دنیا کی تشکیل میں منصوبہ کا کوئی دخل

نہیں، صرف اس لئے کہ اگر وہ اس میں منصوبہ کو مان لیں تو فوراً منصوبہ ساز کو ماننا پڑے گا، اور ان کا مزاج کسی منصوبہ ساز کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔

مزاجی اعتبار سے آدمی اگر کسی بات کو ماننا نہ چاہتا ہو تو دلیل اس کو منوانے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی، خواہ کتنے ہی زیادہ طاقت ور دلائل کے ساتھ اس کو ثابت کر دیا گیا ہو۔ خواہ کتنے ہی زیادہ حقائق اس کی تصدیق کرنے کے لئے موجود ہوں۔

حال میں سوویت روس کے اندر جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ بے حد سبق آموز ہیں۔ روس میں ۱۹۱۷ میں کیمونسٹ انقلاب آیا۔ دوسری عالمی جنگ میں کیمونسٹ روس کو یہ موقع ملا کہ وہ بہت بڑے رقبہ کو اپنے اندر شامل کر لے۔ اس موضوع پر کچھ لوگوں سے میری گفتگو ہوئی۔ میں نے جو کچھ کہا، اس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد سوویت روس کے لئے امریکہ سب سے بڑا انظریاتی اور فوجی دشمن تھا۔ سوویت روس کے حکمرانوں نے اپنی ساری توجہ سب سے زیادہ دو چیزوں پر لگا دی۔ ایک، تمام اشاعتی ذرائع کو استعمال کر کے یہ ثابت کرنا کہ امریکہ کا سرمایہ دارانہ نظام سب سے برا نظام ہے اور روس کا اشتراکی نظام سب سے بہتر نظام (9/764)

دوسری طرف روس نے اپنے بہترین سائنسی دماغوں کو جنگی اہمیت کی چیزوں کی ریسرچ پر لگا دیا۔ ۱۹۴۹ میں سوویت روس نے اپنے پہلے نیوکلیر ہتھیار کا تجربہ کیا۔ اس طرح اُس نے اِس افسانہ کا خاتمہ کر دیا کہ امریکہ دنیا کا واحد ملک ہے جو نیوکلیر ہتھیار رکھتا ہے (۷۶۴/۹) اس کے بعد روس نے اکتوبر ۱۹۵۷ سے اسپٹنک (مصنوعی سیارہ) کا سلسلہ شروع کیا۔ اس نے انسانی تاریخ میں پہلی بار ایسے مصنوعی سیارے کامیابی کے ساتھ خلا میں بھیجے جو زمین کے گرد گھومتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کے بارہ میں لکھا گیا کہ سوویت روس نے تاریخ میں پہلی بار خلائی دور شروع کیا:

Soviet Union .... inaugurated the Space Age (IX/500).

سوویت روس اپنی چالیس سالہ کوششوں سے امریکہ کے بعد دوسری سب سے بڑی طاقت (سپر پاور) بن گیا۔ مگر روس کو یہ کامیابی ایک بے حد مہنگی قیمت پر ملی۔ جنگی دیو بننے کے لئے اس کو اپنے وسائل کی اتنی زیادہ مقدار صرف ایک محاذ پر لگانی پڑی کہ دوسرے اقتصادی شعبوں

کے اعتبار سے وہ ایک بونی قوم بن گیا۔ روس میں خوراک اور استعمال کی اشیاء کی فراہمی ہولناک حد تک کم ہوگئی۔ اس کے فوجی گدام خطرناک فوجی ہتھیاروں سے بھرے ہوئے تھے مگر اس کے بازار اشیاء خوراک اور عام استعمال کی چیزوں سے خالی تھے۔

اب حکمرانوں کے لئے دو صورت تھی۔ ایک یہ کہ عوام کی بربادی کے کھنڈر پر وہ بدستور اپنا سیاسی تخت بچھائے رہیں۔ کیوں کہ جو کچھ مصیبت تھی وہ عوام پر تھی، خود ان کا اپنا مسئلہ ہر اعتبار سے حل شدہ تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ وہ ماضی کی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہوئے ایک انقلابی فیصلہ کریں، خواہ اس انقلابی فیصلہ کے نتیجہ میں انھیں بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ سوویت روس کے موجودہ وزیر اعظم نے اسی دوسرے راستہ کو اپنے لئے اختیار کیا ہے۔

یہی وہ بات ہے جو لندن کے انگریزی اخبار سنڈے ٹائمس (۱۰ جون ۱۹۹۰) نے اپنے اداریہ میں کہی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ تاریخ کے تیز دھارے میں ایک خطرہ ہٹتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ سرد جنگ ختم ہو رہی ہے اور یہ بڑی حد تک مغرب کی فتح کے ہم معنی ہے:

In the sweep of history, as one threat recedes, another replaces it. The cold war is ending, largely in victory for the west.

تاہم اس دنیا میں نہ کوئی ہار آخری ہار ہے اور نہ کوئی جیت آخری جیت۔ اگر سوویت روس نے مغرب کے مقابلہ میں اپنی عارضی "پسپائی" کو وقفۂ تعمیر کے طور پر استعمال کیا تو عین ممکن ہے کہ وہ ترقی کا نیا سفر شروع کر دے اور کسی نئی صورت میں اپنے لئے سپر پاور کا مقام دوبارہ حاصل کرلے۔

سوویت یونین ۱۵ جمہوریتوں پر مشتمل ہے۔ وہ دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔ اس کے پاس بہترین جغرافیہ ہے۔ اس کے پاس انسانی قوت بھی موجود ہے۔ مگر ۷۰ سالہ انقلابی عمل کے باوجود وہ دنیا کی ترقی یافتہ قوموں سے پیچھے ہوگیا۔ اس کا واحد سبب مارکسزم ہے۔

مارکسی نظریہ کے تحت یہاں کے تمام زرعی اور تجارتی ذرائع بجبر افراد کے ہاتھ سے چھین کر حکومتی انتظام میں دے دئے گئے۔ اس مصنوعی انتظام نے سوویت سماج میں مقابلہ کا عمل ختم کر دیا۔ مقابلہ کی حالت کسی سماج میں ہمیشہ اس وقت قائم ہوتی ہے جب کہ ان کو یہ احساس ہو کہ وہ صرف اپنی

ذاتی کارکردگی سے ترقی کرسکتے ہیں۔ مگر جب تمام لوگوں کو سرکاری ملازم بناکر انھیں مقرر تنخواہ پر ڈال دیا جائے تو لوگوں کے اندر ذاتی محرک کا جذبہ ختم ہوجاتا ہے۔ اب آدمی کسی چیلنج سے دوچار نہیں ہوتا جو اس کی قوت عمل کو متحرک کرے۔ ایسا سماج کبھی ترقی نہیں کرسکتا۔ اور یہی اشتراکی روس کے ساتھ ہوا۔

اشتراکی روس کے لئے مارکسزم کا دوسرا تحفہ جنگ جوئی تھا۔ مارکس نے بتایا کہ دنیا میں بہتر نظام لانے کے لئے جنگ ضروری ہے۔ کیوں کہ استحصال کرنے والا طبقہ فہمائش کے ذریعہ اپنے مفادات سے دست بردار نہیں ہوتا۔ اس لئے مزدور طبقہ کو اس سے جنگ کرنی پڑتی ہے۔ تاکہ برابری کا سماج قائم کرنے میں جو واحد رکاوٹ ہے اس کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دے۔ مارکس کا یہی نظریہ تھا جس نے سوویت یونین کو امریکہ کا دشمن بنا دیا۔ کیوں کہ "سرمایہ دارانہ نظام" کے اس سب سے بڑے ایجنٹ کو نیست و نابود کئے بغیر دنیا میں اشتراکی سماج نہیں لایا جاسکتا تھا۔ اس نظریہ نے روس کی بہترین طاقت کو جنگی کارروائیوں کی طرف موڑ دیا جس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ آخرکار وہ دیوالیہ ہوکر رہ گیا۔

اب اشتراکی روس نے اس مجنونانہ قسم کے جنگی نظریہ سے توبہ کرلی ہے۔ روس کے موجودہ حکمراں میخائیل گورباچیف کو ان کی قیام امن کی خدمات پر ۱۹۹۰ کا نوبیل انعام دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ناروے کی انعام کمیٹی کے بیان کے مطابق (ہندستان ٹائمس ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۰) گورباچیف کے پرسترائیکا (Perestroika) کے نتیجہ میں پچھلے چند سالوں میں مشرق اور مغرب کے درمیان تعلقات میں ڈرامائی تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں۔ ٹکراؤ کی جگہ اب بات چیت نے لے لی ہے:

> In the last few years dramatic changes have taken place in the relationship between East and West. Confrontation has been replaced by negotiation.

مگر عجیب بات ہے کہ عین اسی وقت ساری دنیا کے "اسلام پسند" نوجوانوں نے اس تباہ کن جنگی نظریہ کو اسلامائز کرکے اس کا جھنڈا اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے۔ اب ہر جگہ وہ بم اور گولی کی منطق سے اسلامی انقلاب برپا کرنے کا ہنگامہ کھڑا کئے ہوئے ہیں۔ یہ مسلم نوجوان سید قطب، خمینی اور مودودی کے نظریات سے متاثر ہیں اور ان کو مفکرین اسلام کا خطاب دیتے ہیں۔ حالانکہ زیادہ

صحیح بات یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو مخربین اسلام کا لقب عطا کیا جائے۔

میری لائبریری میں کیمونزم سے متعلق جو کتابیں ہیں، ان میں سے ایک ساڑھے سات سو صفحہ کی وہ کتاب ہے جو مارکس اینجلز اور لینن کی اہم ترین تحریروں (Most important writings) پر مشتمل ہے، اس کی ابتدا میں ناشر کی طرف سے جو نوٹ ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ یہ تحریریں ان قوانین سے بحث کرتی ہیں جو سماج کی ترقی میں حاکمانہ اثر رکھتی ہیں اور یہ بتاتی ہیں کہ سماجی ترقی میں انقلابات کا کردار کیا ہے:

They deal with the laws governing the development of society, tell the role of revolutions in social development.

یہ کتاب ۱۹۷۲ کی چھپی ہوئی ہے۔ اس وقت یہ حال تھا کہ ان کمیونسٹ مفکرین کی تحریروں کو آسمانی صحیفہ کی طرح اٹل اور محکم بتا کر دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ مگر اس کی اشاعت کے ۲۰ سال بعد جب میں سوویت روس کی دنیا میں داخل ہوا تو وہاں شاید کوئی ایک شخص بھی نہ تھا جو ماضی کی ان تحریروں کو پڑھنا تو درکنار ان کا تذکرہ کرنا بھی ضروری سمجھتا ہو۔

اس کتاب میں لینن کا مضمون ہے۔ اس میں مذہب کو بے حقیقت بتاتے ہوئے لینن نے کہا تھا کہ مذہب عوام کے لئے افیون ہے:

Religion is opium for the people (p. 411).

آج خود اشتراکی روس کا یہ حال ہے کہ وہاں کے درو دیوار تک پکار رہے ہیں کہ مذہب ایک فطری صداقت ہے، اور خود مارکسزم ایک افیون ہے جس میں روسی عوام کو ۷۰ سال تک مبتلا رکھا گیا۔ "ہیرو ورشپ" کے مزاج کے تحت اگرچہ آج بھی لینن کا شخصی احترام روس میں باقی ہے، مگر اس کی تحریروں کو مقدس سمجھ کر اس کی تلاوت کرنے والا اب شاید ملک میں کوئی بھی نہیں۔

ماسکو میں میری طبیعت خراب ہو گئی۔ میں نے چاہا کہ میں مزید سفر کا سلسلہ ختم کر کے ماسکو ہی سے دہلی واپس چلا جاؤں۔ مگر معلوم ہوا کہ میں فوراً یہاں سے نہیں جا سکتا، کیوں کہ اگلی دو فلائٹ (ایرانڈیا، ایروفلاٹ) مکمل طور پر بک ہو چکی ہیں۔ یہی حال ۲۸ جولائی کو یہاں آتے ہوئے ایروفلاٹ کا تھا۔ بڑے جہاز کی تمام سیٹیں بھری ہوئی تھیں۔

اس سے اندازہ ہوا کہ دہلی اور ماسکو کے درمیان کافی مسافر ہوتے ہیں۔ تجارت اور تعلیم اور حکومتی ضروریات کے تحت لوگ سفر کرتے ہیں۔ حالاں کہ ہفتہ میں تین فلائٹ ایئر انڈیا کی ہے۔ اور تین فلائٹ ایروفلاٹ کی۔

یہ غالباً جواہر لال نہرو کی پالیسی کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے مخصوص مقاصد کے تحت امریکہ سے دوری اختیار کی اور روس سے اپنے تعلقات بڑھائے۔ مگر نئے حالات نے ثابت کیا ہے کہ خود سوویت یونین اپنی ترقی کے لئے امریکہ کا ضرورت مند ہے۔ چنانچہ وہ چاہتا ہے کہ امریکہ ۲۰ بلین ڈالر سے اس کی مدد کرے۔ ۱۹۴۷ میں ایک طرف جاپان نے اپنی نئی زندگی شروع کی اور دوسری طرف، ہندستان نے۔ جاپان امریکہ کا تعاون لے کر بڑھا۔ آج وہ تمام ملکوں سے آگے بڑھ چکا ہے۔ ہندستان نے اشتراکی روس کے تعاون سے آگے بڑھنا چاہا مگر وہ کہیں نہیں پہنچا۔

آج دنیا بھر کے لوگ جاپان کی گھڑی پہننے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ مگر روسی صنعت کا حال عجیب ہے۔ دہلی کے ایک انگلش جرنلسٹ مسٹر ارن شرما نے مجھ سے فرمائش کی تھی کہ میں ان کے لئے روس کی بنی ہوئی پاکٹ واچ لے آؤں۔ کیوں کہ وہ ہاتھ کی گھڑی استعمال نہیں کرتے۔ وہ جیبی گھڑی کو پسند کرتے ہیں۔ ماسکو میں میں نے ایک واقف کار سے اس کا ذکر کیا۔ اس نے کہا کہ روسی گھڑی اطمینان بخش نہیں ہوتی۔ اس کی پائداری کی کوئی ضمانت نہیں۔

آزادی (۱۹۴۷) کے بعد ہندستان کے ترقی نہ کرنے کا کم از کم ایک بڑا سبب یہ ہے کہ آزادی کے بعد اس کی قیادت نہرو کے ہاتھ میں آئی۔ نہرو پہلے سے اشتراکی ذہن کے آدمی تھے۔ بعض سیاسی اسباب کے تحت وہ روس سے قریب ہونے پر مجبور ہوئے۔ انھوں نے ہندستان کی ترقی کے لئے، اپنے الفاظ میں، "سوشلسٹک پیٹرن" کو اختیار کیا۔ (مثلاً پانچ سالہ منصوبے، پبلک سکٹر نیشنلائزیشن، حکومتی کنٹرول، وغیرہ) اگر انھوں نے اس کے بجائے امریکی پیٹرن کو اختیار کیا ہوتا، نیز پڑوسی ملک سے ٹکراؤ کی حالت کو ختم کر دیتے تو مجھے یقین ہے کہ ہندستان آج ایشیا کا سب سے زیادہ طاقت ور اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہوتا۔ سوشلزم اور جنگی بجٹ کے دو پاٹوں میں ہندستان پس کر رہ گیا، اور دونوں کی ذمہ داری جواہر لال نہرو پر آتی ہے۔

خروشچوف کے زمانہ میں ایک لطیفہ مشہور ہوا تھا۔ وہ ایک مرتبہ ایک روسی کارخانہ میں

گئے۔ انھوں نے وہاں کے ایک کارکن سے کارخانہ کے حالات پوچھے۔ اشتراکی کارکن نے کارخانہ کی کارکردگی اور اس کی پیداوار کی زبردست تعریف شروع کی۔ خروشچوف کو اس کی تعریف مبالغہ آمیز معلوم ہوئی۔ اس نے کہا : تم جانتے ہو، میں کون ہوں۔ میں روس کا وزیر اعظم خروشچوف ہوں۔ کارخانہ کا کارکن معذرت کرتے ہوئے بولا۔ معاف کیجئے گا، میں سمجھا کہ آپ کوئی غیر ملکی مہمان ہیں۔

روسی صنعت کے بارہ میں یہ لطیفہ چھپا تو دنیا بھر کے کمیونسٹوں نے کہا کہ یہ سرمایہ داروں کا پروپگنڈہ ہے۔ مگر اب خودگورباچیف اور دوسرے روسی ذمہ دار کھلے لفظوں میں اس حقیقت کا اعتراف کر رہے ہیں۔ اب سوویت روس میں ذاتی اخبار نکالنے کی اجازت ہوگئی ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ ذاتی اخبارات نکال رہے ہیں۔ ان اخباروں کی قیمت سرکاری اخباروں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے باوجود یہ اخبارات سرکاری اخباروں سے زیادہ بکتے ہیں۔ اور اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان اخباروں میں روسی حکومت اور روسی نظام پر تنقید ہوتی ہے۔

۳۱ جولائی کی شام کو یہاں کی میٹرو (زمین دوز ٹرین) دیکھی۔ کہا جاتا ہے کہ ماسکو کی زمین دوز ٹرین دنیا کے چند بہترین نظاموں میں سے ایک ہے۔ اس کا ٹکٹ بہت سستا ہے۔ پانچ کیو پک میں کسی ایک لائن پر کہیں بھی جاسکتے ہیں۔ سارا سسٹم الکٹرانک نظام پر قائم ہے۔

میرے ساتھی ڈاکٹر اودیف (Dr. Gennady P. Avdeyev) کے پاس روبل تھا۔ انھوں نے ایک خاص مشین میں اس کو ڈالا اور فوراً پانچ پانچ کیوپک کے سکے نکل آئے۔ آگے بڑھے تو اندر داخل ہونے کے لئے ایک خاص دروازہ تھا۔ یہاں ایک شخص کو پانچ کیو پک برائے ٹکٹ ڈالنا تھا۔ ہم نے پانچ کیوپک ڈالے اور دروازہ سے گزر کر دوسری طرف پہنچ گئے۔ اگر کوئی شخص کیوپک نہ ڈالے تو آٹومیٹک طور پر دروازہ کے اندر سے ایک لوہا نکل کر دروازہ کو بند کردے گا۔ ٹرین آرام دہ اور تیز رفتار تھی۔ میں ایک اسٹیشن تک جاکر واپس چلا آیا۔

ایک روبل میں ایک سو کیوپک ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ عام لوگوں کے لئے بے حد سستی سواری ہے۔ اسی کے ساتھ اس کا نظام تعجب خیز حد تک سادہ ہے۔ اندر کی تعمیر نہایت مضبوط اور نہایت شاندار نظر آئی۔ اگر دہلی میں اس قسم کا نظام قائم ہوجائے تو دہلی والوں کے لئے بہت بڑی نعمت ثابت ہوگا۔

ہوٹل کے رسپشن پر ایک خاتون تھیں۔ وہ صرف روسی زبان جانتی تھیں۔ میرے گائڈ کی مدد سے انھوں نے پوچھاکہ کیا یہ مسلمان ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہاں۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئیں۔ انھوں نے کہاکہ میں تاتاری نسل کی مسلمان ہوں۔ انھوں نے اپنا نام جولودینو احسانہ (جمال الدین حسنہ) بتایا۔ ان کی عمر ۱۵ سال تھی۔ وہ خود سے ایک روز میرے لئے چائے اور ناشتہ لے آئیں۔

میرا اندازہ ہے کہ روسی لوگ مزاجاً بہت اچھے ہیں۔ مگر یہاں قاعدے اور ضابطے اتنے زیادہ ہیں کہ چاہنے کے باوجود کوئی شخص کچھ کرنہیں سکتا۔ مثلاً ۳۱ جولائی کی شام کو دہلی کے لئے ایروفلاٹ کی پرواز تھی اور اسی دن ایر انڈیا کی پرواز بھی۔ میرے روسی میزبان نے دریافت کرکے بتایا کہ دونوں جہاز کی تمام سیٹیں بک ہوچکی ہیں۔ وہ دن بھر دوڑ دھوپ کرتے رہے، مگر وہ ایروفلاٹ میں میرے لئے ایک سیٹ حاصل نہ کرسکے۔

اس کے بعد میں نے انڈین ایمبیسی کو ٹیلیفون کیا۔ سفیر صاحب موجود نہیں تھے۔ ان کے سکرٹری مسٹر گووندر سے بات ہوئی۔ انھوں نے کہاکہ میں ابھی ایر انڈیا سے معلوم کرکے بتاتا ہوں۔ صرف پانچ منٹ کے بعد دوبارہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ انھوں نے کہاکہ آپ ایر انڈیا کے دفتر میں جاکر مسز سونیا سنگھ سے مل لیں۔ وہ آپ کو سیٹ دے دیں گی۔ مسٹر گووندر نے یہ سیٹ رزرو کوٹا سے دلوائی۔ اسی طرح ایرو فلائٹ میں بھی رزرو کوٹا ہوتا ہے۔ مگر اس کوٹہ سے کسی غیر شخص کے لئے سیٹ حاصل کرنے کا طریقہ اتنا پیچیدہ ہے کہ وہ عملاً ناممکن ہے۔ بعض وجوہ سے میں اس فلائٹ سے سفر نہ کرسکا۔ مگر مذکورہ تقابل سے دونوں ملکوں کے فرق کا اندازہ ہوتا ہے۔

مسٹر گولب ییف (Isaac Golubyev) کے والدین یہودی تھے۔ مگر وہ اپنے کو لامذہب بتاتے ہیں۔ وہ اپنے کو کیمونسٹ نہیں کہتے مگر خوب صورت انداز میں سوشلسٹ سماج کی تعریف کرتے ہیں۔ انھوں نے مجھ کو ماسکو کے کئی علاقے دکھائے۔ دریائے ماسکو کے کنارے مردوں اور عورتوں کی ایک جماعت خوش وخرم کھڑی ہوئی تھی۔ درمیان میں ایک عورت خاص انداز کا سفید کپڑا پہنے ہوئے تھی۔ انھوں نے بتایا کہ یہ دلہن ہے۔ آج ہی ان لوگوں کی شادی ہوئی ہے۔ وہ یہاں خوشی منانے آئے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس شمپین کی بوتلیں تھیں۔ ان کو کھول کر مرد وعورت سب کھڑے ہوئے پی رہے تھے۔

مسٹر گولب ییف نے کہا کہ اب میں آپ کو اپنے گھر لے چلتا ہوں تاکہ آپ دیکھیں کہ ایک روسی کا گھر کیسا ہوتا ہے اور وہ اپنے گھر کے اندر کس طرح رہتا ہے۔ اس کے بعد میں ان کے فلیٹ پر گیا۔ یہ کافی بڑا اور سجا ہوا فلیٹ تھا۔ انھوں نے اپنے باورچی خانہ میں خود بنا کر چائے پلائی کیوں کہ اس وقت وہ گھر میں اکیلے تھے۔

چائے خوش رنگ تھی۔ میں نے اس میں دودھ نہیں ڈالا۔ انھوں نے کہا کہ آپ چائے میں دودھ نہیں ڈال رہے ہیں تو کم از کم ایک چمچہ ہمارا دودھ چکھئے تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ ہمارے یہاں کا دودھ کیسا ہوتا ہے۔ کھانے کی میز پر کاغذی پیکنگ میں دودھ رکھا ہوا تھا۔ اس میں سے انھوں نے ایک چمچہ دودھ نکال کر مجھ کو دیا۔ میں نے کھایا تو دودھ بالکل خالص اور لذیذ معلوم ہوا۔ یہی حال مکھن کا تھا۔

میں نے سوچا کہ ہم ہندستان میں کسی غیر ملکی سے یہی بات نہیں کہہ سکتے۔ ایک شخص جو خود گائے اور بھینس پالے ہوئے ہو وہ تو کہہ سکتا ہے۔ مگر اس کے کہنے کا کوئی اعتبار نہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہاں بازار سے یا ڈیری سے ایک عام شخص کو کیسا دودھ اور کیسا مکھن ملتا ہے۔ ہندستان میں ہم نے سوشلزم اور سرمایہ داری دونوں کو جمع کیا۔ مگر یہاں دونوں کی برائیاں تو جمع ہوئیں مگر دونوں کی خوبیاں جمع نہ ہو سکیں۔

ماسکو سے روسی زبان میں ایک غیر سرکاری ویکلی اخبار نکلتا ہے۔ آرگو منتے ای فاکتے (Arguments and Facts) یہ صرف سیاسی اخبار نہیں بلکہ وہ ہر قسم کے علمی اور سماجی موضوعات کو کور کرتا ہے۔ اس کی موجودہ اشاعت ۳۳ ملین سے زیادہ ہے۔ وہ سارے ملک میں پڑھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اودیف (Gennady P. Avdeyev) نے یہ بات مجھے بتائی تو مجھے بڑا رشک آیا۔ ہندستان میں ہم فخر کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہماری آبادی ۲۰ کروڑ ہے۔ مگر ہندستان میں مسلمانوں کا کوئی ایسا اخبار نہیں جو بڑی تعداد میں چھپتا ہو اور سارے ملک میں تمام مسلمانوں تک پہنچے۔ مسلمان فخر کے میدان میں سب سے آگے ہیں اور عمل کے میدان میں سب سے پیچھے۔

سوویت یونین میں بہت سی زبانیں ہیں۔ اس کا مسئلہ انھوں نے قابل تقلید انداز میں حل کیا ہے۔ سوویت یونین پندرہ ریپبلک پر مشتمل ہے۔ اس میں سے ایک روسی ریپبلک ہے۔ روسی ریپبلک کی فرسٹ زبان روسی زبان ہے جو مرکزی حکومت کی سرکاری زبان ہے۔ بقیہ چودہ ریپبلک میں

ان کی مقامی زبان کو فرسٹ زبان کی حیثیت حاصل ہے اور روسی زبان سیکنڈ لینگویج کی حیثیت سے استعمال ہوتی ہے۔

ایک روسی تعلیم یافتہ شخص سے میں نے سوویت یونین میں مذہب کا حال پوچھا۔ اس نے کہا کہ اشتراکی انقلاب کے بعد مذہب یہاں بطور "عقیدہ" ختم ہوگیا تھا۔ مگر "رسم" کی سطح پر وہ ہمیشہ باقی رہا۔ مثلاً شادی کی رسم، موت کی رسم۔ ان چیزوں میں مذہب پہلے بھی سوویت سوسائٹی میں باقی تھا۔ اب گورباچیف کے زمانہ میں مذہب کو نئی آزادی ملی تو وہ عقیدہ اور عبادت کے اعتبار سے بھی زندہ ہورہا ہے۔

اس سے مذہبی رسوم کی نئی طاقت کا اندازہ ہوا۔ مذہبی رسوم مذہب کے معاملہ میں راکھ میں چنگاری کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ چنگاری راکھ کے ڈھیر میں دبی رہتی ہے۔ اور جب موقع ملتا ہے تو وہ بھڑک کر شعلہ بن جاتی ہے۔

ماسکو میں قیام کے دوران میں نے ہزاروں سوویت باشندوں کو دیکھا۔ وہ مجھے خوش نظر آئے۔ میرے ہوٹل میں روزانہ بہت بڑی تعداد میں مختلف علاقوں کے طلبہ بسوں سے آتے تھے۔ یہ لوگ تعلیمی ٹور کے تحت یہاں بھیجے جاتے ہیں۔ وہ لوگ اکثر ہنستے ہوئے نظر آتے تھے۔ ہوٹل کے ملازمین کا حال بھی یہی تھا۔ میں نے ایک انگریزی داں روسی سے پوچھا۔ اس نے بتایا یہ ایک نیا ظاہرہ ہے۔ یہ لوگ دراصل "پریسترو ئیکا" کی وجہ سے اتنا خوش ہیں کیوں اب وہ اپنے کو آزاد محسوس کرتے ہیں۔

سوویت یونین میں دنیا کے ۱۱۸ ملکوں کے ساتھ اچھے تعلقات کے لئے فرینڈشپ سوسائٹیاں قائم ہیں۔ مثلاً سوویت ۔ سری لنکا فرینڈشپ سوسائٹی۔ اس کے سکریٹری مسٹر گالکن (Alexey V. Galkin) ہیں۔ انھوں نے چار سال لنکا میں رہ کر سنہالی زبان سیکھی اور اس میں مہارت پیدا کی۔ اسی طرح سوویت انڈین فرینڈشپ سوسائٹی۔ اس کے جنرل سکریٹری مسٹر گولب یف (Isaac Golubyev) ہیں۔ انھوں نے ایم اے تک اردو پڑھی۔ اس کے بعد انھوں نے تین سال پاکستان میں گزارے۔ وہ روانی کے ساتھ اردو بولتے ہیں۔ ان دونوں سے میری ملاقاتیں ہوئیں۔ اسی طرح دوسرے تمام ممالک کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے لئے یہاں باضابطہ سوسائٹیاں بنی ہوئی ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ سوویت یونین ایک نظریاتی ریاست ہے۔ مسلمانوں کا کہنا ہے کہ اسلام ایک کامل اور عالمی نظریہ ہے۔ مگر کسی بھی مسلم ملک میں دوسرے ملکوں سے تعلقات کے لئے اس قسم کی سوسائٹیاں قائم نہیں۔ حتیٰ کہ پاکستان میں بھی نہیں جو نصف صدی سے یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ وہ ایک نظریاتی ملک اور نظریاتی ریاست ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مسلم دانشوروں کا نظریاتی دعویٰ محض اظہار فخر کے لئے ہے، وہ سنجیدہ عمل کے لئے نہیں۔

یکم اگست کو ماسکو کی مسجد دیکھی۔ یہاں کے موذن کا نام رئیس بلال (۲۳ سال) ہے اور امام کا نام راوی بن اسماعیل تھا۔ امام اور موذن دونوں کے سر پر گول ٹوپی تھی۔ مگر وہ کوٹ اور پتلون پہنے ہوئے تھے اور ٹائی لگائے ہوئے تھے۔ نماز کے وقت دونوں نے ایک لمبی عبا اپنے اوپر ڈال لی۔ ماسکو میں یہی ایک مسجد ہے۔ مسجد وسط ماسکو میں ہے۔ بہت اچھی بنی ہوئی ہے۔ چوڑی شاہراہ کے عین کنارہ ہے۔ اس کے ساتھ ملا ہوا پارک اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہا ہے۔ مسجد چاروں طرف سے کھلی ہوئی تھی۔ مسجد کے اندر ٹیلیفون وغیرہ کی تمام سہولتیں موجود ہیں۔ وسیع دفتر میں میز اور کرسی کی نشست کا انتظام تھا۔ ماسکو میں ایک اور مسجد ہے جو اس وقت بند ہے۔ یہاں کے مسلمان حکومت سے اس کو کھولنے کی بات چیت کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ وہ بھی جلد کھل جائے گی۔

ماسکو میں مسلمانوں کی تعداد ۲۰۰۰۰ ہے۔ جمعہ کے دن ایک ہزار سے زیادہ آدمی اس مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کرتے ہیں۔ موذن صاحب نے قرآن کا ایک نسخہ دکھایا۔ یہ متن کے بغیر روسی زبان میں قرآن کا کامل ترجمہ تھا۔ اس کے مترجم کا نام کراچکوسکی تھا۔ یہ ایک غیر مسلم روسی ہے۔ مگر وہ عربی زبان کا اچھا عالم تھا۔ اس نے قرآن کا لفظی ترجمہ کیا ہے جس کو حکومت نے شائع کیا ہے۔

امام صاحب کو میں نے "الاسلام یتحدیٰ" بطور ہدیہ پیش کیا۔ وہ اچھی عربی جانتے تھے۔ ان سے گفتگو عربی زبان میں ہوئی۔ وہ کتاب پاکر بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم اس کا ترجمہ روسی زبان اور تاتاری زبان میں کرائیں گے۔ سوویت یونین کے مسلمانوں کی بڑی تعداد تاتاری زبان بولتی ہے۔ یہاں کی مسجد میں میں نے ظہر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی۔

آج یہاں کوئی خاص دن نہیں تھا۔ مگر لوگ مسلسل امام صاحب کے "دفتر" میں آرہے تھے۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بھی بار بار بج رہی تھی۔ سب لوگ بہت "نشیط" دکھائی دے رہے تھے۔

مسجد میں داخل ہوا تو دروازہ کے بائیں طرف دیوار سے ملی ہوئی لمبی الماری تھی۔ اس میں جوتا رکھنے کے لئے بہت سے چھوٹے چھوٹے خانے بنے ہوئے تھے۔ یہ خانے اس طرح سلیقہ سے بنائے گئے تھے کہ وہ مسجد کے دوسرے خوب صورت حصوں کے ساتھ بے جوڑ نہیں معلوم ہوتے تھے۔ اس وقت تقریباً ساٹھ نمازی تھے۔ کسی نے اپنے جوتے کو اتارنے کی جگہ چھوڑ دیا، کسی نے خانہ میں رکھ دیا۔ تمام نمازیوں میں سے کوئی بھی شخص نہ تھا جو جوتے کو اتار کر ہاتھ میں لے اور اس کو سجدہ گاہ کے سامنے رکھ کر نماز ادا کرے۔

نماز سے فارغ ہو کر نکلا تو جوتا اتارنے کی جگہ پر وہ منظر دکھائی نہیں دیا جو دہلی اور دوسرے مقامات کی مسجدوں میں اکثر نظر آتا ہے۔ ایک یا ایک سے زیادہ آدمی حیران و پریشان کھڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان سے پوچھئے کہ آپ کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تو وہ بتائیں گے کہ "یہاں جوتا اتارا تھا، مگر وہ کہیں نظر نہیں آ رہا ہے۔" ہندستان اور پاکستان والوں کو دعویٰ ہے کہ ان کے یہاں سب سے زیادہ اسلام پایا جاتا ہے۔ مگر غالباً ہندستان اور پاکستان ہی وہ ملک ہے جہاں کی مسجدوں میں نمازیوں کے جوتے اٹھا لئے جاتے ہیں۔

وضوخانہ مسجد کے وسیع احاطہ میں باہر کی طرف تھا۔ اس کو "ماڈرن" وضوخانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں خاص انداز کے مقام وضو کے علاوہ صابن، تولیہ، واش بیسن اور کموڈ وغیرہ کا انتظام تھا۔ میرے قریب ایک صاحب بنچ پر بیٹھے ہوئے وضو کر رہے تھے۔ وہ کوٹ پتلون اور ٹائی میں تھے۔ مگر وہ عربی یا انگریزی نہیں جانتے تھے۔ انھوں نے نہایت پرمسرت لہجہ میں ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "حج ... جدہ ... مکہ" پھر چار انگلیوں سے اشارہ کیا۔ اس کا مطلب غالباً یہ تھا کہ میں نے اور میرے خاندان کے چار آدمیوں نے حج کیا ہے۔

آج یہاں دو جنازہ بھی تھا۔ نماز ظہر سے پہلے جنازہ کی نماز پڑھی گئی۔ دونوں نمازوں سے پہلے اور بعد کو امام صاحب نے ذکر و دعا کے کلمات کہے۔ ظہر کی نماز میں کافی آدمی تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آج جنازہ کی وجہ سے بہت سے مرد اور عورتیں یہاں آئی ہوئی تھیں۔ یہاں جو عورتیں نظر آئیں وہ سب اسکرٹ پہنے ہوئے تھیں۔ یہاں مسلم اور غیر مسلم عورتوں کا لباس اتنا ملتا جلتا ہے کہ باہر دیکھ کر بظاہر یہ سمجھا نہیں جا سکتا کہ کون مسلم خاتون ہیں اور کون غیر مسلم خاتون۔

امام اور موذن دونوں کوٹ اور پتلون اور ٹائی پہنے ہوئے تھے۔ مگر نماز کے وقت دونوں نے اوپر سے ایک خاص طرح کی لمبی عبا پہن لی۔ اور سر پر خاص طرح کی پگڑی رکھ لی۔ نمازیوں میں زیادہ تر بوڑھی عمر کے نظر آئے۔ دو صفیں بھری ہوئی تھیں۔ کل تقریباً ۶۰ نمازی تھے۔ مسجد کا نیچے کا حصہ خواتین کے لئے مخصوص ہے۔ گراؤنڈ فلور وسیع ہال کی صورت میں ہے۔ مسجد کے پورے حصہ میں قالین بچھا ہوا ہے۔ سنٹرل ہیٹنگ کا انتظام ہے۔ وغیرہ۔ اوپر کا حصہ بھی نہایت عمدہ اور خوب صورت ہے۔ نماز کے بعد امام صاحب نے میرا تعارف روسی زبان میں کرایا۔ چنانچہ تمام نمازیوں نے آکر مجھ سے مصافحہ کیا اور دعائیں دیں۔

مسجد کے باہر تعمیرات ہو رہی تھیں اور تعمیری مشینیں کھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے سمجھا کہ یہ مسجد سے باہر کوئی چیز بن رہی ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ مسجد کا حصہ ہے اور مسجد کے تحت بن رہا ہے۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ کیوں کہ وہ کافی بڑا تھا اور تعمیر کے بعد اس میں ایک بڑا مدرسہ قائم کیا جاسکتا تھا۔

ماسکو کی جامع مسجد کے امام اور خطیب کا نام راوی بن اسماعیل عین الدین تھا۔ وہ ابھی جوانی کی عمر میں تھے۔ مسجد سے ملا ہوا امام صاحب کا کمرہ جدید طرز کے دفتر کی مانند تھا۔ وہ کافی بڑا تھا۔ نشست میز کرسی پر تھی۔ ان سے میں نے پتہ لکھنے کو کہا تو انھوں نے دو ٹیلیفون نمبر کے ساتھ اپنا یہ پتہ لکھا:

Ravil Gainoutdin, Imam Jama Masjid, Moscow, USSR
Tel: 281-49-04, 281-38-66.

سوویت روس کے موجودہ صدر میخائیل گورباچوف نے دو ایسے کام کئے ہیں جو کسی بھی موجودہ مسلم ملک میں ناقابل تصور ہیں۔ ایک، ساکھ کے سوال کو مکمل طور پر نظر انداز کرکے افغانستان سے روسی فوجیں واپس بلانا۔ دوسرے خود اپنے ملک کے نظام میں وہ تبدیلی لانا جس کو ایک دانشور نے انقلاب کو توڑنے (dismantling a revolution) سے تعبیر کیا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ روسی قوم ایک بے حد جاندار قوم ہے۔ روس کے پاس، امریکہ کے بعد دوسرا سب سے بہتر جغرافیہ ہے۔ مگر پہلی عالمی جنگ کے بعد روسی قوم مسلسل زوال کا شکار ہوتی رہی۔ اسلحہ سازی کے سوا وہ کسی بھی دوسرے میدان میں ترقی نہ کرسکی۔

اس کی دو بڑی وجہیں تھیں۔ ایک مارکسی نظریہ کے تحت عالمی قیادت کا جنون۔ دوسرے

ریاستی اقتصادیات (state economy) کا طریقہ اختیار کرنے کی وجہ سے روسی معیشت میں محرکِ عمل کا ختم ہو جانا۔ گورباچوف اگر اپنی کوششوں میں کامیاب ہوتے ہیں، تو وہ روسی قوم سے ان دونوں کمزوریوں کو دور کر دیں گے۔ اس کے بعد یہ ممکن ہو جائے گا کہ روسی قوم کی امکانی صلاحیت ظاہر ہونا شروع ہو جائے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد پیدا ہونے والے حالات نے روس کو دوسرے سپر پاور کی حیثیت دے دی تھی۔ لیکن گورباچوف کی قیادت میں روس نے امریکہ سے مفاہمت کا جو سلسلہ شروع کیا ہے، اگر وہ کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہا تو تقریباً یقینی ہے کہ مستقبل قریب میں روس اپنی سپر پاور کی حیثیت کھو دے گا۔ روس کو سپر پاور کی حیثیت ہتھیار کی سطح پر حاصل تھی۔ موجودہ معاہدوں کے تحت جب ہتھیار کو غیر موثر بنا دیا جائے گا تو اس کے بعد اصل فیصلہ کن چیز اقتصادی طاقت بن جائے گی۔ اور غیر حربی اقتصادی میدان میں روس، امریکہ اور جاپان سے بہت پیچھے ہے۔ تاہم اس تاریک حال میں اس کے لئے ایک روشن مستقبل کا امکان چھپا ہوا ہے۔

ماسکو کی ایک بے حد چوڑی سڑک تھی۔ دونوں طرف درختوں کی قطاریں دور تک چلی گئی تھیں۔ موسم نہایت خوشگوار تھا۔ ہماری گاڑی اس پر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ یہ ایک خصوصی آرام دہ گاڑی تھی۔ سیٹ کے آگے اتنی زیادہ خالی جگہ تھی کہ آدمی پورا پاؤں نہایت آسانی کے ساتھ پھیلا سکتا تھا۔ میں خاموشی سے سر پکڑے ہوئے اس کے اندر بیٹھا ہوا تھا۔

میرے ساتھی نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا: یہ گاڑی جس میں آپ سفر کر رہے ہیں وہ یہاں بے حد اہم شخصیتوں (VVIPs) کے لئے ہوتی ہے۔ اس وقت ہم لوگ ایک روسی وزیر سے ملنے کے لئے جا رہے تھے۔ میں نے ساتھی کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا: میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ مجھے بہت جلد ماسکو سے دہلی واپس بھیج دیجئے۔

سفر میرے لئے ہمیشہ مصیبت کا باعث ہوتا ہے۔ سفر میں معمولات کا ٹوٹنا میرے لئے اتنا سخت ثابت ہوتا ہے کہ آرام بھی مجھ کو کاٹنے لگتا ہے۔ اور اب بڑھاپے کی عمر کو پہنچنے کے بعد تو یہ کیفیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ حتی کہ اب میں یہ سوچنے لگا ہوں کہ میں اسفار کا سلسلہ بالکل بند کر دوں۔ حالاں کہ ان سطور کے لکھنے کے وقت بھی میرے پاس کئی مقامات کے دعوت نامے موجود

ہیں ـــــ امریکہ ، جاپان ، جرمنی ، انگلینڈ ، اٹلی ، پاکستان ، لیبیا ، وغیرہ

روسی میزبانوں کے سخت اصرار کے باوجود میں نے اپنا سفر مختصر کر دیا اور درمیان سے واپسی کا فیصلہ کیا۔ بالآخر وہ لوگ بھی راضی ہوگئے۔ اب مجھے ۳۱ جولائی کو ہوٹل چھوڑنا تھا۔ صبح کو فجر کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ میری زبان پر یہ الفاظ جاری ہوگئے : یا اللہ مجھے بخش دیجئے۔ آپ کے اس عاجز بندہ کو غیر جہنم بھی برداشت نہیں ، پھر جہنم اس سے کیوں کر برداشت ہوگی۔ ایک ایسا انسان جو راحت کا بھی تحمل نہیں کرسکتا ، وہ عذاب کا تحمل کس طرح کرے گا۔

یکم اگست ۱۹۹۰ کو میں ماسکو ایرپورٹ پر جہاز کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ مختلف سرگرمیوں کے مناظر آنکھوں کے سامنے تھے۔ مختلف ملکوں کے عورت اور مرد آتے جاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اس دوران ایک لطیف تجربہ گزرا۔ دل کے احساس کو رقم کرنے کے لئے آنکھوں نے روشنائی فراہم کی۔ ایک ربانی ارتعاش اندر سے نکل کر فضا میں مرتسم ہوگیا۔

میں نے اپنے بیگ سے قلم اور کاغذ نکالا۔ میں نے چاہا کہ اس ربانی تجربہ کو انسانی الفاظ میں لکھوں۔ مگر پھر میں نے لکھنے کا خیال چھوڑ دیا۔ میں نے سوچا کہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ کثیف حقیقتوں کو سمجھنا بھی ان کے لئے مشکل ہورہا ہے۔ پھر لطیف حقیقتوں کو آخر کون سمجھے گا۔ یہ تو وہ حقیقتیں ہیں جو صرف آنسوؤں سے لکھی جاتی ہیں اور دل کی دھڑکنوں سے پڑھی جاتی ہیں۔ مگر آج انسان کی سطحیت کا یہ عالم ہے کہ اس کے پاس نہ آنکھ کے آنسو ہیں اور نہ دل کی دھڑکنیں۔ پھر کون ہے جو اس کو پڑھے اور کون ہے جس کے لئے اسے لکھا جائے۔

جہاز سازی کی صنعت کو ترقی دینے میں روس کا خاص حصہ رہا ہے۔ مثلاً روس نے پہلی بار کئی انجن والے جہاز (multi-engined plane) بنائے۔ اس کا ڈیزائن سکورسکی (Sikorsky) نے تیار کیا تھا ، اور وہ پہلی بار ۱۹۱۵ میں کامیابی کے ساتھ اڑایا گیا تھا۔ روسی قوم کے اندر غیر معمولی امکانی صلاحیت ہے۔ کمیونزم کے جابرانہ نظام نے اس صلاحیت کے ظہور پر روک لگادی تھی۔ اب امید ہے کہ روسی قوم دوبارہ ترقی کے نئے زینے طے کرسکے گی۔

یکم اگست ۱۹۹۰ کی شام کو ایروفلاٹ کی پرواز نمبر ۵۵۷ کے ذریعہ ماسکو سے دہلی کے

لئے روانگی ہوئی۔

راستہ میں جہاز ایک گھنٹہ کے لئے تاشقند میں رکا۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ میں بھی جہاز سے باہر آگیا اور یہ وقت تاشقند ایرپورٹ پر گزارا۔ ایرپورٹ پر تاشقند کے قدیم آثار کی بہت سی بڑی بڑی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ یہ اپنے طرز تعمیر کے اعتبار سے اسلامی عہد کی معلوم ہوئیں۔ ایک گنبد کی تصویر تھی۔ اس پر نقش و نگار کے انداز میں کچھ عربی کلمات لکھے ہوئے تھے۔ مگر آرٹسٹک خط کو پڑھنے کے معاملہ میں میں بہت کمزور ہوں۔ چنانچہ میں ان کلمات کو پڑھ نہ سکا۔

تاشقند کی زمین ماضی کے ان ایام کو یاد دلاتی ہے جب یہاں مسلمانوں کا دور دورہ تھا۔ تاشقند سوویت یونین کے اس علاقہ میں واقع ہے جس کو سنٹرل ایشیا (وسط ایشیا) کہا جاتا ہے۔

سنڈے ٹائمس (لندن) نے اپنے شمارہ ۱۰ جون ۱۹۹۰ میں لکھا تھا کہ سوویت سنٹرل ایشیا کے جنوبی کنارہ پر واقع تمام مسلم علاقے آزادی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ لوگ سوویت یونین کی کل آبادی کا ۲۰ فی صد حصہ ہیں (خود اس علاقے میں مسلمانوں کی تعداد ۴۰ فی صد ہے) سوویت فوج میں ان کی تعداد ۳۳ فی صد ہے۔ نیشنلزم اور مذہبی بنیاد پرستی کی ایک لہر مسلمانوں کو آزادی کی طرف لے جا رہی ہے۔ وہ کسی نہ کسی دن سوویت اقتدار سے آزادی حاصل کر لیں گے اور بقیہ مسلم دنیا کے ساتھ مل جائیں گے۔

سوویت یونین میں مسلمان زیادہ تر سنٹرل ایشیا کے علاقہ میں رہتے ہیں ازبکستان، تاجکستان، ترکمانستان، کرغیزیہ، قزاقستان۔ سوویت یونین کے مسلمان زیادہ تر سنی ہیں۔ البتہ آذر بائیجان میں شیعہ کی اکثریت ہے جو کہ ایران سے ملا ہوا ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پورے ملک میں ۱۲۰۰ مسجدیں ہیں۔ تاہم یہ اعداد صحیح معلوم نہیں ہوتے۔ بخارا میں الغ بیگ کا مدرسہ ہے۔ یہ مدرسہ ۱۸-۱۴۱۷ میں بنایا گیا تھا۔ وہ وسط ایشیا کا قدیم ترین مدرسہ سمجھا جاتا ہے۔

حکومت سے منظور شدہ بہت سے مسلمانوں کے بورڈ ہیں جو مسلم معاملات کی تنظیم کرتے ہیں۔ مثلاً ایک مسلم بورڈ نے ۱۹۸۹ میں قرآن کے ۵۰ ہزار نسخے چھپوائے۔ اسی طرح ایک بورڈ ایک ماہانہ میگزین (مسلمس آف دی سوویت ایسٹ) شائع کرتا ہے۔ یہ انگلش، فرنچ، عربی، دری، فارسی

میں پچاس ہزار کی تعداد میں چھپتا ہے اور ۸۰ ملکوں میں بھیجا جاتا ہے۔ اب روس اور سعودی عرب میں سفارتی تعلقات بھی قائم ہو گئے ہیں۔

اسی علاقہ میں سمرقند واقع ہے۔ یہاں کے ایک گاؤں خرتنگ میں امام بخاری کی قبر تھی۔ یہاں ۱۹۱۷ کے انقلاب کے بعد مسلمانوں کی کوششوں سے دوبارہ نئی تعمیر کی گئی ہے۔ اور اب یہاں ایک باقاعدہ مقبرہ ہے اور اسی کے ساتھ ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ زائرین کثیر تعداد میں یہاں آتے ہیں۔ (اس صفحہ کے نیچے امام بخاری کے مقبرہ کی موجودہ تصویر دی جارہی ہے)

سوویت یونین کی پندرہ ریاستوں میں سے ایک وہ ہے جس کا نام (Tadzhikistan) (تاجکستان) ہے۔ اس کی راجدھانی دوشنبے (Dushanbe) ہے۔ یہاں مسلمانوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ وہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ انھیں آزاد کیا جائے اور تاجکستان کا سرکاری مذہب اسلام قرار دیا جائے۔

نیویارک کے ہفت روزہ نیوز ویک نے اپنے نمائندہ ڈیوڈ ریکمین کی ایک رپورٹ شائع

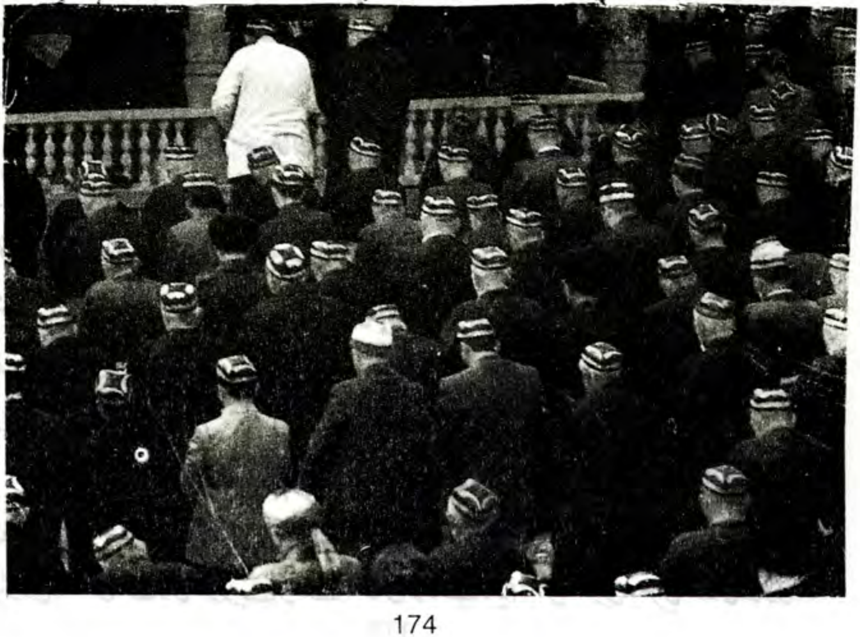

کی ہے۔اس رپورٹ میں بتایا گیاہے کہ دوشنبے میں کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے دفتر کے سامنے دس ہزار مسلمانوں نے جمع ہوکر احتجاج کیا۔مظاہرہ کے دوران اچانک ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ مظاہرین میں سے کچھ مسلم نوجوانوں نے ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں کے پاس کھڑے ہوئے روسی فوجیوں سے کہاکہ آپ لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جائیں۔

روسی فوجی اس "حکم" پرحیران ہوئے۔تاہم کچھ دیر کے بعد وہ سڑک پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد ڈاڑھی رکھے ہوئے ایک بزرگ مسلمان نکلے۔ انھوں نے ایک فوجی گاڑی کے اوپر کھڑے ہوکر اذان دی۔ اس کے بعد تمام مظاہرین صف باندھ کر کھڑے ہوگئے اور باجماعت نماز ادا کی۔ روسی فوج کے لوگ انھیں اچنبھے کے ساتھ دیکھتے رہے۔

نیوز ویک کے رپورٹر کے مطابق، تاجکستان میں مسلمانوں کی تعداد روس کی دوسری ریاستوں میں بسنے والے مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ وہ سب سے زیادہ مذہبی بھی ہیں۔ پچھلے کمیونسٹ دور میں ان کے مذہبی جذبہ کو دبانے کی کوشش کی گئی۔حتیٰ کہ ظاہری طورپر دیکھنے والوں کے لئے وہ ختم بھی ہوگیا۔ لیکن موجودہ روسی حکمراں مسٹر گورباچوف کی اصلاحات کے بعد اچانک یہاں اسلام دوبارہ ظاہر ہوگیا ہے۔ روس میں پانچ کروڑ مسلمان ہیں۔چوں کہ سرکاری طورپر اس قسم کی معلومات چھاپی نہیں جاتی تھیں، اس لئے خود روسیوں کو اس واقعہ کا علم پہلی بار ہوا ہے۔

تاجکستان میں تقریباً ۳۰۰ نئی مسجدیں بن گئی ہیں۔ فیکٹریوں، سڑکوں اور جیل وغیرہ میں نماز پڑھنے کی اجازت مل گئی ہے۔ اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ جو اسلام پسند مسلم ملکوں میں حکمرانوں کے خلاف مہم چلا رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان "سیکولر" حکمرانوں کو مٹانا ضروری ہے۔ ورنہ یہاں سے اسلام کا خاتمہ ہوجائے گا۔ ایسے لوگوں کو روس کے واقعہ سے سبق لینا چاہئے۔ جب کمیونسٹ حکومت کے شدید ترین سلوک کے باوجود اسلام روس میں ختم نہ ہوسکا تو وہ مصر، پاکستان شام، اردن جیسے ملکوں سے کیوں کر ختم ہوجائے گا۔

حال ہی میں افریقہ (سینیگال) گیا تھا، اس کے بعد روس کا سفر ہوا۔ دونوں کے درمیان ایک عجیب فرق تھا۔ افریقہ میں سب کے سب لوگ سیاہ فام دکھائی دیتے تھے، یہاں سب کے سب لوگ سفید فام نظر آتے ہیں۔

یہ فرق اللہ تعالیٰ نے "تعارف" کے لئے رکھا ہے نہ کہ "امتیاز" کے لئے۔ یہ صورت حال در اصل انسان کے حالتِ امتحان میں ہونے کا ایک جزء ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ بیشتر انسان اس امتحان میں ناکام ہو گئے۔ سفید فام لوگوں نے رنگ کی بنا پر اپنے کو مخصوص نسل سمجھ لیا۔ اس کے جواب میں سیاہ فام نسل میں ردعمل پیدا ہوا۔ انھوں نے کہا کہ سیاہ بہتر ہے (Black is good) حتی کہ انھوں نے کہا کہ خدا بھی سیاہ ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

ماسکو میں بہت بڑے بڑے پارک ہیں۔ مثلاً فرینڈشپ پارک اتنا بڑا ہے کہ ایک منظم جنگل معلوم ہوتا ہے۔ اس کے اندر رابندر ناتھ ٹیگور کا اسٹیچو ہے۔ اس کے علاوہ ماسکو میں گاندھی، نہرو، اور اندرا کے اسٹیچو بھی ہیں۔ یہ ایک علامت ہے جس سے ہند اور روس کے درمیان گہرے تعلقات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۲ اگست ۱۹۹۰ کی صبح کو دوبارہ میں دہلی کے اسی ایئرپورٹ پر اتر گیا جہاں سے میں اس سفر پر روانہ ہوا تھا۔ انسان جہاں سے آیا ہے، وہیں اس کو دوبارہ لوٹ کر جانا ہے۔ دنیا کے سفر میں ہر روز انسان کو اس حقیقت کا تجربہ کرایا جا رہا ہے۔ مگر مسافروں کی بھیڑ میں شاید کوئی بھی مسافر ایسا نہیں جو اس ابتدائی تجربہ میں اس کے انتہائی سبق کو پا رہا ہو۔ ہر آدمی واقعہ کے "نصف اول" کا ماہر بنا ہوا ہے، واقعہ کے "نصف ثانی" کی خبر کسی کو نہیں۔

واپس آتے ہوئے اخبار میں ایک رپورٹ پڑھی۔ اس کا عنوان تھا ——— ایک نیا سوویت روس ابھر رہا ہے:

A new USSR is emerging

اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ خمسینات میں سوویت یونین نے ساری دنیا کو حیرانی میں ڈال دیا جب کہ اس نے اپنا اسپٹنک زمین کے مدار میں داخل کر دیا۔ اس طرح اس نے فوجی طاقت میں امریکہ کی برابری (strategic parity) حاصل کر لی۔ روایتی ہتھیاروں کے اوپر اس کو واضح برتری حاصل ہو گئی۔ مگر یہ حیثیت اس کو ایک بے حد مہنگی قیمت پر ملی۔ فوجی برتری حاصل کرنے کی کوشش میں اس نے اپنی اقتصادیات کو برباد کر لیا۔ چنانچہ سوویت یونین اب ۷۰ سالہ اشتراکی لبادہ کو اتار رہا ہے اور عام جمہوری انداز پر اپنی اقتصادیات کی نئی تنظیم کرنا چاہتا ہے۔

اگر آپ ایک ملین ڈالر خرچ کرکے بید کی ایک چھڑی حاصل کریں تو یہ پانا نہیں ہوگا۔ وہ کھونے کی بدترین شکل ہوگی۔ کوئی بڑا اقدام صرف اس وقت بڑا ہے جب کہ وہ نتیجہ خیز بھی ہو۔ جو اقدام بظاہر بڑا ہو مگر نتیجہ کے اعتبار سے وہ چھوٹا ہو، وہ اقدام نہیں بلکہ خودکشی کی چھلانگ ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

روس نے ایک غلط اقدام کیا مگر ، سال بعد وہ غلطی کا اعتراف کرکے اس سے لوٹ آیا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی قیادت ،، اسال سے ایک کے بعد ایک غلط اقدام کر رہی ہے، مگر اب تک اسے غلطی کے اعتراف کی توفیق نہ ہوسکی۔ کیسے عجیب ہوں گے وہ اصحاب ایمان جو اصحاب الحاد سے بھی کم اعتراف کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

ایک سفر

جغرافی اعتبار سے کرۂ ارض کو دو نصف حصہ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک مشرقی نصف حصہ (Eastern Hemisphere) اور دوسرا مغربی نصف حصہ (Western Hemisphere) پہلے نصف میں یورپ، ایشیا، افریقہ، آسٹریلیا شامل ہیں۔ دوسرے نصف میں امریکہ اور بحر الکاہل (Pacific ocean) واقع ہیں۔

پچھلے ۲۰ سال کے دوران مجھے بار بار بیرونی دنیا کے سفر پیش آئے ہیں۔ مگر میرے اب تک کے تمام سفر مشرقی نصف کرہ میں ہوئے ہیں۔ مغربی نصف کرہ میں سفر کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ موجودہ سفر اسی مغربی نصف کرہ ارض میں ہوا۔ یعنی دہلی سے ٹوکیو، اور ٹوکیو سے لاس انجلیز۔ اور پھر اسی راستہ سے دہلی کے لئے واپسی۔ اس طرح اب میرے اسفار میں پورا کرۂ ارض طے ہوگیا۔ یہ انسان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کیسا عجیب معاملہ ہے کہ وہ فضا کی بلندیوں میں اڑتے ہوئے پورے کرۂ ارض کا احاطہ کرلیتا ہے، بغیر اس کے کہ کوئی پہاڑ یا کوئی سمندر اس کی راہ میں حائل ہوا ہو۔

امریکی حکومت ویزا دینے کے بارہ میں بہت فراخ دل ہے۔ میرے سفر کے سلسلہ میں ایک مہینہ کے ویزا کی درخواست دی گئی تھی۔ مگر نئی دہلی کے امریکی سفارت خانہ نے بطور خود ایک سال کا ملٹی پل ویزا (Multiple visa) دے دیا۔ ۱۹۸۹ میں نئی دہلی کے امریکی سفارت خانہ نے ۵۸۵۰۰ ویزا جاری کئے تھے۔

مگر اسی کے ساتھ بے اصولی کرنے والوں کے لئے امریکی انتظامیہ بے حد سخت بھی ہے۔ جو لوگ ویزا کے لئے غلط قسم کے کاغذات پیش کریں۔ ان پر ساری عمر کے لئے امریکہ میں داخلہ بند کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً بعض لوگ اسٹوڈنٹ ویزا پر امریکہ گئے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے غیر قانونی طور پر کام کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح کے واقعات کی بنا پر یہ قاعدہ بنایا گیا ہے کہ جو شخص ویزا کی درخواست میں غلط اندراج کرے یا فرضی ڈاکومنٹ پیش کرے، اس کو ساری زندگی کبھی امریکہ میں داخلہ کا ویزا نہ دیا جائے (ہندستان ٹائمس ۱۳ جون ۱۹۹۰)

۱۸ اور ۱۹ نومبر ۱۹۹۰ کی درمیانی رات کو ۱۲ بجے گھر سے ایرپورٹ کے لئے روانہ ہوا۔ راستہ

یں دو جگہ ٹرکوں کی لمبی لائن لگی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ آجکل ڈیزل کی سپلائی کم کر دی گئی ہے۔ نیزرات کو صرف چند پٹرول پمپ کھلے ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ لمبی لائن ہے۔ ہر لائن میں سو کے قریب ٹرک کھڑے ہوئے نظر آئے۔ میں نے سوچا کہ یہاں ٹرک ہے۔ انجن لگی ہوئی گاڑی ہے۔ ڈرائیور بھی اس کے اندر بیٹھا ہوا ہے۔ غرض ہر چیز موجود ہے، صرف ایک چیز "ایندھن" نہیں ہے، اس کی وجہ سے تمام گاڑیاں کھڑی ہو گئیں۔ ایک "ٹرک" ایندھن کے بغیر نہیں چل سکتا۔ پھر اتنی بڑی کائنات کس طرح ایندھن کے بغیر ۳۰ بلین سال سے چل رہی ہے۔ آدمی اگر اس پر سوچے تو اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔

دہلی سے جاپان ایئرلائنز کی فلائٹ ۴۹۲ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں پڑھنے کے لئے ایئر کمپنی کا میگزین ونڈس (Winds) موجود تھا۔ میں فلائٹ میگزین بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ مگر اس میں کوئی خاص چیز میرے پڑھنے کے لئے نہ تھی۔ تین سو صفحہ کا یہ رنگین چھپا ہوا میگزین زیادہ تر اشتہارات سے بھرا ہوا تھا۔ چند معمولی قسم کے مضمون تھے۔ مثلاً ایک مضمون جاپان کی رسلنگ پر تھا۔ ایک مضمون کا عنوان تھا:

A day in the life of a salary man.

جاپان مکمل طور پر ایک تجارتی ملک ہے۔ دنیا کو دینے کے لئے اس کے پاس بہترین صنعتی چیزیں ہیں۔ مگر علمی اور فکری ذوق رکھنے والوں کے لئے اس کے پاس کچھ نہیں۔

اشتہارات کے لئے بڑی پرکشش زبان استعمال کی گئی تھی۔ مثلاً کار بنانے والی ایک کمپنی کا اشتہار تھا۔ کار کی ایک خوب صورت تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا — تہذیب کے راستہ پر (on the road to civilization) ایک اشتہار میں ٹیلیویژن بنا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ تعارفی الفاظ لکھنے کے بعد یہ جملہ درج تھا کہ ٹکنالوجی انسانیت کو فائدہ پہنچانے کے لئے:

Technology for the benefit of mankind

میں نے سوچا کہ ایک مصلح بھی وہی زبان بولتا ہے جو ایک تاجر بولتا ہے۔ مگر دونوں میں ایک فرق ہے۔ تاجر کا اصل مقصد تجارت ہے۔ مگر وہ شخصی الفاظ نہ بول کر عمومی انسانی الفاظ بولتا ہے۔ مگر مصلح جو لفظ بولتا ہے وہی

اس کا اصل مقصد بھی ہوتا ہے۔ گویا تاجر کی شخصیت میں ثنویت ہوتی ہے اور مصلح کی شخصیت میں وحدت۔

قدیم زمانہ میں دو قسم کی سواریاں رائج تھیں۔ ایک بری اور دوسرے بحری۔ موجودہ زمانہ میں تیسری سواری وجود میں آئی ہے جو باعتبار نوعیت ابتدائی دونوں قسم کی سواریوں سے یکسر مختلف ہے۔ یہ ہوائی سواری ہے۔ آج ہوائی سواری اس سے بھی زیادہ عام ہے جتنا قدیم زمانہ میں بری یا بحری سواری عام تھی۔ قدیم سواریوں میں تکمیل سفر کے بعد آدمی "اندر سے باہر" آتا تھا۔ جدید سواری میں وہ "اوپر سے نیچے" اترتا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اولاد آدم ایک دوسرے کی دشمن ہوگی۔ یہ دشمنی (عداوت) ایک اخلاقی برائی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہی دشمنی (یا کامپٹیشن) دنیا کی تمام ترقیوں کا واحد سب سے بڑا ذریعہ ثابت ہوئی۔ ابتدائی قسم کا ہوائی جہاز سب سے پہلے دو شخصوں نے ۱۷ دسمبر ۱۹۰۳ کو اڑایا تھا۔ مگر اس فن کی ترقی صرف اس وقت شروع ہوئی جب کہ فرانس اور جرمنی نے اس میں جنگی افادیت (war potential) کو محسوس کیا۔ ان دونوں ملکوں نے اس "فلائنگ مشین" کو ترقی دینا شروع کیا۔ تاکہ وہ بوقت جنگ اس کو استعمال کر سکیں۔ اگست ۱۹۱۴ میں پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی تو فرانس نے تقریباً دو ہزار ہوائی جہاز تیار کر لئے تھے اور جرمنی کے پاس ایک ہزار جنگی جہاز تھے۔ ہوائی جہاز کی صنعت نے ابتداءً جنگ کی برکت سے ترقی کی۔ ۱۹۱۹ میں جب پہلی باقاعدہ کمرشیل فلائٹ کا آغاز ہوا تو وہ بھی زیادہ تر استعماری عزائم کے تحت تھا ـــــ جنگ پسندوں نے ابتداءً ہوائی جہاز کو ترقی دی، اس کے بعد امن پسندوں کو بھی اس کا ایک حصہ مل گیا۔

رابرٹ رنسی (Robert Runcie) ۱۹۲۱ میں پیدا ہوئے۔ وہ کیتھولک چرچ میں آرک بشپ آف کینٹربری کے منصب پر رہیں۔ سفر کی بابت انھوں نے ایک دلچسپ بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ قرون وسطیٰ میں لوگ مذہب کے لئے سفر کرتے تھے۔ جب کہ آج وہ اس لئے سفر کرتے ہیں کہ سفر ان کا مذہب ہے:

In the middie ages people were tourists because of their religion, whereas now they are tourists because tourism is their religion.

ہماری پہلی منزل بینکاک تھی جو تھائی لینڈ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ یہاں ایئر پورٹ پر تقریباً

ایک گھنٹہ گزرا۔ ایئرپورٹ بہت صاف ستھرا اور منظم تھا۔ ٹائیلٹ سے لے کر باہر کے مقامات تک کہیں کوئی تنکا یا دھبہ نظر نہیں آیا۔

طالب علمی کے زمانہ میں مجھے ڈاک ٹکٹ جمع کرنے کا شوق تھا، مجھے ایک ٹکٹ ملا جس پر سیام لکھا ہوا تھا۔ یہ غالباً ۱۹۳۹ کی بات ہے۔ اس وقت جو ملک "سیام" کہا جاتا تھا، اس کا موجودہ نام تھائی لینڈ ہے۔ پچاس برس پہلے یہ ٹکٹ صرف کاغذی ٹکڑے کی حیثیت رکھتا تھا۔ آج وہ ٹکٹ اگر موجود ہو تو وہ نہایت قیمتی شمار ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پچاس برس پہلے وہ صرف ڈاک کا ایک ٹکٹ تھا، مگر آج وہ تاریخ کی ایک دستاویز بن چکا ہے۔

تھائی لینڈ کی راجدھانی بینکاک ہے۔ بینکاک کی آبادی پچاس لاکھ سے زیادہ ہے۔ یہی شہر تھائی لینڈ کی تمام سیاسی اور تمدنی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ چنانچہ تھائی لینڈ کے تمام روزنامے بینکاک سے نکلتے ہیں۔ اسی طرح یہاں کے بیشتر ہفت روزہ اور ماہنامہ پرچے بھی۔ یہ پرچے تھائی، انگلش اور چینی زبانوں میں ہوتے ہیں۔

جہاز بینکاک سے ٹوکیو کے لئے روانہ ہوا تو راستہ میں پڑھنے کے لئے تھائی لینڈ کا انگریزی اخبار نیشن (The Nation) تھا۔ اس کے شمارہ ۱۹ نومبر ۱۹۹۰ کا مطالعہ کیا۔ ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ برما کی فوجی حکومت نے مخالف برمی طلبہ کی داروگیر کی تو ۲۰۰۰ طلبہ وہاں سے بھاگ کر تھائی لینڈ آگئے ان میں سے تقریباً ۸۰۰ طلبہ اقوام متحدہ کے ادارہ مہاجرین: (UNHCR)

United Nations High Commissioner for Refugees

کے تحت رجسٹرڈ ہیں، ان کو ادارہ کی طرف سے پناہ گزیں کے طور پر ماہانہ الاؤنس ملتا ہے۔ مگر تھائی لینڈ کی حکومت ان برمی طلبہ کے خلاف ہوگئی ہے۔ حکومت کا کہنا ہے کہ بار بار کی تنبیہ کے باوجود یہ لوگ پرامن قیام پر راضی نہیں۔ وہ تھائی لینڈ کو بیس بناکر برمی حکومت کے خلاف سرگرمیوں (anti-Rangoon political activity) میں مصروف ہیں۔ تھائی لینڈ میں مقیم برمی طلبہ دو جہازوں کو ہائی جیک کر چکے ہیں ایک اکتوبر ۱۹۹۰ میں دوسرا نومبر ۱۹۹۰ میں۔ انھوں نے کہا:

> They had made the move to publicize
> the Burmese people's struggle to democracy.

برمی طلبہ کی تنظیم (All Burma Students Democratic Front) کے لیڈر نے کہاکہ ہماری تنظیم کا کوئی تعلق ہائی جیکنگ کے اس قابل مذمت واقعہ سے نہیں ہے۔ وہ ہمارے کچھ برے افراد (few bad individuals) نے کیا تھا۔ اسی قسم کے جواب ہندستان میں مسلمانوں کے نام نہاد لیڈر بھی دیتے ہیں۔ مگر یہ جواب ان کے لئے عذر نہیں۔ کیوں کہ "برے افراد" کا ہاتھ پکڑنے کی ذمہ داری سب سے پہلے ان کی قوم پر آتی ہے۔ جب کوئی قوم اپنے برے افراد کے ہاتھ نہ پکڑے تو خدائی قانون کے مطابق اُن افراد کی برائی کی قیمت پوری قوم کو بھگتنی پڑے گی۔

ایک امریکی جرنلسٹ ملے۔ ان سے خلیج کے بحران کی بابت گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہاکہ سفارتی ذرائع سے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش مشکل ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر جنگ ہو تو اس میں بہت سی جانیں ضائع ہوں گی اور اس سے امریکہ کے مفادات کو نقصان پہنچے گا:

A diplomatic solution may be messy, but fighting would cost too many lives and damage America's interests.

اس جواب سے امریکی ذہن کا اندازہ ہوتا ہے۔ خلیج کا مسئلہ ۲ اگست ۱۹۹۰ کو پیدا ہوا۔ امریکی فوجیں اس کے فوراً بعد خلیج میں پہنچ گئیں۔ وہ جدید ترین سامان جنگ کے ساتھ عراق اور کویت کی سرحدوں پر موجود ہیں۔ مگر اب تک امریکہ نے کوئی جنگی اقدام نہیں کیا۔ کیوں کہ ان کا مذہب "انٹرسٹ" ہے، اور انٹرسٹ کے نقطۂ نظر سے جنگی کارروائی کا فائدہ مشتبہ نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی مسلم ملک اتنی بڑی طاقت کے ساتھ وہاں موجود ہوتا تو اب تک جنگ کا آغاز اور اختتام دونوں ہو چکا ہوتا۔ خواہ اس کے نتیجہ میں "شہیدوں" کی لاشوں کے سوا اور کوئی چیز مسلم دنیا کے حصہ میں نہ آئے۔ (۱۹ نومبر ۱۹۹۰)

ایک اور امریکی جرنلسٹ سے گفتگو ہوئی۔ وہ ہندستان کے سیاسی حالات سے واقف تھا۔ اس نے کہاکہ آپ کے ملک میں منڈل کمیشن اور رام جنم بھومی کے مسائل پیش آئے۔ آپ کے سابق وزیر اعظم مسٹر وی پی سنگھ لوگوں کو مطمئن نہ کر سکے۔ چنانچہ پارلیمنٹ میں انھیں عدم اعتماد کی تحریک کا سامنا کرنا پڑا جس میں انھیں ۳۴۶ کے مقابلہ میں صرف ۱۴۲ ووٹ ملے۔ انھوں نے ۷ نومبر کو اپنا استعفا صدر کے پاس بھیج دیا۔ امریکہ کے لوگوں میں بھی صدر بش کے خلاف ناراضگی (resentment)

ہے۔ مگر ہمارے صدر جارج بش خوش قسمت ہیں کہ وہ وزیر اعظم نہیں۔ اگر وہ وزیر اعظم ہوتے تو یقیناً آج انھیں بھی عدم اعتماد کی تحریک کا سامنا کرنا پڑتا:

Mr Bush is lucky that he is not a Prime Minister – he would surely have been facing a non-confidence motion.

اس سے ہندستان اور امریکہ کے نظام حکومت کے فرق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہندستان میں وزیر اعظم اور صدر حکومت کا عہدہ الگ الگ ہے۔ امریکہ میں یہ دونوں عہدے ایک شخص کی ذات میں جمع ہوتے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ امریکی صدر دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور انسان ہوتا ہے۔

۱۹ نومبر کو دوپہر سے کچھ پہلے ٹوکیو پہنچا۔ یہاں جہاز بدلنا تھا، اس لئے چند گھنٹے ٹوکیو ایئر پورٹ پر گزرے۔ یہاں میں نے ایئر پورٹ کے ایک شخص سے "ٹوائلٹ" کے بارہ میں پوچھا۔ وہ غالباً انگریزی نہیں جانتا تھا، وہ مجھے بتائے بغیر آگے چلا گیا۔ اتنے میں ایک صاحب میرے قریب آئے۔ انھوں نے اردو میں بولتے ہوئے کہا کہ کیا آپ کو ٹوائلٹ جانا ہے۔ آئیے میں آپ کو لے چلتا ہوں۔ ہم ایک سیڑھی سے نیچے اترے تو وہاں نہایت صاف ستھرا ٹوائلٹ موجود تھا۔

میں نے فراغت کے بعد وضو کیا۔ باہر نکلا تو مذکورہ صاحب دوبارہ ملے۔ انھوں نے بتایا کہ میرا نام محمد راشد ہے۔ میں دہلی میں رہتا ہوں اور اکسپورٹ کا کام کرتا ہوں۔ کئی بار جاپان آچکا ہوں۔ ٹوکیو میں ایک اردو داں کو پاکر خوشی ہوئی۔ میں نے کہا کہ مجھے نماز پڑھنا ہے۔ یہاں قبلہ کی سمت معلوم کرنا بے حد مشکل ہے۔ اندازہ کرکے ایک طرف پڑھ لیتا ہوں۔ انھوں نے فوراً اپنے بیگ سے ایک "قبلہ نما" اور ایک کتابچہ نکالا۔ اور اندازہ کرکے بتایا کہ یہ قبلہ کا رخ ہے۔ چنانچہ میں نے اس کے مطابق ایئر پورٹ پر نماز ادا کی۔

میں نے سوچا کہ یہ بھی کیسی عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کے لئے ایک مرکزی رخ مقرر کیا اور اسی کے ساتھ دنیا میں ایسے ذرائع پیدا کر دئے کہ دنیا کے کسی بھی گوشہ میں اور کسی بھی مقام پر اس مرکزی رخ کو بالکل ٹھیک ٹھیک معلوم کیا جا سکے۔ اتنے اعلیٰ اجتماعی انتظام کے بعد بھی اگر مسلمان متحد نہ ہوں تو یہ سادہ طور پر محض ایک کوتاہی نہیں ہے بلکہ یہ خداوند عالم کی ناقدری ہے۔

ٹوکیو ایئر پورٹ پر اور جاپانی جہاز میں بہت سے تجربات ہوئے جن کا ذکر میں سفرنامہ کے آخر میں کروں گا۔

ٹوکیو سے لاس اینجلز کے لئے جاپان ایئر لائنز کی فلائٹ نمبر ۶۲ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ یہ دس گھنٹہ کی مسلسل پرواز تھی جو پوری کی پوری بحر الکاہل کے اوپر طے ہوئی۔ کرۂ ارض کا تقریباً ۱۷ فی صد حصہ سمندروں سے گھرا ہوا ہے۔ ان میں سب سے بڑا سمندر بحر الکاہل (Pacific Ocean) ہے۔ متصل سمندروں کو چھوڑتے ہوئے صرف بحر الکاہل تمام سمندروں کا ۴۵ فیصد حصہ ہے۔ اس کی اوسط گہرائی ۱۲۹۲۵ فٹ ہے۔ ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک اس کا فاصلہ تقریباً گیارہ ہزار میل ہے۔

اس عظیم سمندر کے مقابلے میں تمام انسانوں کی مجموعی تعداد ایک چیونٹی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ مگر یہی انسان اس کے اوپر فاتحانہ پرواز کرتے ہوئے ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچتا ہے۔ انسان کے اوپر اللہ تعالیٰ کا یہ کیسا عجیب احسان ہے۔ میں نے نیچے سمندر کی لہروں کو دیکھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ لہریں کہہ رہی ہوں کہ اے انسان، ان احسانات کو سوچ کر تیرے اندر شکر خداوندی کا سیلاب امنڈ پڑنا چاہئے۔ مگر دنیا میں شاید ہی کوئی انسان ہو جس نے سمندر کی ان بیتاب لہروں میں اس کے ربانی پیغام کو سنا ہو۔

میں ہمیشہ صرف ایک ہینڈ بیگ کے ساتھ سفر کرتا ہوں۔ مگر اس بار میرے ساتھ کتابوں کے دو بڑے بنڈل تھے جس کی فرمائش امریکہ کی ایک تنظیم کی طرف سے کی گئی تھی۔ ۱۹ نومبر کی شام کو میں لاس اینجلز کے ہوائی اڈہ پر اترا تو سب سے پہلے مجھے ان دونوں بنڈلوں کو حاصل کرنا تھا۔ ایک جگہ ہوائی اڈہ کی مخصوص گاڑیاں کھڑی تھیں جن پر سامان رکھ کر لوگ باہر لے جاتے ہیں۔ میں نے ایک گاڑی لینا چاہا تو وہ ایک راڈ سے چپکی ہوئی نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ اس کا کرایہ ایک ڈالر ادا کرنا ہے۔ میں نے ایک مخصوص مشین کے اندر ایک ڈالر کا نوٹ ڈالا۔ اس کے بعد گاڑی اپنے آپ چھوٹ کر باہر آگئی۔ جس دنیا میں اس طرح فی الفور نتائج نکلتے ہوں وہاں موت کے بعد نکلنے والے نتائج پر یقین کرنا کتنا مشکل کام ہے۔

کتابوں کا بنڈل لے کر ایئر پورٹ کے بیرونی گیٹ پر آیا تو وہاں جناب ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی موجود تھے۔ وہ اسلامک سوسائٹی آف آرنج کاونٹی کے ڈائرکٹر ہیں اور بڑی عجیب خوبیوں کے آدمی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس قسم کے ادارہ کے لئے آئیڈیل ڈائرکٹر ہیں۔ ان کے ساتھ بذریعہ روڈ گارڈن گروو پہنچا جہاں مجھے قیام کرنا تھا۔

ایک شخص جو لاس اینجلیز کے شاندار ہوائی اڈہ پر اترے اور اس کے بعد پر رونق سڑکوں

پرسفر کرتا ہوا اپنی منزل کی طرف روانہ ہو، وہ مشکل سے یہ سوچ سکتا ہے کہ اس خوب صورت دنیا میں کچھ سیاہ دھبے بھی ہیں۔ مگر واقعہ یہی ہے۔

ایک رپورٹ (ٹائم ۱۸ جون ۱۹۹۰) کے مطابق، لاس اینجلز میں ماں باپ سے باغی یا بچھڑے ہوئے لڑکے بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ ان کے ۵۰۰ سے زیادہ گینگ ہیں جن سے تقریباً ۸ ہزار لڑکے وابستہ ہیں۔ ان لوگوں کے پاس پستول اور بندوق جیسے ہتھیار ہوتے ہیں۔ وہ قتل اور چوری اور منشیات جیسے جرائم میں مبتلا رہتے ہیں۔

ٹائم میگزین کے رپورٹر نے ایک پندرہ سالہ لڑکے سے پوچھا کہ تم نے فلاں آدمی کو کیوں قتل کیا۔ اس نے کہا کہ وہ ایک دشمن تھا۔ وہ دشمن کیوں تھا، لڑکا اس کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس نے کہا کہ مجھے اس قسم کے فعل پر کوئی ندامت نہیں۔ وقتی طور پر کچھ احساس ابھرتا ہے، اس کو ختم کرنے کے لئے میں قتل سے پہلے شراب پی لیتا ہوں (صفحہ ۲۰)

ٹائم نے اپنی تین صفحہ کی باتصویر رپورٹ ان الفاظ پر ختم کی ہے کہ لاس اینجلیز کے اندرون شہر کے یہ نوجوان، زمین کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ سماج کے بیچ میں رہتے ہیں۔ وہ مصیبت زدگی اور محرومی کا جواب قدیم قبائل کی بھونڈی نقل کی طرف واپسی کے ذریعہ دے رہے ہیں:

> ...while inner-city youth of Los Angles, at the center of the most advanced society of earth, respond to adversity and deprivation by regressing to a primitive parody of tribes (p. 22).

امریکہ کے لئے میرا موجودہ سفر ایسے وقت میں ہوا جب کہ امریکی فوجیں اگست ۱۹۹۰ سے خلیج میں عراق کا محاصرہ کئے ہوئے ہیں۔ قدرتی طور پر آجکل یہاں کے اخبارات میں سب سے زیادہ اسی کا چرچا ہوتا ہے۔ ایک اخبار میں اس موضوع پر مفصل مضمون تھا۔ اس کے چند حصے یہ ہیں:

صدام حسین ایک غیر فوجی آدمی ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ امریکہ خلیج سے نو ہزار میل کی دوری پر ہے۔ اس کی فوجوں کو یہاں پہنچنے میں کئی دن لگ جائیں گے۔ وہ امریکہ کی مدد پہنچنے سے پہلے کویت اور سعودی عرب دونوں کو زیر کرنے میں کامیاب ہو چکے ہوں گے۔ مگر عراق کے اقدام کے بعد امریکہ نے انتہائی سرعت کے ساتھ ایک لاکھ سے زیادہ فوجیوں کو خلیج میں پہنچا کر تمام دنیا کو حیران کر دیا۔ امریکہ نے

نہ صرف عراق کو گھیر لیا ہے بلکہ اس کے خلاف کارروائی کے لئے اپنے ہدف مقرر کرلئے ہیں۔ امریکہ کا ببار ۵۲ وہ فوجی طیارہ ہے جو چالیس ٹن وزنی بم اٹھا سکتا ہے۔ ایسے ۳۰ طیارے عراق کی تمام اہم تنصیبات کو چند گھنٹوں کے اندر تباہ کر سکتے ہیں۔ یہ ویت نام نہیں جہاں غیر موافق جغرافیہ کی وجہ سے امریکہ کو ہدف نہیں ملتا تھا۔ یہ تو صحرا ہے جہاں ہدف خود طیارے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔

صدام حسین کو معلوم ہو چکا ہے کہ امریکہ کے پاس اتنی طاقت ہے کہ وہ ان کے طیاروں اور میزائلوں کو فضا میں ابھرنے سے پہلے ہی تباہ کر سکتا ہے۔ اسی لئے انھوں نے امریکہ کے "آپریشن ڈیزرٹ شیلڈ" کا مقابلہ "آپریشن ہیومن شیلڈ" سے کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ فیصلہ صرف صدام حسین کی انتہائی بےبسی کو ظاہر کرتا ہے۔ (ٹائم میگزین ۳۱ دسمبر ۱۹۹۰ کے بیان کے مطابق، یکم فروری ۱۹۹۱ تک امریکی فوجیں چار لاکھ تیس ہزار کی تعداد میں خلیج میں پہنچ چکی ہوں گی)

امریکہ کو دریافت کرنے والے کی حیثیت سے کولمبس کو زیادہ شہرت حاصل ہے۔ مگر امریکہ کا نام کولمبس کے نام پر نہیں۔ اس کا نام اٹلی کے ایک تاجر امریگو (Amerigo Vespucci) کے نام پر ہے۔ امریگو کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ وہ ۱۴۹۷ میں امریکہ پہنچا تھا۔ جب کہ کولمبس اس سے کئی سال پہلے امریکہ کے ساحل پر اتر چکا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کولمبس کی دریافت کے باوجود امریکہ کو ایشیا ہی کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔ امریگو کی مہم نے یہ ثابت کر دیا کہ امریکہ ایک علیحدہ براعظم ہے:

He established that the newly discovered lands West of the Atlantic were not a part of Asia but constituted a separate land mass (19/97).

کولمبس کا نام مشہور رہے مگر امریکہ اس کے نام پر نہیں۔ امریگو کا نام مشہور نہیں مگر امریکہ کو اسی کی نسبت سے امریکہ کہا جاتا ہے۔ ایک کی ذات نے شہرت پائی اور دوسرے کے کام نے۔

امریکہ کا نقشہ آپ سامنے رکھیں تو آپ پائیں گے کہ اس میں ریاستوں کی حدبندی بالکل حسابی انداز میں سیدھی لکیروں کی صورت میں کی گئی ہے۔ نقشہ کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ امریکہ ایک ترقی یافتہ ملک ہے۔

اس کے برعکس ہندستان کا نقشہ دیکھئے۔ اس میں ریاستی سرحدوں کی تقسیم ٹیڑھی میڑھی (zig zag) صورت میں نظر آئے گی۔ ہندستان کے کچھ اہل علم کی رائے ہے کہ اس معاملہ میں انڈیا کے

نقشہ کو جدید معیار پر لایا جائے۔ مثال کے طور پر ٹائمس آف انڈیا (۲۳ جون ۱۹۹۰) میں مسٹر پردیپ شنائے (Pradeep Shenoy) کا مضمون چھپا تھا۔ انھوں نے ہندستان میں ریاستوں کا نقشہ امریکی انداز میں مقرر کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ ان کا مجوزہ نقشہ نیچے درج کیا جاتا ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے کانگرس پارٹی نے عوام کو اپنے ساتھ لینے کے لئے جو وعدے کئے ان میں سے ایک یہ تھا کہ ریاستوں کی تقسیم لسانی بنیاد پر کی جائے۔ یہ خالص مصلحت پرستانہ سیاست تھی۔ اس کی قیمت ہندستان کو یہ دینی پڑی کہ آزادی کے بعد لسانی ریاستوں کا مطالبہ نہایت شدت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ نہرو اب اس کے موافق نہ تھے۔ مگر انھوں نے محسوس کیا کہ اگر ہم نے اس مطالبہ کو نہ مانا تو کانگرس کے لئے ریاستوں میں الکشن جیتنا مشکل ہو جائے گا۔ دو بارہ مصلحت پرستانہ سیاست کے تحت ملک کی تقسیم زبان کی بنیاد پر کر دی گئی۔

امریکہ میں قیام کے دوران میں زیادہ تر جناب صغیر اسلم صاحب کے ساتھ رہا۔ ان کو میں نے الرسالہ کا ایک مضمون یاد دلایا۔ میں نے کہا کہ میں آپ کے ساتھ اس طرح رہنا چاہتا ہوں کہ میں آپ کے لئے کسی بھی اعتبار سے مسئلہ نہ بنوں بلکہ کامل طور پر "مسٹر نو پرابلم" بن کر رہوں۔ مثلاً کھانے میں آپ میرے

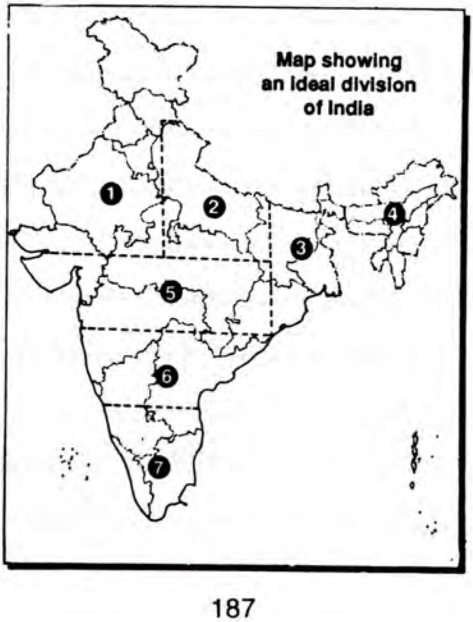

لئے کسی بھی قسم کا کوئی اہتمام نہ کریں۔ جو کچھ آپ روزمرہ کھاتے تھے، بس وہی مجھ کو کھلائیں۔ ان کی اہلیہ خوش قسمتی سے نہایت سادہ مزاج کی ہیں، اس لئے اس شرط پر عمل کرنے میں کوئی زحمت پیش نہیں آئی۔

صغیر اسلم صاحب کے ساتھ لمبی مدت تک رہ کر مجھے اندازہ ہوا کہ ان کے مزاج میں اور میرے مزاج میں بہت زیادہ مطابقت ہے۔ یہاں کے لوگوں میں وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک منفرد انسان نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ایک روز کہا :

After t After the Almighty God made me, He threw the mould away.

میں نے کہا کہ اس میں اتنی تبدیلی کر لیجئے کہ اس مولڈ سے اللہ تعالیٰ نے دو انسان بنائے۔ ایک آپ کو اور دوسرے مجھ کو۔ آپ اس مولڈ کا (finished product) (fin ہیں اور میں اس مولڈ کا (unfinished product) ہوں۔

یہاں پہلے دن میں ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی کے ساتھ ٹھہرا تھا۔ اس کے بعد آخر وقت تک میرا قیام جناب صغیر اسلم صاحب کے یہاں رہا۔ یہ دونوں صاحبان بہت زیادہ میرے ہم مذاق ہیں۔ ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ نہایت سنجیدہ اور متواضع انسان ہیں۔ ان سے گفتگو کر کے بہت خوشی ہوتی ہے۔ وہ یہاں اسلامک سوسائٹی کے ڈائرکٹر ہیں۔ اسی کے ساتھ اپنے گھر پر بھی انھوں نے اسلامی ماحول بنا رکھا ہے۔ وہ اس بات کی ایک مثال ہیں کہ کس طرح آدمی ہر ماحول کے اندر اپنا ماحول بنا سکتا ہے۔ ایک صاحب جو "اسلامی حکومت" قائم کرنے کے علمبردار ہیں، انھوں نے ڈاکٹر صاحب پر نقد کرتے ہوئے کہا کہ آپ اتنے دنوں سے امریکہ میں ہیں۔ آپ نے یہاں کیا کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا : آپ میرے کام کو میرے معیار سے جانچئے نہ کہ اپنے بنائے ہوئے معیار سے۔ میں نے تو الحمد للہ بہت کچھ کیا ہے۔ یہ آپ کو بتانا ہے کہ آپ اتنے دنوں سے اسلامی حکومت کی تحریک چلا رہے ہیں۔ آپ نے کیا کیا۔

صغیر اسلم صاحب بزنس کرتے ہیں۔ وہ بہت خوبیوں کے آدمی ہیں۔ ان کا ایک اصول مجھے بہت پسند آیا۔ اس کو میں اپنے لفظوں میں "چلو یہ بھی ٹھیک ہے، پرنسپل" کہتا ہوں۔ جب بھی کسی سے کوئی اختلافی بات پیدا ہو تو فوراً وہ یہ کہہ کر بات کو وہیں ختم کر دیتے ہیں کہ "چلو یہ بھی ٹھیک ہے"۔ یہ اصول وہی ہے جس کو اعراض کہا جاتا ہے۔

اتوار کی صبح کو میں اور صغیر اسلم صاحب فجر کی نماز پڑھ کر مسجد سے واپس آئے تو ان کے مکان کے گیٹ پر اخباروں کا ایک بڑا بنڈل پڑا ہوا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ کیسا اخبار ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک اخبار ہے۔ اتوار کو خاص طور پر وہ لوگ بہت زیادہ صفحات شامل کرتے ہیں۔ پھر انھوں نے لطیفہ سنایا کہ میرے بھائی وطن سے آئے۔ صبح کو اسی طرح انھوں نے اخبار کا بنڈل دیکھا تو کہنے لگے: غلطی سے وہ سارے محلہ کا اخبار یہیں چھوڑ گیا۔

ایک سفید فام امریکی نے بتایا کہ وہ ایک جاب کے سلسلے میں کچھ دنوں مصر میں رہا ہے۔ اس نے کہا کہ وہاں مسلمانوں کو مجھے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مجھ کو اسلام کا طریقہ بہت اچھا لگا۔" اسلام کی کون سی بات آپ کو اچھی لگی"۔ اس سوال کے جواب میں اس نے کہا کہ وہاں میں نے دیکھا کہ مسلمان اپنے والدین کو عزت کے ساتھ اَبی (میرے باپ) اور اُمّی (میری ماں) کہتے ہیں۔ ہم لوگ امریکہ میں اپنے والدین کو عام آدمیوں کی طرح صرف ان کے نام سے پکارتے ہیں۔ مجھ کو امریکی طریقہ کے مقابلہ میں اسلام کا طریقہ زیادہ پسند ہے۔

امریکہ میں آزادانہ تہذیب کے نتیجہ میں وہ رشتہ بالکل ٹوٹ گیا ہے جو فطری طور پر والدین کے ساتھ اولاد کا ہوتا ہے۔ انسان اب بھی اپنی سابقہ فطرت پر پیدا ہو رہے ہیں، مگر عملی ماحول فطرت کی اس آواز کے مطابق نہیں۔ اس طرح فطرت اور معاشرتی ماحول کے درمیان عدم مطابقت پیدا ہوگئی ہے۔ انسان اپنے آپ کو ایک مصنوعی قید میں محسوس کرنے لگا ہے۔ ایسی حالت میں اسلام کی دعوت کے زبردست مواقع پیدا ہوگئے ہیں۔ مگر یہ مواقع اسلام کی دعوت کو روحانی انداز میں پیش کرنے کے لئے ہیں نہ کہ اسلام کی دعوت کو سیاسی انداز میں پیش کرنے کے لئے۔

۲۱ جون ۱۹۹۰ کو شمالی ایران میں جو زلزلہ آیا تھا اس کا مرکز دیلم تھا، مگر اس کے ہلکے جھٹکے سوویت یونین کے اندر آذر بائیجان تک محسوس کئے گئے۔ اس زلزلہ میں تقریباً ۶۰ ہزار آدمی مرگئے۔ اور اس سے کئی گنا زیادہ تعداد میں زخمی ہوئے۔ اس طرح کے زلزلوں میں موت کا زیادہ بڑا سبب مکانوں کا گرنا ہوتا ہے۔ اگر مکانات نہ گریں تو بہت کم موتیں واقع ہوں۔ امریکہ میں بھی زلزلے آتے ہیں۔ مگر یہاں اتنا زیادہ جانی نقصان نہیں ہوتا جتنا ایران اور روس میں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

یہاں مکانات بالکل دوسرے اندازسے بنائے جاتے ہیں۔

ارضیاتی سائنس میں غیر معمولی ترقیوں کے باوجود، زلزلہ کی پیشین گوئی ابھی تک ایک مایوس کن شعبۂ علم (Frustrating Science) کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے اس کا امکان نہیں کہ لوگوں کو زلزلہ کی آمد کی پیشگی اطلاع دے دی جائے اور لوگ گھروں سے باہر نکل آئیں۔ البتہ ایک چیز بڑی حد تک ممکن ہے، اور وہ ہے مکانات کو اس طرح بنانا کہ وہ زلزلہ کے جھٹکے کو سہ لیں اور گرنے سے بچ جائیں۔

اس مقصد کے لئے موجودہ زمانہ میں ارتھ کوئیک انجنیرنگ وجود میں آئی ہے۔ اس کے مطابق اب ترقی یافتہ ملکوں میں ایسے مکانات بنائے جاتے ہیں جن کا ڈھانچہ (Floating foundations) (فلوٹنگ فاؤنڈیشن) کے اصول پر بنایا جاتا ہے۔ زلزلہ کے جھٹکے آتے ہیں تو یہ مکانات زیادہ تر ہلتے ہیں، وہ گرتے نہیں پڑتے۔

امریکہ میں سان فرانسسکو بھی اسی طرح زلزلہ کا علاقہ ہے جس طرح ایران کا شمالی حصہ زلزلہ کا علاقہ ہے۔ ۱۹۸۹ میں سان فرانسسکو میں تقریباً اسی شدت کا زلزلہ آیا جیسا کہ ایران کا مذکورہ زلزلہ تھا، مگر سان فرانسسکو کے اس زلزلہ میں صرف ۲۰۵ موتیں ہوئیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ سان فرانسسکو کے مکانات جدید ٹکنیک کے مطابق بنائے گئے ہیں۔

ایران کے زلزلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک اخبار نے لکھا تھا کہ ایران ایک زلزلہ والے علاقہ میں واقع ہے۔ اس کو چاہئے کہ وہ اپنے تیل کی دولت کا ایک حصہ خطرہ والے مقامات پر زلزلہ روک مکانات کی تعمیر پر لگائے جو فطرت کے غضب کا شکار ہوتے رہتے ہیں:

> Iran, sitting on a veritable seismic volcano, must divert part of its oil-rich economy to building quake-resistant structures at places which have been subjected to nature's fury.

ایران کا نام نہاد اسلامی انقلاب امریکہ سے نفرت کی بنیاد پر آیا۔ ایران کی طاقت کا سب سے بڑا حصہ یہ ثابت کرنے پر صرف ہو رہا ہے کہ امریکہ شیطان اکبر ہے، ایسی حالت میں اگر وہ امریکہ سے کوئی مفید سبق نہ لے سکا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کا

حال عام طور پر یہی ہے۔ موجودہ زمانہ کا مسلمان اقوامِ غیر کی نفرت میں جیتا ہے، اس لئے وہ ان سے تعمیری سبق نہیں لے پاتا۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ اصلاً ہندستانی ہیں، مگر عرصہ سے امریکہ میں رہ رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیوں آپ نے انڈیا کو چھوڑ کر امریکہ میں رہنا پسند کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہاں پیس (امن) ہے، جبکہ انڈیا میں پیس نہیں۔

میں نے کہا کہ بات یوں نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ آپ لوگ امریکہ میں پیس کی قیمت ادا کر رہے ہیں، اس لئے یہاں آپ لوگوں کو پیس حاصل ہے۔ انڈیا میں آپ پیس کی قیمت دینے کے لئے تیار نہیں، اس لئے وہاں آپ کو پیس بھی حاصل نہیں۔

انھوں نے کہا کہ اس کا کیا مطلب۔ میں نے ان کو منارہ (The Minaret) کا شمارہ (Fall 1989) دکھایا۔ یہ امریکہ کا ایک اسلامک میگزین ہے جو لاس اینجلیز سے شائع ہوتا ہے۔ مذکورہ شمارہ میں ایک مسلمان کا انٹرویو چھپا ہے۔ وہ کیلی فورنیا کے اسلامک سنٹر کے ترجمان ہیں۔ نیز امریکہ کی مسلم پبلک افیرس کے اکزیکیٹو ڈائرکٹر ہیں۔ انٹرویو کا ایک سوال و جواب یہ تھا:

Q. What about cases of discrimination and violence against Muslims during the decade?

A. Such incidents multiplied in the 80's. Mosques were the target of vandalism. Muslim leaders were attacked verbally and physically. People like Ismail Farooqi and Yusuf Bilal were killed. In a pluralistic society where several interest groups work to outdo each other, these kinds of brutal acts are not uncommon. What was sad was that the Muslim community did not pursue these cases vigorously. Farooqi is almost forgotten. So is Bilal.

سوال : پچھلے دہے میں امریکی مسلمانوں کے خلاف امتیاز اور تشدد کی حالت کیسی رہی۔

جواب : اس دہے کے دوران ہر قسم کے واقعات میں اضافہ ہوا۔ امریکہ میں مسجدیں غارت گری کا نشانہ بنیں۔ وہاں مسلم رہنماؤں پر زبانی اور جسمانی حملے کئے گئے۔ اسمائیل فاروقی اور یوسف بلال جیسے لوگوں کو قتل کر دیا گیا۔ مشترک سماج جس میں مفادات رکھنے والے گروہ ایک دوسرے کے خلاف سرگرم ہوں، وہاں اس قسم کے وحشیانہ واقعات غیر معمولی نہیں ہیں۔ مگر جو بات رنج کی ہے وہ یہ کہ یہاں کے مسلمانوں نے ان کے لئے زوردار طور پر کچھ نہیں کیا۔ فاروقی کو تقریباً بھلا دیا گیا ہے، اور اسی طرح بلال کو بھی۔

میں نے کہا کہ اس قسم کے واقعات انڈیا میں ہوتے ہیں تو وہاں کے مسلمان ان کے خلاف جلسے جلوس کے ہنگامے کھڑے کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں کش مکش بڑھتی ہے جو عمومی فساد تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کے برعکس امریکہ کے مسلمان، ان واقعات کو نظرانداز کرتے ہیں، اس لئے یہاں عمومی فساد کی نوبت نہیں آتی۔

اشالی ورما ایک ہندستانی نوجوان ہیں۔ وہ پچھلے ایک سال سے امریکہ میں رہتے ہیں۔ ہندستان میں انھوں نے انگلش اسکول میں تعلیم پائی۔ انگریزی لٹریچر کا کثرت سے مطالعہ کیا۔ اب وہ کافی اچھی انگریزی بولتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ امریکی ان کی باتیں سن کر کہتے ہیں کہ تم تو ابھی ایک سال سے امریکہ میں ہو اور تم اتنی اچھی انگریزی بول رہے ہو:

You've only been here a year and you speak English so well!

انھوں نے کہا کہ عام امریکی بیرونی دنیا کے بارہ میں بہت کم جانتا ہے۔ مجھے یہ جان کر سخت دھکا لگا کہ اگرچہ ہم امریکہ کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ مگر خود امریکی بقیہ دنیا کے بارہ میں کچھ نہیں جانتے:

It came as a shock to me that, though we knew everything about America, the Americans knew next to nothing about the rest of the world.

امریکیوں کا یہی حال اسلام کے بارہ میں ہے۔ عام امریکی اسلام کے بارہ میں کچھ نہیں جانتا۔ ایک امریکی نے گفتگو کے دوران کہا کہ ہم نے اسلام کے بارہ میں پہلی بار اس وقت جانا جب ہم نے سنا کہ ایران میں اسلامک ریولیوشن آگیا ہے اور وہاں کی اسلامی گورنمنٹ نے امریکی سفارت خانہ میں کام کرنے والے امریکیوں کو یرغمال (hostage) بنالیا ہے، اور جو لوگ ان کے مخالف ہیں ان کو پکڑ پکڑ کر انھیں گولی ماری جارہی ہے۔

مسلمانوں کو یہ شکایت ہے کہ مغربی میڈیا مسلم دنیا کے صرف برے واقعات کو نمایاں کرتا ہے۔ مگر یہ شکایت بالکل بے معنی ہے کیوں کہ موجودہ دنیا میں ہمیشہ یہی ہوگا۔ خود مسلمانوں کے اخبار اور رسالے اور کتابوں میں مغربی دنیا کے صرف برے واقعات کو بیان کیا جاتا ہے۔ پھر ایسی شکایت سے کیا فائدہ۔

اس مسئلہ کا حل شکایت نہیں۔ اس کا حل صرف دو میں سے ایک ہے۔ یا تو مسلمان ایک

عالمی میڈیا پیدا کریں اور اس کو اتنا ترقی یافتہ بنائیں کہ دوسری قومیں اس کو دیکھنے اور پڑھنے پر مجبور ہوجائیں۔ اور اگر مسلمان ایسا نہیں کرسکتے تو دوسری ممکن صورت یہ ہے کہ وہ ان واقعات سے آخری حد تک اپنے آپ کو بچائیں جن کو مغربی میڈیا "دہشت گردی" کا عنوان دے کر اپنے یہاں پیش کرتا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور صورت اس بد نامی سے بچنے کی نہیں ہوسکتی۔

امریکہ میں حال ہی میں ایک کتاب جاپان کے بارہ میں چھپی ہے۔ اس کے مصنف ۵۰ سالہ امریکی عالم معاشیات پیٹ کوٹ ہیں اور اس کا نام ہے اثر ورسوخ کے ایجنٹ :

Pat Choate, *Agents of Influence.*

اس کتاب پر دو صفحہ کا تبصرہ امریکی جریدہ ٹائم (۸ اکتوبر ۱۹۹۰) میں چھپا ہے۔ اس تبصرہ کا عنوان ہے ـــــ کیا واشنگٹن جاپان کی جیب میں ہے :

Is Washington in Japan's Pocket?

یہ ایک معلوماتی کتاب ہے۔ اس میں بہت سے اعداد و شمار جمع کئے گئے ہیں۔ اور یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ امریکہ میں جاپان کی تجارتی کامیابی کا خاص راز جاپان کی تجارتی لابی ہے۔ جاپان کی تجارتی کمپنیاں امریکہ کے بڑے بڑے سابق افسراُن کو بھاری قیمت دے کر خرید لیتی ہیں اور ان کے ذریعہ امریکہ میں اپنے تجارتی مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس سلسلہ میں بتایا گیا ہے کہ جاپان تقریباً ایک سو ملین ڈالر (\$ 100 million) سالانہ خرچ کرتا ہے۔ حتیٰ کہ امریکہ کے سابق صدر رونالڈ ریگن کو جاپان بلایا گیا تاکہ وہ وہاں لکچر دیں۔ اس کے لئے ریگن کو ۲ ملین ڈالر ادا کئے گئے۔

اس قسم کے اعداد و شمار بظاہر صحیح ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ ایک مبالغہ آمیز بات ہے کہ صرف اس چیز کو جاپان کی اقتصادی کامیابی کا سبب بتایا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جاپان کے اندر اگر ذاتی صلاحیت نہ ہوتی تو محض "لابی" کی تدبیر اختیار کر کے وہ کبھی کامیابی کا مقام حاصل نہیں کرسکتا تھا۔

امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں کی بیشتر تعداد وہ ہے جس کی دلچسپیوں کا مرکز صرف "ڈالر" ہے۔ تاہم ایک تعداد وہ ہے جو اسلام کے بارے میں لکھتی اور بولتی ہے۔ ان لوگوں سے آپ بات کریں تو وہ متفقہ طور پر کہیں گے کہ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن امریکہ ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح ہمارے بزرگ رہنما ۱۹۴۷ سے پہلے یہ کہا کرتے تھے کہ برطانیہ اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

میں دونوں ہی گروہوں کو نادان سمجھتا ہوں۔ یہ ایک سطحی طرز فکر ہے کہ کسی شخص یا کسی قوم کو نامزد کرکے کہا جائے کہ بس یہ اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ تاہم دونوں گروہوں میں ایک فرق ہے۔ ماضی کے بزرگوں نے جس برطانیہ کو اسلام کا دشمن سمجھا، اس سے انھوں نے مکمل طور پر قطع تعلق کرلیا، مگر حال کے اسلام پسند جس امریکہ کو دشمن بتاتے ہیں وہ اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو ڈالر کے عوض عین اسی دشمن کے ہاتھ فروخت کئے ہوئے ہیں۔

ہماری قیادت کا دوسرا طبقہ وہ تھا جس نے "ہندو دشمن" سے بچنے کے لئے پاکستان بنایا مگر جب پاکستان بن گیا تو معلوم ہوا کہ ترقی کے تمام اعلیٰ ذرائع باہر کے "اسلام دشمن" ملکوں میں ہیں۔ چنانچہ پاکستان بننے کے بعد وہاں کے تمام بہترین دماغ مملکت خداداد سے نکل کر امریکہ جیسے ملکوں میں پہنچ گئے۔ آج پاکستان کے پاس اپنی قوم کا صرف "بھس" ہے۔ اس کا "گندم" تقریباً سب کا سب امریکہ کی سرزمین میں اتر چکا ہے اور اسی طرح دوسرے مغربی ملکوں میں۔

امریکی آدمی اگر آپ کو کسی پارک میں، ہوائی جہاز میں، ایرپورٹ پر یا اور کسی مقام پر ملے تو بظاہر وہ آپ سے بالکل غیر متعلق دکھائی دے گا۔ لیکن اگر آپ اس سے کہیں کہ "معاف کیجئے، کیا میں آپ سے ایک بات پوچھ سکتا ہوں" تو وہ فوراً آپ کی طرف متوجہ ہوجائے گا اور پوری دلچسپی کے ساتھ آپ کے سوال کا جواب دے گا۔

ایک امریکی سے میں نے پوچھا کہ کیا امریکی لوگوں کا کیس کھوئی ہوئی روح (Lost souls) کا کیس ہے۔ وہ ہنسا۔ اس نے کہا کہ مشرق کے لوگ ہمارے بارہ میں ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقۃً ایسا نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ مگر حال میں نیو واشنگٹن پوسٹ نے اے بی سی (ABC) کے ذریعہ جو اوپی نین پول کرایا ہے، اس کی رپورٹ بتاتی ہے کہ امریکہ اس وقت بڑے پیمانہ پر ایک قومی مایوسی (national pessimism) میں مبتلا ہے۔ اس پول کے مطابق، ستر فی صد، یعنی ہر پانچ میں سے چار امریکی یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا ملک غلط راستہ پر چلا گیا ہے:

> Seventy per cent, or four out of five Americans,
> feels that their country has gone off on the wrong track.

یہ سن کر وہ دیر تک چپ رہا۔ پھر سنجیدگی کے ساتھ بولا کہ ــــــــ اس مادی دنیا میں خوشی ہمیشہ

ایک نہ ملنے والی چیز بنی رہے گی۔ مگر اس کی تلاش کی خوشی بھی بہت قیمتی ہے جس میں آدمی ساری عمر لگا رہے۔ اکثر امریکیوں کا یہی خیال ہے:

Happiness must ultimately remain an elusive commodity in this mortal world but the pleasures of its pursuit are well worth spending a lifetime on. Most Americans seem to believe this.

یہ مجبوری بھی کیسی عجیب ہے کہ آدمی خوشی کو تلاش کرنے پر مجبور ہو مگر وہ خوشی کو کبھی پا نہ سکے۔

۳۰ نومبر کو صغیر اسلم صاحب کے گھر والے نہیں تھے۔ دوپہر کو انھوں نے خود کھانے کا انتظام کیا۔ جدید طرز کے باورچی خانہ میں کھانے کی میز کے سامنے بیٹھ گیا۔ انھوں نے فریج سے سالن نکال کر اس کو پلیٹ میں رکھا اور اس کو گرم کرنے کے لئے مائکروویو اوون (microwave Oven) کے خانہ میں ڈال کر بند کر دیا۔ اس کے بعد ۶۰ سکنڈ پر ایڈجسٹ کرکے اس کا سوئچ دبا دیا۔ اب اوون کے اوپر روشن حروف میں الٹا شمار (کاونٹ ڈاؤن) ہونے لگا۔ ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، اس طرح ایک ایک سکنڈ گھٹتا رہا۔ یہاں تک کہ زیرو پر پہنچ کر خاص آواز میں ایک سیٹی بجی اور پھر وہاں روشن حروف میں ختم (end) لکھا اٹھا۔

میں نے کہا کہ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انتہائی قطعیت کے ساتھ دنیا کی عمر مقرر کرکے اس کا سوئچ دبا دیا ہے۔ اب ہر لمحہ اس کا ؤنٹ ڈاؤن ہو رہا ہے۔ جیسے ہی یہ کاونٹ ڈاؤن اپنی آخری گنتی پر پہنچے گا فوراً صور کا خدائی بگل بج جائے گا۔ یہ موجودہ دنیا کے خاتمہ کا اعلان ہوگا۔ اس کے بعد آخرت کی دنیا شروع ہوگی۔ اور پھر خدا کے وفادار بندے کامیاب قرار دئے جائیں گے اور جن لوگوں نے سرکشی کی وہ ناکامیوں کے غار میں دھکیل دئے جائیں گے تاکہ ابد تک اس میں حسرت والم کے ساتھ پڑے رہیں۔

صغیر اسلم صاحب (پیدائش ۱۹۵۱) اس بات کی مثال ہیں کہ ایک شخص اپنے کردار سے اغیار کی نظر میں بھی کتنا زیادہ قابل قدر بن سکتا ہے۔ یہاں میں نے صغیر اسلم صاحب کی ایک فائل دیکھی۔ اس سے ایک بڑی سبق آموز بات معلوم ہوئی۔ اس کا خلاصہ یہاں درج کرتا ہوں۔

امریکہ میں کپڑے کی ایک بہت بڑی ریٹیل کمپنی ہے۔ اس کے بہت سے اسٹور ہیں۔ اس کا نام مروین (Mervyn) ہے۔ اس کو ملک میں پھیلے ہوئے اپنے اسٹوروں کو کپڑا فراہم کرنے کے لئے بڑے پیمانہ

پر کپڑے کی خریداری کرنی پڑتی ہے۔ یہ خریداری امریکہ کے علاوہ بہت سے باہر کے ملکوں سے بھی ہوتی ہے۔ اس کام کے لئے اس کمپنی کو ایک بائر (Fabric Buyer) درکار تھا۔ مروین نے لائق آدمی کی تلاش کے لئے کیلی فورنیا کے ایک بڑے کنسلٹنٹ (Jack H. Lane Agency) کو ہائر کیا۔

اس کمپنی نے ملک بھر میں تحقیق کر کے معلوم کیا کہ کون شخص ہے جو اس کام کے لئے موزوں ہے۔ اس کو معلوم ہوا کہ صغیر اسلم صاحب اس کام کے لئے موزوں ترین آدمی ہیں۔ اس کے بعد اس نے ان کمپنیوں کے پتے معلوم کئے جن سے صغیر اسلم کا اپنے کپڑے کی بزنس کے سلسلہ میں بار بار سابقہ پیش آتا ہے۔ جیک لین نے ان کمپنیوں سے ربط قائم کر کے ان کی رائے صغیر اسلم صاحب کے بارہ میں معلوم کی۔ ان کے جوابات کی فوٹو کاپی صغیر اسلم صاحب کو بھیجتے ہوئے جیک لین نے صغیر اسلم صاحب کو یہ پیش کش کی کہ وہ مروین کمپنی کے اس عہدہ کو قبول کر لیں۔ امریکی تاجروں نے صغیر اسلم صاحب کے بارہ میں جو رائیں دیں، ان میں سے چودہ رایوں کو میں نے پڑھا۔ چند خطوط کے بعض الفاظ یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

1. One of the most astute buyers. Integrity without question. Works hard and intelligently. Far above average. Well organized. World recommend him 101%.
2. Aslam is the Number one buyer in the country.
3. He is knowledgeable, well informed and most important – uncorruptible.
4. He is fair and honest. He gets the last drop of blood for his company.
5. If he says something, you can believe him.
6. Never in my experience in the agency business have I had references that were as outstanding as the ones I received on you.

آخری ریمارک جیک لین کا ہے جس نے مختلف لوگوں سے رائیں طلب کی تھیں ـــــ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک شخص اگر لیاقت کا ثبوت دے تو وہ کس طرح ہر ملک اور ہر قوم میں اپنے لئے اعلیٰ مقام حاصل کر سکتا ہے۔ لائق آدمی کے لئے اس دنیا میں کوئی بھی دروازہ بند نہیں۔

نومبر کے آخری دو جمعہ کی نمازیں اسلامک سوسائٹی آرنج کاونٹی کی مسجد میں پڑھیں۔ میں وہاں پہنچا

تو لوگ منتشر نظر آرہے تھے۔ اذان ہوتے ہی تمام لوگ باقاعدہ صف کی صورت میں جمع ہوگئے۔ اس طرح صف بندی کے ساتھ انھوں نے سنتیں پڑھیں۔ خطبہ کے بعد جب جماعت کھڑی ہوئی تو ہر آدمی اپنی اپنی جگہ کھڑا ہوگیا اور کسی انتشار کے بغیر اپنے آپ صفیں قائم ہوگئیں۔ صف بندی کا یہ طریقہ مجھے پسند آیا۔

دونوں جمعہ میں ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی صاحب (پیدائش ۱۹۴۳) نے انگریزی میں خطبہ دیا۔ یہاں جمعہ کی امامت انھیں سے متعلق ہے۔ مزاج اور علمی لیاقت دونوں اعتبار سے وہ اس عہدہ کے لئے نہایت موزوں ہیں۔ پہلے خطبہ میں انھوں نے آخرت کی جواب دہی کے موضوع پر تقریر کی۔ دوسرے جمعہ کے خطبہ میں ان کی تقریر کا موضوع توحید تھا۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمان کے نزدیک سب سے زیادہ قابل لحاظ چیز صرف اللہ ہے:

The ultimate concern of a Muslim is Allah.

صفی قریشی صاحب نہایت ذہین اور اسی کے ساتھ نہایت سنجیدہ آدمی ہیں۔ ان سے گفتگو کرنا میرے جیسے آدمی کے لئے ایک نہایت خوشگوار تجربہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ نہ زیادہ بولتے اور نہ غیر ضروری بات کرتے ہیں۔ ان کی گفتگو ہمیشہ منطقی حدود کی پابند ہوتی ہے۔ اور ایسے آدمی ہمیشہ بہت کم پائے جاتے ہیں۔

صفی قریشی صاحب نے ایک ملاقات میں ایک انگریزی کتاب کا تذکرہ کیا۔ انھوں کہا کہ میں اس کتاب کو پڑھ کر بہت متاثر ہوا، اور اس کتاب کے کئی نسخے خرید کر میں نے مختلف لوگوں کو بطور تحفہ دیا:

Islam and the Destiny of Man, by Gai Eaton George Allen & Unwin, London 1985, pp-242

میں نے اس کتاب سے دلچسپی ظاہر کی تو انھوں نے اس کا ایک نسخہ مجھے بھی دیا۔ گائی ایٹن ایک انگریز ہیں۔ وہ برٹش ڈپلومیٹک سروس میں تھے۔ اس سلسلہ میں وہ دوسرے ملکوں کے علاوہ مصر اور ہندستان میں بھی رہے ہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ (T.S. Eliot) کی فرمائش پر انھوں نے ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کا موضوع یہ تھا:

Eastern religions and their influence upon Western Thinkers.

اس کتاب کے مطالعہ کے دوران وہ اسلام سے متاثر ہوئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۱ میں انھوں نے مصر میں اسلام قبول کر لیا۔

اس کتاب کو میں نے دیکھا۔ میں اس کے تمام مندرجات سے اتفاق نہیں کرسکتا۔ تاہم کتاب میں ایک نیا پن ہے اور وہ قابل مطالعہ ہے۔ مصنف کے نزدیک، اسلام کا خلاصہ دو چیزیں ہیں: حق اور رحمت (Truth and Mercy) تقوی کی تشریح انھوں نے ان الفاظ میں کی ہے:

...the awe-struck consciousness of God as the supreme Reality (p. 202)

۲ دسمبر کی صبح کو ایک صاحب کے یہاں ناشتہ پر کئی آدمی جمع تھے۔ ایک صاحب نے خلیج کے مسئلہ کے بارہ میں سوال کیا۔ میں نے کہا کہ اس مسئلہ میں میری وہی رائے ہے جو عام طور پر علماء کی رائے ہے۔ علماء کی رائے نہایت تفصیل کے ساتھ آچکی ہے۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ ہم لوگ "تذکیری باتوں پر گفتگو کریں جن کے بارہ میں بہت کم گفتگو کی جاتی ہے۔

پھر میں نے کہا کہ ابھی ہم لوگوں نے ایک کھانا ختم کیا ہے۔ کھانے کے بعد کے لئے ہمیں یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ الحمدللہ الذی اطعمنی وسقانی وجعلنی من المسلمین (اس اللہ کا شکر اور تعریف ہے جس نے مجھے کھانا کھلایا اور جس نے مجھے پانی پلایا اور جس نے مجھے مسلمانوں میں سے بنایا)

اس دعا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی اس کے الفاظ کو یاد کرلے اور کھانے کے بعد اسے اپنی زبان سے دہرا دے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دعا اپنے مفہوم کے اعتبار سے مطلوب ہے نہ کہ محض اپنے الفاظ کے اعتبار سے۔ آپ اگر کسی سے کہیں کہ میرا فلاں ٹیلی فون نمبر ہے، تم اس نمبر پر مجھے کال کرلینا، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ وہ اس گنتی کو یاد کرکے اسے اپنی زبان سے دہراتا رہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ٹیلی فون کے اوپر اس نمبر کو ڈائل کرکے آپ سے ربط قائم کرے۔

یہی دعا کا معاملہ ہے۔ آپ کو چاہئے کہ جب آپ دعا کے یہ الفاظ پڑھیں تو آپ کا ذہن

ان کے معانی کی طرف چلا جائے۔ آپ سوچیں کہ خدا نے کس طرح وہ کھانا اور پانی بنایا جو میری بھوک اور پیاس کو مٹائے اور میری زندگی کی طاقت بنے۔ جب آپ اس طرح سوچیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ ایک عظیم تخلیق کا معاملہ ہے۔ خدا نے کائناتی انتظام کے تحت نان فوڈ کو فوڈ میں کنورٹ کیا، اس نے نان واٹر کو واٹر میں کنورٹ کیا، اس کے بعد یہ ممکن ہوا کہ آپ اس کو کھائیں اور پئیں اور وہ آپ کے جسم میں داخل ہوکر آپ کا گوشت اور خون بنے۔

اسی طرح خدا نے آپ کو یہ توفیق دی کہ آپ اپنے نان اسلام کو اسلام میں کنورٹ کریں، اس کے بعد ہی یہ واقعہ پیش آیا کہ آپ کے اندر ایک اسلامی شخصیت ایمرج کرے۔ ان عظیم انعامات کا احساس جب لفظوں میں ڈھلتا ہے تو وہ مذکورہ کلمہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

لاس اینجلیز میں افرو امریکی مسلمانوں کی ایک تنظیم ہے۔ اس کا نام مسجد السلام ہے۔ اس کی طرف سے لاس اینجلیز میں ۲۳ - ۲۵ نومبر ۱۹۹۰ کو بڑے پیمانے پر ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس کی تھیم یہ تھی ــــ مسلم خاندان کس طرح بنایا جائے:

The making of a Muslim family

اس کانفرنس کے شرکاء میں امریکہ کے علاوہ دوسرے ملکوں کے ممتاز افراد کے نام بھی شامل تھے۔ مثلاً امام وارث دین محمد، پرنس محمد بن فیصل، دکتور جمال بدوی، وغیرہ۔ میں بھی اس کانفرنس میں مدعو تھا۔ اس سلسلہ میں دو دن (۲۴ - ۲۵ نومبر) لاس اینجلیز میں قیام رہا۔ قیام کا انتظام اور کانفرنس کا اجلاس دونوں کا نظم یہاں کے مشہور ہوٹل اسٹوفرس (Stouffers Hotel) میں کیا گیا تھا۔

اپنے کمرہ نمبر ۳۶۴ میں ایک روز میں نے خبریں سننے کے لئے ٹی وی کھولا۔ ایک خبر صدر بش کی خلیج سے واپسی کی تھی۔ مسٹر بش اور مسز بش ہوائی جہاز سے ہنستے ہوئے اترے تو ان کے ساتھ ایک کتا بھی اترا جو ان کے پیچھے چلنے لگا۔ مجھے قرآن کی وہ آیت یاد آئی جس میں بتایا گیا ہے کہ انسان تجارت اور لہو میں مشغول رہتا ہے، اور خدا کی یاد کو چھوڑ دیتا

ہے (الجمعہ) آج کا انسان اس کا مکمل مصداق ہے۔ آج کے انسان کی دلچسپی کی چیز صرف دو ہے۔ مفاد یا تفریح۔ اصل یہ ہے کہ انسان اپنے خالق اور مالک کی یاد میں مشغول ہو، مگر اس اصل مشغولیت کے لئے کسی کے پاس کوئی وقت نہیں۔

پروگرام کے مطابق ۲۵ نومبر کی شام کو میری تقریر ہوئی۔ میں نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ امریکہ کی مسلم نسلوں کے لئے تہذیبی ارتداد (cultural conversion) کا مسئلہ درپیش ہے۔ ترکی اور ہندستان اور روس میں بھی یہی مسئلہ پیدا ہوا، لیکن وہاں عملاً ایسا نہ ہوسکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان ملکوں میں یہ مسئلہ جارحانہ چیلنج کی صورت میں پیش آیا۔ اور جب کسی کو جارحانہ انداز میں چیلنج کیا جائے تو اس کے اندر مدافعانہ جذبات جاگ اٹھتے ہیں جو اس کی حفاظت کی ضمانت بن جاتے ہیں۔ امریکہ میں یہ مسئلہ اس لئے شدید ہے کہ یہاں کا چیلنج جارحانہ چیلنج نہیں۔ جارحانہ چیلنج بظاہر ایک تکلیف کی چیز ہے۔ مگر وہ زحمت میں رحمت (blessing in disguise) ہے۔

میں نے کہا کہ اس مسئلہ کا حل وہی ہے جس کا مشورہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اسی قسم کی صورت حال میں بنی اسرائیل کو دیا گیا تھا: اجعلوا بیوتکم قبلۃ واقیموا الصلوٰۃ۔ یعنی اپنے گھروں کو دینی مرکز بنالو، جو کچھ ملکی سطح پر حاصل نہیں ہے، اس کو اپنے گھر کی سطح پر حاصل کرو۔ میں نے کہا کہ اس خداوندی تدبیر کا فائدہ آپ کو صرف اس وقت مل سکتا ہے جب کہ آپ اپنا زیادہ وقت اپنے گھر اور اپنے بچوں کو دیں۔ امریکہ کے مسلم والدین عام طور پر اپنے بچوں کو ضروری وقت نہیں دے پاتے، اس لئے ان کے بچے یہاں کے کلچر میں گم ہوتے جارہے ہیں۔ آپ کو اپنی آؤٹنگ میں کمی کرنا ہوگا۔ اور اگر آپ دو شفٹ میں کام کرتے ہوں تو ایک شفٹ میں کام کرنا ہوگا تاکہ آپ اپنی اگلی نسلوں کو بچاسکیں۔

اس وقت امریکہ کی عام صورت حال یہ ہے کہ ماں باپ اپنا زیادہ وقت گھر کے باہر گزارتے ہیں۔ وہ کام میں مصروف ہوتے ہیں یا تفریح میں۔ بچوں کے لئے ان کے پاس وقت نہیں۔ اس سلسلہ میں جو اعداد و شمار جمع کئے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکی باپ اپنے بچوں کے

PRESENT CRISIS

&

THE WAY OF ACTION FOR MUSLIMS

a thought provoking lecture by one of the Prominent Muslim Thinkers of Our Time:

Maulana Waheeduddin Khan

President, Islamic Center New Dehli, India

at BUENA PARK HOTEL
7675 Crescent Ave. Buena Park, CA

Sunday, November 4, 1990

5:00 pm	**Maghrib Prayer**
5:30-6:30	**Dinner**
6:30-9:00	**Lecture**
9:15	**Isha Prayer**

TICKETS: $15.00 PER PERSON

Organized by: California Islamic Forum
For Information Call:

(714) 531-7995	**(714) 775-5150**
(714) 826-4956	**(714) 441-2029**

لئے جو وقت دے پاتا ہے وہ ۲۴ گھنٹہ میں صرف سات منٹ ہوتا ہے۔ اور امریکی ماں جو وقت دیتی ہے وہ ۲۴ گھنٹے میں صرف تیس منٹ۔ بچے بڑے ہونے کے بعد خود بھی اپنا وقت باہر گزارنے لگتے ہیں اور چھوٹے بچے گھر میں ٹی وی دیکھتے رہتے ہیں، کیوں کہ ایک امریکی کے الفاظ میں، ٹی وی ان کے لئے کبھی اتنا زیادہ مصروف نہیں ہوتا:

Because the T.V. is never too busy for them.

بچوں کی تربیت کا فطری طریقہ یہ ہے کہ گھر کے اندر اس کا نظام موجود ہو۔ لیکن گھر کے اندر چوں کہ یہاں اس کا نظام موجود نہیں، اس لئے تجارتی لوگ اس کے نام پر ادارے قائم کر رہے ہیں۔ امریکہ کے ایک میگزین میں ایک اشتہار تھا۔ یہ یوٹا (Utah) کا ایک تربیتی ادارہ ہے۔ اس کا نام ہیریٹج اسکول (The Heritage School) ہے۔ اس کا عنوان ہے ــــ پریشان بچوں کی مدد کرو (Help for troubled teens) اس اسکول کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ خاندانی زندگی کا ہنر (family living skills) سکھاتا ہے۔

مذاہب کی انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس) تقریباً ۶۰ سال پہلے تیار کی گئی تھی۔ وہ اگرچہ کافی مستند ہے۔ مگر اب وہ قدیم ہو چکی تھی، نیز بہت باریک لیٹر میں ہونے کی وجہ سے اس کو پڑھنا مشکل ہوتا ہے۔ اب مذاہب پر ایک نئی اور ہر لحاظ سے بہتر انسائیکلو پیڈیا تیار ہو گئی ہے:

The Encyclopadia of Religion, edited by Mircea Eliade Macmillan publishing company, New York, 1987, 16 volumes.

یہ انسائیکلو پیڈیا یہاں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مذاہب کے میدان میں تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے نہایت مفید ہے۔

۲۷ نومبر کو بعد دوپہر میں اپنی قیام گاہ (ولیسٹ منسٹر، کیلی فورنیا) سے ٹہلنے کے لئے باہر نکلا۔ قیام گاہ اس وقت خالی تھی۔ کیوں کہ عورت اور مرد اپنے کام پر گئے ہوئے تھے اور بچے اسکول میں تھے۔ خالی سڑک سے تنہا گزرتے ہوئے میں ایک پارک (فارسٹ ایوینو) پہنچا۔ وسیع پارک میں کچھ بڑے اور کچھ بچے دکھائی دئے۔ یہاں کوئی انسانی آواز سننے کے لئے موجود

نہ تھی۔ دور کے کسی مکان سے کتا بھونکنے کی آواز آرہی تھی اور کبھی کبھی کوئی کار قریبی سڑک سے گزر جاتی تھی۔

پارک نہایت خوبصورت تھا۔ ہندستان کے پارکوں سے وہ اتنا ہی مختلف تھا جتنا خود امریکہ ہندستان سے۔ اس کو دیکھ کر مجھے وہ خوب صورت تر پارک یاد آیا جو پچھلے دن میں نے ٹی وی میں دیکھا تھا۔ صدر امریکہ مسٹر جارج بش یہاں کا خصوصی تیوہار تھینکس گوئنگ اپنے فوجیوں کے ساتھ منانے کے لئے خلیج عرب گئے تھے۔ واپسی میں ان کا خصوصی جہاز واشنگٹن میں اترا۔ جہاز سے نکل کر وہ ایک نہایت خوب صورت پارک سے خراماں خراماں چلتے ہوئے ایک شاندار مکان میں داخل ہو گئے۔

ٹی وی پر یہ منظر دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ موت کا فرشتہ اسی طرح ایک روز آدمی کے پاس آئے گا۔ اس کے ساتھ ایک سواری ہوگی۔ وہ آدمی کو سواری پر بٹھا کر دنیا سے آخرت کی طرف روانہ ہوگا۔ عالم آخرت میں یہ سواری یا تو ایک سرسبز پارک کے کنارے اترے گی۔ آدمی سواری سے نکلے گا اور خوشی خوشی اس پارک سے گزرتا ہوا اپنے جنتی مکان میں داخل ہو جائے گا۔ یا پھر اس کی سواری ایک خشک بیابان میں اترے گی، وہ سواری سے باہر آئے گا تو وہ پائے گا کہ وہاں اندھیروں اور خاردار وادیوں کے سوا کوئی اور چیز اس کا استقبال کرنے کے لئے موجود نہیں۔

اس وقت آسمان مکمل طور پر صاف تھا۔ سورج کی سنہری روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ پارک کے چاروں طرف سرسبز درختوں سے ڈھکے ہوئے خوبصورت مکانات دلکش منظر پیش کر رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ یہ دنیا بے حقیقت ہونے کے باوجود اتنی زیادہ حسین ہے کہ خدا کی خاص توفیق ہی سے کوئی شخص اس کے مسحور کن فتنہ سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اس وقت مجھے بے ساختہ فانی بدایونی کا یہ شعر یاد آگیا:

فریب جلوہ اور کتنا مکمل اے معاذ اللہ　　بڑی مشکل سے دل کو بزم عالم سے اٹھا پایا

اس کے بعد میں تقریباً روزانہ پارک میں جانے لگا۔ یہاں مختلف قسم کے سبق آموز تجربے ہوئے۔ ۲۸ نومبر کی سہ پہر کو میں ایک پارک میں کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ایک حصہ میں بچوں کے کھیل

کا سامان لگا ہوا ہے۔ ایک سفید فام بچہ (تقریباً تین سال کا) آیا اور ایک جھولے پر چڑھ گیا۔ یہ جھولا ایسا تھا جس کو ہلانے کے لئے کوئی دوسرا آدمی درکار تھا۔ بچہ نے مجھ کو مخاطب کرتے ہوئے کچھ کہا۔ ابتداءً میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے کئی بار کہا تو میری سمجھ میں آیا کہ وہ کہہ رہا ہے ــــ چچا، مجھے دھکا دو :

Uncle, push me.

میں اس کے قریب گیا اور اس کو جھولا جھلانے لگا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اس کے بعد اس نے میرا نام پوچھا۔ اس نے کچھ اور کہا جو لہجہ کے فرق کی وجہ سے میری سمجھ میں نہ آسکا۔

پارک میں جس وقت یہ واقعہ پیش آیا، میرے ہاتھ میں امریکہ کے ایک منتھلی میگزین سن سٹ (Sunset) کا شمارہ دسمبر ۱۹۹۰ تھا۔ اس کے ٹائٹل پر لکھا ہوا تھا ــــ مغربی طرز زندگی کا میگزین :

The magazine of Western living

۱۹۰ صفحہ کے اس انگریزی میگزین کا بیشتر حصہ اشتہارات سے بھرا ہوا تھا۔ اس کا چار صفحہ (۷۵ - ۷۴ ۵) بگڑے ہوئے بچوں کے اسکول (School for trouble teens) کے بارہ میں تھا۔ ان صفحات میں تقریباً چار درجن ایسے اسکولوں کے اشتہارات درج تھے۔ اس وقت امریکی خاندانوں کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ والدین کے پاس اپنے بچوں کی تربیت اور نگہداشت کے لئے کوئی وقت نہیں۔ ان کا بیشتر وقت یا تو دفتروں میں گزرتا ہے یا اگر چھٹی ہو تو "آؤٹنگ" میں۔ چنانچہ بچے خودرو پودے کی طرح اگ رہے ہیں۔ اس کے نتیجے میں بچوں کی پوری نسل خراب ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ اسکول ان بچوں کی پروفیشنل رہنمائی (professional guidance) کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ایک اشتہار کا مضمون یہاں نقل کیا جاتا ہے :

We Rescue Teenagers: The most effective option for parents who need help with teens who are – out of control, irresponsible, depressed, during and alcohol dependent, failing school, irresponsible, depressed, drug and alcohol dependent, failing school, running with the wrong friends, unmotivated, undisciplined and who lack real self-esteem.

اس قسم کے اشتہارات پڑھتے ہوئے مجھے مذکورہ سفید فام امریکی بچے کے الفاظ Uncle, push me یاد آئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا بچہ کے ان الفاظ میں نئی امریکی نسل کی روح پکار رہی ہے۔ وہ کہہ رہی ہے کہ میں دلدل میں پھنس گیا ہوں، مجھے دھکا دے کر یہاں سے نکالو۔ حقیقت یہ ہے کہ بچوں کے اس سنگین مسئلہ کا حل پروفیشنل اسکول نہیں ہیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ امریکہ کے معاشرہ کو دوبارہ یہاں لایا جائے کہ اس کا طرز فکر بدلے۔ والدین دوبارہ بچوں کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں۔ بچوں کی تربیت کا حقیقی کام صرف گھر کے اندر ہو سکتا ہے۔ وہ پروفیشنل اسکولوں میں کبھی انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں ارادہ ہے کہ انشاء اللہ خاتون اسلام جلد ہی انگریزی میں شائع کی جائے گی۔ ایک روز میں پارک میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ایک سفید فام امریکی بنچ پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے پاس جا کر میں نے کہا کہ کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔ اس نے خوش دلی کے ساتھ میرے لئے جگہ خالی کر دی۔ میں وہاں بیٹھ گیا۔ ابتدائی رسمی باتوں کے بعد گفتگو شروع ہوئی۔

میں نے پوچھا کہ کیا آپ اسلام کے بارہ میں کچھ جانتے ہیں۔ اس نے کہا کہ میں اسلام کے بارہ میں بہت کم جانتا ہوں۔ شاید یہ کوئی مخالف امریکہ نظریہ ہے:

I have little knowledge of Islam.
Perhaps it is a form of anti-Americanism.

میں نے کہا کہ اسلام اینٹی امریکی نظریہ نہیں، اسلام تو پرو امریکی نظریہ ہے۔ میری زبان سے یہ جملہ سن کر وہ چونک پڑا۔ اس کے دریافت کرنے پر میں نے مزید بتایا کہ اسلام کی بنیاد کسی قوم کی دشمنی یا کسی حکومت کی مخالفت پر نہیں۔ اسلام تو یہ ہے کہ ہر آدمی کو اس کے خالق سے متعارف کرے۔ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ ہر آدمی کو اپنی زندگی میں اس خدائی طریقہ کو اختیار کرنے کی تلقین کرے جو اس کو ابدی جنت میں لے جانے والا ہے۔ اسلام آپ کا دشمن نہیں، اسلام آپ کا دوست اور خیر خواہ ہے۔ اگر آپ گہرائی کے ساتھ مطالعہ کریں تو آپ پائیں گے کہ اسلام اینٹی امریکن ازم کا نام نہیں، اسلام پرو امریکن ازم کا نام ہے۔ کیونکہ وہ آپ کو جنت میں لے جانا چاہتا ہے۔

اسلام کے بارہ میں اس غلط فہمی کی ذمہ داری تمام تر نااہل مسلم رہنماؤں پر ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے سب سے زیادہ اہمیت اپنے قومی مسائل کو دی۔ چنانچہ جو قومیں انھیں ان کے قومی حوصلوں میں رکاوٹ نظر آئیں، وہ ان کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہو گئے۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ اسلام اینٹی امریکن ازم، یا اینٹی ویسٹرن ازم کے ہم معنی بن گیا۔ اگر یہ رہنما دوسرے انسانوں کی نجات آخرت کے لئے تڑپتے تو وہ دوسرے انسانوں کے سامنے واللہ یدعوا الی دارالسلام (یونس ۲۵) کا پیغام لے کر کھڑے ہوتے۔ یہ چیز انھیں دوسری قوموں کا خیر خواہ بناتی۔ دوسری قومیں ان کے لئے محبت کا موضوع بن جاتیں۔ اور پھر لوگوں کو نظر آتا کہ اسلام ہمارا موافق مذہب ہے نہ کہ ہمارا مخالف مذہب۔

یہ بلاشبہ اسلام کے حق میں سب سے بڑا نقصان ہے، اور اسلام کو یہ نقصان اس کے دشمنوں نے نہیں پہنچایا بلکہ اسلام کے نادان دوستوں نے اسلام کو یہ سب سے بڑا نقصان پہنچایا ہے۔

امریکہ کے شہر پلین فیلڈ (Plainfield) سے ایک میگزین نکلتا ہے۔ اس کا نام اسلامک ہورائزن (Islamic Horizons) ہے۔ اس کا شمارہ جولائی۔ اگست ۱۹۹۰ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کے صفحہ ۳۹ پر "انڈین مسلم ریلیف کمیٹی" کا اشتہار تھا۔ اس میں اپیل کی گئی تھی کہ فلاں پتہ پر اپنے عطیات (donations) روانہ کریں۔ اس اشتہار میں یہ الفاظ درج تھے کہ چوں کہ ہندستان کے مسلمان کہتے ہیں کہ صرف اللہ ہمارا رب ہے، اس لئے بے رحمانہ اور وحشیانہ ظلم ان پر ٹوٹ پڑا ہے، مکمل گرہن کی مانند:

> Because Muslims in India say, "Allah is our Lord," ruthless and brutal oppression has come upon them like a full eclipse.

یہ الفاظ نہ صرف واقعہ کے خلاف ہیں بلکہ وہ قرآن وحدیث کی نفی کے ہم معنی ہیں۔ ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد ۲۰۰ ملین بتائی جاتی ہے۔ یہ تعداد دور اول کے صحابہ و تابعین کی مجموعی تعداد سے بھی بہت زیادہ ہے۔ اگر واقعۃً مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد کو صرف اس لئے وحشیانہ طور پر ستایا جائے کہ وہ اللہ کو اپنا رب کہتے ہیں تو ناممکن ہے کہ کوئی ستانے

والا ان کو ستانے میں کامیاب ہو۔ ایسی صورت میں یقیناً اللہ کی غیرت جوش میں آئے گی اور پھر ظالموں کو زیر کر دیا جائے گا اور حق کی خاطر مظلوم ہو جانے والوں کو غلبہ عطا ہوگا۔

کیسے بے خبر ہیں وہ لوگ جو مخلوق کے ظلم کو جانیں مگر وہ خالق کے انصاف کو نہ جانیں۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو انسان کی طاقت کو جانیں مگر وہ خدا وند ذو الجلال کی طاقت سے بے خبر بنے ہوئے ہوں۔

صغیر اسلم صاحب کی یہاں کپڑے کی ایک بڑی دکان (اسٹور) ہے۔ اس میں کپڑے کو رکھنے کے لئے انھیں خاص طرح کی الماریوں کی ضرورت تھی۔ اس سلسلہ میں ایک بڑھئی (Bobbie) ان کی دکان میں کام کر رہا تھا۔ ۲۹ نومبر کی شام کو میں ان کے اسٹور میں گیا۔ میں نے بڑھئی کو کام کرتے ہوئے دیکھا تو بے ساختہ میری زبان سے نکلا: امریکی بڑھئی ہونا ایک ایڈوانٹج ہے۔

ہر قسم کی تیار شدہ لکڑی، ہر قسم کا عمدہ لوہے کا سامان، ان کو کاٹنے اور جوڑنے کے لئے ہر قسم کی دستی مشین۔ اسکریو گن (screw gun) وغیرہ بڑھئی کے پاس موجود تھیں۔ وہ ان کے ذریعہ اس طرح فینسی الماریاں بنا رہا تھا جیسے کہ یہ کوئی خشک کام نہ ہو بلکہ ایک تفریحی عمل ہو۔ ترقی یافتہ ملکوں میں شراب اور جنسی آزادی جیسی خرابیاں بہت افسوسناک ہیں۔ مگر تکنیک کے اعتبار سے ان ملکوں میں اور ہندستان جیسے ملکوں میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مقابلہ میں ہم لوگ ابھی پتھر کے دور میں رہ رہے ہیں۔

ہندستان میں بے شمار تحریکیں ہیں جو تخریب کے کارنامے انجام دے رہی ہیں۔ مگر کوئی ایک بھی ایسی تحریک نہیں جو حقیقی معنوں میں تعمیری مقاصد کے لئے سرگرم ہو، جو ملک کو آگے لے جانے کی کوشش کرے۔ تحریکوں کے ہجوم میں تحریک کے فقدان کی یہ کیسی عجیب مثال ہے جو ہندستان میں پائی جاتی ہے۔

یہ ایک جدید طرز کا اسٹور تھا۔ یہاں میز پر نہایت شاندار چھپے ہوئے بہت سے کیٹلاگ رکھے ہوئے تھے۔ ان میں ملبوس مردوں اور عورتوں کی رنگین تصویروں کے ذریعہ کپڑوں کی نمائش کی گئی تھی۔ ایک صفحہ پر کپڑوں کی نمائش کرتے ہوئے یہ الفاظ درج تھے ـــــ سنسنی خیز، تمام نگاہیں تمہارے اوپر:

Sensational... all eyes on you.

عام لوگ پرکشش کپڑے پہن کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ لیڈروں کا طبقہ بھی یہی کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ دوسرے لوگ خوشنما کپڑوں کے ذریعہ اپنے آپ کو دوسروں کی نظر میں قابل توجہ بناتے ہیں اور لیڈر لوگ خوشنما تقریروں کے ذریعہ۔

مردوں اور عورتوں کے ایک مشترک اجتماع میں خطاب کا موقع ملا۔ خطاب کے بعد کچھ سوالات سامنے۔ ایک خاتون کی طرف سے ایک تحریری سوال آیا، اس کا خلاصہ یہ تھا: جب کسی کے برے سلوک سے دل کو سخت رنج پہنچتا ہے تو اس شخص کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔

میں نے سوچا کہ اس سوال کا جواب تو قرآن وحدیث میں انتہائی واضح ہے۔ قرآن وحدیث میں بار بار یہ کہا گیا ہے کہ ایسے مواقع پر معافی اور درگذر سے کام لو، تم اگر بندوں سے درگذر کرو تو خدا قیامت کے دن تم سے درگذر کا معاملہ فرمائے گا۔ ان واضح ہدایات کے باوجود کیوں ایک دیندار اور تعلیم یافتہ خاتون ایسا سوال پوچھ رہی ہیں۔

میری سمجھ میں آیا کہ اس کی تمام تر ذمہ داری موجودہ زمانہ کے نااہل لیڈروں پر ہے۔ ان لیڈروں نے موجودہ زمانہ میں جو سب سے بڑی دھوم مچائی وہ غیر اقوام کے "برے سلوک" پر فریاد واحتجاج کا مظاہرہ تھا۔ اسی قسم کی سطحی تقریروں اور تحریروں پر انھوں نے پوری قوم کو اٹھایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن وحدیث کی مذکورہ تعلیم پوری قوم کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ مسلمانوں کو صرف یہ سکھایا گیا کہ تمھیں اشتعال انگیزی پر مشتعل ہونا ہے۔ رنج کا تجربہ ہونے پر تم کو شدت کے ساتھ اس کے خلاف ردعمل کا اظہار کرنا ہے۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ قوم کے افراد قرآن کی ان تعلیمات کی اہمیت کو سمجھیں جن میں عفو ودرگذر اور صبر واعراض کی تلقین کی گئی ہے۔

روزنامہ آرنج کاونٹی رجسٹر (۳۰ نومبر ۱۹۹۰) کے پہلے صفحہ پر یہ سنسنی خیز خبر تھی ـــــ صدام حسین کو کویت سے نکل جانے کے لئے صرف ۴۷ دن:

Saddam has 47 days to get out

اقوام متحدہ کی سیکوریٹی کونسل نے تقریباً متفقہ طور پر یہ رزولیوشن پاس کیا ہے کہ عراق کے صدر صدام حسین ۱۵ جنوری ۱۹۹۱ تک بلا شرط کویت کا علاقہ خالی کردیں ، ورنہ امریکہ کو حق ہوگا کہ وہ ان کے خلاف فوجی کارروائی کرے۔

اس خبر کو میں نے پڑھا تو میں نے سوچا کہ یہی معاملہ ہر انسان کا ہے ، حتی کہ خود مذکورہ الٹی میٹم دینے والوں کا بھی۔ ہر انسان جو اس دنیا میں اپنی زندگی بنا رہا ہے ، اس کو خدا کی طرف سے قطعی آگاہی دے دی گئی ہے کہ تمہارے لئے صرف " ۴۹ دن " کا موقع ہے۔ یا تو تم اس مدت میں اپنی سرکشی چھوڑدو ، ورنہ تم کو خدا کی دنیا چھوڑنے پر مجبور کردیا جائے گا۔ اس کے بعد تمہارے لئے بربادی کے اندھیروں میں بھٹکنے کے سوا اور کوئی راستہ نہ ہوگا۔ لوگ دوسروں کے خلاف الٹی میٹم دینے میں مشغول ہیں ، خود اپنے خلاف الٹی میٹم کی کسی کو خبر نہیں۔

امریکہ میں " پیپر ردی والا " جیسی آواز کہیں سنائی نہیں دیتی۔ کیونکہ یہاں اخباروں کو ردی میں بیچنے کا کوئی رواج نہیں۔ یہاں اخبارات کا واحد استعمال یہ ہے کہ پڑھنے کے بعد انھیں کوڑے میں ڈال دیا جائے۔ جب کہ ہندستان میں آدمی اخبارات کو ردی میں بیچ کر ان کی تقریباً نصف لاگت واپس حاصل کرلیتا ہے۔ اس کے باوجود امریکہ میں اخبارات اور میگزین نہایت عام ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی قیمتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ یہاں اخبار والے صرف یہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کے اخبار کو پڑھیں۔ کیوں کہ ان کی قیمت تو انھیں ان کے مشتہرین ادا کرچکے ہوتے ہیں۔

یہاں میں روزانہ اخبار پڑھتا تھا۔ مگر پوری مدت میں یہاں کے اخبارات میں ہندستان کی کوئی خبر پڑھنے کو نہیں ملی۔ سنگاپور جیسے چھوٹے ملکوں کی خبریں تھیں۔ مگر ہندستان کی کوئی خبر نہیں۔ البتہ ہندستان میں کوئی بڑا فساد ہوجائے تو اس کی خبر ضرور یہاں کے اخباروں میں چھپتی ہے۔ اس طرح کی خبریں یہاں کے لوگوں کو یہ تسکین فراہم کرتی ہیں کہ صرف ہمارا سماج مہذب سماج ہے۔ بقیہ دنیا میں وحشت و بربریت کے سوا اور کچھ نہیں ، اس اعتبار سے دیکھئے تو ہندستان کی انتہا پسند تحریکیں صرف ملک دشمنی کی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ کیوں کہ وہ ایسی خبریں تخلیق کرنے میں مشغول ہیں جن کا دوسری قوموں کو نہایت شدت کے ساتھ

انتظار ہے۔

۲۹ نومبر کو دوپہر کا وقت تھا۔ چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے یہاں کی گھڑی میں دیکھا تو وہ ساڑھے گیارہ بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ اس کے بعد میری نظر اپنے ہاتھ کی گھڑی پر گئی تو اس میں ایک بجے کا وقت تھا۔ ایک لمحہ کے لئے یہ فرق عجیب لگا۔ پھر خیال آیا کہ میری گھڑی میں دہلی کا وقت ہے۔ اور کیلی فورنیا اور دہلی کے وقت میں ساڑھے دس گھنٹہ کا فرق پایا جاتا ہے۔ اس وقت جب کہ میں کیلی فورنیا میں ساڑھے گیارہ بجے دن کی روشنی میں بیٹھا ہوا ہوں، دہلی کے کے لوگ ایک بجے رات کے اندھیرے میں اپنے گھروں کے اندر سو رہے ہوں گے۔ کیلی فورنیا میں آج ۲۹ نومبر کی تاریخ ہے، مگر دہلی کا انسان اس وقت نومبر کی ۳۰ تاریخ میں داخل ہو چکا ہے۔ کیلی فورنیا میں اس وقت تمام سرگرمیاں اپنے شباب پر ہیں، جب کہ دہلی میں تمام انسانی سرگرمیاں رات کے سناٹے میں روپوش ہو چکی ہیں۔

زمین کی سطح پر رات اور دن کا یہ فرق سورج کے سامنے زمین کی گردش سے پیدا ہوتا ہے۔ خلائے بسیط میں زمین کی یہ گردش اتنی حیران کن ہے کہ اس کے بارہ میں سوچ کر جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور آدمی بے اختیار ہو کر سجدہ میں گر پڑے۔

انوار حسن صاحب (۵۴ سال) ایک امریکی کمپنی (GHG) میں کام کرتے ہیں۔ اتوار کے دن وہ رضا کارانہ طور پر ایک اسلامک سنٹر میں "سیکوریٹی" کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ کیونکہ اتوار کے دن اس سنٹر میں کافی مسلمان آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے تجربات کی روشنی میں کہا کہ انڈیا اور پاکستان کے جو مسلمان یہاں آتے ہیں، وہ امریکیوں کے درمیان تو بہت بااصول طور پر رہتے ہیں۔ "سر" کہے بغیر ان سے بات نہیں کرتے۔ مگر جب وہ اسلامک سنٹر میں آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کسی جنگل میں آگئے ہیں۔

میں نے کہا کہ اس کی کوئی مثال دیجئے۔ انھوں نے کہا کہ مثال کے طور پر جب وہ امریکی دفتروں میں جاتے ہیں تو وہاں وہ گاڑیوں کے قوانین کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے ہیں۔ مگر اسلامک سنٹر میں آتے ہی ان کا انداز بدل جاتا ہے۔ پچھلے سنڈے کو میں سنٹر کے گیٹ پر ڈیوٹی دے رہا تھا۔ ایک مسلمان اپنی مرسیڈیز پر آئے اور نکلنے والے دروازہ (exit)

سے داخل ہونے لگے۔ میں نے روکا تو مجھ سے لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اگر یہ بیان صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ موجودہ مسلمان (کم از کم ان کی اکثریت) اصول کے تحت باقاعدگی اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ صرف ڈر کے تحت باقاعدہ بننا جانتی ہے۔

امریکہ کے مختلف شہروں میں اس وقت اسلامک سنٹر کے نام سے ایک ہزار سے زیادہ ادارے قائم ہیں۔ لیکن گہرائی کے ساتھ ان کا مطالعہ کرنے کے بعد میری رائے یہ ہے کہ عملی حالت کے اعتبار سے یہ ادارے مسلم کلچرل سنٹر ہیں نہ کہ حقیقی معنوں میں اسلامک سنٹر۔ یہ مسلمانوں کی سماجی اور ثقافتی ضرورت کا اظہار ہیں نہ کہ اسلام کے اصولی اور دعوتی تقاضے کا اظہار۔

امریکہ کے شہروں میں آپ کو بس اور ٹرام اور ریلوے دکھائی نہیں دیں گی۔ اس کے برعکس ان سڑکوں پر ہر وقت کاروں کا مشینی سیلاب بہتا رہتا ہے۔ بظاہر یہ ترقی کی علامت ہے۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو معلوم ہوگا یہ سرمایہ دارانہ استحصال ہے۔ یہاں کے سرمایہ دار منظم طور پر یہ کوشش کرتے رہتے ہیں یہاں پبلک ٹرانسپورٹ کا نظام قائم نہ ہونے پائے تاکہ ان کی کاریں زیادہ سے زیادہ فروخت ہوں۔ یہاں رہنے والا ایک شخص نہایت آسانی سے قسط وار ادائگی کی بنیاد پر ایک یا زیادہ کار خرید سکتا ہے (اور اسی طرح دوسری تمام چیزیں بھی) اس طرح یہاں کا تقریباً ہر آدمی اپنی کمائی کا بہترین حصہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کے اکاونٹ میں پہنچاتا ہے، سامان کی ادھار خریداری کی صورت میں، نیز اس کے اوپر مستقل سود کی ادائگی کے ذریعہ۔

قرض پر مبنی اس اقتصادیات کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ لوگوں کے پاس دین کی مدمیں دینے کے لئے بہت کم رقم باقی رہتی ہے۔ بظاہر یہاں کا ہر مسلمان کافی کما رہا ہے مگر دین کی مدوں میں تعاون دینے کے لئے وہ اپنے آپ کو عاجز پاتا ہے۔

۲ دسمبر کو سین گیبریل (San Gabril Valley) کے اسلامک سنٹر میں تقریر کا پروگرام تھا۔ جناب عبد القادر البخار کے ساتھ یہ سفر طے ہوا۔ موصوف کا خاندان طائف سے آکر حلب (شام) میں آباد ہو گیا۔ ۳۷ سال پہلے وہ حلب سے امریکہ آگئے۔ اب وہ یہاں کے شہری ہو چکے ہیں۔ وہ پر جوش حد تک دین پسند آدمی ہیں۔ جاتے اور آتے ہوئے مجموعی طور پر ۷۰

کیلو میٹر کا راستہ ان کے ساتھ گزرا۔

انھوں نے ایک واقعہ کے بارہ میں بتاتے ہوئے کہا : قل الحق و لوعلیٰ نفسك (حق بات کہو، خواہ، وہ تمہارے اپنے خلاف کیوں نہ ہو) ایک اور واقعہ کے ذیل میں انھوں نے کہا : ان اللہ یُمْهِلُ ولا یُهْمِلُ (اللہ مہلت دیتا ہے مگر اللہ کبھی چھوڑتا نہیں)

روزنامہ آرنج کاونٹی رجسٹر (۴ دسمبر ۱۹۹۰) میں صفحہ اول پر ایک باتصویر خبر ہے۔ تصویر میں ایک جہاز (DC-9) ٹوٹا ہوا پڑا ہے۔ اس کو شعلے گھیرے ہوئے ہیں۔ یہ ایک ہوائی حادثہ کا قصہ ہے جو امریکہ کی ریاست مشی گان میں ڈیٹرائٹ کے ہوائی اڈہ پر پیش آیا۔ آٹھ مسافر فوراً مرگئے۔ بقیہ ۱۸۱ مسافروں میں کچھ زخمی ہوئے، اور کچھ پریشانی کی حالت میں باہر آئے۔

اس واقعہ کی رپورٹ دیتے ہوئے اخبار نے لکھا تھا کہ یہ واقعہ اس لئے پیش آیا کہ ایک جہاز (727) ایئرپورٹ کے کہر آلود رن وے (foggy runway) پر چلتے ہوئے دوسری طرف سے آنے والے جہاز کے راستہ میں داخل ہوگیا جو اڑنے والا تھا۔ اس کے بعد ایک جہاز کا پر دوسرے جہاز کے پر میں ٹکرا گیا۔ ایسا اس لئے ہوا کہ اس وقت ایئرپورٹ پر گہرا کہر چھایا ہوا تھا :

One Northwest Airlines jet strayed into the path of another that was streaming toward takeoff and the two collided in heavy fog on a runway at Detroit Metropolitan Airport.

اس خبر کو پڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ "کہر" کا مسئلہ ہر سفر میں پیش آتا ہے، خواہ وہ مادی سفر ہو یا کوئی ذہنی سفر۔ آدمی اگر صرف روشن راہوں میں چلنا جانتا ہو، وہ کہر کے راستوں میں چلنے کے آداب نہ جانتا ہو تو اس کا یہی انجام ہوگا کہ وہ مخالف سمت سے آنے والی کسی "سواری" سے ٹکرا جائے گا۔ ایسا آدمی اپنی آخری منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔

۶ دسمبر کو جب کہ کیلی فورنیا میں صبح سویرے کا وقت تھا اور دہلی میں شام کا، مجھے دہلی سے بات کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ میں نے جناب صغیر اسلم صاحب سے کہا۔ انھوں نے

اپنے ٹیلیفون پر حسب ذیل نمبروں کے بٹن دبائے:

011-91-11-611128

اس کے فوراً بعد دہلی میں ہمارے دفتر میں گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے سوچا کہ جس دنیا میں یہ ممکن ہے کہ کیلی فورنیا کا ایک انسان دہلی کے ایک انسان سے ایک منٹ سے بھی کم وقت میں رابطہ قائم کر لے، اس دنیا میں کیا یہ ممکن نہیں کہ انسان اپنے خالق سے رابطہ قائم کر سکے۔ دل نے کہا کہ یقینی طور پر ممکن ہے۔ مگر اس کے لئے اسی طرح صحیح تدبیر اختیار اختیار کرنی ہوگی جو کیلی فورنیا اور دہلی کے درمیان رابطہ قائم کرنے کے لئے اختیار کی گئی۔ اس ربط کی ایک شکل یہ بھی تھی کہ ہم مذکورہ نمبروں کا اہتمام نہ کرتے بلکہ دوسرے غیر متعلق نمبروں پر اپنی انگلیاں مارنے لگتے۔ ایسی حالت میں ہماری کوشش بے فائدہ ہو جاتی۔ اس کے بجائے ہم نے یہ کیا کہ صحیح ترین نمبر معلوم کر کے عین اسی نمبر کے ذریعہ ربط قائم کرنے کی کوشش کی۔ ایسا کرتے ہی فوراً ربط قائم ہو گیا۔

اسی طرح خدا سے ربط قائم کرنے کا بھی ایک "صحیح نمبر" ہے اور ایک "غلط نمبر" جو شخص خدا سے ربط قائم کرنے کی سنجیدہ خواہش رکھتا ہو، اس کو چاہئے کہ پہلے اس کا "صحیح نمبر" معلوم کرے۔ ایسا کرنے کے بعد خدا سے اس کا ربط قائم ہونا اتنا ہی ممکن ہو جائے گا جتنا کیلی فورنیا اور دہلی کے درمیان ربط قائم ہونا۔ یہ صحیح نمبر اپنی ذات کو حذف کرنا ہے۔

جناب صفی قریشی صاحب نے ایک مجلس میں بہت اچھی مثال دی۔ انھوں نے کہا کہ آجکل مصنوعی سٹلائٹ خلا میں بھیجے جاتے ہیں۔ یہ سٹلائٹ اوپر جا کر ۲۰۰ میل یا اس سے کم و بیش کی دوری پر زمین کے گرد گھومنے لگتے ہیں۔ مگر ان کی عمر کی ایک مدت ہے۔ ایک مدت گزرنے کے بعد وہ زمین کی کشش کے دائرہ میں آکر زمین کی طرف کھنچنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ نیچے آتے آتے ایک روز زمین پر گر پڑتے ہیں۔ اسی طرح انسان ایک مقرر مدت کے لئے اس دنیا میں آتا ہے۔ اس کے بعد اس کا واپسی کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر کار وہ دوبارہ خدا کی طرف چلا جاتا ہے۔

۶ دسمبر کو ظہر کی نماز کے بعد آخری بار میں یہاں کے پارک میں گیا۔ پارک کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ ملی ہوئی سڑک سے ایک بہت بوڑھا امریکن جوڑا خاص طرح کی کھلی ہوئی چھوٹی گاڑی کو آہستہ

چلاتا ہوا گزر رہا ہے ۔ میری نظر ان لوگوں کی طرف گئی تو مرد نے ہاتھ اٹھا کر ہائی (ہیلو) کہا۔ میں پارک کے اندر داخل ہو رہا تھا اور وہ سڑک پر چلتے ہوئے دوسری طرف جا رہے تھے۔

اس واقعہ میں مجھے خود اپنا دوامی سفر دکھائی دینے لگا۔ میں نے کہا: کل مجھے یہاں سے جانا ہے اسی طرح ایک اور کل آئے گا جب کہ میں اس دنیا کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ پہلے سفر کی منزل معلوم ہے، مگر دوسرے سفر کی منزل معلوم نہیں۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ دوسرے سفر میں میرے اوپر کیا بیتنے والا ہے۔

کچھ دیر تک میں پارک میں بیٹھا۔ خوبصورت پارک، سرسبز درختوں سے ڈھکے ہوئے مکانات، ہوا کے خوش گوار جھونکے، سڑک پر پھسلتی ہوئی کاریں، سورج کی سنہری روشنی میں اڑتے ہوئے ہوائی جہاز، اس طرح کے مختلف مناظر کے درمیان میں نے سوچا کہ خدا نے کتنی زیادہ نعمتیں انسان کو دے رکھی ہیں۔ لوگ ان نعمتوں سے فائدہ اٹھانے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔ مگر کوئی نہیں جو ان بے پایاں نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کرے۔ میری زبان سے بے ساختہ نکلا: خدایا، میں ساری انسانیت کی طرف سے تیرا شکر ادا کرتا ہوں تاکہ ان کے اوپر تیرا غضب نازل نہ ہو جائے۔

۴ دسمبر کو ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی صاحب کے ساتھ لاس اینجلیز گیا۔ وہاں کے اسلامک سنٹر میں چند گھنٹے گزرے۔ امریکی فوج کے تحت کیلی فورنیا میں ایک نشریاتی ادارہ (Armed Forces Radio & Television Broadcast Centre) عرصہ سے قائم ہے۔ اس کے نمائندہ کے طور پر مسٹر رچرڈ ڈیون پورٹ (Richard Davenport) وہاں آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا ادارہ مختلف قسم کے ویڈیو کیسٹ تیار کرتا ہے جو امریکی فوج کے لئے ٹیلیویژن پر دکھایا جاتا ہے۔ یہ پروگرام امریکہ کی تمام فوجی تنصیبات پر دیکھا جاتا ہے۔

اس وقت امریکہ کی تقریباً چار لاکھ فوج خلیج عرب کے علاقہ میں ہے۔ مزید فوج بھی وہاں بھیجی جا سکتی ہے۔ چنانچہ امریکی فوجی اسلام اور عرب کلچر کے بارہ میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ خلیج میں امریکی فوجوں کی موجودگی سے ایک اچھی پیش رفت یہ

برآمد ہوئی ہے کہ بہت سے لوگ اسلام اور مسلمانوں کے بارہ میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں :

The one good thing that came out of this armed forces presence in the Gulf is that many people are now interested to know more about Islam and Muslim people.

یہاں پر اسلامک انفارمیشن سروس کے نام سے ایک ادارہ قائم ہے۔ وہ ہر ہفتہ ایک ویڈیو ٹیپ تیار کرکے ٹیلیویژن کمپنی کو دیتا ہے اور اس کو ٹی وی پر دکھایا جاتا ہے۔ مجھ سے انھوں نے ویڈیو پر ایک مفصل انٹرویو لیا۔ اس میں اسلام کے موجودہ مسائل اور امریکی مسلمان اور ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں سوالات تھے۔ میں نے کہا کہ ہندستانی مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ نا اہل لیڈروں کی غلط رہنمائی کے نتیجہ میں ملک میں لینے والے گروہ (taker-group) بن گئے۔ ان کی حیثیت دینے والے گروہ (giver-group) کی نہیں۔ ان کے مسئلہ کا حقیقی حل صرف یہ ہے کہ انھیں دوبارہ دینے والے گروہ کے مقام پر لایا جائے۔

مسٹر اسلم عبد اللہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ محمد مسلم صاحب مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ یہاں وہ انگریزی میگزین (The Minaret) کے اڈیٹر ہیں۔ انھوں نے جو باتیں کہیں، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ "ہندستانی مسلمانوں کے لئے صحیح ڈائرکشن یہ ہے کہ وہ کنفرنٹیشن کو اوائڈ کرتے ہوئے کام کریں"۔

۵ دسمبر کی شام کو اسلامک سوسائٹی آرنج کاونٹی کے ہال میں ایک اجتماع میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ یہ مسلم، مسیحی اور یہودی سیمینار (Trialogue) تھا۔ پہلے ایک یہودی عالم نے تقریر کی اور اپنے مذہب کی تعلیمات کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد ایک عیسائی عالم کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے مذہب کے بارہ میں تفصیل سے بتایا۔ آخر میں ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی (ڈائرکٹر اسلامک سوسائٹی آرنج کاؤنٹی) کھڑے ہوئے، انھوں نے اسلام کا تعارف پیش کیا۔

ڈاکٹر صدیقی کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی صلاحیت عطا کی ہے۔ انھوں نے اسلام کا تعارف

کرایا تو ان کی تقریر پچھلی دونوں تقریروں پر بھاری ہوگئی۔ لوگوں نے نہایت پسند کیا۔ میرے قریب کی سیٹوں پر چند امریکی نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ Comparative religion (تقابلی مذہب) کے طلبہ تھے۔ وہ اگرچہ مسیحی تھے اور امریکہ کی سفید فام نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر ڈاکٹر صدیقی کی تقریر سننے کے بعد ایک نوجوان بے اختیار کہہ اٹھا کہ میں مسیحی ہوں۔ مگر ڈاکٹر صدیقی کی تقریر نے مجھے اپنے عقیدہ کے بارہ میں شک میں ڈال دیا ہے اور میں دوبارہ سوچنے پر مجبور ہوگیا ہوں۔ مجھے اسلام کے بارہ میں اور زیادہ جاننے کی ضرورت ہے۔ وہ واقعتاً غیر معمولی قسم کے لائق آدمی ہیں:

I am a Christian. But Dr. Siddiqi's presentation make me think twice. I have to learn more about Islam. He was terrific real genius.

ڈاکٹر صدیقی نے اپنی تقریر میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کا تعارف کراتے ہوئے آخر میں یہ بھی کہا تھا کہ اگرچہ تمام مذاہب خدا کی طرف سے آئے۔ مگر آج تمام مذاہب میں محفوظ مذہب (Preserved religion) صرف ایک ہے، اور وہ اسلام ہے۔ یہی اسلام کو پیش کرنے کا صحیح ترین طریقہ ہے۔ اسلامی دعوت میں ہمیں فروعی یا سیاسی باتوں کو چھوڑتے ہوئے صرف بنیادی تعلیمات کو پیش کرنا ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ دیگر مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کی ترجیح بتانے کے لئے یہ نہیں کہنا ہے کہ اسلام افضل مذہب ہے۔ ہمیں ترجیح بتانے کے لئے صرف ایک بات کہنا ہے اور وہ یہ کہ اسلام ہی آج محفوظ مذہب ہے۔ دوسرے مذاہب تاریخی اعتبار سے محفوظ مذہب نہیں۔

میرا خیال ہے کہ اگر ڈاکٹر صدیقی جیسے افراد کی رہنمائی میں اس قسم کی سنجیدہ کانفرنسیں یورپ اور امریکہ میں کی جائیں تو ان کے ذریعہ زبردست دعوتی فائدہ حاصل ہوگا۔ پروگرام کے مطابق آخر میں اختتامی کلمات مجھے کہنا تھا۔ مگر ڈاکٹر صدیقی کی تقریر کے بعد سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ بعض وجوہ سے میں آخر وقت تک ٹھہر نہ سکا۔ میں خاتمہ سے پہلے چلا آیا۔

نیویارک سے جناب کلیم الدین صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے یہ خوشی کی بات بتائی

کہ وہ وہاں الرسالہ مشن کو پھیلا رہے ہیں۔ ۴ دسمبر کی شام کو دوبارہ نیویارک سے جناب محمد ابراھیم صاحب (۴۲ سال) کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ کمپیوٹر انجینئر ہیں اور ۱۸ سال سے نیویارک میں مقیم ہیں۔ وہ ۱۹۸۹ میں حج کے لئے گئے تھے۔ وہاں انھوں نے دعا کی کہ خدایا، مجھے دین کا علم عطا فرما۔ واپسی پر ان کی ملاقات کلیم الدین صاحب سے ہوئی۔ انھوں نے محمد ابراہیم صاحب کو الرسالہ پڑھنے کے لئے دیا۔ الرسالہ کو پڑھتے ہی انھیں محسوس ہوا کہ ان کی دعا قبول ہوگئی۔ الرسالہ اور مطبوعات الرسالہ کی صورت میں انھوں نے اس علم دین کو پالیا جو ان کی روح طلب کر رہی تھی۔ اب دونوں مل کر نیویارک میں الرسالہ مشن کا کام کر رہے ہیں۔

میرے نزدیک مغربی دنیا میں سب سے بڑا اسلامی مسئلہ یہ ہے کہ یہاں کی زبان میں صحیح اسلامی لٹریچر موجود نہیں۔ یہاں میں نے ۵۰ صفحہ کی ایک انگریزی کتاب دیکھی۔ وہ خاص طور پر غیر مسلموں میں اسلام کے تعارف کے لئے چھاپی گئی ہے۔ اس کا نام تھا:

Introducing Islam to non-Muslims

اس کتاب میں جہاد کے عنوان کے تحت کہا گیا تھا کہ جہاد مقدس جنگ (Holy War) نہیں ہے۔ مقدس جنگ کا تصور ایک مسیحی تصور ہے۔ اس کے بعد جہاد کی تشریح کرتے ہوئے درج تھا کہ جہاد صرف دفاعی جنگ بھی نہیں۔ بلکہ وہ کسی بھی غیر منصفانہ حکومت کے خلاف جنگ کا نام ہے۔ اگر ایسی حکومت موجود ہے تو اس کے خلاف جنگ کی جائے گی۔ یہ جنگ لیڈروں کے خلاف ہوگی نہ کہ ملک کے عوام کے خلاف۔ عوام کو نامنصفانہ حکومت کے قبضہ سے نکالا جائے گا تاکہ وہ آزادانہ طور پر اللہ پر ایمان لاسکیں:

> *Jihad* is not also a defensive war only, but a war against any unjust regime. If such a regime exists, a war is to be waged against the leaders, but not against the people of that country. People should be freed from the unjust regimes and influences so that they can freely choose to believe in Allah.

جہاد کا یہ نظریہ غلط ہے اور وہ غیر مسلموں کو اسلام سے بیزار کرنے والا ہے۔ یہ نظریہ جہاد

کو مسیحیوں کی مقدس جنگ کی مانند بنا دیتا ہے۔ اس کے بعد دونوں کو الگ کرنا ممکن نہیں۔

۵ دسمبر کی صبح کو میں نماز فجر کے بعد مسجد سے رہائش گاہ کی طرف آ رہا تھا۔ ایک کراسنگ پر انھوں نے اپنی گاڑی روک دی۔ حالاں کہ سامنے ہری بتی جل رہی تھی۔ دوسری طرف سامنے کی سڑک سے ایک اور بڑی گاڑی آئی، وہ رکے بغیر گزر گئی۔ حالاں کہ وہاں لال بتی جل رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ دوسری گاڑی ایمبولنس کی گاڑی تھی۔ وہ خاص الارم بجاتے ہوئے جا رہی تھی۔ ایمبولنس یا فائر بریگیڈ کی گاڑی جب کسی راستہ سے گزرے تو ہمیشہ ایسا ہی کیا جاتا ہے۔ وہ مسلسل اپنی منزل کی طرف چلتی رہتی ہے خواہ وہاں لال بتی ہو۔ اور دوسری گاڑیاں کھڑی ہو جاتی ہیں خواہ ان کے سامنے ہری بتی جل رہی ہو۔

جب کہیں ایمرجنسی پیش آجائے تو تمام سرگرمیوں کو روک کر ایمرجنسی کی طرف دوڑنا پڑتا ہے۔ یہ حیات دنیا کا قانون ہے۔ یہی معاملہ مزید شدت کے ساتھ آخرت کے لئے ہے۔ جب لوگ ہدایت سے دور ہو جائیں اور حیاتِ آخرت کے اعتبار سے لوگوں کے لئے نقصان کا اندیشہ ہو تو تمام دوسری سرگرمیوں کو روک کر لوگوں کو ہدایت کا پیغام پہنچایا جائے گا۔ اور یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک لوگ ہدایت کے راستہ پر نہ آ جائیں۔

لاس اینجلیز کی کانفرنس ۲۴۔ ۲۵ نومبر میں امام عزت اللہ المجددی سے ملاقات ہوئی۔ وہ افغانی لیڈر پروفیسر صبغت اللہ المجددی کے بھائی ہیں۔ نہایت ذہین آدمی ہیں اور کئی زبانیں جانتے ہیں۔ وہ جہاد افغانستان میں زخمی ہو گئے تھے۔ علاج کے بعد اب اچھے ہیں۔ افغانی قوم ایک نہایت جاندار قوم ہیں۔ اس کے اندر غیر معمولی صلاحیت ہے۔ مگر سیکڑوں سال سے یہ صلاحیت جنگ و قتال کی راہ میں لگی ہوئی ہے۔ اس سے افغانی قوم کی بہادری کی مثالیں تو ضرور قائم ہوئی ہیں۔ مگر اس کا دوسرا نقصان یہ ہوا کہ افغانستان اپنے سارے امکانات کے باوجود کسی بھی اعتبار سے ترقی یافتہ ملک نہ بن سکا۔

پچھلی صدی میں افغانیوں نے انگریزوں کا سیاسی غلبہ اپنے ملک میں ہونے نہیں دیا۔ موجودہ صدی میں انھوں نے روسیوں سے لڑ کر انھیں ملک سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ مگر اسلامی نقطہ نظر سے میں اس کو کوئی بڑا کارنامہ نہیں سمجھتا۔ اسلامی اعتبار سے ان کے لئے زیادہ

بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ دنیا سے شرک اور الحاد کا خاتمہ کرتے۔ مگر افغانی لیڈروں نے افغانی قوم کو اس راہ پر کبھی نہیں لگایا۔

کانفرنس میں بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر عاقل خاں راجپوت تھے۔ وہ امریکہ کے محکمہ میزائل (Missile Weapons Systems) میں ایک بڑے عہدہ پر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ الور کے ایک گاؤں مونڈ اوریں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ کے ہنگامہ میں وہ پاکستان چلے گئے۔ اس کے بعد امریکہ آکر سائنسی تعلیم حاصل کی اور ترقی کرتے ہوئے موجودہ عہدہ پر پہنچے۔

۱۹۴۷ میں بے بسی کے عالم میں کوئی شخص ان کو الور سے بھاگتے ہوئے دیکھتا تو وہ ان کے معاملہ کو صرف ظالم اور مظلوم کا ایک معاملہ سمجھتا۔ مگر ۱۹۴۷ کا مظلوم نوجوان ۱۹۹۰ کا ہیرو انسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مشکل حالات آدمی کے لئے زحمت کے بھیس میں رحمت (blessing in disguise) کے ہم معنی ہیں۔ مشکل حالات آدمی کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو جگاتے ہیں۔ اور کسی آدمی کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اس کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتیں جاگ اٹھی ہوں۔

صغیر اسلم صاحب کے یہاں ۲۲ نومبر کو ایک سفید فام امریکی نوجوان لینی (Lenney) بطور کاریگر کام کرنے کے لئے آیا۔ وہ خوش پوش اور صحت مند تھا۔ کار پر بیٹھ کر آیا تھا۔ میرا ابتدائی تاثر یہ تھا کہ یہاں کے مزدور اور کاریگر بہت اچھی حالت میں ہیں۔ اگلے دن ۲۳ دسمبر کو امریکی عیسائیوں کا خصوصی تہوار تھینکس گوِنگ (Thanksgiving) تھا۔ اس لئے اس نے ۲۳ نومبر کو چھٹی کر لی۔ دوپہر کو صغیر اسلم صاحب کے پاس اس کا ٹیلیفون آیا کہ میرے پاس پیسہ نہیں ہے، اس لئے کل کی مزدوری مجھے پیشگی دے دو۔ اس کے بعد وہ اپنی گاڑی پر آیا اور ۱۰ ڈالر پیشگی لے کر چلا گیا۔

یہ چھوٹا سا واقعہ عام امریکیوں کے مزاج کو بتاتا ہے۔ عام امریکی بے پناہ خرچ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس پیسہ باقی نہیں رہتا۔ اکثر اوقات وہ مقروض رہتے ہیں۔ مزید یہ کہ بظاہر خوش پوشاک اور خوش وخرم آدمی اندر سے غیر مطمئن ہوتا ہے۔ حقیقی

خوشی سے محرومی کی تلافی وہ شراب کے ذریعہ کرتا ہے۔ امریکیوں کی غلط عادتوں نے، ساری ترقی کے باوجود، انھیں اندر سے کھوکھلا کر رکھا ہے۔

محمد اسد صاحب کے انگریزی ترجمہ قرآن (The Message of the Qur'an) کا ذکر سنا تھا مگر اس کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ یہاں اس کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میرے سامنے جو نسخہ ہے، وہ نہایت عمدہ چھپا ہوا صرف ایک جلد میں ہے۔ اس کے ایک ہزار صفحات ہیں۔ وہ انگلینڈ میں چھپا ہے اور درج ذیل ادارہ نے اس کو شائع کیا ہے:

Dar al-Andalus Limited, 3 Library Ramp, Gibraltar

تشریحی نوٹوں میں محمد عبدہ (المنار) کے کافی حوالے ہیں اور اسی طرح الرازی کے بھی۔ تاہم بیشتر مقامات پر تشریح کا انداز روایتی ہے۔ مثال کے طور پر عسی ان یبعثک ربک مقاما محمودا کا ترجمہ مع تشریح یہ کی ہے:

...and thy sustainer may well raise thee to a glorious station
(in the life to come).

ترجمہ کے سلسلہ میں میرا ذوق یہ ہے کہ اس کو خالص لفظی ہونا چاہئے۔ تشریحی ترجمہ مجھے ذاتی طور پر پسند نہیں۔ مگر اسد صاحب نے جگہ جگہ تشریحی ترجمے کئے ہیں۔ مثال کے طور پر ان مع العسر یسرا کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

Verily, with every hardship comes ease.

اس ترجمہ میں کوئی مزید تشریح درج نہیں ہے۔ اس ترجمہ میں comes کا لفظ تشریحی اضافہ ہے۔ اس سے آیت کی اصل معنویت متاثر ہو جاتی ہے۔ صحیح لفظی ترجمہ اس طرح ہونا چاہئے:

Verily, with every difficulty there is ease.

محمد اسد صاحب بنیادی طور پر ایک صحافی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس تفسیر میں وہ گہرائی نہیں جو ایک محقق کے یہاں ملتی ہے۔ مثال کے طور پر یورپ اور امریکہ کے مستشرقین کا ایک اعتراض قرآن پر یہ ہے کہ اس میں تصنیفی یکسانیت نہیں۔ اس میں incoherent rambling پائی جاتی ہے۔ مثلاً کہیں اللہ کا لفظ ہوگا کہیں وہ، کہیں ہم اور کہیں میں، کہیں ہم پر اور کہیں مجھ پر۔

اس کا جواب محمد اسد صاحب نے یہ دیا ہے:

These changes are... a linguistic device meant to stress the idea that God is not a person and cannot, therefore, be really circumscribed by the pronouns applicable to finite beings. (Foreword)

یہ جواب مجھے سطحی معلوم ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں اس قسم کے فرق کا سبب کوئی الٰہیاتی مسئلہ نہیں۔ یہ صرف لسانی اسلوب ہے۔ مستشرقین قرآن کو اپنے معروف تصنیفی معیار پر جانچنا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ قرآن ایک دعوتی کتاب ہے، اس میں داعیانہ اندازِ کلام اختیار کیا گیا ہے۔ اور دعوتی کلام یا داعیانہ اسلوب میں اس قسم کا فرق عین مطلوب ہے، کیوں کہ اس سے کلام میں زور اور تاثیر پیدا ہوتی ہے۔

صغیر اسلم صاحب پاکستان سے ۱۹۵۷ میں کیلی فورنیا (امریکہ) آئے۔ اس وقت وہ نوجوان تھے۔ وہ یہاں کی فضا میں عریانیت اور فحاشی کو دیکھ کر پریشان ہوگئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہاں اپنے ایمان و اخلاق کو کس طرح بچائیں۔ انھوں نے بتایا کہ چودھری محمد علی (سابق وزیر اعظم پاکستان) ان کے رشتہ دار تھے۔ صغیر اسلم صاحب نے چودھری محمد علی صاحب سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ قرآن میں ہے کہ نماز آدمی کو فحش اور منکر سے روکتی ہے۔ اس لئے میں تم کو صرف ایک مشورہ دیتا ہوں۔ تم نماز کے پابند بن جاؤ۔ نماز تم کو محفوظ رکھے گی۔ صغیر اسلم صاحب نے اس مشورہ کو پکڑ لیا اور خدا کے فضل سے امریکہ میں ۳۳ سال سے مومن و مسلم بن کر رہ رہے ہیں۔

اس واقعہ کو میں نے سنا تو میں نے سوچا کہ پاکستان بننے کے بعد اس کے ابتدائی دور میں کیسے کیسے قیمتی لوگ پاکستان کو ملے تھے۔ مگر اسلام پسندوں کی مجنونانہ سیاست کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان کے بہترین لوگ استعمال ہونے سے رہ گئے۔ ان میں سے بہت سے لوگ تھے جو وہاں کے خلفشار کو دیکھ کر باہر کے ملکوں میں جاکر رہنے لگے۔ ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ پاکستان بنے ہوئے تقریباً ۴۵ سال ہوگئے۔ مگر پاکستان کو جتنا ترقی کرنا چاہئے تھا وہ نہ کرسکا۔ میں نے کہا کہ سب سے زیادہ ذمہ داری ان نام نہاد اسلام پسندوں پر ہے جو پاکستان بنتے ہی وہاں

کے حکمرانوں سے لڑ گئے۔ اگر یہ لوگ عملی سیاست سے الگ رہ کر افراد سازی اور اصلاح معاشرہ کے کام میں لگتے تو آج پاکستان کی تصویر بالکل مختلف ہوتی۔

ایک صاحب ہندستان سے امریکہ آئے اور اب یہاں کے شہری ہو کر آرام کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ وہ یہاں ایک سرکاری محکمہ میں ایک اچھے عہدہ پر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان کے حکمراں منافق ہیں، وہ سیکولرزم کی باتیں کرتے ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ تعصب کا معاملہ کرتے ہیں۔ آپ لوگ ان کے خلاف جہاد کیوں نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ امریکہ اس سے بڑا منافق ہے۔ وہ کویت میں صدام کے قبضہ (occupation) کی مذمت کرتا ہے اور اس کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ دوسری طرف یہی امریکہ فلسطین میں یہودیوں کے قبضہ کی حمایت اور سرپرستی کر رہا ہے۔ اس کے باوجود آپ امریکہ کے ساتھ ایڈجسٹ کرکے یہاں رہ رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ڈبل اسٹینڈرڈ ہے۔ اپنے لئے آپ ایڈجسٹمنٹ کا اصول پسند کرتے ہیں اور دوسروں کو جنگ اور ٹکراؤ کا مشورہ دے رہے ہیں۔

۲۲ نومبر کو صغیر اسلم صاحب کو ایک ڈاکٹر کے پاس جانا تھا۔ میں بھی ان کے ساتھ چلا گیا کہ دیکھوں یہاں کے ڈاکٹروں کے کلینک کیسے ہوتے ہیں۔ واپسی میں ایک مسئلہ پیش آگیا۔ صغیر اسلم صاحب جب اپنی گاڑی میں بیٹھے اور اس کو اسٹارٹ کرنا چاہا تو کوشش کے باوجود وہ اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ یہ نئی اسٹرلنگ (Sterling) گاڑی تھی۔ خیال ہوا کہ شاید بیٹری ختم ہوگئی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے وہیں سے انشورنس کمپنی کو ٹیلیفون کیا۔ اس کے صرف آٹھ منٹ بعد ان کا آدمی ایک بڑی گاڑی لے کر آگیا جس میں ٹیلیفون سے لے کر کرین تک ہر چیز موجود تھی۔ آدمی نے کافی کوشش کی۔ مگر گاڑی اسٹارٹ نہ ہو سکی۔ آخر کار اس نے کہا کہ اب یہ گاڑی ورک شاپ جائے گی۔ اس نے اپنے آفس کو ٹیلیفون کرکے گاڑی کو ورک شاپ بھیجنے کا انتظام کیا اور ہم لوگوں کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر گھر تک پہنچا دیا۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے کہ یہاں کام کرنے کا انداز کیا ہے۔ یہی وہ سہولتیں ہیں جن کی بنا پر ہندستان (اور دوسرے ملکوں) کے اکثر ذہین اور تعلیم یافتہ لوگ اپنے ملکوں کو چھوڑ کر مغربی ملکوں میں پہنچ رہے ہیں۔ ہندستان میں مندر اور مسجد کے جھگڑوں پر اور جلوس اور نعروں

کے ہنگاموں پر کروڑوں لوگ سرگرم ہیں۔ حتی کہ اپنا جان و مال تباہ کر رہے ہیں۔ مگر ملک میں کارکردگی کا اعلیٰ ماحول بنانے کے لئے کوئی سرگرم نہیں ہوتا۔

ایک تاجر کے دفتر میں میں نے دیکھا کہ ایک امریکی خاتون بطور سکریٹری کام کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے تجربہ میں کس ملک کے ورکر سب سے اچھے ہوتے ہیں۔ انھوں نے فوراً کہا کہ جاپانی۔ انھوں نے کہا کہ جاپانی ورکر نہایت وفادار، نہایت محنتی اور نہایت دیانتدار ہوتا ہے۔ یہاں ہر آفس والا جاپانی ورکر کو پسند کرتا ہے۔ مگر جاپان کے لوگ زیادہ تر بزنس کے لئے آتے ہیں۔ وہ ملازمتوں کے لئے کم آتے ہیں۔

انھوں نے مزید بتایا کہ ایک ٹیلیویژن پروگرام میں انھوں نے دیکھا کہ جاپان میں ورکروں کی تربیت کے لئے بڑی بڑی تنظیمیں بنی ہوئی ہیں۔ وہاں بہت سے ادارے ہیں جو نہایت اعلیٰ پیمانہ پر تربیت دے کر اپنے افراد کے اندر وہ صفات پیدا کرتے ہیں جس کے بعد وہ بہترین کارکن بن سکیں۔ میں نے سوچا کہ ہندستان کے نام نہاد مسلم لیڈر اگر صرف یہ کرتے کہ وہ ایسے ادارے قائم کریں جو مسلمانوں کو تربیت دے کر عمدہ کارکن بنائیں تو آج مسلمان ملک کی غالب کمیونٹی کا مقام حاصل کر لیتے۔ مگر ان نا اہل لیڈروں نے مسلم عوام کو جذباتی نعروں پر دوڑا کر صرف ان کی بربادی کا کارنامہ انجام دیا ہے۔

صغیر اسلم صاحب ان مستثنیٰ افراد میں سے ہیں جو اپنی فطرت پر قائم رہتے ہیں۔ مثلاً ان کے ساتھ اشتعال انگیزی کی جائے تب بھی وہ مشتعل نہیں ہوتے۔ ایک بار ایک صاحب ان پر غصہ ہو گئے اور مجمع کے اندر انھیں برا بھلا کہنے لگے۔ وہ صاحب نہایت سخت الفاظ بول رہے تھے، مگر صغیر اسلم صاحب انھیں کوئی جواب نہیں دے رہے تھے۔ ایک شخص نے کہا کہ وہ آپ کے ساتھ اتنی سخت کلامی کر رہے ہیں اور آپ اس کے جواب میں کچھ نہیں بولتے۔ صغیر اسلم صاحب کا مختصر جواب یہ تھا: یہ ان کا پرابلم ہے، میرا پرابلم تو نہیں۔

ہر آدمی پیسہ کمانا چاہتا ہے۔ اس اعتبار سے ہر ملک گویا تجارتی ملک ہے۔ مگر امریکہ میں تجارت کو ایک خوب صورت فن بنا دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر بچوں کی چیزوں کے نام پر بے شمار تجارتیں وجود میں آئی ہیں۔ انھیں میں سے ایک بچوں کا لٹریچر ہے۔ بچوں کے

لئے کتابیں اتنے خوب صورت اور اتنے معیاری انداز میں چھاپی جاتی ہیں کہ ماں باپ اس کو خریدنے کے لئے مجبور ہو جائیں۔

مثلاً ایک کتاب نظر سے گزری۔ ۲۰۰ صفحہ کی اس خوب صورت کتاب کا نام تھا ــــ مجھ کو بتاؤ کہ کیوں (Tell Me Why) نام کے نیچے یہ الفاظ درج تھے:

Brief, accurate answers to hundreds of questions children ask about.

میں نے اس کے مختلف حصے پڑھے۔ کتاب اپنے نام کے عین مطابق تھی۔ ار ں میں نے اس طرح کی کئی کتابیں دیکھی ہیں۔ مگر ان میں معلومات کم اور ادبیت زیادہ ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ معلومات متعین اور محدود انداز میں نہیں ہوتیں۔ مذکورہ کتاب کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ انتہائی سادہ اور انتہائی محدّد اسلوب میں لکھی گئی تھی۔ البتہ انواع حیات سے متعلق معلومات میں جگہ جگہ نظریۂ ارتقا، شامل تھا جس سے مجھے اتفاق نہیں۔ میں ارتقا کو محض ایک مفروضہ سمجھتا ہوں نہ کہ کوئی واقعی حقیقت۔

ایک رپورٹ عالمی اقتصادیات کے بارہ میں دیکھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ۱۹۸۶ میں امریکہ کے اوپر قومی قرضہ ۲۱۱۲ بلین ڈالر تھا۔ اس لحاظ سے امریکہ وہ ملک ہے جس کے اوپر سب سے زیادہ قومی قرضہ ہے:

The largest national debt is that of the US

میں نے امریکہ کے ایک معاشی عالم سے اس کا ذکر کیا۔ اس نے کہا کہ ہمارے قرضہ کی وہ نوعیت نہیں ہے جو تیسری دنیا کے قرضہ کی ہوتی ہے۔ تیسری دنیا کے ملک اقتصادی مدد کے طور پر قرض لیتے ہیں۔ اور کئی ملکوں کا یہ حال ہے کہ وہ اس کی قسط بھی ادا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اس کی قسط کی ادائگی کے لئے دوبارہ قرض لینا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس امریکہ جو قرض لیتا ہے وہ پیداواری مقصد کے لئے لیتا ہے، جیسے ایک کمپنی بینک سے قرض لے کر اپنا کاروبار بڑھاتی ہے۔ چنانچہ امریکہ اگر سب سے بڑا مقروض ملک ہے تو اس سے زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ قومی پیداوار (National product) کے معاملہ میں وہ تمام دنیا کے ملکوں سے بڑھا ہوا ہے:

The country with the largest GNP is the US,
reaching nearly $ 4,000 billion in 1986.

لینااور دینااس دنیا میں نسبتی مقدار کا نام ہے۔اگر آپ دنیا سے زیادہ لے رہے ہوں مگر دینے کے معاملہ میں اس سے بھی زیادہ دے رہے ہوں تو آپ لوگوں کی نظر میں دینے والے ہی سمجھے جائیں گے۔

مشہور کتاب گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈس (Guinness Book of World Records) کا نام میں نے سنا تھا مگر اس کو دیکھا یا پڑھا نہیں تھا۔ وہ کتاب مجھ کو یہاں ملی۔ اس کا کافی حصہ دیکھا۔ میرے سامنے اس کا ۱۹۸۷ کا اڈیشن ہے۔ انڈکس وغیرہ کو شامل کرتے ہوئے اس کے تقریباً ۳۰۰ صفحات ہیں۔ یہ کتاب کئی آدمیوں نے مل کر تیار کی ہے۔

دیباچہ میں بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب پہلی بار امریکہ سے ۱۹۵۶ میں شائع ہوئی۔ چھپتے ہی وہ بہت زیادہ بکنے والی کتابوں (best-sellers) میں نمبر ایک کتاب بن گئی۔ ۲۵ زبانوں میں وہ ۱۹۸۷ تک ۲۲۰ بار چھپ چکی تھی۔ جن زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے ہیں، ان میں عربی اور ہندی زبانیں بھی شامل ہیں۔

اس کتاب میں ہر قسم کی غیر معمولی چیزوں کا ذکر ہے۔ مثلاً سب سے لمبا آدمی، سب سے اونچا پہاڑ، سب سے پرانا درخت، سب سے لمبا یا سب سے چھوٹا دریا، سب سے بڑا آئس برگ وغیرہ۔ یہ کتاب گویا ریکارڈ توڑ چیزوں (Record breakers) کی قاموس ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ کتاب چھپی تو وہ خود ریکارڈ توڑنے کی ایک مثال ہو گئی۔ ۱۹۸۶ تک عالمی سطح پر ۵۳ ملین کتابیں فروخت ہو چکی تھیں۔ یہ تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اگر ان کو ایک کے اوپر ایک رکھا جائے تو ان سے ۱۱۸ ڈھیر ایسے بن سکتے ہیں جن میں سے ہر ایک کی اونچائی ماونٹ ایورسٹ کے برابر ہو۔ جبکہ ماونٹ ساڑھے پانچ میل اونچا ہے۔

کتاب کے الفاظ میں اچنبھے میں ڈالنے والے واقعات (amazing facts) کے اس مجموعہ کو اتنی زیادہ مقبولیت کیوں حاصل ہوئی۔ اس پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ انسان کی فطرت میں پیدائشی طور پر سب سے زیادہ طاقتور احساس یہی اچنبھا (amazement)

اور استعجاب کا احساس ہے۔ آدمی کے اندر بے پناہ گہرائی کے ساتھ یہ جذبہ چھپا ہوا ہے کہ وہ کسی ایسی چیز کو دیکھے جو غیر معمولی حد تک عظیم ہو تو اس کی عظمت کے احساس سے سرشار ہو جائے۔ اسی احساس کا ایک نتیجہ فطرت پرستی اور ہیرو پرستی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

انسان کے اندر یہ شعور اس لئے رکھا گیا تھا کہ وہ خدائے ذوالجلال کو پہچانے اور اس کے آگے اپنی عبدیت کا اظہار کرے۔ یہی "الٰہ" کا مطلب ہے۔ لاالٰہ الااللہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے اپنے احساس کو دوسری تمام سمتوں سے ہٹا کر ایک خدا کی طرف موڑ لیا۔ شرک کی تمام صورتیں دراصل اسی احساس کا غلط استعمال ہیں۔

ایک صاحب یہاں کے "اردو داں مسلمانوں" کی دعوت پر امریکہ آئے تھے۔ یہاں انھوں نے اپنے ہم وطنوں کے درمیان تقریریں کیں۔ ان کا ایک کیسٹ سننے کا اتفاق ہوا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ دعوتی کام، جس کو یہاں دعوہ ورک (*Daw'ah* work) کہا جاتا ہے۔ وہ محدود معنوں میں ایک اچھا کام ہو سکتا ہے۔ مگر یہی اصل اسلامی کام نہیں۔ اصل کام ہے نظام کو بدلنا۔ ہم ایک مکمل انقلاب لانے کے علمبردار ہیں۔ اور مکمل انقلاب جہاد و قتال کے بغیر کبھی نہیں آتا۔ ہمارا نشانہ یہ ہے کہ انقلابی جد وجہد کے ذریعہ امریکہ میں اور اسی طرح سارے عالم میں مکمل اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔

اس قسم کی باتوں کا تعلق اسلام سے تو کیا ہوگا۔ ان کا عقل سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اس کو ایک قسم کی سیاسی شاعری کہا جا سکتا ہے۔ مصر اور پاکستان کے اسلام پسندوں نے اسی قسم کی سیاسی شاعری میں پچاس قیمتی سال ضائع کر دئے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ مسلمانوں کی پیرانوئک (paranoiac) نفسیات ہے جس کی بنا پر ایسے مقرروں کو کچھ سامعین مل جاتے ہیں۔ ایسا نہ ہو تو اس قسم کے لوگوں کو حقائق کی اس دنیا میں کوئی سننے والا اور پڑھنے والا نہ ملے۔

قرآن وسنت کے مطابق اسلام کا اصل کام دعوتی کام ہے۔ دعوتی کام سے مراد کوئی سطحی کام نہیں، اس سے مراد افراد کے اندر ذہنی انقلاب لانا ہے۔ اسلام کا اصل مقصد یہ ہے کہ

لوگ اللہ کی معرفت حاصل کریں۔ لوگ آخرت کی حقیقت کو محسوس کرنے والے بن جائیں۔لوگ اسلام کی صداقت پر یقین کرنے والے بن جائیں۔ یہی جڑ کا کام ہے۔جو لوگ اس معنی میں اسلام کو پالیں، وہ آخرت میں خدا کی ابدی رحمتوں کے مستحق ٹھہریں گے۔اور اگر اس قسم کے انسانوں کی بڑی تعداد کسی مقام پر پیدا ہو جائے تو اس کے بعد ان کے درمیان وہ چیز بھی وجود میں آجاتی ہے جس کو اسلامی حکومت کہا جاتا ہے۔

یہاں یونیورسٹیوں اور لائبریریوں وغیرہ کے اندر پارکنگ لاٹ ہیں۔اس کے مطابق ، ہر طبقہ کا آدمی اپنی مختص کی ہوئی لاٹ میں گاڑی کھڑی کرتا ہے۔لاٹ کے گیٹ کمپیوٹرائزڈ ہوتے ہیں۔ان کے اندر مطلوبہ کارڈ ڈالنے ہی سے وہ دروازے کھلتے ہیں۔ایک لائبریری میں ایک جگہ جنگلہ سا نظر آیا۔یہاں سائیکل کھڑے کرنے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔غالباً دس سائیکلوں کی جگہ ہوگی ، مگر صرف دو سائیکلیں وہاں کھڑی ہوئی تھیں۔البتہ وہاں لکھے ہوئے یہ الفاظ بہت قابل توجہ تھے ـــــ اس کو تالا لگاؤ یا اس کے کھونے کا انتظار کرو :

Lock it or loose it.

میں نے سوچا کہ یہ مسئلہ صرف سائیکل کا نہیں بلکہ خود "سائیکل سوار" کا بھی ہے۔آدمی کو خود بھی یہی کرنا ہے کہ وہ اپنے آپ پر تالا لگائے ، اپنے آپ کو حد سے باہر جانے سے روکے۔ورنہ وہ اپنے آپ کو کھو دے گا۔ بے تالے کی سائیکل کو چور لے جاتا ہے اور بے تالے کے آدمی کو شیطان۔

ایک عرب سے ملاقات ہوئی۔ وہ حزب التحریر سے تعلق رکھتے ہیں۔یہ حزب ۱۹۵۳ء میں عرب میں قائم ہوئی تھی۔اس کے موسس الشیخ نبھانی ہیں۔مگر عرب ملکوں میں ہر جگہ ان پر پابندی ہے۔اس لئے یہ لوگ آجکل امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔

انھوں نے ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ایک کتاب دی۔اس عربی کتاب (حزب التحریر) میں اس تحریک کا تعارف درج تھا۔اس میں بتایا گیا ہے کہ کافر حکومتوں کے غلبہ و نفوذ (سیطرۃ الدول الکافرۃ ونفوذھا) کا سبب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں " خلافت" کا ادارہ

قائم نہیں ہے۔ ان حضرات کے نزدیک سب سے پہلا اسلامی کام یہ ہے کہ خلافت کا قیام عمل میں لایا جائے۔

اس میں ان لوگوں پر تنقید کی گئی ہے جو "اصلاح افراد" کی بات کرتے ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ مجتمع کی اصلاح افراد کی اصلاح سے نہیں ہوتی بلکہ مجتمع کی اصلاح اس کے نظام کی اصلاح سے ہوتی ہے (ان اصلاح المجتمع لا یکون باصلاح افرادہ بل ان اصلاح المجتمع انما یکون باصلاح انظمتہ)

یہ مارکسی طرز فکر کو اسلام میں داخل کرنا ہے جس کو قرآن میں مضاہاۃ کہا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے تمام انقلابی مفکرین اسی مضاہاۃ کا شکار ہوئے ہیں۔ مگر اسلام کے نزدیک اصل اہمیت فرد کی ہے۔ فرد کے اندر توحید اور آخرت کا شعور پیدا کرنا، یہی اصل اسلامی کام ہے۔ بقیہ تمام چیزوں کی حیثیت ثانوی ہے۔

ورلڈ کونسل آف چرچز کے نام سے جنیوا میں ایک ادارہ قائم ہے۔ فروری ۱۹۹۱ میں اس کا ایک بڑا اجلاس آسٹریلیا میں ہونے والا ہے۔ اس میں ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی کو خصوصی دعوت نامہ ملا ہے۔ میں نے دعوت نامہ کو دیکھا۔ اس میں اس کی ایک تقسیم یہ بتائی گئی تھی جو میرے نزدیک نہایت درست تھی:

The creation and perception of enemy images are among the ideological and psychological roots of militarism.

امریکہ کے ایک بہت بڑے تاجر ہیں۔ ان کا نام Alfred Armand Montapert (مونٹاپرٹ) ہے۔ انھوں نے لاس اینجلیز میں ۱۲ سال کی عمر میں ایک مزدور کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ مگر ان کی حوصلہ مند طبیعت زندگی میں اوسط کامیابی (average success) پر راضی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے تعلیم شروع کرکے الکٹریکل انجنیرُ کی ڈگری لی۔ اس کے بعد وہ صنعت میں داخل ہوئے اور نصف درجن سے زیادہ بڑی کمپنیاں بنائیں۔

ہر آدمی کے اندر اعلیٰ ترین کامیابی حاصل کرنے کا بے پناہ جذبہ چھپا ہوا ہے۔ مگر خوش قسمت وہ ہے جس کو اللہ یہ توفیق دے کہ وہ دنیا میں " اوسط کامیابی " پر راضی ہو کر اپنے اعلیٰ

DISTILLED WISDOM

The universe does not make sense without God. – E. Stanley Jones
Religion brings man the answer which his heart desires. – Alexis Carrel
Produce great men, the rest follows. – Walt Whitman
Success is ninety-nine per cent mental attitude. – Wilferd Peterson
Who knows the mind has the key to all things else. A.B. Alcott
Expedients are for the hour; principles for the ages. – H.W. Beecher
A problem well stated is a problem half solved. – Charles Kettering
The thousand-mile journey starts with one step. – Confucius
Buy not what you want, but what you need. – Cato
A clear statement is the strongest argument. – English proverb
Keep cool; anger is not argument. – Daniel Webster
When all else is lost the future still remains. – Jean-Paul Sartre
Life begins when a person first realizes how soon it ends. – A.A.M.
No gain without pains. – Franklin
Gold is tried in fire, friendship in need. – Danish saying
Fools rush in where angels fear to tread. – Alexander Pope
Avoid the evil and it will avoid thee. –Gaelic Proverb
One example is worth a thousand arguments. – William Gladstone
If you would lift me you must be on higher ground. – Emerson
He that is good for making excuses is seldom good for anything else. – Franklin
Silence is one of the great arts of conversation. –Cicero
All your strength is in union. All your danger is in discord. – Longfellow
A man who is master of patience is master of everything else. – Lamartine
There is a woman at the beginning of all great things. – Edward Bok
Happiness lies in a constructive job well done. – Hubbard
Joy is not in things, it is in us. – Charles Wagner
Great haste makes great waste. – Franklin
There is no education like adversity. –Councillor
Many receive advice, only the wise profit by it. – Publilius Syrus
Your advertising should be written to convince your customers, not yourself. – Roy Smith
When anger rises, think of the consequences. – Confucius
Successful men usually snatch success from seeming failure. – A.P. Goutlay
My way is to begin with the beginning. – Lord Byron
It is the surmounting of difficulties that makes heroes. – Kossuth
With ordinary talent, and extraordinary perseverence, all things are attainable. – Thomas Buxton
We win by tenderness; we conquer by forgiveness. – F.W. Robertson
Life cannot go on without much forgetting. – Balzac
Many of the greatest men have owed their success to industry rather than to cleverness. – A.A.M.
Go outdoors and get rid of nerves. – Dr. Frank Crane
The only period of time you can ever act upon is right now. – Dr. Paul Parker
One cannot be envious and happy at the same time. – Henry Greber
Little effort, little result; big effort, big result. – A.A.M.
Nature works on a method of all for each and each for all. – Emerson
Violence is the weapon of the weak, non-violence that of the strong – Gandhi
To speak as the common people do, to think as wisemen do. – Roger Ascham
He is safe from danger who is on guard even when safe. – Publiliuu Sqgux

کامیابی کے حوصلوں کو آخرت کی طرف موڑ دے۔ جو شخص دنیا میں اعلیٰ کامیابی حاصل کرنا چاہے وہ آخرت کے معاملہ میں تہی دست ہو کر رہ جائے گا۔

مسٹر مونٹاپرٹ کی عادت تھی کہ وہ بڑے بڑے لوگوں کے حکمت و دانش کے اقوال نوٹ کرتے رہتے تھے۔ اس طرح ان کے پاس بہت بڑا ذخیرہ اکٹھا ہوگیا۔ ان کو انھوں نے ساڑھے تین سو صفحات کی ایک کتاب کی صورت میں شائع کیا ہے۔ اس کا نام (Distilled Wisdom) (ڈسٹلڈ وزڈم) ہے۔ اس میں ایک ہزار آدمیوں کے کئی ہزار اقوال درج ہیں۔ میرے سامنے اس کا پانچواں اڈیشن ہے جو نیو جرسی سے شائع ہوا ہے۔ یہ کتاب مجھے پسند آئی۔ اس کے کچھ اقوال بطور نمونہ الگ صفحہ پر درج کئے جاتے ہیں۔

امریکہ میں پانچویں کلاس میں پڑھائی جانے والی ایک کتاب "سوشل اسٹڈیز" کے بارہ میں دیکھی۔ کتاب کا نام اور مصنف کا نام یہ تھا:

The Eastern Hemisphere, Yesterday and Today
by Kenneth S. Cooper, Silver Burdett & Ginn, 1988.

۵۵۰ صفحات پر چھپی ہوئی اس خوب صورت کتاب کا ایک باب یہ ہے ــــ محمد، عربوں کے لیڈر:

Mohammad: Leader of the Arabs

اس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۲ سال کی عمر میں محمد ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ "کیمل ڈرائیور" کی حیثیت سے ان مقامات پر گئے جہاں یہودی اور مسیحی آباد تھے۔ ان سے انھوں نے ان کے مذہب کی باتوں کو سیکھا۔ ایک عجیب و غریب قسم کی سواری کے اوپر ایک عجیب و غریب قسم کے آدمی کو ایک تصویر میں بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس کے نیچے یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں:

Here an artist shows Mohammad on a journey through the heavens to see God. Do you think the artist saw this happen? (p.339)

ایک تصویر میں ایک باریش آدمی خلافت کی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ بہت سے آدمی ننگی تلواریں اپنے ہاتھ میں اٹھائے اس کی حمایت کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس کے نیچے لکھا ہوا ہے:

Abu Bakr is being hailed as Islam's first Caliph.
How is the crowd showing him support? (p. 342)

ایک جگہ قرآن کے ایک صفحہ کی تصویر ہے۔ یہ صفحہ قدیم طرز کے معمولی خط میں لکھا ہوا ہے۔ اس تصویر کے نیچے لکھا ہوا ہے :

These pages from the Koran are a sample of Arabic writing.
Why might they be described as a work of art? (p. 352)

اس طرح کی کئی غیر نمائندہ تصویریں دینے کے بعد آخر میں ایک اور تصویر ہے۔ اس میں ایک عرب اسکالر اپنا روایتی عربی لباس پہنے ہوئے بیٹھا ہے۔ اس کے سامنے جدید طرز کی مغرب کی بنی ہوئی ایک خوردبین رکھی ہوئی ہے۔ عرب اس مغربی خوردبین پر جھکا ہوا کسی چیز کا مشاھدہ کر رہا ہے۔ اس کے نیچے لکھا ہوا ہے :

The Arab researcher is working hard to find ways to cure diseases.
What tool is he using? (p. 354)

اس طرح بچوں کی اس کتاب میں نہایت منظم طور پر اسلام کو حقیر بنا کر دکھایا گیا تھا۔ اور اس کے مقابلہ میں مغرب کی تصویر نہایت عظیم بنا کر پیش کی گئی تھی۔ کیلی فورنیا میں مقیم ایک ہندستانی مسلمان کا خط مجھے دہلی میں ملا تھا۔ انھوں نے الرسالہ پر سخت برہمی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ آپ ہندستانی مسلمانوں کو بزدلی سکھا رہے ہیں۔ آپ کے مضامین کا خلاصہ یہ ہے کہ ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے ، اس سے مسلمان آنکھیں بند کرکے تعلیم اور تجارت جیسی چیزوں میں لگ جائیں۔ اس طرح تو مسلمان اپنی شناخت بھی کھو دیں گے۔

ان مسلمان صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے مذکورہ کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس قسم کی باتوں پر ہندستان میں مسلمان لڑیں تو اس کو آپ جہاد بتاتے ہیں اور خود اس قسم کی بے شمار باتوں کو برداشت کرکے امریکہ میں اطمینان کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ بتائیے کہ آپ کا یہ رویہ ، آپ کے معیار کے مطابق ، بزدلی ہے یا بہادری۔ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مکہ کے انگریزی پرچہ مسلم ورلڈ لیگ جرنل (جولائی۔اگست ۱۹۹۰) نے امام وارث دین محمد کا ایک انٹرویو چھاپا تھا۔ اس کا ایک سوال وجواب یہ تھا:

Q. What are the deficiencies of American Muslims today.

A. Our main deficiency in America is the need for materials. Other religions in America mainly depend on their literature. So our main deficiency is that we need much more excellent literature for doing an excellent job of Dawah in the United States. (47-48)

پوچھا گیا کہ دعوت کے کام کے سلسلہ میں آج امریکی مسلمانوں کی بنیادی کمی کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ امریکہ میں ہماری بنیادی کمی سامان کی ضرورت ہے۔ امریکہ میں دوسرے مذاہب اپنی تبلیغ کے لئے زیادہ تر لٹریچر پر انحصار کرتے ہیں۔ اس لئے ہماری بنیادی کمی یہ ہے کہ ہم زیادہ اعلیٰ قسم کے دعوتی لٹریچر کے ضرورت مند ہیں۔ تاکہ ہم امریکہ میں زیادہ اعلیٰ پیمانہ پر دعوتی کام کرسکیں۔

یہاں یہ سوال ہے کہ مسلمانوں میں ہزاروں کی تعداد میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ابھی تک انگریزی میں اعلیٰ قسم کی دعوتی کتابیں تیار نہ ہوسکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے تمام علماء اور دانشور نفرتِ مغرب یا نفرت امریکہ میں جی رہے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کے لئے ناممکن ہے کہ وہ اہل مغرب کے لئے اعلیٰ دعوتی لٹریچر تیار کرسکیں۔ دعوتی کلام کے لئے محبت بھرا دل درکار ہے نہ کہ نفرت بھرا دل۔

امریکہ کے سفر میں میری ملاقات ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان سے ہوئی۔ وہ دین سے بھی واقف تھے اور اسی کے ساتھ انگریزی کی اچھی صلاحیت رکھتے تھے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے امریکہ کے خلاف سخت نفرت کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ "امریکہ اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے"۔ یہ میرے نزدیک سراسر غیر داعیانہ مزاج ہے، اور غیر داعیانہ مزاج کے ساتھ کبھی داعیانہ لٹریچر تیار نہیں کیا جاسکتا۔

امریکہ کے زمانۂ قیام میں عام ملاقاتوں کے علاوہ متعدد بار اجتماعی خطاب کا موقع ملا۔ یہ خطابات زیادہ تر تذکیری نوعیت کے تھے۔ میں نے ان خطابات میں آخرت پسندانہ مزاج، اتحاد اور دعوت کی اہمیت پر زور دیا۔ ان خطابات کا ایک نقشہ اگلے صفحہ پر درج کیا جاتا ہے۔

امریکہ کے زمانۂ قیام میں

۲۱ نومبر ۱۹۹۰	نمازعشاء کے بعد اسلامک سوسائٹی آرنج کاونٹی کی مسجد میں تقریر
۲۲ نومبر	نماز فجر کے بعد اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں درس قرآن
۲۳ نومبر	نماز فجر کے بعد اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں درس قرآن
۲۴ نومبر	نماز فجر کے بعد اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں درس قرآن
۲۴ نومبر	شام کو ایڈیسن کمیونیٹی سنٹر میں مردوں اور عورتوں کے اجتماع سے خطاب
۲۵ نومبر	مسلم فیملی کانفرنس، لاس اینجلیز میں کلچرل کنورژن کا مسئلہ اور اس کا حل پر تقریر
۲۶ نومبر	نماز فجر کے بعد اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں درس قرآن
۲۶ نومبر	نمازعشاء کے بعد اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں تقریر، بعنوان: "صحابہ اسپرٹ"
۲۷ نومبر	نماز فجر کے بعد اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں درس قرآن "مومن کا کردار"
۲۹ نومبر	نماز فجر کے بعد اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں درس حدیث
۳۰ نومبر	شام کو صغیر اسلم صاحب کی رہائش گاہ پر اجتماعی کھانا (Potluck) کے موقع پر تقریر
یکم دسمبر	نماز فجر کے بعد اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں درس حدیث
یکم دسمبر	شام کو صفی قریشی صاحب کی رہائش گاہ پر ایک اجتماع سے خطاب
۲ دسمبر	نماز فجر کے بعد اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں درس حدیث
۲ دسمبر	دوپہر کو سین گیبریل کے اسلامک سنٹر میں مردوں اور عورتوں کے اجتماع میں تقریر
۲ دسمبر	اسلامک سوسائٹی آرنج کاؤنٹی کے ہال میں مسلمانوں کے موجودہ مسائل پر تقریر
۳ دسمبر	اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں نماز فجر کے بعد درس حدیث
۳ دسمبر	دوپہر کو سین گیبریل کے اسلامک سنٹر میں تعلیم یافتہ خواتین کے اجتماع سے خطاب
۴ دسمبر	اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں نماز فجر کے بعد درس حدیث
۴ دسمبر	اسلامک انفارمیشن سروس، لاس اینجلیز میں ویڈیو پر انٹرویو
۵ دسمبر	اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں نماز فجر کے بعد درس حدیث
۵ دسمبر	صغیر اسلم صاحب کی رہائش گاہ پر خواتین کے اجتماع میں تقریر "عورت کا رول اسلام میں"
۶ دسمبر	اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں نماز فجر کے بعد درس حدیث
۶ دسمبر	شام کو اسلامک سوسائٹی کے ہال میں ـــــ "قیام امریکہ کے تاثرات"

صغیر اسلم صاحب اور ان کے بچے امریکہ کے شہری بن چکے ہیں۔ ان کی اہلیہ نے ابھی شہریت نہیں لی تھی۔ ۲۸ نومبر کی صبح کو وہ لوگ شہریت کی کارروائی مکمل کرنے کے لئے لاس اینجلیز کے متعلقہ آفس میں جا رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ میں بھی اس " تاریخی منظر" کو دیکھوں۔ چنانچہ میں بھی ان کے ساتھ روانہ ہوگیا۔

امریکی شہریت دینے کی تقریب (ceremony) سال میں دو بار کی جاتی ہے۔ کنونشن سنٹر پہنچا تو وہاں ہزاروں انسانوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ تمام امیدوار صبح سویرے اپنے گھروں سے نکل کر یہاں پہنچے تھے۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اگر انھوں نے اس موقع کو کھو دیا تو دوسرا موقع چھ مہینے کے بعد آئے گا۔

خاص راستوں سے گزارتے ہوئے تمام لوگ ایک بہت بڑے ہال میں لے جائے گئے جہاں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف شہریت کے امیدوار اور دوسری طرف وزیٹرس بٹھا دئے گئے۔ اسٹیج سے اس تقریب (ceremony) کی اہمیت بتائی جا رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد ایک سفید فام جج آکر صدارت کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے امیدوار لوگوں نے امریکہ کا ایک چھوٹا سا کاغذی جھنڈا اپنے ہاتھ سے اٹھا کر لہرایا۔ جج نے آپ کی زندگی کے اس تاریخی دن (This historic day of your life) کے الفاظ سے آغاز کرتے ہوئے کچھ ضروری باتیں کہیں۔ اس کے بعد اس نے حلف کے انگریزی الفاظ کہے اور ہر ایک نے اس کو بلند آواز سے دہرایا۔ اس کی تکمیل کے بعد جج نے اعلان کیا کہ اب یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکہ کے شہری ہیں۔ آخر میں سب لوگوں کو کھڑا کر کے نیشنل اینتھم بجایا گیا۔ معلوم ہوا کہ تین دنوں کے اندر صرف لاس اینجلیز کے سات ہزار آدمیوں کو امریکہ کا شہری بنایا گیا ہے۔

اب ہم لوگ ہال سے باہر کر دئے گئے۔ کچھ دیر کے بعد نئے امریکی شہری ایک ایک کر کے باہر آنے لگے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں سفید کاغذ کا ایک بڑا لفافہ تھا۔ اس میں شہریت کا سرٹیفکٹ اور دوسرے کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ لوگوں کے چہروں پر خوشی چمک رہی تھی۔ کوئی لفافہ کو سنبھال رہا تھا، کوئی اپنے ساتھی کو سرٹیفکٹ نکال کر دکھا رہا تھا۔ کچھ لوگوں کو میں نے دیکھا کہ وہ ایک ہاتھ میں امریکی جھنڈا اور دوسرے ہاتھ میں شہریت کا سرٹیفکٹ لئے ہوئے فوٹو کھنچوا رہے تھے۔

میں ایک طرف کھڑا ہوا یہ منا ظر دیکھ رہا تھا۔ اس میں مختلف ملکوں اور مختلف قوموں کے مرد اور عورت شامل تھے۔ اچانک ایک شخص نے میری طرف بڑھ کر کہا : السلام علیکم۔ یہ محمد جاوید الٰہ آبادی تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ہندستان سے تعلق رکھتے ہیں اور انھوں نے بھی آج یہاں آکر امریکہ کی شہریت لی ہے۔ میری مسلمان صورت دیکھ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے تھے۔ انھوں نے سامنے کی بھیڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا : اس سٹی زن شپ میں کیا دھرا ہے، اصلی سٹی زن شپ تو مرنے کے بعد والی ہے۔

ان کا یہ جملہ سن کر مجھ پر عجیب تاثر ہوا۔ میں نے سوچا کہ امریکہ کی شہریت لینے کے لئے لوگ کہاں کہاں سے بھاگے چلے آرہے ہیں۔ مگر جنت کا شہری بننے سے کسی کو دل چسپی نہیں۔ جنت کا شہری بنانے کی کھڑکیاں امیدواروں کی قطار سے خالی ہیں۔

یہاں میری ملاقات ایک مسلمان سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ امریکہ کا اقتصادی نظام تو عربوں کی دولت پر چل رہا ہے۔ عربوں کی جو دولت یہاں کے بینکوں میں جمع ہے اور یہاں کی مختلف کمپنیوں میں عربوں کا جو سرمایہ لگا ہوا ہے، اس کو اگر وہ نکال لیں تو امریکہ دیوالیہ ہو جائے گا۔

دوسری طرف میری ملاقات ایک ہندو انجنیئر مسٹر منن سے ہوئی۔ ان کا خیال تھا کہ امریکہ کو تو ہندو ماہرین چلا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ امریکی سائنس دانوں کی بہت بڑی تعداد در اصل ہندستانی ہے۔ اور یہی امریکہ کی بڑائی کا راز ہے۔ وہ ہر ملک کے بہترین افراد کو اپنی طرف کھینچ کر لاتا ہے اور ان کو اپنے اندر شامل کر لیتا ہے:

> A large number of American scientists are in fact Indian. And that is part of America's greatness. It attracts, absorbs and assimilates the best from every land.

یہ مشابہت بھی کیسی عجیب ہے کہ ہندو یا مسلمان کوئی بھی خود "اپنے ملک" کو ترقی نہ دے سکا، البتہ دونوں اس بات پر فخر کر رہے ہیں کہ وہی ہیں جنھوں نے "دوسرے ملک" کو اعلیٰ ترقی کے درجہ تک پہنچایا ہے۔ مزید یہ کہ یہ ملک دونوں کے نزدیک قابل مذمت سامراجی ملک ہے۔

امریکہ میں قیام کے دوران میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ وہ یہاں کی ایک مسجد میں امام ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ مذکورہ مسجد سے تعلق رکھنے والے مسلمان ان کے خلاف ہو گئے ہیں اور ان کو مسجد کی امامت سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق، اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے ایک بار جمعہ کی تقریر میں صدام حسین کی مذمت کی تھی، اور خلیج کے معاملہ میں سعودی موقف کی حمایت کی تھی۔

یہ کوئی انفرادی بات نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خلیج کے موجودہ بحران میں مسلم دنیا کی اکثریت صدام حسین کی حامی ہے۔ علما کی اکثریت نے اگرچہ صدام حسین کو غلط ٹھہرایا ہے، مگر مسلم عوام کی اکثریت اس معاملہ میں پرو صدام نقطۂ نظر رکھتی ہے۔

صدام حسین کا کویت پر حملہ واضح طور پر جارحیت ہے۔ صدام حسین نے کویت میں داخلہ کے بعد مبینہ طور پر مسلمانوں پر سنگین مظالم کئے ہیں۔ ان سب کے باوجود کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کی بیشتر تعداد صدام حسین کی مذمت نہیں کرتی، بلکہ ان کو ہیرو کا مقام دئے ہوئے ہے۔

اس وجہ مسلمانوں کی شکست خوردہ نفسیات ہے۔ مسلمان ایک سو سال سے اس احساس میں مبتلا ہیں کہ مغربی قوموں نے ان کے وقار کو مجروح کیا۔ ان کے اقتدار کا خاتمہ کیا۔ ان کی تہذیب کو مٹا ڈالا۔ اس شکست خوردگی کی بنا پر جب بھی وہ دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص ان کے "دشمنوں" کو چیلنج کر رہا ہے تو اس سے انھیں ایک قسم کی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ ایسا آدمی ان کی نظر میں ہیرو بن جاتا ہے۔ یہی نفسیات ہے جس کی بنا پر موجودہ صدی کے آغاز میں کمال اتاترک مسلمانوں کے ہیرو بن گئے۔ اس کے بعد جمال عبد الناصر، معمر قذافی، آیات اللہ خمینی، ٹھیک اسی بنا پر ان کے ہیرو بنتے رہے ہیں۔ اور اب اسی بنا پر انھوں نے صدام حسین کو اپنا ہیرو بنا رکھا ہے، کیوں کہ کم از کم الفاظ کی حد تک، وہ "دشمن اکبر" امریکہ سے چیلنج کی زبان میں بات کر رہا ہے۔

یہ خوش خیالیوں کی دنیا میں کسی کو ہیرو بنا کر اپنی مفروضہ فتح پر خوشی منانا ہے۔ ایسی مفروضہ فتح کسی کے کچھ کام آنے والی نہیں۔ اس دنیا میں حقائق کی قیمت ہے نہ کہ مفروضات کی۔ ۲ اگست ۱۹۹۰ کو عراق نے کویت پر فوجی قبضہ کر لیا تھا۔ نومبر کے خاتمہ پر اس کے قبضہ

کو چار مہینے پورے ہو جائیں گے۔ اس مدت میں امریکہ کی قیادت میں مختلف ملکوں نے عراق سے مطالبہ جاری کر رکھا تھا کہ وہ بلاشرط کویت کو خالی کر دے۔ سوویت یونین اس معاملہ میں امریکہ کے ساتھ تھا، مگر شرائط اور تحفظات کے ساتھ۔ روزنامہ آرنج کاونٹی رجسٹر (۲۷ نومبر ۱۹۹۰) میں صفحہ اول پر یہ سرخی پڑھی کہ سوویت یونین اب تحفظات کو ختم کر کے امریکہ کا حامی ہو گیا ہے۔ اس خبر کی سرخی ہے ـــــ عراق کے لئے ایک آخری موقع :

final opportunity for Iraq

خبر میں بتایا گیا تھا کہ سوویت یونین کے پریسیڈنٹ میخائیل گورباچیف نے الٹی میٹم کی زبان میں بولتے ہوئے کہا کہ عراق جنوری ۱۹۹۱ تک کویت سے اپنی فوجیں واپس بلالے ورنہ جنگی کارروائی کا سامنا کرے۔ انگریزی رپورٹ کے مطابق، انھوں نے کہا کہ عراق کی قسمت اس کی قیادت کے ہاتھ میں ہے، اور وقت اب اس کے لئے ختم ہو رہا ہے :

The fate of Iraq is in the hands of its leadership.
Time is running out.

میں نے اس کو پڑھا تو میں نے سوچا کہ اگر معاملہ کو وسیع تر معنوں میں لیا جائے تو یہ وارننگ نہ صرف صدام حسین کے لئے ہے بلکہ گورباچیف، جارج بش اور تمام دوسرے لوگوں کے لئے بھی ہے۔ ہر ایک کے لئے وقت ختم ہو رہا ہے۔ ہر ایک اس لمحہ کی طرف بڑھ رہا ہے جب کہ خدا کا صور پھونک دیا جائے اور ہر آدمی کو وہاں کھڑا کر دیا جائے جہاں اس کے لئے صرف اپنے کئے کا انجام پانے کا موقع ہو، سرکشی کرنے کا موقع کسی کے لئے باقی نہ رہے۔

یہاں کے اخبارات کا طریقہ ہندستانی اخبارات سے مختلف ہے۔ یہاں کا اخبار سیکڑوں صفحات کا ایک بنڈل ہوتا ہے۔ مگر وہ ایک کتاب کی صورت میں نہیں ہوتا۔ اس کے الگ الگ بہت سے سکشن ہوتے ہیں۔ مثلاً ورلڈ نیوز، ٹریول، اسپورٹس، میٹرو، وغیرہ۔

۲۵ نومبر کو میں روزنامہ آرنج کاونٹی رجسٹر کا سکشن ہوم فائنڈر دیکھ رہا تھا۔ اس کے صفحہ ۳ پر ایک ہنستی ہوئی تصویر تھی۔ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا " وجے سونی "۔ مسٹر سونی دہرہ دون میں ۱۹۴۴ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے سول انجینرنگ میں ماسٹر ڈگری لی۔ ایک

عرصہ تک انڈیا میں کام کرنے کے بعد ۱۹۸۲ میں وہ امریکہ چلے گئے۔ اب وہ آرنج کاونٹی میں مقیم ہیں۔ (ٹیلیفون 5598451 وہ جائداد (real estate) کی خرید وفرخت کا کام کرتے ہیں۔ انھوں نے کیلی فورنیا میں اس کام میں نمبر ۲ کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ وہ اپنی کامیابی کا کریڈٹ سب سے زیادہ ڈیل کارینگی کو دی ہے جس کی درج ذیل کتاب انھوں نے بار بار پڑھی ہے:

How to Win Friends and Influence People.

انھوں نے کہاکہ میں اپنے گاہک کی بات کو نہایت غور سے سنتا ہوں اور اس کی ہر بات کا غذ پر نوٹ کرتا جاتا ہوں۔ میرے بستر پر مستقل طور پر ایک نوٹ بک موجود ہوتی ہے۔ تاکہ رات کے وقت اگر ٹیلی فون پر کوئی پیغام ملے تو اسی وقت میں اس کو لکھ کر محفوظ کر لوں۔ انھوں نے کہاکہ ۱۹۹۰ء کے لئے میرا نشانہ ۲۵ ملین ڈالر ہے:

My goal for 1990 is $25 million.

ہر آدمی حقیقی کے نام پر غیر حقیقی (non-real) کو اپنا نشانہ بنائے ہوئے ہے، اس دنیا میں کوئی نہیں جو واقعی معنوں میں حقیقی (real) کو اپنا نشانہ بنانے پر تیار ہو۔

یہاں کے لوگوں میں یہ ذوق ہے کہ وہ اپنی کار کے پیچھے نمبر پلیٹ کے اوپر کچھ پسندیدہ فقرے لکھ دیتے ہیں۔ اس طرح کی کئی گاڑیاں میں نے دیکھیں۔ چند گاڑیوں پر لکھے ہوئے جملے یہ تھے:

Sex is like credit. Some get it, Some don't.
Happiness is being a grandparent.
Get rich on life, not drugs.

غالباً بوڑھے لوگ اس قسم کے فقرے اپنی گاڑیوں پر لکھتے ہیں، انسانوں میں انھیں کوئی نہیں ملتا جس سے وہ کامیابی کے ساتھ اپنی بات کہہ سکیں۔ اس لئے وہ وہ اپنی مشین پر اسے نقش کرکے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔

۷ دسمبر ۱۹۹۰ کی شام کو یہاں سے واپسی ہوئی۔ ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی کے ساتھ لاس انجلیز ایئر پورٹ پہنچا۔ اندر داخل ہوا تو ایک منظر میرے لئے بڑا عجیب تھا۔ ایک جاپانی خاتون

بہت بڑا سا ایک "لڑکا" اپنے سینہ سے لگائے ہوئی تھی۔ لڑکے کے موٹے موٹے ہاتھ اور پاؤں لٹک رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اتنے بڑے لڑکے کا بوجھ وہ کیسے اتنی آسانی کے ساتھ اٹھائے ہوئے ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ زندہ لڑکا نہیں ہے بلکہ کسی ہلکی چیز سے بنی ہوئی بہت بڑی گڑیا ہے۔ ماڈرن عورت لڑکا پیدا کرنا نہیں چاہتی۔ مگر وہ اولاد کی فطری طلب کو بھی اپنے اندر سے نکال نہ سکی۔ حقیقی اولاد سے محرومی کی تلافی وہ مصنوعی اولاد کے ذریعہ کر رہی ہے۔

ایئر پورٹ کے اندرونی حصہ میں داخل ہونے سے پہلے، قاعدہ کے مطابق، ہمارا سامان ایک مخصوص قسم کی متحرک بیلٹ پر رکھا گیا۔ اور اس پر چلتا ہوا اندرونی حصہ میں پہنچ گیا۔ اسی طرح تمام لوگوں کے سامان اس کے اوپر رکھ کر گزارے جا رہے تھے۔ میں نے دیکھا تو اوپر لگی ہوئی اسکرین میں ہر چیز کی صاف تصویر آ رہی تھی۔ بکس مکمل طور پر بند تھا۔ مگر اس کے اندر جو چیز تھی، مشین اس کی تصویر لے کر اسکرین کے اوپر اس کو منعکس کر رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اسی طرح خدا ہر ایک کی اندرونی حالت کو دیکھ رہا ہے۔ آدمی خواہ بند کمرہ میں کوئی عمل کرے یا اپنے سینے کے اندر کوئی بات سوچے، خدائے عالم الغیب سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں۔

لاس اینجلیز سے جاپان ایئر لائنز کی فلائٹ نمبر ۶۵ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ یہاں کے ایئر پورٹ پر تقریباً ہر وقت کوئی جہاز اترتا ہے یا اڑ رہا ہوتا ہے۔ جدید مواصلاتی ذرائع نے دوری کے مسئلہ کو اس طرح ختم کر دیا ہے کہ اب زمین کے ایک حصہ اور اس کے دوسرے حصہ کے درمیان ربط قائم کرنا اتنا ہی آسان ہو گیا ہے جتنا کسی محلہ کے ایک حصہ اور دوسرے حصہ میں۔ اس مواصلاتی انقلاب سے لوگ زبردست سیاسی اور تجارتی فائدے حاصل کر رہے ہیں۔ مثلاً جاپان اور امریکہ کے درمیان ہر روز ۱۲ فلائٹ آتی ہے اور ۱۲ فلائٹ جاتی ہے۔ مگر اس مواصلاتی انقلاب کو اب تک اشاعت حق کے لئے استعمال نہ کیا جا سکا۔

راستہ میں ایئر ہوسٹس اخبار لے کر آئی۔ میں نے دیکھا تو اس کے ہاتھ میں بظاہر بہت سے اخبار تھے۔ میں نے چاہا کہ ان میں سے ایک لے لوں۔ اس نے کہا کہ یہ سب ایک ہی اخبار ہے یہ لاس اینجلیز ٹائمس (۷ دسمبر ۱۹۹۰) تھا۔ میں نے گنا تو اس کے کل ۱۸۰ صفحات تھے۔ یہی امریکی اخبارات کا عام انداز ہے۔ وہ اخبار سے زیادہ اشتہارات کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ

وہ اتنے زیادہ صفحات پر مشتمل ہوتے ہیں۔

جاپان ایئرلائنز کی فلائٹ میگزین (Winds) کے شمارہ دسمبر ۱۹۹۰ کو دیکھ رہا تھا۔ ضخیم میگزین کا بیشتر حصہ اشتہارات سے بھرا ہوا تھا۔ ایک صفحہ پر یہ الفاظ درج تھے:

If you've got a minute, Minolta's got a copier

یہ کاپی کرنے والی مشین کا اشتہار تھا۔ اس میں چھوٹی بڑی مشینوں کی تصویریں تھیں ـــــ ۱۵ کاپی فی منٹ، ۳۰ کاپی فی منٹ، ۴۰ کاپی فی منٹ، ۶۰ کاپی فی منٹ۔ اس کو دیکھ جناب صفی قریشی صاحب کی بات یاد آئی کہ موجودہ سوسائٹی انسٹینٹ فکس (instant fix) سوسائٹی ہے۔ انسٹینٹ کافی کی طرح ہر کام فوری طور پر ہوتا ہے۔ اس سے جدید انسان فوری حل کا عادی ہوگیا ہے۔ یہ آخرت کا پیغام دینے والی تحریک کے لئے ایک نفسیاتی رکاوٹ ہے۔ انسان اپنے مسئلہ کو "آج" حل کرنا چاہتا ہے، اور آخرت کا نظریہ اس کو "کل" تک موخر کر رہا ہے۔

یہ بڑا جہاز (۷۴۷) تھا۔ مگر چند کو چھوڑ کر اس کے تمام مسافر جاپانی تھے۔ جہاز کے اندر کامل سکون نظر آیا۔ ہندستانی مسافر جس جہاز میں ہوں، اس کے اندر شور لازمی ہے۔ ٹائیلٹ میں جائیے تو گندا کیا ہوا ملے گا۔ بچے جہاز کے اندر دوڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔ مگر موجودہ جہاز میں اس قسم کی کوئی چیز نہ تھی۔ اکثر مسافر پڑھتے یا لکھتے ہوئے دکھائی دئے۔ جاپانیوں کا یہی مزاج جاپانیوں کا اصل سرمایہ ہے۔ ان کی ترقی کا اصل راز ان کا یہی تعمیری مزاج ہے۔

لاس اینجلیز سے ٹوکیو تک تقریباً دس گھنٹہ کی مسلسل پرواز ہے۔ یہ پورا سفر بحرالکاہل کے اوپر طے ہوتا ہے۔ بحرالکاہل کی گہرائی اتنی زیادہ ہے کہ اگر اس کے اندر ہمالیہ پہاڑ ڈال دیا جائے تو وہ اس طرح ڈوب جائے کہ اس کا کوئی حصہ دکھائی نہیں دے گا۔ اتنے گہرے اور اتنے بڑے سمندر کے اوپر انسان تیز رفتاری کے ساتھ اڑتا ہوا ایک ساحل سے دوسرے ساحل پر پہنچ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا یہ کیسا عجیب کرشمہ ہے۔

"اس وقت ہم ۳۳ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑ رہے ہیں"۔ جہاز کے پائلٹ نے اعلان کیا۔ میں نے جہاز کے ایک جاپانی افسر سے پوچھا کہ اتنی زیادہ بلندی پر اڑنے کا سبب کیا ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس وقت آپ سمندر کے اوپر ہیں، آپ دو ہزار فٹ کی بلندی پر بھی اڑ

سکتے ہیں۔ اس نے کہا کہ نیچے ہوا کا دباؤ زیادہ ہوتا ہے، اس لئے ایندھن کو جلانے کے لئے پٹرول کی زیادہ مقدار خرچ ہوتی ہے۔ جب کہ اوپر ہوا کا دباؤ کم ہونے کی وجہ سے پٹرول کا خرچ تقریباً نصف کے بقدر گھٹ جاتا ہے۔

جہاز کا بلندی پر جانا جہاز کے لئے مفید ہے مگر وہ انسان کے لئے سخت مضر ہے۔ انسان کے اندر خون کا جو دوران ہے، اس کو متوازن رکھنے کے لئے ہوا کا مناسب دباؤ انتہائی ضروری ہے۔ یہ دباؤ زمین کی سطح پر بالکل مناسب مقدار میں موجود رہتا ہے۔ مگر اوپری فضا میں ہوا کا دباؤ بہت کم ہو جاتا ہے۔ کم دباؤ کی اس ہوا میں اگر انسان کو کھلا چھوڑ دیا جائے تو جسم میں خون کا رکنا مشکل ہو جائے گا۔ ایسی حالت میں خون کان، ناک، آنکھ سے بہنے لگے گا حتی کہ وہ جلد کو پھاڑ کر نکل پڑے گا۔ اور پھر تھوڑی دیر میں انسان کی موت واقع ہو جائے گی۔

اس مسئلہ کے حل کے لئے ہوائی جہاز میں وہ انتظام کیا گیا ہے جس کو کیبن کا دباؤ (cabin pressurization) کہا جاتا ہے۔ یہ طریقہ ۱۹۴۰ سے ہوائی جہازوں میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے، ہوائی جہاز زیادہ بلندی پر نہیں اڑ سکتے تھے۔ آج ہم ہوائی جہاز کے اندر اسی طرح بیٹھتے ہیں جس طرح زمین کی سطح پر کوئی شخص کار کے اندر بیٹھتا ہے۔ مگر یہ آسانی اس خصوصی انتظام کی وجہ سے ممکن ہوئی ہے جس کا اہتمام جدید جہازوں کے اندر موجود ہوتا ہے۔

یہی موجودہ دنیا کا عام قانون ہے۔ یہاں کوئی مسئلہ دوسرے مسئلہ سے الگ نہیں۔ یہاں ایک مسئلہ کے ساتھ دوسرے بہت سے مسائل وابستہ ہوتے ہیں۔ جو شخص کسی مسئلہ کو اس طرح چھیڑے کہ اس نے دوسرے مسائل کی رعایت نہ کی ہو وہ بدترین مجرم ہے۔ کیوں کہ وہ اپنی حد پر نہیں رکا، اپنی نااہلی کے باوجود وہ اپنی حد سے باہر نکل گیا۔

ٹوکیو میں مجھے ٹرانزٹ پسنجر کے طور پر دو دن ٹھہرنا تھا۔ ایسے مسافروں کا انتظام ایئرکمپنی کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ ٹوکیو ایئرپورٹ پر اتر کر میں نے ہوٹل کے رجسٹریشن کارڈ کی بابت دریافت کیا۔ جواب ملا کہ آپ فلاں جگہ چلے جائیے، وہاں بورڈ پر آپ کا کارڈ لگا ہوا ہوگا۔ متعلقہ جگہ پر پہنچا تو وہاں ٹائپ کیا ہوا رجسٹریشن کارڈ پیشگی طور پر موجود تھا۔ اس طرح کی باقاعدگی

میں نے اب تک کسی اور ایئرپورٹ پر نہیں دیکھی۔

ائیر پورٹ سے ہر آدھ گھنٹہ پر بسیں ہوٹل اور شہر جاتی ہیں۔ میں میجر امولک سنگھ کے ساتھ باہر نکلا تو ایک بس کھڑی ہوئی تھی۔ اس پر لکھا ہوا تھا ہوٹل نریتا ٹوکیو (Narita Tokyo) ہم اس پر بیٹھ گئے۔ بس چلتی ہوئی ایک ہوٹل پر رکی۔ اندر داخل ہو کر اپنا کارڈ دکھایا تو ہمیں بتایا گیا کہ آپ کا رجسٹریشن ہوٹل نکو نریتا (Nikko Narita) میں ہے۔ اب دوسری بس سے دوبارہ ائیر پورٹ واپس آنا پڑا۔ ایئرپورٹ سے ایک اور بس ملی۔ اس نے ہمیں ہمارے ہوٹل میں پہنچایا۔

یہ غلطی ہوٹل کے نام میں مشابہت کی وجہ سے پیش آئی۔ اسی طرح زندگی میں ایسا ہوتا ہے کہ آدمی محض لفظی مشابہت کی وجہ سے ایک بے حقیقت چیز کو حقیقت سمجھ لیتا ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ پوری تحقیق کر کے چیزوں کو اختیار کرے۔ یا کم از کم اس کے اندر یہ حوصلہ ہو کہ جب اس کی غلطی اس پر واضح ہو جائے تو وہ فوراً صحیح چیز کی طرف پلٹ آئے۔

نکو ہوٹل میں میرا قیام کرہ نمبر ۴۲۴۵ میں تھا۔ ٹوکیو ایک بے حد مشینی شہر ہے۔ یہاں کی پوری زندگی ایک بہت بڑی مشین نظر آتی ہے۔ میرے پاس ایک مہینہ کا ویزا تھا۔ یہاں کا اسلامک سنٹر مجھے مزید ٹھہرانا چاہتا تھا اور ٹوکیو میں میرا پروگرام رکھنا چاہتا تھا۔ مگر ٹوکیو کی مشینی زندگی سے مجھے بہت جلد وحشت ہو گئی۔ میں یہاں زیادہ ٹھہرنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ نہ کر سکا۔

" اسلامک سنٹر جاپان " ٹوکیو میں واقع ہے (Tel. 03-460-6169) وہ ۱۹۶۵ میں قائم ہوا۔ اس کی باقاعدہ عمارت ۱۹۸۲ میں تعمیر ہوئی۔ اس نے جاپانی زبان میں ۲۵ کتابیں چھاپی ہیں۔ اس کا ایک سہ ماہی جرنل بھی جاپانی زبان میں نکلتا ہے جس کا نام السلام ہے۔ اس کا سرکولیشن تین ہزار ہے۔ اس کے تحت بچوں کا اسکول قائم ہے۔ سیمنار وغیرہ منعقد کئے جاتے ہیں۔ وہ نکاح اور دوسری دینی ضرورتیں پورا کرنے کا مرکز بھی ہے۔ وغیرہ

جاپان میں کسی بھی قسم کا مذہبی امتیاز نہیں ہے۔ چنانچہ برابر کچھ نہ کچھ افراد اسلام قبول کرتے رہتے ہیں۔ مگر دوسرے ملکوں کی طرح ، یہ سب اپنے آپ ہو رہا ہے۔ سنٹر کے تعارف نامہ میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس میں ہمارا کوئی کارنامہ نہیں۔ اسلام میں خود کشش ہے اور وہ

خود اپنی طاقت سے پھیلتا ہے:

We do not claim any credit. Islam itself has the attracting power.

۱۹۰۹ میں پہلے جاپانی مسلمان نے حج کیا تھا۔ پہلی مسجد کوبے میں ۱۹۳۵ میں بنائی گئی۔ ۱۹۵۲ میں پہلی جاپانی مسلم تنظیم بنی جس کا نام جاپان مسلم ایسوسی ایشن تھا۔ جاپان کی ۱۲۰ ملین آبادی میں مسلمانوں کی تعداد صرف ہزاروں میں ہے۔ تاہم مستقبل میں اسلام کی ترقی کی کافی امید نظر آتی ہے۔

ہوٹل کے کمرہ میں نئے عہد نامہ (New Testament) کا ایک عمدہ نسخہ موجود تھا۔ یہ دو کالمی انداز میں چھپا تھا۔ بائیں کالم میں انگریزی انجیل اور دائیں کالم میں اس کا جاپانی ترجمہ چھپا ہوا تھا۔ یہ "جاپان بائبل سوسائٹی" کی طرف سے تیار کیا گیا تھا۔ اس کے شروع میں یوحنا (۳ : ۱۶) کی ایک آیت کے کئی ترجمے دئے گئے تھے اور لکھا ہوا تھا کہ یہ آیت ۱۴۰۰ سے زیادہ زبانوں میں ترجمہ کی جا چکی ہے۔ وہ آیت عربی کے ترجمہ کے مطابق یہ تھی: لانه هكذا احب الله العالم حتى بذل ابنه الوحيد لكى لا يهلك كل من يؤمن به بل تكون له الحياة الابدية۔

میں نے سوچا کہ یہ بھی کتنا المناک واقعہ ہے کہ ہلاکت سے بچنے کا جھوٹا نسخہ ساری دنیا میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ مگر ہلاکت سے بچنے کا جو سچا نسخہ ہے اس کو اہل عالم تک پہنچانے کی تڑپ کسی کے اندر نہیں۔

ہوٹل میں ایک نہایت نفیس قسم کی رنگین چھپی ہوئی کتاب تھی۔ اس کا نام تھا جاپان آج (Japan Now) اس میں جاپانی زندگی کے مختلف مناظر بے حد عمدہ چھپائی کے ساتھ موجود تھے۔ ہر چیز نہایت پرکشش دکھائی دے رہی تھی۔ یہ "جاپانی جنت" کا تعارف تھا۔ مگر جب میں ٹوکیو کی سڑکوں پر نکلا تو یہ جاپانی جنت کہیں موجود نہ تھی۔ بے شمار مسائل نے عملاً اس جنت کو بے معنی بنا رکھا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ خدا کی بنائی ہوئی یہ زمین بے حد حسین ہے۔ اس میں وہ تمام امکانات رکھ دئے گئے ہیں جن کے ذریعہ یہاں ایک خوبصورت دنیا بنائی جا سکے۔ مگر جدید سائنسی

طریقوں کو استعمال کرکے جب آدمی نے یہ خوبصورت دنیا بنالی تو معلوم ہوا کہ اس خوبصورت دنیا میں داخلہ اس کے لئے حرام ہے۔ لوگوں کے پاس خوبصورت مکانات ہیں۔ مگر ان مکانات کے اندر خوبصورت زندگی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا صرف جنت کا تعارف ہے، مگر وہ بذات خود جنت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بظاہر ہر قسم کے سامانوں کی موجودگی کے باوجود یہاں آدمی خوشیوں سے بھری ہوئی زندگی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

جاپان نسبتاً ایک چھوٹا ملک ہے۔ رقبہ کے اعتبار سے ہندستان اس سے نوگنا زیادہ بڑا ہے۔ مگر ہندستان آج مقروض ملک ہے، جب کہ جاپان ساری دنیا کو قرض دے رہا ہے۔ اس کی وجہ جاپان کی صنعتی ترقی ہے۔ عالمی تجارت (global trade) میں جاپان کا حصہ تقریباً ۲۵ فی صد ہے۔ جب کہ ہندستان کا حصہ عالمی تجارت میں ایک فیصد سے بھی کم ہے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی، وشوہندو پریشد جیسی جماعتیں بھارتیتا کا نعرہ لگا رہی ہیں۔ ان کے لئے کرنے کا کام یہ تھا کہ وہ ملک کو سائنس اور صنعت کے میدان میں اوپر اٹھائیں۔ مگر وہ مذہبی جھگڑے بڑھانے ہی کو سب سے بڑا کارنامہ سمجھے ہوئے ہیں۔

ٹوکیو ابتداءً سولھویں صدی میں آباد کیا گیا تھا۔ اس وقت وہ محض مچھلی پکڑنے کا گاؤں (Fishing village) تھا۔ اور اس کا نام (Yedo) تھا۔ ۱۸۶۸ میں اس کو ٹوکیو کے نام سے موسوم کیا گیا جس کا مطلب مشرقی راجدھانی ہے۔ ۱۹۳۰ میں اس کی آبادی ۵۰ لاکھ کے قریب تھی۔

ٹوکیو بار بار زلزلہ سے دوچار ہوا ہے۔ ان میں ۱۹۲۳ کا زلزلہ سب سے زیادہ شدید تھا۔ جس میں شہر کا بیشتر حصہ تباہ ہوگیا۔ اس کے بعد ٹوکیو کی نئی تعمیر کا سوال سامنے آیا۔ اب ماہرین تعمیرات نے نئے انداز میں شہر کی منصوبہ بندی کی تاکہ زلزلہ کی صورت میں اس کو کم سے کم نقصان پہنچے۔ مثلاً چوڑی سڑکیں، بڑے بڑے پارک اور اسی طرح مکانات کو لوہے اور سمنٹ کے ذریعہ اس طرح بنانا تاکہ وہ زلزلہ کے مقابلہ میں ٹھہر سکیں:

New buildings, designed to withstand earthquakes had frames of concrete and steel.

اس طرح جاپان کے اندرونی حالات نے اس کو یہ سبق دیا کہ اگر اس کو زندہ رہنا ہے تو اس کو حالات کے مطابق اپنے آپ کو تیار کرنا ہوگا۔ ورنہ وہ تباہ ہو جائے گا۔

دوسری عالمی جنگ (۱۸-۱۹۱۴) میں فضائی بمباریوں کے نتیجہ میں پھر شہر ٹوکیو کا بیشتر حصہ تباہ ہوگیا۔ اب دوبارہ ٹوکیو کی تعمیر نئے منصوبہ کے تحت کی گئی۔ جاپان نے اپنے ناموافق حالات کے خلاف فریاد اور احتجاج کا انداز اختیار نہیں کیا۔ بلکہ غور وفکر کے ذریعہ اپنی تعمیر نو کی تدبیر تلاش کی۔ یہ جاپانی کردار کا مخصوص پہلو ہے۔ اور اسی نے جاپان کی ترقی میں اہم حصہ ادا کیا ہے۔ ایک جاپانی مثل جاپانیوں کے مزاج کو بہت خوبی کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں اس طرح کیا گیا ہے کہ آدمی فتح سے بہت کم سیکھتا ہے مگر شکست سے وہ بہت زیادہ سیکھ لیتا ہے:

Man learns little from victory, but much from defeat.

اس سفر میں میرا جانا اور آنا دونوں جاپان کے راستہ سے ہوا۔ اس دوران مختلف مراحل پر جن لوگوں سے گفتگو ہوئی ان کو تاریخ وار درج کرنے کے بجائے یکجائی طور پر یہاں درج کیا جاتا ہے۔

ایک سیاح سے ملاقات ہوئی۔ وہ پہلی بار جاپان کی سیاحت کے لئے آئے تھے اور اب واپس وطن جا رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ جاپان کے بارے میں اپنا کوئی تجربہ بتائیے۔ انھوں نے کہا کہ آپ ایک ٹیکسی سے سفر کر رہے ہوں اور ٹیکسی ڈرائیور آپ کے بتائے ہوئے پتہ پر پہنچ نہ پا رہا ہو تو وہ ٹیکسی سے اتر کر پبلک بوتھ پر جائے گا اور اپنے پیسہ سے ٹیلیفون کرکے صحیح جگہ کو معلوم کرلے گا اور آپ کو عین دروازہ پر لے جاکر اتارے گا ایسا صرف جاپان میں ہوتا ہے:

A cab-driver failing to locate the address you want to reach, rings up from a public booth on his own account to get the exact location and drops you at the very doorstep. This happens only in Japan.

اس قسم کے واقعات کا تعلق قومی مزاج سے ہے۔ قوم کی تعمیر کے سلسلہ میں سب سے زیادہ اہمیت مزاج سازی کی ہے۔ ہمارے یہاں کام کے نام پر بے شمار ہنگامے

جاری ہیں، مگر اسی بنیادی کام کا کوئی وجود نہیں۔

جاپان کی اقتصادی ترقی کو باہر کی دنیا میں رشک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر خود جاپان کا باشعور طبقہ اس پر زیادہ خوش نہیں۔ میں نے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ جاپانی سے جاپان کی تجارتی ترقی کی تعریف کی۔ اس نے فوراً کہا، مگر جاپان بین اقوامی سطح پر وہ مقام حاصل نہ کر سکا جس کا وہ مستحق تھا:

But Japan did not succeed to secure the important place it deserves in the comity of nations.

اس کے نزدیک اس کا سبب یہ تھا کہ جاپان کے پاس خارجہ پالیسی کا فقدان (lack of foreign policy) ہے۔ میں نے کہا کہ کامیاب خارجہ پالیسی کے لئے کوئی بنیاد درکار ہوتی ہے، اور وہ بنیاد جاپان کے پاس موجود نہیں۔ جاپان نے اپنی پچاس سالہ کوشش سے غیر معمولی اقتصادی ترقی حاصل کر لی۔ اب مسئلہ انٹرنیشنل رول ادا کرنے کا تھا۔ مگر یہاں جاپان اپنے آپ کو غیر مستعد پا رہا ہے:

But Japan finds itself unprepared for it.

اس کی وجہ یہ ہے کہ اقتصادی ترقی کسی قوم کو زیادہ سے زیادہ جو چیز دے سکتی ہے وہ بینک بیلنس ہے۔ لیکن محض اقتصادی ترقی کے ذریعہ کوئی قوم عالمی رول ادا کرنے کے قابل نہیں بنتی۔ اس کے لئے مزید کوئی طاقت درکار ہے۔ میں نے کہا کہ جاپان کی حیثیت آج اقتصادی سپر پاور (economic superpower) کی ہے۔ اور امریکہ کی حیثیت عسکری سپر پاور (military superpower) کی۔ امریکہ کی فوجی طاقت نے اس کو عالمی حیثیت دے دی ہے۔ جاپان کے لئے اس کا موقع نہیں کہ وہ فوجی میدان میں امریکہ کا حریف بن سکے۔ تاہم ایک زیادہ اہم میدان ابھی خالی ہے۔ اور وہ نظریاتی سپر پاور (ideological superpower) بننے کا میدان ہے۔ اس میدان میں عمل کر کے جاپان اپنے آپ کو عالمی لیڈر بنا سکتا ہے۔

مذکورہ جاپانی کے لئے یہ بات نئی تھی۔ اس نے پوچھا کہ جاپان کس طرح نظریاتی سپر پاور بن سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں میں نے مختصر طور پر اسلام کی اہمیت بتائی۔

یہاں سنگاپور کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ بزنس منیجر تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ جاپان کس لئے آئے۔ انھوں نے کہا کہ صرف سیکھنے کے لئے۔ میں نے دوبارہ پوچھا کہ جاپان کی کس بات نے آپ کو اتنا متاثر کیا کہ آپ صرف سیکھنے کے لئے یہاں آگئے۔ انھوں نے کہا کہ میں جاپان کی صنعتی ترقی کے بارہ میں بہت کچھ سنتا اور پڑھتا تھا۔ مگر ایک واقعہ میں نے پڑھا۔ اس نے مجھے تڑپا دیا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھ کو جاپان جاکر وہاں سے کچھ حاصل کرنا ہے۔ میں نے پوچھا کہ وہ واقعہ کیا تھا۔ انھوں نے اپنا بریف کیس کھولا اور ایک انگریزی میگزین نکالا۔ اس میں حسب ذیل واقعہ چھپا ہوا تھا:

The story is told of a Swedish expert who went to Japan to study workers' participation in management. In one factory, in the middle of an interview, he was gravely embarrassed when the Japanese worker burst into tears. Finding no response from the worker, the Swede sought an answer from his supervisor. "Tell me everything that you said to the worker," confidently after listening to his story, "the worker was upset when you told him that his company has not been procuring export orders like before." The worker, the Swede was told was deeply concerned that the nation would suffer if the exports went down, a fact which could be attributed, in his own estimation, to a lowering of quality.

سویڈن کے ایک ماہر کا قصہ بتایا جاتا ہے۔ وہ جاپان گیا تاکہ انتظام میں کارکنوں کی شرکت کا مطالعہ کرے۔ ایک کارخانہ میں وہ ایک کارکن سے بات کر رہا تھا۔ وہ اس وقت بہت متاثر ہوا جب اس نے دیکھا کہ اس کے ایک سوال پر جاپانی کارکن بے اختیار رو پڑا۔ جب اس کو کارکن کی طرف سے اپنے سوال کا جواب نہیں ملا تو اس نے سپروائزر سے اس کی بابت پوچھا۔ سپروائزر نے کہا کہ جو کچھ آپ نے اس سے کہا ہے وہ سب مجھے بتائیے۔ پورا قصہ سننے کے بعد سپروائزر نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ جب آپ نے کارکن کو بتایا کہ تمہاری کمپنی آجکل برآمدی فرمائشوں کی تعمیل پہلے کی طرح نہیں کر رہی ہے تو وہ سخت پریشان ہوگیا۔ اس نے کہا کہ جاپانی کارکن کو اس کا بہت زیادہ خیال رہتا ہے کہ اگر برآمد گھٹ گئی تو اس سے

پوری قوم کا نقصان ہوگا۔ اس کے خیال کے مطابق اس کو جاپانی کارکردگی کا معیار گھٹنے سے تعبیر کیا جائے گا۔

اس واقعہ کو پڑھنے کے بعد میں نے سوچا کہ جاپان کا ایک انسان اپنی قوم کے بارہ میں اتنا حساس ہے کہ وہ برداشت نہیں کرتا کہ اس کی کسی کوتاہی سے اس کی قوم پر حرف آئے۔ مگر موجودہ مسلمان اپنے دین کے بارہ میں اس طرح حساس نہیں۔ وہ مسلسل غلطیاں اور نادانیاں کررہے ہیں۔ مگر یہ احساس ان کو نہیں تڑپاتا کہ اس کی وجہ سے ان کا دین دوسری قوموں کی نظر میں بدنام ہو جائے گا۔

مجھے اپنے بچپن کے زمانہ کی بات یاد ہے۔ یہ دوسری عالمی جنگ سے پہلے کا زمانہ تھا۔ اس وقت "میڈ ان جاپان" کے معنی ہوتے تھے معمولی اور کمزور چیز۔ اس زمانہ میں عام طور پر کھلونے وغیرہ جاپان سے آتے تھے اور سستی قیمت پر بازار میں بکتے تھے۔ یہاں میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ جاپان اپنے قدیم دور سے جدید دور تک کیسے پہنچا جب کہ ماضی کے برعکس "میڈ ان جاپان" کا لفظ معیاری مصنوعات کا عنوان بن گیا ہے۔

بعض جاپانیوں سے بات کرنے کے بعد ایک بالکل نئی چیز میرے علم میں آئی۔ وہ تعلیم کے سال (education years) کا لفظ تھا۔ معلوم ہوا کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد جاپان میں تعمیر شعور کی ایک مستقل تحریک چل پڑی اور اس نے قومی تحریک (national movement) کی صورت اختیار کر لی۔ اس تحریک کا مقصد تصور (outlook) کو بدلنا تھا۔

تعلیم کے سال (ایجوکیشن ایرس) کا مرحلہ fifties & sixties (خمسینات اور ستینات) کے دوران تقریباً ۱۵ سال تک جاری رہا۔

قوم کے اندر تعمیری شعور پیدا کرنے کے بعد دوبارہ تقریباً ۱۵ سال تک حصول معیار (pursuit ot quality) کا دور گزرا ہے۔ یہ دوسرا دور ستینات اور سبعینات (sixties & seventies) کے زمانہ میں جاری رہا۔ اس طرح تیس سالہ فکری جدوجہد کا نتیجہ وہ عملی ترقی ہے جو آج جاپان کو حاصل ہوئی ہے۔

جاپان نے تعمیر شعور کے محاذ پر ۳۰ سال صرف کئے۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلم

رہنماؤں کا حال یہ ہے کہ انھوں نے افراد قوم کی شعوری تعمیر پر ۳۰ دن بھی صرف نہیں کئے۔ حتی کہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ تعمیر شعور بھی کوئی کرنے کا کام ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنا حق سمجھتے ہیں کہ وہ اور ان کی پوری قوم پوری زمین تو کیا پوری کائنات کی صدر نشین بن جائے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، دوسری عالمی جنگ تک جاپانی مصنوعات کو غیر معیاری (substandard) سمجھا جاتا تھا۔ مگر آج معاملہ الٹا ہے۔ آج میڈ ان جاپان کا مطلب ہوتا ہے سب سے اچھا اور سب سے زیادہ قابل اعتماد سامان۔ چنانچہ آج تمام لوگوں کی زبان پر یہ سوال ہے کہ جاپانی کیسے ایسا کرتے ہیں اور اتنا عمدہ کرتے ہیں:

How they do it and do it so well.

دنیا کے مختلف ملکوں سے خاص اس مقصد کے لئے لوگ جاپان آتے ہیں تاکہ اس راز کا پتہ لگائیں۔ اس قسم کے ایک صاحب، جو یورپ کے ایک ملک سے آئے تھے، ان سے ٹوکیو ایئر پورٹ پر میری ملاقات ہوئی۔ گفتگو شروع ہوئی تو میں نے کہا کہ جس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے آپ جاپان آئے، میں خود بھی اسی سوال سے دوچار ہوں۔ اس لئے آپ مجھے اپنی دریافت سے آگاہ کریں۔

انھوں نے کہا کہ اس کا راز میرے خیال میں یہ ہے کہ جاپانی لوگ بہت زیادہ معیار پسند (highly quality consious) ہوتے ہیں۔ ہر جاپانی کے اندر زبردست طور پر یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ جو کام بھی کرے بہتر طور پر کرے۔ یہ خواہش اتنی گہری ہے کہ اس کی خاطر وہ ہر دوسری چیز حتی کہ خاندانی زندگی کو چھوڑ دیتا ہے:

Every Japanese possesses very strong desire to do well, whatever bit he does. This desire is so intense that he forfeits even family life in pursuit of perfecting it.

جاپان کے افراد کا یہ مزاج جاپان کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ ہندستان جیسے ملکوں میں بدقسمتی سے یہ مزاج نہیں۔ یہی ہماری سب سے بڑی کمی ہے جس نے ہمیں عالمی سطح پر پیچھے کر رکھا ہے۔

یہاں مجھے ایک جاپانی آفس میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ایک تصویر

خصوصی اہتمام کے ساتھ دیوار پر لگی ہوئی ہے۔ اس پر لکھا ہوا تھا: ایڈورڈس ڈیمنگ (Edwards Deming) میں نے کہا کہ یہ تو ایک امریکی ہے، آپ کی حریف قوم کا ایک فرد۔ پھر آپ نے اس کی تصویر اپنے یہاں کیوں لگا رکھی ہے۔ دفتر کے ذمہ دار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ وہ تو ہمارے سب سے بڑے گرو ہیں:

He is our super-guru.

ایڈورڈس ڈیمنگ ایک ماہر شماریات (statistician) کا نام ہے۔ اس نے صنعت کی ترقی کے لئے کوالیٹی کنٹرول کا نظریہ پیش کیا اور اس کے اصول وضع کئے۔ جاپانیوں نے فوراً اس کو لے لیا اور اس کو اپنی ترقی کی بنیاد کے طور پر استعمال کیا۔ اس معاملہ میں انھوں نے اپنی قوم کو اتنا باشعور بنایا کہ پوری قوم کے لئے کوالیٹی کی حیثیت ایک طریق زندگی (way of life) کی ہوگئی۔ حتیٰ کہ انھوں نے اپنی صنعتی پیدا وار کو زیرو ڈیفکٹ (zero defect) کے مرحلہ میں پہنچا دیا۔

جاپانیوں کو امریکہ سے سخت چوٹ پہنچی تھی، مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا کہ امریکیوں کو دشمن بتا کر ان کے خلاف الفاظ کا طوفان جاری کر دیں۔ اس کے بجائے انھوں نے امریکیوں سے سیکھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے دشمن کے اندر سے بھی اپنے موافق باتیں نکال لیں۔ یہی اس دنیا میں زندگی کا راز ہے، اور ایسے ہی لوگ اس دنیا میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

جاپان میں قیام کے لئے میرے پاس دو ہفتہ کا ویزا تھا۔ مگر بعض اسباب کی بنا پر میں دو دن ہی یہاں ٹھہر سکا۔ ٹوکیو میں ایک اسلامک سنٹر ہے۔ یہ ۱۹۶۵ میں قائم ہوا۔ ۱۹۸۲ میں اس کی مستقل عمارت بنائی گئی۔ اس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عبد الرحمٰن صدیقی کا ٹیلیفون امریکہ میں آیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اسلامک سنٹر میں میرا پروگرام رکھیں۔ اس سے پہلے دہلی میں ڈاکٹر اسکندر احمد چودھری (مقیم ٹوکیو) کا خط ملا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ آپ کی آمد کے موقع پر ہم چاہتے ہیں کہ جاپانی مسلمانوں کا ایک اجتماع ٹوکیو کے اسلامک سنٹر میں رکھیں۔

میرے مختصر قیام کی وجہ سے اس قسم کا کوئی پروگرام تو نہیں بنا، البتہ اپنے مختصر قیام کو میں نے زیادہ سے زیادہ اس مقصد کے لئے استعمال کیا کہ میں جاپان کو سمجھوں۔ ایک بار بس میں میری

ملاقات ایک جاپانی سے ہوئی۔ وہ انگریزی جانتا تھا، بات چیت کے دوران اس نے اپنے بیگ سے ایک کارڈ نکالا۔ اس پر لکھا ہوا تھا ــــــ جاپان اٹھ، دنیا کو تیری ضرورت ہے:

Stand up, Japan, the world needs you.

اس سے گفتگو کرکے اندازہ ہوا کہ جاپانیوں میں ایک نیا گروہ ابھر رہا ہے۔ وہ موجودہ صورت حال پر مطمئن نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ صرف عمدہ سامان تیار کرکے دنیا میں بیچنا یا قوموں کو مالی مدد دینا کافی نہیں۔ دنیا میں امن کا دور لانے کے لئے ہمیں کچھ اور کرنا چاہئے۔ تاھم جاپانیوں کی اکثریت زیادہ تر اقتصادی انداز میں سوچتی ہے:

the Japanese have grown used to thinking of decisions only in terms of economics.

اس نے کہا کہ جاپانیوں میں نیا ذہن بنانے کے لئے نصف صدی کی مدت درکار ہوگی تاکہ ان میں یہ سوچ ختم ہو کہ محض دعا کرنے سے امن آسکتا ہے:

It could take half a century to re-educate the Japanese so that they stop thinking that merely praying for peace will bring peace.

جاپان کو اپنے مزید حوصلوں کی تکمیل کے لئے ایک "آئیڈیالوجی" کی ضرورت ہے۔ مگر جاپان کے پاس کوئی مکمل آئیڈیالوجی نہیں۔ یہی جدید جاپان کی سب سے بڑی کمی ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی ضرورت بھی۔

جلد ہی ۲۲ نومبر ۱۹۹۰ کو جاپان کے بادشاہ اکی ہیتو (Akihito) کی تخت نشینی کی رسم ٹوکیو میں ادا کی گئی ہے۔ وہ ۱۹۳۳ میں پیدا ہوئے اور وہ جاپان کے ۱۲۵ ویں شہنشاہ ہیں۔ ہیرو ہیتو کے انتقال (۷ جنوری ۱۹۸۹) کے بعد انھیں یہ عہدہ ملا تھا۔ تاہم محل کے آداب کے مطابق ان کی باقاعدہ تخت نشینی پچھلے ہفتہ کو انجام پائی ہے۔ میں نے ایک جاپانی سے پوچھا کہ کیا آپ لوگوں کے عقیدہ کے مطابق، جاپانی شہنشاہ آسمان کا خدائی بیٹا ہے:

Is the Japanese Emperor the divine Son of Heaven?

اس نے کہا کہ پہلے جاپانی ایسا سمجھتے تھے۔ مگر اب وہ ایسا خیال نہیں کرتے۔ اس نے بتایا کہ دوسری

عالمی جنگ سے پہلے جاپانیوں کا عام خیال یہ تھا کہ شہنشاہ زندہ خدا (living god) ہے۔اور وہ ان کا محافظ ہے۔ مگر دوسری عالمی جنگ میں جب جاپان کو شکست ہوئی تو ان کا یہ عقیدہ متنزلزل ہوگیا۔ مزید یہ کہ خود شہنشاہ ہیرو ہیٹو نے یہ اعلان کردیا کہ میں خدا یا خدا کا بیٹا نہیں ہوں۔ جاپانی اگرچہ اب بھی اپنے بادشاہ کو کامی (Kami) کہتے ہیں جس کے معنی خدا کے ہوتے ہیں۔ مگر اب یہ لفظ صرف علامتی معنی میں بولا جاتا ہے نہ کہ حقیقی معنی میں۔

میں نے کہا کہ پہلے آپ لوگ اپنا حقیقی خدا رکھتے تھے، اب آپ لوگوں کے پاس صرف علامتی خدا ہے۔ اس کے جواب میں وہ مسکرا کر رہ گیا، اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

۶ اگست ۱۹۸۹ کو دہلی میں میری ملاقات ایک جاپانی صحافی کونیونیشی (Kunio Nishi) سے ہوئی تھی۔ وہ ٹوکیو کے روزنامہ سیکائی نپو (Sekai Nippo) کے رپورٹر کے طور پر دہلی آئے تھے اور مجھ سے ملے تھے۔ گفتگو کے دوران میں نے ان سے جاپانی شہنشاہ اور خدا کے عقیدہ کی بابت سوال کیا۔ انھوں نے جو کچھ کہا، اس کا خلاصہ خود ان کے الفاظ میں یہ تھا:

> The Emperor was "God" and respected by Japanese people before world war II. He was the supreme head in the old Japanese constitution. In the name of the Emperor the war against America and Britain was fought. But after the defeat in the war, Japanese people have been changed into behaving that the Emperor is simply a man. The New Constitution puts him as the symbolic head of Japan. Now the Emperor has no political power.

الرسالہ مارچ ۱۹۷۷ میں جاپان کی تاریخ کا ایک صفحہ نقل کیا گیا تھا۔ یہ بے حد عبرتناک ہے۔ ۱۸۹۱ء کا واقعہ ہے۔ اس وقت جاپان میں شہنشاہ میجی (Meiji) کی حکومت تھی۔ برطانی استعمار کے زیر اثر جاپان میں مسیحیت پھیلنے لگی۔ مقامی مذہب میں اس کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہ تھی۔ میجی نے مسیحیت کے پھیلاؤ کو روکنے کے لئے چاہا کہ وہاں مسلمانوں کو بلائے۔ اس نے ترکی کے سلطان عبد الحمید ثانی کو خط لکھا کہ آپ کچھ مسلم علماء کو جاپان بھیجیں تاکہ وہ مسیحی مبلغین سے مناظرہ کریں اور یہاں کے لوگوں کے سامنے اپنا مذہب پیش کریں۔

سلطان عبد الحمید ثانی نے ترکی کے علماء (بشمول سید جمال الدین افغانی) کو دربار میں بلایا اور مشورہ کیا۔ مگر کسی بھی عالم نے اس پیش کش کو اہمیت نہ دی۔ وہ غیر ضروری بحثیں کرتے رہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی ایک عالم یا مبلغ بھی جاپان بھیجا نہ جاسکا۔

اس واقعہ پر اب ایک سو سال گزر چکے ہیں۔ اگر اس وقت کے علماء نے جاپان کے بادشاہ کی اس پیش کش کو فوراً قبول کرلیا ہوتا اور جاپان کے لئے اسلامی مبلغ بھیجنے کا سلسلہ شروع کر دیا جاتا تو ایک سو سال پورا ہونے کے بعد اب جاپان میں اسلام کا کیا حال ہوتا، اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

معروف افراد کی سطح پر تو یہ کام نہ ہوسکا۔ تاہم غیر معروف افراد کے ذریعہ جاپان میں تبلیغی کام کچھ نہ کچھ ہوتا رہا ہے۔ اس کی ایک مثال الرحلة اليابانية ہے۔ یہ ایک مصری مسلمان علی احمد الجرجاوی کی کتاب ہے۔ انھوں نے ۱۹۰۶ (۱۳۲۵ھ) میں جاپان کا سفر کیا۔ واپسی کے بعد یہ کتاب لکھی جو اسی زمانہ میں قاہرہ سے شائع ہوئی۔ اس کا ایک نسخہ قاہرہ کے المكتبة الازهرية میں موجود ہے۔ قطر کے عربی ماہنامہ الامة کے شمارہ شوال ۱۴۰۶ھ (جون ۱۹۸۶) میں اس پر چار صفحہ کا تعارف چھپا ہے۔

علی احمد الجرجاوی نے اخبار میں پڑھا کہ جاپان کے بادشاہ میکادو کے حکم سے جاپان میں ایک مذہبی کانفرنس ہورہی ہے۔ اس میں ہر مذہب کے نمائندے شریک ہوں گے۔ انھوں نے اپنے جریدہ الارشاد میں لکھا کہ مصر سے مسلمانوں کا ایک وفد جاپان کی اس کانفرنس میں شرکت کرے۔ مگر کسی کو اس سے دلچسپی نہ ہوسکی۔ آخر کار وہ کلکتہ کی جامع مسجد کے امام احمد موسی المصری اور تیونس کے ایک شخص کو لے کر ٹوکیو کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ بحری سفر کا زمانہ تھا۔ وہ اسکندریہ، تونس، مراکش، اٹلی، جدہ، عدن، بمبئی، کولمبو، سنگاپور، ہانگ کانگ، یوکاہاما ہوتے ہوئے ٹوکیو پہنچے۔ مصر سے جاپان تک ۱۲ ہزار میل سے زیادہ کا سفر کیا۔

ٹوکیو میں معلوم ہوا کہ ہندستان سے سید حسین عبد المنعم بھی اس کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔ ان چار آدمیوں نے ٹوکیو میں ایک مکان کرایہ پر لیا۔ مالک مکان کا نام موسیو جازنیف تھا۔ سید حسین عبد المنعم انگریزی سے واقف تھے۔ وہی مترجم کا کام کرتے تھے۔ مالک مکان نے ان لوگوں سے اسلام کی تعلیمات کے بارہ میں پوچھا۔ انھوں نے اس کے سامنے اسلام کا تعارف کرایا۔ جاپانی نے اسی مجلس میں اسلام قبول کرلیا اور کہا کہ آج سے مجھے مسلمانوں میں سے سمجھو (اعتبروني من الآن في عداد المسلمين)

موسیو جازنیف نے اسلام کی تبلیغ کے معاملہ میں ان لوگوں کی ہر طرح مدد کی۔ یہاں تک کہ چند مہینے کی کوشش سے تقریباً ۱۲ ہزار جاپانی مسلمان ہوگئے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ جاپانیوں میں اسلام کی اشاعت کے سلسلے

میں جو چیز معاون ہوئی وہ یہ کہ جاپانی ایسے لوگ ہیں جن کے اندر فطری طور پر یہ استعداد ہے کہ وہ ہر اس چیز کو قبول کر لیں جو عقل کے موافق ہو (لانهم قوم عندهم استعداد طبيعى لقبول كل مايوافق العقل) صفحہ ۵۳

مسلم رہنما ہر جگہ صلیبیت اور صہیونیت اور عرب قومیت کو عالم اسلام کا سب سے بڑا خطرہ بتا رہے ہیں۔ مگر وہ تبلیغی اسلام کی تسخیری طاقت سے بالکل بے خبر ہیں۔ "سب سے بڑا خطرہ" کا انکشاف کرنے والے بہت ہیں مگر "سب سے بڑا امکان" کا اعلان کرنے والا کوئی نہیں۔

سوویت روس کی مشرقی سرحد پر جزیروں کا ایک سلسلہ ہے۔ ان جزیروں کو کوریل جزیرے (Kuril Island) کہا جاتا ہے۔ یہ جزیرے پہلے جاپان کا حصہ تھے۔ یہ جزیرے ایک ہزار کیلو میٹر سے زیادہ رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ زیادہ تر غیر آباد ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے آخر میں یالٹا کانفرنس کے فیصلہ کے مطابق، سوویت روس نے کچھ جزیروں پر قبضہ کر لیا۔ یہ واقعہ ۱۹۴۵ کا ہے۔

روس اور جاپان کے درمیان یہ ایک مستقل نزاع کا باعث تھا۔ جاپان کی بار بار کوشش کے باوجود روس ان جزیروں کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا تھا۔ مگر جاپان کی غیر معمولی ٹکنکل ترقی کے بعد یہ خود روس کی ایک ضرورت بن گئی۔ کیوں کہ سوویت روس جاپان کی ٹکنالوجی سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ مگر جاپان کا کہنا تھا کہ پہلے ہمارے جزیروں کو ہمارے حوالے کرو، اس کے بعد ہمارے اور تمہارے درمیان ٹکنکل تعاون کا آغاز ہو سکتا ہے۔

موجودہ نزاع عملاً چار جزیروں پر ہے۔ تازہ خبر یہ ہے کہ سوویت یونین اس پر راضی ہو گیا ہے کہ وہ اس میں سے دو خاص جزیروں کو جاپان کے حوالے کر دے۔ جاپان کی حکمراں پارٹی کے لیڈر شنتارو آبے (Shintaro Abe) نے سوویت یونین کے پرپوزل کو بہت اہم (very important) قرار دیا۔ میں نے اس خبر کو پڑھا تو میری زبان سے نکلا —— جاپان نے جنگ کے ذریعہ کھویا تھا، اور امن کے ذریعہ دوبارہ حاصل کر لیا۔

جزائر کوریل کی واپسی کا مسئلہ جب تک صرف جاپان کا مسئلہ تھا، روس اس کی واپسی سے انکار کرتا رہا۔ مگر جب ان جزائر کی واپسی سے خود روس کا انٹرسٹ وابستہ ہو گیا تو اس نے اپنی سابقہ پالیسی بدل دی —— اگر آپ حریف کی ضرورت بن جائیں تو آپ کسی لڑائی

کے بغیر اپنے حریف کو جھکانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

۲۲ جون ۱۹۹۰ کو سان فرانسسکو میں جاپان کے وزیر خارجہ اور امریکہ کے وزیر خارجہ کے درمیان ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں جاپانی وزیر نے امریکہ کے ایک مطالبہ کو ماننے سے انکار کر دیا جس کو اخبارات نے ایک بہت بڑا نہیں (very big no) سے تعبیر کیا ہے۔ وہ مطالبہ یہ تھا کہ جاپان اگلے دس برسوں (۲۰۰۰ - ۱۹۹۱) کے درمیان اپنی آمدنی کا دسواں حصہ (چار ٹریلین ڈالر) عوامی سہولت (public amenities) اور سماجی کاموں (social infrastructure) پر خرچ کرے۔ یعنی پارک، سڑکوں اور سیور لائن وغیرہ کا نظام بہتر بنانے پر۔

جاپان کے لوگ دنیا کے بہترین لوگ ہیں۔ نیز جاپان ایک انتہائی دولت مند ملک ہے۔ مگر جاپان کا سیاح حیرت انگیز طور پر دیکھتا ہے کہ جاپان میں تمدنی سہولتیں اس اعلیٰ درجہ کی نہیں ہیں جو امریکہ یا مغربی جرمنی جیسے ملک میں نظر آتی ہیں۔ امریکہ چاہتا ہے کہ جاپان ان مدوں میں اپنی جمع شدہ دولت کا ایک معقول حصہ خرچ کرے۔ مگر جاپان ابھی تک اس کے لئے تیار نہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں جاپان اس قدیم تجارتی اصول پر قائم ہے —— گھر بناؤ کچا، کاروبار کرو پکا۔

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے۔ لندن کے ایک اخبار دی انڈپینڈنٹ (The Independent) میں حال میں ایک خط چھپا ہے۔ مکتوب نگار لکھتے ہیں کہ جنت وہ ہے جہاں آدمی کو انگلش مکان، چینی باورچی، امریکی تنخواہ اور جاپانی بیوی حاصل ہو۔ اس کے برعکس جہنم وہ ہے جہاں کسی کو جاپانی مکان، انگلش باورچی، چینی تنخواہ اور امریکی بیوی دے دی جائے:

> Heaven consists of an English house, a Chinese cook, an American salary and a Japanese wife. On the other hand, a Chinese salary and an American wife.

جاپان کے ایک ممتاز لیڈر شنتارو اشی ہارا (Shintaro Ashiharo) کا ایک آرٹیکل

لاس اینجلیز ٹائمس (Los Angeles Times Syndicate) میں چھپا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ امریکہ اور جاپان کے درمیان ۱۹۶۰ میں جس سیکوریٹی ٹریٹی معاہدہ پر دستخط ہوئے تھے، وہ اب مکمل طور پر فرسودہ (obsolete) ہو چکا ہے۔ اس معاہدہ کے تحت جاپان نے یہ ذمہ داری لی تھی کہ وہ جاپان میں مقیم امریکی فوجوں کا ۴۰ فیصد خرچ ادا کرے گا۔ مگر اب بدلے ہوئے حالات میں ہم کو نہ اپنے دفاع کے لئے امریکی فوجوں کی ضرورت ہے اور نہ اس کا خرچ ادا کرنے کی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ وقت آگیا ہے کہ جاپان اپنے مائیکرو چپ کارڈ کو استعمال کرنے پر غور کرے تاکہ امریکہ کو ہوش میں لایا جاسکے:

It is time for Japan to consider the possibility of playing our microchip card in order to bring the US to its senses.

اس کو پڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ہندستان میں اور جاپان میں کتنا زیادہ فرق ہے۔ ہندستان میں ہمارے لیڈروں کا حال یہ ہے کہ وہ کمیونل کارڈ (ہندو کارڈ، مسلم کارڈ) کھیلتے ہیں۔ مگر جاپان کا لیڈر اپنے سیاسی مقصد کے لئے بھی یہ سوچ رہا ہے کہ اس کو مائیکرو چپ کارڈ کھیلنا چاہئے۔ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہندستان میں تخریبی سیاست چلائی جاتی ہے اور جاپان میں تعمیری سیاست۔

جدید صنعتی انقلاب نے تمام پرانے معانی کو بالکل بدل دیا ہے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ اکتوبر ۱۹۹۰ میں شری لال کرشن ایڈوانی نے سومناتھ سے ایودھیا تک ۱۰ ہزار میل کی جو رتھ یاترا کی، اس رتھ کا نام "رام رتھ" رکھا گیا تھا۔ مگر حقیقۃً وہ "جاپان رتھ" تھا۔ کیوں کہ وہ رام کی قدیم بیل گاڑی کی نقل نہ تھا۔ یہ دراصل ایک ایئر کنڈیشنڈ جاپانی وین تھی جس کو اوپر سے رتھ کی صورت دیدی گئی تھی۔

عباسی خلیفہ ہارون رشید نے فضا میں بادل کے ٹکڑے کو چلتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا کہ جہاں چاہے جاکر برس، تیرا خراج میرے ہی پاس آئے گا (أمطري حيث شئت فسياتيني خراجك) آج کی ترقی یافتہ قومیں اگر دنیا والوں سے کہیں کہ تم خواہ جو بھی سرگرمی دکھاؤ، اس کا مالی فائدہ ہم کو ہی ملے گا تو غلط نہ ہوگا۔

پرانا لطیفہ ہے "عقل بڑی کہ بھینس" مگر موجودہ زمانہ میں جاپان نے اس میں ایک اور اضافہ کیا ہے۔ اس نے عملی طور پر ثابت کیا ہے "علم بڑا نہ کہ ہتھیار"۔ اس نے اس کو ایک ٹھوس حقیقت بنا کر دکھا دیا ہے۔ ایک امریکی مبصر کے الفاظ میں جاپان نے ثابت کیا ہے کہ آتشیں طاقت (firepower) کے مقابلہ میں دماغی طاقت (brainpower) زیادہ بڑی اور زیادہ موثر ہے۔

جاپان نے یہ برتر طاقت علم کے ذریعہ حاصل کی ہے۔ جاپان نے اپنی علمی ترقی کے ذریعہ ٹکنالوجی میں نئی بلندیاں حاصل کیں۔ مثال کے طور پر سب سے اعلیٰ سیمی کنڈکٹر جاپان میں تیار ہوتا ہے جو کہ کمپیوٹر کی صحت کارکردگی کی ضمانت ہے۔ جاپان کی دو اعلیٰ شخصیتوں کی تیار کی ہوئی ایک کتاب چھپی ہے۔ اس کا نام معنی خیز طور پر یہ ہے ــــ جاپان جو کہہ سکتا ہے کہ نہیں (The Japan that Can Say No) اس کے مصنفین نے جاپان کو مشورہ دیا ہے کہ امریکہ اگر جاپان سے اپنے مطالبات بند نہیں کرتا تو جاپان کو یہ کہہ دینا چاہئے کہ وہ اپنے سیمی کنڈکٹر کی جانکاری (expertise) سوویت روس کو دیدے گا۔ اس پر کچھ امریکی مبصرین نے لکھا ہے کہ اس کتاب کی اشاعت امریکہ کے لئے "پرل ہاربر" کے برابر ہے۔

جاپان نے اپنی موجودہ صنعتی اور اقتصادی ترقی علم کے ذریعہ حاصل کی ہے۔ ایک امریکی کتاب میں بتایا گیا ہے کہ بین اقوامی سطح پر امریکی طلبہ بیس صنعتی قوموں میں دسویں نمبر ہیں۔

جاپانیوں کی اسی بڑھی ہوئی معیار پسندی کا یہ نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنی مصنوعات کو بےنقص (zero defect) کے معیار تک پہنچا دیا۔ جاپانیوں کے اس مزاج کے متعلق میں نے ایک آرٹیکل پڑھا اس میں لکھا تھا کہ زیرو ڈیفکٹ کے معاملہ میں ان کا شوق اتنا بڑھا ہوا ہے کہ معمولی جاپانی کارکن بھی اپنی کارکردگی کا تقابل جرمنوں اور امریکنوں سے کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، اگر دوسرے لوگ پرزوں کو فی ملین کی سطح سے جانچتے ہیں تو جاپانی یہ چاہتا ہے کہ اس کو فی بلین کی سطح سے جانچے:

So relentless are they in their zeal for 'zero defect', that even the ordinary Japanese workers are said to compare their performance with that of the Germans and Americans: If, for instance, others control parts at the per-million level, the Japanese want to do it at the per-billion level.

جاپانی رہنماؤں نے اپنے افراد کے اندر معیاری پسندی کا ذہن پیدا کیا۔ اس کے برعکس موجودہ مسلم رہنما اپنی قوم کے افراد میں شکایت پسندی کا ذہن پیدا کر رہے ہیں۔ جاپانیوں کی سوچ یہ ہے کہ دوسرے لوگ اگر اچھا کام کرکے آگے بڑھے ہیں تو ہم اور زیادہ اچھا کام کرکے ان سے آگے نکل جائیں۔ جب کہ نام نہاد رہنماؤں نے موجودہ مسلمانوں کے اندر جو ذہن پیدا کیا ہے وہ یہ کہ دوسرے لوگ جس چیز کو لیاقت کی بنیاد پر حاصل کر رہے ہیں۔ اس کو تم مطالبہ کی بنیاد پر حاصل کرنے کی کوشش کرو، اور جب مطالبہ اور ڈیمانڈ کی بنیاد پر وہ چیز تم کو نہ ملے تو اس کو تعصب کا نتیجہ بتا کر شکایت اور احتجاج کا لفظی طوفان جاری کر دو۔

ٹوکیو میں ۱۹۰۸ میں اسکول آف فارن لینگویجز قائم ہوا۔ اس میں اردو زبان کا بھی ایک شعبہ تھا۔ اس کے تحت غالباً پہلی بار پانچ جاپانی طالب علموں نے اردو پڑھنا شروع کیا۔ ۱۹۱۱ میں اس شعبہ کو ترقی دی گئی تو طلبہ کی تعداد بھی بڑھنے لگی۔ ۱۹۰۹ میں مولانا برکت اللہ صاحب بھوپالی اس شعبہ کے استاد مقرر ہوئے۔ وہ مولانا محمود حسن صاحب کی تحریک آزادی کے پروگرام کے تحت انگلینڈ اور امریکہ ہوتے ہوئے جاپان پہنچے تھے۔ اور یہاں ٹوکیو کے مذکورہ اسکول میں اردو کے استاد مقرر ہو گئے۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی کئی زبانیں جانتے تھے۔ وہ نہایت متحرک آدمی تھے۔ انھوں نے اپنے زمانۂ قیام میں ٹوکیو میں اسلامک فریٹرنٹی (Islamic Fratenity) کے نام سے ایک انجمن قائم کی اور اسی نام سے ایک انگریزی اخبار بھی جاری کیا۔ یہ اخبار جلد ہی بند ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے دوسرا پرچہ الاسلام (Al-Islam) کے نام سے نکالا۔ ان پرچوں کا نام اگرچہ اسلامی تھا مگر عملاً یہ دونوں پرچے سیاسی پرچے تھے۔ حکومت جاپان کو مولانا برکت اللہ بھوپالی کی سیاسی سرگرمیاں پسند نہیں آئیں۔ ۱۹۱۴ میں ان کو اسکول کی ملازمت سے الگ کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ جاپان سے واپس چلے گئے۔

۸۰ سال پہلے مولانا برکت اللہ بھوپالی کو جاپان میں کام کے جو مواقع ملے تھے اس کو اگر وہ اشاعت اسلام کے لئے استعمال کرتے تو آج شاید جاپان کی تاریخ دوسری تاریخ ہوتی۔ موجودہ زمانہ میں زبان، جغرافیہ، تاریخ، کلچر وغیرہ موضوعات کے تحت ساری دنیا میں

مختلف ادارے قائم کئے گئے ہیں۔ ان اداروں کے تحت مسلمانوں کو یہ موقع مل رہا ہے کہ وہ اس سے وابستہ ہوکر دنیا کے ہر ملک میں قیام کرسکیں۔ اس جدید امکان کے تحت بیسویں صدی میں لاکھوں مسلمانوں کو ساری دنیا میں رہنے اور کام کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ اگر مسلمانوں میں دعوتی ذہن ہوتا تو یہ مواقع موجودہ زمانہ میں اسلام کی عالمی اشاعت کا ذریعہ بن جاتے۔ مگر دعوتی ذہن نہ ہونے کی بنا پر یہ مواقع اشاعت اسلام کے حق میں استعمال نہ ہوسکے۔ یہ بلاشبہ سب سے بڑا اسلامی نقصان ہے جو موجودہ زمانہ میں ہمیں پیش آیا ہے۔

ٹوکیو کے مذکورہ لسانی اسکول کے ایک اردو ٹیچر مسٹر بدر الاسلام فضلی تھے۔ وہ دسمبر ۱۹۳۰ میں جاپان پہنچے اور ڈیڑھ سال تک وہاں رہے۔ ہندستان واپس آکر انھوں نے "حقیقت جاپان" کے نام سے اپنا مفصل سفر نامہ لکھا تھا جو انجمن ترقی اردو دہلی سے ۱۹۳۴ میں شائع ہوا۔ اس جاپانی سفر نامہ کا ایک جزء الرسالہ دسمبر ۱۹۷۶ میں شائع کیا جاچکا ہے۔

آج جاپان کی کئی یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے قائم ہیں۔ اردو ۔ جاپانی لغت بھی شائع کیا جا چکا ہے۔ اردو سے متعلق اور بہت سے کام ہورہے ہیں۔ اسکی تفصیل ہفت روزہ ہماری زبان (نئی دہلی) کے شمارہ ۸ جنوری ۱۹۹۱ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

شومی اوکادا (Shumi Okawa) غالباً پہلے جاپانی عالم ہیں جنھوں نے براہ راست عربی سے قرآن کا ترجمہ جاپانی زبان میں کیا۔ جاپان کی کئی یونیورسٹیوں میں اردو، عربی اور اسلامیات کی تعلیم کے شعبے ہیں۔ ان کی وجہ سے اسلام کی اشاعت میں مدد ملتی ہے۔ تبلیغی جماعت کے لوگوں نے بھی جاپان میں اسلام کی اشاعت کا کام کیا ہے۔

۱۹۷۳ میں جب شاہ فیصل نے تیل کی سپلائی جزئی طور پر بند کی تو اچانک دنیا کو معلوم ہوا کہ جدید صنعتی دور میں تیل کو انتہائی اہم حیثیت حاصل ہے۔ اس کے نتیجہ میں عرب دنیا نے نئی اہمیت حاصل کرلی اور نتیجۃً مسلم کلچر اور اسلامی علوم کا مطالعہ شروع ہوگیا۔ اس سے پہلے جاپان کے اہل علم اسلام کے معاملہ میں یورپ اور امریکہ کی کتابوں پر انحصار کرتے تھے، اب ان کے اندر یہ ذہن پیدا ہوا کہ وہ براست طور پر اسلام کا مطالعہ کرکے مسلم دنیا سے واقفیت حاصل کریں۔

۱۹۷۵ میں باقاعدہ طور پر جاپان کی یونیورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز کے شعبے قائم کرنے کا کام شروع ہوا۔ ۱۹۸۵ میں ایک بہت بڑا شعبہ قائم ہوا جس کا انگریزی نام (The Institute of Middle Eastern Studies) ہے۔ اسی طرح ٹوکیو یونیورسٹی میں (Institute of Oriental Culture) قائم ہے۔ پچھلے برسوں میں جاپان میں اسلام کے موضوع پر کئی سیمینار ہو چکے ہیں۔ مذکورہ انسٹی ٹیوٹ ایک سہ ماہی مجلہ چھاپتا ہے جس کا نام میدان (Maydan) ہے۔ اس میں جاپانی اور انگریزی زبان میں مضامین ہوتے ہیں۔

ایک اخبار میں جاپان میں آنے والے روبوٹ انقلاب (robot revolution) کا ذکر تھا۔ اس کا پہلا جملہ یہ تھا ـــــ آجکل جو لوگ جاپان آتے ہیں وہ اس کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ کس طرح جاپان میں ہر صنعتی شعبہ میں روبوٹ مشینیں کام کر رہی ہیں:

Recent visitors to Japan are awe-struck at the proliferation of robots in every field of industrial activity.

مضمون میں بتایا گیا تھا کہ دنیا بھر میں جتنے روبوٹ استعمال ہوتے ہیں، اتنے جاپان میں تنہا استعمال ہو رہے ہیں۔ آگ بجھانا، گھر کی صفائی کرنا، سمندر کی تہوں میں سامان لے جانا، کارخانوں میں سخت محنت والے کام کرنا، سرنگوں میں داخل ہونا وغیرہ، وغیرہ

روبوٹ کی سائنس کو روبوٹکس (Robotics) کہا جاتا ہے۔ اب روبوٹکس کی تحقیق خلائی روبوٹ بنانے کی طرف متوجہ ہے۔ ایسے روبوٹ بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے جو خلائی کارخانوں میں کام کر سکیں۔ مضمون میں مستقبل کے روبوٹ کے بارہ میں بہت سی انوکھی باتیں درج تھیں۔ میں نے ایک ہم سفر سے اس کا ذکر کیا۔ وہ انجینئر تھا۔ اس نے کہا کہ آج جب یہ باتیں کی جاتی ہیں تو وہ لوگوں کو سائنسی افسانہ معلوم ہوتی ہیں مگر اس صدی کے خاتمہ تک یہ سب عام بات ہو چکی ہوگی:

We seem to be talking the stuff of science fiction but by the turn of the century all this may sound commonplace.

میں نے سوچا کہ عین یہی بات آخرت کے معاملہ میں بھی ہے۔ آج جب لوگوں سے جنت اور

دوزخ کی بات کی جائے تو لوگوں کو اس کی صحت پر یقین نہیں آتا۔ حتی کہ آخرت کا اقرار کرنے والے بھی اس کو شعور کی سطح پر سمجھ نہیں پاتے۔ مگر موجودہ زندگی کے ختم ہوتے ہی جنت اور دوزخ ایسے واقعہ کی صورت میں سامنے آجائے گی کہ لوگ محسوس کریں گے کہ یہ تو اتنی بڑی حقیقت تھی کہ اس سے بڑی حقیقت اور کوئی نہیں۔

۹ دسمبر کو ظہر کی نماز کے بعد ہوٹل سے ایئر پورٹ کے لئے روانہ ہوا۔ یہاں کے قاعدہ کے مطابق درمیان میں بس روکی گئی۔ جاپانی پولیس نے تمام مسافروں کو مع سامان اتارکر ان کے پاسپورٹ اور ان کے سامان کی جانچ کی۔ میری باری آئی تو مجھ کو دیکھتے ہی میز کی دوسری طرف کھڑے ہوئے آدمی نے کہا "آپ مسلمان ہیں" میں نے کہا، ہاں۔ اس کے بعد ابتداءً انگریزی اور اس کے بعد عربی میں گفتگو ہوئی۔ اس نے بتایا کہ میں تین سال تک خرطوم میں رہا ہوں اور "شویّا" عربی جانتا ہوں۔ اس قافلہ میں میں اکیلا مسلمان تھا۔ اس نے سب کی باقاعدہ چیکنگ کی۔ مجھ کو صرف ایک مسکراہٹ کے ساتھ چھوڑ دیا۔

قیامت کے دن جو لوگ ایمان و اسلام کے ساتھ پہنچیں گے، وہ اسی طرح سرسری طور پر دیکھ کر آگے بڑھا دئے جائیں گے۔ مگر جن لوگوں کے پاس ایمان و اسلام کا سرمایہ نہ ہوگا، ان کا سخت حساب ہوگا اور حدیث میں آیا ہے کہ من نوقش فقد هلك۔ اللہ اس دن کی ہولناکی سے بچائے۔

جاپانی قوم اول و آخر ایک تجارتی قوم ہے۔ اس کا اخلاق بھی اس کے تجارتی مفاد کے تابع ہے۔ مثلاً اکثر ملکوں میں (خود دہلی میں بھی) ایئر پورٹ یا ایئر پورٹ ہوٹل سے مقامی ٹیلیفون مفت کیا جا سکتا ہے مگر جاپان میں اس کی سہولت نہیں۔ اکثر ملکوں میں ٹرانزٹ مسافر کے لئے ایئر پورٹ ٹیکس نہیں ہوتا مگر جاپان میں ٹرانزٹ مسافر سے بھی ۱۶ ڈالر ایئر پورٹ ٹیکس کے طور پر وصول کئے جاتے ہیں۔ وغیرہ

ہندستانی انسان بھی مفاد پسند ہے اور جاپانی انسان بھی مفاد پسند۔ تاہم دونوں میں ایک فرق ہے۔ ہندستانی انسان کے نزدیک مفاد پرستی کا مطلب اکسپلائٹیشن ہے۔ وہ ناقص سامان بیچ کر اپنا مفاد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مگر جاپانی انسان کی مفاد پرستی اس کو یہ سکھاتی

ہے کہ بہتر سے بہتر سامان تیار کرو تاکہ ساری دنیا تمہارا سامان خریدنے پر مجبور ہو جائے۔ ہندستانی انسان کا تجارتی مذہب دھوکا ہے، جاپانی انسان کا تجارتی مذہب اعلیٰ کوالیٹی۔ اس فرق کا مزید نتیجہ یہ ہے کہ جاپان میں اس قسم کے دنگے کبھی نہیں ہوتے جیسے کہ ہندستان میں ہر روز ہوتے رہتے ہیں۔ کیوں کہ "کوالیٹی" کا مزاج آدمی کو امن پسند بناتا ہے اور "دھوکے" کا مزاج فساد پسند۔

لاس اینجلیز سے ٹوکیو تک کا سفر نہایت پرسکون گزرا تھا۔ کیوں کہ اس میں بیشتر جاپانی مسافر تھے۔ چند ہندستانی مسافر بھی تھے۔ ان کے مزاج کا سب سے پہلا مظاہرہ ایئر پورٹ پر گیٹ نمبر ۱۲ کے ویٹنگ ہال میں ہوا۔ یہاں ہندستانی لوگ آدھ گھنٹہ کے لئے جمع ہوئے تھے۔ وہ یہاں سے اٹھے تو میں نے دیکھا کہ جگہ جگہ کوڑا پڑا ہوا تھا۔ جہاز کے اندر ایک ہندستانی مسافر نے کافی شراب پی لی۔ اس کے بعد وہ مدہوش ہو کر چلانے لگے۔ جہاز کا عملہ بڑی مشکل سے ان کو اٹھا کر پیچھے کی سیٹ پر لے گیا۔

میری سیٹ کے قریب ایک امریکی خاتون (Rebecca Becky Medcalf) تھیں۔ وہ سیاح کے طور پر ہندستان جا رہی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ میں خدا پر عقیدہ رکھتی ہوں، مگر کسی مذہب کو نہیں مانتی:

I believe in God, but not in any particular religion.

انھوں نے "مسلم ریلیجن" کا کوئی مطالعہ نہیں کیا تھا۔ البتہ مختصر طور پر عیسائیت اور یہودیت کو پڑھا تھا، مگر وہ اس سے متاثر نہ ہو سکیں۔

اس قسم کے لوگ مغرب میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ (اسلام کے علاوہ) مذاہب تحریف کی بنا پر انسانی عقل کو اپیل نہیں کرتے۔ مگر خدا کی معرفت انسان کی فطرت میں پیوست ہے۔ آدمی کسی خارجی مذہب کا انکار کر سکتا ہے مگر وہ خود اپنی فطرت کا انکار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ جو مذہب کو نہیں مانتے، وہ عین اسی وقت گہرائی کے ساتھ خدا کے وجود کے معترف ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو غیر محرف مذہب (اسلام) مل جائے تو وہ خدا کو بھی ماننے لگیں گے اور خدا کے بھیجے ہوئے سچے مذہب کو بھی۔

درمیان میں جہاز بینکاک میں اترا۔ یہاں کا وقت انڈیا کے مقابلہ میں ڈیڑھ گھنٹہ آگے

تھا۔ میں نے اپنی گھڑی تبدیل نہیں کی تھی۔ چنانچہ ملک ملک کے اعتبار سے میری گھڑی کا وقت بدلتا رہا۔ امریکہ میں ساڑھے دس گھنٹے کا فرق تھا، جاپان میں ساڑھے تین گھنٹہ کا، بینکاک میں ڈیڑھ گھنٹہ کا۔ کراچی میں یہ فرق آدھ گھنٹہ رہے گا اور دہلی پہنچ کر ملک کا وقت اور میری گھڑی کا وقت یکساں ہو جائے گا۔ یہی وہ آفاقی حقیقت ہے جو قرآن میں رب المشارق والمغارب کے لفظوں میں بیان کی گئی ہے۔

بینکاک ایئرپورٹ کی دیوار پر یہ لکھا ہوا نظر آیا کہ بینکاک کا مطلب ہے فرشتوں کا شہر:

Bangkok means – the city of angels.

قدیم زمانہ میں ہر قوم نے اسی طرح اپنے شہر، اپنی زبان، اپنے پہاڑ، اپنے دریا، اپنے درخت، غرض ہر نمایاں چیز کو خصوصی اہمیت کا حامل سمجھ کر ان کا ایک مقدس نام دے رکھا تھا۔ یہ قدیم مشرکانہ توہمات کا نتیجہ تھا۔ اس دور کو اسلام کے موحدانہ انقلاب نے ختم کیا۔ اب مشرکانہ توہمات اگر کہیں باقی ہیں تو تاریخی آثار کے طور پر باقی ہیں نہ کہ زندہ عقیدہ کے طور پر۔

۱۰ دسمبر ۱۹۹۰ کی صبح کو دہلی واپس پہنچا۔ واپسی کے بعد مختلف لوگوں کے خط اور پیغام ملے۔ ان سے ان کے تاثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں صرف ایک تاثر نقل کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحمید خاں صاحب اپنے خط مورخہ ۱۴ دسمبر ۱۹۹۰ میں لکھتے ہیں:

It was indeed a pleasure and heart warming occasion for us to listen to you during your recent trip to the USA.

ڈاکٹر صاحب موصوف بلامعاوضہ خدمت کے طور پر ایک ادارہ چلا رہے ہیں۔ اس ادارہ کا مقصد امریکہ اور کناڈا میں مقیم مسلم خاندانوں کو مناسب رشتۂ نکاح کی تلاش میں مدد دینا ہے۔ ان کا خاص دائرۂ عمل وہ لوگ ہیں جو برصغیر ہند سے جا کر امریکہ اور کناڈا میں آباد ہو گئے۔ ضرورت مند لوگ حسب ذیل پتہ پر ربط قائم کر سکتے ہیں:

Dr. Abdul Hameed Khan, Islamic Marriage Bureau, P.O. Box 472, Atwood, California 92601, U.S.A.

ایک سفر

طرابلس (لیبیا) میں ۲۴ ــ ۲۸ ستمبر ۱۹۹۰ کو ایک انٹرنیشنل اسلامی کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس کی دعوت کے مطابق ایک سفر ہوا۔ سفر کے کچھ تاثرات یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

۲۲ ستمبر کو صبح ساڑھے تین بجے گھر سے روانگی ہوئی۔ فجر کی نماز دہلی ایرپورٹ پر پڑھی۔ ایرپورٹ پر ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ اخوانی مزاج کے تھے۔ اسلامی جہاد پر بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اسلامی جہاد (بمعنی قتال) صرف دفاع ہے۔ اسلام کا اصل اقدام دعوت ہے نہ کہ قتال۔

انھوں نے کہا کہ ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ البتہ ہمارا کہنا ہے کہ دعوت کی راہ میں جب رکاوٹ ڈالی جائے تو رکاوٹ کو ختم کرنے کے لئے قتال کیا جائے گا۔ میں نے کہا کہ "دعوت کی راہ میں رکاوٹ" کا نظریہ دراصل موجودہ زمانہ کے سیاست پسند مفکرین کا پیدا کردہ ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک اسلامی دعوت کا مقصد اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔ یہ لوگ جب اسلام کو ایک سیاسی نظام کی حیثیت سے نافذ کرنا چاہتے ہیں تو انھیں محسوس ہوتا ہے کہ وقت کے حکمراں اس انقلابی مقصد کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ چنانچہ وہ ان سے لڑنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں تاکہ رکاوٹ کو دور کر کے اسلامی قانون کی حکومت قائم کریں۔

میں نے کہا کہ اسلامی دعوت کا یہ تصور ہی سرے سے غلط ہے۔ اسلامی دعوت دراصل توحید کا اعلان اور آخرت کا انذار ہے۔ اور اعلان توحید اور انذار آخرت کے کام میں، کم از کم موجودہ زمانہ میں کسی رکاوٹ کا سوال ہی نہیں۔ ہندستان میں بائیں چلو (خذ ذات الیسار) کا اصول ہے اور عرب ملکوں میں دائیں چلو (خذ ذات الیمین) کا۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ "دائیں چلو" کا اصول اسلام کا اصول ہے۔ اس لئے میں ہندستان کی سڑکوں پر دائیں چلوں گا تو ایسے شخص کو ہندستان کا نظام ایک رکاوٹ معلوم ہوگا۔ وہ کہے گا کہ ہمیں چاہیے کہ لڑ کر اس رکاوٹ کو دور کریں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ ایک احمقانہ بات ہے۔

بورڈنگ کارڈ لینے کے لئے ایرلائن کی کھڑکی پر کھڑا ہوا تو میں لائن میں سب سے پیچھے تھا۔

اچانک اندر سے ایک عرب نوجوان باہر آیا۔ اس نے میرا ٹکٹ لیا اور اندر جاکر ضروری کارروائی کی اور بورڈنگ پاس لاکر مجھے دے دیا۔ اسی کے ساتھ اس نے ایک خوب صورت چھپا ہوا کارڈ مزید دیا جو ضیافت کے لئے تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا:

Royal Jordanian is pleased to invite you to avail the facility of Baurya Lounge in Departure Hall; Thank You.

اس تجربہ کے بعد دل بھر آیا۔ میں نے کہا کہ کاش قیامت کے دن بھی ایسا ہی ہو کہ میں عجز اور دل فگاری کی تصویر بنا ہوا سب سے پیچھے کھڑا ہوں اور اللہ تعالیٰ فرشتہ کو بھیج دیں کہ میرے اس عاجز بندے کے پاس جاؤ اور اس کے داخلۂ رحمت کا کارڈ خود اس کے پاس پہنچا دو۔

دہلی ایئر پورٹ کے اندر میں امیگریشن (Immigration) کی کھڑکی پر کھڑا تھا۔ میرے قریب کی دوسری کھڑکی پر شور سنائی دیا۔ میں نے دیکھا کہ کھڑکی پر بیٹھے ہوئے پولیس کے آدمی سے دو مسافروں کا جھگڑا ہو رہا تھا۔ دوسری طرف میری کھڑکی پر بھی ایک وردی پوش آدمی تھا۔ مگر وہ نہایت شریفانہ انداز میں مسافروں کا کام انجام دے رہا تھا۔ میں نے اس کا نام پوچھا تو اس نے کہا: سرب جیت سنگھ۔

میں نے سوچا کہ جو لوگ آدمیوں کو فرقوں اور گروہوں کی صورت میں دیکھتے ہیں وہ کتنی بڑی غلطی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے سطحی قائدین ہر فساد کے موقع پر آنکھ بند کرکے "پولیس" کی مذمت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ گویا کہ ہر وہ شخص جس نے پولیس کی وردی پہن لی، وہ ایک ظالم گروہ کا فرد بن گیا۔ رائے قائم کرنے کا یہ طریقہ حد درجہ ظالمانہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک انسان اور دوسرے انسان میں فرق ہوتا ہے۔ انسانوں کو ان کے کردار کے اعتبار سے بانٹنا چاہئے نہ کہ فرقوں اور گروہوں کے اعتبار سے۔

دہلی سے اردن ایئرویز کی فلائٹ نمبر ۱۹۳ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں ایئر لائنز کا انگریزی میگزین رائل ونگ (Hemisphere) پڑھا۔ حسب معمول اس میں ہوٹلوں کے شاندار باتصویر اشتہارات تھے۔ عنوان تھا:

The Finest collection of Hotels in the Middle East.

سرسبز و شاداب ماحول میں خوب صورت اور شاندار عمارتیں دیکھنے میں بہت پرکشش

معلوم ہوئیں۔ میں نے سوچا کہ میں بار بار اسی قسم کے ہوٹلوں میں ٹھہرا ہوں۔ مگر جب وہاں ٹھہرتا ہوں تو وہاں کا قیام اور وہاں کی زندگی میں میرے لئے کوئی کشش نہیں ہوتی۔

خیال آیا کہ ان تصویروں کے پرکشش ہونے کا سبب یہ ہے کہ ان میں ہوٹلوں کا ایک پہلو حذف ہو گیا ہے۔ وہ ان کا تعب اور حزن ہے۔ قرآن میں اہل جنت کی زبان سے کہلایا گیا ہے کہ اس اللہ کا شکر ہے جس نے ہم سے حزن کو ختم کر دیا (اذھب عنا الحزن) دنیا کا یہ تجربہ آخرت کے معاملہ کا ایک تعارف ہے۔ دنیا میں حزن تصویر میں حذف ہو جاتا ہے مگر حقیقت میں وہ موجود رہتا ہے۔ آخرت میں خدا اپنے کمال قدرت سے خود حقیقت کے اندر سے حزن کو حذف کر دے گا۔ اس کے بعد خدا کی دنیا ابدی خوشیوں کی لازوال آرام گاہ بن جائے گی۔

۲۲ ستمبر کو دوپہر بعد کا وقت تھا۔ باہر سورج کی روشنی پوری طرح فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہمارا جہاز اردن کے صحرائی حصہ کے اوپر ۵۳۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ رہا تھا۔ کھڑکی سے باہر کی طرف نظر ڈالی تو نیچے خالص صحرائی منظر تھا۔ دور دور تک کہیں کوئی آبادی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ہر طرف غیر آباد ریتیلے میدانوں کا منظر تھا۔

اس وقت میرے ہاتھ میں اردن ایئرلائنز کا عربی مجلہ " الاجنحہ " تھا۔ اس کے ایک مضمون کا عنوان تھا: المیاہ فی الوطن العربی و الاردن اس میں عرب دنیا کے آبشار (الشلالات) دکھائے گئے تھے۔ آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی رنگیں تصویروں میں نظر آ رہا تھا کہ پہاڑوں کے اوپر سے پانی کے بڑے بڑے دھارے آبشار بن کر نیچے گر رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ خدا کی قدرت بھی کیسی عجیب ہے۔ زمین پر ایک طرف خشک صحراؤں میں ریت اڑ رہی ہے اور دوسری طرف اسی زمین میں پانی کے دریا بہہ رہے ہیں۔

اس بار لیبیا کا سفر ہنگامی حالات میں ہوا۔ ۲ اگست ۱۹۹۰ کو کویت کے خلاف عراق کے فوجی اقدام نے یہ صورت حال پیدا کر دی ہے کہ ہر طرف جنگ کی باتیں ہو رہی ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ "لیبیا" کا لفظ جدید دور کی جنگی طاقت کو بھی بتاتا ہے اور اس کی کمزوری کو بھی۔

امریکی جنرل آجکل صدام حسین کو بم کا نشانہ بنانے کی بات کر رہے ہیں (ہندستان ٹائمس ۷ استمبر ۱۹۹۰) ۱۹۸۶ میں اسی طرح امریکی بمباروں نے لیبی حکمراں کو نشانہ بنایا تھا۔ یہ واقعہ ایک طرف

بتاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں کس طرح یہ ممکن ہوگیا ہے کہ ایک فوجی افسر فضائی راستہ سے دشمن کے ملک میں داخل ہوجائے۔ اور وہاں اپنے مطلوبہ نشانہ پر بم گرا کر محفوظ طور پر واپس چلا آئے۔ اسی کے ساتھ یہی واقعہ انسان کی محدودیت کو بھی بتا رہا ہے۔ یعنی ساری مشینی ترقیوں کے باوجود اب بھی انسان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ نتیجہ کو صد فی صد اپنے حق میں یقینی بنا سکے۔

ٹائم (۱۰ ستمبر ۱۹۹۰) نے اسی بات کو ان لفظوں میں کہا تھا کہ امریکہ کے فوجی جنرل صدام حسین کے خلاف جراحی ضرب کی بات کر رہے ہیں لیکن جراحی ضرب عام طور پر غلط نشانوں پر مارتی ہے، جیساکہ ۱۹۸۶ میں لیبیا کے خلاف حملہ میں ہوا۔ اس حملہ کا نشانہ معمر قذافی تھے۔ مگر عملاً جو ہوا وہ یہ کہ فرانسیسی سفارت خانہ تباہ ہوگیا اور قذافی کی لڑکی مرگئی:

Generals like to talk of "surgical strikes", but surgical strikes usually hit the wrong targets - like the misguided air raid on Libya in 1986 that wrecked the French embassy and killed Colonel Gaddafi's daughter (p. 56).

دہلی سے روانہ ہوکر ہمارا جہاز پاکستان، افغانستان، ایران اور عراق کے اوپر سے اڑتا ہوا دوپہر بعد عمان کے ایرپورٹ پر اتر گیا۔ اس سے پہلے میں عمان سے دوبار گزر چکا ہوں، مگر اس بار عمان ایرپورٹ پر کچھ بھیڑ کا سا منظر دکھائی دیا۔ حالانکہ اس سے پہلے یہاں بہت کم آدمی نظر آتے تھے۔ خلیج کے موجودہ حالات غالباً اس کا سبب ہیں۔

عمان کا لفظ آجکل خبروں میں بہت زیادہ آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۲ اگست کو کویت پر عراق کے حملہ کے بعد جب لوگ بھاگنا شروع ہوئے تو ان کے لئے اردن کی سرحد سب سے زیادہ کھلی ہوئی تھی۔ چنانچہ بہت بڑی تعداد میں لوگ بھاگ بھاگ کر اردن پہنچ گئے۔

حملہ کے وقت تقریباً ۸۰ ہزار ہندستانی کویت میں تھے۔ ان کی بڑی تعداد بھاگ کر اردن میں داخل ہوگئی۔ یہاں سے انھیں بسوں کے ذریعہ عمان لایا گیا۔ تازہ اطلاع کے مطابق، بوقت تحریر تقریباً دس ہزار ہندستانی عمان میں رہ گئے ہیں۔ بقیہ کو عمان سے بمبئی پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ لوگ عمان سے ۱۱۰ کیلو میٹر کے فاصلہ پر ازرق ریفیوجی کیمپ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

اس مقصد کے لئے ایر انڈیا اور اقوام متحدہ کے جہاز مشترکہ طور پر مصروف رہے۔ ابتداءً روزانہ

دو جہاز عمان سے بمبئی جاتے تھے۔ پھر روزانہ ۱۳ جہاز جانے لگے۔ اب ان کی تعداد روزانہ نو کر دی گئی ہے۔ چند دن کے اندر انشاء اللہ تمام ہندستانی اپنے وطن پہنچائے جا چکے ہوں گے۔

عمان سے طرابلس کے لئے اردن ایر لائنز کی فلائٹ نمبر ۴۵ا کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں آج (۲۲ ستمبر) اردن کے دو اخباروں کا مطالعہ کیا۔ ایک عربی روزنامہ "الرای" دوسرا انگریزی روزنامہ (Jordan Times) انگریزی اخبار کے پہلے صفحہ کی پہلی سرخی یہ تھی کہ سعودی عرب نے اردن کو تیل کی سپلائی بند کر دی:

S. Arabia cuts off oil supply to Jordan

ایسا ہونا بالکل فطری ہے۔ کیوں کہ اردن نے کھلم کھلا کویت عراق کے معاملہ میں صدام حسین کا ساتھ دیا ہے۔ عربی اخبار کے صفحہ ۱۸ پر چھ چوکھٹوں میں مختلف کمپنیوں اور اداروں کے اعلانات تھے۔ ان اعلانات میں اردن کے ملک حسین کے ساتھ صدام حسین کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ ہر چوکھٹے پر تائید و ولاء (تائید اور دوستی) جیسے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ ان میں صدام حسین کو قائد عربی کے روپ میں دکھایا گیا اور "عہد" کیا گیا تھا کہ ظالم امریکیوں اور صلیبیون کے خلاف جنگ میں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

اخبار میں کویت کے خلاف صدام حسین کی جارحیت کا مطلق کوئی ذکر نہ تھا۔ مختلف انداز میں صرف امریکہ اور اس کے ساتھیوں کے ظلم اور فریب کو نمایاں کیا گیا تھا۔ ایک عراقی فوجی طارق نعیم کا خط (رسالہ) اپنے مصری فوجی دوست دسوقی ابو المعاطی کے نام نمایاں طور پر چھاپا گیا تھا۔ اس خط میں عراقی فوجی نے مصری فوجی کو شرم دلائی تھی کہ کیا تم ظالموں کی فوج میں شامل ہو کر میرے اوپر گولی مارنا چاہتے ہو۔ حالاں کہ یہ سب ڈاکو ہیں جو سمندر پار سے عربوں کو قتل کرنے کے لئے آئے ہیں۔ خط کا خاتمہ اس جذباتی لفظ پر ہوا تھا: فهل تدعهم يفعلون (پھر کیا تم انھیں چھوڑ دو گے کہ وہ جو چاہتے ہیں کریں)

اردن کے اخبار میں اس قسم کی خبروں اور اس قسم کے مضمون کو پڑھ کر میں نے سوچا کہ انسان بھی کیسا عجیب ہے۔ وہ دوسرے کے ظلم کو بتاتا ہے اور اپنے ظلم کو چھپاتا ہے۔ صدام حسین نے واضح طور پر کویت کے خلاف جارحیت کی ہے۔ مگر اس کی کھلی ہوئی جارحیت کا کوئی ذکر نہیں، سارا شور وغوغا صرف اس بات پر ہے کہ امریکہ اپنی فوجوں کو لے کر خلیج عرب میں کیوں آ گیا۔

یہ ایک بدترین دھاندلی ہے۔ ساری دنیا کے لوگ اسی دھاندلی میں مبتلا ہیں۔ ہندستان کے مسلمانوں میں تمام لکھنے اور بولنے والے اسی دھاندلی کا شکار ہیں۔ یہ ایسا جرم ہے جس کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کو ہرگز خدا کی مدد ملنے والی نہیں۔

ٹائم میگزین کے سائز پر پیرس سے ایک عربی ہفت روزہ "الوطن العربي" کے نام سے نکلتا ہے۔ جہاز کے اندر اس کا شمارہ ۷ ستمبر ۱۹۹۰ موجود تھا۔ اس کا بھی مطالعہ کیا۔ مگر یہ ایک سرسری قسم کا پرچہ تھا۔ اس کی کور اسٹوری تھی: خلیج کا بحران، جنگ یا جنگ نہیں (ازمة الخليج: حرب ام لا حرب) مضمون میں دونوں پہلوؤں کو واضح کرتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ جنگ ہونے کا امکان بھی اتنا ہی ہے جتنا جنگ نہ ہونے کا۔

میں اگرچہ فرسٹ کلاس میں سفر کر رہا تھا۔ اور فرسٹ کلاس کے مسافروں کو جہاز میں غیر معمولی سہولتیں دی جاتی ہیں۔ مگر میں اپنی وسیع اور آرام دہ سیٹ پر اس طرح بے قرار تھا جیسے مجھے کسی عذاب خانہ میں ڈال دیا گیا ہے۔ میرا یہی حال ہر سفر میں ہوتا ہے۔ میں نے سوچا کہ دوسرے لوگ سفر سے لطف اٹھاتے ہیں۔ آخر میرا مزاج ایسا کیوں ہے کہ دنیا کی کوئی راحت میرے لئے خوشی اور سکون کا باعث نہیں بنتی۔

نفسیاتی اعتبار سے اس پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اپنے مزاج کے اعتبار سے میں ایک معیار پسند (Idealist) آدمی ہوں۔ دنیا کی کوئی چیز، خواہ وہ کتنی ہی اچھی ہو، وہ معیار (آئیڈیل) سے کم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں کسی بھی چیز سے، خواہ بظاہر وہ کتنی ہی اچھی ہو، کبھی مطمئن نہیں ہو پاتا۔

میرے اس مزاج نے میرے لئے زندگی کو ایک مسلسل کرب بنا دیا ہے۔ تاہم اس مزاج کا ایک فائدہ مجھے یہ ملا کہ میں اس سطحیت سے بچ گیا جس میں بہت سے لوگ مبتلا ہوئے۔ انھوں نے اپنی کسی کتاب یا اپنے کسی عمل کو "شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم" کا درجہ دیا اور کہا کہ قیامت کے دن جب خدا پوچھے گا کہ کیا لائے تو میں اپنی اس کتاب یا اپنے اس عمل کا ہدیہ خدا کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔

میری معیار پسندی میرے لئے اس میں مانع ہو گئی کہ میں اپنی کسی کتاب یا اپنے کسی عمل کو یہ درجہ

دوں کہ وہ خدائے ذوالجلال کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کرنے کے قابل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس قسم کے کسی تصور کو خدا کی تصغیر کے ہم معنی سمجھتا ہوں۔

۲۲ ستمبر کو مقامی وقت سے ڈھائی بجے دن میں جہاز طرابلس کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ پوری پرواز نہایت ہموار تھی۔ اس کے کیپٹن (قائد الطائرہ) عبد اللہ الدبر تھے۔ عربوں میں اب ٹکنیکل ماہرین کافی تعداد میں پیدا ہو چکے ہیں۔

ایر پورٹ سے شہر آتے ہوئے سڑک پر ایک جگہ یہ کتبہ لکھا ہوا نظر آیا: الوحدة العربية ضرورة حتميه (عرب اتحاد ناگزیر ضرورت) اس کو پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ پچھلے پچاس سال سے اس قسم کے الفاظ ہر جگہ بولے اور لکھے جا رہے ہیں، مگر عین ان الفاظ کے ہجوم میں عرب اتحاد آج خلیج عرب میں غرق ہو چکا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ کلام اتحاد کو واقعہ بننے کے لئے شعورِ اتحاد درکار ہے۔ اور شعورِ اتحاد ساری مسلم دنیا میں کہیں موجود نہیں۔ لوگ اتحادیوں کے ساتھ متحد ہونا جانتے ہیں۔ حالانکہ حقیقی اتحاد اس وقت قائم ہوتا ہے جب کہ لوگ اختلافیوں کے ساتھ متحد ہونے کو جان لیں۔

طرابلس میں میرا قیام فندق باب البحر (کمرہ ۸۳۷) میں تھا۔ ۲۳ ستمبر کی صبح کو ناشتہ کی میز پر ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ کسی قدر مختلف لہجہ میں انگریزی بول رہے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ پہلے عیسائی "منسٹر" تھے۔ ۱۹۸۳ میں مسلمان ہو گئے۔ اپنی عمر انھوں نے ۶۶ سال بتائی۔ ان کا قدیم نام فسی ہوئی منو (Fisii Hoi Manu) تھا۔ موجودہ نام "فیاض" ہے:

Haji Faiyaz Manu, P.O. Box 1156
Nukualofa, Tonga Island, South Pacific Ocean

میں نے پوچھا کہ آپ نے کیسے اسلام قبول کیا۔ انھوں نے کہا کہ میری ملاقات فجی کے ایک مسلمان (محمد عثمان خاں) سے ہوئی۔ میں نے ان پر عیسائیت کی تبلیغ کرنی چاہی۔ اس طرح میرے اور ان کے درمیان گفتگو شروع ہوئی۔ یہ بحث کئی دن تک جاری رہی۔ میرا کہنا تھا کہ یسوع مسیح خدا تھے۔ انھوں نے کہا کہ انجیل کے مطابق، حضرت مسیح نے آخر وقت میں ایلی ایلی (میرے خدا، میرے خدا) پکارا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے سوا کسی اور کو خدا سمجھتے تھے۔

میں نے کہا کہ یسوع مسیح دنیا کے نجات دہندہ (Saviour of the World) تھے۔ انھوں نے کہا کہ جو انسان، آپ کے بیان کے مطابق، خود اپنے آپ کو یہودیوں اور رومیوں سے نہ بچا سکا، وہ ساری دنیا کو کس طرح بچائے گا۔ اس طرح بحثیں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ مجھ پر اسلام کی صداقت واضح ہوگئی اور میں نے اسلام قبول کر لیا۔

۲۴ ستمبر ۱۹۹۰ کی صبح کو اس عالمی کانفرنس کا افتتاح ہوا اور ۲۸ ستمبر تک جاری رہا۔ اس کا شعار تھا ـــــــ "الدعوة الاسلامية و آفاق المستقبل" اس کانفرنس میں مختلف ملکوں کے ۴۵۰ سے زیادہ افراد شریک ہوئے۔ یہ سب ۳۰۰ تنظیموں کے نمائندہ تھے۔ صدر جلسہ نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ دنیا جو اس وقت مختلف بحرانوں سے گزر رہی ہے، وہ دراصل دین اسلام کی محتاج ہے جو کہ فی الواقع سچا دین ہے (ان العالم الذی یمرّ بازمات الآن هو فی حاجة الی الاسلام لان الاسلام هو الدین الحقیقی)، تاہم بہت کم لوگوں نے اصل موضوع پر اظہار خیال کیا۔ زیادہ تر لوگوں کی تقریروں کا رخ استعماری سازشوں اور صلیبی اور صہیونی حملوں کی طرف رہا۔

کانفرنس کی کارروائیاں ذات العماد کے ہال میں ہوئیں جو انتہائی جدید طرز پر بنایا گیا ہے۔ مگر تقریریں زیادہ تر تقلیدی انداز کی تھیں۔ ایک مقرر اپنی پرجوش تقریر کر کے اسٹیج سے اترے تو میں نے کہا کہ آپ لوگ "جدید طرز کے ہال میں قدیم طرز کی تقریر کر رہے ہیں"۔ تقریروں اور مقالوں کی زبان عربی اور انگریزی تھی۔

موتمر میں بیشتر لوگوں نے جوش کے انداز میں تقریر کی۔ تاہم بعض لوگ نہایت سنجیدہ نظر آئے۔ مثلاً یوگوسلاویہ کے دکتور احمد سلاوچ نے اپنی عربی تقریر میں کہا کہ موجودہ زمانہ میں کام کا بہترین طریقہ پرامن طریقہ ہے۔ ہم کو علمی اسلوب میں اپنا کام کرنا چاہئے۔ ہم کو ٹکراؤ سے ہمیشہ پرہیز کرنا چاہئے۔ حتی کہ اگر فریق ثانی ٹکراؤ شروع کرے تب بھی ہم کو ٹکراؤ سے بچ کر اپنا کام علمی اور دعوتی اسلوب میں جاری رکھنا چاہئے۔ ان کی تقریر مجھے پسند آئی۔ مگر خواہش کے باوجود الگ سے میں ان سے ملاقات نہ کر سکا۔

ایک صاحب کناڈا سے آئے تھے۔ انھوں نے اپنی انگریزی تقریر میں ایک بات کہی جو مجھے

بہت پسند آئی۔ انھوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہوئے کہاکہ سب سے پہلے آپ کو دوسروں کی نظر میں اپنی اعتباریت قائم کرنا چاہئے۔ اس کے بعد ایسا ہوگا کہ آپ کی طرف سے جو بات آئے گی، وہ آسانی کے ساتھ قبول کر لی جائے گی:

First of all you have to establish your own credibility.
Then what comes from you will be easily accepted.

ایک عربی مقالہ کے بعد اس پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے جو کچھ کہا۔ اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ اس مقالہ کا موضوع تھا: دنیا کی حالیہ تبدیلیاں اور عالم اسلام پر اس کا اثر (المتغیرات فی العالم وتاثیرھا علی العالم الاسلامی)

میں نے کہاکہ آج مسلمانوں کا ذہن غیر اہم باتوں میں الجھا ہوا ہے۔ اور جو اصل بات ہے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں۔ میں نے کہاکہ جدید دنیا کے مطالعہ کے بعد میں نے یہ سمجھا ہے کہ آج پوری دنیا دو قسم کے تضادات میں مبتلا ہے۔ ایک علمی تضاد اور دوسرا دینی تضاد۔ اس تضاد سے آج انسان کو نکالنا، یہی موجودہ زمانہ میں دعوتی عمل کا اصل میدان ہے۔

میں نے کہاکہ جدید دنیا کا علمی تضاد وہ ہے جو مشہور سائنسداں شروڈنگر (Schrodinger) کے اس قول میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس نے بہت سے سائنس دانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے کہاکہ فطرت کے بارہ میں سب سے زیادہ ناقابل فہم بات یہ ہے کہ وہ قابل فہم ہے:

The most incomprehensible thing about
nature is that it is comprehensible.

جدید علما، ایک ناقابل حل مشکل میں مبتلا ہیں۔ وہ کائنات کو خدا کے بغیر سمجھنا چاہتے ہیں۔ مگر خدا کائنات میں اتنا زیادہ شامل ہے کہ خدا کو الگ کر کے کائنات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی۔ اس تضاد کا واحد حل یہ ہے کہ آج کے اہل علم کو خدا کے عقیدہ پر لایا جائے۔ خدا کے عقیدہ کو مانتے ہی وہ اپنے اس لاینحل تضاد سے نجات حاصل کر لیں گے۔

دوسرا تضاد وہ ہے جس کو مذہبی تضاد کہا جا سکتا ہے۔ انڈیا کے ایک ہندو مفکر نے کہا ہے کہ ہندوؤں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان کا مذہب اتنا زیادہ غیر عقلی ہے کہ وہ ان کے لئے کھڑے ہونے کی مثبت

بنیاد نہیں بن سکتا ۔ وہ صرف مسلم دشمنی کی منفی بنیاد پر کھڑے ہو سکتے ہیں ۔ مگر منفی بنیاد کبھی کسی قوم کو ترقی کی طرف نہیں لے جا سکتی ۔ یہ بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جو چیز پسندیدہ ہے وہ ممکن نہیں، اور جو ممکن ہے وہ پسندیدہ نہیں :

What is desirable is not possible
and what is possible is not desirable.

یہ صرف ہندوازم کی بات نہیں ۔ یہی اسلام کے سوا تمام مذاہب کی بات ہے ۔ یہ تمام مذاہب محرف مذاہب ہیں ۔ وہ تحریف کے نتیجہ میں غیر عقلی بن چکے ہیں ۔ اس کے نتیجہ میں موجودہ قومیں اس صورتحال سے دوچار ہیں کہ ان کا قومی مذہب قابل عمل نہیں ہے ۔ اور اسلام قابل عمل ہے مگر قومی تعصب کی بنا پر وہ اس کو اختیار نہیں کرتے ۔

یہ دو قسم کے تضاد ہیں جن میں آج کی تمام قومیں مبتلا ہیں ۔ دنیا کو اس تضاد سے نکالنا، یہی آج دعوتی اعتبار سے کرنے کا سب سے بڑا کام ہے ۔

۲۵ ستمبر کی شام کا وقت ہے ۔ میں اپنے کمرہ کی پشت کی بالکنی پر کھڑا ہوں ۔ سامنے حد نظر تک سمندر (میڈیٹرینین) پھیلا ہوا ہے ۔ سمندر میں کچھ تفریحی کشتیاں نظر آئیں جو اپنے مسافروں کے ساتھ سمندر میں تیز رفتاری کے ساتھ دوڑ رہی تھیں ۔ فضا میں کچھ سمندری چڑیاں منڈلا رہی تھیں جو بار بار مچھلی پکڑنے کے لئے پانی میں گرتی تھیں ۔ ساحل سے ملی ہوئی سڑک پر دوڑتی ہوئی کاروں کا منظر تھا جو اپنے مسافروں کو لئے ہوئے مسلسل چلی جا رہی تھیں ۔

ان چیزوں کو دیکھ کر میری سمجھ میں آیا کہ ولقد کرمنا بنی آدم وحملناھم فی البر والبحر کا مطلب کیا ہے اور اس میں انسان کے لئے جس "تکریم" کا ذکر ہے، اس سے کیا مراد ہے ۔ وہ یہ کہ انسان کے ساتھ "حملنا" کا معاملہ کیا گیا ہے، جب کہ حیوانات کے ساتھ "حملنا" کا معاملہ نہیں کیا گیا ۔

پاؤں والے جانور اپنے پیروں پر چلتے ہیں ۔ مچھلیاں اپنی طاقت سے تیرتی ہیں ۔ چڑیاں اپنے بازوؤں کے ذریعہ اڑتی ہیں، مگر انسان سواری پر بیٹھ کر اپنا راستہ طے کرتا ہے ۔ خشکی میں اس کے لئے گاڑی ہے ۔ سمندروں میں اس کے لئے کشتی ہے اور فضاؤں میں اس کے لئے ہوائی جہاز ہے ۔ گویا

انسان کے لئے اللہ تعالیٰ نے شاہانہ معاملہ فرمایا ہے۔ جو لوگ اس عطیۂ الٰہی کا حقیقی احساس کرکے اس چیز کا ثبوت دے سکیں جس کو حمد اور شکر کہا گیا ہے، ایسے لوگوں کے ساتھ آخرت میں بھی شاہانہ معاملہ کیا جائے گا، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: وإذا رأيت ثَمّ رأيت نعيماً وملكاً كبيرا

یہاں جو لوگ جمع تھے، ان کی بہت بڑی تعداد وہ تھی جو مجھ کو جانتی تھی، اس لئے اکثر ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ تاہم جس موضوع پر سب سے زیادہ گفتگو ہوئی وہ یہ تھا کہ اسلام کے احیاء کے لئے موجودہ زمانہ میں، ہمیں کیا کام کرنا ہے۔

جن لوگوں کو عالم اسلام کے تعلیم یافتہ لوگوں کا تجربہ ہے، وہ جانتے ہیں کہ موجودہ زمانہ کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی بیشتر تعداد "تغییر نظام" کی اصطلاح میں سوچتی ہے۔ جمال الدین افغانی، سید قطب، آیات اللہ خمینی، اقبال اور ابو الاعلیٰ مودودی وغیرہ کا طرز فکر زیادہ تر لوگوں کے ذہنوں پر چھایا ہوا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ اسلامی کام کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ حکومتی نظام کو توڑ کر اقتدار پر قبضہ کیا جائے۔ اس کے بغیر اسلام کو زندہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے ہر مجلس میں اس نقطۂ نظر کی مکمل تردید کی۔ میں نے کہا کہ "تغییر نظام" کا نظریہ کوئی نظریہ نہیں، یہ صرف ردّ فعل ہے۔

ایک عرب انجنیر نے بتایا کہ ہمارے ملک میں ۱۹۸۸ میں پٹرولیم انجنیرنگ پر ایک سمینار ہوا۔ اس میں یورپی ملکوں کے لوگ بھی بلائے گئے تھے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر برنر کیمبل (Burner Campbel) تھے جو ایل پی جی (Liquified petrolium gas) کے ماہر تھے۔ ان کو میں نے آپ کی کتاب "گاڈ ارائزز" پڑھنے کے لئے دی۔ اس کو پڑھنے کے بعد انھوں نے گہرا اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ میں نے یہ جانا کہ اگر زمین پر کوئی مذہب واقعۃً منطقی مذہب (Logical religion) ہے تو وہ اسلام ہی ہو سکتا ہے۔ اور اگر کبھی مستقبل میں میں نے اپنا مذہب بدلنے کا فیصلہ کیا تو میں اسلام کا انتخاب کروں گا۔ انھوں نے گاڈ ارائزز کے بارہ میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

> Even English speaking scientists in the west can not write such a book on this subject.

اسلامی مرکز کی انگریزی مطبوعات کے سلسلہ میں اور بھی کئی لوگوں نے اعلیٰ تاثر کا اظہار کیا۔

کانفرنس میں ایک صاحب لندن سے آئے تھے۔ انھوں نے ایک مجلس میں خلیج کے مسئلہ کا ذکر کیا۔ وہ پرجوش طور پر صدام حسین کی وکالت کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اس معاملہ میں بیشتر مسلمان صدام حسین کے حامی ہیں۔ جو لوگ مخالف ہیں وہ وہی لوگ ہیں جن کو سعودی عرب سے پیسہ ملتا ہے۔ میں نے کہا کہ تنقید کا یہ طریقہ صحیح نہیں۔ جو حضرات صدام حسین کے حامی ہیں ان کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ ان کو عراق سے پیسہ ملتا ہے تو آپ اس کا کیا جواب دیں گے۔

میں نے کہا کہ صدام حسین کو اگر حملہ کرنا تھا تو انھوں نے اسرائیل پر حملہ کیوں نہیں کیا۔ کویت پر کیوں حملہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں لندن میں عراق کے سفیر سے ملا تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے کویت پر کیوں حملہ کیا۔ سفیر نے کہا کہ اصل میں تو ہم اسرائیل پر حملہ کرنا چاہتے تھے، ہم نے سعودی عرب اور کویت سے کہا کہ اس معاملہ میں ہمارا ساتھ دو، مگر وہ ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ اس لئے ہم کو ایسا کرنا پڑا۔ میں نے کہا کہ آپ کو سفیر عراق سے پوچھنا چاہئے تھا کہ جب آپ نے سعودی عرب اور کویت کی حمایت کے بغیر ایران اور کویت پر حملہ کر دیا تو اسی طرح آپ ان کی حمایت کے بغیر اسرائیل پر بھی حملہ کر سکتے تھے۔

پھر انھوں نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ عراقی سفیر کے بیان کے مطابق، عراق کو یہ خطرہ تھا کہ جب وہ اسرائیل پر حملہ کرے گا تو امریکہ کی فوجیں خلیج میں عراق کے خلاف آ جائیں گی۔ میں نے کہا کہ آپ کو عراقی سفیر سے دوبارہ کہنا چاہئے تھا کہ امریکی فوج تو کویت پر حملہ کی صورت میں بھی مکمل طور پر خلیج میں آگئی ہے۔ پھر جس طرح کویت پر حملہ کے وقت آپ نے امریکی فوج کی پروا نہیں کی، اسی طرح آپ اسرائیل پر حملہ کے وقت بھی امریکی فوج کی آمد سے بے پروا ہو کر اسرائیل کے خلاف اپنی فوجی کارروائی کر سکتے تھے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سوچ کتنی زیادہ سطحی ہو گئی ہے اور مسلمانوں کے لیڈر کس طرح مسلمانوں کی کم فہمی کا استغلال کر رہے ہیں۔

۲ اگست ۱۹۹۰ کو صدام حسین نے کویت پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے مزاج کا جو پہلو سامنے آیا ہے وہ نہایت عجیب ہے۔ سنجیدہ اور سمجھ دار مسلمانوں کی ایک اقلیت نے اس کو صدام حسین کی جارحیت قرار دیا اور کھل کر اس کی مذمت کی۔ مگر دنیا بھر میں عام

مسلمانوں کی اکثریت نے جارحیت کے مسئلہ کو نظر انداز کیا۔ وہ صرف یہ کہتی رہی کہ سعودی عرب نے کیوں امریکہ کو بلایا اور امریکہ کی فوجیں کیوں خلیج میں داخل ہو گئیں۔ چنانچہ موجودہ موتمر میں آنے والے لوگوں کی بیشتر تعداد کی سوچ بھی یہی تھی۔

یہ معاملہ موجودہ مسلمانوں کی ایک کمزوری کو بتاتا ہے۔ موجودہ مسلمان ہر معاملہ میں "بغض معاویہ" کی نفسیات کے تحت سوچتے ہیں۔ وہ "حب علی" کی نفسیات کے تحت سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے زعماء، ان کے اخبارات، ان کے جلسے، صبح و شام صرف ایک بات کا اعلان کرنے میں مصروف ہیں۔ اور وہ "اعداء اسلام" کا مسئلہ ہے۔ ہر لکھنے اور بولنے والا صرف یہ خبر دے رہا ہے کہ اسلام دشمنوں نے ہمارے اوپر حملہ کر رکھا ہے اور ہمیں ان کے خلاف اٹھنا چاہیے۔

اس قسم کی باتوں نے مسلمانوں کے اندر مستقل طور پر "بغض معاویہ" کی نفسیات پیدا کر رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر معاملہ میں ان کا طرز فکر منفی طرز فکر ہوتا ہے۔ اسی طرز فکر کا ایک مظاہرہ خلیج کے بحران کے سلسلہ میں ہوا ہے۔ مسلمان اگر معتدل نفسیات میں جی رہے ہوتے تو وہ اس معاملہ میں صدام حسین کی جارحیت کو سب سے زیادہ قابل مذمت چیز سمجھتے۔ مگر ان کی غیر معتدل نفسیات کا یہ نتیجہ ظاہر ہوا ہے کہ ان کی ساری توجہ صرف "دشمن اسلام" امریکہ کی کارروائی کی طرف چلی گئی، وہ صدام حسین کی خلاف حق کارروائی کو دیکھنے سے قاصر رہی۔

ایک تعلیم یافتہ عرب سے اس حدیث پر گفتگو ہوئی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لا الٰہ إلا اللہ کے قول سے اپنے ایمان کی تجدید کرو (جددوا ایمانکم بقول لا الٰہ إلا اللہ) میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تجدید کرو، یہ نہیں فرمایا ہے کہ تکرار کرو۔ یہاں جددوا کا لفظ تکرار کے معنی میں نہیں ہے بلکہ تفکیر کے معنی میں ہے۔ لا الٰہ الا اللہ ایک حقیقت ہے، بلکہ وہ سب سے بڑی حقیقت ہے، اس کی کوئی حد نہیں۔ جب بھی آپ اس پر غور کریں تو آپ اس میں نئی بات پائیں گے۔ پس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ توحید کی حقیقت میں غور کرو، اس طرح تمہارا ایمان بڑھتا رہے گا:

ان الرسول صلی اللہ علیہ وسلم قال جددوا ولم یقل کرروا، فکلمۃ

”جددوا“ ھھنالیس بمعنی التکرار بل بمعنی التفکیر ”لا الٰہ إلّا اللہ“ ھی حقیقۃ بل اکبر من کل الحقائق۔ فلا نھایۃ لھا۔ وکلما فکرت فیھا ادرکت منھا شیئاً جدیدا۔ فمعنی الحدیث، علیکم ان تتفکروا وتتفکروا فی حقیقۃ التوحید فتزداد معرفتکم۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ اکثر اپنی تحریروں میں سائنٹفک نظریات سے اسلام کی صداقت ثابت کرتے ہیں۔ اگر بعد کو یہ سائنسی نظریات غلط ثابت ہو جائیں تو ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ اسلام کی تعلیمات غلط ہیں۔ میں نے کہا کہ جو شخص اس قسم کی بات کرے اس سے آپ کو کہنا چاہئے کہ تمہارا اعتراض غلط ہے۔ تم اسلام کی اصل تعلیم کو دیکھو نہ کہ ایک شخص کی تفسیر کو۔ کیوں کہ جو چیز غلط ثابت ہوئی ہے وہ ایک شخص کی تفسیر ہے نہ کہ خود اسلام کا متن۔

دوسری بات یہ کہ یہ ایک ناقابل عمل چیز ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ اعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ اس آیت کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ألا ان القوۃ الرمی ألا ان القوۃ الرمی (قوت سے مراد تیر مارنا ہے، قوت سے مراد تیر مارنا ہے) یہ واضح طور پر آیت کی زمانی تفسیر ہے نہ کہ ابدی تفسیر۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانہ میں یہ تفسیر نہ کرتے اور یہ سمجھ کر چھوڑ دیتے کہ آیندہ یہ تفسیر لوگوں کو غلط نظر آئے گی تو یہ حکمت کے خلاف ہوتا۔ کیوں کہ تفسیر نہ کرنے کی صورت میں آیت کا وہ زمانی فائدہ حاصل نہ ہوتا جس کو حاصل کرنا ضروری تھا۔

ایک صاحب علم النفس کے ڈاکٹر تھے۔ انھوں نے کہا کہ انسان کے اخلاقی اوصاف میں کسی خارجی عنصر کا کوئی دخل نہیں ہے۔ وہ صرف کیمیائی عمل (chemical reactions) کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً نفرت اور محبت، معافی اور انتقام، دینا اور چھیننا، سب جسم کے اندر کیمیائی تبدیلیوں کے سبب سے ظہور میں آتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اگر اس کو مان لیا جائے تو منطقی طور پر اس کا کوئی جواز نہیں رہتا کہ کسی مجرم کو سزا کیوں دی جائے۔ سزا کا تصور لازمی طور پر ”ارادہ“ کو تسلیم کرتا ہے۔ اگر کسی کے جرم میں اس کا اختیار اور ارادہ شامل نہ ہو تو اس کو اس کے کسی جرم پر سزا دینا کس طرح جائز ہوگا۔

ایک صاحب مغرب کے تعلیم یافتہ تھے۔ ان سے ڈارون کے نظریہ ارتقاء پر گفتگو ہوئی۔ میں نے

کہاکہ میں ڈاروِنزم کونہیں مانتا۔ وہ حیرت کے ساتھ میرا چہرہ دیکھنے لگے ، انھوں نے کہاکہ ڈاروِن کانظریہ ارتقا، تو ایک ثابت شدہ نظریہ ہے، پھر کس طرح آپ اس کاانکار کرسکتے ہیں۔

میں نے پوچھاکہ وہ کیسے ثابت شدہ ہے۔ انھوں نے کہاکہ اس نظریہ کے علما نے بندر سے لے کر انسان تک کے تمام ڈھانچے (اسکل) جمع کئے ہیں۔ان کو سلسلہ وار رکھ کر دیکھنے سے معلوم ہوتاہے کہ ان میں ایک تدریجی تبدیلی (Gradual change) ہوئی ہے۔ میں نے کہاکہ جس چیز کو آپ "تبدیلی" کہتے ہیں، اس کو اگر میں "فرق" کہوں تو آپ کے پاس اس کی تردید کی کیا دلیل ہوگی۔

یہ صحیح ہے کہ حیوانات کے درمیان بناوٹ کی مشابہت ہے۔ اسی طرح انسان اور حیوان کے ڈھانچہ میں بھی مشابہت ہے۔ مگر جب تک تجرباتی طور پر یہ ثابت نہ ہوجائے کہ ایک نوع سے دوسری نوع نکلی ہے، اس وقت تک ڈھانچہ کی اس مشابہت کو تبدیلی کی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔موجودہ حالت میں یہ مشابہت صرف فرق کو بتا رہی ہے۔ یعنی ہر ڈھانچہ اپنی ایک مستقل نوع کو بتا رہاہے ، نہ یہ کہ ایک سے دوسرا نکلا ، دوسرے سے تیسرا، اور تیسرے سے چوتھا۔ اور اس طرح ہوتے ہوتے انسان بن گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ نظریہ ارتقا کی بنیاد صرف خود ساختہ توجیہات پر ہے نہ کہ حقیقۃً مشاہدہ اور تجربہ پر۔

عربوں کی ایک مجلس میں موجودہ زمانہ کی مسلم تحریکوں کا ذکر آیا۔ میں نے کہاکہ موجودہ زمانہ کی تحریکیں آندھی کی طرح اٹھیں مگر نتیجہ کے اعتبار سے بے حقیقت ہو کر رہ گئیں۔اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ تحریکیں لینے کے نام پر اٹھیں ، جب کہ اس دنیا میں کامیابی اس کے لئے ہے جو دینے کے لئے اٹھے۔

سب سے پہلی تحریکیں وہ ہیں جو استعمار کے خلاف اٹھیں۔ وہ مغربی قوموں سے ان کی غالبیت چھیننا چاہتی تھیں۔ اسلام پسند تحریکوں نے مسلم حکمرانوں سے ان کا اقتدار چھیننے کا نشانہ دیا۔ فلپائن ، برما ، اریٹریا جیسے ملکوں کے مسلم لیڈر اپنے ملک کے غیر مسلم لیڈروں سے حق حکومت چھیننا چاہتے ہیں۔ ہندستان جیسے ملکوں کے مسلمان وہاں کے اکثریتی طبقہ سے یہ حق چھیننا چاہتے ہیں کہ وہ سڑکوں پر اپنا جلوس نکالیں یا اپنی مرضی کے مطابق اپنی زندگی کی تشکیل کریں۔

اس طرح موجودہ زمانہ کی تمام تحریکیں "چھیننے" کا نشانہ لے کر اٹھیں۔ مگر صحیح اسلامی تحریک وہ ہے جو دینے کے لئے اٹھے۔ جس کا مقصد دوسروں کو وہ چیز دیناہے جو ان کے لئے مفید ہے۔ دعوت

حق کی حیثیت یہی ہے ۔ دعوت حق لوگوں کو جہنم سے بچاکر جنت میں داخل کرنا چاہتی ہے۔

مگر موجودہ زمانہ کے سطحی مفکرین نے دعوت کو بھی چھیننے کا ایک معاملہ بنا دیا ہے۔ انھوں نے دعوت کی تعبیر سیاست کے انداز میں کی۔ انھوں نے دعوت کا مطلب یہ بتایا کہ اقتدار پر قبضہ کرکے اسلامی قانون کو زمین پر نافذ کیا جائے ۔ دعوت اسلامی کی یہ تعبیر مجرمانہ حد تک غلط ہے۔ اس کے نتیجہ میں داعی اور مدعو کے درمیان غیر ضروری سیاسی نزاع قائم ہوگئی۔ وہ ربانی مہم جو دراصل دینے کی مہم تھی ، وہ بالکل غلط طور پر چھیننے کی مہم بن کر رہ گئی ہے۔

عرب لوں کی ایک مجلس میں مسلمانوں کے کردار پر گفتگو ہو رہی تھی ۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ موجودہ مسلمانوں میں کردار کی بہت کمی ہوگئی ہے ، اس لئے ان کے درمیان کوئی بڑی مہم کامیاب نہیں ہوتی۔ میں نے کہا کہ کردار ، کردار کہنے سے کردار پیدا نہیں ہوتا ۔ جس طرح درخت ، درخت کہنے سے درخت نہیں اگتا ۔ درخت بیج بونے سے پیدا ہوتا ہے ۔ یہی انسانی کردار کا معاملہ بھی ہے ۔ انسانی کردار کا ایک بیج ہے ، اور وہ بیج مقصد ہے ۔ مقصد کا شعور ہی آدمی کے اندر وہ اعلیٰ اوصاف پیدا کرتا ہے جس کو کردار کہا جاتا ہے ۔ میں نے کہا کہ مقصد جتنا زیادہ بڑا ہوگا ، کردار بھی اتنا ہی بڑا بنے گا ۔ موجودہ مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے مقصد کا احساس کھو دیا ہے، اس لئے وہ کردار بھی کھوئے ہوئے ہیں :

بقدر مايكون الهدف عظيما فسوف تكون الاخلاق عظيمة ۔ ان اكبر مشكلة فى المسلمين المعاصرين انهم قد فقدوا الهدف العظيم لهذا فهم قد فقدوا الاخلاق العظيمة

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ آجکل مسلمانوں کے جس اجتماع میں جائیے یا جس مجلس میں بیٹھئے ، ہر جگہ "اعداء اسلام" کے بارہ میں باتیں سننے کو ملتی ہیں ۔ میرے نزدیک یہ طرز فکر سطحی بھی ہے اور خلاف اسلام بھی ۔ اگر موجودہ صورت حال کو خالص عقلی اعتبار سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کے ساتھ اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے وہ ان کی اپنی کمزوریوں کا نتیجہ ہے ۔ اور اگر اس کو دینی اعتبار سے جانچا جائے تو یہ خدا کی طرف سے انتباہ ہے تاکہ مسلمان جاگیں اور اپنی دینی کوتاہیوں کو دور کریں ۔ مگر ان چیزوں کو اعداء اسلام کے خانہ میں ڈالنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ موجودہ صورت حال سے مسلمانوں کے اندر

نہ تعمیر خویش کا جذبہ ابھرا اور نہ دینی احتساب کا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ طرز فکر مکمل طور پر شیطان کا وسوسہ ہے۔ شیطان چاہتا ہے کہ مسلمان جھوٹی شکایتوں میں کھوئے رہیں اور اپنی اصلاح کی طرف سے غافل ہو جائیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کا کہنا ہے کہ اسلامی دعوت کا نشانہ فرد ہے نہ کہ جماعت۔ حالانکہ اسلام میں جہاد اور قتال جیسے اعمال بھی ہیں جو کہ سراسر اجتماعی ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ خیال صحیح نہیں۔ اسلام میں دعا اور عبادت سے لے کر جہاد و قتال تک ہر عمل ذاتی ہے۔ قرآن و حدیث کے مطابق کسی عمل کی قیمت عامل کی نیت کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ ہر آدمی کے عمل کو اندرونی نیت کے معیار پر جانچا جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر عمل، اپنے آخری تجزیہ میں، ذاتی اور شخصی عمل ہے۔ کسی عمل کا اجتماعی پہلو اس کا اضافی پہلو ہے نہ کہ اس کا حقیقی پہلو۔

ایک صاحب نے پرجوش تقریر کی۔ ان کی عربی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ اعداء اسلام صرف طاقت سے ڈرتے ہیں، اور طاقت ہی کے ذریعہ ان کو شر انگیزی سے روکا جا سکتا ہے۔ اس لئے ہم کو چاہئے کہ ہم طاقت فراہم کریں۔ ان کے نزدیک یہی دعوت اسلامی کا سب سے بڑا نکتہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ دعوت اس کا نام ہے کہ امت کو طاقت ور بننے کی طرف متوجہ کیا جائے (الدعوة هي توجيه الامة الى القوة) اس تقریر کو سن کر مجھے نظیر اکبر آبادی کا شعر یاد آگیا:

ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے   بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

ایک شخص بھوکا ہو تو اس کو چاند سورج بھی روٹی کی صورت میں دکھائی دیں گے۔ یہی حال موجودہ مسلمانوں کا ہے۔ موجودہ مسلمانوں پر "دشمن" کا تصور اتنا چھا گیا ہے کہ ان کو ہر طرف بس دشمن کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ حتی کہ انھوں نے اسلام کو اپنے اسی ذہنی نقشہ میں ڈھال لیا ہے۔ قرآن و سنت میں وہ "دعوت" کا لفظ دیکھتے ہیں تو فوراً سمجھ لیتے ہیں کہ اس کا مطلب جنگی طاقت بننے کی دعوت ہے۔

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ اختلاف موجودہ دنیا کا ایک ناگزیر ظاہرہ ہے۔ وہ قیامت تک باقی رہے گا۔ ہمارا اصل کام حالتِ اختلاف کو ختم کرنا نہیں ہے، کیوں کہ وہ ممکن نہیں۔ ہمارا اصل کام یہ ہے کہ لوگوں کے اندر یہ مزاج بنائیں کہ وہ اختلاف کو پر امن دائرہ میں حل کرنے کی کوشش

کریں۔ موجودہ مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ انھوں نے برداشت کو کھو دیا ہے۔ اختلاف پیدا ہوتے ہی فوراً وہ جارحیت پر اتر آتے ہیں۔

میں نے کہا کہ روس اور امریکہ کے درمیان اختلاف تھا۔ دونوں کے پاس انتہائی طاقتور ہتھیار موجود تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ سختی کے ساتھ اس پر قائم ہیں کہ ہر اختلاف کو میز پر طے کرنے کی کوشش کریں۔ خلیج میں عراق اور کویت کے درمیان اختلاف تھا۔ عراق کے پاس اتفاق سے کچھ طاقت آگئی۔ اس نے فوراً کویت کے خلاف فوجی اقدام کر دیا۔ دوسری طرف اسی معاملہ میں امریکہ کو عراق سے شدید ترین اختلاف ہے۔ وہ اپنی فوجیں لئے ہوئے خلیج میں کھڑا ہوا ہے۔ مگر کئی مہینے گزر جانے کے باوجود ابھی تک اس نے عراق پر فوجی حملہ نہیں کیا۔ مسلمانوں کے اسی مزاج نے انھیں موجودہ دنیا میں برباد کر رکھا ہے۔

اخوانی طرز فکر کے کچھ عربوں سے ملاقات ہوئی۔ ان سے گفتگو کے دوران مصر کے لیڈر سید قطب کا ذکر آیا۔ اخوانی حلقہ سید قطب کی بے حد تعظیم کرتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں نے سید قطب کو پڑھا ہے۔ میں نے ان کے یہاں علم اور گہرائی نہیں پائی۔ یہ دراصل جمال عبد الناصر تھے جنھوں نے ان کو بلند کر دیا۔ ناصر نے ان کو قطب سے شہید قطب بنا دیا۔ ناصر نے اگر ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا ہوتا تو وہ ایک عام آدمی بن کر رہ جاتے۔ مگر جب ناصر نے ان کو قتل کر دیا تو انھوں نے ان کو ہیرو بنا دیا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح جنرل ضیاء الحق نے بھٹو کو پھانسی دے کر بھٹو کو ہیرو بنا دیا:

قد قرأت لسيد قطب. فما وجدت عنده علما و عمقا. انما هو جمال عبد الناصر الذی رفعه، فصنعه من قطب الى الشهيد قطب. لو تركه لمات كشخص عادی ولكن لما قتله جعله بطلا، كما ان ضياء الحق جعل بوتو بطلا بمثل هذا العمل

کچھ عربوں سے میری ذاتی زندگی کا ذکر آیا۔ میں نے کہا کہ میری زندگی کا سب سے عجیب پہلو یہ ہے کہ دنیوی معاملہ میں میں نے جو کچھ چاہا، عملاً میرے ساتھ اس کے خلاف معاملہ کیا گیا۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ میں میری مثال اردو شاعر فانی بدایونی کے اس شعر کی سی ہے:

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول — تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

طمعی كان على استعداد لقبول نعيم العالمين، انه لكرم منك ان وهبتنی قلباً حزيناً

یہاں سیکڑوں لوگ جمع تھے اور سب دین کے نام پر یہاں آئے تھے۔ مگر میں نے کسی نشست میں لوگوں کی زبان سے موت اور آخرت کی بات نہیں سنی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کہ لوگوں کو اس حقیقت کبریٰ کا علم ہی نہیں۔ ایک مجلس میں میں نے کہا کہ عربی شاعر نے کہا تھا : ستبدی لك الایام ماکنت جاھلا (زمانہ تم کو عنقریب وہ چیز بتادے گا جس سے تم بے خبر تھے) شاعر نے یہ بات دنیوی معنی میں کہی تھی۔ مگر یہی بات زیادہ شدت کے ساتھ موت اور آخرت کے بارہ میں صحیح ہے۔ جب موت آئے گی اور جب قیامت برپا ہوگی تو لوگ اچانک ان باتوں کو اپنے سامنے دیکھ کر دہشت زدہ ہو جائیں گے جن کی آج انھیں خبر دی جا رہی ہے۔ مگر وہ بے پروائی کے ساتھ اس کو نظر انداز کر رہے ہیں۔

ایک عرب نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک ایسے ملک سے تعلق رکھتے تھے جہاں ان کے خیال کے مطابق ڈکٹیٹر شپ قائم ہے۔ وہ کچھ اور نوجوانوں کے ساتھ ایک خفیہ تحریک چلا رہے تھے تاکہ حکومت کا تختہ الٹ سکیں۔ کئی سال کی کوششوں کے بعد جب انھیں کامیابی نہیں ملی تو انھوں نے ارادہ کر لیا کہ وہ خودکشی کر لیں۔ عین اسی زمانہ میں انھیں انگریزی الرسالہ اور عربی کتابیں مل گئیں۔ ان کا مطالعہ کرتے ہی ان کا ذہن بدل گیا۔ ان کا کہنا ہے کہ اب مجھ کو نئی زندگی حاصل ہو چکی ہے۔ انھوں نے اسلامی مرکز کے مشن کے بارہ میں کہا :

ان ھذہ الدنیا مثل الصحراء ولا یوجد بھا ای شیئ۔ وھذہ الرسالة ھی مثل الشجرة۔ فلا یوجد ای شیئ غیرھا۔ فیجب ان نقوم لھذہ الرسالة بکل قوة۔

ایک عرب جو اخوانی فکر کے تھے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ امراء المسلمین سے سیاسی نزاع کرنا اسلام میں جائز نہیں۔ حالاں کہ امام احمد بن حنبل جیسے جلیل القدر محدث نے عباسی حکومت سے نزاع کی۔ میں نے کہا کہ آپ کا حوالہ درست نہیں۔ امام احمد نے کبھی بھی عباسی حکومت سے سیاسی نزاع نہیں کی۔ یعنی انھوں نے کبھی یہ مہم نہیں چلائی کہ وہ عباسی خلافت کو توڑ کر نیا سیاسی نظام بنائیں۔ ان کا اختلاف صرف ایک مخصوص اعتقادی مسئلہ میں تھا۔ اس کے آگے ان کا کوئی سیاسی مطالبہ نہیں تھا۔

یہ اسی قسم کا ایک واقعہ تھا جو ہندستان میں پیش آیا۔ ہندستان کی سپریم کورٹ نے ایک مسلم

مطلقہ عورت کے حق میں یہ فیصلہ دیا کہ وہ اپنے سابقہ شوہر سے ماہانہ نفقہ حاصل کرنے کا حق رکھتی ہے۔ یہ فیصلہ ملکی قانون کے تحت دیا گیا تھا۔ مگر وہ شریعت کے خلاف تھا۔ علماء نے اس کے خلاف خالص غیر سیاسی انداز میں ایک مہم چلائی۔ یہاں تک کہ حکومت نے نیا ایکٹ بنا کر مسلم مطلقہ عورتوں کو اس ملکی قانون سے مستثنیٰ قرار دیدیا۔ اسی پر امام حنبل کے معاملہ کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔

ایک تجربہ گزرا۔ اس کے بعد میری زبان پر بے اختیار یہ فقرہ آگیا ـــــ آہ، وہ لوگ جو جہنم کے قابل بھی نہیں، مگر وہ امیدوار ہیں کہ ان کے لئے جنت کے دروازے کھولے جائیں گے۔ انھیں جنت کے باغوں میں داخل کیا جائے گا۔

۲۸ ستمبر ۱۹۹۰ کو ایک واقعہ ہوا۔ اس کے بعد میں نے کچھ عرب نوجوانوں سے کہا کہ قرآن کا ایک اسلوب یہ ہے کہ ایک آیت میں بظاہر ایک متعین بات کہی جاتی ہے۔ مگر وہ در اصل ایک کلیہ کا جزئی انطباق ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے: ما ننسخ من آیۃ او ننسہا نأت بخیر منہا او مثلہا (البقرہ ۱۰۶) ظاہر الفاظ کے اعتبار سے یہاں صرف نسخ آیت کا ذکر ہے۔ مگر وسیع تر معنوں میں وہ اللہ تعالیٰ کے ایک عمومی قانون کا بیان ہے۔ اور وہ یہ کہ اس دنیا میں جب بھی کسی صورت حال کو بدلا جاتا ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی جگہ کسی نئی بہتر صورت کو لایا جائے۔ اس اعتبار سے قرآن کی مذکورہ آیت کی تفسیر کی جائے تو وہ اس طرح ہوگی:

ان اللہ سبحانہ وتعالیٰ اذا اراد ان یغیر الاحوال فما یغیرہا الا ویأتی بما ھو احسن منہ۔ ھذا ھو الاسلوب الالٰھی۔ وکذالک فعل فی القرآن فقال (ما ننسخ من آیۃ او ننسہا نأت بخیر منہا او مثلہا)

ایک مجلس میں کچھ واقف کار عربوں نے میری ذات کے بارہ میں پوچھا۔ میں نے کہا کہ جو اسلامی مشن میں چلا رہا ہوں، اگر میں اس کو دریافت نہ کرتا تو میں زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک صاحب نے اس کو سن کر پوچھا کہ اس کا سبب کیا ہے۔

میں نے کہا کہ میں فطری طور پر ایک کمال پسند (perfectionist) آدمی ہوں۔ کمال سے کم (less than perfect) پر راضی ہونا میرے لئے ممکن نہیں۔ جب میں سن شعور کو پہنچا تو میں نے اپنے آپ کو دو چیزوں کے درمیان پایا۔ ایک مادی دنیا۔ دوسرے تقلیدی مذہب، موجودہ دنیا

کی ہر چیز کمال سے کم ہے۔ کمال (perfect) کا حصول صرف آخرت میں ممکن ہوگا۔ چنانچہ میں اپنے آپ کو دنیا پر راضی نہ کرسکا۔ تقلیدی مذہب انسانی ملاوٹوں کا مذہب ہے۔ سچا مذہب فکری اعتبار سے کامل ہوتا ہے۔ مگر انسانی ملاوٹ نے تقلیدی مذہب کو کمال سے کم بنا دیا ہے۔ چنانچہ میں اس پر بھی راضی نہ ہو سکا۔ اس کے بعد اللہ کی توفیق سے میں نے اس دین کو دریافت کیا جو ابتداءً پیغمبر پر اترا تھا اور پوری طرح کمال کی صفت رکھتا تھا۔ اس دریافت نے میرے لئے زندگی کو ممکن بنا دیا۔

۳۰ ستمبر کی شام کو لیبیا کا ایک زراعتی فارم (المزرعۃ) دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ طرابلس شہر سے ۳۰ کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ فارم کے پرسکون ماحول میں چند گھنٹے گزارے۔

لیبیا کی زمین نہایت زرخیز ہے۔ مگر یہاں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہاں پانی کی وہ فراوانی نہیں ہے جو ہندستان میں ہے۔ یہاں کی زمین میں ہر قسم کی عمدہ فصل اگانے کی صلاحیت ہے۔ بشرطیکہ پانی وافر مقدار میں ملنے لگے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ لیبیا میں کچھ زراعتی بیماریاں پھیل گئی ہیں۔ یہ خاص طرح کے کیڑے ہیں جو ہوا میں سفر کرکے اِدھر سے اُدھر پہنچتے رہتے ہیں۔ وہ درخت کی لکڑی کے اندر گھس جاتے ہیں اور اس کو کھاتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ درخت سوکھ جاتا ہے۔ میں نے یہاں کئی درخت دیکھے جو جزئی یا کلی طور پر سوکھ گئے تھے۔

ایک مغربی ماہر نے ان کیڑوں کو ختم کرنے کا منصوبہ دیا ہے۔ مگر اس پر عملدرآمد کے لئے ایک سو ملین ڈالر کی ضرورت ہوگی۔

تاہم بعض درختوں پر ان کیڑوں کا بالکل اثر نہیں ہوتا۔ مثلاً فارم کے اندر کھجور کے چھوٹے بڑے درخت تھے۔ مگر وہ مکمل طور پر سرسبز و شاداب تھے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی ہے جو بتاتی ہے کہ اخلاقی اور دینی بیماریاں صرف ان لوگوں کو نقصان پہنچاتی ہیں جو ان سے متاثر ہونے کا مزاج رکھتے ہوں۔ جن کے اندر تاثر کا مزاج نہ ہو وہ اخلاقی بیماریوں کے ہجوم میں بھی اس سے محفوظ رہیں گے۔

ایک مجلس میں گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ جو لوگ اسلام کی تشریح سیاسی انقلاب کی اصطلاحوں میں کرتے ہیں، انھوں نے بہت بڑی جسارت کی ہے۔ انھوں نے بطور خود اللہ کے منصوبہ کو بدلنے کی کوشش کی ہے۔ اللہ کے منصوبہ کے مطابق، یہ دنیا پوری کی پوری دار الامتحان ہے۔ ایک شخص گھر میں ہو یا بازار میں، تنہا ہو یا دوسروں کے ساتھ ہو۔ وہ عام انسان کی حیثیت میں ہو یا وہ

ملک کا حکمراں بن جائے، ہر جگہ وہ حالت امتحان میں ہے۔ مگر مذکورہ سیاسی تفسیر کے مطابق، حکومت مطلوب حالت قرار پاتی ہے اور غیر حکمرانی کی حالت غیر مطلوب حالت۔

اسکول کے ایک طالب علم کا امتحان ہو تو اس کو کئی پرچے دئے جاتے ہیں جن کا تعلق مختلف موضوعات سے ہوتا ہے۔ مثلاً زبان، تاریخ، سماجیات، سائنس وغیرہ۔ ان میں سے ہر پرچہ بذات خود مطلوب ہوتا ہے۔ یہاں ایک اور دوسرے میں کوئی فرق نہیں۔ اسی طرح جس شخص کو جو احوال ملے ہوں، وہی احوال اس کے لئے مطلوب احوال ہیں اور انھیں احوال میں اس کو اپنا امتحان دینا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ تعبیر آدمی کے اندر سے محرک عمل چھین لیتی ہے (ھذا التفسیر یسلب من الانسان الدافع للعمل) اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص قرآن میں انفاق کا حکم دیکھتا ہے۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کے راستے میں مال خرچ کرو۔ اب اگر ایک شخص یہ سمجھے کہ کم یا زیادہ جو بھی میرے پاس ہے، اس میں سے مجھے خرچ کرنا ہے تو حکم کو پڑھتے ہی اس کے اندر انفاق کی نفسیات پیدا ہو جائے گی۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ سمجھ لے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو موٹر کار کا عطیہ دو، تو عام انسان کے اندر انفاق کی نفسیات نہیں ابھرے گی۔ کیوں کہ وہ اس معنی میں انفاق کے حکم پر عمل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔

یہی حال سیاسی تفسیر کا ہے۔ یہ تفسیر آدمی کے اندر عمل کے بجائے انتظار اور توقف کی نفسیات پیدا کرتی ہے۔ اس کے مطابق، اصل عمل کا آخری آغاز اس وقت ہوگا جب کہ حکومت پر قبضہ ہو جائے۔ اس لئے وہ حکام سے ٹکراؤ کی نفسیات تو ابھارتی ہے مگر ذاتی عمل کی نفسیات نہیں ابھارتی۔ ھذا التفسیر یُنبت فی الانسان نفسیة محاسبة الحکام لا نفسیة محاسبة الذات۔

ہندستان اور پاکستان کے لوگ یہاں کافی تعداد میں ہیں۔ انھوں نے ۲ اکتوبر ۱۹۹۰ کو طرابلس کے ایک ہال میں سیرت النبی کا جلسہ کیا۔ اس موقع پر مجھے خطاب کی دعوت دی گئی۔ چنانچہ میں نے جلسہ سے خطاب کیا۔ اس جلسہ میں مسلمان اور ہندو دونوں ہی شریک ہوئے۔ سفیر ہند مسٹر گلیانی بھی موجود تھے۔

میں نے اپنی تقریر میں یہ بتانے کی کوشش کی کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام وقتی نہیں تھا۔ اس کا تعلق (relevance) عصر حاضر کے لئے بھی پوری طرح موجود ہے۔ عصر اور مغرب کے

درمیان تقریر ہوئی ۔ مغرب کی نماز کے بعد سوال وجواب کی نشست ہوئی ۔ یہ دوسری نشست صرف مسلمانوں پر مشتمل تھی ۔

زیادہ تر سوال ہندستان کے مسلمانوں کی حالت کے بارہ میں کیا گیا ۔ میں نے کہا کہ میرے نزدیک ہندستان کا معاملہ وہی ہے جو ساری دنیا کا معاملہ ہے ۔ خواہ ہندستان ہو یا لیبیا یا پاکستان یا سعودی عرب یا یورپ اور امریکہ ، ہر جگہ کامیاب زندگی گزارنے کا راز صرف ایک ہے ۔ اور وہ برداشت اور ٹالرنس ہے ۔ کسی بھی ملک میں اگر آپ کامیاب ہیں تو اس لئے کامیاب ہیں کہ وہاں آپ برداشت کرکے رہتے ہیں ۔ اور جہاں آپ بظاہر ناکام ہیں وہاں اسی لئے ناکام ہیں کہ وہاں آپ نے برداشت کو کھو دیا ہے ۔

۳ اکتوبر ۱۹۹۰ کو طرابلس سے پی آئی اے کی فلائٹ نمبر ۲۰۷ کے ذریعہ روانگی ہوئی ۔ حیرت انگیز طور پر اس کے اندر بہت کم مسافر تھے ۔ میں نے کھڑے ہو کر جہاز کے چاروں طرف دیکھا تو سیٹوں پر اتنے کم آدمی تھے کہ ایسا معلوم ہوا کہ گویا جہاز خالی حالت میں اڑ رہا ہے ۔ میں نے جہاز کے عملہ سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیٹیں بالقصد خالی رکھی گئی ہیں ۔ کویت اور عراق میں کام کرنے والے لاکھوں پاکستانی جو کویت پر حملہ کے بعد بھاگ کر اردن آ گئے تھے ، ان کو روزانہ عمان سے پاکستان لے جایا جا رہا ہے ۔ ان پناہ گزینوں کی خاطر یہ سیٹیں خالی رکھی گئی ہیں ۔ مزید یہ کہ عمان میں جہاز کا اترنا خصوصی معاملہ کے طور پر ہے ۔ کیوں کہ عام قاعدہ کے مطابق یہ جہاز عمان میں نہیں اترتا ۔

میں نے سوچا کہ ان پاکستانیوں کی وہ کیا خصوصیت ہے جس نے ان کے اندر یہ قیمت پیدا کر دی کہ ان کے لئے خالی جہاز بھیجے جائیں ۔ ذہن نے کہا کہ اس کی وجہ ان پاکستانیوں کی مظلومیت ہے ۔ کبھی دولت اور اقتدار سے آدمی کے اندر قیمت پیدا ہوتی ہے ۔ کبھی آدمی کا عاجز اور مظلوم ہونا اس کے اندر وہی قیمت پیدا کر دیتا ہے جو عام حالات میں قوت وطاقت کے ذریعہ کسی کے اندر پیدا ہوتی ہے ۔

یہ سوچ کر دل بھر آیا ۔ میں نے کہا کہ خدایا ، میرا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے ۔ میرے پاس طاقت والی چیزوں میں سے کوئی چیز موجود نہیں ۔ میرے پاس صرف عجز ہے ۔ تو میرے عجز کو قبول فرما ۔ ایک عاجز کے لئے وہ فیصلہ فرما دے جو عام حالات میں صرف طاقتور کا حق سمجھا جاتا ہے ۔

جہاز میں پاکستانی اخبارات (نوائے وقت، جنگ، جسارت، دی نیشن) پڑھ رہا تھا۔ اس دوران یہ آیت یاد آئی: یوم یکشف عن ساق ویدعون الی السجود فلا یستطیعون (القلم ۴۲)

میں نے کہا کہ اس آیت میں "سجدہ" کا لفظ علامتی طور پر آیا ہے۔ اصل میں یہ محرومی کا ایک وسیع تجربہ ہے جو آدمی کے اوپر قیامت میں گزرے گا۔ مالک کائنات اپنے تمام جلال و کمال کے ساتھ انسان کے سامنے ظاہر ہو جائے گا۔ اس وقت آدمی خدا کو دیکھنا چاہے گا مگر وہ اس کو نہ دیکھ سکے گا۔ کیوں کہ دنیا میں وہ خدا کو دیکھنے کے لئے اندھا بنا رہا۔ وہ خدا کی حمد کرنا چاہے گا مگر وہ اس کی حمد نہ کر سکے گا، کیوں کہ دنیا میں خدا کی حمد کرنے سے اس کی زبان گونگی ہو گئی۔ وہ خدا کی باتوں کو سننا چاہے گا مگر وہ اس کو نہ سن سکے گا، کیوں کہ دنیا میں خدا کی باتوں کو سننے کے لئے اس نے اپنے کان بند کر لئے تھے۔ وہ چاہے گا کہ اپنے رب کی عظمت کے اعتراف میں اس کے آگے جھک جائے مگر وہ اس کے آگے نہ جھک سکے گا، کیوں کہ دنیا میں وہ اس کے آگے جھکنے کے لئے تیار نہ ہو سکا۔

روزنامہ جنگ (۳ اکتوبر ۱۹۹۰) کے صفحہ اول پر وزیر اعظم پاکستان غلام مصطفی جتوئی کی ایک تقریر درج تھی۔ اس میں انھوں نے کہا کہ لوگوں کو کوئی چیز "احتساب سے نہیں بچا سکتی"۔ اور یہ کہ "۲۴ اکتوبر ان کے لئے یوم حساب ثابت ہو گا"۔ اسی خبر کا عنوان روزنامہ جسارت (۳ اکتوبر) میں یہ تھا: کوئی سازش بدعنوانوں کو احتساب سے نہیں بچا سکتی۔

میں نے سوچا کہ پاکستان کا ۲۴ اکتوبر (الکشن) وہ یوم حساب ہے جو انسان صرف اپنی محدود طاقتوں کے ذریعہ برپا کر سکتا ہے۔ ایسے یوم حساب سے بچ نکلنا بہت آسان ہے جیسا کہ سابق صدر جنرل ضیاء الحق کے احتساب کے باوجود پیپلز پارٹی دوبارہ زندہ رہی۔ مگر انسان پر ایک اور یوم حساب آنے والا ہے۔ اس سے کوئی شخص بھی بچ نہ سکے گا۔ حتی کہ صدر اور گورنر اور وزیر اعظم بھی نہیں۔

چوں کہ پاکستان میں الکشن قریب ہے، اس لئے ہر لیڈر بے تکان بول رہا ہے۔ تمام اخبارات لیڈروں کے بیانوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ہر ایک اپنے کو صحیح اور دوسرے کو غلط ثابت کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ آج ہر آدمی کے پاس الفاظ ہیں۔ ایک وقت آنے والا ہے جب کہ کسی کے پاس الفاظ نہیں ہوں گے۔ اس وقت صرف وہ شخص بول سکے گا جو دنیا میں خدا کے خوف سے چپ ہو گیا تھا۔ اس دن صرف اس شخص کو چلنے کی سعادت حاصل ہو گی جس کے قدم خدا کی عظمت کے احساس

سے موجودہ دنیا میں رک گئے تھے۔

جسارت کے صفحہ اول کی ایک خبر کی سرخی یہ تھی: نواز شریف نے ملکی سیاست کو لسانی اور گروہی سیاست کی نذر کر دیا ہے ـــــ جماعت اسلامی کی مجلس عاملہ کی قرار داد۔" نواز شریف صاحب اسلامی جمہوری اتحاد کے صدر ہیں، اور جماعت اسلامی اس اتحاد میں پوری طرح شامل ہے۔ اس کے باوجود ایک دوسرے کے خلاف اخبار میں اس قسم کے بیان چھپ رہے ہیں۔ اس خبر کو میں نے پڑھا تو میری زبان پر یہ الفاظ آگئے:
وہ اتحاد بھی کیسا عجیب اتحاد ہوگا جو ملک کو گروہی سیاست کے خانوں میں بانٹ دے۔

شام کو جہاز دمشق پہنچا۔ جہاز سے اتر کر کچھ وقت دمشق کے ہوائی اڈہ پر گزارا۔ مغرب کی نماز بھی جماعت کے ساتھ دمشق کے ہوائی اڈہ پر پڑھی۔

دمشق کا نام سب سے پہلے میں نے غالباً دس سال کی عمر میں سنا جب کہ مولانا فیض الرحمان اصلاحی (وفات ۱۸ فروری ۱۹۷۲) کے ذریعہ میں نے شیخ سعدی شیرازی (۱۲۹۲ - ۱۲۱۳ء) کی فارسی کتاب بوستاں پڑھی۔ یہ منظوم کتاب اخلاقی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اس کی ایک حکایت اس شعر سے شروع ہوتی ہے:

چناں قحط سالے شد اندر دمشق   کہ یاراں فراموش کردند عشق

اس نظم میں دمشق کے ایک قحط کا ذکر ہے جس میں عشق کرنے والے اپنا عشق بھول گئے تھے۔ شیخ سعدی نے قحط کی تصویر کشی کرتے ہوئے جو اشعار لکھے ہیں، ان میں سے ایک شعر یہ ہے:

نہ بر کوہ سبزہ نہ در باغ شخ   ملخ بوستاں خورد ومردم ملخ

(نہ پہاڑ پر ہریالی باقی رہی اور نہ درخت پر شاخ، ٹڈیاں باغ کو کھا گئیں اور لوگوں نے ٹڈیوں کو)

دمشق ایک ایسا شہر ہے جو اسلامی قافلہ کے سفر کے تیسرے مرحلہ کی یاد دلاتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، امیر معاویہؓ نے دمشق کو اسلامی سلطنت کا دار الخلافہ بنایا۔ یہاں سے اسلام کی تاریخ کا تیسرا دور شروع ہوا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز ۶۱۰ء میں ہوا۔ اس وقت مکہ اسلامی دعوت کا مرکز تھا۔ ۶۲۲ء میں ہجرت ہوئی اور مدینہ اسلام کا مرکز قرار پایا۔ بنو امیہ کے ہاتھ میں اقتدار آیا تو انھوں نے ۶۶۱ء میں دمشق کو اسلام کے مرکز کی حیثیت دے دی۔ ۷۵۰ء میں بنو عباس اسلامی اقتدار پر قابض

ہو گئے اور انھوں نے بعض سیاسی اسباب کے تحت بغداد کو اپنا دار الخلافہ بنانا پسند کیا جو ۱۲۵۸ء تک باقی رہا۔

اس کے بعد کئی نسبتاً چھوٹے اسلامی مراکز بنے۔ عبد الرحمٰن اموی ۷۵۶ء میں اسپین میں داخل ہوا اور یہاں اس شاندار عہد کا آغاز کیا جس کو "مسلم اسپین" کہا جاتا ہے۔ یہ دور ۱۴۹۲ء میں آخری طور پر ختم ہوا۔ اس درمیان میں مختلف چھوٹی بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ ان میں سے دو کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ایک، عثمانی خلافت جس کا مرکز استنبول تھا۔ یہ ۱۳۰۰ء کے بعد شروع ہوئی اور چھ صدیوں تک شان وشوکت کے ساتھ قائم رہی۔ ۱۹۲۴ء میں کمال اتاترک کے الغاء خلافت کے اعلان سے رسمی طور پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ دوسری، مغل سلطنت ہے جو بابر کے فتح دہلی ۱۵۲۶ء سے باقاعدہ طور پر قائم ہوئی اور ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر پر ختم ہو گئی۔

شام ایک عرب ملک ہے، جس طرح سعودی عرب اور کویت عرب ملک ہیں۔ مگر سعودی عرب اور کویت پٹرول کے خزانوں سے مالا مال ہیں، جب کہ شام کے پاس اس قسم کی کوئی قدرتی دولت نہیں۔ دوسری طرف حدیث کی پیشین گوئیوں کے مطابق، حضرت مسیح علیہ السلام کا نزول شام کے شہر دمشق میں ہو گا جو کہ بلاشبہ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے بعد سے قیامت تک پیش آنے والے تمام واقعات میں سب سے بڑا واقعہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی تقسیم کا معاملہ بڑا عجیب ہے۔ اس نے امریکہ کو بہترین جغرافیہ دیا اور بنگلہ دیش کو اس کے برعکس جغرافیہ۔ کسی کو معتدل موسم سے نوازا اور کسی کے حصہ میں سخت موسم لکھ دیا۔ بعض ملکوں کے نیچے دولت کے خزانے رکھ دئے مگر نزول مسیح جیسے غیر معمولی واقعہ کے ظہور کے لئے ایک ایسے علاقہ کو منتخب کیا جو مادی دولت میں دوسرے خوش نصیب ملکوں سے پیچھے تھا۔ موجودہ دنیا میں ہمارے لئے صرف یہی ممکن ہے کہ ہم اس "تقسیم" پر راضی ہو جائیں۔ اس ربانی تقسیم میں کیا کیا مصلحتیں چھپی ہوئی ہیں، ان کو جاننے کے لئے قیامت کا انتظار کرنا چاہئے۔

خلیج کے موجودہ بحران کے نتیجہ میں بالکل نئے قسم کے حالات سامنے آئے ہیں۔ مثلاً شام اسرائیل کا سخت دشمن تھا، کیوں کہ ۱۹۶۵ کی جنگ میں اسرائیل نے شام کا ایک علاقہ اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ چوں کہ امریکہ اسرائیل کا ساتھی ہے، اس لئے شام کو امریکہ سے بھی سخت دشمنی تھی۔ مگر کویت کی صورت حال

پیش آنے کے بعد اس نے امریکہ سے تعلق قائم کرلیا اور اپنی فوجیں سعودی عرب بھیج دیں جہاں وہ امریکہ کے ماتحت عمل کریں گی۔ مسٹر جی ایچ جانسین (G.H. Jansen) نے اس واپسی کو یوٹرن (U-turn) کا نام دیا ہے۔

دمشق کے ہوائی اڈہ پر ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ خلیج کے بحران پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کویت تو اس سے پہلے عراق کا ایک حصہ تھا۔ اور بصرہ کے ماتحت تھا۔ ایسی حالت میں اگر صدام حسین نے کویت پر قبضہ کرلیا ہے تو اس کے لئے یورپ اور امریکہ کی فوج بلانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو صاحب حق کو اس کا حق ملنے کے ہم معنی ہے۔

میں نے کہا کہ یہ بات صحیح نہیں کہ کویت اس سے پہلے عراق کا حصہ تھا۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ کویت عثمانی سلطنت کا ایک حصہ تھا جس طرح خود عراق عثمانی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ البتہ کویت چوں کہ بہت چھوٹا ملک تھا اور اس وقت اس کی آبادی بہت کم تھی، اس لئے عثمانیوں نے اس کو بصرہ کے گورنر کے ماتحت کر رکھا تھا۔

تاہم اس سے قطع نظر، بجائے خود یہ ایک غلط اصول ہے کہ اس قسم کے معاملات کا فیصلہ ماضی کی بنیاد پر کیا جائے۔ اگر یہ کوئی صحیح اصول ہو تو پھر فلسطین پر یہودیوں کے قبضہ کو بھی جائز قرار دینا چاہئے، کیوں کہ ایک زمانہ میں فلسطین بھی یہودی سلطنت کا حصہ تھا۔ مزید یہ کہ یہودیوں کو فلسطین کا علاقہ خود خدا کی طرف سے بطور انعام دیا گیا تھا۔ بین اقوامی دنیا میں اگر اس اصول کو چلایا جائے تو ساری دنیا کا جغرافیہ از سر نو بنانا پڑے گا۔ کیا صدام حسین کے حامی اپنے نظریہ کے اس وسیع انطباق کے لئے تیار ہیں۔

عام حالات میں یہ جہاز دمشق سے سیدھا کراچی جاتا ہے۔ مگر آج وہ کویت سے آئے ہوئے لوگوں کو لینے کے لئے عمان ایئرپورٹ پر اترا۔ یہاں ڈیڑھ گھنٹہ ٹھہرا رہا۔ تمام سیٹیں بھر گئیں۔ آنے والے لوگ جب جہاز کے اندر داخل ہوئے تو میں ان کے چہروں کو غور سے دیکھتا رہا۔ ان کے چہرہ پر خوشی کے آثار تھے۔ کیوں کہ انھیں یقین تھا کہ اب وہ بحرانی دور سے باہر آچکے ہیں اور چند گھنٹے کے بعد وہ اپنے وطن میں پہنچ جائیں گے۔

آدمی پر مشکلیں پیش آتی ہیں۔ جب وہ مشکلوں کے اندر گھرا ہوا ہو تو وہ سخت مایوسی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مگر جب حالات بدلتے ہیں تو اچانک وہ اطمینان کی کیفیت محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔ وہ ماضی کو بہت جلد بھول جاتا ہے۔ اگر یہ بھولنے کا مادہ آدمی کے اندر نہ ہو تو اس کے لئے زندگی گزارنا سخت مشکل ہو جائے۔

۴ اکتوبر کو صبح ساڑھے چار بجے کراچی پہنچا۔ یہاں ٹرانزٹ پسینجر کے طور پر دو دن قیام رہا۔ میرا قیام جناب طارق رحمن صاحب (گلشن اقبال) کے یہاں تھا۔

پاکستان کے سفر کا پروگرام ابتداءً ۱۹ فروری کے لئے طے ہوا تھا۔ اس کے مطابق انڈین ایئر لائنز سے ریزرویشن بھی کرایا جا چکا تھا۔ مگر ۱۴ فروری کو کراچی سے ٹیلیفون پر اطلاع ملی کہ کراچی میں حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ فساد اور کرفیو کی وجہ سے اجتماع کا پروگرام چلانا ممکن نہ ہوگا۔ چنانچہ ۱۹ فروری کو سفر کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا۔

اس قسم کا التوا اس سے پہلے کشمیر کے سلسلہ میں بھی پیش آیا تھا۔ کشمیر (سرینگر) کا ایک پروگرام ۲۰ اگست ۱۹۸۹ کے لئے طے ہوا تھا۔ اس کا اعلان ہو چکا تھا اور اس کا رزرویشن بھی کرایا جا چکا تھا۔ مگر آخر وقت میں ٹیلیفون پر اطلاع ملی کہ کشمیر میں حالات بگڑ گئے ہیں اور اجتماع کا انتظام ممکن نہیں ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمان توڑ پھوڑ کی جو سیاست جگہ جگہ چلا رہے ہیں۔ اس سے انھوں نے پایا تو کچھ نہیں، البتہ یہ نقصان ہوا کہ ناقابل تلافی حد تک دعوتی اور تعمیری کام کے مواقع ختم ہو گئے۔

پاکستان کے مذکورہ پروگرام کی وجہ سے مجھے دوسرے کئی پروگرام چھوڑنے پڑے تھے۔ ۲۲ فروری ۱۹۹۰ کو لکھنؤ میں سیرت کا جلسہ تھا۔ اس کا ٹکٹ آ چکا تھا۔ مگر مجھے معذرت کرنی پڑی کہ میں ۲۲ فروری کو وہاں کا سفر نہ کر سکوں گا۔ وغیرہ

کراچی کا مذکورہ پروگرام فاران کلب نے بنایا تھا۔ ۱۹ فروری سے ۲۶ فروری تک کا پورا پروگرام طے ہو چکا تھا۔ مگر آغاز سفر سے چند دن پہلے کراچی کے ٹیلیفون پر سفر کو منسوخ کرنا پڑا۔

اس طرح پاکستان کے سفر کا باقاعدہ پروگرام بار بار ملتوی ہوتا رہا۔ آخر میں میں نے طے کیا کہ موجودہ سفر کے تحت ٹرانزٹ کے طور پر ایک دو دن کے لئے کراچی میں قیام کروں۔ چنانچہ دہلی میں پاکستانی سفارت خانہ سے ویزا حاصل کر لیا گیا تاکہ واپسی کے موقع پر کراچی میں قیام کیا جا سکے۔

باہر کے سفروں میں پہلا مرحلہ ویزا کا ہوتا ہے۔ نئی دہلی کے پاکستانی سفارت خانہ سے ویزا بن کر آیا تو اس پر لکھا ہوا تھا پولیس رپورٹنگ سے مستثنیٰ (Exempted from police reporting) ویزا کی فیس بھی انھوں نے ازراہ عنایت لوٹا دی تھی اور "فری" ویزا جاری کر دیا تھا۔

یہ واقعہ دیکھ کر دل نے کہا کہ کاش یہی معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قیامت کے دن بھی کیا جائے۔

آخرت میں مجھ سے کہہ دیا جائے کہ عمل کی قیمت دینے سے تم کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ نیز تم کو اس سے بھی مستثنیٰ کر دیا گیا ہے کہ تم کو فرشتوں کی جانچ کے مرحلہ سے گزرنا پڑے۔ اور اللہ کے لئے یقیناً ایسا کرنا کچھ مشکل نہیں۔

۴ اکتوبر کو ظہر کی نماز گلشن اقبال (بلاک نمبر ۷) کی جامع مسجد میں پڑھی۔ پوری مسجد ایک بڑے ہال کی صورت میں ہے۔ اس کے اندر اور باہر بالکل فطرت کا ماحول ہے۔ نماز پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ میں ایک روحانی مرکز میں ایک روحانی عمل ادا کر رہا ہوں۔

جب میں مسجد کے اندر بیٹھا ہوا تھا، مجھے خیال آیا کہ اگر مسلمان ان تمام جھگڑوں کو ختم کر دیں جن کو وہ اسلام کے نام پر غیر ضروری طور پر جاری کئے ہوئے ہیں، اور اسلام کی نمائندگی کے لئے صرف اس قسم کی مسجدیں دنیا میں باقی رہیں تو دنیا کی آدھی آبادی صرف ان مسجدوں کو دیکھ کر اسلام قبول کر لے۔ دوسرے مذاہب کے عبادت خانوں کے مقابلہ میں مسجد کا ماحول نہایت فطری اور سادہ ہوتا ہے۔ مگر مسلمانوں کی بے فائدہ سیاسی اور مادی اور قومی ہنگامہ آرائیوں نے اسلام کے اس فطری حسن پر پردہ ڈال دیا ہے۔ اگر مسلمان صرف اتنی قربانی کریں کہ وہ کچھ نہ کریں تو اسلام اپنے آپ دنیا کو اپنی طرف کھینچے گا اور لوگ جوق در جوق دین فطرت کے دائرہ میں داخل ہو جائیں گے۔

ایک پاکستانی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اس سال ہائی اسکول پاس کیا ہے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ میں نے سنا ہے کہ پاکستان میں ہندو لڑکے تعلیم کے میدان میں مسلمان لڑکوں سے آگے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں، یہ بات صحیح ہے۔ میں نے پوچھا کہ اس کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرے ایک استاد نے ایک مرتبہ یہی بات ہم لوگوں سے کہی۔ انھوں نے اس کا راز یہ بتایا کہ ہندو لڑکوں میں مل کر پڑھنے (combined study) کا رواج ہے۔ مل کر پڑھنے سے ہر ایک کو دوسرے کی معلومات کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، ایک طالب علم ذاتی طور پر پڑھے تو اس کو ایک درجہ فائدہ ملے گا۔ مگر جب کئی طالب مل کر مطالعہ کریں تو ہر ایک کو کئی گنا زیادہ فائدہ ملنے لگتا ہے۔

کراچی کے روزنامہ جنگ (۳ اکتوبر) میں "جنگ الکشن سیل" کی طرف سے ایک تجزیہ چھپا تھا۔ اس میں ۱۹۸۸ میں ہونے والے الکشن کی ان ۴۳ نشستوں کا ذکر تھا جو اسلامی جمہوری اتحاد اور دوسری جماعتوں اور آزاد امیدواروں کی باہمی چپقلش کی وجہ سے پیپلز پارٹی کو مل گئیں۔ ان جماعتوں میں ووٹ بٹ جانے کے باعث پیپلز پارٹی جیت گئی۔

مضمون میں بتایا گیا تھا کہ یہ پوری سچائی نہیں۔ مضمون نگار نے نام بنام تفصیل کے ساتھ بتایا تھا کہ یہی واقعہ خود پیپلز پارٹی کے ساتھ بھی پیش آیا۔ اس کے اپنے دائرہ میں بھی کئی جگہ امیدواروں کی کثرت کی بنا پر اس کے ووٹ بٹ گئے اور وہ اسلامی جمہوری اتحاد کے مقابلہ میں ہار گئی۔ مضمون نگار نے لکھا تھا کہ اس نے باقاعدہ تفصیلات جمع کیں تو حیرت انگیز طور پر ان نشستوں کی تعداد بھی ۳۴ ہی تھی جو پیپلز پارٹی نے ووٹوں کی تقسیم کی بنا پر کھو دیں۔ یعنی اپنے ووٹوں کی تقسیم کی بنا پر اسلامی جمہوری اتحاد نے بھی ۳۴ نشستیں کھوئیں۔ اور اسی طرح پیپلز پارٹی نے بھی ووٹوں کی تقسیم کی بنا پر ۳۴ نشستیں کھو دیں۔

اختلافی معاملات میں لوگ اکثر ایسا کرتے ہیں کہ وہ اپنے موافق آدھی بات کا ذکر کرتے ہیں اور اپنے مخالف آدھی بات کا ذکر نہیں کرتے۔ یہ طریقہ نہ عقل کے مطابق ہے اور نہ اسلام کے مطابق۔ جو لوگ اس طرح کی باتیں کریں وہ ہمیشہ حقیقت کی دریافت میں ناکام رہتے ہیں۔

۵ اکتوبر کی صبح کو گلشن اقبال میں ایک نشست ہوئی۔ اس میں کراچی کے کچھ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ ابتداءً میں نے دعوت اسلامی کے جدید امکانات پر گفتگو کی۔ نیز بتایا کہ ان دعوتی امکانات کو استعمال کرنے کے لئے "صبر" کی صفت درکار ہے۔ یعنی ناخوشگوار باتوں کو برداشت کرتے ہوئے اپنی ساری توجہ دعوت کے عمل پر لگانا۔ گفتگو کے آخر میں سوال وجواب ہوا۔ یہ نشست تقریباً ۳ گھنٹہ جاری رہی۔

مہاجر تحریک کے قائد الطاف حسین صاحب یہاں کی مشہور شخصیت ہیں۔ ان سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔ میں نے سنا تھا کہ ان کے جلسہ میں لوگ لاکھوں کی تعداد میں آتے ہیں۔ اس لئے میں ان کو سننا چاہتا تھا۔ چنانچہ وی سی آر پر ان کا ایک پروگرام دیکھا۔ وہ نومبر ۱۹۸۹ میں لاہور گئے تھے۔ یہ ویڈیو کیسٹ اسی سفر سے تعلق رکھتا تھا۔

الطاف حسین صاحب نہایت پرجوش انداز میں بولتے ہیں۔ وہ جب بولتے ہیں تو زبان کے ساتھ ان کا پورا جسم بھی مسلسل حرکت میں رہتا ہے "مہاجر پاکستان میں مہاجر بن کر رہنے کے لئے نہیں آیا تھا بلکہ پاکستانی بن کر رہنے آیا تھا۔ مگر جب ہم نوکری کے لئے گئے تو ہم سے پوچھا گیا کہ تمہارا باپ کہاں پیدا ہوا تھا، تمہارا دادا کہاں پیدا ہوا تھا، اس امتیاز نے ہم کو مہاجر بنا دیا۔" "ہم اپنے وطن میں بے وطنی کا طعنہ سنتے ہیں۔ ہم اپنا حق مانگتے ہیں تو ہم کو کلاشنکوفوں سے بھون دیا جاتا ہے۔" "ہمارے خلاف بالقصد فسادات

کرائے جاتے ہیں تاکہ مہاجر اور غیر مہاجر کے درمیان جھگڑا ہو۔ یہ فسادات ایک منظم سازش کے تحت ہو رہے ہیں"۔ مہاجرین کی بستی علی گڑھ پر حملہ کیا گیا اور چھ گھنٹہ تک ہم گولیوں سے بھونے جاتے رہے۔ مگر کوئی ہمارے لئے بولنے والا نہیں۔ اس چیز نے مہاجر تحریک پیدا کی"۔

الطاف حسین صاحب کی تقریر کے یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ وہ کیا چیز ہے جس نے انھیں لیڈر بنایا ہے۔ یہ دراصل مہاجرین کا احساس مظلومی ہے۔ وہ مظلوم مہاجرین کے احساسات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہی چیز ہے جس نے ان کو مہاجرین کا لیڈر بنا دیا ہے۔

ٹھیک یہی صورت حال ہندستان میں بھی ہے۔ جو شخص مسلمانوں کے احساس مظلومی کی ترجمانی کرتا ہے وہ ان کے درمیان فوراً مقبول ہو جاتا ہے۔ مگر سچا لیڈر وہ ہے جو لوگوں کے احساس یافت کو جگا کر ان کا قائد بنے۔

سفر کے دوران میں نے ایک پائلٹ سے پوچھا کہ ہوائی جہاز کیسے اڑتا ہے۔ اس نے کہا کہ ہوائی جہاز کو ہم نہیں اڑاتے۔ یہ دراصل نیچر کا قانون ہے جو ہوائی جہاز کو اڑاتا ہے۔ اس نے بتایا کہ ہوائی جہاز کی مخصوص وضع، اس کا پنکھا، انجن کے ذریعہ تیزی سے پیچھے کی طرف ہوا نکالنا، اور رن وے پر اس کو تیزی سے دوڑانا، اس قسم کی کچھ چیزیں جب آپ ایک مشین میں جمع کریں تو وہ اپنے آپ اوپر اٹھنے لگتی ہے۔ یہ نیچر کا قانون ہے، اور اسی قانون کو استعمال کر کے ہم ہوائی جہاز کو اڑاتے ہیں۔

امکانات فطرت کو استعمال کرنے ہی کا دوسرا نام ٹکنولوجی ہے۔ پانی کو سو ڈگری تک حرارت پہنچائیں تو اس کے مالے کیول ٹوٹنے لگتے ہیں جس کا دوسرا نام ابلنا ہے۔ مقناطیسی فیلڈ اور موشن کو یکجا کریں تو الیکٹران دوڑنے لگتے ہیں جس سے بجلی تیار ہوتی ہے۔ اسی طرح مقناطیسی فیلڈ اور کرنٹ کو یکجا کریں تو موشن پیدا ہو جاتا ہے جس سے تمام مشینیں چلتی ہیں۔ اسی طرح کچھ خاص چیزوں کو یکجا کریں تو مشین اوپر اٹھنے لگتی ہے جس سے ہوابازی کی صنعت وجود میں آئی ہے۔

اس دنیا میں امکاناتِ فطرت کو استعمال کرنے ہی کا نام کامیابی ہے۔ اسی سے تمام ٹکنولوجی ظہور میں آئی ہے۔ اسی طرح انسانی دنیا میں بھی کوئی حقیقی کامیابی اس وقت ملتی ہے جب کہ زندگی کے امکانات کو سمجھا جائے اور اس کو حکمت کے ساتھ استعمال کیا جائے۔

ایک صاحب نے بتایا کہ پاکستان کے تعلیمی اداروں میں تعلیم کا ماحول تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ طلبہ

تعلیم سے زیادہ سیاست میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ پاکستان میں یہ برائی سب سے پہلے جماعت اسلامی نے سید ابوالاعلیٰ مودودی کے زمانہ میں شروع کی۔ انھوں نے طلبہ کو منظم کرکے انھیں اپنی سیاست کے لئے استعمال کیا۔ جب دوسری جماعتوں نے دیکھا کہ جماعت اسلامی طلبہ کو سیاسی طاقت کے طور پر استعمال کررہی ہے تو وہ بھی یہی کرنے لگے۔ کسی قوم کے نوجوانوں کو تعلیم سے ہٹا کر سیاست میں لگانا بلاشبہ اس قوم کے ساتھ دشمنی ہے، اور دشمنی کی یہ قسم ہندستان اور پاکستان دونوں جگہ یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔

ایک صاحب جو یہاں کی اصطلاح میں "مہاجر" ہیں، انھوں نے کہا کہ ہم نے زبردست تحریک چلاکر پاکستان بنوایا۔ ہم سمجھتے تھے کہ پاکستان بنتے ہی برصغیر کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ مگر پاکستان کو بنے ہوئے آدھی صدی بیت گئی اور مسائل کا حل ہونا تو درکنار، ان میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہوگیا۔

میں نے کہا کہ یہ سادہ سی بات نہیں بلکہ بہت گمبھیر بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ برصغیر ہند کے ہندو مسلمانوں کے لئے مدعو کے درجہ میں تھے۔ مسلمانوں کو انھیں دین حق کا پیغام دینا تھا۔ مگر مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے برعکس انھوں نے ہندوؤں کو اپنا حریف اور رقیب سمجھ کر ان سے ٹکراؤ شروع کردیا۔ انھوں نے علیٰحدگی اور تقسیم کا نعرہ لگایا۔ آخر کار منافرت اور مہاجرت کی وہ صورت سامنے آئی جس کا نام پاکستان ہے۔

اس طرح کا عمل اللہ تعالیٰ کی اسکیم کے سراسر خلاف ہے۔ اللہ کی مرضی یہ ہے کہ مدعو قوموں کو دعوت دی جائے اور یک طرفہ صبر کے ذریعہ اس کو اتمام حجت کے مرحلہ تک پہنچایا جائے۔ اتمام حجت سے پہلے اگر منافرت اور مہاجرت کا طریقہ اختیار کیا جائے تو وہ اللہ کے نزدیک سراسر غلط ہوگا۔

پاکستانی مسلمانوں کو میرا مشورہ ہے کہ ہندستان کے معاملہ میں وہ اپنے عداوتی ذہن کو بدلیں۔ ہندستان کی طرف سے اگر کوئی زیادتی کی بات ہوتی ہے تو اس کو نظرانداز کرتے ہوئے یک طرفہ طور پر اس کے خیرخواہ بنیں۔ پاکستان کے مسلمان اگر ایسا کرسکیں تو یہاں سے وہ اپنی ایک نئی تاریخ کا آغاز کرسکتے ہیں۔

۶ اکتوبر ۱۹۹۰ کی صبح کو میں دوبارہ دہلی واپس پہنچا۔

ایک سفر

۶ اکتوبر ۱۹۹۱ کی شام کو مجھے ایک لمبے سفر پر روانہ ہونا تھا۔ دہلی سے چل کر ردم اور مالٹا اور قاہرہ پہنچنا تھا اور وہاں سے پھر دہلی واپس آنا تھا۔ آج کا اخبار آیا تو اس کے پہلے صفحہ کی اس خبر پر نظر اٹک گئی کہ ـــــــ ہوائی حادثہ میں ۱۳۲ آدمی ہلاک ہوگئے۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ انڈونیسی ایرفورس کے ایک جہاز میں اڑان بھرنے کے صرف تھوڑی دیر بعد دھاکہ ہوا۔ وہ جکارتا کی ایک بلڈنگ پر گر پڑا۔ اس کے تمام ۱۳۲ مسافر جل کر مر گئے:

> An Indonesian air force plane crashed and exploded shortly after take-off today, killing all 132 people on board.

ایک تاجر کے بارہ میں ایک بار میں نے پڑھا کہ وہ کسی سفر پر جانے والا تھا۔ عین اسی دن ایک ہوائی حادثہ کی خبر ملی۔ اس نے اپنا سفر منسوخ کر دیا۔ لیکن اگلے روز عین اس وقت اس کے دل کی حرکت بند ہوگئی جب کہ وہ اپنے محفوظ مکان میں کھانے کی میز پر بیٹھا ہوا صبح کی چائے پی رہا تھا۔

اگر ہم انسانی جہاز میں سفر نہ کریں تب بھی ہم ایک خدائی جہاز کے مسافر ہوتے ہیں۔ یہ ہمارا جسم ہے جس میں بیٹھ کر ہماری شخصیت زندگی کا سفر طے کر رہی ہے۔ جس لمحہ خدا کا حکم ہوگا جسم کی یہ سواری ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور اس کے بعد ہماری شخصیت (روحانی وجود) اس سے نکل کر خدا کی عدالت میں حاضر کر دیا جائے گا۔ آدمی کو اگر اس حقیقت کا احساس ہو تو اس کو اپنے پرسکون مکان میں بیٹھنا بھی اسی طرح پرخطر دکھائی دینے لگے جس طرح کسی سمندری یا ہوائی سواری میں سفر کرنا۔

۶ اکتوبر ۱۹۹۱ کی شام کو عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر دہلی ایرپورٹ کے لئے روانہ ہوا۔ میرے ساتھ ثانی اثنین بھی تھے۔ ہماری گاڑی مانوس راستوں سے گزرتی ہوئی پرسکون طور پر آگے بڑھ رہی تھی۔ اور میرے ذہن میں خیالات کا طوفان برپا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے مجھے محسوس ہوا کہ میرا دماغ ایک قسم کی کنورٹنگ مشین ہے جس میں دنیا کا ہر غم آخرت کے غم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ میرا یہ مزاج اتنا بڑھا ہوا ہے کہ میرا دماغ خوشی کے واقعہ کو بھی غم میں بدل لیتا ہے، تاکہ دوبارہ اس کو غم آخرت میں ڈھال سکے۔ دنیا میرے لئے ایک تجربۂ غم تھی۔ کاش اللہ اپنی رحمت سے آخرت کو میرے لئے تجربۂ مسرت

بنا دے۔

ایر پورٹ کے اندر داخل ہوا تو وہاں کی دنیا حسب معمول نظر آئی۔ یہاں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں کوئی مقیم نہ تھا۔ یہاں کا ہر شخص مسافر تھا۔ میں نے لوگوں کے چہروں کو پڑھنے کی کوشش کی۔ کچھ لوگوں کی بات چیت کو سنا۔ میرے دل نے کہا کہ ان لوگوں کو سفر حیات کی خبر ہے۔ مگر انھیں سفر موت کی کوئی خبر نہیں۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو اپنے آغاز کو جانیں مگر وہ اپنے انجام کے بارہ میں بالکل بے خبر بنے ہوئے ہوں۔

دہلی سے الیتالیا کی فلائٹ ۷۸۷ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ سروس ہر اعتبار سے اچھی تھی۔ جہاز کے اندر الیتالیا کا میگزین ULISSE پڑھا۔ ایک مضمون میں یہ مقولہ نقل کیا گیا تھا کہ —— ایک سفر کا خاتمہ دوسرے سفر کا آغاز ہے:

The end of one journey is the start of another.

میگزین میں یہ مقولہ الیتالیا کے کمرشیل ہوائی جہازوں پر چسپاں کیا گیا تھا جو ہر سفر کے خاتمہ پر دوسرے سفر کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں۔ مگر یہ مقولہ زیادہ بہتر طور پر انسانی زندگی کے اوپر چسپاں ہوتا ہے۔ جب آدمی کی موت آتی ہے اور اس کی ایک زندگی بظاہر ختم ہوجاتی ہے تو یہ خاتمہ سادہ معنوں میں صرف خاتمہ نہیں ہوتا بلکہ ایک وسیع تر دورِ حیات کا آغاز ہوتا ہے۔

یہ جہاز بوئنگ ۷۴۷ تھا۔ اس کے اندر ۱۹۲ سیٹیں تھیں۔ جہاز کا سفر موجودہ زمانہ میں ایک عام ذریعہ سفر بن چکا ہے۔ مگر میں جب بھی ہوائی جہاز میں سفر کرتا ہوں تو میرے اندر سخت استعجاب کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کیسی عجیب رحمت ہے کہ اس نے موجودہ دنیا میں ایسے امکانات رکھے جو ہوائی جہاز کی صورت میں ڈھل جائیں اور انسان کے سفر کو حیرت ناک حد تک تیز رفتار بنا دیں۔

خدا نے ایسا نہیں کیا کہ وہ بنے بنائے ہوائی جہاز انسان کو دیدے۔ بلکہ اس نے زمین میں ہوائی جہاز کے "امکانات" رکھے اور یہ انسان کے اوپر چھوڑ دیا کہ سیکڑوں سال کی تحقیق اور جستجو کے بعد وہ ایک واقعی جہاز بنا سکے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی ایک سنت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کو انسان کے لئے اکتشافی طریقہ

(discovery method) پسند ہے۔ یہی طریقہ اس نے دین میں بھی رکھا ہے۔ دین اپنی حقیقت کے اعتبار سے اتنا واضح ہے کہ اس کی رات بھی دن کی طرح روشن ہے (لیلھا کنھارھا) مگر اللہ نے دین پر التباس (الانعام ۹) کا پردہ ڈال دیا ہے۔ یہ ایک تدبیر ہے جس کا مقصد انسان کے ذہن کو متحرک کرنا ہے۔ یہ اس لئے ہے تاکہ آدمی اپنی فکری قوتوں کو عمل میں لاکر اس پردہ کو پھاڑے اور دین کو ذاتی معرفت کی سطح پر دریافت کرے۔

پچھلی رات میں دہلی میں سو نہیں سکا تھا۔ جہاز میں داخل ہوا تو نیند اور تکان کا سخت غلبہ تھا۔ چنانچہ جلد ہی نیند آگئی۔ میں لیٹ گیا اور گہری نیند سوتا رہا۔ دہلی سے روم کی پرواز مسلسل ۹ گھنٹے کی ہے مگر اس کا بڑا حصہ سونے میں گزر گیا۔ اور ایک تھکا دینے والا سفر بآسانی طے ہو گیا۔

جسم اسی طرح خود کار نظام کے تحت کھوئے ہوئے کی تلافی کرتا ہے۔ تلافی (compensation) فطرت کا ایک مستقل اصول ہے۔ مثلاً کسی آدمی کے جسم سے اس کا ایک گردہ نکال دیا جائے تو دوسرا گردہ اپنے آپ بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اتنا بڑا ہو جاتا ہے کہ تنہا پورے جسم کی ضرورت کو پوری کر سکے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا کا پسندیدہ طریقہ کیا ہے۔ وہ تلافی مافات کا طریقہ ہے۔ اس کے مطابق اگر کوئی قوم دوسری قوموں سے پچھڑ جائے تو اس کے لئے فطری طریقہ یہ ہوگا کہ وہ سب سے پہلے اپنی کمی کی تلافی کرے۔ کمی کی تلافی کے بغیر اقدام کرنا فطرت کے مقررہ طریقہ کے خلاف ہے۔ اور جو لوگ فطرت کے طریقہ کے خلاف عمل کریں ان کا ناکام ہو جانا یقینی ہے۔

۹ گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد جہاز ۲ اکتوبر کی صبح کو روم میں اتر گیا۔ لینڈنگ نہایت ہموار تھی۔ جس کانفرنس میں مجھے شرکت کرنا ہے وہ اگرچہ اٹلی میں ہے مگر اس کے نمائندہ ڈاکٹر پالومبی (Dr Leonardo Polombi) دو آدمیوں کے ساتھ روم ایر پورٹ پر ہماری رہنمائی کے لئے موجود تھے۔ یہ کانفرنس ویٹیکن کے ماتحت ایک اطالوی ادارہ (CXomunity of S. Egidio) کی طرف سے کی جارہی ہے۔

ہمارے اخبارات و رسائل میں ویٹیکن اور دوسرے مسیحی اداروں کے بارہ میں صرف یہ چھپتا ہے کہ وہ اسلام کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ مگر طریق کار کے اعتبار سے ان کے یہاں جو اعلیٰ نمونہ ہے

اس سے مسلمانوں کو باخبر نہیں کیا جاتا۔ یہ لوگ جس غیر معمولی نظم اور باقاعدگی اور منصوبہ بندی کے ساتھ اپنا کام کرتے ہیں اس سے اب تک کوئی سبق نہیں لیا گیا۔ حالاں کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دشمن کے اندر بھی اگر کوئی ہنر ہے تو اس کو اس سے سیکھنے کی کوشش کرو۔

۶ اکتوبر ۱۹۹۱ کو فجر کی نماز میں نے نظام الدین (دہلی) کی قریش مسجد میں پڑھی تھی۔ ۷ اکتوبر کو فجر کی نماز روم ایرپورٹ کے وی آئی پی لاونج میں پڑھی۔ مسجد کے مقدس ماحول میں نماز پڑھنے کے بے شمار فائدے ہیں۔ مگر ایک غیر مسجد میں یا ایک نئے مقام پر نماز پڑھنا ایک ایسا انوکھا تجربہ ہے۔ جس کو لفظوں میں بیان کرنا بے حد مشکل ہے۔ یہ وہ خصوصی لمحہ ہے جب کہ بندہ اس احساس سے دوچار ہوتا ہے کہ میں ایک ایسے مقام پر جھک کر سجدۂ اعتراف کر رہا ہوں جہاں مجھ سے پہلے شاید کسی انسان نے سجدۂ اعتراف پیش نہیں کیا۔ یہ ایک ایسا احساس عبدیت ہے جس کا تجربہ عام حالات میں نہیں کیا جاسکتا۔

ہماری پہلی منزل روم تھی۔ روم میں اگلا جہاز کافی دیر کے بعد تھا۔ اس طرح ہم کو یہاں چھ گھنٹے سے زیادہ مل رہے تھے۔ ایرپورٹ پر کانفرنس کے جو منتظمین ہم سے ملنے کے لئے آئے تھے، ان سے ہم نے کہا کہ روم میں ہم خاص طور پر دو چیزیں دیکھنا چاہتے ہیں، ایک ویٹیکن اور دوسرے یہاں کا اسلامی مرکز اور مسجد۔ وہ بخوشی اس پر راضی ہو گئے۔ ہمارے پاس اٹلی کا ویزا نہیں تھا۔ عام حالات میں اب ویزا حاصل کرنا ہمارے لئے تقریباً ناممکن تھا۔ مگر انھوں نے فوراً کارروائی کرکے ہمارا ویزا حاصل کیا۔ اس کے بعد وہ ہم کو لیکر شہر کی طرف نکلے۔ ویٹیکن سے تعلق رکھنے والوں کو یہاں خصوصی اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔

روم کے مختلف علاقوں سے گزارتے ہوئے وہ ہم کو ویٹیکن میں لے گئے۔ اس طرح ہم نے روم کو بھی کم از کم ایک حد تک دیکھ لیا۔ ویٹیکن کو اندر اور باہر سے پوری طرح دیکھا۔ یہ ایک مربع کلو میٹر سے بھی کم رقبہ میں واقع ہے۔ پوپ کی رہائش گاہ بھی یہیں ہے۔ سینٹ پیٹر (پطرس) کا مقبرہ اس کا سب سے زیادہ مقدس حصہ ہے۔ ایک جگہ میں نے دیکھا کہ سینٹ پیٹر کا بڑا مجسمہ ہے۔ لوگ اس کے پاؤں کو احترام کے ساتھ چھوتے ہیں اور اس کو چوم رہے ہیں۔

ویٹیکن ساری دنیا کے مسیحیوں کا مذہبی مرکز ہے۔ وہ ہر طرف مجسموں سے بھرا ہوا ہے۔ مسیح اور مریم اور فرشتوں کے مجسموں سے لے کر بعد کے مسیحی اکابر اور مختلف زمانوں کے پوپ کے مجسمے

جگہ جگہ لگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سنگ مرمر کا ایک مجسمہ مائیکل انجلو کا بنایا ہوا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں مریم کو بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے۔ اور ان کے دونوں پیروں پر ایک دبلا اور مردہ جسم بیچارگی کی حالت میں پڑا ہوا ہے۔ یہ ان کے عقیدہ کے مطابق حضرت مسیح کا مردہ جسم ہے جس کو صلیب دئے جانے کے بعد حضرت مریم نے اٹھالیا تھا۔ مزعومہ خدا کی یہ بے کس تصویر بھی کیسی عجیب ہے۔

ویٹیکن کو دیکھ کر یہ تاثر ذہن میں نہیں آتا کہ مذہب کسی خدا پر مبنی نظریہ کا نام ہے۔ اس کے برعکس اس کو دیکھنے سے یہ تاثر ذہن میں آتا ہے کہ مذہب ایک ایسا نظریہ یا عقیدہ ہے جو انسانی شخصیتوں کے تقدس پر قائم ہے۔

ویٹیکن (Vatican) روم کی ایک پہاڑی کا نام ہے۔ یہاں سینٹ پیٹر (پطرس) کی قبر ہے۔ اور پوپ کی قیام گاہ ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کیتھولک عیسائیوں کی کئی مقدس اور متبرک چیزیں یہاں کے میوزیم میں رکھی ہوئی ہیں۔

ویٹیکن کا رقبہ صرف ۱۰۸ مربع ایکڑ ہے۔ اس کے باشندوں کی مجموعی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے۔ مگر اس چھوٹی سی دنیا میں ایک مکمل ریاست قائم ہے۔ یہ مذہبی ریاست قانونی طور پر ۱۹۲۹ میں مسولینی کے زمانہ میں قائم ہوئی۔ جس معاہدہ کے تحت اس کا قیام عمل میں آیا اس کو معاہدۂ لیٹران (Lateran Treaty) کہا جاتا ہے۔ اس معاہدہ کے تحت پوپ یا ویٹیکن حکومت کو اندرونی طور پر مکمل آزادی حاصل ہے۔ یہ گویا ریاست کے اندر ایک ریاست ہے تاہم وہ اس کی پابند ہے کہ وہ اٹلی کی حکومت کے معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔

۱۹۲۹ کے معاہدہ کو دیکھئے تو بظاہر محسوس ہوگا کہ ویٹیکن اپنے آپ کو بہت چھوٹی حیثیت پر راضی کر رہا ہے۔ ویٹیکن کا رقبہ ایک مربع کلومیٹر سے بھی کم ہے۔ جب کہ اٹلی کا رقبہ 301,262 مربع کیلومیٹر ہے۔ گویا جغرافی معنوں میں ویٹیکن کو اٹلی کا ایک فیصد سے بھی کم رقبہ حاصل ہے۔

مگر حقائق کبھی الفاظ کے پابند نہیں ہوتے۔ چنانچہ ویٹیکن نے ایک اور پہلو سے اپنی کمی کی تلافی کرلی۔ اٹلی کی ۹۹ فیصد آبادی عیسائی ہے۔ اس اعتبار سے اٹلی کے تمام باشندوں نیز تمام دنیا کے عیسائیوں کے دلوں تک اس کا رقبہ پھیلا ہوا ہے۔ حتی کہ کہا جاتا ہے کہ اپنے انتہائی چھوٹے رقبہ کے باوجود ویٹیکن کو عملاً اٹلی سے بھی زیادہ بڑی حیثیت حاصل ہے۔ کیوں کہ وہ (ویٹیکن) مسیحی مذہب کی سب سے بڑی

شاخ، کیتھولک چرچ، کا صدر مقام ہے:

Despite its minuscule size, however, Vatican City has been said to possess an influence greater than that of Italy itself, for it is the site of the headquarters of the largest branch of the Christian religion, the Roman Catholic Church. (19/36)

ویٹیکن کی سرکاری زبان لاتینی ہے۔ ویٹیکن کے تمام آفیشل ڈاکومنٹ لاتینی زبان ہی میں تیار کئے جاتے ہیں۔ مگر لاتینی زبان عربی زبان کی مانند نہیں۔ وہ ایک مردہ زبان ہے۔ صرف کچھ اختصاصی علماء ہی اس میں مہارت رکھتے ہیں۔ چنانچہ لسانی امور میں اکثر غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر، ۱۹۸۹ میں پوپ کے اسکینڈینیوا کے سفر پر ویٹیکن حکومت نے ایک یادگاری ٹکٹ جاری کیا۔ اس میں سویڈن کے لئے جو قدیم لاتینی لفظ (Sueta) لکھا گیا تھا اس کا تلفظ غلط تھا:

In 1989 the hierarchy was embarrassed when a stamp commemorating Pope John Paul II's trip to Scandinavia misspelled the Latin word for Sweden. (Time, 7-10-1991)

اس قسم کے ناخوشگوار واقعات سے متاثر ہو کر ویٹیکن نے لاتینی زبان کی ایک ڈکشنری خصوصی اہتمام کے ساتھ تیار کرائی ہے۔ اس میں (13,500) نئے الفاظ شامل ہیں۔ اس کی پہلی جلد حال میں چھپی ہے اور دوسری جلد عنقریب چھپنے والی ہے۔ یہ کام ایک پندرہ سالہ ادارہ لیٹن فاؤنڈیشن (Latin Foundation) کے تحت کیا جا رہا ہے۔

اسلام کے سوا دوسرے تمام ادیان کی مذہبی زبان اب کلاسیکل بن چکی ہے۔ یہ صرف اسلام ہے جس کی مذہبی زبان آج بھی مکمل طور پر ایک زندہ زبان ہے۔ یعنی عربی زبان۔

ویٹیکن کو دیکھنے کے بعد ہم روم کی مسجد اور اسلامی مرکز دیکھنے کے لئے گئے۔ یہ مقام ایرپورٹ سے بذریعہ کار پون گھنٹہ کی مسافت پر واقع ہے۔ یہ روم کا ایک پرفضا مقام ہے۔ ویٹیکن میں اندر اور باہر ہر طرف صرف عمارتوں کا ایک پتھریلا جنگل نظر آتا ہے۔ مگر اسلامی مرکز کے چاروں طرف کھلا ہوا علاقہ ہے۔ یہاں دور دور تک درخت اور سبزہ دکھائی دیتا ہے۔

تاہم یہ مرکز ابھی تک زیر تعمیر ہے۔ وہاں نماز قائم نہیں ہو سکی ہے۔ ایک اطالوی کمپنی اس کی تعمیر

کرا رہی ہے۔ اس نے مسجد کے اندر داخلہ ممنوع قرار دے رکھا ہے۔ مرکز کے ذمہ داروں نے ہم کو تحریری اجازت دی۔ اس کے بعد ہمارا تین آدمیوں کا قافلہ اس کے اندر داخل ہو سکا۔

یہ بہت وسیع اور بالکل جدید طرز کی مسجد ہے۔ اس سے متصل عمارتوں میں اسلامی مرکز کے دفاتر قائم ہوں گے۔ رقبہ بھی کافی بڑا ہے۔ حکومت اٹلی نے جب یہاں مسجد اور اسلامی مرکز قائم کرنے کی اجازت دی اس وقت یہاں کوئی سڑک نہ تھی جو اس کو بقیہ شہر سے جوڑ سکے۔ یہاں کے قانون کے مطابق، اس کے بعد نہایت عمدہ سڑک بنائی گئی جو مسجد سے متصل گزرتی ہے۔ اس سڑک کا نام مسجد روڈ (Viale Della Moschea) ہے۔

۱۹۲۹ میں مسولینی نے ویٹیکن کے لئے لیتران معاہدہ پر دستخط کئے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۳۰ میں اٹلی میں مقیم افریقی مسلمانوں کا ایک وفد مسولینی سے ملا اور اس سے کہا کہ ہم کو روم میں ایک مسجد بنانے کی اجازت دی جائے۔ کہا جاتا ہے کہ مسولینی نے اس کا جواب یہ دیا کہ روم عیسائیوں کا مقدس شہر ہے جس طرح مکہ مسلمانوں کا مقدس شہر ہے۔ روم میں مسجد بننا اسی وقت ممکن ہے جب کہ مکہ میں بھی ایک کیتھولک چرچ بن کر کھڑا ہو جائے۔

تاہم روم کے مسلمانوں نے کوشش جاری رکھی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے عرب پٹرول کی طاقت ظاہر کر دی۔ وہ دور آگیا جب کہ امریکی میگزین نیوز دیک (۱۸ فروری ۱۹۷۴) نے لکھا کہ قدیم زمانہ میں کہا جاتا تھا کہ تمام سڑکیں روم کو جاتی ہیں۔ مگر اب حالات بدل چکے ہیں۔ آج تمام سڑکیں ریاض کو جارہی ہیں:

(All roads lead to Riyadh

اٹلی کو عرب پٹرول کی ضرورت پیش آگئی۔ اس اقتصادی منطق نے اٹلی کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ دو طرفہ گفت و شنید کے دوران ۱۹۷۳ میں سعودی حکمراں شاہ فیصل نے اٹلی کی حکومت سے یہ یقین دہانی حاصل کر لی کہ وہ روم میں مسجد بنانے کی اجازت دے دے گی۔ اس کے ساتھ پوپ پال ششم نے بھی یقین دلایا کہ وہ مسجد کے پروجیکٹ میں مداخلت نہیں کریں گے۔ اس کے بعد سائٹ کی تلاش ہوئی۔ آخر کار ایک مقام پر ۳۰ ہزار مربع میٹر کا رقبہ مسجد اور اسلامک سنٹر کے لئے مختص کر دیا گیا اور ۱۹۸۳ میں وہاں کام شروع ہو گیا۔ اندازہ ہے کہ اس کی تکمیل پر پچاس ملین ڈالر خرچ ہوں گے۔ اٹلی میں تقریباً

چار لاکھ مسلمان آباد ہیں۔ مسجد کے اندر دو ہزار آدمیوں کے لئے نماز پڑھنے کی گنجائش ہوگی۔ روم میں ایک ہزار عیسائی چرچ اور یہودیوں کے آٹھ سینا گاگ ہیں۔ اب ایک باقاعدہ مسجد بھی وہاں تعمیر ہوگئی ہے۔ دوسری مسجد میلان میں ہے۔

۱۹۳۰ میں جو چیز بظاہر ناممکن تھی وہ آج واقعہ بن کر شاندار طور پر روم کے اندر کھڑی ہوئی ہے۔ خدا کی دنیا میں ہر ناممکن کو ممکن بنانے کے مواقع ہیں۔ بشرطیکہ سنت الٰہی کے مطابق اس کا انتظار کیا جائے۔

روم میں میرے رہنما ڈاکٹر لیونارڈو تھے۔ وہ پختہ عیسائی ہیں اور ویٹیکن سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے انتہائی ذوق و شوق کے ساتھ مجھ کو روم کی سیاحت کرائی۔ انھوں نے جس دلچسپی کے ساتھ مجھ کو ویٹیکن دکھایا ٹھیک اسی دلچسپی کے ساتھ انھوں نے روم کی مسجد اور اسلامک سنٹر کو بھی دکھایا۔

میرے تجربہ کے مطابق، مسلمانوں کے اندر اس قسم کا کردار موجود نہیں۔ اور اس کا واحد سبب دعوتی مزاج کا فقدان ہے۔ داعی اور مبلغ عین اپنے مزاج کے تحت دوسروں میں دلچسپی لیتا ہے۔ وہ دوسروں کی پوری رعایت کرتے ہوئے ان سے معاملہ کرتا ہے۔ غیر داعی کا مزاج اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ داعی اپنے ساتھ دوسروں کو بھی جانتا ہے اور غیر داعی صرف اپنے آپ کو۔

روم میں اگرچہ میری ملاقات کسی اردو داں سے نہیں ہوئی۔ تاہم مجھے معلوم ہوا کہ اٹلی میں اردو داں عیسائی موجود ہیں۔ انھوں نے خود اٹلی میں اردو کی تعلیم حاصل کی ہے۔

مسیحی چرچ مکمل طور پر ایک تبلیغ اورینٹڈ ادارہ ہے۔ اس کے یہاں ہر قسم کی تبلیغی سرگرمیاں جدید تر۔ین معیار پر پائی جاتی ہیں۔ اسی میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے آدمیوں کو تمام دنیا کی زبانیں پڑھاتے ہیں۔ مسیحی چرچ کے پاس کثیر تعداد میں ایسے قابل افراد موجود ہیں جو ہر زبان میں لکھنے اور بولنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مالٹا کی کانفرنس میں کئی ایسے پادری تھے جو روانی کے ساتھ عربی زبان بولتے تھے۔ حتیٰ کہ اپنے حلیہ، اپنے لباس اور اپنی عادات میں بھی وہ عرب مسلمان نظر آتے تھے۔ وہ السلام علیکم، الحمدللہ، ماشاءاللہ وغیرہ الفاظ اس طرح بولتے تھے جیسے کہ ایک مذہبی مسلمان بولتا ہے۔

اٹھارویں صدی کے آغاز میں نیپلز (اٹلی) میں مسیحی حضرات نے ایک ادارہ قائم کیا۔ ۷ اپریل ۱۷۳۲ء کو پوپ کلیمنٹ دوازدہم نے اس ادارہ کو باقاعدہ طور پر تسلیم کرلیا اور اس کی سرپرستی کرتے ہوئے جنوبی اٹلی میں اس کے لئے ایک جائداد وقف کردی۔ اس کے بعد اس میں مزید اوقاف

کا اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ یہ ادارہ مستحکم اور خود کفیل ہوگیا۔ اس کا موجودہ نام اورینٹل یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ، نیپلز ہے۔ یہ یورپ میں علوم مشرقی کی تعلیم کا قدیم ترین مرکز سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تمام مشرقی زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔

اردو زبان کی تعلیم کا آغاز اسی ادارہ میں انیسویں صدی میں ہوا۔ یہاں باقاعدہ طور پر اردو کا ایک شعبہ قائم کیا گیا۔ اس وقت سے وہ باقاعدہ طور پر کام کر رہا ہے۔ اس کے طلبہ زیادہ تر وہ مسیحی نوجوان ہوتے ہیں جو مسیحیت کی تبلیغ کو بطور کیریر اختیار کرتے ہیں اور جن کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اردو خواں دنیا میں مسیحیت کا پیغام پہنچائیں گے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران پروفیسر اجیت سنگھ اس ادارہ میں اردو کے استاد تھے۔ ۱۹۶۰ میں ڈاکٹر اقتدار حسن یہاں اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۰ میں ڈاکٹر رحیم رضا نے ان کی جگہ سنبھالی۔

اٹلی میں (دوسری عالمی زبانوں کے ساتھ) اردو کی تعلیم کا یہ انتظام حکومت کے تعلیمی نظام کے تحت نہیں ہے بلکہ چرچ کے تعلیمی نظام کے تحت ہے۔ اس کا مقصد مشنری عیسائیوں کو اردو داں بنانا ہے۔ تاکہ وہ اردو داں مسلمانوں کے درمیان عیسائیت کا پیغام پہنچا سکیں۔ مسلمان فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ اسلام عالمی مذہب ہے اور حضرت مسیح صرف "بنی اسرائیل کی بھیڑوں" کے لئے بھیجے گئے تھے۔ مگر عملاً آج معاملہ بالکل برعکس ہے۔ مسیحیت عالمی تبلیغ کے وسیع ترین منصوبہ پر عمل پیرا ہے، جب کہ مسلمانوں کے یہاں شعور کے درجہ میں بھی عالمی تبلیغ کا کوئی حقیقی خاکہ موجود نہیں۔

اٹلی کی ایک خاتون ہیں۔ وہ ایک مسیحی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ پھر انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ ور ایک عرب نوجوان سے نکاح کرلیا۔ ان کے عرب شوہر سے میری ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی اہلیہ اطالوی زبان کے علاوہ انگریزی زبان بھی بخوبی جانتی ہیں اور اب انھوں نے عربی بھی سیکھ لی ہے۔ عرب نوجوان نے بتایا کہ انھوں نے اطالوی خاتون کو انگریزی الرسالہ کے کچھ شمارے پڑھنے کے لئے دئے۔ ان کو پڑھ کر وہ کافی متاثر ہوئیں۔ اس کے بعد انھیں اسلامی دعوت کے بارے میں بنی مسئولیت کا احساس ہوا۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ کا اسلوب عصری اسلوب ہے۔ وہ یورپی ہن کو اپیل کرتا ہے اور دل کی گہرائی تک اتر جاتا ہے۔ میں ان مضامین سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔

ان کو پڑھ کر میں اپنی زندگی میں پہلی بار روئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کو اسی طرح پیش کرنا چاہئے :
إنّ هٰذا الاسلوب اسلوب عصري يخاطب العقلية الاوربية وينفذ الى اعماق القلب
اني تاثرت جدا بهٰذه المقالات وبكيت لاول مرة۔ هٰكذا يجب أن يقدّم الاسلام
ملاقاتوں کے بعد اکثر ایسے واقعات سامنے آتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی مرکز کا پیغام ایسے ایسے مقامات پر پہنچ رہا ہے جن کی بابت ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔ مثلاً سفر کے دوران ڈنمارک کے ایک صاحب ملے۔ انھوں نے بتایا کہ ہم نے آپ کا انگریزی الرسالہ اور انگریزی کتابیں پڑھی ہیں۔ وہ ہمارے سنٹر کی لائبریری میں موجود ہیں۔ اور لوگ ان کو شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان کا نام اور پتہ یہ ہے :

Sheikh Mohammed Idris, Islamic Cultural Centre,
Morsebakken 2, Copenhagen 2400 NV (Tel. 01609017)

روم کے تاریخی مقامات کو دیکھنے کے بعد دوبارہ ہم روم ایئرپورٹ پر واپس آگئے۔ یہاں ایئرپورٹ لاونج میں سنڈے ٹیلی گراف (۶ اکتوبر ۱۹۹۱) دیکھا۔ اس کے صفحہ ۲۶ پر ایک کالم ویٹیکنالوجی (Vaticanology) کا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ اٹلی اور انگلستان کے سفیر سے ملاقات کرتے ہوئے پوپ جان پال دوم (Pope John Paul II) نے چرچ کی طرف سے تشدد اور تخویف کے تمام اعمال کی ان الفاظ میں مذمت کی :

The Church continues to condemn all acts of violence and intimidation, from whatever source they originate.

قدیم زمانہ میں ممکن تھا کہ تشدد کو صرف ظالم اور مفسد کے خلاف استعمال کیا جائے۔ مگر موجودہ زمانہ میں ٹکنکل ترقیوں نے اس کو ناممکن بنادیا ہے۔ ایٹمی ہتھیاروں کے دور میں تشدد ایک ایسا ہلاکت عمل بن چکا ہے جو فاتح اور مفتوح دونوں کو برباد کر دیتا ہے۔ حتی کہ وہ خود زمین کو ناقابل رہائش بنادینے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روس اور امریکہ اپنے ہتھیاروں کو فنا کرنے کے معاہدے کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں جو مسلمان تشدد اور مسلح انقلاب کی بات کرتے ہیں وہ ایک قسم کی خلاف زمانہ حرکت (anachronism) میں مبتلا ہیں۔ وہ اسلام کو بھی وہیں پہنچا دینا چاہتے ہیں جہاں وہ خود اپنی فکری

پسماندگی کی بنا پر کھڑے ہوئے ہیں۔

روم سے مالٹا کے لئے الیتالیا کی فلائٹ ۴۹۰ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز کے اندر الیتالیا کا میگزین (Arrivederci) دیکھا۔ اس کے ایک صفحہ پر اٹلی کے ایک خوبصورت مکان کی رنگین تصویر تھی جس کے ساتھ خوبصورت تر گارڈن بھی شامل تھا۔ اس پرکشش تصویر کو دیکھ کر میری زبان سے نکلا : دنیا جنت کی ناقص تصویر ہے اور جنت اس کی کامل تصویر۔ دنیا ان کمپلیٹ ہے اور جنت کمپلیٹ۔

روم سے روانگی کا وقت ایک بج کر ۴۵ منٹ تھا۔ مگر روانگی میں آدھ گھنٹہ کی تاخیر ہوگئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آخر وقت میں معلوم ہوا کہ جہاز کے نظام میں کوئی ٹکنکل خرابی پیدا ہوگئی ہے۔ فوراً انجنیر بلایا گیا۔ دو آدمی دیر تک کام کرتے رہے۔ جب نظام کی اصلاح ہوگئی، اس کے بعد جہاز روانہ ہوا۔

میں نے سوچا کہ جہاز کے فنی نظام میں خرابی کا علم پرواز سے پہلے ہونا اور اس کا علم پرواز کے دوران ہونا دونوں میں لفظی طور پر بہت کم فرق ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پرواز سے پہلے اس کا علم ہونا اگر زندگی ہے تو پرواز کے دوران اس کا علم ہونا موت۔

یہی معاملہ قوموں کا ہے۔ جس قوم کے لیڈر اقدام سے پہلے قوم کی کمیوں کو جان لیں وہ قوم کو زندگی کی نعمت عطا کرتے ہیں۔ اور جس قوم کے لیڈر اقدام کے بعد قوم کی کمیوں اور کمزوریوں کو جانیں وہ قوم کو صرف ہلاکت کے گڑھے میں گرانے کا سبب بنتے ہیں۔

روم اور مالٹا کے درمیان سسلی واقع ہے۔ مالٹا جاتے ہوئے ہم جزائر سسلی کے اوپر سے گزرے۔ جہاز کی کھڑکی سے وہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ چنانچہ میں اس کو دیر تک دیکھتا رہا۔ میں نے سوچا کہ ہمارے اسلاف جزائر سسلی میں اترے اور اس کو تہذیب و تمدن کی ترقیاں عطا کیں۔ میرے لئے صرف یہ مقدر تھا کہ میں اس کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے گزر دوں۔ کیسا عجیب فرق ہے ماضی اور حال میں۔

سسلی میڈیٹرینین کا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ اس وقت وہ اٹلی کا ایک حصہ ہے۔ قدیم زمانہ میں سسلی مختلف قوموں کے ماتحت رہا ہے۔ لندن کی چھپی ہوئی ایک قدیم انسائیکلوپیڈیا (The Book of Knowledge) میں یہ الفاظ درج ہیں کہ نویں صدی میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سسلی عرب کلچر اور عرب علم کا مرکز بن گیا تھا۔ نارمنوں نے ان کو گیارھویں صدی میں یہاں سے

نکال دیا:

> The arrival of the Saracens in the 9th century made Sicily a centre of Arab culture and learning. The Normans drove them out in the 11th century. (7/50)

سسلی (صقلیہ) نویں صدی میں مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ اس کے بعد وہ میڈیٹرینین میں مسلمانوں کی توسیعی مہموں کا مرکز بن گیا۔ یہاں تک کہ نارمن نے ۱۰۹۱ میں جزیرہ کے اندر اپنا اقتدار قائم کرلیا:

> With the Muslim conquest of Sicily (9th century), the island became the chief base of Arab expansion in the Mediterranean until the Normans imposed their authority in 1091. (V/470,9/932)

تاریخ کے ان واقعات میں بے پناہ سبق ہے۔ یہ واقعات ہمیں اپنی کمزوریوں کے مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کی لکھی ہوئی تاریخی کتابیں ان واقعات کو صحیح انداز میں پیش نہیں کرتیں۔ اس لئے ان کو پڑھ کر بھی مسلمان ان سے صحیح سبق نہیں لے پاتے۔

مثال کے طور پر ابن اثیر کی الکامل فی التاریخ کا ایک باب ہے: جزیرہ صقلیہ پر فرنگیوں کے اقتدار کا ذکر (ذكر ملك الفرنج جزيرة صقلية) یہ باب ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے:

في هذه السنة استولى الفرنج لعنهم الله على جميع جزيرة صقلية أعادها الله إلى الاسلام والمسلمين (۱۰/۱۹۳)	اس سن (۴۸۴ھ) میں فرنگی پورے جزیرہ پر قابض ہوگئے، اللہ ان پر لعنت کرے اور اللہ اس کو دوبارہ اسلام اور مسلمانوں کی طرف لوٹا دے۔

سسلی پر "فرنگیوں" کا دوبارہ قبضہ، جیسا کہ خود ابن اثیر نے تفصیل سے لکھا ہے، خود مسلمانوں کی باہمی عداوتوں اور آپس کے قتل وخون کی وجہ سے ہوا۔ مگر جب آغاز بحث میں مذکورہ جملہ لکھ دیا جائے تو اس کے بعد سرے سے نصیحت کا ذہن ختم ہوجاتا ہے۔ حالاں کہ تاریخ کے مطالعہ کا اصل فائدہ یہ ہے کہ اس سے حال اور مستقبل کے لئے نصیحت حاصل کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کو

مؤرخانہ انداز میں لکھنا چاہئے نہ کہ معتقدانہ انداز میں۔

میڈیٹرینین میں پیش قدمی کے زمانہ میں سسلی مسلمانوں کے لئے رسد گاہ کا کام کرتا تھا۔ قدیم زمانہ میں مسلمانوں نے اس کو کافی ترقی بھی دی تھی۔ سسلی پر عرب تہذیب کی اتنی گہری چھاپ تھی کہ عربوں کے یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی سسلی کے امراء اور سلاطین عرب طرز پر رہتے تھے اور عربوں جیسا لباس پہنتے تھے، جس طرح موجودہ زمانہ میں برٹش راج سے آزادی حاصل کرنے کے باوجود قدیم برطانوی ممالک برطانوی لباس اور برطانوی زبان کو فخر کے ساتھ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ علامہ اقبال نے سسلی کی بابت کہا تھا:

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوں نابہ بار   وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار

مگر سسلی کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ موجودہ زمانہ میں مواصلاتی ذرائع کی ترقی نے ہمارے لئے دعوت کے مواقع کتنے زیادہ بڑھا دئے ہیں۔ ہمارے اسلاف نے "تہذیب حجازی" کو سسلی تک پہنچانے کے لئے برسوں کا دشوار گزار سفر طے کیا تھا۔ آج ہم صرف گھنٹوں کے اندر آسان سفر طے کرکے سسلی پہنچ سکتے ہیں اور وہاں کے باشندوں کو دوبارہ "تہذیب حجازی" کی تسخیری قوت سے مسخر کرسکتے ہیں۔ مگر اس کے لئے دعوتی شعور کی ضرورت ہے، اور دعوتی شعور موجودہ مسلمانوں میں سرے سے موجود نہیں۔

جزیرہ صقلیہ (سسلی) اور جنوبی اٹلی میں ایک عرصہ تک مسلمانوں کا غلبہ رہا ہے۔ اس سلسلہ میں تاریخ کی کتابوں میں کافی مواد موجود ہے۔ اس موضوع پر ۲۸۰ صفحات کی ایک عربی کتاب یہ ہے:

احمد توفیق المدنی، المسلمون فی جزیرۃ صقلیۃ وجنوب ایطالیا،

مکتبۃ الاستقامۃ، تونس، ۱۹۴۶،

اس کتاب کے صفحہ ۱۰۶ پر "فتح مالطۃ" کا عنوان ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ رومیوں نے ۵۳۳ء میں مالٹا پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۸۷۰ء میں صقلیہ کے مسلم حکمرانوں نے اس کو اپنے زیر اقتدار لے لیا۔ جزیرہ پر ان کا یہ اقتدار ۱۰۹۰ء تک باقی رہا۔ اس طرح ۲۲۰ سال تک یہاں مسلمانوں کی حکومت قائم رہی۔ کتاب میں بتایا گیا ہے کہ مالٹا کے لوگ محرف عربی بولتے ہیں۔

روم سے مالٹا تک کا پورا سفر میڈیٹرینین کے اوپر سے ہوا۔ سمندر بھی اسی طرح نیلا نظر آرہا

تھا جس طرح آسمان نیلا دکھائی دیتا ہے۔ حالاں کہ باعتبار حقیقت نہ سمندر نیلے رنگ کا ہے اور نہ آسمان نیلے رنگ کا۔

یہ صرف ایک گھنٹہ کا مختصر سفر تھا۔ ہم لوگ جہاز میں آکر بیٹھے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی چیزیں دیکھیں۔ اتنے میں ناشتہ آگیا۔ ناشتہ سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ "اپنی کرسی کی پیٹی باندھ لیں" کا اعلان ہونے لگا۔ پھر اعلان ہوا کہ ہم جلد ہی مالٹا کی زمین پر اترنے والے ہیں۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ سفر آدمی کی دنیوی زندگی کا ایک علامتی تعارف ہے۔ آدمی دنیا میں آتا ہے۔ وہ بچہ سے بڑا ہوتا ہے۔ تعلیم حاصل کرتا ہے۔ کمانے اور دنیا کی تعمیر کے کام میں مصروف ہوتا ہے۔ وہ اپنا گھر بناتا ہے۔ ابھی اس کے گھر کی دیواروں کی پینٹنگ ہورہی ہوتی ہے کہ "کوس رحلت بکوفت دست اجل" کا وقت آجاتا ہے۔ دنیا میں زندگی کا لمحہ کتنا مختصر ہے۔ اور کتنی لمبی مدت تک اس مختصر لمحہ کی قیمت انسان کو ادا کرنا ہے۔

۷ اکتوبر کی شام کو ہم مالٹا ایر پورٹ پر اتر گئے۔ جہاز سے باہر نکلے تو وہاں کانفرنس کے نمائندے ہماری رہنمائی کے لئے موجود تھے۔ انھوں نے ہم کو ایئر پورٹ کے لاونج میں بٹھادیا۔ ہمارے پاس مالٹا کا ویزا نہیں تھا۔ اس لئے یہاں ویزا ابھی لینا تھا۔ ان لوگوں نے ہمارا پاسپورٹ لیا اور اس کے بعد ویزا کا اندراج اور دوسری ضروری کارروائیوں کے لئے وہ ہمارا بدل بن گئے۔

یہ بظاہر سادہ سی بات ہے۔ ہر کانفرنس میں اسی طرح مہمانوں کی آمد پر ان کا استقبال اور ان کا تعاون کیا جاتا ہے۔ مگر میرا ذہن یہ سوچنے لگا کہ ایسا کس طرح ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ میں ایسا ممکن نہیں تھا کہ ایک شخص ہندستان سے روانہ ہو اور لمبی مدت طے کرنے کے بعد جب وہ مالٹا پہنچے تو وہاں کے لوگوں کو ہر چیز کی مکمل اطلاع ہو اور وہ عین وقت پر اس کی مدد کے لئے وہاں موجود ہوں۔ مگر آج جب ایک شخص غیر ملک میں اترتا ہے تو وہاں اس کے میزبان کو آمد کا وقت اور تاریخ اور سواری وغیرہ کی اطلاعات انتہائی صحت کے ساتھ معلوم ہوتی ہیں۔

یہ "معجزہ" مواصلات (کمیونیکیشن) کی ترقی کے ذریعہ ممکن ہوا ہے۔ جدید مواصلات اللہ تعالیٰ کی عجیب نعمت ہیں۔ وہ خدا کی قدرت کو یاد دلاتے ہیں۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب وہ بیرونی دنیا کے سفر کرتے ہیں تو وہ فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ میں فلاں مقام پر پہنچا تو وہاں اتنے آدمی میرے استقبال کے

لئے موجود تھے۔ ایک واقعہ جس کو حقیقۃً خدا کی گلوری کے خانہ میں ڈالنا چاہئے اس کو وہ ذاتی گلوری کے خانہ میں ڈال دیتے ہیں۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو اپنے آپ کو جانیں مگر وہ خداوند ذوالجلال کے بارہ میں بے خبر ہوں۔

میں مالٹا ایئر پورٹ کے وی آئی پی لاونج میں بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک خوش پوش نوجوان آئے اور میری کرسی کے قریب فرش پر عقیدت مندانہ انداز میں بیٹھ گئے۔ انھوں نے اپنا نام مارکونی بتایا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے آپ کی کتاب گاڈ ارائزز اور دوسری کئی انگریزی کتابیں پڑھی ہیں۔ ان کتابوں نے مجھ کو بہت متاثر کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ روم اور مالٹا میں بہت سے لوگ ہمارے مشن سے واقف ہیں اور ہماری کتابیں پڑھ چکے ہیں۔ اس علاقہ میں الرسالہ مشن کو متعارف کرانے میں الجزائر یونیورسٹی کے استاد دکتور محمد السلیمانی کا بہت بڑا دخل ہے۔ وہ عربی کے علاوہ فرانسیسی اور اطالوی زبانیں جانتے ہیں۔

کانفرنس کے منتظمین کا ہر کام اتنی منصوبہ بندی کے ساتھ ہو رہا ہے کہ ہم جب مالٹا ایئر پورٹ پر پہنچے تو اسی وقت ہم کو کانفرنس کا بیگ، اس سے متعلق ضروری کاغذات اور مالٹا کے بارہ میں تعارفی لٹریچر سب کچھ ایئر پورٹ پر ہی دے دیا گیا۔

مالٹا میں میرا قیام ہالی ڈے اِن کے کمرہ نمبر ۲۰۱ میں تھا۔ مالٹا میں اہل اسلام کی ۲۲۰ سال تک حکومت تھی۔ یہاں کی زبان اور تہذیب پر عربوں کا غیر معمولی اثر ہے۔ مالٹی زبان میں پچاس فیصد سے زیادہ الفاظ عربی کے ہیں۔ اس کے بعد اطالوی اور انگریزی کے۔ مگر آج مالٹا مسلمانوں سے خالی ہے۔ عربی میں بطور مثل کہا جاتا ہے کہ ——— فلان کَمَن یؤذّن فی مالطا یعنی فلاں شخص مالٹا میں اذان دے رہا ہے جہاں کوئی نماز پڑھنے والا نہیں۔

تاہم یہ مثل مجھے پسند نہیں آئی۔ اس میں دعوتی شعور کا نقدان نظر آتا ہے۔ ایک عرب عالم سے میں نے کہا کہ اذان کا تعلق صرف مسلمانوں سے نہیں ہے بلکہ دعوتی معنوں میں اس کا تعلق غیر مسلموں سے بھی ہے۔ اذان میں حیّ علی الصلاۃ بھی کہا جاتا ہے اور حیّ علی الفلاح بھی۔ ایک کلمہ کا تعلق اگر ایمان قبول کرنے والوں سے ہے تو دوسرے کا تعلق ان لوگوں سے ہے جنھوں نے ابھی ایمان قبول نہیں کیا۔ مسلمان ایک اذان سے واقف ہیں، مگر وہ دوسری اذان سے واقف نہیں۔

مالٹا ہوٹل کے ایک دروازہ پر لکھا ہوا تھا: معذوروں کے لئے حمام (Handicap toilets)

مغربی دنیا میں معذوروں کے لئے خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ ان کو ہر جگہ خصوصی توجہ کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ اس کو دیکھ کر دل میں یہ احساس ابھرا کہ خدایا، میں بھی عالم انسانی کا ایک معذور شخص ہوں۔ تو میرے ساتھ میرے عمل کے اعتبار سے نہیں بلکہ میرے عذر کے اعتبار سے معاملہ فرما۔ اپنی رحمت خاص سے میری بخشش فرما دے۔

مالٹا کا مسلم عہد مسلمانوں کے دور عروج میں تھا۔ اس لئے یہاں کی ہر چیز پر مسلم تہذیب کی گہری چھاپ اب تک موجود ہے۔ یہاں کے مکانات بیشتر مسلم اسپین کے طرز پر بنائے گئے ہیں۔ مقامات کے نام ابھی تک عربی میں ہیں۔ مثلاً غار، رباط، سلیمہ، مدینہ وغیرہ۔ مگر قومی اسباب سے مسلمانوں کے خلاف تعصب پایا جاتا ہے۔ مثلاً سیاحوں کے لئے تیار کئے ہوئے ایک پمفلٹ میں نپولین کے ذیل میں "مالٹا میں نپولین کے دستوں کی آمد" کا لفظ ہے، اور ترکوں کے ذیل میں "ترک فوجوں کا مالٹا پر حملہ" کا لفظ درج کیا گیا ہے:

MARSAXLOKK: The Turkish forces invaded Malta in 1565 from the shores of this village. Here also landed the troops of Napoleon to whom the knights surrendered in 1798.

یہ انسان کا عام مزاج ہے کہ وہ اپنوں کے لئے ایک قسم کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور غیروں کے لئے دوسرے قسم کے الفاظ۔ تاہم اس کو پڑھ کر مجھے لکھنے والوں پر کوئی غصہ نہیں آیا۔ کیوں کہ یہ بات موجودہ مسلمانوں میں مزید اضافہ کے ساتھ موجود ہے۔ آج مسلمانوں کے اکابر تک کا یہ حال ہے کہ ان کو جس شخص یا جس گروہ سے شکایت ہو جائے اس کے لئے ان کی زبان بالکل مختلف ہو جاتی ہے۔

مالٹا جیسے چھوٹے اور دور دراز مقامات تاریخ کے اس دور کی یاد دلاتے ہیں جب کہ دنیا میں عام طور پر مذہبی جبر کا دور زور رہا تھا۔ لوگ حکومتوں کے مذہبی تشدد سے بچنے کے لئے اس طرح کے مقامات پر پناہ لیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مسیحی بزرگ نے رومی پکڑ دھکڑ سے بچنے کے لئے مالٹا میں پناہ لی تھی۔ مالٹا کے بارہ میں ایک تعارفی پمفلٹ میں یہ الفاظ درج ہیں کہ یہ چرچ ابتداءً ۱۴۱۷ میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۶۹۴ میں وہ دوبارہ بنایا گیا۔ یہ چرچ سینٹ اگاتھا سے منسوب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ رومی شہنشاہ ڈیسیس کی تعذیب سے بھاگ کر مالٹا آئے تھے:

CHAPEL OF ST. AGATHA: This church was originally built in 1417, and redesigned by Lorenzo Gafa, in 1694. The church is dedicated to St. Agatha who, it is said, found shelter on Malta from the persecution of the Roman Emperor Decius (249 AD)

مذہبی جبر کے اس دور کو اسلام نے ختم کیا۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ لوگ عطیہ سے فائدہ اٹھارہے ہیں مگر معطی کا اعتراف کرنے والا کوئی نہیں۔ حتی کہ خود مسلمانوں میں بہت سے لوگ اس خدائی واقعہ کو اپنے قومی فخر کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ صحیح یہ تھا کہ اس کو وہ شکر خداوندی کے خانہ میں ڈالیں۔

عرب تہذیب کا اثر مالٹا پر اتنا گہرا پڑا کہ آج بھی وہ مالٹی زبان کی صورت میں موجود ہے۔ مالٹی زبان حقیقۃً عربی کی بگڑی ہوئی صورت ہے جس میں انگریزی اور اطالوی زبانوں کے کچھ الفاظ بھی شامل ہوگئے ہیں۔ موجودہ مالٹی زبان انگریزی حروف میں لکھی جاتی ہے۔

مثال کے طور پر مالٹی زبان کا ایک اخبار (Nazzjon) ہے۔ اس کے شمارہ ۲۸ اکتوبر کی پہلی سرخی مذکورہ کانفرنس کے بارہ میں تھی۔ اس کے الفاظ اس طرح تھے:

Il-lum tibda Il-Hames Laqgha Internazzjonali

(الیوم تبدأ الخمیس لقاء انٹرنیشنل) یعنی آج ۵ بجے انٹرنیشنل اجتماع شروع ہوگا۔

ہندستان کے علماء نے ۱۸۵۷ میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کی تحریک شروع کی تھی جو اپنے آخری مرحلہ میں ریشمی رومال کی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس سلسلہ میں دسمبر ۱۹۱۶ میں مولانا محمود حسن صاحب کو گرفتار کر لیا گیا۔ انھیں ساڑھے تین سال تک مالٹا میں نظر بند رکھا گیا۔ جون ۱۹۲۰ میں وہ رہا کئے گئے۔ اس نظر بندی کے زمانہ میں مولانا موصوف کے شاگرد خاص مولانا حسین احمد مدنی بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس سلسلہ میں جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے:

"حضرت شیخ الہند کے زمانہ نظر بندی میں جو لوگ ساتھ رہے ان میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ آپ نے حضرت شیخ کی خدمت کرنے اور زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے میں دن رات ایک کر دیا۔ ایک ادنیٰ سا واقعہ ہے۔ مالٹا میں شدت کی سردی میں حضرت

شیخ کے سرد پانی سے وضو کرنے کی تکلیف آپ سے دیکھی نہ گئی۔ تو آپ نے گرم پانی مہیا کرنے کا انتظام اور التزام اس طرح کیا کہ ساری رات ٹھنڈے پانی کا لوٹا سینے سے لگائے لحاف اوڑھے بیٹھے رہتے اور جسم کی حرارت سے گرم شدہ پانی کا لوٹا فجر کے وضو کے لئے حضرت شیخ کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ یہ سلسلہ ایک یا دو دن نہیں پورے تین سال ۵ مہینے تک چلا"۔ (الجمعیۃ ویکلی ۹۔ ۱۵ اگست ۱۹۹۱)

اس واقعہ کو ماننے کے لئے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ پورے تین سال ۵ مہینے تک مالٹا میں متواتر شدت کی سردی پڑتی رہی۔ عام قاعدہ کے خلاف وہاں موسم تبدیل نہیں ہوا۔ اس سے قطع نظر، خود یہ بات بڑی عجیب ہے کہ مولانا کا ایک شاگرد ان کے پاس ساری رات بیٹھے رہنے کی مصیبت اٹھا رہا ہے مگر مولانا اس کو منع نہیں فرماتے۔ اگر مولانا نے جانتے ہوئے منع نہیں کیا تو یہ ان کی شرافت کے خلاف ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ مولانا کو اس کا علم نہ ہو سکا تو یہ اور بھی زیادہ عجیب ہے۔ کیوں کہ جو شخص خود اپنے گھر کے ایک واقعہ سے ساڑھے تین سال تک بے خبر رہے، وہ ان عالمی حالات سے کیوں کر باخبر ہو سکتا ہے جن کو جاننا برٹش امپائر کے خلاف تحریک چلانے کے لئے ضروری تھا۔ ایک صورت میں مولانا کی شرافت مشتبہ ہوتی ہے اور دوسری صورت میں مولانا کی فراست۔ اب یہ مولانا کے معتقدین کو فیصلہ کرنا ہے کہ وہ دونوں میں سے کس صورت کو ترجیح دیتے ہیں۔

سفر سے پہلے میں نے ایک کتاب حاصل کی۔ اس کا نام "اسیران مالٹا" ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس میں مالٹا کے مذکورہ اسیروں کے بارہ میں تاریخی معلومات ہوں گی اور وہ مالٹا میں میرے کام آئیں گی۔ مگر کتاب کو پڑھنے کے بعد حیرت انگیز طور پر میں نے پایا کہ اس میں دوسری دوسری باتیں تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ مگر اسیران مالٹا کے بارہ میں کچھ نہیں۔ اگرچہ دوسری باتیں بھی اس میں زیادہ تر غیر تاریخی انداز میں ہیں۔ مگر اسیران مالٹا کے بارہ میں جزئی تذکرہ کے سوا کوئی بھی تاریخی یا غیر تاریخی معلومات اس کتاب میں مشکل سے ملے گی۔

اردو کتابوں کا عام طور پر یہی حال ہے۔ اردو زبان کا ارتقاء اس زمانہ میں ہوا جب کہ مسلم اہل قلم اور مسلم اہل زبان سب کے سب زوال کی نفسیات میں مبتلا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان میں مشکل سے کوئی ایسی کتاب ملے گی جو حقیقی معنوں میں سائنٹفک انداز میں لکھی گئی ہو۔ جو لوگ صرف اردو کتابیں پڑھیں وہ علم سے اسی طرح بے بہرہ رہتے ہیں جس طرح دیوان غالب کو پڑھنے والا

آدمی ارضیات سے۔

مولانا محمود حسن صاحب اور مولانا حسین احمد مدنی کو گرفتاری کے بعد مالٹا لایا گیا تھا اور ساڑھے تین سال تک ان کو یہاں رکھا گیا۔ ان پر انگریز کے خلاف باغیانہ سازش کا الزام تھا۔ ذاتی طور پر مجھے اس واقعہ سے زیادہ دلچسپی نہیں۔ کیوں کہ میرے نزدیک یہ محض ایک سیاسی واقعہ تھا نہ کہ کوئی اسلامی واقعہ۔ تاھم وہ ہماری تاریخ کا ایک جزء ہے۔ اس بنا پر مجھے تلاش تھی کہ میں اس کے بارہ میں ضروری تاریخی معلومات یہاں سے حاصل کروں۔

وقت کی تنگی کے باوجود، مجموعی طور پر میں نے اس کے لئے پورا ایک دن گزارا۔ گاڑی لے کر مالٹا کے مختلف حصوں میں سفر کرتا رہا۔ پبلک لائبریری۔ نیشنل لائبریری اور کئی دوسری لائبریریاں اور میوزیم دیکھے۔ مگر کہیں کسی ریکارڈ کا سراغ نہ ملا۔ یہاں کے نیشنل آرکائیوز میں ممکن ہے اس سلسلہ کا کوئی ریکارڈ موجود ہو۔ مگر اس کا علم مجھے آخر میں ہوا۔ اور وہاں جانے کا وقت میں نکال نہ سکا۔ البتہ ٹیلیفون پر ان کو تفصیلات درج کرا دی گئیں۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ تلاش کر کے بذریعہ ڈاک مطلع کریں گے۔

تاہم اس تمام دوڑ دھوپ اور تلاش کا ایک فائدہ ہوا۔ وہ یہ کہ اس مخصوص معاملہ سے متعلق اصل آدمی کا نام و پتہ معلوم ہو گیا۔ یہ مالٹا کے آرکائیوز کا انچارج تھا۔ اس سے ٹیلی فون پر بات کی گئی۔ اس نے کہا کہ ہمارے آرکائیوز میں برٹش دور کے بہت سے آثار ہیں۔ تاہم ان کی ترتیب ابھی باقاعدہ طور پر قائم نہیں ہو سکی ہے۔ عین ممکن ہے کہ آپ کا مطلوبہ ریکارڈ اس میں موجود ہو۔ مگر اس کو تلاش کرنا پڑے گا۔ ذیل میں ان صاحب کا پتہ درج ہے کوئی صاحب چاہیں تو ان سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں:

Mr. J. Caruana, National Archives,
Santo Spirito, Rabat, Malta. Tel. 00-356-459863

ہم کو مالٹا کے اس خاص مکان کی تلاش تھی جہاں دونوں صاحبان کو قید کر کے رکھا گیا تھا۔ اس کے لئے کئی پرانی عمارتیں دیکھیں۔ جس عمارت کے بارہ میں بھی لوگوں نے گمان ظاہر کیا اس کو جا کر دیکھا۔ مگر عمارت کا سراغ نہ مل سکا۔ تاہم جہاں بھی ہم گئے وہاں کے لوگوں نے انتہائی ہمدردی اور تعاون کا انداز اختیار کیا۔

مولانا محمود حسن صاحب جامعہ ملیہ کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اگر جامعہ ضروری وسائل فراہم

کرے اور اپنے کسی طالب علم کو کم ازکم ایک مہینہ کے لئے یہاں بھیجے اور وہ تمام ممکن مقامات پر جاکر مکمل تحقیق کرے تو امید ہے کہ کچھ ریکارڈ حاصل ہو جائے گا۔

اس تلاش و تحقیق سے واپس آتے ہوئے ایک دکان پر نظر پڑی۔ اس کے بورڈ پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا: لے جائیے (Take away) آدمی اگر انھیں دو لفظوں کو سب کچھ سمجھ لے تو وہ گمان کرے گا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دکان میں داخل ہو اور جو چاہیے وہاں سے بلا قیمت اٹھا لے جاؤ۔ مگر ان الفاظ کا یہ مطلب نہیں۔ ان لکھے ہوئے لفظوں میں کچھ اور الفاظ اپنی طرف سے ملانے پڑیں گے اس کے بعد ہی ان کا مطلب سمجھا جا سکتا ہے۔ مزید الفاظ کو ملانے کے بعد پوری بات یوں ہے: قیمت ادا کرو اور لے جاؤ۔

یہ الفاظ عام طور پر ان دکانوں پر ہوتے ہیں جہاں کھانے کا تیار سامان فروخت ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ہوٹل نہیں ہے جہاں آپ بیٹھ کر کھائیں۔ البتہ یہاں سے کھانے کی چیزیں خرید کر اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ ہر لفظ یا ہر عبارت اس وقت تک نامکمل ہے جب تک آپ اس میں اپنے حصہ کے ضروری الفاظ شامل نہ کریں۔

مالٹا میں ہماری معلومات کے مطابق، اس وقت دو مسجدیں ہیں۔ ایک قدیم مسجد ہے۔ یہ مسجد ترکوں کی بنائی ہوئی ہے۔ قدیم طرز کی کافی بڑی مسجد ہے۔ اس کو ہم صرف باہر سے دیکھ سکے۔ کیوں کہ وہ چاروں طرف سے بند تھی۔ غالباً وہ محکمۂ آثار قدیمہ کے زیر انتظام ہے۔

دوسری مسجد نئی ہے۔ یہ لیبیا کے تحت تعمیر شدہ اسلامک سنٹر کی مسجد ہے۔ اس سنٹر میں بظاہر کوئی خاص سرگرمی نظر نہیں آئی۔ البتہ تعمیر کے اعتبار سے وہ کافی بڑا ہے۔ اور اس میں ایک نہایت خوبصورت مسجد ہے۔ اس مسجد میں ہم نے ظہر کی نماز پڑھی۔ مسجد کے بیرونی دروازہ پر ایک عربی کتبہ لگا ہوا ہے اس پر یہ عربی الفاظ درج ہیں: بسم اللہ وعلیٰ برکۃ اللہ: وضع الاخ العقید معمر القذافی حجر الاساس للمرکز الاسلامی بجمھوریۃ مالطا الصدیقۃ بتاریخ ۲۷ رجب ۱۳۹۸ھ ۲ یولیو ۱۹۷۸م

مالٹا سیاحوں کا شہر ہے۔ یہاں ہر روز کثرت سے ساری دنیا کے سیاح آتے رہتے ہیں۔ جس وقت ہم مذکورہ مرکز میں تھے، اس وقت بھی کچھ سیاح "اسلامک سنٹر" کو دیکھنے کے لئے آئے۔ اگر

اس مرکز کو حقیقی معنوں میں دعوتی مرکز کے طور پر چلایا جائے تو اس کے ذریعہ سے عظیم الشان فائدے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

مالٹا کے لیبی سنٹر میں چند افراد بطور کارکن ہیں۔ یہی اس سنٹر کی دنیا ہے۔ یہ لوگ مقامی سوسائٹی سے بالکل کٹے ہوئے ہیں۔ ہمارے سامنے دو سیاح (ایک مرد، ایک عورت) سنٹر میں آئے۔ مگر وہاں ان لوگوں کو دینے کے لئے کوئی اسلامی لٹریچر موجود نہ تھا۔ چنانچہ انھیں گیٹ ہی سے رخصت کر دیا گیا۔ سنٹر کے مدیر نے شکایت کی کہ ہم کو مالٹا کی موجودہ کانفرنس میں مدعو نہیں کیا گیا۔

ہم ابھی سنٹر میں تھے کہ ظہر کا وقت ہو گیا۔ لاؤڈ اسپیکر کے بغیر اذان دی گئی۔ فلسطین کے ایک سفید ریش بزرگ اپنے کمرہ سے نکلے۔ معلوم ہوا کہ وہ یہاں کے امام ہیں۔ امام سمیت سنٹر کے غالباً تین افراد جماعت میں شریک ہوئے۔ سنٹر کے یہی چند افراد اس مسجد کے نمازی ہیں۔ سنٹر کے مدیر نے گفتگو کے دوران ہنستے ہوئے کہا: نحن نؤذن فی مالطا (ہم مالٹا میں اذان دے رہے ہیں)

عربوں میں یہ مثل مشہور رہے کہ فلان یؤذّن فی مالطا یا فلان کمن یوذن فی مالطا۔ اس مثل کا پس منظر یہ ہے کہ صلیبی جنگوں سے پہلے مالٹا میں مسلمان بڑی تعداد میں تھے۔ مگر صلیبی جنگوں کے دوران جب صلیبیوں نے مالٹا کو اپنا فوجی مرکز بنانا چاہا تو مسلمانوں کو یہاں سے ایک ایک کر کے نکال دیا۔ اس کے بعد مالٹا میں ایک بھی مسلمان باقی نہیں رہا۔ اس کے بعد یہ مثل بنی کہ فلاں شخص تو مالٹا میں اذان دے رہا ہے۔ یعنی ایسی جگہ لوگوں کو پکار رہا ہے جہاں کوئی اس کی پکار کا جواب دینے والا نہیں۔

ماضی اور حال کا یہ فرق بے حد عجیب ہے۔ عقبہ بن نافع تابعی (۶۸۳ - ۶۲۱ء) افریقہ کو فتح کرتے ہوئے اپنی آخر عمر میں افریقہ کے ساحل تک پہنچ گئے جہاں اٹلانٹک کا وسیع سمندر ان کے سامنے موجیں مار رہا تھا۔ انھوں نے سمندر کے ساحل پر کھڑے ہو کر کہا:

یارب لولا هذا البحر لمضیت فی البلاد حتی لا یعبد احد دونك۔	اے میرے رب، اگر یہ سمندر حائل نہ ہوتا تو میں چل کر ملکوں میں پہنچ جاتا یہاں تک کہ تیرے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے۔

یہ دور اول کے مسلمانوں کے جذبات تھے۔ وہ غیر عبادت گزار کو عبادت گزار بنانے کے

لئے تڑپتے تھے۔ اب ایک ہزار سال بعد جب اللہ نے راستے کھول دئے اور سفروں کو آسان کر دیا تو موجودہ مسلمان یہ کہہ رہے ہیں کہ جہاں کوئی عبادت گزار نہ ہو وہاں آخر اذان دینے کی کیا ضرورت۔

۸ اکتوبر کی سہ پہر کو میڈیٹرینین کانفرنس سنٹر کے وسیع ہال میں کانفرنس کا افتتاح ہوا۔ وزیر اعظم اٹلی، وزیر اعظم مالٹا، اور دوسرے لوگوں کی تقریریں ہوئیں۔ ایک مقرر نے اپنی تقریر میں کہا کہ مذہب کا نیا نام امن ہے:

The new name of religion is peace

"امن" بذات خود تو مذہب کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ کہنا صحیح ہے کہ آج انسان ایک ایسے مذہب کی تلاش میں ہے جس کی تعلیمات پر امن زندگی کی طرف لے جانے والی ہوں۔

یہ ایک بے حد اہم بات ہے۔ پچھلے تلوار کے زمانہ میں جنگ کا تعلق صرف فوجی میدان سے ہوتا تھا۔ مگر اب جدید ہتھیاروں کے ظہور میں آنے کے بعد یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ جنگ کے اثرات صرف میدان جنگ تک محدود رہیں۔ آج جنگ کے معنی پوری انسانیت کی تباہی کے ہیں۔

ایسی حالت میں جو لوگ "مسلح جدوجہد" کے ذریعہ اسلامی انقلاب لانے کی بات کرتے ہیں وہ بیک وقت دو نادانی کے شکار ہیں۔ وہ جدید انسان کو تشدد کا مذہب دینا چاہتے ہیں۔ جب کہ آج کا انسان امن کے سوا کسی اور مذہب کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر بالفرض یہ حضرات وہ نوبئی طاقت حاصل کر سکیں جس کے ذریعہ وہ موجودہ عالمی طاقتوں کو زیر کر کے زمین پر اسلامی اقتدار کا جھنڈا لہرائیں تو یہ ایک ایسی زمین ہو گی جہاں ان کے کارنامے کی داد دینے کے لئے کوئی انسان موجود نہ ہو گا۔ حتی کہ شاید وہ خود بھی نہ ہوں گے کہ اپنی انوکھی فتح اسلام کی تقریب مسرت منعقد کر سکیں۔

انٹرنیشنل کانفرنسوں کے عام رواج کے مطابق، یہاں بھی "ہیڈ فون" کا انتظام تھا۔ بولنے والا اپنی زبان (مثلاً فرانسیسی یا اطالوی) میں بولتا تھا۔ اور سننے والا آلۂ سماعت کے ذریعہ اس کو اپنی زبان (مثلاً انگریزی یا عربی) میں سنتا تھا۔ اس عمل کے دوران ایک بار مجھے خیال آیا کہ متکلم کی بات کو براہ راست طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ متکلم کی زبان کو سامع بھی سمجھتا ہو۔ متکلم اور سامع

دونوں کی زبان ایک نہ ہو تو کلام موجود ہو گا مگر سماعت وہاں پائی نہ جائے گی۔

پھر میں نے سوچا کہ یہ سادہ طور پر صرف زبان کا معاملہ نہیں ہے بلکہ طرز فکر کا معاملہ بھی ہے۔ اگر متکلم کا طرز فکر ایک ہو اور سامع کا طرز فکر دوسرا ہو تو مشترک زبان کے باوجود دونوں ایک دوسرے کی بات سمجھنے سے عاجز رہیں گے۔ مثلاً ایک شخص علمی تنقید کرے گا۔ مگر سننے والا اپنے مخصوص ذہنی سانچہ کی بنا پر سمجھے گا کہ وہ شخصی تنقیص کر رہا ہے۔ وغیرہ

مطبوعہ پروگرام کے مطابق، مالٹا کی کانفرنس میں مجھے تین بار عملی شرکت کا موقع ملا۔ ۸ اکتوبر کے اجتماع میں چیرمین کی حیثیت سے۔ اس موقع پر میں نے کوئی باضابطہ تقریر نہیں کی۔ ابتدا میں میں نے چیرمین کی حیثیت سے افتتاحی کلمات کہے۔ اس کے بعد دوسرے حضرات نے اپنے اپنے مقالات پیش کئے۔ آخر میں میرے اختتامی کلمات پر جلسہ ختم ہوا۔

۹ اکتوبر کو صبح کی نشست خاص طور پر میری دلچسپی کی تھی۔ اس کا موضوع تھا اسلام اور عالمی چیلنج (Islam and the challenges of the world) اس موضوع پر میں نے اپنا انگریزی مقالہ پیش کیا۔ یہ مقالہ انشاءاللہ انگریزی الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔ ۹ اکتوبر کو آخری نشست میں لوگوں کے مقالات پر تبصرہ میرے ذمہ تھا۔ میں نے دوران کارروائی اپنا دو صفحہ کا تبصرہ انگریزی میں لکھا اور اس کو آخر میں لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

میرے مذکورہ مقالہ کے سلسلہ میں ایک عجیب بات پیش آئی۔ اس سلسلہ میں میں نے اپنی یادداشت کی ڈائری میں جو الفاظ لکھے تھے وہ یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

۹ اکتوبر کو دوبارہ میڈ یٹرینین کانفرنس سنٹر میں اجتماعات ہوئے۔ مختلف لوگوں نے اپنے اپنے مقالات پیش کئے۔ یہاں ۸۰ ملکوں کے لوگ آئے ہیں۔ اور ہر بڑے مذہب کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ چنانچہ ہر ایک اپنے اپنے خیالات پیش کر رہا ہے۔

آج میری تقریر کا موضوع تھا: اسلام اور جدید عالمی چیلنج۔ میں نے اس موقع کے لئے ایک مقالہ تیار کر کے پیشگی طور پر دہلی سے بھیج دیا تھا۔ کانفرنس کے منتظمین نے اس کی کاپیاں بھی تیار کر لی تھیں۔ مگر مالٹا آنے کے بعد یہاں کانفرنس سے جو باتیں ہوئیں اور لوگوں کے ذہن کا جو اندازہ ہوا، اس کے بعد میں نے چاہا کہ نئے پہلو سے میں اپنی بات یہاں پیش کروں۔

یہ ایک مشکل مسئلہ تھا۔ کیوں کہ بہت کم وقت میں دوبارہ مجھے ایک نیا مقالہ تیار کرنا تھا۔ ۸ اکتوبر کی شام کو اس کے بارہ میں سوچتے ہوئے لیٹا اور سوگیا۔ رات کو حسب معمول ساڑھے تین بجے میری نیند کھل گئی۔ میں بستر سے اٹھا۔ وضو کرکے ہوٹل کے کمرہ میں دو رکعت نماز پڑھی۔ اس کے بعد اپنی نئی تقریر لکھنے کے لئے میز پر بیٹھ گیا۔

آج صبح ۱۱ بجے کی نشست میں مجھے یہ مقالہ پیش کرنا تھا۔ میں نے تیزی سے اپنے خیالات جمع کئے اور ان کو کاغذ پر لکھنا شروع کیا۔ درمیان میں صرف فجر کی نماز کے لئے ایک بار اٹھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ سورج نکلتے نکلتے میرا مقالہ تیار ہوچکا تھا۔

اس کے بعد کمرہ کے ٹیلیفون کے ذریعہ کانفرنس کے منتظمین سے ربط قائم کیا۔ انھیں بتایا کہ میں نے اپنا مقالہ بدل دیا ہے۔ اور اب میرے ہاتھ کے لکھے ہوئے نئے مسودہ کو ٹائپ کرانا ہے انھوں نے مقالہ بدلنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ فوراً ہی انھوں نے اس کو حاصل کرکے ٹائپسٹ کے حوالے کر دیا۔ ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد ٹائپ کیا ہوا مقالہ میرے ہاتھ میں موجود تھا۔ کانفرنس میں میں نے یہی دوسرا مقالہ پیش کیا۔

قاہرہ کے مفتی شیخ طنطاوی نے عربی میں تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ اسلام میں صرف دفاعی جنگ ہے، اسلام میں جارحانہ جنگ نہیں ——— الاصل فی العلاقات السلام، القتال لایکون الا للمقاتلین، لایرجع المرء الی الحرب الا اذا کان مضطراً ۔ وغیرہ

یروشلم سے بھی ایک ربی آئے تھے۔ انھوں نے یہودی مذہب کی ترجمانی کی۔ انھوں نے اپنی انگریزی تقریر میں کہا کہ فلسطین کی مقدس سرزمین لوگوں کے دلوں میں امن کا جذبہ پیدا کرنے کا ذریعہ ہے:

The Holy Land is a source of inspiration for peace.

ربی کی تقریر سن کر مجھے خیال آیا کہ امتحان کی اس دنیا میں شاید الفاظ سب سے بڑا فتنہ ہیں۔ یہاں ہر بات خوبصورت لفظوں میں ڈھل جاتی ہے، خواہ باعتبار حقیقت وہ کتنا ہی بے اصل کیوں نہ ہو۔

۸ اکتوبر کو شام کا کھانا صدر مالٹا کے پیلس میں تھا۔ یہ ایک بہت بڑا محل ہے جس کو غالباً انگریزوں نے بنایا تھا۔ ہم لوگ ایک بڑے ہال میں پہنچائے گئے۔ وہاں اعلیٰ تواضع کا انتظام تھا۔

کچھ دیر میں صدر مالٹا مسٹر تابون (Censu Tabone) ہال میں آئے اور لوگوں سے ملنے لگے۔ میں ہال کے کنارے کچھ لوگوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا، ایک صاحب نے کہا کہ آپ بھی چلیں، پریسیڈنٹ سے مصافحہ کرلیں۔ مگر میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ کچھ دیر کے بعد خود پریسیڈنٹ صاحب میری طرف آئے اور سلام اور مصافحہ کیا۔ وہ ۱۹۸۹ سے مالٹا کے صدر ہیں۔

مذکورہ صدر میرے بارہ میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ یہ صرف ان ملکوں کے عام رواج کی بات ہے کہ وہ اس طرح سادہ طور پر ہر ایک سے ملاقات کر رہے تھے۔ اسی قسم کا تجربہ مجھے مالٹا ایرپورٹ پر بھی ہوا تھا۔ ہم لوگ ایرپورٹ کے جس کمرہ میں بٹھائے گئے، وہاں پہلے سے مالٹا کے ایک وزیر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم کو دیکھ کر وہ بلا تکلف فوراً اٹھ گئے اور کہا کہ آپ لوگ یہاں اطمینان سے بیٹھیں، میں دوسرے کمرہ میں چلا جاتا ہوں۔

کانفرنس کی تنظیمی ہیئت کے صدر پروفیسر ریکارڈی (Andrea Riccardi) ہیں۔ وہ اطالوی اور فرانسیسی زبانیں جانتے ہیں۔ ان سے ترجمان کی مدد سے گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں آپ کے مشن سے واقف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ مین آف ڈائیلاگ ہیں۔

اس جملہ میں دراصل یہ احساس چھپا ہوا تھا کہ مسلم علما راکثر اس مزاج کے نہیں ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک عالم سے میری گفت گو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ مسیحیوں کے ساتھ حوار میں داخل ہونا ہمارے لئے غیر مفید ہے۔ کیوں کہ اس حوار میں مسلمان کمزور فریق ہوتے ہیں جن کو قوی فریق استعمال کرتا ہے (المسلمون هم الطرف الضعيف يستخدمهم الطرف القوى)

اس کے مقابلہ میں مسیحی حضرات کا انداز زیادہ حوصلہ مندانہ تھا۔ مثلاً ایک عرب عالم نے ان عصری تحدیات (چیلنج) کا ذکر کیا جو آج مسلمانوں کو درپیش ہیں۔ اس پر ایک مسیحی عالم نے کہا کہ یہ تحدیات صرف اسلامی تحدیات نہیں ہیں بلکہ وہ تمام ادیان کو درپیش ہیں (هذه التحديات ليست تحديات اسلامية فقط بل هى تحديات تواجها كل الديانات) ایک مسیحی مقرر نے کہا کہ حضارت اسلامی کا تعلق صرف مسلمانوں سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق مسیحیوں سے بھی ہے۔ حضارت اسلامی کو فروغ دینے میں مسیحی بھی مشترک ہیں۔ انھوں نے بھی اس کے لئے کام کیا ہے۔ البتہ دین ہمارا دوسرا ہے اور مسلمانوں کا دوسرا۔ یوحنا ابراہیم (مسیحی عالم) نے خالص عربی لہجہ میں تقریر

کرتے ہوئے یہ باتیں کہیں۔ یہ تقریر ۹ اکتوبر کو کانفرنس میں ہوئی۔

کانفرنس میں مسیحی حضرات ہم لوگوں کو السلام علیکم کے لفظ سے خطاب کرتے تھے اور انشاء اللہ وغیرہ الفاظ بے تکلف بولتے تھے۔ روم کے ایک مسیحی عالم سے میں نے پوچھا کہ انشاء اللہ کو اطالوی زبان میں کس طرح کہا جائے گا۔ انھوں نے فوراً ایک کاغذ پر لکھ کر دیا: SE DIO VUOLE

۱۰ اکتوبر کو کانفرنس کا آخری دن تھا۔ صبح کے سشن میں مختلف لوگوں کی تقریریں ہوئیں۔ ایک مقرر نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں ہر طرف تبدیلی کی بات کی جارہی ہے مگر عملاً تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص دنیا کو بدلنے کی بات کررہا ہے، کوئی بھی شخص اپنے آپ کو بدلنے کے لئے نہیں سوچتا:

Everyone is thinking to change the world; no one is thinking to change himself.

حیفہ (اسرائیل) کے چیف ربائی نے اپنی تقریر میں امن کی اہمیت پر بہت زیادہ زور دیا۔ اس نے کہا کہ امن بھی خدا کا ایک نام ہے:

Peace is one of the names of God.

مگر اسی کے ساتھ جب اسرائیل کا ذکر آیا تو اس نے یہ بھی کہا کہ اس سے اس کی مراد صرف موجودہ اسرائیل نہیں ہے بلکہ وہ پورا علاقہ ہے جس کا خدا نے اسرائیل سے اس کی مقدس کتابوں کے مطابق وعدہ کیا ہے (Not the only Israel but all the promised land) دونوں باتوں میں واضح تضاد ہے۔ مگر جب آدمی کے اندر احتساب خویش کا مادہ نہ ہو تو اس کو اپنے نقائص کی خبر نہیں ہوتی۔

کانفرنس میں جو یہودی علماء اور مسیحی علماء آئے تھے، ان کو میں نے دیکھا کہ وہ بہت اچھی حالت میں ہیں۔ ان کی قوم نے ان کو نہایت اعلیٰ سہولتیں دے رکھی ہیں۔ ان کو اپنی قوم کے اندر عزت بھی حاصل ہے اور ہر قسم کے مادی وسائل بھی۔

میں نے سوچا کہ مذہبی اعتبار سے ہمارے یہاں مسجد کے امام اور مدرسہ کے مولوی کا جو درجہ ہے وہی یہودیوں کے یہاں ربّی کا اور مسیحیوں کے یہاں پادری کا درجہ ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ دوسروں کے یہاں ان کی مذہبی شخصیت کو جو مقام حاصل ہوتا ہے وہ مقام ہمارے یہاں کی مذہبی شخصیت کو حاصل نہیں۔

اس کی ایک وجہ کانفرنس کے تجربہ میں سمجھ میں آئی۔ میں نے دیکھا کہ یہودی اور مسیحی علماء نہایت اعلیٰ سطح پر اپنے مذہب کی نمائندگی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ عالمی زبانوں میں اپنے مذہب کی وکالت اس طرح کر رہے ہیں جس سے ان کے ہم قوم خوش ہو جائیں۔

یہی خصوصیت اگر مسجد کے امام اور مدرسہ کے مولوی کے اندر آجائے تو وہ بھی مسلمانوں کے اندر اونچا درجہ حاصل کر لے گا۔ مثلاً یہ لوگ اگر انگریزی سیکھ لیں اور مشترک اجتماعات میں انگریزی زبان میں اسلام کی اعلیٰ نمائندگی کرنے کے قابل ہو جائیں تو قوم کے اندر انھیں بھی اعلیٰ رتبہ حاصل ہو جائے گا۔

شام کی آخری کارروائی ساڑھے تین بجے شروع ہوئی۔ کانفرنس کے منتظمین اس کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے نزدیک یہی پوری کانفرنس کا اصل خلاصہ ہوتا ہے۔

پہلے کار کے ذریعہ ہم کو ایک مقام پر پہنچایا گیا۔ یہاں قدیم انداز کا ایک بہت بڑا گیٹ تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا: باب البلد (Bieb il-Belt) گیٹ کے دوسری طرف سیدھی لمبی سڑک تھی۔ اس سڑک سے ہم کو گزرنا تھا۔ تقریباً ایک کیلومیٹر تک سڑک کے دونوں طرف بے شمار عورتیں اور مرد کھڑے ہوئے تھے۔ گیٹ پر پہنچتے ہی لوگوں نے خوش آمدید کے انداز میں تالیاں بجانی شروع کیا اور سارے راستے میں مسلسل بجاتے رہے۔ یہ منظر دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ میری زبان سے نکلا: کیسے عجیب خوش قسمت ہوں گے وہ لوگ جن کا استقبال جنت کے دروازہ پر کیا جائے۔

پروگرام کے مطابق ہر مذہب کے لوگوں کو مخصوص مقامات پر پہنچ کر اپنے اپنے انداز میں عبادت اور دعا کرنا تھا۔ چنانچہ مسیحی حضرات ایک چرچ میں داخل ہو گئے۔ ہم مسلمان تقریباً دس کی تعداد میں تھے۔ آگے پہنچے تو ایک بہت بڑے محل نما مکان کے صحن میں قالین بچھے ہوئے تھے۔ ہم لوگ یہاں بٹھا دئے گئے۔

یہاں نصیحت اور تذکیر کے انداز میں باتیں ہوئیں۔ سوڈان کے ایک عالم نے کہا کہ یہاں ہم کو اذان دینا چاہئے۔ انھوں نے کہا کہ صوفیا نے اذان کے الفاظ کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ اللہ نے اس مقام پر تجلّی فرائی ہے اس لئے تم لوگ یہاں آؤ (ان اللہ سبحانہ وتعالیٰ تجلّی فی ھٰذا المکان فھلموا الیہ) اس کے بعد انھوں نے کھڑے ہو کر اپنے مخصوص لہجہ میں اذان دی۔ تقریباً یقینی

ہے کہ اس محل میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ یہاں اذان کی آواز گونجی۔

یہاں ہم لوگوں نے شیخ طنطاوی کی امامت میں مغرب کی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد سوال وجواب کے انداز میں دیر تک مجلس رہی۔ اس میں زیادہ تر دو آدمیوں نے حصہ لیا۔ ایک ایرانی عالم سوال کرتے رہے اور شیخ طنطاوی سنجیدہ علمی انداز میں ان کا جواب دیتے رہے۔ زیادہ تر سوالات "جہاد" کے مسئلے سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ طنطاوی کا نظریہ تھا کہ جہاد بمعنی قتال صرف دفاع کے لئے ہے۔ جب کہ ایرانی عالم کو اس سے اختلاف تھا۔

شروع سے آخر تک اس نشست میں تقریباً تین گھنٹے لگے۔ اس پوری مدت میں مسیحی حضرات بڑی تعداد میں ہمارے چاروں طرف ہاتھ باندھے کھڑے رہے۔ ہماری مجلس کی ساری کارروائی عربی زبان میں تھی۔ اس لئے وہ اس کو سمجھ نہیں سکتے تھے۔ تاہم مذہبی احترام کے جذبہ کے تحت وہ مسلسل خاموش کھڑے رہے۔ اسی طرح کھڑے ہو کر انھوں نے ہماری باجماعت نماز کو بھی دیکھا۔

یہ مسیحی حضرات جس انہماک اور عقیدت کے ساتھ ہماری نماز کو دیکھ رہے تھے اس کے بارہ میں سوچتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ نماز باجماعت اپنی ذات میں ایک مکمل تبلیغ ہے۔ نمازی کے لئے وہ عبادت ہے اور دیکھنے والوں کے لئے دعوت۔

قرآن میں ہے کہ جن وانس کو صرف اللہ کی عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے (الذاریات ۵۶) عبادت کی سب سے اعلیٰ اور کامل صورت نماز ہے۔ غور کیجئے تو انسان کی نفسیات اور اس کا جسمانی ڈھانچہ اس طرح ہے گویا وہ نماز پڑھنے ہی کے لئے بنایا گیا ہو۔ ایسی حالت میں جب ایک غیر مسلم مسلمانوں کو نماز ادا کرتے ہوئے دیکھتا ہے، خاص طور پر جماعت کی نماز، تو اس کا پورا وجود خاموش طور پر کہہ اٹھتا ہے کہ یہی وہ چیز ہے جس کو میری فطرت مانگ رہی تھی۔ وہ نماز کو خود اپنی اندرونی طلب کا جواب سمجھنے لگتا ہے۔ اس طرح نماز کو دیکھنا اس کے لئے ایک عملی تبلیغ بن جاتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ بہت سے لوگ نماز کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے۔ اس کی وجہ یہی ہے۔ ان کا وجود پہلے سے نماز جیسی ایک چیز کا طالب تھا۔ جیسے کوئی پیاسا آدمی پانی کا طالب ہو۔ جب انھوں نے نماز کو دیکھا تو انھیں محسوس ہوا کہ یہ ان کے اپنے ہی اندرونی تقاضے کا خارجی مظاہرہ ہے۔ اس احساس کے تحت انھوں نے بڑھ کر اس کو اختیار کر لیا۔

یہاں مصر کے مفتی الشیخ طنطاوی نے تذکیری انداز میں دیر تک کچھ باتیں کیں۔ اس میں خصوصی طور پر اسلام کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں کو واضح کیا۔ پھر انھیں نے مغرب کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھائی۔ آخر میں جزیرہ والوں کے لئے، مسلمانوں کے لئے اور اہل عالم کے لئے سلامتی اور فلاح کی دعائیں کی گئیں۔ یہ عمل تقریباً دو گھنٹے تک جاری رہا۔

اس نشست کے دوران سوال وجواب بھی ہوا۔ شیخ طنطاوی نے اپنی کانفرنس کی تقریر میں کہا تھا کہ اسلام امن وسلامتی کا دین ہے۔ اسلام میں صرف دفاعی قتال ہے۔ اسلام میں ہجومی قتال نہیں ہے۔ جو لوگ جہاد کے نام پر غیر مسلم اقوام سے لڑائیاں چھیڑے ہوئے ہیں ان سے شیخ طنطاوی نے عدم اتفاق کا اظہار کیا۔

اس پر ایران کے عالم کو اعتراض تھا۔ انھوں نے شیخ طنطاوی سے سوالات کئے۔ شیخ طنطاوی نے نہایت عالمانہ انداز میں ہر سوال کا جواب دیا۔ ایرانی عالم نے یہ حدیث پیش کی کہ امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ۔ شیخ طنطاوی نے کہا کہ اس کا تعلق قدیم مشرکین عرب سے ہے جنھوں نے پیغمبر کا انکار کیا اور ان کو ان کے وطن سے نکالا۔ اب ہمارے لئے قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم کا حکم ہے۔ جو قومیں ہمارے خلاف عدوان نہ کریں ہم بھی ان کے خلاف جہاد نہیں چھیڑ سکتے۔ کیوں کہ قرآن میں ہے کہ فما استقاموا لکم فاستقیموا لھم۔ مسلم حکومت کے تحت غیر مسلموں کے بارہ میں اسلام کا اصولی حکم انھوں نے یہ بتایا کہ لھم مالنا وعلیھم ماعلینا۔

مغرب کی نماز کے بعد ہمارا قافلہ دوسرے حضرات کے ساتھ ایک خاص مقام کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں کانفرنس کے شرکاء کے علاوہ لاکھوں کی تعداد میں مالٹا کے عوام جمع تھے۔ یہاں امن کے بارہ میں پوپ کا پیغام پڑھا گیا۔ ہر مذہب کے پیشواؤں نے امن کی شمع جلائی اور امن کے لئے دعائیں کی گئیں۔ پورا مجمع اس دعا میں شریک رہا۔

کانفرنس کی تھیم مذاہب امن کے سمندر کے لئے (Religions for a sea of peace) مقرر کی گئی تھی۔ یہاں عوام جس بڑی تعداد میں اور جوش وخروش کے ساتھ جمع ہوئے وہ گویا ایک "بحر امن" کا مظاہرہ تھا۔ کارروائی کے خاتمہ پر لوگوں نے آپس میں مل کر ایک دوسرے کو مبارک باد دی اور مصافحہ کیا۔ اس موقع پر ان کا خاص کلمہ امن (peace) ہوتا تھا جس کو وہ اپنی زبان سے دہراتے تھے۔

یہاں سے ہم لوگ پیدل چل کر ایک بڑے میدان میں لے جائے گئے۔ یہاں مخصوص انداز میں عمومی اجتماع کا انتظام تھا منتظمین اس کو "دعائیہ اجلاس" کہتے ہیں۔ اس دعائیہ اجلاس میں عوام اسی طرح بڑی تعداد امنڈ آئے تھے جس طرح تبلیغی جماعت کے جلسوں میں دعا کے وقت بستی کے ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔

غالباً ۱۹۴۲ میں پنڈت جواہر لال نہرو مئو (یوپی) آئے تھے۔ وہاں ان کا جلسہ تھا۔ میں بھی وہاں گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کہ میں نے کوئی بڑا جلسہ دیکھا۔ یہ بلا مبالغہ انسانوں کا جنگل تھا۔ بھیڑ کی اس کیفیت کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

یہی احساس ۱۱ اکتوبر کے مذکورہ دعائیہ اجتماع میں بھی ہوا۔ تاہم یہ صرف بھیڑ نہ تھی بلکہ نہایت منظم اور نہایت منصوبہ بند قسم کا ایک عظیم الشان اجتماع تھا۔ اس کو دیکھ کر دوبارہ مجھے احساس ہوا کہ اس منظر کو اگر میں لفظوں میں بیان کرنا چاہوں تو میں اس کو الفاظ کی صورت میں بیان نہیں کرسکتا۔ اس کو یا تو براہ راست مشاہدہ کے ذریعہ سمجھا جاسکتا ہے یا ٹی وی پر بالواسطہ مشاہدہ کے ذریعہ۔

اس طرح کے تجربات کے بعد مجھے خیال آتا ہے کہ جنت کی زندگی کے پرمسرت لمحات میں ایک لمحہ غالباً وہ بھی ہوگا جب کہ آدمی اپنے جنتی مکان میں "جنتی ٹی وی" پر پچھلے انبیاء کے واقعات کو دیکھے گا۔ پیغمبروں کی زندگی حیرت ناک واقعات کی زندگی ہے۔ ہم اس کو لفظوں کی صورت میں کتاب میں پڑھتے ہیں۔ مگر الفاظ ان کا پورا تعارف نہیں کرتے۔ جنت کا ایک آدمی اپنے "جنتی ٹی وی" کا بٹن دبا کر جب ان کو دیکھے گا تو وہ فرحت کا ایک ایسا تجربہ ہوگا جس کا آج کی دنیا میں اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

۹ اکتوبر کی سہ پہر کو میڈیٹرینین سنٹر کے ایک ہال میں پریس کانفرنس ہوئی۔ روم سے ۸۰ روزنامے نکلتے ہیں۔ ان میں سے بارہ اخباروں کے نمائندے پریس کانفرنس میں موجود تھے۔ جواب دینے والوں میں میرے سوا دو الجزائری مسلمان تھے اور ایک سوڈان کے اور ایک ایران کے عالم۔ سوالات اطالوی زبان میں کئے گئے۔ جن کا ترجمہ ایک مسیحی پادری نے عربی زبان میں کیا۔ سوالات زیادہ تر مسلم۔ مسیحی تعلقات کے بارہ میں تھے۔

پریس کانفرنس میں روم کے ایک اخباری نمائندہ نے سوال کیا کہ مسیحی لوگوں نے روم میں مسجد بنانے کی اجازت دے دی۔ پھر مسلمان مسیحیوں کو کیوں مدینہ میں چرچ بنانے کی اجازت نہیں دیتے۔

الجزائر کے دکتور محمد السلیمانی نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہم اپنی مذہبی تعلیمات کی بنا پر ایسا کرتے ہیں۔ اگر آپ کی انجیل میں یہ لکھا ہو کہ روم میں کسی غیر مذہب کا عبادت خانہ بنانے کی اجازت نہ دی جائے تو میں مسلمانوں سے کہوں گا کہ وہ انجیل کے اس حکم کا احترام کریں اور روم میں ہرگز مسجد بنانے کی کوشش نہ کریں۔ ہندستان میں اس طرح کے جواب پر مزید سوالات کا طوفان کھڑا ہو جائے گا۔ مگر یہاں سب کے سب اخبار نویس جواب کو سن کر چپ ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے دوسرا سوال شروع کر دیا۔

ایک اخبار نویس نے سوال کیا کہ مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان ڈائیلاگ کی کامیابی کے بارہ میں آپ کیا کہتے ہیں۔ کیوں کہ آپس کے اختلافات کی وجہ سے یہ کوشش آگے نہیں بڑھ رہی ہے۔ پھر ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ میں نے کہا کہ ایک جملہ میں اس کا جواب یہ ہے کہ اختلاف کو نظر انداز کیجئے اور اتحاد کے گوشوں کی تلاش جاری رکھئے:

I will give the answer in a single sentence: avoid the differences and continue the dialogue to seek the points of agreement.

۹ اکتوبر کو شام کی نشست کا عنوان تھا: مذہب اور کلچر (Religion and Culture) بحیثیت چیئرمین میں نے مختصر تقریر کی۔ اس کے بعد مذکورہ موضوع پر لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

یہاں کے اجتماعات میں عورت اور مرد کثیر تعداد میں جمع ہوتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک پڑھا لکھا ہوتا تھا۔ مگر میں نے کسی بھی اجتماع میں غیر ضروری سوال وجواب کا وہ انداز نہیں دیکھا جو ہندستان جیسے ملکوں میں عام ہے۔ یہاں تمام لوگ ذوق وشوق کے ساتھ اسٹیج کی تقریروں کو سنتے اور اس کے بعد یہ اصرار نہیں کرتے تھے کہ ہم کو ہر قسم کے سوال کرنے کا موقع دو۔

ہوٹل کے کمرہ میں حسب معمول گیڈینز (The Gideons International) کی طرف سے ہدیہ کی ہوئی بائبل بھی موجود تھی۔ ۱۸۹۸ میں امریکہ کے دو مسافروں نے طے کیا کہ وہ تمام دنیا کے ہوٹل، اسپتال وغیرہ میں بائبل (انجیل) کے نسخے مختلف زبانوں میں چھاپ کر فراہم کریں گے۔ اس وقت سے آج تک یہ کام جاری ہے۔ اس طرح عالمی پیمانے پر تمام دنیا میں مسیحیت کا پیغام پہنچایا جارہا

ہے۔ ۱۳۰ ملکوں میں اس کی شاخیں موجود ہیں۔

موجودہ نسخہ تین زبانوں (اطالوی، فرانسیسی، انگریزی) میں تھا۔ دیباچہ میں انجیل کو خدا کی حیرت ناک کتاب (Wonderful Book of God) بتایا گیا تھا۔ اس میں درج تھا کہ گیڈینز بنیادی طور پر چرچ کا ایک غیر فرقہ وارانہ تبلیغی بازو ہیں۔ وہ خدا کے کلام کے قیمتی بیج کو تمام دنیا کی زمینوں میں بو رہے ہیں:

The Gideons are essentially a nonsectarian missionary arm of the church, sowing the precious Seed, the Word of God, in the field of the World.

مسلمان اپنی تقریروں اور تحریروں میں فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ مسیح کا پیغام صرف بنی اسرائیل کے لئے تھا اور اسلام کا پیغام ساری دنیا کے لئے ہے۔ مگر آج صورت حال یہ ہے کہ مسیحیت کو اس کے ماننے والوں نے ایک عالمی تبلیغی مذہب بنا دیا ہے۔ اور مسلمان کوئی ایک یا دوسری وجہ بتا کر اسلام کو عملاً صرف مسلمانوں کے لئے خاص کئے ہوئے ہیں۔ دعوت عام کا شعور مسلمانوں کے اکابر تک میں موجود نہیں۔

۸ اکتوبر کو دن کا ابتدائی نصف حصہ خالی تھا۔ ہم لوگ دو گاڑیوں پر مالٹا کا قدیم شہر دیکھنے کے لئے روانہ ہوئے۔ ہمارے ساتھ رہنما کے طور پر ڈاکٹر پنزا (Giancarlo Penza) موجود تھے۔ مالٹا کا قدیم شہر عربوں نے بسایا تھا۔ یہ آج بھی مدینہ (Mdina) کے نام سے مشہور ہے۔ وہاں کئی چیزیں دیکھیں۔

یہاں قدیم اشیاء کا ایک میوزیم ہے۔ اس میں بہت سی یادگار چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ ایک ممتاز آرٹ ورک وہ ہے جس میں حضرت مسیح کو نعوذ باللہ سولی پر مردہ حالت میں دکھایا گیا ہے۔ صلیب کی شکل کی ایک لکڑی ہے۔ اس پر ایک دبلا اور ننگا انسان اس طرح بنایا گیا ہے کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں میں کیلیں ٹھونکی ہوئی ہیں۔ جگہ جگہ سے خون بہہ رہا ہے۔ اس کا جسم مردہ کے انداز میں لٹک گیا ہے۔

واقعہ کے اعتبار سے اگرچہ وہ سراسر بے بنیاد ہے مگر خالص فنی اعتبار سے وہ نہایت کامیاب ہے۔

اس کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اس دنیا میں یہ بھی ممکن ہے کہ ایک سراسر خلاف واقعہ بات کو تصویر یا الفاظ میں اس طرح ظاہر کیا جائے کہ عام انسان کو وہ بالکل حقیقی واقعہ نظر آنے لگے۔

مدینہ کے راستوں میں چلتے ہوئے ایک گلی کے کنارے ایک بورڈ لگا ہوا نظر آیا۔ اس پر لکھا ہوا تھا (Tariq Mesquita) یعنی مسجد کا راستہ یا مسجد اسٹریٹ۔ اس گلی میں کافی تلاش کے باوجود کوئی مسجد نظر نہیں آئی، غالباً قدیم زمانہ میں یہاں کوئی مسجد تھی جس کے نام پر یہ گلی مسجد والی گلی مشہور ہوگئی۔ مگر اب وہ مسجد کسی مکان کا حصہ بن چکی ہے۔ اگرچہ گلی کا نام اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔

میرے ساتھی دکتور محمد السلیمانی الجزائری نے مالٹا کی ان چیزوں کو دیکھ کر کہا کہ طمسوا کل شیئ۔ یعنی مسیحیوں نے یہاں غلبہ پانے کے بعد تمام مسلم آثار کو مٹا دیا۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ طمسنا کل شئ یعنی ہم نے خود اپنی غفلت سے لوگوں کو یہ موقع دیا کہ وہ ہماری تمام چیزوں کو مٹا دیں۔

راستہ میں ہمارے ڈرائیور نے ایک جگہ بتایا کہ اس درخت کو مسیحی لوگ "شجرہ صلیب" کہتے ہیں۔ یعنی صلیبی درخت۔ کیوں کہ وہ بالکل صلیب کی شکل کا ہے۔ ہم نے اتر کر اس درخت کو بہت غور سے دیکھا۔ مگر ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس قسم کے توہمات ہر قوم میں پائے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ خود مسلمانوں میں بھی۔

اس کے بعد ہم ایک بڑی عمارت کے سامنے پہنچے۔ اس پر وار میوزیم کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس میں پہلی اور دوسری عالمی جنگ کے زمانہ کی بہت سی یادگار چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ کچھ حقیقی اور کچھ تصویر کی صورت میں۔ ایک جگہ یہاں کے گول چرچ کی تصویر تھی۔ اس کے پاس قدیم طرز کے ایک بم کی تصویر تھی جس کے پاس بہت سے لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ تختی پر لکھا ہوا تھا کہ دوسری عالمی جنگ میں ۹ اپریل ۱۹۴۲ کو جرمنی نے یہ بم گول چرچ پر گرایا مگر وہ بم پھٹ نہ سکا:

During an air attack on 9th April 1942, a 500 Lb. bomb hit the Mosta Rotunda. It pierced the dome, bounced off the interior wall twice and skidded across the whole length of the Church without exploding. None of the congregation numbering over 300 was injured.

یہ دعوتی شعور کی کمی ہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ مولانا محمود حسن صاحب جس زمانہ میں مالٹا میں نظر بند تھے۔ ان کے نگرانی عملہ کا انگریز افسر ان سے متاثر ہوگیا۔ کیوں کہ ان کے مشرقی انداز میں اس کو روحانی شخصیت کا حلیہ نظر آیا۔ یہ بہترین موقع تھا کہ اس انگریز کو اسلام کے قریب لایا جائے۔ مگر مولانا محمود حسن صاحب نے اس سے خلافت کے معاملہ میں انگریزوں کے ناروا سلوک پر بحث چھیڑ دی جو ایک سیاسی اور اختلافی موضوع تھا۔ چنانچہ وہ انگریز مزید اسلام سے قریب نہ ہوسکا۔

مالٹا میں مولانا محمود حسن کے تین ساتھیوں میں سے ایک مولانا وحید احمد مدنی تھے۔ وہ ہندستان سے ہجرت کرکے عرب چلے گئے تھے۔ وہاں مولانا محمود حسن صاحب سے وابستہ ہوگئے اور پھر ان کے ساتھ گرفتار ہو کر مالٹا چلے گئے۔ مولانا موصوف کے صاحبزادے ڈاکٹر رشید الوحیدی دہلی میں ہیں اور مولانا فرید الوحیدی جدہ میں مقیم ہیں۔ مولانا وحید احمد مدنی کا حافظہ نہایت قوی تھا۔ مختلف لوگوں سے تعلقات کے دوران انھوں نے کئی زبانیں سیکھ لیں —— عربی، اردو، فارسی، انگریزی، ترکی، فرانسیسی، پشتو، بنگلہ وغیرہ۔ اگر ان کے اندر دعوتی اسپرٹ پیدا کی جاتی تو وہ کامیاب داعی بن سکتے تھے۔ مگر ان کی لیاقت غیر استعمال شدہ رہی۔ یہاں تک کہ دسمبر ۱۹۳۸ میں ۵۴ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔

مالٹا کے مختلف حصوں میں مجھ کو بار بار جانے کا اتفاق ہوا۔ مگر ایک بار بھی کہیں گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی نہیں دی۔ جب کہ ہندستان کے شہروں میں ہارن کا شور عام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہارن بجانا صرف ذہنی ڈسپلن کی کمی کا ثبوت ہے۔ حقیقی ضرورت سے اس کا تعلق بہت ہی کم ہے۔

اسی طرح مالٹا میں فٹ پاتھ کی دکانداری، سڑکوں کی گندگی، لاؤڈ اسپیکر کے ہنگامے، آپس کے لڑائی جھگڑے جیسی چیزیں کہیں نظر نہیں آئیں۔ انڈیا کا زمینی رقبہ ۱۲۶۹۴۲۰ مربع میل ہے، اور مالٹا کا رقبہ صرف ۱۲۲ مربع میل۔ انڈیا کے مقابلہ میں اس کے ذرائع تقریباً صفر کے بقدر ہیں۔ مگر مالٹا آج کی ترقی یافتہ دنیا کا ایک حصہ نظر آتا ہے۔ جب کہ انڈیا ہر اعتبار سے ترقی یافتہ دنیا سے پیچھے ہے۔ حتی کہ مذہب اور اخلاق کے اعتبار سے بھی۔

انڈیا میں مقابلتہً نہ مادی ترقی نظر آتی اور نہ مذہبی ترقی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہاں مذہب کی بنیاد فرقہ وارانہ نفرت پر رکھی گئی اور قومی ترقی کی بنیاد سوشلزم کے غیر فطری اصول پر اور دونوں ہی چیزیں صرف فساد پیدا کرنے والی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی چیز اصلاح کرنے والی نہیں۔

جدید دنیا کے دوسرے شہروں کی مانند، مالٹا میں بھی گھر کی عورتیں باہر نکل آئی ہیں۔ مزید یہ کہ ہر عورت کی ٹانگیں کھلی ہوتی ہیں۔ ان حالات میں صرف غض بصر کافی نہیں، بلکہ اسی کے ساتھ اعراض بصر کے اصول پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ عورت کی ٹانگ کا کھلا ہونا بلاشبہ ایک وحشت خیز منظر ہے۔ مگر جدید دنیا کے تمام مقامات پر اب یہ چیز بالکل عام ہو چکی ہے۔

پچھلے مہینہ میں لاہور گیا تھا۔ وہاں کوئی ایک عورت بھی کھلی ٹانگوں والی نظر نہیں آئی۔ اب روم اور مالٹا آیا تو یہاں ہر عورت اسی وحشت ناک حلیہ میں ہر طرف چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ اس فرق پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ تنزل کے باوجود اب بھی مسلمانوں کی زندگی میں ایسے بہت سے ممتاز پہلو ہیں جو غیر مسلم دنیا کو اسلام کی طرف متوجہ کر سکتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ عام مفروضہ کے برعکس، یہ نہیں ہے کہ لوگ مسلمانوں کی بے عملی کی بنا پر اسلام سے متاثر نہیں ہوتے۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ ساری دنیا میں مسلمانوں کے رہنما اسلام کے نام پر غیر مسلموں سے لفظی یا عملی لڑائی لڑنے میں مشغول ہیں۔ اس بے فائدہ لڑائی نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ضد اور نفرت کی فضا پیدا کر دی ہے۔ یہی ضد اور نفرت کی فضا اسلامی دعوت کی راہ میں رکاوٹ ہے نہ کہ مسلمانوں کی اخلاقی کمزوری۔ اگر

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان قومی نفرت کی فضا ختم ہو جائے تو مسلمانوں کی موجودہ حالت کے باوجود اسلام تیزی سے ان کے درمیان پھیلنے لگے۔

موجودہ زمانہ میں مسیحی چرچ بہت بڑے پیمانے پر یہ کوشش کر رہا ہے کہ مسلمانوں اور مسیحی اقوام کے درمیان عداوت کی فضا ختم ہو جائے اور صلح و آشتی کی فضا قائم ہو جائے۔ موجودہ کانفرنس بھی اسی نوعیت کی ایک کوشش تھی۔ بہت سے مسلمان اس کو "مسیحی سازش" کہہ کر اس کو متوحش نظروں سے دیکھتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر ایسا ہو جائے تو یہ دور جدید کی صلح حدیبیہ ہوگی جو بالآخر "فتح مبین" کا دروازہ کھولنے کا ذریعہ بن جائے گی۔

یہاں محکمۂ سیاحت کی طرف سے ہم کو تعارفی پمفلٹ اور کاغذات دئے گئے تھے۔ یہ سب نہایت خوبصورت چھپے ہوئے تھے۔ اکثر کتابچوں کے صفحہ اول پر کسی نہ کسی گرجا یا مسیحی یادگار کی نمایاں تصویر دی گئی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے خیال آیا کہ اسی مالٹا میں مسلم عمارتیں بھی ہیں، مگر ان کتابچوں میں ان کا کوئی ذکر نہیں۔ پھر میں نے سوچا کہ یہ این گناہ است کہ در شہر شما نیز کنند کا معاملہ ہے۔ مالٹا کے بارہ میں ترک اگر کوئی پمفلٹ چھاپیں تو وہ اپنے دور کی مسجد کی تصویر صفحہ اول پر دیں گے۔ اسی طرح لیبیا والے اگر کوئی تعارفی پمفلٹ تیار کریں تو اس کے صفحہ اول پر لیبیا کے تعمیر کردہ اسلامی مرکز کی تصویر چھپی ہوئی ہوگی۔

یہی تمام مسلمانوں کا حال ہے۔ ہندستان میں ہر ادارہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں سارا نقشہ اس طرح پیش کرتا ہے جیسے کہ وہی نظام عالم کی کلید ہے۔ اسی کے گرد کائنات کا کارخانہ گردش کر رہا ہے۔ ایسی حالت میں دوسروں سے اس معاملہ کی شکایت کرنا غلطی پر سرکشی کا اضافہ ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

مالٹا ایک خوبصورت مقام ہے۔ اس کو سیاحوں کی جنت کہا جاتا ہے۔ ہم کو روزانہ بار بار شہر کے مختلف حصوں میں جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ مگر بے شمار گاڑیوں کے باوجود یہاں کی فضا میں کثافت بہت کم تھی۔ صفائی کا غیر معمولی اہتمام تھا۔ سڑکوں پر کہیں بھی کوئی چیز پڑی ہوئی نظر نہیں آئی۔ فٹ پاتھ کی بھیڑ اور گندگی کا نشان بھی کہیں موجود نہ تھا۔ قاعدہ اور قانون کی خلاف ورزی کا یہاں مزاج نہیں۔ ہر آدمی اپنی حد کے اندر رہ کر اپنے کام میں مشغول رہتا ہے۔ میں نے ایک بار ایک مالی کو دیکھا۔ وہ ہوٹل کے

لان کی گھاس دستی مشین کے ذریعہ کاٹ رہا تھا۔ وہ اپنے کام میں اس قدر مشغول اور منہمک تھا جیسے کہ اس کو اس کے سوا اور کسی چیز کی خبر ہی نہیں۔ جب کہ ہندستان کے "مالی" کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اس کو سب سے زیادہ دلچسپی دوسرے کام سے ہوتی ہے اور سب سے کم دلچسپی اپنی ڈیوٹی والے کام سے۔

۱۱ اکتوبر کو ہم مالٹا کے ایک قدیم چرچ میں داخل ہوئے۔ یہ صبح نو بجے کا وقت تھا۔ اس وقت چرچ کے اندر سروس (عبادت) ہو رہی تھی۔ گیٹ کے پاس نوٹس بورڈ پر جلی حرفوں میں یہ الفاظ: WAQT IL-QUDDIES لکھے ہوئے تھے۔ غالباً اس کا مطلب وقت القدیس تھا۔

چرچ کے ہال میں چاروں طرف مجسمے لگے ہوئے تھے۔ ان میں دوسرے مسیحی پیشواؤں کے علاوہ مریم اور مسیح کا بھی مجسمہ تھا۔ اسٹیج کے مقام پر چند پادری کچھ پڑھ رہے تھے اور بار بار جھک کر اپنا سر میز پر رکھتے تھے۔ حاضرین سامنے کی بنچوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

اس کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ مسیحی عبادت (اور اسی طرح دوسرے مذاہب) کی عبادت کا طریقہ انسان کی روح کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ انسان عین فطرت کے اعتبار سے یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے خالق کے آگے پوری طرح ڈال دے۔ اور ان طریقوں میں انسان سرف جزئی طور پر اپنے آپ کو اپنے خالق کے سامنے پیش کرتا ہے، وہ پوری طرح اپنے آپ کو خدا کے حوالے نہیں کر پاتا۔

۱۰ اکتوبر کو شام کے کھانے کے لئے ہم لوگوں کو ایک مقام پر پہنچایا گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ "بشپ پیلس" ہے۔ یہ بہت بڑا محل کی مانند ایک مکان تھا۔ تاہم وہ بالکل سادہ تھا۔ یہ یہاں کے بشپ کی قیام گاہ ہے۔ یہاں لوگوں نے مالٹا کے مخصوص انداز میں کھانا کھایا۔ ملاقاتیں کیں اور پھر واپسی ہوئی۔

مالٹا کے انگریزی اخبار دی ٹائمس (۸ اکتوبر ۱۹۹۱) میں یہ خبر تھی کہ یہاں کے سابق پولیس کمشنر کمنڈیٹور بنسینی (commedatore Algred J. Bencini) کا ۷۴ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ وہ ۱۹۳۹ میں مالٹا پولیس فورس میں شامل ہوئے تھے۔

کمنڈیٹور بنسینی نے اپنی خود نوشت سوانح عمری لکھی ہے جو ۔۔۔ سچائی کے سوا اور کچھ نہیں

(Nothing But the Truth) کے نام سے چھپی ہے۔ انھوں نے ۱۹۷۳ میں ریٹائرمنٹ لے لیا تھا۔ وہ اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ پانچ مہینہ تک انتظام میں وزیر اعظم کی غیر قانونی مداخلت کے بعد میں پنشن لے کر ملازمت سے الگ ہو گیا تھا:

... he had retired on pension in January 1973 after five months on protest leave against Prime Minister Dona Mintoff's illegal interference in the internal administration of the force.

کسی نظام میں جب آدمی کی پوزیشن وہ ہو جائے جو مسٹر بنسینی کی ہو گئی تھی تو اس وقت مسئلہ خارجی نظام کا نہیں رہتا بلکہ خود اپنے ضمیر کا ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اپنے آپ کو بچانے کی تدبیر کرنا چاہئے۔ اس کے بعد نہ مصالحت درست ہے اور نہ بے فائدہ طور پر نظام سے ٹکرانا۔

۱۱ اکتوبر کی صبح کو مالٹا سے میری واپسی تھی۔ اپنے کمرہ میں فجر کی نماز کے لئے کھڑا ہوا تو ایسا محسوس ہوا گویا میں حدیث کے الفاظ میں "صلاۃ مودع" پڑھ رہا ہوں۔ گویا کہ آج کا دن مالٹا سے نہیں بلکہ خود دنیا سے میری روانگی کا دن ہے جہاں خالق کائنات نے مجھ کو ایک مدت کے لئے بھیجا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ آخری روانگی کا دن میرے لئے آج مقدر ہے یا آج کے بعد۔ تاہم اس وقت کو آنا ہے اور وہ ضرور آکر رہے گا۔ اس کے بعد کس کے ساتھ کیسا معاملہ کیا جائے گا، یہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: واللہ لا ادری واللہ لا ادری واللہ لا ادری وانا رسول اللہ ما یفعل بی ولا بکم۔

"آخری لمحات" کے احساس کے تحت کلمۂ شہادت میری زبان پر آگیا۔ میں نے کہا: اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمداً عبدہ ورسولہ۔ اس کلمہ کو ادا کرتے ہوئے مزید یہ احساس ابھرا کہ بہت سے نادان لوگ اس کلمہ کو کلمۂ فخر سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ درحقیقت وہ کلمۂ عجز ہے۔ یہ خدا کی خدائی یا رسول کی رسالت کا صرف اقرار نہیں بلکہ اس کے مقابلہ میں اپنی حیثیت واقعی کا اعتراف بھی ہے۔ گویا ایک بندہ جب اس کلمہ کو اپنی زبان سے ادا کرتا ہے تو وہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ خدا یا تو خدا ہے، میں خدا نہیں ہوں۔ اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں، مجھے رسول کی حیثیت حاصل نہیں۔ توحید و رسالت کے اقرار کے ساتھ اپنی عبدیت کا یہ اعتراف جب تک اس میں شامل

نہ ہو اس کو پورے معنوں میں کلمۂ شہادت کی ادائگی نہیں کہا جاسکتا۔

۱۱ اکتوبر کی دوپہر کو ہم واپس ہوکر دوبارہ مالٹا ایرپورٹ پہنچے۔ یہاں کچھ وقت وی آئی پی لاؤنج میں گزرا۔ ضروری اندراجات کا سارا کام ہمارے میزبان نے کیا۔ ساڑھے بارہ بجے ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے لئے نکلا۔ یہ ایرمالٹا کی فلائٹ (KM 220) تھی۔ جہاز کے دروازہ پر پہنچا تو وہاں دروازہ کے کنارے حسب ذیل دو لفظ لکھے ہوئے تھے۔ (Iftah/Open) ہوائی جہاز کے اسٹاف کے ایک آدمی سے میں نے پوچھا کہ "افتح" کیا مالٹی زبان ہے۔ اس نے کہا ہاں۔ پھر اس نے کہا کہ مالٹی زبان بہت زیادہ عربی زبان سے مشابہ ہے:

Malti language is very similar to Arabic language.

جہاز کے مسافروں میں زیادہ تعداد سیاحوں کی تھی۔ مالٹا میں سیاح بڑی تعداد میں آتے ہیں۔ مالٹا کی آمدنی کا خاص ذریعہ سیاحت ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندستان کو سیاحت انڈسٹری کا بہت کم حصہ ملتا ہے۔ اس کی دو خاص وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ سیاح یہاں اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرتا ہے۔ مختلف قسم کی پرتشدد تحریکوں نے سیاح کو ہندستان کی طرف سے متوحش بنا دیا ہے۔

دوسری اس سے بھی زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ ہندستان کا نظام سیاحوں کے لئے اسی طرح غیر ہمدرد ہوتا ہے جس طرح وہ عام ہندستانیوں کے لئے غیر ہمدرد ہے۔ سیاح اکثر ہندستان سے تلخ دفتری اور انتظامی تجربات لے کر واپس لوٹتے ہیں۔ جہاز کے اندر ایرمالٹا کی فلائٹ میگزین (Melta) کے شمارہ اکتوبر ۱۹۹۱ میں ایک مضمون مالٹا میں ٹیلی کارڈ کو رائج کرنے کے بارہ میں تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ فائر، پولیس اور ایمبولنس جیسے ایمرجنسی نمبروں کو ڈائل کرنے کے لئے کوئی رقم ادا کرنے کی ضرورت نہیں:

One does not need to insert a card to dial the emergency numbers

مذکورہ مضمون میں بتایا گیا تھا کہ مالٹا میں سیاحوں کے لئے بہت سی رعایتیں ہیں۔ مذکورہ رعایت ان میں سے صرف ایک ہے۔

ہمارا جہاز ۳۳ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتا ہوا مالٹا سے قاہرہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں ہم جزیرہ کریٹ (Crete) سے گزرے۔ کریٹ کو دیکھ کر ماضی کی بہت سی یادیں تازہ ہو گئیں۔

عرب ۸۲۴ء میں کریٹ کے ساحل پر اتر چکے تھے اور انھوں نے اس کے ایک حصہ پر اپنا اقتدار قائم کرلیا تھا۔ ۱۶۶۹ میں ترکوں نے پورے کریٹ کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ میڈیٹرینین کا یہ جزیرہ ایک عرصہ تک ترکوں کی یورپ میں پیش قدمی کے لئے ان کا بحری اڈہ بنا رہا۔ ۱۸۹۸ میں ترکوں کو کریٹ چھوڑ دینا پڑا۔ (5/253)

میں نے سوچا کہ "کریٹ" ایک اعتبار سے مسلم تاریخ کا ایک صفحہ ہے، ایک ایسی تاریخ جو اب گزر چکی۔ اگر میں صرف اس تاریخ کو یاد کروں تو اس سے مجھے حسرت اور افسوس کے سوا کچھ اور ملنے والا نہیں۔ مگر دوسرے اعتبار سے "کریٹ" ایک جزیرہ ہے جو میڈیٹرینین کے درمیان ابھرا ہوا ہے۔ وہ قدرت کا ایک نشان ہے جو بتاتا ہے کہ کس طرح خدا نے وسیع سمندروں میں جگہ جگہ خشکی کے مقامات پیدا کر دئے ہیں جہاں انسان اپنی زندگی کی تعمیر کر سکے۔ "کریٹ" کو اگر میں اس دوسرے پہلو سے دیکھوں تو آج بھی وہ مجھ کو اپنا نظر آئے گا۔ کیوں کہ وہ مجھ کو عظیم ربانی خوراک دینے کا ذریعہ بن رہا ہے۔

ہم نے ایر مالٹا کے جس جہاز سے سفر کیا، اسی سے مالٹا کے پرائم منسٹر ایڈورڈ فرنچ ادامی (Edward French-Adami)، بھی سفر کر رہے تھے۔ مگر جہاز میں پرائم منسٹر کے لئے کوئی اہتمام نہ تھا۔ نہ سیکورٹی کا کوئی آدمی دکھائی دیا۔ انڈیا کا پرائم منسٹر اولاً تو عام جہاز (کمرشیل فلائٹ) میں سفر نہیں کرے گا۔ اور اگر بالفرض وہ ایسا کرے تو جہاز میں اس کے لئے اتنی دھوم ہوگی کہ ہر آدمی محسوس کرے گا کہ پرائم منسٹر صاحب اس جہاز میں سفر کر رہے ہیں۔ ہندستان میں "پرائم منسٹر" کے لئے کچھ اور ہے اور عوام کے لئے کچھ اور۔ اس کے برعکس مالٹا میں جو عوام کے لئے ہے وہی پرائم منسٹر کے لئے بھی ہے۔ پرائم منسٹر کو انتظامی اختیارات یقیناً عوام سے زیادہ حاصل ہیں۔ مگر حقوق اور احترام میں دونوں کے درمیان کوئی امتیازی فرق نہیں۔

جہاز میں میرے قریب کی سیٹ پر مصر کے ایک عیسائی جارج اناوتی (George Anavati) تھے۔ وہ اسکندریہ میں پیدا ہوئے۔ وہ ۵۰ سال سے قاہرہ میں رہتے ہیں۔ ان سے مصر کے عیسائیوں کے بارہ میں بات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ مصر میں ۱۰ فیصد مسیحی ہیں۔ میں نے پوچھا کہ مسیحیوں کا کلچر اور مسلمانوں کا کلچر ایک ہے یا دو ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا مذہب اور ان کا مذہب تو الگ الگ ہے۔ باقی کلچر دونوں کا ایک ہے۔ کلچر کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ میں نے ان کی عمر پوچھی۔

انھوں نے بتایا کہ ۸۶ سال۔ میں نے کہا کہ آپ خوش قسمت ہیں کہ ۸۶ سال میں اتنی اچھی حالت میں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ الحمدللہ۔

سماجی تعلقات کے سلسلہ میں اس کی بے حد اہمیت ہے۔ دو مسلم گروہ بھی اگر کلچر میں ایک دوسرے سے مختلف ہوں تو ان کے درمیان معتدل تعلقات مشکل ہو جائیں گے۔ اس کی مثال سابق پاکستان میں بنگالی اور پنجابی تعلقات اور موجودہ پاکستان میں سندھی اور مہاجر تعلقات میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ہندستان کے مسلمان چاہتے ہیں کہ وہ اکثریتی فرقہ سے الگ اپنا کلچرل تشخص قائم کریں۔ اصولاً یہ کوئی غلط بات نہیں۔ مگر ہم کو جاننا چاہئے کہ ہر چیز کی ایک قیمت ہے اور کسی مشترک سماج میں علیٰحدہ تشخص قائم کرنے کی بھی ایک قیمت ہے۔ اس دنیا میں قیمت دئے بغیر کوئی چیز کسی کو نہیں ملتی۔ سندھ کے مہاجرین نے اپنا علیٰحدہ گروہی تشخص قائم کرنا چاہا مگر وہ اس کی قیمت دینے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ اس کا جو نتیجہ ہوا وہ ہر ایک کو معلوم ہے۔

جو سوال میں نے جارج انا داتی سے پوچھا تھا، وہی سوال میں نے قاہرہ میں محمد کمال صاحب سے کیا۔ میں نے پوچھا کہ کیا یہاں کلچر کے اعتبار سے مسلمان اور مسیحی میں فرق ہے۔ اگر ہم ایک مسیحی سے سڑک پر ملیں اور اس سے بات کریں یا اس کے ساتھ چل کر اس کے گھر میں داخل ہوں تو کیا ہم اس کی زبان اور رہائش میں اور مسلمان مصری کی زبان اور رہائش میں فرق محسوس کریں گے۔

انھوں نے کہا کہ نہیں، کوئی فرق نہیں۔ سوا اس کے کہ ہم مسجد میں جاتے ہیں اور وہ چرچ میں جاتے ہیں۔ اس کے سوا دونوں میں کوئی فرق نہیں (لیس هناك ایّ فرق)

کولمبس ایک اطالوی ملاح تھا جس نے مشہور روایت کے مطابق امریکہ کو دریافت کیا۔ اس کی کشتیوں کا بیڑا ۱۲ اکتوبر ۱۴۹۲ کو امریکہ (Bahamas) کے ساحل پر پہنچا تھا۔ اس اعتبار سے اس واقعہ پر اب پانچ سو سال گزر چکے ہیں۔

الیتالیا کے اشاعتی شعبہ نے اس مناسبت سے ۱۳۰ صفحات کا خصوصی نمبر شائع کیا ہے۔ اس میں کولمبس کو عالمی اطالوی (Universal Italian) کا لقب دیا گیا ہے۔ ایک مضمون (The Dawn of Modern Age) کے تحت بتایا گیا ہے کہ ۵۰۰ سال پہلے کولمبس کی دریافت امریکہ کے ذریعہ ایک نئے جغرافی، علمی، اخلاقی اور افق کا راستہ کھولا گیا:

5000 years ago the way was opened to new geographic, scientific, ethical and juridical horizons (p.10)

خالص تاریخی اعتبار سے اصل حقیقت یہ ہے کہ دور جدید کی صبح اسلام کے ظہور کے وقت چودہ سو سال پہلے طلوع ہوئی۔ یہ در اصل توحید پر مبنی اسلامی انقلاب تھا جس نے انسان کے اوپر تمام جدید ترقیوں کے دروازے کھولے (تفصیل کے لئے: اسلام دور جدید کا خالق)

ایک مسلمان پروفیسر سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے عربوں کے بارہ میں یہ شکایت کی کہ وہ یورپ اور امریکہ کے سفید فام لوگوں سے بہت مرعوب ہیں۔ یہاں کی ایک اصطلاح ہے جس کو عُقدۃ الخَوَاجۃ (White man Complex) کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ اس مرعوبیت کو بتاتا ہے جو موجودہ عربوں کو سفید فام امریکیوں یا یوروپینوں کے بارہ میں ان کے اندر ہے۔ ایئر پورٹ پر سفید فام امریکی کو "ویلکم" کے ساتھ مسکراہٹ ملے گی۔ مگر ہندستانی، پاکستانی یا بنگلہ دیشی مسلمان کا استقبال صرف خشک دفتریت سے کیا جائے گا۔ یہی فرق ہر سطح پر پایا جاتا ہے۔ حتی کہ تنخواہوں میں بھی دونوں طبقوں کے درمیان واضح امتیاز موجود ہے۔

تاہم مجھے ذاتی طور پر اس کی شکایت نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کا تفریقی سلوک حقیقۃً سفید فام یا سیاہ فام کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ بلکہ قومی امیج کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ "سفید فام امریکی" نے اپنے تین سو سالہ عمل سے اپنی ایک اعلیٰ عمومی امیج بنائی ہے۔ بدقسمتی سے ایشیائی اور افریقی مسلمان اپنے حق میں اس قسم کی امیج نہ بنا سکے۔ ایسی حالت میں ناممکن ہے کہ ہماری کوتاہی کی قیمت کوئی دوسرا ادا کرے۔

مادی اور ٹکنکل ترقیات کے علاوہ عام اصول حیات میں بھی ایشیائی اور افریقی مسلمان ان سفید فام قوموں سے پیچھے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ لوگ اپنا کام حد درجہ پلاننگ کے ساتھ کرتے ہیں، جب کہ ہمارے یہاں ابھی تک تصور کے درجہ میں بھی پلاننگ کا کوئی وجود نہیں۔ ایسی حالت میں اگر بین اقوامی سلوک میں دونوں کے درمیان فرق پایا جائے تو یہ عین مطابق حقیقت بات ہے۔ ہمیں چاہئے کہ خود اپنی کوتاہیوں کو دور کریں نہ کہ دوسروں کے خلاف احتجاج کرنے میں اپنا وقت ضائع کریں۔

قاہرہ کے ہوائی اڈہ پر جہاز اترا تو مسافروں نے تالیاں بجائیں۔ ہوائی جہاز جب فضا

میں بلند ہو کر اڑ رہا ہو تو اس میں حادثہ کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ زیادہ تر ہوائی حادثے ہوائی اڈہ سے اڑتے ہوئے یا ہوائی اڈہ پر اترتے ہوئے پیش آتے ہیں۔ اس لئے ہوائی جہاز کا محفوظ طور ہوائی اڈہ پر اتر جانا مسافروں کے لئے خصوصی اطمینان کا باعث ہوتا ہے۔

جہاز سے اتر کر ہوائی اڈہ کی عمارت کے سامنے پہنچا تو داخل ہونے کے دروازہ پر ایک بورڈ تھا اس پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد قرآن (یوسف ۹۹) کی یہ آیت روشن حروف میں لکھی ہوئی تھی : ادخلوا مصر ان شاء اللہ آمنین۔ اندر امیگریشن کی قطار میں کھڑا ہوا تھا۔ اتنے میں شیخ اسحاق ادریس مجھ کو دیکھ کر وہاں آ گئے۔ انھوں نے میرا اور میرے ساتھی کا پاسپورٹ لے کر اسٹاف کے ایک آدمی کو دیا اور ہم کو لے جا کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ضروری کارروائی مکمل ہو کر ہمارا پاسپورٹ واپس آ گیا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور دل سے دعا نکلی کہ کاش قیامت کے دن بھی اللہ تعالیٰ میرے ساتھ رحمت کا معاملہ فرمائے۔

ہوائی اڈہ کے باہر میرے میزبان محمد کمال مصری موجود تھے۔ ان کے ساتھ شہر کے لئے روانہ ہوا۔ گاڑی میں بیٹھا تو محمد کمال صاحب نے کہا : شرفتَ القاهرة یا مولانا۔ اس وقت میں ایک خیال میں گم تھا۔ میری زبان سے نکل گیا : نعم۔ ایک لمحہ کے بعد خیال آیا کہ میں نے بڑا غلط لفظ کہہ دیا۔ مجھے کہنا چاہئے تھا : بل القاهرة شرّفتني۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی کان سے نہیں سنتا، وہ دماغ سے سنتا ہے۔ آدمی کسی کی بات سنے یا کسی کی زبان سے کوئی کلمہ نکل جائے تو صرف لفظ کو نہیں دیکھنا چاہئے بلکہ حسن ظن سے کام لیتے ہوئے یہ دیکھنا چاہئے کہ اس سے اس کی واقعی مراد کیا ہے۔ اسی لئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ الذین یستمعون القول فیتبعون احسنه

قاہرہ کے در و دیوار گویا کتاب واقعات کے زندہ اوراق ہیں۔ یہاں کے ہر حصہ سے تاریخ کے واقعات وابستہ ہیں۔ ہم شہر کے لئے روانہ ہوئے تو میرے میزبان نے سڑک کے دونوں طرف کھڑی ہوئی عمارتوں کا تعارف کرانا شروع کیا ۔ یہاں انور سادات کو گولی ماری گئی۔ یہ صلاح الدین کا قلعہ ہے۔ یہ جامعۃ الازہر ہے۔ یہ فاطمیوں کے عہد کی یادگار ہے۔ وغیرہ۔ ایک لمحہ کے لئے ایسا محسوس ہوا گویا ہم سڑک پر نہیں چل رہے ہیں بلکہ تاریخ کے درمیان اپنا سفر طے کر رہے ہیں۔

شیخ اسحاق ادریس بھی ہمارے ساتھ آئے۔ ایک مقام پر پہنچ کر گاڑی رکی۔ یہ دس منزل

منزلہ مکان تھا جس کی آخری منزل پر موصوف کا قیام ہے۔ ہم گاڑی سے باہر آئے تو سامنے پھلوں کی دکان تھی جو مذکورہ مکان کی زمینی منزل پر واقع ہے۔ ہم لوگ کل چار آدمی تھے۔ دکاندار فوراً اپنی دکان سے اٹھے اور کیلے چھیل چھیل کر ہر ایک کو پیش کرنا شروع کیا۔ میں نے کہا کہ یہ عرب اخلاق کا پہلا نمونہ ہے جس کا تجربہ یہاں پہنچ کر ہم کو ہو رہا ہے۔ کچھ وقت شیخ اسحاق ادریس سوڈانی کے مکان پر گزارنے کے بعد وہاں سے روانہ ہوئے۔

رات کو عشاء کے وقت ہم اپنی قیام گاہ (زہرا ،حلوان) پہنچے۔ یہ دکتور عبدالحلیم عویس کا مکان ہے۔ انھیں کی دعوت اور اسرار پر مصر کا یہ سفر پیش آیا۔ وہ ریاض کی جامعۃ الامام میں علوم اجتماعی کے شعبہ میں استاد ہیں۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ابن خلدون ۱۳۸۲ء میں قاہرہ آیا تھا۔ اس وقت بحری راستہ کے ذریعہ تیونس سے اسکندریہ (مصر) پہنچنے میں ابن خلدون کو چالیس دن لگے۔ چند روز اسکندریہ ٹھہر کر وہ قاہرہ پہنچا۔ آج مواصلات کی ترقی نے سفر کی مدت کو کتنا زیادہ گھٹا دیا ہے۔ یہ مواصلاتی ترقیاں شاید اسی لئے ہیں کہ لوگوں کو اہل جنت کے سفروں کا تعارف کرایا جائے جو زمین و آسمان کی وسعتوں میں بلاخوف تیزرفتاری کے ساتھ جاری رہے گا (آل عمران ۱۳۳)

اگرچہ قاہرہ کی تاریخ پانچ ہزار سال تک جاتی ہے۔ مگر موجودہ شہر صحابی رسول عمرو بن العاص نے ۶۴۱ء میں بسایا۔ اس وقت اس کا نام الفسطاط تھا۔ اسی سال انھوں نے مصر کی پہلی مسجد اس شہر میں بنائی جو اب بھی مسجد عمرو بن العاص کے نام سے مشہور ہے۔ ۹۷۴ء میں شہر کی نئی تعمیر ہوئی۔ اس وقت سے اس کا نام القاہرہ ہے۔

۱۷۹۸ء میں جب نپولین قاہرہ میں داخل ہوا اس وقت شہر کی آبادی تین لاکھ (300,000) سے کم تھی۔ آج قاہرہ کی آبادی تقریباً ۸۰ لاکھ ہو چکی ہے۔

"دار الصحوۃ" کو تفصیل کے ساتھ دیکھنے کا موقع ملا۔ اس کو دکتور عبدالحلیم عویس (جامعۃ الامام ریاض) نے ۱۹۸۴ میں قاہرہ میں قائم کیا۔ اس کے موجودہ انچارج محمد کمال عبد رب النبی ہیں۔ محمد کمال صاحب میں واقعی کمال کے اوصاف ہیں۔ قاہرہ میں دکتور عبدالحلیم عویس اور محمد کمال عبد رب النبی کے خصوصی تعاون کی وجہ سے ہم کو بہت آسانی ہوئی۔

دارالصحوہ نے کثیر تعداد میں عربی کتابیں چھاپی ہیں۔ وہ قاہرہ کے بڑے نشریاتی اداروں میں سے ہے۔ اس کے تعارف نامہ میں لکھا ہوا ہے کہ دارالصحوہ صرف تجارتی دارالاشاعت کے طور پر قائم نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ اس کے سامنے ایک اسلامی نشانہ ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے اندر حقیقی دینی فہم پیدا کرے اور ان کو جدید چیلنج کا مقابلہ کرنے کے قابل بنائے۔

دارالصحوہ کا مقصد، اس کے تعارف نامہ کے مطابق، یہ ہے کہ اہل اسلام کو روحانی اور ثقافتی اعتبار سے بلند کرے۔ ان کے اندر اعلیٰ ترین فکری اور اخلاقی اوصاف پیدا کرے تاکہ وہ سنت اللہ کے مطابق عالمی قیادت کے مستحق بن سکیں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ عالمی قیادت کا منصب انھیں کو دیتا ہے جو فکری اور اخلاقی اور ثقافتی اعتبار سے بلند درجہ کو پہنچے ہوئے ہوں۔ دارالصحوہ کے انچارج جناب محمد کمال صاحب نے اپنے مکتبہ کی کئی کتابیں مجھے دیں۔ ان میں سے ایک شیخ شعراوی کی کتاب تھی۔

شیخ محمد متولی الشعراوی یہاں کے مشہور عالم ہیں۔ وہ زیادہ تر تقریریں کرتے ہیں۔ ان کی کچھ باتوں کا مجموعہ چھاپا گیا ہے۔ اس کو مرتب کرنے والے ابوالحسن عبدالرزاق ہیں۔ اس میں بہت سی نصیحت کی باتیں ہیں۔ ایک اقتباس میں انھوں نے کہا کہ ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور اپنے معاشرہ کو مجتمع اسلامی کہتے ہیں۔ مگر ہم اسلامی مجتمع نہیں۔ دراصل ہم اسلامی جغرافیہ ہیں (نحن فی الواقع لسنا مجتمعاً اسلامیا، نحن جغرافیۃ اسلامیۃ) صفحہ ۴۰

شیخ شعراوی کی یہ کتاب تمام تر خطابی انداز میں ہے۔ اس میں کسی بات کا گہرا تجزیہ مجھے نہیں ملا۔ مثال کے طور پر کتاب کے صفحہ ۳۰ پر ایک حدیث کو مختصراً نقل کیا گیا ہے۔ اس حدیث کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرب قیامت کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ ہے کہ ہر قبیلہ کے منافق اس کی سرداری کریں گے (من علامات الساعۃ ... ولیسود کل قبیلۃ منافقوھا) اس حدیث پر انھوں نے خطابی انداز کے کچھ جملے کہے ہیں مگر وہ اس کی کوئی گہری تشریح نہ کرسکے۔

اس حدیث کا پورا مطلب اس وقت سمجھ میں آتا ہے جب کہ اس کو قرآن سے ملا کر دیکھا جائے۔ قرآن میں منافقین کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ جب تم انھیں دیکھو تو ان کے جسم تم کو اچھے لگتے ہیں، اور اگر وہ بات کریں تو تم ان کی بات کو سنتے ہو (المنافقون ۴)

منافق حقیقۃً اس انسان کا نام ہے جو مصلحت پرست اور زمانہ ساز ہو۔ اس کی اس صفت کی بنا پر اس کے دنیوی معاملات درست رہتے ہیں ۔ اس کی زندگی خوش حالی کی زندگی ہوتی ہے۔ اس کی زندگی غم سے خالی ہوتی ہے۔ اس کے ان حالات کا اثر اس کے جسم پر پڑتا ہے۔ اس کا جسم پرکشش جسم بن جاتا ہے۔ اسی طرح اپنے مخصوص مزاج کی بنا پر وہ اس بحث میں نہیں پڑتا کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔ اصول کیا ہے اور بے اصولی کیا۔ تضاد والا کلام کیا ہے اور بے تضاد کلام کیا۔ اس کے بجائے وہ موقع کی رعایت کرکے بولتا ہے۔ اس بنا پر اس کا کلام ہر ایک کی پسند کا کلام بن جاتا ہے۔

منافقین کی یہ خصوصیت ہر دور میں ان کو عوام کا لیڈر بنائے رہی ہے ۔ قرب قیامت میں پریس اور اسٹیج کا دور آجانے کی وجہ سے منافقین کے یہ مواقع اور زیادہ بڑھ جائیں گے۔ اپنی مذکورہ صفات کے اظہار کے لئے وہ زیادہ وسیع مواقع پالیں گے اور نتیجۃً زیادہ بڑے پیمانے پر اپنے لئے قیادت کا مقام حاصل کرلیں گے۔

ایک مصری عالم نے گفت گو کے دوران کہا کہ یورپی اور امریکی ہی موجودہ زمانہ کے صلیبی ہیں (الصلیبیون الآن هم الاوربيون والامريكيون) انھوں نے شیخ محمد ابوزہرۃ کا قول دہرایا: ان کل حرب تقع بین اقلیم اسلامی ودولة اوروبية هي حرب صليبية (ہر جنگ جو کسی مسلم ملک اور کسی مغربی ملک کے درمیان ہوتی ہے وہ صلیبی جنگ ہے)

آج تقریباً پوری عرب دنیا کی سوچ یہی ہے ۔ مگر میرے نزدیک یہ سوچ صحیح نہیں ۔ یہی وہ خاص سوچ ہے جس نے مسلم دنیا کی نظر میں مغربی قوموں کو نفرت کا موضوع بنادیا ہے۔ حالاں کہ امت مسلمہ کی داعیانہ حیثیت کا تقاضا ہے کہ مغربی قومیں اس کے لئے شفقت و ہمدردی کا موضوع بنیں۔

ایک مجلس میں چند عرب لوگ تھے۔ ایک صاحب نے کہا کہ آپ جو مشن چلا رہے ہیں، اس سے مجھے اتفاق ہے ۔ مگر سوال یہ ہے کہ آپ کے بعد یہ مشن کس طرح جاری رہے گا۔ کیا آپ نے اپنے بعد کے لئے اپنے جیسا کوئی شخص تیار کیا ہے جو آپ کی جگہ لے سکے ۔ اس پر رابطہ عالم اسلامی کے شیخ ادریس نے کہا: وحيد الدين لا يكون الا وحيداً (وحید الدین صرف ایک ہی ہوتا ہے)

یہ کسی ایک شخص کی بات نہیں بلکہ ہر آدمی کی بات ہے ۔ ہر آدمی جو اس دنیا میں آتا ہے وہ ایک

منفرد شخصیت لے کر آتا ہے۔ جس طرح ہر آدمی کے انگوٹھہ کا نشان دوسروں سے الگ ہوتا ہے، اسی طرح ہر آدمی کی شخصیت بھی دوسروں سے الگ ہوتی ہے۔ کسی بھی آدمی کی تکرار اس دنیا میں ممکن نہیں۔

۱۲ اکتوبر کی سہ پہر کو ہم اہرام وغیرہ دیکھنے کے لئے نکلے۔ ایک مقام پر پہنچے تو ایک اونچی بلڈنگ کے اوپر آخری منزل پر ایک سفید اور کالا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس عمارت کے اوپر کے حصہ میں اسرائیل کا سفارت خانہ واقع ہے۔ پہلے یہ سفارت خانہ نیچے کی منزل پر تھا۔ مگر اس پر حملے ہوئے۔ اس کے بعد اس کو اوپر کی آخری منزل پر قائم کر دیا گیا۔ تاہم قاہرہ میں وہ یہاں کے سماج سے بالکل کٹ کر رہتے ہیں۔ یہاں کوئی ان سے ملنا پسند نہیں کرتا۔

پہلا اسرائیلی سفیر جب اپنی مدت پوری کرکے قاہرہ سے اسرائیل واپس گیا تو اس کی بیوی نے اسرائیلی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قاہرہ میں ہم کسی جیل کے اندر تھے۔ اب اس سے نکل کر آزاد دنیا میں آئے ہیں۔

قاہرہ کی مذکورہ بلڈنگ کے اوپر اسرائیل کا جھنڈا لہراتے ہوئے دیکھ کر خیال آیا کہ جس ملک میں ثورہ کے بعد اس کے اول حکمراں نے اسرائیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ سنرمیکم فی البحر (ہم تم کو سمندر میں پھینک دیں گے) عین اسی ملک میں اس حکمراں کے پہلے جانشین کے زمانہ میں خود اس کی اجازت سے یہ واقعہ پیش آیا کہ اسرائیل نے دارالسلطنت قاہرہ میں داخل ہو کر وہاں اپنا جھنڈا نصب کر دیا۔

حقیقتیں کبھی الفاظ سے نہیں بدلتیں بلکہ اس کے مطابق ضروری اسباب فراہم کرنے سے بدلتی ہیں۔ موجودہ زمانہ کے بیشتر قائدین کا یہ حال ہے کہ انھوں نے پرجوش الفاظ بولنے کو حقیقی عمل کا بدل سمجھ لیا ہے۔ مگر اس قسم کی خوش فہمی صرف خوش فہم آدمی کے ذہن میں جگہ پاتی ہے وہ زمین پر کبھی قائم نہیں ہوتی۔

جامعۃ القاہرہ، حدیقۃ الحیوانات اور دوسرے مقامات کو دیکھتے ہوئے ہمارا سفر طے ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ہم جیزہ کے اہرام تک پہنچ گئے۔ یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر تین اہرام واقع ہیں۔ کھلے میدان میں پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے بنے ہوئے اہرام اس طرح کھڑے ہوئے تھے جیسے مصر کی گزری ہوئی تاریخ اپنی تمام قدامت کے ساتھ اٹھ کر کھڑی ہوگئی ہو اور خاموش زبان

میں اپنا تعارف کرا رہی ہو۔

ہماری گاڑی اہرام کی طرف آگے بڑھی تو ایک سپاہی نے اس کو روک لیا۔ وہ ہمارے ساتھی سے بات کر رہا تھا جو گاڑی چلا رہے تھے۔ میں حسب عادت پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نظر میرے اوپر پڑی تو اس کا رویہ بدل گیا۔ اس نے یہ کہہ کر گاڑی آگے کی طرف جانے کی اجازت دے دی کہ: من اجل الشیخ الکبیر سمحنا لك۔ میں نے سوچا کہ اس دنیا میں اگر طاقت ور آدمی کی طاقت میں تاثیر ہے تو میرے جیسے ضعیف آدمی کا ضعف بھی اپنے اندر ایک طاقت رکھتا ہے۔ اور بعض اوقات ضعیف کی طاقت قوی کی طاقت سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔

تین اہرام دیکھنے کے بعد میں نے ابوالہول کو دیکھا جو اہرام سے الگ پتھر کو تراش کر بنایا گیا ہے۔ ایک سیاح عالمی سفر کر کے واپس آیا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا کہ تم نے ساری دنیا کا سفر کیا ہے۔ بتاؤ کہ سب سے عجیب چیز تم نے کیا دیکھی۔ اس نے کہا: ابوالہول کے اعضاء کا تناسب۔ ابوالہول نامی بت

Did Space Explorers Visit Ancient Egypt?

بہت بڑا ہونے کے باوجود تناسب الاعضاء ہے۔ تاہم مجھ کو وہ اتنا زیادہ تناسب نظر نہیں آیا جتنا مذکورہ سیاح نے بتایا ہے۔

اہرام دیکھنے کے دوران ایک موقع پر تمام سواریاں روک دی گئیں۔ اتنے میں ایک درجن کاروں کا قافلہ خاص آداب کے ساتھ آیا۔ معلوم ہوا کہ وزیر اعظم مالٹا اہرام دیکھنے کے لئے آئے ہیں۔ یہی دھوم پچھلے دن قاہرہ کے ہوائی اڈہ پر نظر آئی تھی جب کہ مالٹا کے وزیر اعظم قاہرہ ایئرپورٹ پر اترے تھے۔ مالٹا میں ہم نے دیکھا تھا کہ وزیر اعظم وہاں عام انسانوں کی طرح رہتا ہے۔ مگر قاہرہ آتے ہی اس کے ساتھ شاہانہ آداب کا منظر دکھائی دینے لگا۔ کتنا فرق ہے ایک ملک اور دوسرے ملک میں۔

ایک انگریزی اخبار میں ایک دلچسپ مضمون پڑھا۔ اس کے ساتھ ایک تصویر بھی شامل تھی۔ اس تصویر میں مصر کے تین اہرام نظر آرہے تھے۔ دوسری طرف اونٹ اپنی روایتی صورت میں موجود تھے۔ اسی کے ساتھ اہرام کے سامنے کھلے ہوئے میدان میں ایک چاند گاڑی تھی۔ اس کے اوپر ایک آدمی خلائی لباس (اسپیس سوٹ) پہنے ہوئے دکھائی دے رہا تھا۔ تصویر کے اوپر لکھا ہوا تھا: کیا خلائی تحقیق کرنے والے قدیم مصر میں اترے تھے۔

یہ ایک فرضی قیاس آرائی تھی۔ مگر آرٹسٹ کے قلم نے کاغذ کے اوپر اس کو ایک واقعہ کی صورت میں ڈھال دیا۔ اگر آپ صرف کاغذی نقشہ کو دیکھیں تو وہ آپ کو واقعہ معلوم ہوگا۔ اور اگر آپ اپنے ذہن کو استعمال کریں تو آپ پر کھلے گا کہ وہ صرف ایک لطیفہ ہے۔ اس دنیا میں اگر کوئی شخص صرف ظاہر کی بنیاد پر رائے قائم کرے تو وہ کبھی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہاں حقیقت کو صرف وہ شخص پاتا ہے جو ظاہر سے گزر کر باطن تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

استاذ محمد کمال نے نہر سوئز جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ صبح کو قاہرہ سے بذریعہ کار سوئز جانا اور پھر شام تک وہاں سے واپس آنا تھا۔ مجھے خود بھی سوئز دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ مگر بعض دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے میں سوئز کا سفر نہ کر سکا۔

سوئز کی تاریخ کے ساتھ طرح طرح کے خوشگوار اور ناخوش گوار واقعات شامل ہیں۔ سوئز وہ مصنوعی نہر ہے جو میڈیٹرینین اور ریڈ سی کو ملاتی ہے اور اس طرح یورپ اور مشرقی دنیا کے درمیان بحری سفر کو مختصر کر دیتی ہے۔ اس نہر کا تخیل کافی قدیم ہے۔ ۱۸۵۶ میں سوئز کینال کمپنی بنی۔ ۱۸۵۹

میں کھدائی کا کام شروع کیا جو آخری طور پر ۱۸۶۹ میں مکمل ہوا۔ نومبر ۱۹۶۹ میں وہ جہاز رانی کے لئے کھولی گئی۔

مختلف حالات سے گزرتے ہوئے یہ کمپنی فرانس اور برطانیہ کی ملکیت میں آگئی۔ ابتدائی ٹھیکہ کے مطابق، سوئز پر کمپنی کا کنٹرول ۹۹ سال تک رہنا تھا جو ۱۹۶۸ میں ختم ہوتا تھا۔ آخری زمانہ میں سوئز کے کل منافع میں مصر کا حصہ سات فیصد تھا۔ کمپنی کے کارکنوں میں زیادہ تعداد مصریوں کی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ کمپنی کی ذمہ داری یہ بھی تھی کہ وہ علاقہ میں اسپتال، اسکول وغیرہ قائم کرے۔ حوالہ کے لئے: انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، جلد ۱۷، صفحہ ۷۶۸

مصر میں جمال عبدالناصر کی حکومت آئی تو انھوں نے اسوان ڈیم کا منصوبہ بنایا۔ امریکہ نے اس کے لئے ۲۷ کروڑ ڈالر ($270,000,000) کی اقتصادی مدد منظور کی۔ برطانیہ نے بھی مدد کا وعدہ کیا۔ مگر جمال عبدالناصر نے اسی کے ساتھ اندر اندر کمیونسٹ بلاک سے تعلقات قائم کرلئے۔ انھوں نے چیکو سلاویکیا سے ہتھیار حاصل کرنے کا خفیہ معاملہ کیا۔ اس پر امریکہ بگڑ گیا۔ اس نے ڈیم کی امداد روک دی۔ اس کے بعد ۲۹ اکتوبر ۱۹۵۶ کو جمال عبدالناصر نے تالیوں کی گونج کے درمیان اعلان کیا کہ آج ہم نے نہر سوئز کو نیشنلائز کرلیا اور اب ہم اس کی آمدنی سے اسوان ڈیم کی تعمیر کریں گے۔ (12/844)

جمال عبدالناصر کے اس اقدام نے مغربی قوموں کو ان کا دشمن بنا دیا۔ اس کے فوراً بعد فرانس اور برطانیہ نے اسرائیل کے ذریعہ مصر پر حملہ کرا دیا۔ خود بھی پوری طرح اس کی مدد کی۔ اس حملہ میں مصر کی فوجی طاقت کچل کر رہ گئی۔ اسرائیل نے مزید اطراف کے علاقوں پر قبضہ کرکے اپنے رقبہ کو پانچ گنا بڑھا لیا۔

جمال عبدالناصر اگر ۱۲ سال انتظار کرتے تو سوئز کمپنی معاہدہ کے مطابق اپنے آپ ختم ہوجاتی۔ مگر ان کے عاجلانہ اقدام نے مصر کو تباہ و برباد کرکے رکھ دیا۔ جو چیز ۱۹۶۸ میں اپنے آپ مل جاتی، اس کو ۱۹۵۶ میں پیشگی طور پر حاصل کرنے کی کوشش مصر کے حق میں الٹی ثابت ہوئی۔

ایک ہندستانی مصنف کی عربی کتاب قاہرہ سے چھپی ہے۔ اس کا نام ہے: المسلمون فی الهند، بین خدعة الديمقراطية واكذوبة العلمانية۔ میں نے پڑھنے کے لئے لیا تو اس کا پہلا جملہ یہ تھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے انڈیا کے ہندوؤں نے طے کرلیا ہے کہ وہ اسپین کے

قصہ کو انڈیا کے مسلمانوں کے ساتھ دہرائیں (یبدو ان الهندوس فی الهند قرروا ان یقوموا بتکریر قصة الاندلس)

پوری کتاب انشائی انداز میں ہے۔ حقائق سے صرف نظر کرکے اس میں الفاظ کا جوش وخروش دکھایا گیا ہے۔ آخر میں ہندستانی مسلمانوں کے لئے افغانی جنگجوؤں کو بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے: وان شعبنا الهندی المسلم الذی یزید عدده عن عدد المجاهدین الافغان سبعة اضعاف یستطیع ان یستفید من الدرس الافغانی ویستوعبه (صفحہ ۹۷)

یہ سب باتیں اتنی بے معنی ہیں کہ مجھے ان لوگوں کی عقل پر حیرت ہوتی ہے جو اس کو لکھیں اور ان لوگوں کی عقل پر بھی حیرت ہوتی ہے جو اس کو چھاپ کر پھیلائیں۔

ایک مصری مصنف (عبدالجید صبح) کی کتاب دیکھی۔ ۴۷۰ صفحہ کی اس کتاب کا نام حقائق الاسلام بین الجہاد والجہود تھا۔ اس کتاب کے ٹائٹل پر دو تلواریں بنی ہوئی تھیں۔ ایک تلوار مسلم ملت کو سیاسی حیثیت سے قتل کر رہی تھی اور دوسری تلوار اس کو دینی حیثیت سے۔ پوری کتاب جدلی انداز میں ہے۔ مگر اس کے تعارف میں ٹائٹل کے آخری صفحہ پر بتایا گیا ہے کہ وہ منہج علمی پر لکھی گئی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مصنفین اسلام منہج علمی کو جانتے بھی نہیں۔ کجا کہ وہ منہج علمی پر کتاب لکھ سکیں۔

عربوں کی موجودہ نفسیات کی بنا پر جہاد کی باتیں ان کو بہت پسند آتی ہیں۔ کتابوں کے جارحانہ ٹائٹل اور ٹائٹل کے اوپر عسکری آرٹ ان کے درمیان بہت پسند کیا جاتا ہے۔ قاہرہ میں ہم کتابوں کی ایک دکان میں داخل ہوئے۔ معمولی مشاہدہ میں دس سے زیادہ ایسی کتابیں نظر آئیں جن کے ٹائٹل پیج پر تلوار کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ مثلاً ـــــ مقام الصحابة، حقائق الاسلام، خفقات قلب، شهداء الصحابة، الدولة والسلطة فی الاسلام، السبحة اوالدماء، الفارس المصلوب عبد الله بن الزبیر، شهید المحراب عمر بن الخطاب، الاعلام الخلیجی، صور وبطولات، وغیرہ۔

الشیخ محمد متولی الشعراوی مصر کے بڑے عالموں میں سے ہیں۔ وہ لوگوں میں بہت مقبول تھے۔

انور السادات کے زمانہ حکومت میں سبعینات میں انھوں نے وزیر اوقاف کا عہدہ قبول کرلیا۔ اس کے بعد عوام کے درمیان ان کی مقبولیت بہت کم ہوگئی۔ وہ "سرکاری مولوی" سمجھے جانے لگے۔ شیخ شعراوی نے اس فرق کو محسوس کیا اور ۱۹۷۹ میں وزارت سے الگ ہوگئے۔ اس کے بعد انھوں نے کبھی حکومت میں کوئی عہدہ قبول نہیں کیا۔ آج وہ مصر کے مقبول ترین عالم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ صورت حال موجودہ زمانہ میں اسلام کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ کچھ ناعاقبت اندیش قائدین نے یہ روایت قائم کی ہے کہ اسلام کا سب سے بڑا کام حکومت کا مخالف بن کر کھڑا ہونا ہے۔ اسلام کے نام پر جاری کی جانے والی اس غیر اسلامی سیاست نے اسلام کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اتنا کسی دشمن نے بھی اسلام کو نقصان نہیں پہنچایا۔ موجودہ زمانہ میں تمام اعلیٰ ذرائع حکومت کے قبضہ میں ہوتے ہیں۔ ان ذرائع کو استعمال کرکے اسلام کی عظیم خدمت کی جاسکتی ہے۔ مگر غلط طور پر یہ صورت حال بن گئی ہے کہ جو شخص حکومت کے قریب ہو وہ مسلم عوام سے دور ہو جاتا ہے اور جو شخص مسلم عوام سے قریب ہونا چاہے اس کو حکومت سے دور ہونا پڑتا ہے۔

رجاء بن حیوہ نے سلطان وقت سے قریب ہو کر عمر بن عبدالعزیز جیسے انسان کے لئے خلافت کا راستہ کھولا۔ مگر آج کوئی عالم رجاء بن حیوہ بننے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ سعودی عرب میں شیخ ابن باز، مصر میں شیخ طنطاوی اور شام میں شیخ کفتارو حکومت سے مل کر دین کا کام کرنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ عوام میں غیر مقبول ہیں۔ دوسری طرف جو علماء حکومت سے لفظی یا عملی ٹکرلے رہے ہیں، انھوں نے کوئی بھی حقیقی فائدہ نہیں پہنچایا، مگر عوام میں انھیں کو مقبولیت حاصل ہے۔

قاہرہ کے زمانہ قیام میں محمد الخطیب کی کتاب بالاسلام مصر دولۃ عظمی دیکھی۔ پوری کتاب خطیبانہ انداز میں ہے۔ ۳۳۳ صفحہ کی اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قاری کے اندر فکری ہیجان کے سوا اور کچھ پیدا نہیں ہوسکتا۔ جبکہ صحیح کتاب وہ ہے جو آدمی کے اندر سنجیدہ تعمیری ذہن پیدا کرے۔

کتاب کا خلاصہ موجودہ مسلمانوں کو ابھارکر ان کے اندر وہ چیز پیدا کرنا ہے جس کو مصنف نے الشخصیۃ الجہادیۃ للفرد والامۃ علی السواء (صفحہ ۱۳۳) کہا ہے۔ کتاب میں بار بار دہرایا گیا ہے کہ مسلمان عظیم تاریخ کے وارث ہیں۔ وہ امامت عالم اور قیادت بشری کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

ان کا مشن یہ ہے کہ اپنے عقیدہ کی بنیاد پر عالمی حکومت قائم کریں۔ اور پھر خاتمہ میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ عنقریب وہ عظیم اسلامی حکومت قائم ہو کر رہے گی، خواہ شر کی طاقتیں چاہیں یا نہ چاہیں (ستقوم الخلافة الاسلامية لامحالة باذن الله شاءت قوى الشر ام ابت)

کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کے نزدیک شاید اذن اللہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے ہمارے لئے ایسا ہونا مقدر کر دیا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ اذن اللہ کا تعلق اصول سے ہے نہ کہ کسی گروہ سے۔ اس سے مراد قانون فطرت ہے نہ کہ مسلم قوم۔

کتاب میں زور و شور کے ساتھ جاپان کی مثال دہرائی گئی ہے کہ وہ دوسری عالمی جنگ میں خاکستر ہو گیا اور پھر اٹھ کر وہ عالمی طاقت بن گیا۔ جب کہ مصر کے پاس امکانات کی مقدار اس سے بہت زیادہ ہے۔ یہ حوالہ صحیح نہیں۔ کیوں کہ اہل جاپان نے اس طرح ترقی نہیں کہ ان کے یہاں خطیبوں اور انشاپردازوں کا ایک گروہ اٹھا اور اس نے عظمت ماضی کے اعادہ کے نام پر پرجوش الفاظ کا دریا بہانا شروع کر دیا۔ اس کے برعکس جاپان کے اہل فکر نے اپنی قوم کے اندر اعتراف حقیقت کا مزاج پیدا کیا۔ انھیں اس پر راضی کیا کہ وہ امریکی اقتدار اور اس کے منصوبوں کو بلا بحث تسلیم کر لیں۔ وہ اس سے ٹکرائے بغیر اس کے حدود میں رہ کر خالص غیر سیاسی انداز میں اپنی پر مشقت تعمیر کریں۔

قرآن میں ہے کہ وجعلنا منهم ائمة يهدون بامرنا لما صبروا (السجدہ ۲۴) گویا اذن اللہ یہ ہے کہ اس دنیا میں صبر کرنے والے کو امامت کا منصب دیا جاتا ہے۔ مسلمان صبر کو حذف کر کے قیادت کے منصب پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور خدا کی دنیا میں کبھی ایسا ہونے والا نہیں۔

قاہرہ سے ایک عربی روزنامہ الشعب نکلتا ہے۔ اس کے شمارہ ۱۵ ربیع الاول ۱۴۱۲ھ میں دکتور محجوب عمر کے قلم سے ایک مضمون تھا۔ اس کا عنوان تھا: المشكلة هي اسرائيل۔ یہی اس وقت عالم اسلام کے اہل فکر کا عام مزاج ہے۔ وہ اسرائیلی اور غیر اسرائیلی سازشوں کو مسلمانوں کا اصل مسئلہ سمجھتے ہیں۔ مگر اس قسم کا طرز فکر قرآن کی تردید کے ہم معنی ہے۔ قرآن کے مطابق مسلمانوں کی اصل مشکل یا ان کا اصل مسئلہ ان کی داخلی کمیاں ہیں نہ کہ خارجی دشمن کی سازشیں۔ لیکن مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے اپنے بے فائدہ کلام سے مسلمانوں کو اس فرضی وہم سے نکلنے نہیں دیتے۔

ایک بار میں قاہرہ کی ایک سڑک سے گزر رہا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک طرف وسیع میدان اور اونچا پنڈال نظر آیا۔ ہمارے مصری رفیق محمد کمال صاحب نے بتایا کہ یہی وہ میدان ہے جہاں ٦ اکتوبر ١٩٨١ کو عرب ۔ اسرائیلی جنگ (اکتوبر ١٩٧٣) کی یاد میں ملٹری پریڈ ہو رہی تھی اور سابق مصری صدر انور السادات اپنے رفقاء کے ساتھ پنڈال پر بیٹھے ہوئے تھے۔ عین اس وقت فوج کا ایک جوان اپنی صف سے نکلا اور تیزی سے گولی مار کر انھیں ہلاک کر دیا۔

انور السادات کا قاتل ایک مصری نوجوان خالد اسلامبولی تھا۔ وہ الاخوان المسلمون کی تحریک سے متاثر ہوا۔ وہ انور السادات کے سخت خلاف تھا۔ مقدمۂ قتل کے دوران جج نے اس سے کہا کہ تمھارے اوپر انور السادات کے قتل کا الزام ہے۔ اس نے کہا کہ ہاں۔ میں نے ہی اس فرعون کو قتل کیا ہے۔ عدالتی فیصلہ کے تحت ٨ مارچ ١٩٨٢ کو خالد اسلامبولی کو قتل کر دیا گیا۔

خالد اسلامبولی کی ماں سے ایک عربی جریدہ نے انٹرویو لیا تھا۔ اس انٹرویو میں خالد اسلامبولی کی ماں نے بڑے ہی جذباتی انداز میں ایک ایک سوال کا جواب دیا تھا۔ اس انٹرویو کا ایک جز یہ ہے :

(ام خالد نے کہا) خالد سے جب پہلی بار سجن حربی میں میری ملاقات ہوئی تو اس وقت اس کے خلاف قتل کا کیس شروع ہو چکا تھا اور اس دن مقدمۂ قتل کی سماعت کا دوسرا دن تھا۔ ہال میں داخل ہو کر میں تیزی سے چلتی ہوئی خالد کے پاس پہنچ گئی۔ خالد اس وقت عدالت کے مخصوص کٹہرے میں کھڑا ہوا تھا۔ وہ بالکل مطمئن تھا۔ اس نے میری پریشانی کو محسوس کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ قول دہرایا جو آپ نے مکہ میں یاسر کے خاندان کو عذاب میں مبتلا دیکھ کر فرمایا تھا : صبراً آلَ یاسرٍ موعِدُکم الجنۃ (آل یاسر، صبر کرو کیوں کہ تمہارے لیے جنت کا وعدہ ہے) یہ حسن اتفاق کی بات ہے کہ خالد کی کنیت بھی ابو یاسر تھی۔

خالد اسلامبولی کی جرأت اور بے خوفی بلاشبہ ایک واقعہ ہے۔ مگر آل یاسر کی مثال ان کے اوپر چسپاں نہیں ہوتی۔ کیوں کہ آل یاسر کا معاملہ یک طرفہ تھا اور خالد اسلامبولی کا معاملہ دو طرفہ۔ آل یاسر نے ظلم کو برداشت کیا، اس کے باوجود ان پر سزا ڈھائی گئی۔ جب کہ خالد اسلامبولی کا معاملہ یہ ہے کہ انھوں نے ظلم کو برداشت نہیں کیا، اس لیے انھیں سزا دی گئی۔

۱۲ اکتوبر کو ۱۰ بجے ہم قاہرہ کے تاریخی مقامات دیکھنے کے لئے نکلے۔ ہم سڑک سے گزر رہے تھے اور ہمارے رفیق محمد کمال صاحب ہر چیز کا تعارف کراتے جا رہے تھے۔ ایک جگہ نظر آیا کہ سڑک کے کنارے اونچی فصیلوں سے گھری ہوئی عمارت ہے۔ فصیل کے اوپر جگہ جگہ سپاہی بندوق لئے ہوئے کھڑے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ یہاں کا سنٹرل جیل ہے۔ میرے رفیق نے کہا کہ یہ جیل ہے۔ اخوان کے لوگوں کو اسی کے اندر سخت سزائیں دی گئی تھیں (ھٰذا سجن۔ عُذِّب فیہ الاخوان المسلمون)

سڑک کے دوسری طرف دریائے نیل بہہ رہا تھا۔ میں نے اس کو بہت غور سے دیکھا۔ نیل کے متعلق مضامین اور کتابوں میں جو کچھ پڑھا تھا، اس سے ذہن میں نیل کے بارہ میں ایک عجیب افسانوی تصور تھا۔ مگر نیل ویسا ہی ایک بڑا دریا نظر آیا جیسے دوسرے بڑے دریا ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سن کر یا پڑھ کر آدمی کے ذہن میں کسی چیز کے بارہ میں ایسا تاثر قائم ہو جاتا ہے جو واقعہ کے مطابق نہیں ہوتا۔ کبھی اصل واقعہ سے کم اور کبھی اصل واقعہ سے زیادہ۔

سڑک کے دونوں طرف اونچی بلڈنگیں اسی طرح دکھائی دے رہی تھیں جس طرح ماسکو میں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ جمال عبد الناصر کی دین ہے۔ ناصر نے مصر کی ترقی کے لئے سوشلسٹ نمونہ اختیار کیا۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ جن لیڈروں نے سوشلسٹ نمونہ کو اختیار کیا انھوں نے صرف ملک کو برباد کیا۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے امریکی نمونہ کو اختیار کیا، وہ کم از کم دنیوی اعتبار سے اپنے ملک کو ترقی دینے میں کامیاب ہو گئے۔

مسجد صلاح الدین کو ہم نے باہر سے دیکھا۔ اس کو دیکھ کر اسلامی تاریخ کی اس مشہور شخصیت کی یاد تازہ ہو گئی جس نے اپنی ذات سے ایک نئی تاریخ بنائی۔ چلتے ہوئے ہم مسجد عمرو بن العاص پہنچے۔ یہ عمرو بن العاص صحابی نے ۲۱ھ میں تعمیر کرائی تھی۔ ابتدائی مسجد کھجور کے تنوں پر بنائی گئی تھی۔ اس کے بعد مختلف سلاطین کے زمانہ میں اس میں ترمیم اور اضافہ ہوتا رہا۔ تاہم مسجد کی شکل بنیادی طور پر وہی ہے جو ابتدا میں تھی۔ کھجور کے تنوں کا قائم مقام آج پتھر کے بنے ہوئے گول ستون ہیں۔ اس مسجد کا طرز عام مساجد سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے اندر چلتے ہوئے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ہم تاریخ کے درمیان سفر کر رہے ہیں۔ چودہ سو سالہ تاریخ کے دونوں سرے ایک لمحہ کے لئے ملتے ہوئے نظر آئے۔ مسجد کے باہر ایک کتبہ لگا ہوا ہے اس کی ابتدائی دو سطریں یہ ہیں:

جامع عمرو بن العاص ۲۱ھ - ۶۴۲م : اول المساجد التی أُنشأت فی مصر وافریقیا واول جامعة علمیة فی مصر أسسها عمرو ابن العاص۔

ظہر کی نماز ہم نے اسی مسجد میں پڑھی۔ مسجد کے اندرونی حصہ میں وضوخانہ نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ وضوخانہ باہر بنا ہوا ہے۔ ہم عقبی دروازہ سے باہر نکلے۔ مسجد سے متصل ایک لمبی اور وسیع پٹی کے دوسری طرف وضوخانہ کی عمارت تھی۔ مسجد اور وضوخانہ کے درمیان خالی زمین جو یقیناً مسجد ہی کی زمین تھی وہ کوڑا خانہ کا منظر پیش کر رہی تھی۔

اس کے بعد ہم المتحف المصری (مصری میوزیم) پہنچے۔ اس کے گیٹ پر پہنچے تو میرے مصری ساتھی نے کہا: لم ادخل ھذا المتحف من قبل۔ اول مرۃ ادخل۔ عام طور پر میں نے دیکھا ہے کہ اس طرح کی چیزوں سے مقامی لوگوں کو کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی۔ باہر کے لوگ افسانوی شوق لے کر اس کو دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ مگر مقامی لوگ کم ہی اس کو دیکھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اسی متحف میں اس فرعون کی ممیائی کی ہوئی لاش ہے جو موسیٰ علیہ السلام کا ہم زمانہ تھا۔ اس کو تاریخ میں ریمسس ثانی (Ramses II) کہا جاتا ہے۔

قاہرہ کا جامعۃ الازہر (ازہر یونیورسٹی) جامعۃ القرویین کے بعد قدیم ترین مسلم درس گاہ ہے۔ اس کو دولت فاطمیہ نے ۹۷۰ء میں قائم کیا تھا۔ اس میں طلبہ کی تعداد ۳۰ ہزار سے زیادہ ہے۔ اسلام نے دور اول میں علم کا جو طاقتور رجحان پیدا کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد کی تمام صدیوں میں تعلیمی کالج اور مدرسے پوری مسلم دنیا میں اسپین سے لے کر وسط ایشیا اور ہندستان تک قائم ہو گئے۔ اسپین وہ مقام تھا جہاں سے فلسفہ اور سائنس منتقل ہو کر یورپ پہنچے:

> Throughout subsequent centuries, colleges and madrasahs arose throughout the Muslim world from Spain (whence philosophy and science were transmitted to the Latin West) across Central Asia to India. (9/922)

علمی ترقی اور تعلیمی توسیع کا یہ سارا کام خلافت راشدہ کے بعد اس وقت ہوا جب کہ مسلم حکمرانوں میں بگاڑ آگیا تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے مطابق، مسلم علماء اور دانشوروں نے یہ عظیم الشان حکمت اختیار کی کہ انھوں نے "اصلاح سیاست" کے نام سے حکمرانوں سے ٹکراؤ نہیں کیا۔ انھوں

نے حکمرانوں سے تعرض نہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو ہمہ تن دینی اور سائنسی علوم کی ترقی میں لگا دیا۔ اس حکمت کی بنا پر انھیں حکمرانوں کا زبردست تعاون حاصل ہوا۔ حتی کہ اسلام کی عظیم الشان علمی تاریخ وجود میں آگئی۔ اس کے برعکس مسلم علماء اور مسلم دانشور اگر مسلم حکمرانوں سے لڑنا شروع کر دیتے تو وہ "شہداء" کی تعداد میں تو ضرور اضافہ کرتے مگر وہ اسلام کے لئے کوئی تاریخ ساز کارنامہ انجام نہیں دے سکتے تھے۔

ایک صاحب نے مجھے ایک کتاب دی۔ یہ جامعۃ الازہر کی طرف سے چھپی ہے۔ اور اس کو وسیع پیمانہ پر تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا نام ہے: واجبات الامة نحو کاشف الغمة صلی اللہ علیه وسلم۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے امت کی ذمہ داریاں۔ میں نے اس کتاب کو دیکھا۔ اس کتاب کے مضامین کا اندازہ اس کی فہرست سے بخوبی طور پر ہوتا ہے۔ یہ فہرست حسب ذیل ہے:

الواجب الاول	الایمان بنبوته والتصدیق برسالته صلی اللہ علیه وسلم
الواجب الثانی	طاعته فیما امربه واجتناب ما نهی عنه صلی اللہ علیه وسلم
الواجب الثالث	احیاء سنته الشریفة واماتة البدعة
الواجب الرابع	محبته وشوق لقائه صلی اللہ علیه وسلم
الواجب الخامس	تعظیم شانه وتوقیره صلی اللہ علیه وسلم
الواجب السادس	الصلاة والسلام علیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم
الواجب السابع	زیارة مسجده الشریف صلی اللہ علیه وسلم

۹۴ صفحہ کی اس کتاب میں بظاہر امت محمدی کے تمام واجبات بیان کر دئے گئے ہیں۔ مگر اس میں وہی چیز حذف ہے جو امت کے تمام واجبات میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ یعنی شہادت حق اور دعوت الی اللہ۔ سنت کے باب میں مونچھ کاٹنے اور داڑھی بڑھانے تک کی سنت کا ذکر ہے۔ مگر اس میں سنت دعوت کا کوئی ذکر نہیں۔

بعد کے دور میں لکھی جانے والی تمام کتابوں کا یہی حال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دعوت وتبلیغ کا تصور ہی امت کے زندہ شعور سے حذف ہوگیا ہے۔ حتی کہ جو لوگ بظاہر دعوت وتبلیغ کا نام لیتے ہیں وہ بھی دوسرے دوسرے کاموں کو دعوت وتبلیغ کا عنوان دئے ہوئے ہیں۔

۱۲ اکتوبر کی صبح کو کئی عرب نوجوان میری قیام گاہ پر آگئے۔ دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ گفتگو کا موضوع "اسلامی دعوت عصر حاضر میں" تھا۔ ایک عرب نوجوان نے خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام کی تفسیر پوچھی۔ میں نے کہا کہ اس دنیا میں تحویل (conversion) کا قانون رائج ہے۔ ابتدائی لوہا پر عمل کرکے اس کو اسٹیل بنایا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کے اندر بالفعل وہ صفت پیدا ہوجاتی ہے جس کو قرآن میں بأس شدید کہا گیا ہے۔ مگر یہ بأس شدید لوہے پر عمل کرکے حاصل ہوگی۔ مٹی یا لکڑی پر عمل کرکے آپ اس کو اسٹیل نہیں بنا سکتے۔

یہی معاملہ انسانوں کا ہے۔ جن لوگوں کے اندر قوی شخصیت موجود ہو انھیں کی تربیت کرکے ان کو اس قابل بنایا جاسکتا ہے کہ وہ بڑے بڑے کام کرسکیں۔ ضعیف شخصیت کے لوگوں پر عمل سے یہ فائدہ حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے عربوں پر عمل کیا تو ان سے ابطال کا ایک گروہ وجود میں آگیا۔ آپ نے مدینہ کے یہود پر عمل کیا مگر ان سے اس قسم کا کوئی گروہ نہ بن سکا۔ اسی طرح دور عباسیہ کے مسلمان شخصی کمزوری کا شکار ہوچکے تھے۔ اس لئے ہر قسم کی تعلیمی و تربیتی سرگرمیوں کے باوجود وہ اسلام کے قائد نہ بن سکے۔ تاتاری مفسد اور ظالم تھے۔ مگر جب وہ بدلے تو انھیں کے اندر سے وہ قوم ابھری جس نے صدیوں تک اسلام کی پاسبانی کی۔

موجودہ زمانہ کے مسلم اہل فکر کی کمزوری یہ ہے کہ وہ قوموں کے صرف "ظلم" کو دیکھ پاتے ہیں۔ ان کو قوموں کے اندر چھپے ہوئے امکانی اوصاف نظر نہیں آتے۔ اس لئے بے شمار کوششوں کے باوجود وہ ایسا نہ کرسکے کہ دوبارہ اسلام کی علمبرداری کرنے کے لئے کوئی طاقت ور گروہ وجود میں لاسکیں۔

۱۳ اکتوبر کو فجر کی نماز جدید مصر میں مسجد یوسف الصحابی (میدان الحجاز) میں پڑھی۔ نماز کے بعد اکثر نمازی مسجد میں بیٹھ گئے اور قرآن کے نسخے لے کر ہلکی آواز میں پڑھنے لگے۔ مصریوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ بڑے ذوق وشوق سے قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ قومی اعتبار سے غالباً یہ بات سب سے زیادہ مصر کے اندر پائی جاتی ہے۔ غالباً اسی لئے کہا گیا ہے کہ نزل القرآن فی الحجاز وقریٔ فی مصر۔

مسجد کے اندر جگہ جگہ اس مضمون کی تختی دیوار پر لگی ہوئی تھی —— تنبیہ: ضع حذاءك وأمتعتك أمامك۔ (اپنا جوتا اور اپنا سامان اپنے سامنے رکھئے) قاہرہ کی کئی مسجد میں میں نے نماز

پڑھی۔ یہاں کی مسجدوں کا ایک خاص انداز ہوتا ہے جو دوسرے ملکوں کی مسجدوں سے مختلف ہے۔ تاہم مسجد اور اطراف مسجد میں صفائی کا معیار زیادہ اچھا نظر نہیں آیا۔

ایک عرب نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ وہ ڈیڑھ ہزار کیلومیٹر کا سفر طے کرکے صرف مجھ سے ملاقات کے لئے قاہرہ آئے تھے۔ ملاقات ہوئی تو دیر تک لپٹ کر روتے رہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان کے اندر حقیقت کی تلاش کی کیفیت ابھری۔ حتی کہ وہ سوچنے لگے کہ میں خودکشی کرلوں۔ پھر انھوں نے ہمارے یہاں کی عربی اور انگریزی مطبوعات پڑھیں۔ اس کے بعد انھوں نے ازسرنو اسلام کی حقیقت کو دریافت کیا۔ انھوں نے کہا : عندما ادرکتُ ھذہ الرسالة عرفت اَنّ ھٰذا ھو الامر الحقیقی الذی کنت ابحث عنہ)

یہاں اس طرح کے اور کئی عرب نوجوانوں سے ملاقات ہوئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الرسالہ مشن کی قبولیت کا مزاج سب سے زیادہ عربوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب کا دین بعد کے اضافوں سے بڑی حد تک پاک ہے۔

مولانا عبد الباری ندوی (۱۸۹۰ - ۱۹۷۶) قاہرہ کو مقہورہ کہا کرتے تھے۔ یعنی اس کی حیثیت قاہر اور غالب کی نہیں بلکہ وہ مغربی تہذیب سے مغلوب اور مقہور ہوچکا ہے۔ میں اس سے اتفاق کرتے ہوئے اس میں یہ اضافہ کروں گا کہ یہی حال دوسرے تمام مسلم شہروں کا بھی ہے۔ حتی کہ موجودہ زمانہ کے مسلم ادارے بھی اس کیفیت سے مستثنیٰ نہیں۔ ظاہری صورت میں ضرور فرق ہے مگر اندرونی حقیقت کے اعتبار سے ایک اور دوسرے میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔

ایک مصری طالب علم عبد الحمید سعد عویس نے ایک مصری مثل ان لفظوں میں بتائی : کُلُ ما یُعجبك والبس ما یُعجب الناس (کھانا اپنی پسند کا کھاؤ اور کپڑا دوسروں کی پسند کا پہنو) اس مثل سے مصری مسلمانوں کا مزاج معلوم ہوتا ہے۔ مصری مسلمان عام طور پر خوش باش ذہن کے ہوتے ہیں۔ ان کی اس صفت کا یہ فائدہ ہے کہ وہ عام طور پر تندرست ہوتے ہیں۔ مگر دوسرا نقصان یہ ہے کہ وہ معاملات پر زیادہ گہرائی کے ساتھ غور نہیں کر پاتے۔

۱۳ اکتوبر کو عشاء کی نماز میں نے یہاں کی مسجد الفرقان (تعمیر ۱۳۹۰ھ) میں پڑھی۔ یہ مسجد کافی صاف ستھری اور نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ مسجد کے اندر ایک نئی چیز یہ نظر آئی کہ اس میں پلاسٹک

کے بنے ہوئے خاص انداز کے اسٹول رکھے ہوئے تھے۔ یہ معذورین کے لئے تھے۔ جن لوگوں کو کھڑے ہونے یا بیٹھنے میں زحمت ہوتی ہے۔ وہ اس اسٹول پر بیٹھ کر نماز پڑھ سکتے ہیں۔

۱۳ اکتوبر کو قاہرہ کے ایک مکان میں عرب نوجوانوں کی مجلس تھی۔ میں نے کہا کہ میں ایک جملہ کہتا ہوں آپ میں سے کوئی صاحب اس کی تشریح کریں۔ پھر میں نے کہا: البقرة هی صناعة الٰهية التی تحول اللاحليب الی حليب ۔ وکذالك المومن فهو صناعة الٰهية الذی يحول اللا ايمان الی ايمان۔

جن نوجوانوں نے میرے مضامین ابھی زیادہ نہیں پڑھے تھے وہ اس سوال کو اچھی طرح سمجھ نہ سکے۔ مگر جن نوجوانوں نے میرے مضامین پڑھے ہیں وہ سوال کا مطلب سمجھ گئے اور اس کی کچھ تفسیر بھی بیان کی۔ آخر میں میں نے تفصیلی طور پر اس کی وضاحت کی۔

۱۳ اکتوبر کو ہم نے ظہر کی نماز مسجد بلال بن رباح میں پڑھی۔ یہ کافی چھوٹی مسجد تھی۔ مگر ہم تین آدمیوں کے اضافہ کے باوجود ایک صف بھی پوری نہیں ہوئی۔

راستہ میں ایک چرچ تھا۔ آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ مسیحی لوگ اس کے اندر اپنی عبادت کر رہے ہیں۔ ہم نے چاہا کہ اس کو اندر سے دیکھیں۔ لیکن گیٹ کے باہر تین مسیحی چوکیدار بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ پولیس کی وردی میں تھے۔ انھوں نے ہم کو داخلہ سے روک دیا۔ میں نے بار بار کہا کہ ہمارا مقصد صرف دیکھنا ہے۔ مگر ان لوگوں نے کسی بھی قیمت پر اندر داخل ہونے نہیں دیا۔ میں نے کہا کہ میں کئی ملکوں کے چرچوں کے اندر بلا روک ٹوک داخل ہوا ہوں۔ حتی کہ عین عبادت کے وقت چرچ کے اندر گیا ہوں۔ تاہم انھوں نے مجھ کو اندر جانے نہیں دیا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اِن ملکوں میں سب سے اہم مسئلہ سیکورٹی کا ہوتا ہے۔ ان ملکوں کا سماج سیکورٹی اورینٹڈ سماج ہوتا ہے۔ اس بنا پر وہ ہر آدمی کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

آتے جاتے ہوئے یہاں کے دو پارک دیکھے۔ یہ دونوں پارک جدید مصر کے تھے۔ مگر دونوں کی حالت معمولی نظر آئی۔ سیاحت کے اعتبار سے اہمیت کے مقامات پر میں نے یہاں صفائی اور دیکھ ریکھ کا اہتمام پایا۔ مگر دوسرے مقامات یا پارک ایسے نظر آئے جیسے انھیں کوئی اہمیت نہ دی جارہی ہو۔

قاہرہ کی سڑکوں پر عورتیں کثرت سے اسکرٹ پہنے ہوئے نظر آتی ہیں۔ میں نے ایک مصری بزرگ سے پوچھا کہ یہاں اسکرٹ کا رواج کیسے شروع ہوا۔ انھوں نے کہا کہ اس کی وجہ مغربی سیاحوں کا سیلاب ہے۔ چوں کہ مصر میں کثرت سے تاریخی مقامات ہیں۔ اس لئے مغربی ملکوں کے مرد اور عورت بڑی تعداد میں سیاحت کے لئے آتے ہیں۔ ان کے اثر سے یہ بدعت یہاں شروع ہوئی۔ وہ بظاہر یہاں بطور سیاح آتے ہیں مگر اسی کے ساتھ وہ یہاں اپنی تہذیب بھی پھیلا رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ واقعہ کا ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ پیاسا گویا کہ خود کنویں کے پاس آرہا ہے۔ انسان بظاہر خواہ کچھ بھی ہو، اپنی فطرت کے اعتبار سے ہمیشہ وہ حق کا متلاشی ہوتا ہے۔ آپ اس دوسرے پہلو کو دیکھیں اور ان کو اپنا حریف سمجھنے کے بجائے ان کو اپنا مدعو سمجھیں۔ آپ ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کریں جو سچا دین ہونے کی بنا پر ہر ایک کا مطلوب ہے۔ اگر آپ اس دعوتی کام کو منظم انداز سے جدید معیار پر کریں تو جو داعی ہے وہ خود آپ کا مدعو بن جائے گا۔ یہ لوگ انشاء اللہ بڑی تعداد میں اسلام قبول کریں گے۔ یہاں تک کہ نئی تاریخ وجود میں آجائے گی۔

۱۴ اکتوبر کو قاہرہ سے روانگی کا دن تھا۔ فجر کی نماز مسجد الفرقان میں پڑھی۔ وہاں پہنچا تو دروازہ کے باہر نوٹس بورڈ پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا: اخی المصلی، ضع متاعك امامك مسجد اس لئے تھی کہ آدمی اپنا سامان اپنے پیچھے چھوڑ کر بھی اپنے آپ کو محفوظ سمجھے۔ مگر آج نمازی صرف اس وقت اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے جب کہ اس نے اپنا سامان اپنے سامنے رکھا ہو۔ اس قسم کے اعلانات بتلاتے ہیں کہ قومی کردار کی حالت قومی عقیدہ کے مطابق نہیں۔

امام نے اپنی قرأت میں قرآن کا وہ حصہ پڑھا جس میں یہ آیت ہے: قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یأتوا بمثل هٰذا القرآن لا یاتون بمثله ولو كان بعضهم لبعض ظهيرا۔ میں نے سوچا کہ خود یہ آیت اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے۔ کیوں کہ اس قسم کی مطلق تحدی مالک کائنات کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا اور نہ کبھی کوئی ایسی تحدی کر سکا۔

۱۴ اکتوبر کو قاہرہ سے واپسی ہوئی۔ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ میں قاہرہ ایئرپورٹ پہنچا۔ ایئرپورٹ پر میرے قریب دو مصری مسافر آج کا اخبار الجمهورية پڑھ رہے تھے۔ میں نے

دیکھا تو اس کے صفحہ اول پر صدر مصر کی کافی بڑی اور رنگین تصویر چھپی ہوئی تھی۔ یہ مسلم ملکوں کا عام مزاج ہے۔ امریکہ اور یورپ کے اخباروں میں آپ کو اس قسم کا منظر دکھائی نہیں دے گا۔

۱۴ اکتوبر کو میں قاہرہ ایئرپورٹ پر ظہر کی نماز ادا کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک مسافر آئے۔ انھوں نے پیچھے سے مجھے پکڑا اور گھما کر میرا رخ صحیح سمت میں کر دیا۔ میں نے سوچا کہ اسلام میں ایک مقرر "سمت قبلہ" ہے جو ہر ایک کو معلوم ہے۔ گویا اسلام میں ہر ایک کے پاس ایک معلوم کسوٹی ہے۔ ہر ایک کے لئے ممکن ہے کہ دوسرے شخص کو اس کسوٹی پر جانچے اور جس شخص میں انحراف پائے اس کو سیدھے رخ پر کھڑا کر دے۔ ایسی حالت میں نہ کسی شخص کو رخ کی تصحیح میں بخل کرنا چاہئے اور نہ کسی کو اس پر برا ماننا چاہئے کہ اس نے اس کو اسلام کی کسوٹی پر جانچا اور اس کے رخ کو صحیح سمت میں پھیرنے کی کوشش کی۔

گلف ایئر کی فلائٹ نمبر ۴۷ کے ذریعہ قاہرہ سے واپس روانگی ہوئی۔ جہاز کے اندر گلف ایئر کا فلائٹ میگزین گولڈن فالکن (Goldenfalcon) کا شمارہ اکتوبر ۱۹۹۱ دیکھا۔ اس کے ایک مضمون میں بتایا گیا تھا کہ انگریزی زبان میں عربی کے سیکڑوں الفاظ ہیں جو پچھلے ایک ہزار سال کے دوران اس میں شامل ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں کچھ الفاظ درج تھے۔ مگر ان میں سے بہت کم الفاظ براہ راست عربی سے انگریزی میں داخل ہوئے ہیں۔ زیادہ تر فرانس اور اٹلی وغیرہ کے راستہ سے انگریزی میں پہنچے ہیں۔ اس سے اس علاقہ میں عرب۔ اسلامی تہذیب کی فوقیت کا اندازہ ہوتا ہے جو اس کو سائنسی میدان میں حاصل تھی:

> The preponderance of technical or scientific words entering English from Arabic during the Middle Ages suggests the general superiority of Arab-Islamic civilisation in the area of scientific achievement during this period. (p. 24)

عجیب بات ہے کہ عربی زبان کی برتری کا تذکرہ کرنے والے ماہنامہ کا نام انگریزی "گولڈن فالکن" رکھا گیا ہے۔

طیران الخلیج (گلف ایئر) کے فلائٹ میگزین (Goldenfalcon) کا شمارہ اکتوبر مکمل دیکھا۔ اس کے مذکورہ مضمون میں بتایا گیا تھا کہ انگریزی کے بہت سے الفاظ عربی زبان سے لئے گئے

ہیں۔ مثلاً صفر (cipher) اور لیمون (lemon) وغیرہ۔ مضمون نگار نے اس سلسلہ میں تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ قرون وسطیٰ میں ۵۰۰ سال تک عربی علم اور عربی کلچر اور فکری ترقی کی زبان بنی رہی:

for 500 years Arabic was the language of learning, culture and intellectual progress.

یہ الفاظ پڑھ کر میں سوچنے لگا کہ جب ماضی ایسا تھا تو موجودہ زمانہ کے مسلمان اس سے مختلف کیوں ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ سمجھ میں آئی کہ موجودہ مسلمان قدیم مسلمانوں کا تسلسل نہیں ہیں، وہ قدیم مسلمانوں کی اگلی نسلیں ہیں۔ قدیم مسلمانوں کے اندر مذکورہ انقلابی صفت اس لئے آئی تھی کہ ان کا ایمان ان کے لئے ذہنی انقلاب کے ہم معنی تھا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو اگر اٹھانا ہے تو ان کے ایمان کو دوبارہ ذہنی انقلاب بنانا پڑے گا۔ اس ابتدائی عمل کے بغیر محض جذباتی الفاظ بولنے سے موجودہ مسلمانوں میں ماضی والے مسلمانوں کی صفت آنے والی نہیں۔

درمیان میں ہمارا جہاز تقریباً ایک گھنٹہ کے لئے دوحہ میں رکا۔ یہ قطر کی راجدھانی ہے۔ ۱۹۶۷ تک اس کی حیثیت ایک معمولی بستی کی تھی۔ ۱۹ویں صدی کے آخر میں عثمانیوں نے یہاں اپنا قبضہ قائم کیا۔ ۱۹۱۶ سے ۱۹۷۱ تک وہ برطانیہ کے دائرہ اثر میں رہا۔

۲۰ویں صدی کے آغاز میں دوحہ کے ساحل پر ۳۵۰ سمندر سے موتی نکالنے والی کشتیاں (pearling boats) تھیں۔ اس وقت تک موتی نکالنا یہاں کا خاص کاروبار تھا۔ مگر اس کے بعد جاپان کے مصنوعی موتی (cultured pearls) بازار میں آگئے۔ بظاہر اصلی موتی ہونے کے باوجود وہ بہت سستے تھے۔ چنانچہ اس کے بعد دوحہ کی موتیوں کی تجارت ختم ہو گئی۔

مگر دوسری عالمی جنگ کے بعد یہاں پٹرول نکالنے کے کارخانے قائم ہو گئے۔ اور اب قطر ایک انتہائی دولت مند ملک سمجھا جاتا ہے۔ اب یہاں قدیم مٹی کے گھروں کے بجائے جدید طرز کے عالیشان مکانات کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی دنیا میں ترقی کے بے پناہ امکانات رکھے ہیں۔ یہاں ایک امکان کے ختم ہوتے ہی دوسرا اس سے بڑا امکان سامنے آجاتا ہے۔ فطرت کا یہ قانون زمین کے مادی خزانوں کے لئے بھی ہے اور انسانی زندگی کے لئے بھی۔

عرب امارات (United Arab Emirates) کی فیڈریشن ۱۹۷۱ میں بنی۔ اس میں سات چھوٹی ریاستیں شامل ہیں۔ ان کی مجموعی آبادی دو ملین سے بھی کم ہے۔ ابوظبی اس فیڈریشن کا صدر مقام ہے۔ شیخ زائد کی رہنمائی میں فیڈریشن نے "ایجوکیشن اورینٹڈ بجٹ" بنایا ہے۔ وہ اپنی آمدنی کا ۱۴ فیصد حصہ تعلیم پر خرچ کر رہے ہیں۔

یہ بلاشبہ ایک دانشمندانہ طریقہ ہے۔ موجودہ دور معلومات کا دور (information age) ہے۔ معلومات تک رسائی صرف اہل علم کو ہو سکتی ہے۔ اس لئے قوم کو حصول علم میں آگے بڑھانا دور جدید میں ترقی کے لئے انتہائی ضروری ہے۔

تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دینے کا یہ نتیجہ ہے کہ عرب امارات اور ابوظبی میں اعلیٰ تعلیم یافتہ عرب نوجوانوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ دہلی کے انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (۱۷ دسمبر ۱۹۹۱) میں عرب امارات کے حالات پر ایک جائزہ چھپا ہے۔ جائزہ نگار نے ابوظبی کے ایک بڑے تاجر سلطان بن سلیمان (۳۶ سال) سے ملاقات کی۔ اس نے لکھا ہے کہ سلطان بن سلیمان انگریزی بھی اتنی ہی اچھی بولتے ہیں جتنا کہ عربی:

He is as articulate in English as he is in Arabic.

عرب امارات کے اکثر شعبوں میں ابھی تک برٹش لوگ کثرت سے موجود ہیں۔ میں نے ایک شیخ سے پوچھا کہ برٹش افراد اس طرح کب تک یہاں رہیں گے۔ انھوں نے جواب دیا کہ اس معاملہ میں ہم نے تدریج کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہم اپنے نوجوانوں کو بڑے پیمانہ پر جدید تعلیم دلا رہے ہیں۔ امید ہے کہ اس صدی کے آخر تک ہمارے نوجوان تربیت پا کر ان شعبوں کو سنبھال لیں گے جن کو آج زیادہ تر انگریز سنبھالے ہوئے ہیں۔ اس طرح کے معاملہ میں یہی طریقہ درست ہے۔ جو لوگ انقلابی جوش میں دفعۃً تمام بیرونی افراد کو خارج کر دیتے ہیں وہ ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ کارکردگی کا معیار تباہ ہو کر رہ جائے۔

ایک مسافر نے مجھے بتایا کہ ایک بار وہ ابوظبی ایئر پورٹ پر تھا۔ ایک عرب لڑکی آکر پاس کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ مسافر نے اس سے عربی میں ایک سوال کیا۔ لڑکی نے روانی کے ساتھ انگریزی میں جواب دیا۔ مسافر نے کہا کہ تم انگریزی جانتی ہو۔ اس نے فوراً جواب دیا کہ بے شک (of course)

گلف ایئر کی سروس اچھی تھی۔ تاہم دوحہ اور ابوظبی دونوں جگہ اس کی لینڈنگ ایسی تھی جس کو رف لینڈنگ ہی کہا جائے گا۔ سفر کے دوران ہموار پرواز کا انحصار موسم پہ ہوتا ہے۔ اور لینڈنگ کے وقت ہموار لینڈنگ کا انحصار پائلٹ پر۔

دوحہ (قطر) سے نکلنے والے عربی اخبار العرب کا شمارہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۱ دیکھا۔ اس کی ایک خبر کا عنوان تھا: ۲۷۰۰ لغة في العالم (دنیا میں ۲۷۰۰ زبانیں ہیں) اس میں ترکی کے ذرائع سے بتایا گیا تھا کہ ساری دنیا میں مروجہ زبانوں کی مجموعی تعداد ۲۷۰۰ تک پہنچتی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ استعمال کی جانے والی زبانیں یہ ہیں ـــــ چینی، انگریزی، اسپینی، ہندی، ترکی۔

اس خبر کو پڑھ کر میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور پھر اس کی مناسبت سے نظیر اکبر آبادی کا یہ شعر یاد آگیا:

ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے   بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

خبر کو پڑھ کر میرے ذہن میں کیا خیال آیا تھا، اس کو میں ناظرین کے اوپر چھوڑتا ہوں۔ جو لوگ میری تحریریں برابر پڑھتے رہے ہیں ان کے لئے اس کو قیاس کرنا مشکل نہیں۔

دوحہ کا دوسرا عربی اخبار الشرق (۱۴ اکتوبر) بھی دیکھا۔ اس کے صفحہ اول کی ایک خبر یہ تھی کہ شاہ حسین آرام کرنے کی خاطر اردن کے تخت کو چھوڑنے کے بارہ میں سوچ رہے ہیں (حسین یفکر في التخلي عن عرش الاردن)

خبر میں بتایا گیا تھا کہ اردن اس وقت سخت ترین اقتصادی اور اجتماعی مشکلات سے دوچار ہے۔ ان ذمہ داریوں کو سنبھالنا شاہ حسین کے لئے سخت دشوار ہو رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی حکومت پر باقی رہنے کے سوال نے ان کو ناقابل برداشت مصیبت میں ڈال دیا (ان مسئلة الاستمرار في الحكم قد ارهقته)

شاعر نے کہا ہے کہ: جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے۔ جو شخص جتنے بڑے مرتبہ پر ہو اتنا ہی زیادہ وہ مشکلات میں مبتلا ہوتا ہے۔ یہ اصول شاہ اردن کے لئے جتنا درست ہے اتنا ہی وہ شاہ امریکہ کے لئے بھی درست ہے۔ اس میں کسی کا کوئی استثناء نہیں۔

جہاز میں ایک نئی بات یہ تھی کہ عربی اور انگریزی کے ساتھ ہندی زبان میں بھی اعلانات کئے

جارہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس جہاز میں کافی ہندستانی مسافر ہوتے ہیں۔

اس کا محرک تجارت تھا۔ تجارتی مفاد کی بنا پر جہاز کے ذمہ داروں نے اپنے اعلانات کی زبان میں ہندی کو شامل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تجارتی محرک لوگوں کو مجبور کر رہا ہے کہ وہ اپنے گاہک کی زبان میں بولیں۔ حق کے حاملین کے لئے دعوت کا محرک اتنا طاقت ور نہ بن سکا کہ وہ مدعو کی زبان میں بولنے کا اہتمام کریں۔

جہاز میں انگریزی روزنامہ (Emirates News) کا شمارہ ۱۴ اکتوبر دیکھا۔ اس کے صفحہ آخر پر کویت کے شاہی خاندان کی ایک خاتون (سعد عبد اللہ السالم الصباح کی اہلیہ) کا انٹرویو تھا۔ انھوں نے کہا کہ کویت پر عراق کے حملہ نے اختلافات ختم کر دئے۔ ہمارے عوام کو باہم قریب کر دیا۔ اس قسم کی قربت صرف اقتصادی خوش حالی سے پہلے تھی جب کہ لوگ کچے گھروں میں رہتے تھے:

> The invasion brought our people close together. Such a closeness existed only before the economic boom when people lived in mud houses. (p. 12)

اس کو میں نے پڑھا تو میری زبان پر یہ الفاظ آگئے ـــــــ مصیبت کے وقت تو حیوانات بھی اپنا اختلاف ختم کر دیتے ہیں۔ انسان کی صفت یہ ہے کہ وہ خوش حالی اور اقتدار کے وقت اپنے اختلافات کو ختم کر دے۔

دبئی کا انگریزی روزنامہ گلف نیوز (۱۴ اکتوبر) دیکھا۔ اس میں مختلف ملکوں کی خبر کے لئے صفحات مقرر تھے۔ مثلاً عرب امارات، مڈل ایسٹ، یونائٹڈ کنگڈم، ایسٹ ایشیا، یو ایس اے۔ امریکہ کے صفحہ پر ایک تصویر میں دکھایا گیا تھا کہ عورتوں اور مردوں کی بھیڑ اپنے ہاتھ میں بڑے بڑے لفافے لئے ہوئے ہے اور ان کو ایک خاص ڈاک خانہ میں جلد از جلد پوسٹ کر دینے کی منتظر ہے۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا:

> Crowds of people wait in line to mail applications for a lottery of 40,000 Green Cards at the Merrifield post office in suburban Virginia. The State Department is accepting the first 40,000 applications that arrive at its special post office box after 12 a.m. today in the first of three annual massive giveaways of Green Cards on a first come first serve basis—Reuter.

اس کو پڑھتے ہوئے دل تڑپ اٹھا۔ میں نے کہا کہ امریکہ کے گرین کارڈ کو حاصل کرنے کے لئے لوگ ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ مگر جنت کے گرین کارڈ کی کھڑکی خالی پڑی ہوئی ہے۔ وہاں کوئی لائن میں کھڑا ہونے والا نہیں۔

اس کے بعد ہمارا جہاز کچھ دیر کے لئے ابوظبی میں اترا۔ تمام مسافر ہوائی جہاز سے نکل کر ایرپورٹ پر آ گئے۔ تقریباً ایک گھنٹہ ابوظبی میں گزرا۔ ابوظبی ایئر پورٹ کی پوری چھت خیمہ کے انداز پر بنائی گئی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے کہ اسلام آباد (پاکستان) کی فیصل مسجد کی چھت بنائی گئی ہے۔ تاہم یہ طرز تعمیر مجھے ذاتی طور پر پسند نہیں۔ میں اس کو سطحی ذوق کی علامت سمجھتا ہوں۔

ابوظبی، عرب امارات کی سات ریاستوں میں سب سے بڑی ریاست ہے۔ اس کا رقبہ ۲۶ ہزار مربع میل ہے۔ وہ اور دبئی عرب امارات کی سب سے زیادہ دولت مند ریاستیں سمجھی جاتی ہیں۔

ڈھائی سو سال پہلے ابوظبی کی حیثیت زیادہ تر غیر آباد صحرا کی تھی۔ ۱۷۶۱ء میں قبیلہ بنی یاس کو یہاں پانی کا کنواں ملا۔ اس کے بعد وہ یہاں رہ پڑا۔ اسی قبیلہ کا ایک خاندان اب تک یہاں حکمراں ہے۔ ۱۹۵۸ میں یہاں پٹرول دریافت ہوا۔ اس کے بعد سے ابوظبی نے عالمی اہمیت حاصل کرلی۔ پانی کی دریافت نے ابوظبی کو صرف قبائلی اہمیت دی تھی۔ تیل کی دریافت نے اس کو عالمی سطح پر اہمیت کا حامل بنا دیا۔

پانی ایک سادہ انسانی ضرورت ہے۔ ایک معمولی دیہاتی آدمی بھی پانی کو دیکھے تو وہ اس کی اہمیت اور اس کے استعمال کو جان لے گا۔ مگر پٹرول کی اہمیت اور اس کے استعمال کو جاننے کے لئے صرف اس کو دیکھنا کافی نہیں۔ اس کے لئے مزید ایک پوری صنعتی تہذیب کی ضرورت ہے۔ یہی فرق ہے جس کی بنا پر پانی دریافت ہوا تو اس کا پورا فائدہ عرب قبیلہ کو ملا۔ مگر تیل دریافت ہوا تو اس کا بیشتر فائدہ مغربی قوموں کے حصہ میں چلا گیا۔

۱۴ اکتوبر کو ابوظبی سے دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ سفر خلیج ایئر کے جہاز کے ذریعہ طے ہوا۔ راستہ میں شارجہ کا عربی روزنامہ الخلیج (۱۴ اکتوبر ۱۹۹۱) دیکھا۔ اس کے صفحہ ۶ پر ایک مضمون (النظام العربي وآفاق المستقبل) تھا۔ اس میں الامۃ العربیۃ کو مخاطب کرتے ہوئے کچھ باتیں کہی گئی تھیں۔

اس ذیل میں مضمون نگار (علی ربیعہ) نے لکھا تھا کہ صحرا کے قافلے جس قاعدہ کا اتباع کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اپنے اندر کے سب سے کمزور کی چال چلو (سیروا سیر اضعفکم) میں نے اس کو پڑھا تو میرے دل نے کہا کہ یہ اصول صرف صحرائی سفر کے لئے نہیں ہے بلکہ زندگی کے تمام سفروں کے لئے ہے۔

مثلاً آپ کو شہر کی سڑک پر ایک جلوس نکالنا ہے۔ آپ کی جماعت میں ۹۵ فیصد ایسے لوگ ہیں جن کے اندر برداشت کی طاقت ہے۔ مگر ۵ فیصد افراد میں برداشت کی طاقت نہیں۔ ایسی حالت میں آپ کو ۵ فیصد کا لحاظ کرتے ہوئے جلوس نہیں نکالنا چاہئے۔ کیوں کہ جلوس کے پانچ فیصد افراد بے برداشت ہو کر تشدد کر بیٹھیں گے اور پھر آپ کا جلوس ملت کو فائدہ پہنچانے کے بجائے ملت کی تباہی کا سبب بن جائے گا۔

دہلی ایئرپورٹ میں داخل ہوا تو "ڈیوٹی فری شاپ" کا ایک حصہ نظر سے گزرا۔ شیشہ کی الماری کے پیچھے شراب کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف شیشہ کے اوپر خوبصورت اشتہار درج تھا۔ اوپر شراب کی دو خوبصورت بوتلوں کی تصویریں تھیں۔ اس کے نیچے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے کہ فرسٹ کلاس سفر کا ساتھی:

First class travel companions

جن لوگوں کو "فرسٹ کلاس" کا رتبہ مل جاتا ہے، اس کے بعد ان کے لئے ساری اہمیت صرف تفریح کی رہ جاتی ہے۔ وہ شراب کو تفریح کا ذریعہ سمجھ کر اس کو اپنی زندگی کا ساتھی بنا لیتے ہیں۔ یہ زندگی کا کتنا کمتر استعمال ہے۔ زندگی کا سب سے بڑا استعمال یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو حقائق اعلیٰ کی دریافت میں لگائے۔ مگر یہی سب سے اہم چیز دنیا میں سب سے کم پائی جاتی ہے۔

ہمارے پاس کتابوں کے کئی بنڈل تھے جو قاہرہ سے ہمارے ساتھ آرہے تھے۔ کتابوں پر کسٹم وغیرہ نہیں ہوتا۔ میں نے سوچا کہ کسٹم کا عملہ ہم کو روک کر بنڈل کھلوائے گا اور پھر غیر ضروری طور پر تاخیر ہوگی۔ مگر عین اس وقت محمد حنیف صاحب اتفاقاً وہاں آگئے جو ایئرپورٹ پر بڑے افسر ہیں۔ ان کی ہدایت پر کسٹم والے نے ہم کو روکنے کے بجائے ہماری گاڑی خود لے لی اور اس کو ٹیکسی تک پہنچایا۔ میں نے سوچا کہ کاش اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بھی ایسا ہی معاملہ فرمائے اور میرے معاملہ کو اپنی رحمت سے آسان

کردے۔

دہلی ایئرپورٹ سے ہم "پری پیڈ" ٹیکسی کے ذریعہ روانہ ہوئے۔ اس کا انتظام پولیس کی طرف سے کیا گیا ہے۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا کہ اس سفر کے لئے ہم نے آپ کے آفس کو ڈیڑھ سو روپئے ادا کئے ہیں۔ اس میں کتنا آپ کا ہے اور کتنا دفتر کا۔ ڈرائیور نے کہا کہ دفتر فی ٹیکسی دو روپیہ لیتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تو زیادہ رقم نہیں۔ ڈرائیور نے کہا کہ ایئرپورٹ کے لئے یہاں چار سو ٹیکسیاں ہیں اور ہر ایک ٹیکسی سے دو دو روپیہ لیتے ہیں۔ اس طرح ان کا حصہ ہم سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ چار سو ٹیکسیاں ہیں تو روزانہ ان کو ۸۰۰ روپیہ ملیں گے۔ ڈرائیور نے کہا کہ نہیں۔ ہر ٹیکسی ایک دن میں اوسطاً تین چکّر ایئرپورٹ کا کرتی ہے۔ اس طرح ان کو ہر روز کم از کم ڈھائی ہزار روپے مل جاتے ہیں۔

یہ انفرادی عمل اور اجتماعی عمل کے فرق کی ایک مثال ہے۔ فرد کا حصہ ایک بار کے سفر پر ڈیڑھ سو روپیہ ہے۔ اور اجتماعی نظم کا حصہ صرف دو روپیہ۔ مگر مجموعی نتیجہ کے اعتبار سے فرد کے حصہ میں صرف ساڑھے چار سو روپیہ آیا، اور اجتماعی نظم کو ڈھائی ہزار روپیہ مل گیا۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ اجتماعیت میں برکت ہے۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۹۱ کی صبح کو میں اس وقت دہلی واپس پہنچا جب کہ یہاں کی مسجدوں سے فجر کی اذان کی آواز بلند ہو رہی تھی اور پوری فضا اس سے ہم آہنگ ہو کر بزبان خاموش یہ کہہ رہی تھی کہ — رات ختم ہو گئی۔ بہت جلد افق سے نئے دن کا سورج طلوع ہونے والا ہے۔

ایک سفر

لاہور کے سفر کی بات بہت عرصہ سے چل رہی تھی۔ لاہور میں اسلام پسند نوجوانوں کا ایک حلقہ ہے۔ اس کی طرف سے مجھے سفر کی دعوت دی گئی۔ اس سلسلہ میں ۸۸ - ۱۹۸۷ میں جناب نعیم بلوچ صاحب سے خط وکتابت ہوتی رہی۔ مگر کوئی قطعی پروگرام نہ بن سکا۔ آخر کار جناب کرامت اللہ شیخ صاحب کی دعوت پر پروگرام طے ہوگیا۔ خط اور ٹیلیفون کے ذریعہ تفصیلات کی بابت تبادلہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ طے پاگیا کہ میں ۱۹ ستمبر کو لاہور پہنچوں۔

۱۹ ستمبر ۱۹۹۱ کی سہ پہر کو میں دہلی سے لاہور کے لئے روانہ ہوا۔ آج کے ٹائمس آف انڈیا (۱۹ ستمبر) کے صفحہ اول پر وزیر اعظم ہند مسٹر نرسمہا راؤ کا ایک بیان چھپا تھا۔ اس کی سرخی یہ تھی ـــــ پاکستان سے معاملہ کرنے کے لئے تیار رہو:

Be ready to deal with Pakistan

ایرپورٹ پہنچ کر پی آئی اے کی فلائٹ نمبر ۲۷۱ کے اندر داخل ہوا۔ جہاز میں پاکستانی اخبارات پڑھنے کے لئے موجود تھے۔ لاہور کے روزنامہ جنگ (۱۹ ستمبر) کے صفحہ ۴ پر "بیرونی خطرات" کے عنوان سے ایک مضمون تھا۔ اس میں دوبارہ سابق چیف آف آرمی اسٹاف جنرل اسلم بیگ کا آخری بیان نقل کیا گیا تھا۔ "ہمارے وطن عزیز کی سرحدوں پر جنگ کے گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں"۔

روس اور امریکہ نے سپر پاور ہوتے ہوئے سرد جنگ اور گرم جنگ کو مکمل طور پر ختم کر دیا۔ اب دونوں کے درمیان کوئی بھی جنگ کی بات نہیں کرتا۔ یہ محض دو ملکوں کا فیصلہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک زمانی فیصلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب سرد جنگ یا گرم جنگ کا دور ختم ہوگیا۔ مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سپر پاور زخواہ جنگی زبان بولنا بند کر دیں۔ مگر منی پاورز کے درمیان جنگی زبان کا رواج بدستور باقی رہے گا۔

دن کے ڈھائی بجے دہلی انٹرنیشنل ایرپورٹ پہنچا تھا۔ یہاں باہر اور اندر تقریباً سناٹے کا عالم نظر آیا۔ جب کہ رات کے وقت یہاں ہر طرف آدمیوں کا ہجوم دکھائی دیتا ہے۔ یہ ہندستان کی پسماندگی

کی قیمت ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں ایرپورٹ پر دن کے وقت چہل پہل ہوتی ہے اور غیر ترقی یافتہ ملکوں میں رات کے وقت۔ ترقی یافتہ ملک اپنے شہریوں کی سہولت کے لئے رات کے وقت جہازوں کو اترنے یا روانہ ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔ جدید دنیا میں ترقی یافتہ ملک کا باشندہ ہر جگہ برتر حیثیت میں ہوتا ہے اور غیر ترقی یافتہ ملک کا باشندہ ہر جگہ کم تر حیثیت میں۔

دنیا میں جو تقسیم ترقی اور بے ترقی کی بنیاد پر ہے، آخرت میں وہ تقسیم مزید اضافہ کے ساتھ صالح اور غیر صالح کی بنیاد پر قائم ہو جائے گی۔ موجودہ دنیا کی تقسیم علامتی صورت میں آخرت میں پیش آنے والے واقعہ کا اعلان ہے۔ مگر اس اعلان کو سننے کے لئے وہ کان درکار ہیں جو خاموش آوازوں کو اسی طرح سنیں جس طرح کوئی شخص لاؤڈ اسپیکر کی چیخ کو سنتا ہے اور اس کو سمجھ لیتا ہے۔

ایرپورٹ کے اندر انتظار گاہ میں ٹیلیفون لگے ہوئے ہیں جن پر لکھا ہوا ہے "فری ٹیلیفون" میں نے اپنے یہاں کا نمبر ڈائل کیا۔ ہمارے دفتر کے ٹیلیفون پر گھنٹی بجنے لگی۔ "ہیلو" کے تبادلہ کے ساتھ اگلے لمحہ دفتر سے ربط قائم ہو گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے "غائب" حیثیت رکھتے تھے، مگر ہم دونوں "حاضر" کی طرح باہم گفت گو کر رہے تھے۔

یہ ایک سادہ سا واقعہ ہے۔ مگر جب بھی ایسا ہوتا ہے تو میں سوچنے لگتا ہوں کہ جس دنیا میں "انسان غائب" سے رابطہ قائم کرنا ممکن ہو، وہاں "خدائے غائب" سے رابطہ قائم کرنا کیوں ممکن نہ ہوگا۔ بلاشبہ یہ ممکن ہے: ولکنّ اکثر الناس لا یعلمون۔

۴۵ منٹ کی پرواز کے بعد جہاز لاہور ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ پرواز اور لینڈنگ دونوں نہایت ہموار رہی۔ اندرونی سروس کا معیار بھی اچھا تھا۔ میں نے جب بھی پاکستان انٹرنیشنل سے سفر کیا ہے، اس کا معیار ہمیشہ اچھا پایا ہے۔ اس بار بھی مجھے ایسا ہی تجربہ ہوا۔

ہوائی اڈہ کے اندر عملہ کے ایک واقف کار آدمی نے میرا پاسپورٹ لے لیا اور رسمی کارروائیاں تیزی سے طے کرا دیں۔ باہر نکلے تو عین ہوائی اڈہ کے سامنے سڑک کے دوسری طرف ایک سادہ اور خوبصورت مسجد تھی۔ ساتھیوں کی رائے ہوئی کہ نماز مغرب یہاں ادا کر لی جائے۔ اس کے بعد شہر کے لئے روانہ ہوں۔ چنانچہ مغرب کی نماز اسی مسجد میں ادا کی گئی۔

مسجد کی بیرونی دیوار پر لکھا ہوا تھا: واعتصموا بحبل اللہ جمیعا۔ یہاں اکثر ہوائی

مسافر تھے۔ جب مختلف ملکوں اور قومیتوں کے لوگ ایک امام کے پیچھے صف باندھ کر کھڑے ہوئے تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کہ وہ واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً کے حکم کی عملی تصدیق کر رہے ہیں۔ یہ کیسا عجیب سبق ہے جو مسجد کے ماحول میں مسلمانوں کو دیا جاتا ہے۔ اگر یہ سبق مسلمانوں کی پوری زندگی میں شامل ہو جائے تو ان کے اندر عظیم انقلاب آجائے۔

نماز پڑھ کر باہر نکلا تو مسجد کے گیٹ پر ایک صاحب ملے۔ انھوں نے اپنا نام محمد ظفر عادل بتایا۔ انھوں نے کہا کہ میں ایک سنگین مرض میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر جواب دینے لگے تھے۔ چنانچہ میرے اندر افسردگی (depression) کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ عین اس وقت اتفاق سے آپ کی کتاب ''راز حیات'' پڑھنے کو ملی۔ اس کو پڑھ کر میری حالت بالکل بدل گئی۔ میرے اندر نیا یقین جاگ اٹھا۔ جو کام دوا نہ کر سکی تھی وہ کام اس کتاب نے کر دیا۔

لاہور میں میرا قیام جناب کرامت شیخ کے یہاں تھا۔ شام کو یہاں مختلف اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب جمع ہو گئے۔ گیارہ بجے رات تک یہ مجلس جاری رہی۔ علمی انداز میں تبادلہ خیال ہوتا رہا۔

پاکستان کا اقتصادی مرکز کراچی ہے۔ اسلام آباد اس کا سیاسی مرکز ہے۔ لاہور کو پاکستان کے علمی اور تمدنی مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ لاہور اگرچہ قدیم شہر ہے۔ مگر اس کی قدیم تاریخ کے بارہ میں زیادہ معلومات حاصل نہیں۔ غزنوی خاندان نے ۱۱۵۲ء میں اس کو اپنی راجدھانی بنایا۔ اس وقت سے وہ باقاعدہ طور پر تاریخ میں ذکر کیا جانے لگا۔ ۱۳۹۸ میں اس کو تیمور کی فوجوں نے تباہ کر دیا تھا۔ مبارک شاہ نے ۱۴۲۲ میں دوبارہ اس کو آباد کیا۔ ۱۴۵۱ میں بہلول خاں لودی نے اس پر اپنی حکومت قائم کی۔

مغل حکمراں بابر کی فوجوں نے ۱۵۲۴ میں اس پر قبضہ کر لیا، اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷) کے بعد ۱۷۹۹ میں رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کر کے اس کو اپنی وسیع سلطنت کی راجدھانی قرار دیا۔ افغانی حکمراں شاہ زماں نے ۱۲ اپریل ۱۸۰۱ کو اعلان کیا کہ وہ رنجیت سنگھ کو لاہور کا گورنر تسلیم کرتا ہے۔ مگر رنجیت سنگھ نے اس حیثیت کو قبول نہیں کیا اور ''مہاراجہ پنجاب'' ہونے کا اعلان کر دیا۔ ۱۸۴۹ سے لاہور انگریزوں کی ماتحتی میں آگیا، ۱۹۴۷ سے وہ پاکستان کا دوسرا سب سے بڑا شہر ہے۔

آج اگر مکہ میں کوئی بڑا واقعہ ہو تو اسی دن اس کی خبر پنجاب کے اس شہر میں پہنچ جائے گی۔ مگر ساڑھے تیرہ سو سال پہلے دنیا کتنی مختلف تھی۔ ۶۳۰ ء میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دس ہزار اصحاب کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور فاتحانہ طور پر مکہ میں داخل ہوئے۔ اسی ۶۳۰ میں چینی سیاح ہوان سانگ (Hsuan Tsang) سفر کرتا ہوا شمالی پنجاب پہنچا۔ مگر اس کے سفر نامہ میں نہ لاہور کا ذکر ہے اور نہ فتح مکہ کا۔ قدیم دنیا اور جدید دنیا میں کتنا زیادہ فرق ہے۔

پچھلے نبیوں کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا ہے۔ مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں میں علم کی زبردست روح پھونکی۔ اس کی وجہ سے دور اول ہی میں لوگوں نے علم اور ادب میں مہارت پیدا کی اور اسلامی واقعات کو کتابوں کی صورت میں مدون کیا۔ اس طرح اسلام کی تاریخ ماضی کے مذاہب کے برعکس، گم ہونے سے محفوظ رہ گئی۔

جس زمانہ میں میں لاہور میں تھا انھیں دنوں میں برطانیہ کی لیڈی ڈائنا لاہور آئیں۔ ۲۵ ستمبر کو انھوں نے لاہور کی بادشاہی مسجد کی زیارت کی۔ ہندستان ٹائمس (۲۷ ستمبر ۱۹۹۱) میں ایک تصویر چھپی ہے۔ اس میں ایک عورت سر پر دوپٹہ اوڑھے ہوئے اور ننگے پاؤں مسجد کے اندر چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ تصویر کے نیچے یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں:

A barefooted Princess Diana takes a walk inside historical Badshahi mosque on wensday during her one day visit to Lahore city.

لاہور کے روزنامہ امروز (۲۶ ستمبر) میں "شہزادی ڈائنا سے اسلامی ذہن کے مردوں کا مصافحہ" کے عنوان سے ایک دلچسپ نوٹ تھا۔ اس میں درج تھا کہ —— دنیا نے پاکستان ٹیلی ویژن کے خبرنامہ میں یہ خوبصورت منظر بھی دیکھا کہ اعجاز الحق سمیت اسلامی ذہن کے وفاقی وزراء والہانہ انداز میں شہزادی ڈائنا سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔ (دوسری طرف) ہمارے ملک میں جب کسی عورت کو اقتدار یا عروج حاصل ہوتا ہے تو لوگ ایسی تصاویر تلاش کرنے نکل کھڑے ہوتے ہیں جس میں اس خاتون نے کسی مرد سے ہاتھ ملایا ہو۔

"اردو زبان یہاں کے لوگوں کے لئے فیشن کی مانند ہے۔ وہ فخر کے ساتھ اردو بولتے ہیں اور اس کو بہت پسند کرتے ہیں۔" ایک صاحب نے کہا۔ میں نے اپنے تجربہ میں اس کو بالکل درست پایا۔

حقیقت یہ ہے کہ پنجاب کے لوگوں میں اردو زبان کا تقریباً وہی درجہ ہے جو ہندستان میں انگریزی کا ہے۔ لوگوں کی پڑھنے لکھنے کی زبان اردو ہے۔ ہر موضوع پر اعلیٰ کتابیں اردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ معیاری قسم کے جرائد اردو زبان میں نکلتے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان کو کمپیوٹر کی سطح پر لانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ وغیرہ۔

پاکستان کے مسلمانوں میں ایک امتیازی خصوصیت پائی جاتی ہے جو ہندستان کے مسلمانوں میں نہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کے بچے عام طور پر انگریزی اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ وہ اردو زبان سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اس بنا پر ہمارے یہاں علماء اور جدید مسلم نسل کے درمیان ایک لسانی بعد (لینگویج گیپ) پایا جاتا ہے اور وہ صورت حال پیدا ہوگئی ہے جس کو فارسی شاعر نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے:

زبان یار من ترکی ومن ترکی نمی دانم

مگر پاکستان میں یہ صورت حال نہیں۔ وہاں اعلیٰ خاندان کے بچے بھی بخوبی طور پر اردو زبان جانتے ہیں۔ اس طرح ان کے اور علماء کے درمیان زبان کی دوری پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اگرچہ بعض تجربات کی بنا پر میں نے محسوس کیا کہ خود علماء کے غیر حکیمانہ رویہ کی بنا پر یہاں کی نئی نسل علماء کے طبقہ سے زیادہ مانوس نہیں۔

میں جس کالونی میں ٹھہرا تھا، مجھے معلوم ہوا کہ اس کی مسجد کے امام صاحب کے لئے مسجد کی طرف سے باقاعدہ رہائش گاہ دی گئی ہے۔ اتفاق سے امام صاحب نے صبح کے ناشتہ پر مدعو کیا۔ اس طرح ان کی رہائش گاہ کو اندر سے دیکھنے کا موقع ملا۔

اس کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ یہ ایک صاف ستھرا فلیٹ تھا۔ جس کا کرایہ لاہور کے معیار سے تقریباً چار ہزار روپیہ ماہوار ہوگا۔ اس کے اندر بجلی اور پانی کا معقول انتظام تھا۔ ساتھ ہی ایک وسیع اور صاف ستھرا جدید طرز کا باورچی خانہ تھا۔ جس کے اندر گیس کا چولھا موجود تھا۔ اور گیس بھی سلنڈر کے بجائے پائپ کے ذریعہ آرہی تھی۔ اور یہ سب کچھ امام صاحب کے لئے بالکل فری تھا۔

اگرچہ پاکستان کے تمام ائمہ کا معیار یہی نہیں ہے۔ تاہم اس کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اور دل

سے دعا نکلی کہ کاش وہ دن آئے جب ہند و پاک کی تمام مسجدوں میں اسی طرح ائمہ کے لئے معقول تنخواہ اور صاف ستھری رہائش گاہ کا انتظام ہو۔ مساجد کے ائمہ کی حیثیت مسلم معاشرہ میں بے حد اہم ہے۔ مگر معاشی پستی کی وجہ سے ان کے اندر نہ اعلیٰ حوصلہ پیدا ہوتا اور نہ وہ اس قابل ہوتے کہ اعلیٰ سطح پر معاشرہ کی خدمت کر سکیں۔

لاہور کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں قدیم ترین زمانہ سے درس قرآن کے سلسلے کثرت سے جاری رہے ہیں۔ لاہور کے ماہنامہ حکمت قرآن (ستمبر ۱۹۹۱) کے ایک مضمون میں " لاہور کے درس قرآن " کی تفصیل بتائی گئی تھی۔ اس کے مطابق، مولانا احمد علی صاحب غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۱۹۱۷ میں شیرانوالہ دروازہ کی ایک مسجد میں درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا، یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ مضمون کے مطابق، ۱۹۷۰ میں لاہور شہر کے اندر ۱۳۰ مقامات پر قرآن کا درس جاری تھا۔

اس پر گفت گو کرتے ہوئے میں نے ایک صاحب سے کہا کہ قرآن کے فوائد حاصل کرنے کے لئے یہی کافی نہیں ہے کہ قرآن کا درس مسجدوں میں جاری کر دیا جائے۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن کا درس اپنی صحیح صورت میں دیا جارہا ہو۔ چودھری غلام احمد پرویز بھی اپنی آخر عمر تک گلبرگ میں قرآن کا درس دیتے رہے۔ مگر تمام علماء کے نزدیک ان کا درس مفید نہ تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے فلسفہ کے مطابق یہ سمجھ لیا تھا کہ " نظام ربوبیت " قرآن فہمی کی روح ہے۔ وہ اپنے اسی فلسفہ کی روشنی میں قرآن کی تفسیر کیا کرتے تھے۔

ہر فکری کتاب کی طرح، قرآن کی بھی ایک شاہ کلید ہے۔ ضروری ہے کہ آدمی اس شاہ کلید کے تعین میں غلطی نہ کرے۔ ورنہ وہ قرآن کو سمجھنے میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔ قرآن فہمی کی شاہ کلید کوئی فن، کوئی نظریہ یا کوئی علمی نکتہ نہیں ہے، قرآن فہمی کی شاہ کلید تقویٰ ہے۔ جس آدمی کے اندر یہ شرط موجود ہو وہ قرآن کو سمجھے گا۔ اور جس آدمی کے اندر یہ بنیادی شرط نہ پائی جائے وہ دوسری تمام خصوصیات کے باوجود بھٹک کر رہ جائے گا۔ وہ قرآن کا ماہر ہو کر بھی قرآن فہمی سے محروم رہے گا۔ اسی لئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: ھدیً للمتقین

کراچی (چاندنی چوک، ناظم آباد) کی محمدی مسجد کے خطیب جناب سید عبد الرؤف صاحب کو ایک تلخ تجربہ ہوا۔ انھوں نے ایک بار جامعہ کراچی میں قرآن کی تلاوت کی۔ تلاوت کے خاتمہ پر، عام قاریوں کے معمول کے خلاف، انھوں نے صدق اللہ العظیم نہیں کہا۔ اس پر ایک طالب علم نے انھیں ٹوکا اور کہا:

جناب ، آپ ایک آیت چھوڑ گئے ہیں۔

جناب عبدالرؤف صاحب پر اس کا سخت ردعمل ہوا۔ ان کے ذہن میں یہ خیال جڑ پکڑ گیا کہ چوں کہ علماء اور قراء نے اختتام تلاوت پر صدق اللہ العظیم کہنا اپنا معمول بنا لیا ہے، لہٰذا اس تواتر عمل نے عام لوگوں کے ذہنوں میں یہ مغالطہ پیدا کر دیا ہے کہ شاید یہ الفاظ بھی قرآن کا مستقل حصہ ہیں۔ ان کا یہ احساس اتنا شدید ہوا کہ وہ تلاوت قرآن کے آخر میں اس کلمہ کے کہنے کو بدعت و گمراہی سمجھنے لگے۔ چنانچہ انھوں نے اس سلسلہ میں ایک سخت مضمون لکھا جو لاہور کے ماہنامہ حکمت قرآن (نومبر، دسمبر ۱۹۸۹) میں دو قسطوں میں چھپا۔

اس مضمون کی اشاعت کے بعد جوابی ردوکد ہوئی۔ یہاں تک کہ حکمت قرآن (مارچ ۱۹۹۰) میں مدیر محترم نے لکھا کہ یہ انتہاپسندانہ نقطۂ نظر ہے۔ اگر دور اول میں اس کا معمول نہ ہو تب بھی تلاوت قرآن کے آخر میں صدق اللہ العظیم کہنا بدعت اور گمراہی نہیں۔ یہ گویا اختتام تلاوت کی علامت ہے اور اس اعتبار سے اس میں کوئی قباحت نہیں۔

میں نے ایک صاحب سے گفتگو کے دوران کہا کہ مذکورہ طالب علم کی بات محض ایک انفرادی بات تھی، اس کو اتنی زیادہ اہمیت دینا اور اس کو عمومی گمراہی سمجھ کر اس پر بحث جاری کر دینا صحیح نہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے مذہبی حلقوں میں عام طور پر یہی ذہن چھایا ہوا ہے۔ اور اختلاف کا اصل سبب یہی مزاج ہے۔

وفاق پبلی کیشنز لاہور نے ۱۰۰ صفحہ کی ایک کتاب چھاپی ہے۔ اس کا نام نفاذ اسلام: منزل بہ منزل" ہے۔ روزنامہ وفاق کے پینل نے جناب مصطفی صادق کی قیادت میں سابق صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق سے کئی انٹرویو لئے تھے۔ ان سب کو کتاب کی صورت میں جمع کر دیا گیا ہے۔ اس کے صفحہ ۸۶ پر سابق صدر پاکستان کا ایک جواب نقل کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق، انھوں نے ایک سوال کے جواب میں جلسہ جلوس کی سیاست کو بے مقصد آگ بھڑکانا بتایا۔ انھوں نے کہا:

میرے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق، جلسہ اور جلوس وقت کا ضیاع ہے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس سے عوام کی تربیت پر غلط اثرات پڑ سکتے ہیں۔ اگر (جلسہ جلوس) کا یہ طریق کار اختیار کر لیا گیا تو اس کے اثرات اچھے نہیں ہوں گے۔ میں اس کے لئے موزوں الفاظ استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ کسی نے کہا ہے:

Political activities of procession and public meeting have generated more heat than light.

اس پر گفت گو کے دوران میں نے ایک صاحب سے کہا کہ اس معاملہ میں ٹھیک یہی حالت ہندستان کی بھی ہے۔ یہاں بھی جلوس اور عوامی جلسوں کی صورت میں جو سیاسی سرگرمیاں جاری کی جاتی ہیں انھوں نے روشنی سے زیادہ گرمی پیدا کرنے کا کام کیا ہے۔ مثلاً سلمان رشدی کی کتاب کے مسئلہ پر بمبئی میں جلوس نکالا گیا اس نے ماحول میں صرف گرمی پیدا کی اور مسلمانوں کی قیمتی جانیں بے فائدہ طور پر ضائع ہوئیں۔ اسی طرح بابری مسجد کے مسئلہ پر جلسہ اور جلوس کے جو ہنگامے جاری کیے گئے اس نے بھی مسلمانوں کو کوئی روشنی نہیں دی۔ البتہ ماحول کے اندر جو گرمی پیدا ہوئی اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو مختلف قسم کے اندوہناک نقصانات اٹھانے پڑے۔

پاکستان کے سابق صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے پندرہ روزہ امپیکٹ (لندن) کو ایک انٹرویو دیا تھا۔ یہ انگریزی ہفت روزہ پاکستان کے اسلام پسند نوجوان نکالتے ہیں۔ انٹرویو زیادہ تر پاکستان میں اسلام نظام اور جمہوریت سے متعلق تھا۔ اس کا ایک سوال وجواب یہ ہے:

Q: You are trying to reform democracy. Is it not necessary to reform the administrative structure as well so that it is able to run the Islamic system you are introducing?

A: I wish I can do that, but I don't think we can. I am sorry to say that if I tell... to start growing a beard, he will be the first to say no, because I myself do not keep a beard. (Radiance Weekly, April 12, 1981)

سوال: آپ پاکستان میں جمہوریت کی اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا یہ ضروری نہیں کہ انتظامی ڈھانچہ کی بھی اصلاح کی جائے تاکہ وہ اس اسلامی نظام کو چلانے کے قابل ہوسکے جس کو آپ ملک میں لا رہے ہیں۔

جواب: میری خواہش ہے کہ میں ایسا کرسکتا۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ ہم ایسا کرسکتے ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ اگر میں انتظامی کارکنوں سے کہوں کہ تم داڑھی رکھو تو وہ سب سے پہلے نہیں کردے گا۔ کیوں کہ میں خود داڑھی نہیں رکھتا۔

اس انٹرویو کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے ایک صاحب سے کہا کہ جنرل محمد ضیاء الحق کو پاکستان میں کامل اقتدار ملا۔ وہ ساڑھے گیارہ سال تک پاکستان کے مطلق حکمراں بنے رہے۔ اس کے باوجود ان

کے لئے یہ ممکن نہ ہوسکا کہ وہ طاقت کے زور پر مکمل اسلامی نظام نافذ کردیں۔

ایسی حالت میں جو لوگ آج تشدد کی تحریکیں چلا رہے ہیں تاکہ اقتدار پر قبضہ کرکے اسلامی نظام کو نافذ کریں، وہ یا تو انتہائی نادان ہیں یا انتہائی غیر سنجیدہ۔ ان دو کے سوا کوئی اور خانہ نہیں جس میں ان کو جگہ دی جاسکے۔

۱۹۹۱ کے الکشن کے بعد انڈیا کی پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں میں جو ممبران منتخب ہوکر آئے ہیں ان میں مسلم ممبروں کی تعداد ہمیشہ سے بہت کم ہے۔ اس پر یہاں کے مسلم حلقوں میں طرح طرح کے مایوسانہ تبصرے کئے جا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں دہلی کے روزنامہ قومی آواز (۹ ستمبر ۱۹۹۱) میں مسٹر دیش راج گوئل کے قلم سے ایک مضمون چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے: "ملک کا سب سے زیادہ پریشان حال طبقہ"۔ مضمون نگار لکھتے ہیں:

سوال یہ ہے کہ کیا بھارتی پارلیمنٹ میں مسلمان ممبران کی زیادہ تعداد ان مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہوسکتی ہے جو بھارت میں انھیں درپیش ہیں۔ پاکستان کی قومی اسمبلی میں تو مسلمان ہی بھاری اکثریت میں موجود ہیں۔ پھر کیا یہ مسلم ممبران پاکستان کے مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔"

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ ہندو لیڈر کے یہ الفاظ مسلمانوں کے لئے چشم کشا حیثیت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کا مسئلہ "مسلم ممبران" حل نہیں کرسکتے۔ اگر ایسا ہوتا تو پاکستان اور بنگلہ دیش میں مسلمانوں کے مسائل حل ہوچکے ہوتے۔ مگر وہاں بھارت سے بھی زیادہ سنگین مسائل موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسائل کے حل کے لئے ہمیں خود مسلم قوم کو تیار کرنا چاہئے۔ مسلم قوم میں جب تک تعمیری انداز میں فکری بیداری نہ لائی جائے، کوئی بھی دوسری تدبیر ان کے مسائل کو حل کرنے والی نہیں، خواہ بھارت کا معاملہ ہو یا پاکستان اور بنگلہ دیش کا معاملہ۔

اگست ۱۹۹۱ کے آخری ہفتہ میں جماعت اسلامی پاکستان نے اپنے "پچاسویں یوم تاسیس" کی تقریبات لاہور میں منعقد کیں۔ اس موقع پر جماعت اسلامی کے ذمہ داروں نے پر جوش تقریریں کیں۔ اخباری رپورٹ کے مطابق، ان تقریروں میں بڑی دلچسپ باتیں کہی گئیں۔ جماعت اسلامی پاکستان اپنے آٹھ ممبران اسمبلی کے ساتھ "اسلامی جمہوری اتحاد" کی حکومت میں شامل ہے۔ مگر جماعت کے

امیر قاضی حسین احمد صاحب نے اسلامی جمہوری اتحاد کے صدر اور پاکستان کے وزیر اعظم میاں نواز شریف پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ " میاں نواز شریف اپنے انتخابی منشور کو چھوڑ چکے ہیں۔ وہ اسلامی جمہوری اتحاد کا نام تو لیتے ہیں لیکن عملاً ان پر بھارتی لابی کی گرفت ہے۔"

پاکستان کی جماعت اسلامی کے سابق امیر میاں طفیل محمد صاحب نے اپنی تقریر میں پاکستان کے شریعت ایکٹ کو ایک منافقانہ قانون بتایا۔ انھوں نے کہا کہ اس شریعت ایکٹ نے گزشتہ (ایوبی) دور کے فیملی لا کو بھی مات کر دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ " بھارت میں تو (سابق وزیر اعظم) چندر شیکھر نے مسلمانوں کو حقوق دے رکھے ہیں۔ خود پاکستان میں بھی تمام اقلیتوں کو حقوق حاصل ہیں۔ لیکن پاکستانی مسلمانوں کو حقوق حاصل نہیں" (روزنامہ وفاق، لاہور، ۲۸ اگست ۱۹۹۱، صفحہ ٦)

نوائے وقت (۳۰ اگست ۱۹۹۱) کے مطابق، جماعت اسلامی کے موجودہ اکابر کی تحریروں میں " دو قومی نظریہ، تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کا سارا کریڈٹ مولانا مودودی کو دیا گیا ہے۔" ایک طرف جماعت کے لوگ یہ کریڈٹ لینا چاہتے ہیں کہ انھوں نے پاکستان بنوا کر وہاں کے مسلمانوں کو محفوظ کر دیا۔ دوسری طرف وہی یہ بھی اعلان کر رہے ہیں کہ اس محفوظ خطہ میں بھی بھارت کی انتہائی طاقت ور لابی موجود ہے۔ اور یہ کہ پاکستانی مسلمانوں کو اتنا حق بھی حاصل نہیں جتنا بھارت میں بسے ہوئے مسلمانوں کو حاصل ہے۔ اسی بنا پر نوائے وقت (۳۰ اگست) نے ایک مضمون اس عنوان کے تحت چھاپا ہے کہ: جماعت والوں کی مت ماری گئی۔

ہندستان ٹائمس کے نمائندہ مسٹر بھابنی سین گپتا نے حال ہی میں پاکستان کا سفر کیا تھا۔ ان کی ایک رپورٹ ہندستان ٹائمس (۱۸ ستمبر ۱۹۹۱) میں چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے — بڑی کابینہ نواز شریف کی بقاء میں مددگار:

Large cabinet helps Nawaz Sharif survive.

نواز شریف (اسلامی جمہوری اتحاد) اکتوبر ۱۹۹۰ کے الکشن کے بعد برسر اقتدار آئے تھے۔ پچھلے کچھ عرصہ سے مختلف پارٹیاں ان کے خلاف شور وغل کرتی رہی ہیں۔ ان کے سخت ناقدین میں جماعت اسلامی پاکستان بھی شامل ہے جو روایتی طور پر ان کی حلیف رہی ہے۔ مزید یہ کہ حال ہی میں اسلام آباد یونیورسٹی کے ایک سینئر استاد ڈاکٹر عنایت اللہ نے ۱۹۹۰ کے الکشن کے بارہ میں اپنا

جائزہ شائع کیا ہے۔ اس کے مطابق، تقریباً چالیس حلقۂ انتخاب میں واضح طور پر انتخابی دھاندلی کی گئی تھی۔

اس قسم کے مختلف واقعات سے مسٹر نواز شریف کی سیاسی حیثیت کمزور ہو رہی تھی۔ انھوں نے اس کا آسان حل یہ نکالا کہ مخالفین کو عہدے دے کر خاموش کر دیا۔ انھوں نے ۱۱ستمبر ۱۹۹۱ کو پاکستان کی مرکزی کابینہ میں توسیع کر کے ۲۹ نئے وزیروں کو اس میں شامل کر لیا۔ اس طرح اب ان کی کابینہ میں وزیروں کی مجموعی تعداد ۵۰ ہو گئی ہے۔

اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے میں نے ایک صاحب سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مدینہ کے انصار نے حکومتی عہدہ سے دستبرداری اختیار کر لی تھی۔ گویا اسلام کے دور اول میں حکومتی عہدہ چھوڑنے والوں نے اسلام کی تاریخ بنائی تھی، اب موجودہ زمانہ میں ایسے اسلام پسند ظاہر ہوئے ہیں جو حکومتی عہدوں پر قبضہ کر کے اسلام کی تاریخ بنانا چاہتے ہیں ــــــ کیسا عجیب ہے یہ فرق جو ماضی اور حال کے درمیان پایا جاتا ہے۔

اسلام آباد کے انگریزی اخبار مسلم نے ۳۵ سالہ مہاجر لیڈر الطاف حسین کا ایک انٹرویو شائع کیا تھا۔ میں نے اس انٹرویو کی وہ نقل دیکھی ہے جو دہلی کے انگریزی اخبار انڈین اکسپریس (۱۲ مارچ ۱۹۸۸) نے صفحہ ۸ پر شائع کی تھی۔ اس انٹرویو کے مطابق مہاجر لیڈر (قائد تحریک) نے کہا کہ ہندستان کی تقسیم کے وقت جو مسلمان ہجرت کر کے پاکستان گئے، ان کو اور ان کی اولاد کو پاکستان میں تیسرے درجہ کا شہری سمجھا جاتا ہے۔ ان کو آج بھی برابر کے حقوق حاصل نہیں۔ یہاں کے قدیم باشندے ان کو خارجی سمجھتے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں کسی بھی حکومت نے ان مہاجرین کو فرزند وطن کا درجہ نہیں دیا۔

مسٹر الطاف حسین کے الفاظ میں، پاکستان میں مہاجرین کو ملازمتوں کے معاملہ میں تحفظ حاصل نہیں ہے۔ وہاں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہاں ان کی کوئی شناخت نہیں۔ یہاں ہر شخص اپنے کو پٹھان پنجابی، سندھی، بلوچی کہتا ہے اور اردو بولنے والے مہاجر ان خانوں میں سے کسی خانہ میں نہیں آتے۔ انھوں نے کہا کہ یہاں کی تمام پارٹیاں علاقائی پارٹیاں ہیں جو مذکورہ چار قومیتوں میں سے کسی ایک قومیت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس بنا پر مہاجرین نے اپنی قومی تحریک شروع کی ہے تاکہ ان کو پانچویں

قومیت کی حیثیت سے پاکستان میں جگہ مل سکے۔

مسٹر الطاف حسین نے کہاکہ ہر مہاجر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے جائز حقوق کو ناجائز طریقہ سے سلب کر لیا گیا ہے۔ اور تعلیم، روزگار، ٹیلیویژن، حتی کہ کھیلوں تک میں ان کے ساتھ امتیاز کیا جاتا ہے۔ انھوں نے شکایت کی کہ مہاجروں کو کرکٹ کی ٹیم میں منتخب ہونے کا اہل نہیں سمجھا جاتا اور اگر بعض خوش قسمت ایسے ہیں جنھیں منتخب کیا گیا تھا تو ان کو عروج پر پہنچنے سے پہلے ریٹائر کر دیا گیا۔ انھوں نے کہاکہ کراچی تک کی پولیس پنجابیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس محکمہ میں کسی مہاجر کو ملازمت نہیں دی جاتی۔

میں نے ایک صاحب سے کہاکہ پاکستان اب اپنے قیام کی نصف صدی پوری کر رہا ہے۔ مگر وہاں کے اردو خواں مسلمانوں کے لئے بھی وہی مسائل ہیں جو ہندستان کے اردو خواں مسلمانوں کو پیش آرہے ہیں۔ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ ہندستان اور پاکستان یا ہندو اور مسلم کا نہیں ہے۔ بلکہ ذہنیت کا ہے۔ یہ دراصل ذہنیت ہے جو تمام مسائل پیدا کرتی ہے، اور دوبارہ یہ ذہنیت ہی ہے جو تمام مسائل کو ختم کرنے والی ہے۔ ایک لفظ میں —— تمام مسائل کا سبب غیر حقیقت پسندی ہے۔ اور تمام مسائل کا حل حقیقت پسندی۔

ایک صاحب نے کہاکہ ہمارے یہاں اسلامی ذہن بنانے کے لئے بے شمار سرگرمیاں جاری ہیں۔ مگر پچاس سالہ کوشش کے باوجود اب تک اسلامی انداز میں لوگوں کی ذہنی تربیت نہ ہوسکی۔ میں نے کہاکہ مجھے آپ کے بیان کے نصف ثانی سے اتفاق ہے۔ مگر مجھے اس کے نصف اول سے اتفاق نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اسلامی ذہن بنانے کی حقیقی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ پھر جس چیز کی کوشش ہی نہ کی گئی ہو وہ وجود میں کیوں کر آسکتی ہے۔

صرف اسلام کا نام لینے سے اسلامی تربیت نہیں ہوتی۔ اس کی ایک مثال دیتے ہوئے میں نے کہاکہ پاکستان کے پندرہ روزہ المنبر کے تازہ شمارہ ۲۵ ستمبر 1991 میں "ضیاء الحق شہید فاؤنڈیشن" کے زیر اہتمام ہونے والی کانفرنس کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ —— "ضیاء الحق فاونڈیشن کو فوری طور پر قوم کے کردار اور فکر کی تہذیب و تربیت کا کام شروع کرنا چاہئے۔"

مگر محض اس طرح اسلام کا نام لینے سے اسلامی فکر اور اسلامی کردار پیدا نہیں ہوسکتا۔

اس کے لئے ضرورت ہوتی ہے کہ لوگوں کو حیات و کائنات کا اس طرح مطالعہ کرایا جائے کہ ان کے گردوپیش کی پوری دنیا ان کے لئے رزق ربانی کا دسترخوان بن جائے۔ مثال کے طور پر المنبر کے مذکورہ شمارہ میں سابق صدر جنرل ضیاء الحق صاحب کے تذکرہ کے تحت درج ہے کہ "یہ شہید صدر ہی تھے جن کی بدولت قرآن مجید کے لاکھوں نسخے روس میں تقسیم ہوتے رہے۔" صفحہ ۲۲۔

یہ وہی واقعہ ہے جس کا ذکر الرسالہ نومبر ۱۹۹۰ (صفحہ ۲۷) میں کیا گیا ہے۔ الرسالہ میں سوویت سسٹم کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی اعلیٰ تدبیروں کے ذریعہ حالات میں وہ تبدیلی پیدا کی جس کے نتیجہ میں سوویت یونین کی آہنی دیواریں ٹوٹ گئیں اور وہاں اسلام کا داخلہ ممکن ہو گیا۔ دوسری طرف المنبر میں اس واقعہ کو تمام تر ایک انسان کی بدولت ظہور میں آنے والا واقعہ بتایا گیا ہے۔

الرسالہ کے مضمون کو پڑھ کر آدمی کے اندر شکر خداوندی کا جذبہ امنڈے گا۔ مزید اس کے اندر یہ جذبہ ابھرے گا کہ موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کے نئے امکانات پیدا ہوئے ہیں، اور ہم کو چاہئے کہ ہم ان کو استعمال کریں۔ جب کہ المنبر کے بیان سے صرف ہیرو ورشپ کا جذبہ ابھرے گا، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلامی تربیت کے لئے موجودہ انداز کلام کس طرح ناکافی ہے۔

ایک صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کا اتنا زیادہ چرچا ہے۔ اس کے باوجود لوگوں میں حقیقی اسلامی اسپرٹ پیدا نہیں ہوئی۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اسلام کے سارے معاملہ کو فخر کا معاملہ بنا دیا گیا ہے۔ اسلامی اسپرٹ تواضع کی اسپرٹ کا نام ہے۔ اور یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ فخر کی باتیں کبھی تواضع کا مزاج پیدا نہیں کرتیں۔

میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان سے ایک ماہنامہ "ہمدرد صحت" کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کا تازہ شمارہ ستمبر ۱۹۹۱ میں ایک مضمون "قرآن حکیم کی تکریم" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں کہا گیا ہے کہ قرآن شریف کی تعظیم یہ بھی ہے کہ دوران تلاوت اس کے مضامین کے لحاظ سے قلب میں پیدا ہونے والی کیفیات اور تاثرات کا بھی اندازہ کیا جائے۔ اگر

ذکر عذاب پر خوف طاری نہ ہو، اگر جنت کی بشارت پر بشاشت پیدا نہ ہو، اگر عظمت وکبریائی کے ذکر سے دل مائل بہ سجود نہ ہو تو اس کی تکریم کا حق ادا نہیں ہوا (صفحہ ۶)

یہ بات بظاہر درست ہے۔ مگر مضمون کے آخر میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے اس بات کی نفی ہو جاتی ہے۔ آخر میں کہتے ہیں کہ: قرآن حکیم وہ دولت دارین ہے جس پر ہمیں فخر بھی کرنا چاہئے۔ اس امت کے لئے سب سے بڑا شرف اور اس کے لئے سب سے بڑا سرمایۂ افتخار قرآن شریف ہے (صفحہ ۱۱)

یہ انسانی نفسیات کے سراسر خلاف ہے۔ قرآن کو اگر آپ مسلمانوں کے سامنے فخر کی کتاب کی حیثیت سے پیش کریں اور اس کو ان کے لئے سرمایۂ افتخار بتائیں تو اس کے بعد اس احساس کا ابھرنا ناممکن ہو جاتا ہے جو تمام اصلاحات کی جان ہے۔ یعنی خوف خدا۔ جس چیز کو آدمی اپنے لئے فخر کا سامان سمجھ لے اس کے تصور سے اس کے اندر ناز کی کیفیت تو ابھر سکتی ہے مگر اس کے تصور سے اس کے اندر احتساب خویش کی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی۔

لاہور میں جو دینی حلقے ہیں ان میں سے ایک حلقہ وہ ہے جو مولانا جاوید احمد غامدی کی سربراہی میں قائم ہے۔ یہ سب کے سب نوجوان لوگ ہیں۔ ان کی اہم ترین صفت یہ ہے کہ وہ سب کے سب نہایت سنجیدہ ہیں۔ یہاں کے زمانہ قیام میں ان حضرات سے کئی بار انفرادی اور اجتماعی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کی سنجیدگی اور ان کے اسلامی ذوق کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

ان حضرات سے جو باتیں ہوئیں ان کو نقل کرنا ممکن نہیں۔ تاہم ایک چیز جس پر میں نے سب سے زیادہ زور دیا وہ دعوت ہے۔ میں نے کہا کہ دعوت الی اللہ ایک لازمی فریضہ ہے جو ہر حال میں اسی طرح اہل اسلام پر عائد ہوتا ہے جس طرح کہ نماز روزہ۔ فرق صرف یہ ہے کہ نماز روزہ ہر ہر فرد پر فرض ہے اور دعوت الی اللہ کی حیثیت فرض کفایہ کی ہے۔ یعنی کچھ لوگ اس کو ادا کر دیں تو پوری امت سے یہ فریضہ عملاً ساقط ہو جائے گا۔ ورنہ تمام امت ذمہ دار ٹھہرے گی۔

اس کام کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ مسلمان یا مسلمانوں کی پوری جماعت اصلاح یافتہ ہو جائے اس کے بعد اس کام کو انجام دیا جائے۔ دعوت سے مراد اسلام کی طرف دعوت ہے نہ کہ امت مسلمہ کی طرف دعوت۔ اس کا مطلب مدعو کو اس حقیقت واقعہ سے خبردار کرنا ہے کہ وہ اس دنیا میں

حالت امتحان میں ہے۔ موت کے بعد اس کا حساب لیا جائے گا اور اس کے بعد اس کے لئے یا تو ابدی جنت ہے یا ابدی جہنم۔ دعوت سے مراد انذار و تبشیر ہے۔ اور انذار و تبشیر میں ساری اہمیت پیغام رسانی کی ہوتی ہے۔ اس کے سوا بقیہ تمام چیزیں اضافی بن جاتی ہیں۔

ایک مجلس میں یہ سوال سامنے آیا کہ آدمی نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے۔ مگر اس کے اندر خوف خدا کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ اس کا سبب کیا ہے۔ جناب شیخ خاور محمود صاحب نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اس کے مطابق زندگی نہیں گزارتے۔ یہ جواب اگرچہ سادہ تھا مگر مبنی بر حقیقت تھا۔

یہاں ایسے لوگ بڑی تعداد میں ہیں جو الرسالہ اور دوسری کتابوں کو پڑھتے رہے ہیں اور ہمارے مشن سے بخوبی واقف ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ایک صاحب نے اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ الرسالہ کے مطالعہ سے پہلے میرے اندر منفی سوچ تھی۔ اب الحمدللہ منفی سوچ مکمل طور پر ختم ہو چکی ہے۔ اب میں نے پوری طرح مثبت سوچ کو اپنا لیا ہے اور اسی پر اپنی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ایک نوجوان نے اپنی ڈائری دی اور کہا کہ اس میں کوئی چھوٹی سی نصیحت میرے لئے لکھ دیجئے۔ میں نے یہ جملہ لکھ دیا : دانش مند وہ ہے جو چھوٹی بات کو بڑی بات کے روپ میں دیکھ سکے۔

ایک طالب علم سے میں نے پوچھا کہ پاکستان کے جو ہندو نوجوان تعلیم میں مسلم نوجوانوں سے آگے ہیں اس کا راز کیا ہے۔ اس نے کہا کہ اس سلسلہ میں مجھے خود تو ذاتی طور پہ کوئی تجربہ نہیں۔ البتہ میرے ایک ٹیچر نے ایک بار کلاس میں یہی بات کہی۔ ہم لوگوں نے ان سے پوچھا کہ اس کا سبب کیا ہے۔ ہمارے استاد نے کہا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ہندو طلبہ مشترکہ مطالعہ (combined study) کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک دوسرے کے علم سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اجتماعی مطالعہ کی بنا پر انھیں زیادہ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس مسلم طلبہ صرف انفرادی طور پر پڑھتے ہیں، ان کی معلومات کم رہتی ہیں۔ اس طرح ہندو آگے بڑھ جاتے ہیں اور مسلمان ان کے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

روزنامہ نوائے وقت (۲۴ ستمبر) میں ایک مضمون دیکھا۔ اس کا عنوان تھا: "ہندوؤں کی اسلام دشمنی" اس مضمون کا پہلا پیراگراف یہ ہے — یہ ایک ناقابل تردید اور اٹل حقیقت ہے جسے ہر پاکستانی کو مکمل طرح اپنے ذہن نشیں کر لینا چاہئے کہ پاکستان اور پاکستانیوں کا ازلی اور ابدی دشمن مسیحی نہیں، پارسی

نہیں، بدھ اور جین نہیں بلکہ ہنود بروزن یہود ہیں" (صفحہ ۱۱)

ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ یہ سراسر غیرداعیانہ انداز کلام ہے۔ اگر ہم اپنے کو داعی اور دوسری قوموں کو مدعو سمجھیں تو ہم تمام قوموں کو انسان کی نظر سے دیکھیں گے اگر بالفرض کوئی قوم زیادتی کرے تو اس کو نظرانداز کرکے اس کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کریں گے جیسا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔

عجیب بات ہے کہ اسی اخبار (نوائے وقت ۲۴ ستمبر) میں برطانیہ کی شہزادی ڈائنا کی تقریر چھپی ہوئی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ برطانی خاتون نے اسلام آباد میں تقریر کرتے ہوئے علامہ اقبال کے شعر کا حوالہ دیا۔ جنھوں نے کہا ہے کہ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو خدا سے محبت کرتے ہیں۔ وہ اس کی تلاش میں جنگل میں گھومتے ہیں۔ لیکن میں اس شخص سے محبت کروں گا جو خدا تعالیٰ کی تمام انسانیت سے پیار کرتا ہے۔ لیڈی ڈائنا نے کہا کہ اس شعر کے الفاظ دل کی گہرائیوں تک اثر کرتے ہیں اور میں اس کی گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہوں۔ (صفحہ ۶)

میں نے ایک صاحب سے اس خبر کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ محبت اپنے اندر تسخیری طاقت رکھتی ہے۔ دعوت کا سب سے بڑا ہتھیار محبت ہے۔ مگر اس دنیا میں محبت نام ہے یک طرفہ محبت کا۔ اس دنیا میں لازماً ایک کو دوسرے سے شکایت پیش آتی ہے۔ ایک کو دوسرے کی طرف سے زیادتی کا تجربہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس دنیا میں وہی شخص محبت کرسکتا ہے جو شکایتوں اور زیادتیوں کے باوجود لوگوں سے محبت کرنے کا حوصلہ کرسکے۔

کرامت شیخ صاحب (پیدائش ۱۹۳۶) آٹومیٹک بک بائنڈنگ کی مشین اپنے یہاں لگانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے وہ لندن گئے۔ وہاں کی ایک کمپنی (Muller Martini) سے انھیں یہ مشین خریدنا تھا۔ کمپنی کے دفتر سے بات کرکے یہ طے ہوا کہ اس کا نمائندہ کرامت شیخ صاحب کی قیام گاہ پر آئے گا اور ان کو ساتھ لے جاکر شوروم میں مذکورہ مشین دکھائے گا۔

طے شدہ وقت پر کمپنی کا ایک انگریز نمائندہ گاڑی لے کر آیا اور شیخ صاحب کو اپنے ساتھ لے گیا تاکہ انھیں مذکورہ مشین دکھائے۔ راستہ میں گفتگو کے دوران اسلام زیر بحث آیا۔ اس نے کہا کہ یہ کیسا مذہب اسلام ہے۔ ایک شوہر اپنی بیوی پر زیادتیاں کرتا ہے، وہ مسلسل

پریشان کرتا رہتا ہے۔ مگر وہ عورت اپنے شوہر سے طلاق نہیں لے سکتی۔

کرامت شیخ صاحب نے کہا کہ آپ کو غلط فہمی ہے۔ ایسی عورت طلاق لے سکتی ہے۔ اسلام میں اس کی اجازت ہے۔ یہ سن کر وہ مبہوت ہوگیا۔ اس نے حیرانی کے ساتھ کہا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ ہم تو سمجھے ہوئے تھے کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح گفت گو ہوتی رہی۔ آخر میں اس نے کہا ــــ جناب، آپ جیتے، میں ہار گیا۔

کرامت شیخ صاحب نے اپنا ذاتی تجربہ بتانے کے بعد کہا: موجودہ زمانہ میں اصل مسئلہ یہ ہے کہ اسلام کا پیغام دوسری قوموں تک پہنچایا ہی نہیں گیا۔ اگر ہم صحیح طور پر اسلام کا پیغام جدید انسان تک پہنچائیں تو وہ چیخ اٹھے گا اور کہے گا کہ میں غلطی پر تھا، تم حق پر ہو۔ میں تمہارے دین کو قبول کرتا ہوں۔

میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں دعوتی کام شروع نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ مسلمان اپنی "غلطی" ماننے کے لئے تیار نہیں۔ مسلمانوں کو پہلے یہ ماننا ہوگا کہ موجودہ زمانہ میں انھوں نے غلط تحریکیں چلائیں، اس کے بعد ہی ان کے درمیان صحیح دعوتی تحریک ابھر سکتی ہے۔

۲۱ ستمبر کو جناب مصطفی صادق (اڈیٹر انچیف روزنامہ وفاق) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بہت سے سبق آموز واقعات بتائے۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۸۵ میں وہ سابق صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کے ساتھ امریکہ گئے تھے۔ وہاں ہیوسٹن کی لیڈی میر نے ضیاء الحق صاحب کے اعزاز میں ہوٹل (Inn on the park) میں پارٹی دی۔ جب لوگ میز کے گرد جمع ہوگئے تو امریکی میئر نے کہا کہ آج ہمارا مہمان ایک ایسا شخص ہے جو شراب نہیں پیتا۔ اور جس کے مذہب میں شراب حرام ہے۔ اس لئے ان کے احترام میں آج ہم نے یہاں شراب کا انتظام نہیں کیا ہے۔ مہمان حضرات اس کے لئے ہمیں معاف فرمائیں:

اگلے دن وہاں کے انگریزی اخبار ہیوسٹن ٹائمز (Huston Times) میں اس پارٹی کی خبر چھپی۔ اس خبر کی سرخی اخبار نے ان الفاظ میں قائم کی تھی ــــ اسلام کے لمبے بازو ہیوسٹن تک پہنچ گئے:

Long arms of Islam reach Huston.

یہ سرخی علامتی طور پر اس امکان کو بتا رہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے ابدی طور پر رکھ دیا ہے۔ وہ یہ کہ اسلام کے بازو اتنے لمبے ہیں کہ امریکہ بھی اس کی زد سے باہر نہیں۔ موجودہ زمانہ میں اسلام کے حق میں اس امکان کو بہت کم استعمال کیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو سمجھا جائے اور اس کو پوری طرح استعمال کیا جائے۔

جنرل ضیاء الحق صاحب ساڑھے گیارہ سال تک پاکستان کے بااختیار صدر رہے۔ مگر انھوں نے اپنے لڑکوں کو کوئی عہدہ نہیں دیا۔ ان کے لڑکے عام لوگوں کی طرح بینک وغیرہ میں سروس کرتے رہے۔ مگر ضیاء الحق صاحب کی وفات کے بعد ان کے دونوں لڑکے (اعجاز الحق، انوار الحق) نے انتخاب میں حصہ لیا۔ وہ بھاری ووٹوں سے کامیاب ہوئے۔ اب دونوں لڑکے مرکزی کیبنٹ میں منسٹر ہیں۔

عام طور پر بااختیار لوگ صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ اپنے اختیار کو استعمال کرکے اپنے بیٹوں کو اچھے عہدے دلادیں۔ مگر مذکورہ مثال بتاتی ہے کہ بیٹوں کو عہدہ نہ دلانا بھی انھیں بڑی چیز دینا ہے۔ ایسے لوگوں کے بچے خواہ اپنے والد کی زندگی میں ترقی کے درجات تک نہ پہنچیں مگر باپ کے بعد وہ ضرور اعلیٰ ترقیات تک پہنچ کر رہتے ہیں۔

کرامت شیخ صاحب نے بتایا کہ سابق صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے ایک بار علماء کی مٹینگ بلائی۔ اس میں مولانا نورانی بھی تھے۔ وہ پان کھانے کے عادی ہیں۔ ان کے منھ میں پان دیکھ کر ضیاء الحق صاحب نے کہا کہ مولانا، آپ پان کھاتے ہیں، یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ مولانا نورانی نے کہا: آپ خود بھی تو سگرٹ (Dunhill) پیتے ہیں۔ ضیاء الحق صاحب نے یہ جملہ سننے کے بعد اسی وقت سگرٹ چھوڑنے کا اعلان کر دیا۔ اور پھر ساری زندگی کبھی سگرٹ نہیں پیا۔

مسجد بلال (نیو گارڈن ٹاؤن)، بڑی خوب صورت مسجد ہے۔ اس میں امام اور موذن کے لئے رہائش گاہ بھی بنی ہوئی ہے۔ میں نے امام صاحب کی رہائش گاہ کو دیکھا۔ فلیٹ کے انداز کا ایک کشادہ مکان تھا۔ نہایت صاف ستھرا بنا ہوا۔ چپس کا فرش تھا۔ جدید طرز کا باورچی خانہ اور حمام وغیرہ اس کے اندر موجود تھے۔ پانی، بجلی اور پائپ گیس کے کنکشن بھی تھے۔

بہت سے لوگ ملیں گے جو یہ کہیں کہ مسجدوں کے امام حضرات کو معاشرہ کی اصلاح کا کام کرنا

چاہئے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ائمہ کو زیادہ فعّال بنانے کے لئے ان کی معاشی حالت کو بہتر بنانا ضروری ہے۔ ائمہ کی معاشی حالت اگر عام طور پر بہتر ہو جائے تو ان کے اندر اعتماد اور حوصلہ پیدا ہوگا اور وہ معاشرہ کی اصلاح میں اپنا موثر کردار ادا کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

ایک صاحب سے میں نے پوچھا کہ پاکستان میں جو اسلامی رسالے نکلتے ہیں، ان میں سے کون سا رسالہ ہے جو ہر حلقہ میں پڑھا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہاں تو ایسا کوئی رسالہ نہیں۔ یہاں جتنے اسلامی رسالے نکلتے ہیں وہ سب کسی حلقہ سے نکلتے ہیں اور اسی حلقہ میں پڑھے جاتے ہیں ۔ یہاں اگر کوئی پرچہ ہر حلقہ میں پڑھا جاتا ہوگا تو وہ الرسالہ ہوگا۔

ایک نوجوان نے بتایا کہ یہاں انڈیا کی فلمیں پاکستانی فلموں سے زیادہ مقبول ہیں۔ انڈیا کو دوسرا ہالی وڈ کہا جاتا ہے۔ یہاں کے نوجوان کہتے ہیں کہ انگریزی ہالی وڈ امریکہ میں ہے اور اردو ہالی وڈ انڈیا میں۔ پاکستان کے سینما ہاؤسوں میں انڈیا کی فلم دکھائی نہیں جاتی۔ البتہ اس کے ویڈیو گھروں کے اندر وی سی آر پر بہت بڑے پیمانے پر دیکھے جاتے ہیں۔

گورنمنٹ فورمن کرسچین کالج یہاں کا بہت بڑا کالج ہے۔ اس کا رقبہ ۱۸۲ ایکڑ ہے۔ طلبہ کی تعداد چھ ہزار سے زیادہ ہے۔ ۲۴ ستمبر کی دوپہر کو یہاں کے آڈیٹوریم میں خطاب کے بعد اتنے زیادہ سوالات آئے کہ کاغذات کا ڈھیر لگ گیا۔ ایک سوال بہت صاف ہندی رسم الخط میں لکھا ہوا تھا۔ طلبہ کے جوش وخروش کو دیکھ کر میں نے کہا کہ آج میری سمجھ میں آگیا کہ یہاں کے لوگوں کے لئے کسی نے "زندہ دلان پنجاب" کا لفظ کیوں استعمال کیا تھا۔

عبدالمجید صاحب ٹوکیو (جاپان) میں رہتے ہیں۔ ان کا ایک خط مورخہ ۱۶ ستمبر جناب محمد اسلم اُپّل کے پاس دیکھا۔ اس میں انھوں نے جاپانیوں کے حالات لکھے تھے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ جاپانی بہت باکردار قوم ہیں۔ ان کے یہاں رشوت، سفارش، دھوکا، چوری، قتل وغیرہ کا نام تک نہیں۔ میں نے کبھی کسی مرد یا عورت کو کسی سے جھگڑتے نہیں دیکھا۔ ان کی زندگی کا مقصد یہ ہے ــــ خود خوش رہو اور دوسروں کو خوش رہنے دو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ فطری اعتبار سے اس معیار اخلاق پر ہیں جس کو حدیث میں اس طرح بتایا گیا ہے کہ "مومن وہ ہے جو دوسروں کے لئے وہی پسند کرے جو وہ اپنے

لئے پسند کرتا ہے۔" گویا کہ وہ لوگ "۵۰ فیصد" دین خداوندی کے قریب آچکے ہیں۔ اب صرف "پچاس فیصد" مزید انھیں خدا کے دین کے قریب لانا ہے۔ اس کے بعد وہ یہ کہتے ہوئے خدا کے دین میں داخل ہو جائیں گے کہ "ہم تو پہلے ہی سے اس پر ایمان لائے ہوئے تھے۔"

جناب محمد اسلم اُپّل اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور اسی کے ساتھ نہایت سنجیدہ ہیں۔ وہ ایک کالج میں استاد ہیں۔ وہ اس کے سخت خلاف ہیں کہ تعلیم گاہوں میں سیاست کو داخل کیا جائے۔ انھوں نے ایک ملاقات میں کہا کہ اگر ہماری تعلیم گاہوں کے طلبہ اور معلم سیاسی مزاج کے ہو جائیں تو اس کے بعد ہمیں کسی اور دشمن کی ضرورت نہیں:

We need not any enemy when teachers and the taught have been politicized.

مجھے ان لوگوں کے نقطہ نظر سے تو سخت اختلاف ہے جنھوں نے جدید درس گاہوں کو "قتل گاہ" بتایا۔ مگر جناب اسلم صاحب کی مذکورہ رائے سے مجھے صد فیصد اتفاق ہے۔ میری قطعی رائے ہے کہ تعلیم گاہوں سے یونین کا نظام اور سیاسی سرگرمیوں کو مطلق طور پر بند کر دینا چاہئے۔ طالب علمی کے زمانہ میں طالب علم کو صرف پڑھنا چاہئے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

ایک مجلس میں میں نے اسلام کی بنیادی تعلیمات اور دین کے بنیادی تقاضوں پر گفتگو کی۔ گفتگو ختم ہوئی تو ایک صاحب نے کہا کہ ـــــ " اور بابری مسجد کا مسئلہ" میں نے کہا کہ اجودھیا کی بابری مسجد کا مسئلہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ویسا ہی ہے جیسا لاہور کی مسجد شہید گنج کا مسئلہ۔ حقیقت یہ ہے کہ بابری مسجد کا مسئلہ مسجد کا مسئلہ نہیں بلکہ مسجد کو سیاست بنانے کا مسئلہ ہے۔ جہاں کہیں بھی آپ کسی دینی معاملہ کو سیاسی استحصال (political exploitation) کا ذریعہ بنائیں گے تو وہی ہوگا جو بابری مسجد کے ساتھ ہوا۔

آپ کے لئے اس کی ایک قریبی مثال لاہور کی مسجد شہید گنج ہے۔ اس مسجد کو ۱۹۳۵ میں سیاسی استحصال کا ذریعہ بنایا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان بننے کے ۴۵ سال بعد بھی مسجد شہید گنج تعمیر نہ ہو سکی۔ اسی سے آپ اجودھیا کی بابری مسجد کے معاملہ کو سمجھ سکتے ہیں۔ لاہور کی مسجد شہید گنج کا مسئلہ یہاں کے پرجوش لیڈروں نے پیدا کیا تھا۔ ٹھیک اسی طرح اجودھیا کی بابری مسجد کا مسئلہ

حقیقۃً ہندستان کے کچھ نااہل مسلم لیڈروں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ دونوں کا معاملہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل یکساں ہے۔

یہاں خطابات کے علاوہ روزانہ صبح وشام کثرت سے لوگ ملنے کے لئے آتے رہے اور ان سے گفتگو اور تبادلہ خیال جاری رہا۔ چوں کہ میری گفتگو کا سب سے زیادہ ابھرا ہوا موضوع دعوت ہوتا تھا، اس لئے سوال وجواب بھی اکثر براہ راست یا بالواسطہ طور پر اسی سے متعلق تھے۔

کچھ لوگوں نے میرے دعوتی نقطہ نظر سے اختلاف کیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ ہمارا سب سے پہلا کام مسلمانوں کی اصلاح ہے۔ دعوت کا مرحلہ اس کے بعد آتا ہے۔ دوسرے نے کہا کہ ہم کو پہلے اپنے ملک میں اسلام کا نظام قائم کرنا ہے اس کے بعد قوموں کو اسلام کا مخاطب بنانا ہے۔ تیسرے صاحب نے کہا کہ سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت کو درست کیا جائے۔ اس کے بعد دعوت وغیرہ کا کام کیا جائے۔ چوتھے صاحب نے کہا کہ ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم پہلے مسلم امہ کو تیار کریں، اس کے بعد یہ مسلم امہ دوسری قوموں پر دین کی گواہی کا کام انجام دے گی۔ وغیرہ۔

اس قسم کی تمام باتوں کو میں غلط سمجھتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ختم نبوت کے بعد مسلمان مقام نبوت پر ہیں۔ انذار وتبشیر کا پیغمبرانہ کام ان کی لازمی ذمہ داری ہے۔ کسی بھی عذر یا کسی بھی تاخیر کے بغیر انھیں اس کام کے لئے اٹھنا ہے۔ اور اپنی پوری طاقت کو خرچ کرکے اس کام کو انجام دینا ہے۔ اس کام کی فطری ترتیب یہ ہے کہ جن افراد کے اندر اس کا احساس پیدا ہو وہ افراد اس کام کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے دوسرے افراد بھی اٹھیں گے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آسکتا ہے کہ یہ کام اجتماعی سطح پر ہونے لگے۔

کچھ لوگوں نے کہا کہ مسلمان اس وقت ساری دنیا میں مسائل کے اندر گھرے ہوئے ہیں۔ کوئی بھی کوشش انھیں مسائل سے نجات دلانے والی نظر نہیں آتی۔ میں نے کہا کہ یہ معاملہ کسی قوم کی سازش کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی اصل ڈیوٹی (دعوت الی اللہ) کو چھوڑ رکھا ہے۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کا معاملہ سیدنا یونسؑ جیسا ہے۔ وہ دعوت کے محاذ سے ہٹ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو مچھلی نے نگل لیا۔ اسی طرح مسلمانوں کو مسائل نے نگل رکھا ہے۔ یہ حالت صرف اس وقت ختم ہوگی جبکہ

مسلمان اپنی غلطی کا احساس کریں اور دوبارہ دعوتی ڈیوٹی انجام دینے کی طرف پلٹ آئیں۔ اس کے علاوہ کسی بھی دوسری تدبیر سے یہ صورت حال ختم ہونے والی نہیں۔

لاہور کے زمانۂ قیام میں ہر روز خطابات کا پروگرام رہتا تھا۔ اس کی خبریں روزانہ اخباروں میں آتی رہیں۔ مگر اخباری رپورٹر چوں کہ خاص طرح کی زبان کے عادی ہو چکے ہیں، اس لئے بعض اوقات رپورٹنگ میں بڑی عجیب سی غلطیاں ہوئیں۔ مثلاً روزنامہ وفاق (۲۴ ستمبر) میں ایک تقریر کی رپورٹنگ میں یہ درج تھا کہ "مولانا نے کہا کہ اس وقت اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ لوگوں نے نماز روزہ ترک کر دیا ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان کو دین کی روح سے بیگانہ کیا جا رہا ہے (صفحہ ۱)

آجکل یہ مزاج ہے کہ ہر خرابی کا ذمہ دار حکومت کو بتا کر اس کی مذمت کی جاتی ہے۔ اس لئے رپورٹر کی زبان پر "بیگانہ کیا جا رہا ہے" کا جملہ آگیا۔ حالاں کہ الرسالہ پڑھنے والے جانتے ہیں کہ یہ میرا مسلک نہیں۔ میں نے اپنی بات "لازم" کے صیغہ میں کہی تھی، رپورٹر نے اس کو "متعدی" کے صیغہ میں تبدیل کر دیا۔

ایک صاحب سے صدام حسین اور ان کے پیدا کردہ خلیجی المیہ پر گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ مسلم تاریخ میں اتنی بڑی نادانی کی کوئی اور مثال مشکل سے ملے گی۔ اس کے باوجود مسلمانوں کی اکثریت ہر جگہ بشمول پاکستان صدام حسین کی حامی بن گئی۔ انھوں نے کہا کہ صدام حسین کا جرأتمندانہ انداز اور اس کا امریکہ اور اسرائیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولنا ایسا واقعہ تھا جس نے تمام مسلمانوں کو مسحور کر دیا۔

میں نے کہا کہ یہی مسلمانوں کی اصل کمزوری ہے۔ موجودہ مسلمان ایک الفاظ پسند قوم بن گئے ہیں۔ اور سیاسی لیڈران کی اسی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مگر الفاظ پسندی صرف زوال کی علامت ہے۔ امام مالک نے اپنی موطا میں قاسم بن محمد تابعی کا قول صحابہ کے بارے میں نقل کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو قول پر کچھ بھی خوش نہیں ہوتے تھے (ادرکت الناس وما یعجبون بالقول)

زندہ لوگ ہمیشہ عمل کو اہمیت دیتے ہیں اور مردہ لوگ الفاظ کو۔ صحابہ کرام زندہ لوگ تھے، اس لئے وہ عمل کو اہمیت دیتے تھے۔ موجودہ مسلمانوں میں زندگی نہیں۔ اس لئے وہ الفاظ کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں یہی ہمارا سب سے بڑا المیہ ہے۔ مسلمانوں کی یہی وہ کمزوری ہے

لاہور میں اجتماعی پروگرام

۲۰ ستمبر ۱۹۹۱	مسجد بلال نیو گارڈن ٹاؤن، خطبہ جمعہ سے پہلے تقریر، موضوع :	نماز کی حقیقت
	مسجد بلال گارڈن ٹاؤن، بعد نماز مغرب :	درس قرآن
	لاہور کے کچھ مسلم نوجوانوں سے ملاقات :	اسلامی جماعتیں
۲۱ ستمبر	قائداعظم لائبریری کے ہال میں خطاب :	اسلام اور عصر حاضر
	روزنامہ جنگ کے صدر دفتر کے ہال میں صحافیوں سے خطاب :	اسلام اور امن عالم
	پریس کونسل آف انٹرنیشنل افیرس کے تحت، ہلٹن ہوٹل :	صحابہ کرام کے کارنامے
	گارڈن ٹاؤن کے ایک مکان پر	درس حدیث
۲۲ ستمبر	قارئین الرسالہ سے ملاقات بر مکان کرامت شیخ صاحب :	تاثرات، سوال و جواب
	مسجد شان اسلام، گلبرگ میں خطاب :	اسلام کا عقیدۂ آخرت
	ہفت روزہ زندگی کی ٹیم سے تفصیلی انٹرویو :	ملت اسلامی کے مسائل
۲۳ ستمبر	روزنامہ نوائے وقت کے نمائندہ مسٹر عطاء الرحمٰن سے انٹرویو :	مسلمانان ہند کے مسائل
	ادارہ امور پاکستان کے ہال میں خطاب :	اسلام اور نیا چیلنج
	ماہنامہ اشراق کے دفتر میں ملاقات :	مسائل حاضرہ پر گفتگو
۲۴ ستمبر	گورنمنٹ فورمن کرسچین کالج میں خطاب :	اظہار اسلام
	کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کی مسجد میں خطاب :	دین کی حقیقت
	مسجد بلال، نیو گارڈن ٹاؤن میں بعد نماز مغرب :	درس حدیث
۲۵ ستمبر	نوجوانوں کے ایک حلقہ سے ملاقات :	موجودہ اسلامی تحریکیں
	گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن میں اساتذہ و طلبہ سے خطاب	عہد حاضر کا چیلنج
	مسجد بلال میں نماز مغرب کے بعد	درس حدیث
	جم خانہ کلب میں	آج کا انسان اور اسلام
۲۶ ستمبر	اخبار پاکستان کے نمائندہ مسٹر حفیظ قریشی سے انٹرویو	مسلمانان ہند کے مسائل
	نوجوانوں کے ایک اجتماع سے خطاب	توحید اور آخرت

جس نے انھیں استحصال پسند لیڈروں کی شکار گاہ بنا دیا ہے۔

کرسٹینا لیمب برطانیہ کی ایک خاتون جرنلسٹ ہیں۔ وہ فائننشل ٹائمس کی کرسپانڈنٹ کی حیثیت سے کئی سال تک پاکستان میں رہی ہیں۔ پاکستان کے بارہ میں اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں انھوں نے ۳۰۰ صفحہ کی ایک کتاب تیار کی ہے۔ یہ کتاب لندن سے چھپی ہے:

Christina Lamb,
Waiting for Allah — Pakistan's Struggle for Democracy

وہ لکھتی ہیں کہ ابتداءً جب میں پاکستان آئی تو اس سے مجھے بہت دلچسپی ہوئی۔ میں نے اس کے بارہ میں بڑی بڑی امیدیں قائم کرلیں۔ مگر حقیقی تجربات نے مجھے اس کے بارہ میں مایوس کر دیا۔ خاص طور سیاسی کرپشن پاکستان کو اتنا زیادہ برباد کر چکا ہے کہ بظاہر اس کی ترقی کا کوئی امکان نہیں۔ ان کے خیالات کا خلاصہ خود ان کے الفاظ میں یہ ہے کہ —— آؤ ہم خدا پر بھروسہ کریں اور انتظار کریں کہ وہ ہم کو نجات دے گا۔ کیونکہ ہم خود یہ کام نہیں کر سکتے:

Let us have faith in Allah and wait for Him to redeem us, because we cannot do it ourselves.

کتاب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ پاکستان کے بارہ میں برطانوی خاتون کے احساسات اس کے معاندکے احساسات نہیں ہیں بلکہ اس کے دوست کے احساسات ہیں۔ تاہم میں نے ایک صاحب سے کہا کہ پاکستان کی موجودہ صورت حال کی ذمہ داری سب سے زیادہ جس کے اوپر آتی ہے وہ یہاں کا "اسلام پسند طبقہ" ہے۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد ان لوگوں نے نہایت غیر دانش مندانہ طور پر یہ کیا کہ وہ "اسلامائزیشن آف پاکستان" کا سیاسی جھنڈا لے کر کھڑے ہو گئے۔ حالاں کہ ان کے کرنے کا کام یہ تھا کہ وہ اسلامائزیشن آف مین کے محاذ پر اپنی ساری قوتیں صرف کرتے۔ اگر وہ ایسا کرتے کہ سیاست کے معاملہ کو نارمل پولٹیکل پراسس کے حوالے کر دیتے اور خود فرد اور معاشرہ کی اصلاح کی مہم میں لگ جاتے تو یقینی طور پر پاکستان کی تاریخ اس سے مختلف ہوتی جو برطانی صحافی جیسے بہی خواہوں کو آج وہاں نظر آتی ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ مسلم دنیا کو ایٹمی طاقت بننا چاہئے۔ انھوں نے حوالہ دیا کہ لیبیا کے لیڈر

معمر قذافی نے عرب ملکوں سے کہا ہے کہ انھیں اگلے ۲۰ سال میں متحدہ طور پر ایٹمی ہتھیاروں پر مشتمل مزاحمتی طاقت بنانا چاہئے۔ انھوں نے کہا کہ اگر لیبیا نے مناسب مقدار میں طاقت ور اسلحہ بنالیا ہوتا تو پھر ہم ۱۹۸۶ میں امریکہ کی بم باری کا جواب دیتے۔ اگر ہمارے پاس نیویارک پہنچنے والے میزائل ہوتے تو اس بمباری کے جواب میں اسی وقت ہم اپنی فوجوں کو نیویارک پر میزائل پھینکنے کی ہدایت کرتے۔ اس لئے ہمیں یہ طاقت حاصل کرنا چاہئے تاکہ آئندہ امریکہ یا کوئی اور ہم پر دوبارہ حملہ کرنے کے بارے میں نہ سوچے (نوائے وقت، ۲۳ اپریل ۱۹۹۰)

میں نے کہا کہ ہتھیار کی جس طاقت کو معمر قذافی حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ سوویت روس کے پاس بھاری مقدار میں موجود تھی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے ہتھیار کو اپنے دشمن امریکہ پر استعمال کرنے کے لئے اپنے آپ کو عاجز پایا۔ چنانچہ اس نے امریکہ پر میزائل مارنے کے بجائے اس سے مصالحت کی بات چیت کی۔ حتی کہ اس مصالحت کو ممکن بنانے کے لئے اس پر راضی ہو گیا کہ وہ اپنے ہتھیاروں کو برباد کر دے۔

مختلف واقعات نے ثابت کیا ہے کہ آج دنیا اس حد تک بدل چکی ہے کہ اب تشدد کی طاقت نے اپنی اثر انگیزی کھو دی ہے۔ آج تشدد کی طاقت کے مقابلہ میں امن کی طاقت زیادہ موثر ہے۔

اس معاملہ کی ایک مثال جاپان ہے۔ جاپان نے صنعتی اعتبار سے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ مگر جاپان کے پاس آج بھی کوئی قابل ذکر فوجی طاقت نہیں۔ مگر جاپان کی تعمیری ترقی امریکہ کے لئے زیادہ بڑا خطرہ بن گئی ہے۔ امریکہ میں اوپی نین پول سے معلوم ہوا ہے کہ بیشتر امریکی روس کی فوجی طاقت کے مقابلہ میں جاپان کی صنعتی اور اقتصادی طاقت کو اپنے لئے زیادہ بڑا خطرہ سمجھتے ہیں۔

ٹائم (۳۰ اپریل ۱۹۹۰) نے ایک اوپی نین پول میں اپنے امریکی قارئین سے پوچھا کہ:

Was the U.S. right or wrong to get involved in the Vietnam War?

اس سوال کے جواب میں ۲۹ فی صد امریکیوں نے کہا کہ امریکہ اپنے اس اقدام میں رائٹ تھا اور ۷۵ فی صد امریکیوں نے کہا کہ امریکہ اپنے اس اقدام میں رانگ تھا۔ یہ ویٹ نام جنگ ختم ہونے کے پندرہ سال بعد کا جواب ہے۔ ویٹ نام کی جنگ (۷۵-۱۹۶۵) میں امریکہ کے ۵۸۰۲۲ مرد اور عورت ہلاک ہوئے۔ ویٹ نام کی جنگ ۱۹۶۵ سے ۱۹۷۵ تک جاری رہی۔

ٹائمس آف انڈیا (۳۰ستمبر ۱۹۹۱) میں یہ خبر دی گئی ہے کہ مولانا عبد القادر آزاد کو کچھ لوگ نشانہ تنقید بنا رہے ہیں جنھوں نے شہزادی ڈائنا کو بادشاہی مسجد میں داخل ہونے کی اجازت دی تھی۔ مخالفین کا کہنا ہے کہ شہزادی ڈائنا جس وقت مسجد کے اندر داخل ہوئیں ان کی ٹانگیں کھلی ہوئی تھیں، اور یہ اسلام کی رو سے جائز نہیں۔ مولانا عبد القادر آزاد نے اس کے جواب میں کہا کہ اسلام کا یہ اصول مسلم عورتوں کے لئے ہے نہ کہ غیر مسلم عورتوں کے لئے۔

خبر میں بتایا گیا ہے کہ لاہور کے ایک وکیل کی معرفت کچھ لوگوں نے مولانا عبد القادر آزاد کے خلاف ایک فوجداری کیس (criminal complaint) دائر کر دیا ہے۔ خبر میں یہ اشارہ ہے کہ اس کے پیچھے اصل میں سیاسی مقصد ہے۔ مولانا عبد القادر آزاد وزیر اعظم نواز شریف سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ نواز شریف کے مخالفین اس واقعہ کو وزیر اعظم کو بدنام کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

اسلام کو سیاسی مقصد کے لئے استعمال کرنے کی یہ سیاست مسلمانوں میں بہت عام ہے۔ مگر وہ بہت بڑا گناہ ہے اور مسلمانوں کو آخری حد تک اس سے بچنا چاہئے۔

لاہور کے ایک اخبار کے نمائندہ انٹرویو لینے کے لئے آئے۔ انھوں نے ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں دریافت کیا۔ ان کے ہاتھ میں دہلی کا انگریزی ماہنامہ "مسلم انڈیا" تھا۔ میں نے کہا کہ آپ ہندستانی مسلمانوں کی حالت اسی سے سمجھ سکتے ہیں کہ ہندستان کا مسلمان اپنے ماہنامہ کا نام "مسلم انڈیا" رکھتا ہے اور برسوں سے اس کو نکال رہا ہے۔ مگر اس کو کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ اس کے برعکس پاکستان کے ہندو اگر "ہندو پاکستان" کے نام سے اپنا ماہنامہ نکالیں تو مجھے امید نہیں کہ یہاں وہ اس کو نکالنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

میں نے کہا کہ ہندستان میں ہم کو مکمل آزادی ہے۔ وہاں "ہندستان میں اسلام کا غلبہ" (مومنٹ اگست ۱۹۹۱) کے عنوان سے مضامین چھپتے ہیں۔ حالاں کہ پاکستان میں ہندوؤں کے لئے ناممکن ہے کہ وہ "پاکستان میں ہندوازم کا غلبہ" کے عنوان سے مضامین چھاپیں۔ لاہور کے ایک صاحب ہندستان جاتے ہیں اور وہاں یہ تقریر کرتے ہیں کہ ہم آرمڈ اسٹرگل کے ذریعہ اسلامی انقلاب برپا کریں گے۔ اور وہاں ان کی تقریر پر پابندی نہیں لگتی۔ حالاں کہ انڈیا سے ایک ہندو آکر یہاں تقریر

کرے کہ ہم ہتھیاروں کے زور پر ہندو نظام قائم کریں گے ، تو ناممکن ہے کہ وہ یہاں اس قسم کی تقریر کر سکے۔

انڈیا میں ۳ لاکھ مسجدیں ہیں۔ ان مسجدوں میں اسی طرح لاؤڈ اسپیکر پر اذان ہوتی ہے جس طرح پاکستان میں ہوتی ہے۔ وہاں ہر شہر اور ہر بستی میں لاکھوں کی تعداد میں مدرسے قائم ہیں۔ اور سب کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ مسلمان اسلام کے نام پر بڑے بڑے جلسے اور کانفرنسیں کرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

انھوں نے کہا کہ "مسلم انڈیا" تو لکھتا ہے کہ مسلمان سرکاری ملازمتوں میں بہت کم ہیں۔ میں نے کہا کہ مسلم انڈیا آدھی بات لکھتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمان تعلیم میں دوسری قوموں سے بہت زیادہ پیچھے ہیں۔ اور جب تعلیم میں پیچھے ہیں تو سروسوں میں وہ برابری کا درجہ کس طرح پا سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پھر ہندستان میں ہندو مسلم فساد کیوں ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اسی بنا پر جس بنا پر پاکستان میں مسلم مسلم فساد ہوتے ہیں۔ دونوں کا سبب ایک ہی ہے۔ اور وہ ہے صبر و اعراض نہ کرنا۔

مجھے اشتیاق تھا کہ لاہور کے اس تاریخی مقام کو دیکھوں جو "مسجد شہید گنج" کے نام سے مشہور ہے۔ ۲۱ ستمبر کی شام کو جناب کرامت شیخ صاحب کے ساتھ اس کو دیکھا۔ یہ مقام یہاں کے مشہور نولکھا بازار میں واقع ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہماری گاڑی نولکھا بازار کی تنگ گلیوں میں داخل نہیں ہو سکتی۔ ہم نے گاڑی کو باہر سڑک پر چھوڑ دیا اور نولکھا بازار میں داخل ہو کر پیدل روانہ ہوئے۔ پر ہجوم گلی سے گزرتے ہوئے آخر کار ہم وہاں پہنچے جہاں مذکورہ عمارت واقع ہے۔

وہاں پہنچ کر سب سے پہلا عجیب منظر جو دکھائی دیا وہ عمارت کے مقام داخلہ پر لگا ہوا بورڈ تھا اس بورڈ پر انگریزی اور اردو میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے : گوردوارہ شہید گنج سنگھیاں۔ گویا بورڈ کے اعتبار سے یہ عمارت مسجد نہیں ہے بلکہ گوردوارہ ہے۔

یہ مقام اس وقت پاکستان وقف بورڈ کے تحت ہے۔ یہاں بورڈ کی طرف سے ایک صاحب چوکیدار کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا نام عادل بادشاہ (۵۴ سال) بتایا۔ انھوں نے کئی عبرت انگیز باتیں بتائیں۔ انھوں نے کہا کہ تقریباً ڈیڑھ سال پہلے یہاں انڈیا کے ایک مسلمان آئے۔ ان کی عمر تقریباً ۷۰ سال تھی۔ وہ اندر داخل ہوئے تو صحن میں پہنچ کر بری طرح رونے لگے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کیوں رو رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ جب انگریز پولیس نے

مسلمانوں پر گولی چلائی تھی، اس وقت میں یہاں موجود تھا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے مسلمان یہاں جمع ہیں اور اندر داخل ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن انگریز پولیس نے ایک نشان کر دیا تھا کہ اس حد سے آگے کوئی نہ بڑھے۔ مسلمان نہایت جوش میں تھے۔ وہ بڑھ کر اس حد کو پار کرتے۔ میں نے دیکھا کہ ایک مسلمان آگے بڑھا۔ پولیس نے گولی چلائی۔ اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ دوسرا مسلمان آگے بڑھا۔ دوبارہ پولیس نے گولی چلائی۔ اور اس کی لاش وہیں گر پڑی۔ اس طرح بارہ آدمی بڑھے اور سب کے سب گولی کھا کر گرتے رہے۔ اس کے بعد مجھے دیکھنے کی تاب نہ رہی۔ میں وہاں سے ہٹ گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کے بعد کیا ہوا۔

خدا بخش لائبریری جرنل کے حوالہ سے ہفت روزہ نقیب (پٹنہ) کے شمارہ ۹ ستمبر ۱۹۹۱ میں ایک دستاویز شائع ہوئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ لاہور ریلوے اسٹیشن کے قریب لنڈا بازار میں دوسو سال پہلے ایک مسجد تعمیر ہوئی جو مسجد عبد اللہ خاں کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کو لاہور کے کوتوال عبد اللہ خاں نے بنوایا تھا۔ سکھوں کی شورش کے زمانہ میں پنجاب کے مغل گورنر نے ان کی سرکوبی شروع کی۔ مسجد کے قریب ہی کوتوالی میں سکھ مجرموں کو سزا دی جاتی تھی۔ اسی زمانہ میں ایک سکھ لیڈر تارو سنگھ یہیں مارا گیا۔

اس کے بعد جب سکھوں کا راج آیا تو انھوں نے مسجد پر قبضہ کر لیا اور اس کے قریب تارو سنگھ کی یاد میں ایک سمادھی بنا دی۔ جون ۱۹۳۵ میں سکھوں نے فیصلہ کیا کہ مسجد عبد اللہ خاں (جو اب مسجد شہید گنج کہی جاتی تھی) کو ڈھا کر وہیں گوردوارہ بنا یا جائے۔ اس پر مسلمانوں میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ مسلم رہنماؤں کا ایک وفد انگریز گورنر سے ملا لیکن اس کی شنوائی نہیں ہوئی۔ اور برطانی سنگینوں کی حفاظت میں سکھوں نے مسجد کو گرا دیا۔

اس پر مسلمانوں کا بہت بڑا جلوس نکلا جو اندرون شہر سے دہلی دروازہ کے باہر پہنچا۔ یہاں پولیس نے صف بندی کی۔ مگر جلوس صف بندی کو توڑ کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے بعد پولیس اور فوج کے ساتھ مسلمانوں کا خونیں تصادم شروع ہوا جو ۴۸ گھنٹے تک جاری رہا۔ دو دن کے اندر دس بار گولی چلی۔ تیرہ نوجوان ہلاک ہوگئے اور سیکڑوں مسلمان زخمی ہوئے۔ گورنمنٹ نے مسجد کے انہدام سے پہلے ہی مسلمانوں کے لیڈر ظفر علی خاں وغیرہ کو پکڑ کر جیل میں بند کر دیا تھا۔

انگریزی حکومت نے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے مال روڈ پر مسجد شاہ چراغ کو واگزار کردیا جو تقریباً ۷۵ سال سے انگریزوں کے قبضہ میں چلی آرہی تھی۔ مگر مسلمان اس پر راضی نہیں ہوئے مجلس اتحاد ملت کے نیلی پوش رضا کاروں نے سول نافرمانی شروع کردی۔ ہزاروں نوجوان جیلوں میں چلے گئے۔ مسلمانوں کے تمام لیڈر بھی قید میں تھے۔ ایک نوجوان ابوسعید انور اور اس کے ساتھی بادشاہی مسجد کو اڈا بنا کر حکومت کے خلاف تحریک چلا رہے تھے۔

اسی کے ساتھ لاہور کی دو مسلم جماعتوں کے درمیان معرکہ گرم ہوگیا۔ دہلی دروازہ کے باہر سرخ رنگ کی دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ جو شخص ادھر سے گزرتا، احرار اس کی قمیص اتار کر سرخ رنگ میں رنگ دیتے۔ دوسری طرف موچی دروازہ کے باہر نیلے رنگ کی دیگیں تیار رہتی تھیں۔ یہاں لوگوں کے کرتے نیلے رنگ میں رنگے جارہے تھے۔ بازاروں میں سرخ پوش اور نیلی پوش کثرت سے نظر آرہے تھے۔

مجلس احرار کا نشان سرخ رنگ تھا اور مجلس اتحاد ملت کا نشان نیلا رنگ۔ مسجد شہید گنج کی تحریک کے زمانہ میں ان دونوں کا جوش اپنے شباب پر پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ وہ عام مسلمانوں کو پکڑ کر ان کے کپڑے اپنے پسندیدہ رنگ میں رنگنے لگے تھے۔ اس نے مسجد شہید گنج کے مسئلہ کو تو حل نہیں کیا۔ البتہ اس جنونی عمل کے نتیجے میں مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان ناقابل بیان نفرت پیدا ہوگئی ــــــ یہی انجام موجودہ زمانہ کی تمام مشہور مسلم تحریکوں کا ہوا ہے۔

قرآن میں حکم ہے کہ اللہ کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں ان پر سب وشتم نہ کرو، ورنہ یہ لوگ حد سے گزر کر جہالت کی بنا پر اللہ کو سب وشتم کرنے لگیں گے۔ اسی طرح ہم نے ہر گروہ کی نظر میں اس کے عمل کو خوشنما بنا دیا ہے۔ پھر ان سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔ اس وقت اللہ انھیں بتادے گا جو وہ کرتے تھے (الانعام ۱۰۹)

علماء نے کہا ہے کہ اس آیت کا حکم اس امت پر ہر حال میں باقی ہے۔ جب بھی اہل باطل طاقتور حیثیت میں ہوں اور یہ اندیشہ ہو کہ اسلام پر یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یا اللہ پر سب وشتم کیا جائے گا تو کسی مسلمان کے لئے جائز نہ ہوگا کہ وہ ان کی صلیب کو یا ان کے دین کو یا ان کے عبادت خانہ کو برا کہے اور نہ کوئی ایسا فعل کرے جس کا یہ نتیجہ نکلنے والا ہو۔ کیونکہ یہ ان کو معصیت پر ابھارنے کے ہم معنی ہے (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۷/ ۶۱)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی شریعت میں ایسے ہر اقدام سے منع کیا گیا ہے جو الٹا نتیجہ (کاؤنٹر پروڈکٹو)

ثابت ہونے والا ہو۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے بڑے پیمانہ پر یہ فعل انجام دیا ہے۔ مسجد اقصیٰ (۱۹۴۸) سلمان رشدی (۱۹۸۹) شاہ بانو بیگم (۱۹۸۵) بابری مسجد (۱۹۸۶) وغیرہ مسائل پر جو دھواں دھار تحریکیں چلائی گئیں وہ سب اسی کے تحت آتی ہیں۔ ان تحریکوں سے کوئی بھی مثبت فائدہ نہیں ملا۔ البتہ ان کا یہ ناقابل تلافی نقصان ہوا کہ ساری دنیا میں اسلام سے نفرت پیدا ہوگئی۔ دین رحمت لوگوں کی نظر میں صرف دین تشدد بن کر رہ گیا۔

۲۶ جنوری ۱۹۳۸ کو لاہور ہائی کورٹ نے مسجد شہید گنج کے مقدمہ میں مسلمانوں کے خلاف فیصلہ دیا۔ اگلے دن اسلامیہ کالج کے گراونڈ میں احتجاجی جلسہ ہو۔ اس کے بعد بادشاہی مسجد میں ایک جلسہ عام ہوا۔ شہر کے مختلف حصوں سے جلوس نکل رہے تھے۔ سب کی منزل بادشاہی مسجد تھی۔ مسجد مسلمانوں سے بھر گئی۔ مولانا ظفر علی خاں جلسہ کی صدارت کے لئے آئے۔ وہ منبر پر کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کہا: عزیزان ملت، میں تمہارے لئے ایک بشارت لایا ہوں۔ انھوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ ہر طرف اللہ اکبر کے نعرے گونجنے لگے۔ بڑی مشکل سے انھوں نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا کہ آج میری آنکھوں نے یہ روح پرور منظر دیکھا کہ ہزاروں مسلم نوجوان ننگے سر اور دیوانہ وار سڑک پر چلے جا رہے ہیں۔ ایک طالب علم کہتا ہے: تم کو کیا چاہئے (What do you want) اور پھر سب کے سب جواب دیتے ہیں: مسجد شہید گنج (Shahid ganj mosque) لوگو، جب کسی قوم کے نوجوان اس طرح فیصلہ کرلیں تو کوئی طاقت انھیں کامیابی سے روک نہیں سکتی۔

شورش کاشمیری نے اپنی کتاب "بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل" میں مسجد شہید گنج کا قصہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ اس کے کچھ حصے یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

جولائی ۱۹۳۵ میں ایک دن ہنگامہ برپا ہوگیا کہ سکھ اس مسجد کو گرا رہے ہیں۔ پورا شہر بھڑک اٹھا۔ اس روز جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز کے بعد مسلمانوں نے شہید گنج کا رخ کیا۔ ہزارہا مسلمان نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے شہید گنج کی طرف روانہ ہوگئے۔ سیکڑوں لوگ مسلح تھے۔ اور بعض نوجوانوں نے تیزاب کی پچکاریاں بھری ہوئی تھیں۔ میں بھی تماشائی کے طور پر ساتھ ہوگیا۔

جلوس شہید گنج کے چوک پر پہنچا تھا کہ اسی وقت گھڑ سوار پولیس آگئی۔ پیادہ پولیس بھی کافی تعداد میں تھی۔ سٹی مجسٹریٹ نریند رسنگھ نے آتے ہی مسلمانوں پر لاٹھی چارج کا حکم دے دیا۔

سکھوں نے شہید گنج کی بالکونی سے " راج کرے گا خالصہ " کے نعرے بلند کئے۔ مسجد بدستور گرتی رہی اگلی صبح تک مسجد کا نام ونشان نہ تھا۔ جب لاٹھی چارج کافی نہیں ہوا تو پولیس نے گولی چلائی جس میں بہت سے مسلمان ہلاک ہوگئے۔ دو دن متواتر مسلمانوں نے گولیاں کھائیں۔

اس سے پہلے سکھوں نے گوردوارہ تحریک چلائی تھی۔ ان کی بے مثال قربانیوں کے بعد گوردوارہ ایکٹ بنا تو گوردوارے مہنتوں اور گیانیوں سے لے کر گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے سپرد کئے گئے۔ اس فہرست میں شہید گنج کو بھی شامل کیا گیا۔ نواب مظفر خاں نے سکھوں کا یہ حق تسلیم کر لیا اور انھیں کے دستخطوں سے شہید گنج سکھوں کو ملی تھی۔ مسلمان اپنا دعویٰ ہار چکے تھے۔ اب گیارہ بارہ سال بعد ان کا دعوائے ملکیت برطانوی قانون کے نزدیک بے معنی تھا۔ آخر کار مورچہ ختم ہوگیا۔

اسی زمانہ میں پیر جماعت علی شاہ نے اعلان کیا تھا کہ اگر شہید گنج مسجد مسلمانوں کے حوالے نہ کی گئی تو وہ شاہی مسجد کے مینار پر چڑھ کر چھلانگ لگا دیں گے۔ مسلمان اس اعلان پر جھوم اٹھے۔ مگر شاہی مسجد کے مینار سراپا انتظار بنے کھڑے رہے۔ پیر صاحب نے عذر تراشا کہ شاہی مسجد کا امام وہابی ہے، اور وہ آج تک وہاں کی مسجد میں نہیں گئے۔

اس کے بعد ریزولیوشن پاس ہوتے رہے۔ کانفرنسیں ہوتی رہیں۔ نعرے لگے۔ جلسے ہوئے۔ لطف یہ ہے کہ شہید گنج اب بھی اسی طرح پڑی ہے اور اسلامی سلطنت کے دور میں بھی وہ سکھوں کی ملکیت تسلیم کی جاتی ہے"۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے ہمیشہ منفی تحریکیں چلائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا عام مزاج منفی مزاج بن گیا۔ اب مسلمان ہمیشہ اس وقت جوش دکھاتے ہیں جب کہ مسئلہ " مسلم ورسس نان مسلم " ہو۔ جب نان مسلم نشانہ سے ہٹ جائے تو اس کے بعد مسلمانوں کا جوش عمل بھی ختم ہو جاتا ہے۔

یہی معاملہ خود ہندوؤں کا بھی ہے۔ ہندستان کے جو ہندو مسلمانوں کے خلاف جوش دکھاتے ہیں وہ اسی لئے ایسا کر رہے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے آپ کو ان کے نشانہ پر کھڑا کر رکھا ہے۔ اگر مسلمان اپنے آپ کو ان کے نشانہ سے ہٹا لیں تو اس کے بعد ان ہندوؤں کا جوش بھی ختم ہو جائے گا۔ اور پھر اجودھیا کے " رام مندر " کا بھی وہی انجام ہوگا جو لاہور کی مسجد شہید گنج کا ہوا ہے۔

اس مزاج کا ایک دلچسپ مظاہرہ ستمبر ۱۹۹۱ میں ہوا ہے۔ دور درشن پر بچوں کے ایک پروگرام میں کوئز (Quiz) کے دوران ایک ہندو بچہ سے پوچھا گیا کہ "شو بوائے" کی تاریخ کیا ہے۔ اس نے کہا کہ آزادی سے پہلے مسٹر جناح نے یہ لفظ مولانا ابو الکلام آزاد کے لئے استعمال کیا تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں میں دور درشن کے خلاف ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ اس قول کی اصل ذمہ داری مسٹر جناح پر ہے۔ مگر مسلمانوں نے کبھی مسٹر جناح کے خلاف ہنگامہ نہیں کیا۔ البتہ یہی لفظ ٹی وی پر ایک ہندو بچہ نے دہرایا تو اس کے خلاف وہ ہنگامہ کرنے لگے۔ وہ یہ مطالبہ لے کر کھڑے ہو گئے کہ ٹی وی کے اس عملہ کو برطرف کیا جائے جس نے اس قسم کا کوئز ٹی وی پر دکھایا ہے۔

لاہور کے سفر کے لئے جب میرا رزرویشن ہوا تو اس کے مطابق، مجھے ۱۹ ستمبر کو وہاں جانا تھا اور ۲۶ ستمبر کو دہلی واپس آنا تھا۔ یہ مدت میرے لئے غیر معمولی طور پر زیادہ تھی۔ چنانچہ لاہور پہنچتے ہی یہ حال ہوا کہ میں دن گننے لگا۔ ایک ایک دن ختم ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ۲۶ ستمبر آگیا جب کہ مجھے یہاں سے روانہ ہونا تھا۔ ۲۶ ستمبر کی صبح کو جب میں اٹھا اور روانگی کی تیاری کرنے لگا تو ایسا محسوس ہوا کہ گویا میں سفر آخرت کی تیاری کر رہا ہوں۔

میں نے سوچا کہ جس طرح لاہور میں ایک ایک دن ختم ہو کر آخر کار ۲۶ ستمبر آگیا۔ اسی طرح دنیا میں بھی میرے ایک ایک دن گزر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر کار وہ لمحہ آجائے گا جب کہ دنیا سے نکل کر مجھے آخرت کی طرف سفر کرنا ہوگا۔ ایک مدت ختم ہوگئی۔ اسی طرح دوسری مدت بھی ختم ہو جائے گی۔ پہلی مدت کے خاتمہ پر انسانی سواری مجھے لاہور سے اٹھا کر دہلی پہنچا رہی ہے۔ دوسری مدت کے خاتمہ پر فرشتوں کی سواری آجائے گی اور مجھ کو دنیا سے نکال کر آخرت کے عالم میں پہنچا دے گی۔ کیسا عجیب ہے وہ وقت جو آچکا، کیسا عجیب ہے وہ وقت جو آنے والا ہے۔

۲۶ ستمبر ۱۹۹۱ کو پی آئی اے کی فلائٹ ۲۷۰ کے ذریعہ لاہور سے دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔ ایئرپورٹ پہنچا تو معلوم ہوا کہ میری سیٹ کینسل ہو چکی ہے۔ دہلی سے اگرچہ میری واپسی کی سیٹ کنفرم تھی۔ مگر قاعدہ کے مطابق، مجھے اپنی سیٹ کو ری کنفرم کرانا چاہئے تھا۔ مگر میں نہ کرا سکا۔ اس بنا پر حسب قاعدہ میری سیٹ کینسل ہو گئی۔ مگر ایئرپورٹ کے عملہ نے غیر معمولی تعاون دیا۔ مجھے سیٹ دوبارہ مل گئی۔

ایئرپورٹ پر میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ روانگی کے اعلان کا انتظار کر رہا تھا۔ ان میں جناب

امیر العظیم صاحب (انچارج شعبۂ اطلاعات جماعت اسلامی پاکستان) بھی تھے۔ امیر العظیم صاحب کے ہاتھ میں ایک "موبائل ٹیلیفون" تھا۔ ٹیلی فون کا عام تصور یہ ہے کہ گھر یا آفس میں جہاں ٹیلی فون نصب ہو، وہیں سے رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ مگر موبائل ٹیلی فون ایک چلتا پھرتا ذریعہ رابطہ ہے۔ چنانچہ امیر العظیم صاحب کے دستی ٹیلی فون پر کئی بار گھنٹی بجی۔ انھوں نے لاہور کے اندر اور لاہور کے باہر مختلف مقامات سے اس طرح گفتگو کی جیسے کہ دونوں پاس بیٹھے ہوئے ہوں۔ امیر العظیم صاحب نے کہا کہ پہلے مجھ سے ربط قائم کرنے کے لئے ضروری تھا کہ میں اپنے دفتر یا گھر میں موجود رہوں۔ اب میں خواہ جہاں بھی رہوں فوراً لوگوں کے ساتھ میرا رابطہ قائم ہو جاتا ہے۔

یہ دیکھ کر مجھے قرآن کی وہ آیت یاد آئی جس میں بتایا گیا ہے کہ تم جہاں کہیں بھی ہو اللہ تم سب کو لے آئیگا، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے (البقرہ ۱۴۸) اللہ کے لئے پوری طرح ممکن ہے کہ وہ مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے انسانوں سے ربط قائم کرے اور ان کو اپنے پاس بلالے۔ یہ ہمارا عقیدہ ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کی ایجادات نے اس عقیدہ کو واقعاتی طور پر قابل فہم بنا دیا ہے۔

جہاز کے اندر داخل ہو کر میں اپنی سیٹ پر بیٹھا تھا کہ جہاز کے عملہ کے ایک صاحب مسکراتے ہوئے میرے پاس آئے۔ ان کے ہاتھ میں لاہور کے اخبار وفاق (۲۶ ستمبر) کا شمارہ تھا۔ انھوں نے کہا کہ یہ اخبار "مولانا وحید الدین نمبر" کے طور پر نکالا گیا ہے۔ اس کی تصویروں سے میں نے سمجھا کہ وہ آپ ہی ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا: "آپ بزرگ آدمی ہیں۔ خصوصی دعائیں کریں ہمارے لئے۔ بہت برا حال ہے ہمارا"۔ ان کے چہرہ پر داڑھی تھی۔ انھوں نے اپنا نام اکرام اللہ بتایا۔

اکرام اللہ صاحب کا یہ جملہ سن کر میرے سامنے وہ مناظر گھومنے لگے جو لاہور میں میرے ساتھ گزرے تھے۔ ایک صاحب سے میری ملاقات کرائی گئی۔ وہ کرتا اور پائجامہ پہنے ہوئے تھے۔ سر پر گول ٹوپی اور چہرہ پر داڑھی تھی۔ بظاہر وہ ایک مولوی معلوم ہوتے تھے۔ مگر تعارف کرانے والے نے بتایا کہ یہ ہمارے یہاں کے فلاں شعبہ کے ڈائرکٹر ہیں۔ اسی طرح بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ کوئی چیف انجنیئر تھا اور کوئی ڈاکٹر، کوئی پروفیسر تھا اور کوئی بہت بڑا تاجر۔ مگر اسی کے ساتھ دین دار اور اسلامی تشخص کو اپنائے ہوئے۔ اسی فہرست میں اکرام اللہ صاحب کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

میں نے سوچا کہ جب پاکستان میں ایسے قابل رشک دین دار موجود ہیں تو اکرام اللہ صاحب نے ایسا

مایوسن کن جملہ کیوں کہا۔ غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ اس کا اصل سبب موجودہ اخبارات ہیں۔ یہ اخبارات ملک کے اچھے واقعات کو نمایاں نہیں کرتے۔ وہ زیادہ تر برے واقعات کو اپنے صفحات میں نمایاں کرتے ہیں۔ عام آدمی جو صبح سے شام تک اپنے کام میں مشغول رہتا ہے، اس کے لئے اخبارات ہی ملکی حالات کو جاننے کا ذریعہ ہیں۔ اخباروں کا "زرد صحافت" کا انداز انھیں ملک کے حالات کے صرف ۵۰ فیصد سے باخبر کرتا ہے۔ بقیہ ۵۰ فیصد ان کے لئے لامعلوم بنا رہتا ہے۔ اس صورت حال نے سوچنے والے لوگوں میں غیر ضروری طور پر مایوسی کی نفسیات پیدا کر دی ہے۔ حالاں کہ وہ اصل حقیقت کے مطابق نہیں۔

جہاز میں لاہور کا انگریزی اخبار پاکستان ٹائمس (۲۶ ستمبر) دیکھا۔ اس کے صفحہ اول اور صفحہ آخر پر لیڈی ڈائنا کی رنگین تصویر تھی۔ اس کے علاوہ بھی اس میں موصوفہ کی بہت سی تصویریں تھیں۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ لیڈی ڈائنا جب بادشاہی مسجد پہنچیں تو وہاں کے امام مولانا عبدالقادر نے ان کو قرآن کا ہدیہ پیش کیا اور سیرت رسول پر ایک کتاب انھیں عطا کی۔ تصویر میں دکھایا گیا تھا کہ امام صاحب سے قرآن کا ہدیہ لیتے ہوئے شہزادی ڈائنا نے اپنے سر کو دوپٹہ سے ڈھانک رکھا تھا۔ خبر کی سرخی ان الفاظ میں قائم کی گئی تھی :

Diana impressed by Lahore cultural heritage.

جہاز میں پی آئی اے کا میگزین ہم سفر (ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۹۱) موجود تھا۔ اس میں ایک مضمون کھیوڑہ کی نمک کی کانوں کے بارہ میں تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ دنیا میں نمک کے سب سے بڑے ذخائر پاکستان میں ہیں۔ یہاں کے پہاڑوں میں ایک ایسا طویل سلسلہ موجود ہے جو اندر سے مکمل طور پر نمک ہیں۔ ان پہاڑوں کو کوہستان نمک (سالٹ رینج) کہا جاتا ہے۔ دنیا میں نمک کے دوسرے سب سے بڑے ذخائر پولینڈ میں ہیں۔

نمک کی ان کانوں کو ماہرین نے "ارضیاتی عجائب گھر" کا نام دیا ہے۔ ماہرین ارضیات کا خیال ہے کہ نمک کے یہ پہاڑ تقریباً چار ارب سال پرانے ہیں۔ نمک کی یہ کانیں ۳۲۲ قبل مسیح میں سکندر اعظم کے زمانہ میں دریافت ہو چکی تھیں۔ کھیوڑہ میں سائنسی بنیادوں پر نمک کی کان کنی کا آغاز ۱۸۴۹ میں انگریزوں کے دور حکومت میں ہوا۔ کھیوڑہ کی کانوں سے ہر روز تقریباً ۲۰ ہزار من نمک نکالا جاتا ہے۔

مضمون میں بہت سی دلچسپ معلومات تھیں۔ نیز بتایا گیا تھا کہ جس مقام سے نمک کے ذخائر

کا سلسلہ شروع ہوتا ہے وہاں ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ یہ دنیا میں اپنی نوعیت کی واحد مسجد ہے۔ اس مسجد کا فرش پورا نمک کا ہے۔ اس کی دیواروں میں جو اینٹیں لگی ہوئی ہیں وہ بھی سب نمک ہیں۔ یہ مسجد ۱۵ سال پہلے بنائی گئی تھی۔

۲۶ ستمبر ۱۹۹۱ کو میں دہلی واپس پہنچا میں پاکستان میں صرف ویزا کی مدت کے بقدر رہ سکتا تھا۔ ہندستان میں میرے قیام کے لئے بظاہر اس قسم کی کوئی تحدید نہیں ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہاں بھی میرا ٹھہرنا ایک محدود مدت تک ہی کے لئے ہے۔ اس کے بعد میرے لئے آخری روانگی کا وقت آجائے گا۔ موجودہ سواری نے مجھے دہلی ایئرپورٹ پر اتارا ہے، اگلی سواری مجھے کہاں اتارے گی، اس کا علم اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں —— کیسا عجیب مرحلۂ حیات پیش آچکا ہے، کیسا عجیب مرحلۂ حیات پیش آنے والا ہے۔

ایک سفر

ستمبر ۱۹۹۲ میں ایشیا، یورپ اور افریقہ کے درمیان ایک طویل سفر ہوا۔ اس سفر کے دوران مختلف قسم کے تجربات ہوئے۔ اس کی روداد اختصار کے ساتھ یہاں لکھی جاتی ہے۔

۱۱ ستمبر کی رات کو گیارہ بجے کے بعد گھر سے دہلی ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں خوشگوار ہواؤں کے جھونکے استقبال کرتے ہوئے ملے۔ خیال آیا کہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کو سانس لینے کے لئے ہر لمحہ تازہ آکسیجن کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے یہ کیا کہ آکسیجن کی مسلسل فراہمی کا انتظام فرما دیا۔ زمین کی سطح پر آدمی جہاں بھی جائے اس کے لئے زندگی بخش ہوا (آکسیجن) پیشگی طور پر موجود ہوگی۔ یہ انتظام اس بات کا خاموش اعلان ہے کہ کائنات کی تخلیق کے پیچھے ایک بامعنی منصوبہ بندی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو طلب اور رسد میں یہ کامل ہم آہنگی ممکن نہ ہوتی۔

میں ایئر پورٹ کی انتظار گاہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ میرے قریب کی سیٹ پر ایک کافی بوڑھی خاتون بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ غیر شعوری طور پر میرے ذہن میں آیا کہ یہ معذور خاتون ایئر پورٹ کی لمبی مسافت طے کرکے کس طرح ہوائی جہاز تک پہنچے گی۔ اتنے میں ایئر پورٹ کا ایک باوردی آدمی مخصوص پہیہ والی گاڑی (Wheel chair) لے کر وہاں آگیا۔ گاڑی خوبصورت اور آرام دہ تھی۔ اس نے خاتون کو اس پر بٹھایا اور اس کو چلاتا ہوا نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

ہوائی اڈوں پر ہر جگہ اس قسم کا مفت انتظام ہوتا ہے۔ مسافر کے لئے صرف اطلاع کر دینا کافی ہے۔ اس کے بعد ہوائی اڈہ یا ایئر کمپنی کا آدمی گاڑی لے کر آئے گا اور مسافر کو اس پر بیٹھا کر احترام کے ساتھ اس کو جہاز تک پہنچا دے گا۔ معذور آدمی خصوصی توجہ کا مستحق ہوتا ہے۔ آخرت میں بھی معذوروں کے ساتھ یہی معاملہ ہوگا، بشرطیکہ وہ اللہ کی نظر میں فی الواقع معذور قرار پائیں۔

اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر بیٹھا ہوا تھا کہ وہ قصہ یاد آیا جو میں نے پاکستان کے اخبار نوائے وقت ۱۰ جولائی ۱۹۹۲ میں پڑھا تھا۔

پاکستان کے حکیم محمد سعید صاحب جون ۱۹۹۲ میں کراچی سے تیونس گئے تھے تاکہ ایک طبی کانفرنس

میں شرکت کرسکیں۔ وہ پاکستانی ایئرویز کے ذریعہ کراچی سے دہلی آئے۔ اور دہلی سے الیتالیہ کے ذریعہ براستہ روم وہ تیونس گئے۔ حکیم صاحب اپنے سفر نامہ میں لکھتے ہیں:

"اندرا گاندھی ایئرپورٹ پر الاطالیہ سے جب میں نے سوال کیا کہ کیا میرا سامان جو تیونس کے لئے بک ہے، پی آئی اے سے الاطالیہ میں منتقل ہوگیا ہے۔ تو وہ حیران ہوئے، اچھا سامان ہے، مگر پی آئی اے نے تو ہمیں ذرا بھی اطلاع نہ دی۔ ان کا تو اب دفتر بھی بند ہوگیا ہے۔ نہ جانے سامان کہاں ہے۔ میں خود حیران ہوا کہ وہ خاتون جو مجھے وی آئی پی کا مرتبہ دینے آئی تھیں۔ انھوں نے میرے سامان کو لاوارث چھوڑ دیا۔ خاصی پریشانی ہوئی۔ اندرا ایئرپورٹ پولیس کے لوگ کام آئے۔ سب تلاش میں لگ گئے۔ بالآخر سامان مل گیا اور لے سے الاطالیہ میں رکھوا دیا گیا اور میں ۱۲ بجے رات اندرا گاندھی ایئرپورٹ کے خوب صورت لاونج میں آکر بیٹھ گیا۔ (نوائے وقت، ۱۰ جولائی ۱۹۹۲)

ایک بار ایک پاکستانی دانشور نے لکھا تھا: "اسلام اور مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ہنود بروزن یہود ہیں"۔ پاکستانی اخباروں کو مذکورہ قسم کے واقعات سے سبق لینا چاہئے اور اپنے عوام کو صحیح صورتحال سے آگاہ کرنا چاہئے۔

رات کو ایک بجے سوئس ایئر کی فلائٹ نمبر ۱۸۱ کے اندر داخل ہوا۔ جدید طریقہ کے مطابق ایئرپورٹ اور جہاز کے درمیان معلق پل (Aerobridge) کا انتظام تھا۔ اس کے ذریعہ آدمی نہایت آسانی کے ساتھ چلتا ہوا جہاز کے اندر داخل ہوجاتا ہے۔ مگر مجھ کو ذاتی طور پر قدیم سیڑھی والا طریقہ زیادہ پسند ہے۔ قدیم طریقہ میں ایک رومانی لمس (romantic touch) ہے۔ یہاں قدیم اور جدید میں وہی فرق ہے جو گھوڑے اور موٹر سائیکل میں۔

راستہ میں انٹرنیشنل ہرالڈ ٹریبون (۱۱ ستمبر ۱۹۹۲) پڑھا۔ اس میں بہت سی سبق آمیز خبریں نظر سے گزریں۔ اس کے صفحہ ۲ پر پچاس سال کی چھپی ہوئی ایک خبر دوبارہ چھاپی گئی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ۱۰ ستمبر ۱۹۴۲ کو واشنگٹن حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ اس نے پچاس خاتون پائلٹوں کا انتخاب کیا ہے جو امریکہ میں ہوائی جہاز چلائیں گی۔ اس وقت ایئر ٹرانسپورٹ کمانڈ کے ڈپٹی چیف لفٹننٹ کرنل رابرٹ لو (Robert M. Love) نے پر فخر طور پر کہا تھا کہ اب میں یہ لفظ نہیں بولوں گا کہ ہمارا مین پاور بلکہ یہ کہوں گا کہ مین اینڈ وومن پاور:

I shall not say our man power,
but of our man and woman power.

اس منصوبہ کے مطابق اب امریکہ (اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں مرد پائلٹ اور خاتون پائلٹ کی تعداد برابر ہونی چاہئے۔ مگر ۱۹۴۲ کا یہ اعلان حقیقت سے زیادہ خوش فہمی پر مبنی تھا۔ میں نے بار بار مغربی ملکوں میں سفر کئے ہیں اور تقریباً ہر بڑی ہوائی کمپنی کے جہاز میں بیٹھا ہوں مگر میرے تجربہ میں ایک بار بھی کوئی خاتون پائلٹ نہیں ملی۔ خاتون پائلٹ آج بھی تقریباً نہیں کے برابر ہیں۔

فطرت کے مطابق اقدام آدمی کو کامیابی کی طرف لے جاتا ہے، اور فطرت کے خلاف اقدام صرف بربادی اور ناکامی کی طرف۔

سوئس ایئر کا ماہ ستمبر کا فلائٹ میگزین (Swissair gazette) دیکھا۔ اس کے اداریہ میں بتایا گیا تھا کہ اس وقت تقریباً تمام بڑی بڑی ہوائی کمپنیاں گھاٹے پر چل رہی ہیں۔ آئی اے ٹی اے (IATA) کی ممبر کمپنیوں کے بارہ میں اندازہ کیا گیا ہے کہ ۱۹۹۲ میں ان کی کل آمدنی ۳۰۰ ملین ڈالر ہوگی جب کہ ان کا مجموعی خرچ چھ بلین ڈالر ہوگا۔ سوئس ایئر بھی خسارہ کے مسئلہ سے دوچار ہے۔ چنانچہ اس کی موجودہ حکمت عملی ہے ــــــ پیداواری عمل کو بڑھانا اور خرچ کو گھٹانا:

raising productivity and reducing costs

سفر کے دوران جہاز میں اعلان کیا گیا کہ اب ہم جرمنی کے اوپر سے گذر رہے ہیں۔ یہ سن کر جرمنی سے متعلق کچھ یادیں تازہ ہوگئیں۔ جرمنی سے ہندستان کے کئی تاریخی واقعات وابستہ ہیں۔ ان میں سے ایک نیتاجی سبھاش چندر بوس کی جرمنی میں آمد ہے۔ وہ ان دنوں کلکتہ میں اپنے گھر کے اندر نظر بند تھے۔ انھوں نے اپنی داڑھی کو شیو کرنا چھوڑ دیا۔ دو مہینہ میں جب داڑھی بڑھ گئی تو انھوں نے مولوی کا بھیس بدلا اور کلکتہ سے بذریعہ ٹرین پشاور پہنچے۔ اور وہاں سے کابل گئے۔ اس کے بعد لمبا سفر طے کرتے ہوئے ۳ اپریل ۱۹۴۱ کو برلن پہنچ گئے۔

سبھاش چندر بوس چانکیہ کے اس اصول پر یقین رکھتے تھے کہ "دشمن کا دشمن اپنا دوست ہوتا ہے۔" چنانچہ وہ برطانیہ کے دشمن اڈولف ہٹلر سے برلن میں ملے۔ ہٹلر کھلم کھلا مدد کرنے پر راضی نہ ہوا۔ البتہ اس نے مخفی طور پر ان کے لئے کئی مدد فراہم کی۔ انھوں نے برلن میں فری انڈیا سنٹر قائم کیا۔

اسی کے ساتھ انھوں نے جاپان سے ربط قائم کیا۔ جاپانیوں نے دوسری عالمی جنگ کی ابتدا میں جب پینانگ پر قبضہ کیا تو برطانی فوج کے بہت سے ہندستانی سپاہی گرفتار ہو کر جاپان لے جائے گئے۔ سبھاش چندر بوس کی درخواست پر جاپان نے ان ہندستانی سپاہیوں کو رہا کر کے انھیں سبھاش چندر بوس کے حوالے کر دیا۔ انھوں نے دوسرے ہندستانی افراد کو ملاکر آزاد ہند فوج بنالی۔ اس تربیت یافتہ فوج کے تین ڈویزن تھے۔ ان میں سے ہر ڈویزن میں ۱۰ ہزار مسلح سپاہی تھے۔ اس کے علاوہ ۲۰ ہزار والنیٹر تھے۔

اکتوبر ۱۹۴۳ میں سبھاش چندر بوس نے انڈپنڈنٹ انڈین گورنمنٹ کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد وہ رنگون کے راستہ سے ہندستان کی سرحد پر پہنچ گئے۔ یہاں ان کا مقابلہ برطانی فوج سے ہوا۔ برطانی فوج کے پاس ہوائی جہاز تھے۔ مگر سبھاش چندر بوس کی فوج کسی ہوائی حمایت (aerial support) سے خالی تھی۔ چنانچہ اس کو شکست ہوئی۔ ۱۹ اگست ۱۹۴۵ کو سبھاش چندر بوس ایک حادثہ کا شکار ہو کر مر گئے۔

سبھاش چندر بوس نے برٹش راج کے خلاف مسلح بغاوت (armed revolt) کا منصوبہ بنایا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مجھے خون دو اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم کو آزادی دوں گا:

Give me blood and I promise you freedom.

ہزاروں آدمی سبھاش چندر بوس کی اس پکار سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے اپنا خون پیش کر دیا۔ مگر مسٹر بوس سمیت ہزاروں آدمیوں کا خون کوئی نتیجہ پیدا نہ کر سکا۔ دوسری طرف مسٹر بوس مہاتما گاندھی کے سخت خلاف تھے۔ وہ گاندھی جی اور ان کے غیر متشددانہ اور مصالحانہ انداز (conciliatory attitude) کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھئے تو مہاتما گاندھی آزادی کا انقلاب لانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور سبھاش چندر بوس ناکام رہے۔

جرمنی میں ہم جنسی کے تعلقات کا رواج ہے۔ مگر اس قسم کے تعلق کو قانونی حیثیت حاصل نہیں جیسا کہ مثلاً ڈنمارک اور نیوزی لینڈ میں ساتھ رہنے کے معاہدہ (cohabitation contract) کے نام پر موجود ہے۔ چنانچہ اگست ۱۹۹۲ کے آخر میں جرمنی کے تقریباً پچاس شہروں میں جرمن مردوں اور عورتوں کے ایک طبقہ نے مظاہرہ کیا وہ سڑکوں پر گھومے اور یہ مانگ کی کہ ہم جنس کی شادی

(same-sex marriage) کو قانونی حیثیت دے دی جائے۔ یہ جوڑے اسی طرح ایک دوسرے کے وارث ہوں جس طرح عام منکوحہ مرد اور عورت ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں میں نے ایک جرمن مسافر سے کچھ سوالات کئے۔ میری عادت ہے کہ اکثر میں سوالات کی صورت میں گفتگو کرتا ہوں۔ اس نے میرے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ میرا خیال ہے کہ یہ نامساوی قوانین جو کہ اس وقت ہمارے یہاں ہیں ان کا خاتمہ کر دینا چاہئے:

I think these unequal laws that we now have must be knocked down.

اس نے اپنا نام ایڈتھ ماریا اسٹال (Edith Maria Stoll) بتایا۔ میں نے کہا کہ نکاح کے موجودہ قوانین اَن ایکول نہیں ہیں بلکہ وہ نیچرل ہیں۔ یہ ایکول اور اَن ایکول کا مسئلہ نہیں، بلکہ نیچرل اور اَن نیچرل کا مسئلہ ہے۔

ہوائی جہاز کی چھت میں جگہ جگہ ویڈیو لگا ہوا تھا۔ اس پر جہاز سے متعلق معلومات تصویر کی صورت میں دکھائی جا رہی تھیں۔ دنیا کا نقشہ بنا کر اس پر ایک لال لکیر رینگتی ہوئی نظر آتی تھی۔ جو بتا رہی تھی کہ اب جہاز کہاں پہنچا اور کس طرف بڑھ رہا ہے۔ اسی کے ساتھ لمحہ بہ لمحہ بتایا جا رہا تھا کہ اب جہاز اپنی منزل سے کتنی دور ہے۔ آخری مرحلہ میں گنتی بتا رہی تھی کہ اب جہاز ۶۰ کیلومیٹر دور ہے، اب ۵۰ کیلومیٹر دور ہے، اب ۳۰ کیلومیٹر دور ہے۔ اس طرح کم ہوتے ہوتے گنتی آخر میں پہنچ گئی اور جہاز اپنی منزل پر اتر گیا۔

میں نے سوچا کہ یہی معاملہ انسان کی ذات کا بھی ہے۔ جوانی کی عمر تک زندگی اوپر کی طرف جاتی ہے۔ اس کے بعد تنزل شروع ہوتا ہے۔ بال میں سفیدی ظاہر ہو کر بتاتی ہے کہ اب دور زوال شروع ہو گیا۔ اسی طرح آنکھ، دانت اور دوسرے تمام اعضا کمزور ہونے لگتے ہیں۔ جسم کا ایک ایک حصہ آدمی کا ساتھ چھوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر وقت آجاتا ہے۔ موت سے پہلے ظاہر ہونے والے قدرت کے نشانات کو آدمی اگر پڑھ سکے تو موت کے امتحان میں پورا اترنا اس کے لئے آسان ہو جائے۔

جہاز ۳۹ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتا ہوا آٹھ گھنٹہ میں دہلی سے زیورک پہنچ گیا۔ میں نے

۱۱ ستمبر کو عشاء کی نماز نظام الدین (دہلی) کی قریش مسجد میں پڑھی تھی۔ ۱۲ ستمبر کو فجر کی نماز میں نے زیورک (سوئٹزرلینڈ) میں پڑھی۔ جب کہ دونوں مقامات کے درمیان تقریباً ۶۲۰۰ کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔

زیورک میں جہاز کی لینڈنگ بہت سہل تھی۔ جہاز نہایت سہولت سے رن وے پر اتر کر دوڑنے لگا۔ اتفاق سے اس وقت میں ہیرالڈ ٹریبون (۱۲ ستمبر) میں امریکہ کی اقتصادی حالت کے بارہ میں ایک رپورٹ پڑھ رہا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ اقتصادی مشکلات میں مبتلا ہے اور آئندہ اس کو اس سے بھی زیادہ سخت اقتصادی مسائل کا سامنا ہے۔ اس رپورٹ کی سرخی یہ تھی :

(Hard landing ahead)

اس کو پڑھ کر اچانک میرا ذہن آخرت کی طرف مڑ گیا۔ میں نے سوچا کہ دنیا میں تو ماہر پائلٹ اور موسم کی موافقت کی بنا پر "سہل لینڈنگ" میرے حصہ میں آئی ہے آخرت میں اگر "ہارڈ لینڈنگ" ہو تو وہاں کیا چیز ہوگی جو مجھے بچانے والی ثابت ہو۔

پائلٹ سے میں نے پوچھا کہ ہوائی جہاز کیسے اڑتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ ایک بے حد ٹکنکل بات ہے۔ تاہم آسان لفظوں میں میں کہوں گا کہ ہوائی جہاز کو ہم نہیں اڑاتے۔ بلکہ نیچر اڑاتی ہے۔ ہوائی جہاز کی چڑیا جیسی شیپ، اس کا پنکھا، ہوا کو آگے سے کھینچ کر پیچھے پھینکنا، اس قسم کے کچھ اسباب کو ہم جمع کرتے ہیں۔ اس کے بعد جہاز اپنے آپ اوپر اٹھنے لگتا ہے۔ اور پھر انجن کی حرکت سے آگے کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ اس کی سادہ مثال ایسی ہے جیسے غبارہ بغیر ہوا تو وہ زمین پر پڑا رہے گا۔ لیکن اگر آپ اس میں ہوا بھر دیں تو وہ اپنے آپ ہوا میں اوپر اٹھ جاتا ہے۔

زیورک میں ایک ایرانی سے ملاقات ہوئی۔ وہ اتفاق سے اردو جانتا تھا۔ ایران اور افغانستان وغیرہ میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اردو جانتے ہیں۔ انھوں نے گفتگو کے دوران کہا کہ اس وقت مسلمان ہر طرف محرومی کا شکار ہیں۔ کیوں کہ اسلام کے دشمن ہر جگہ ان کے حقوق سلب کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

میں نے کہا کہ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ محرومی کے اس نظریہ نے مسلمانوں سے وہ عظیم چیز چھین لی ہے جو اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر ان کو عطا کی تھی۔ اور وہ ہے دعوت کی طاقت اور داعیانہ منصب۔ داعی کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کے پاس ایک بہت بڑی چیز ہے جس کو وہ دوسروں کو دے

سکتے ہیں۔ مگر محرومی کے نظریہ نے ان سے یہ دولت چھین لی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو لوگ محرومی کے احساس میں مبتلا ہوں وہ کبھی یافت کا پیغام دینے والے نہیں بن سکتے۔

زیورک سوئزرلینڈ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ جہاز میں ویڈیو پر اس کے جو مناظر دکھائے گئے اس میں وہ خوب صورت شہر کے روپ میں نظر آرہا تھا۔ تصویر میں یہ دنیا بے حد حسین ہے۔ مگر حقیقت میں وہ ایسی حسین اور پر راحت نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دنیا کے ساتھ خوف اور حزن لگا ہوا ہے اس خوف اور حزن نے اس کو ساری معنویت کے باوجود بے معنی بنا دیا ہے۔ آخرت میں جب خوف اور حزن کو اس سے نکال لیا جائے گا تو دنیا اتنی پر لطف ہو جائے گی کہ آدمی ابدی طور پر اس سے محظوظ ہوتا رہے مگر وہ کبھی اس سے سیر نہ ہو۔

سوئزرلینڈ میں (اور اسی طرح تمام یورپ میں) مسافر کو ہر طرح کا تعاون دیا جاتا ہے۔ مثلاً سوئزرلینڈ میں آپ کو ٹرین سے سفر کرکے ایک ایسے شہر میں پہنچنا ہے جہاں سے آپ کو ہوائی جہاز پکڑنا ہے تو آپ آغاز ہی میں اپنے سامان کو ریلوے کے عملہ کو دیدیجئے۔ آپ کا سامان ٹرین سے اتار کر ہوائی جہاز میں پہنچا دیا جائے گا۔ اور پھر اسی طرح آپ کی منزل پر آپ کو مل جائے گا۔

زیورک میں اگلے جہاز کے لئے ایک گھنٹہ قیام کرنا پڑا۔ زیورک کا ایرپورٹ بہت بڑا ہونے کے ساتھ بہت عمدہ اور منظم تھا۔ ایک مقام پر دیوار کے اوپر چمکدار حرفوں میں لکھا ہوا نظر آیا:

...your efficiency is our business.

(آپ کی ایفیشنسی ہمارا بزنس ہے) یہ چیز عملاً بھی یہاں ہر طرف نظر آئی۔ میں نے سوچا کہ انڈیا کے لوگ بھی اگرچہ اس قسم کے الفاظ بولتے ہیں مگر اصل حقیقت کے اعتبار سے کہا جائے تو انڈیا کا ماٹو شاید یہ ہوگا:

to exploit you is our business

زیورک (Zurich) سوئزرلینڈ کا سب سے بڑا صنعتی مرکز ہے۔ یہاں دور تاریخ سے پہلے انسانی آبادی قائم ہو چکی تھی۔ ۵۸ ق م میں رومیوں نے اس علاقہ کو فتح کیا۔ اس کا موجودہ نام انھیں کا دیا ہوا ہے۔ تیسری صدی عیسوی میں یہاں تین مسیحی مبلغوں کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اسی مقام پر آج یہاں کا کیتھڈرل بنا ہوا ہے۔ رومی حکومت کے خاتمہ کے بعد یہاں فرانس کے مسیحیوں کی سلطنت قائم

ہوئی۔ اسی زمانہ میں شارلی مین (Charlemagne) نے موجودہ کیتھڈرل تعمیر کرایا۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب ہارون الرشید بغداد کا خلیفہ تھا۔

زیورک کا ایئرپورٹ سوئزرلینڈ کا سب سے زیادہ مصروف ایئرپورٹ ہے۔ یہاں سے ستر ملکوں کے ۱۱۰ شہروں کے لئے ڈائرکٹ فلائٹ حاصل کی جاسکتی ہے۔ اتصالات کے یہ کیسے عجیب مواقع ہیں جو موجودہ زمانہ میں ہر طرف کھل گئے ہیں اور حق کے داعیوں کو خاموش زبان میں پکار رہے ہیں کہ آؤ، ان نئے مواقع کو استعمال کرو اور خدا کا کلمہ خدا کے تمام بندوں تک پہنچا دو۔

زیورک ایئرپورٹ پر ایک تعلیم یافتہ ہندو سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہندستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر آجکل وہ جرمنی میں مقیم ہیں۔ وہ اس کانفرنس میں شریک تھے جو جرمنی کی وشو ہندو پریشد کی طرف سے اگست ۱۹۹۲ کے آخر میں فرینکفرٹ کی گوئٹے یونیورسٹی میں منعقد کی گئی۔ واضح ہو کہ گوئٹے (J.W.V. Goethe) نے کالی داس کا جرمن ترجمہ پڑھا تھا اور وہ اس کے خیالات سے متاثر تھا (10/376) اس کانفرنس کی تھیم تھی ــــ ہندوازم جدید دنیا میں:

Hinduism in the modern world

مذکورہ ہندو پروفیسر نے کہا کہ ہندوازم کا خلاصہ وحدت انسانیت (One world family) اور عدم تشدد (Non-violence) ہے مگر یہ تاریخ کا عجیب المیہ ہے کہ وہ مذہب جس میں اتنی وسعت ہے کہ وہ منکرین مذہب تک کو اپنے دائرہ میں لے لیتا ہے، وہ اس وقت تعصب کے الزام کے مقابلہ میں اپنے دفاع پر مجبور ہو رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہندو مذہب کے بارہ میں جو غلط باتیں پھیلائی جارہی ہیں ان کا دفعیہ کریں، ورنہ بالآخر وہ ہندستان کی تصویر بگاڑنے والی ثابت ہوں گی:

> We want to counter the disinformation now spreading regarding the Hindu religion; otherwise it will ultimately affect the image of India.

میں نے کہا کہ اگر آپ ہندوازم کی تصویر کو بگڑنے سے بچانا چاہتے ہیں تو آپ کو چاہئے کہ اس عمل کو بدلیں جو انڈیا میں وشو ہندو پریشد انجام دے رہی ہے۔ اس قسم کی تقریری کانفرنسوں سے تصویر درست ہونے والی نہیں۔

عجیب بات ہے کہ خود مسلمان بھی ٹھیک اسی غلطی میں مبتلا ہیں۔ موجودہ زمانہ میں وہ بے صبر ہو کر جگہ جگہ متشددانہ عمل کر رہے ہیں اور جب دنیا یہ کہنے لگتی ہے کہ اسلام تشدد کی تعلیم دیتا ہے تو فوراً وہ کانفرنس کر کے اعلان کرتے ہیں کہ یہ ڈس انفارمیشن ہے۔ ورنہ ہم تو جس مذہب پر ہیں وہ امن وسلامتی کے سوا اور کچھ نہیں۔

ہوا میں پرواز کرنے کا تخیل انسان کے اندر کب پیدا ہوا۔ اس کی کوئی قطعی تاریخ معلوم نہیں۔ تاہم تقریباً یقینی طور پر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ پرواز کا پہلا خیال انسان کے اندر اس وقت آیا جب اس نے چڑیا کو فضا میں اڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہوئے دیکھا۔

غالباً مچھلی کو دیکھ کر انسان کے اندر پانی میں تیرنے کا خیال آیا اور چڑیوں کو دیکھ کر فضا میں اُڑنے کا۔ انسان نے جلد ہی کشتی بنا کر پانی میں تیرنا شروع کر دیا۔ مگر فضا میں اڑنے کا تخیل بہت دیر میں واقعہ بن سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سادہ کشتی بنانے کا کام قدیم دستکاری کے دور میں بھی ہوسکتا تھا۔ مگر ہوائی جہاز بنانا صرف اس وقت ممکن تھا جب کہ اس سے پہلے دنیا میں صنعتی انقلاب برپا ہو چکا ہو۔

دوسری کئی چیزوں کی طرح، ہوائی جہاز کو ترقی دینے میں جنگجویانہ ذہن کا بڑا حصہ ہے۔ فرانس کا لوئی چہاردہم (Louis XIV) ایک جنگجو بادشاہ تھا۔ اس کو جب معلوم ہوا کہ ایسی سواری بنائی جاسکتی ہے جو فضا میں اڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جائے تو اس نے اس کام کی حوصلہ افزائی کی۔ ۱۶۶۰ میں اس نے اس کام کے لئے کچھ لوگوں کو ہر قسم کے وسائل دئے۔ تاہم ابتدائی نوعیت کی مشینی سواری (Powered flight) غالباً ۱۸۶۸ میں سومرسیٹ میں بنائی جاسکی۔ جہازوں کے ماڈل کو دیکھا جائے تو ان میں ایک تدریجی ارتقا نظر آئے گا۔

۱۲ ستمبر کی صبح کو سوئس ایئر کی فلائٹ کے ذریعہ آگے کے لئے روانگی ہوئی۔ تقریباً ایک گھنٹہ کی پرواز کے بعد ہم بروسیلز میں اتر گئے۔ یہاں کانفرنس کے لوگ رہنمائی کے لئے موجود تھے۔ ان کے ساتھ ہمارا قافلہ شہر کے لئے روانہ ہوا۔ بروسیلز کی سڑکیں بہت صاف ستھری نظر آئیں۔ مکانات اور دکانیں بھی نہایت آراستہ تھے۔ ہر طرف پھیلا ہوا سبزہ اور خوشگوار موسم مزید اس میں اضافہ کر رہا تھا۔

بروسیلز میں میرا قیام بیلسن ہوٹل (Belson Hotel) کے کمرہ نمبر ۱۳۶ میں تھا۔ یہ شہر

کے کنارے خوشنما مقام پر واقع ہے۔ ایک بار میں لفٹ میں تھا۔ اچانک بجلی چلی گئی۔ لفٹ رک گئی۔ اس کے اندر مکمل اندھیرا چھاگیا۔ مجھے یاد تھاکہ اس کے اندر ٹیلیفون ہے۔ مگر میرے ذہن میں یہ تھا کہ اس سے پیغام دینے کے لئے کسی نمبر کو ڈائل کرنا ہوگا اور تاریکی کی وجہ سے نمبر کو دیکھنا اور اس کو ڈائل کرنا ممکن نہیں۔ اسی حیص بیص میں رسیور اٹھایا تو اپنے آپ گھنٹی بجنے لگی۔

لفٹ کے ٹیلیفون پر نمبر ڈائل کئے بغیر صرف رسیور اٹھانے سے گھنٹی بجتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتو لفٹ کے اندر اندھیرا ہو جانے کے بعد ٹیلیفون کو استعمال کرنا ناممکن ہو جائے۔ اس کے بعد ہنگامی موقع پر اس ٹیلیفون کو صرف وہ شخص استعمال کرسکتا ہے جس کے پاس ٹارچ موجود ہو۔ یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پیش بندی کس چیز کا نام ہے۔ پیش بندی کسی بھی عمل کی کامیابی کے لئے ضروری ہے۔

۱۲ ستمبر کی شام کو لووین کی کیتھولک یونیورسٹی (Catholic University of Louvain) میں شرکاء کانفرنس کی اجتماعی ملاقات اور کھانا تھا۔ یہ یونیورسٹی چودھویں صدی عیسوی میں قائم ہوئی۔ اس میں ۲۵ ہزار طلبہ تعلیم پا رہے ہیں۔ دوسرے شعبوں کے ساتھ اس میں فیکلٹی آف تھیالوجی کا بہت بڑا شعبہ ہے۔ اس کے تحت اسلامک اسٹڈیز کا بھی انتظام ہے۔ یہ یونیورسٹی قدیم طرز کی نہایت عظیم عمارات میں واقع ہے۔

چودھویں صدی اور اس کے بعد کی صدیوں میں یورپ میں علم کا چرچا بہت زیادہ بڑھ گیا۔ یہ زیادہ تر بغداد اور اسپین کے زیر اثر تھا۔ مگر بعد کے دور میں، بڑی بڑی سلطنتوں اور بڑی شخصیتوں کے باوجود، مسلم دنیا میں علم کا چرچا باقی نہ رہا۔ علم کا آغاز مسلمانوں نے کیا تھا، مگر اس کی تکمیل کے دور میں سارا کریڈٹ مغربی قوموں نے حاصل کرلیا۔ یہی علمی پس ماندگی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ہے نہ کہ فرضی سازشیں جس کا اعلان غلط طور پر ہمارے لکھنے اور بولنے والے لوگ ہر صبح و شام کرتے رہتے ہیں۔

یونیورسٹی دیکھنے کے بعد ہوٹل واپس آیا تو کافی رات ہو چکی تھی۔ عین اس وقت کمرہ کے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ رسیور اٹھایا تو ایک عرب نوجوان قاہرہ سے بول رہے تھے۔ مجھے تعجب ہوا کہ انھوں نے برسیلز میں ہمارے ٹیلیفون کا نمبر کیسے حاصل کرلیا۔ معلوم ہوا کہ انھوں نے دہلی، لندن اور برسیلز میں

کئی ٹیلی فون کئے۔ آخر کار ان کو معلوم ہوگیا کہ میں بروسیلز کے ہیلسن ہوٹل کے کمرہ نمبر ۱۳۲۲ میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ انھوں نے بتایا کہ عرب نوجوانوں کی ایک جماعت لندن میں اور دوبارہ عرب نوجوانوں کی ایک جماعت قاہرہ میں میرا انتظار کر رہی ہے۔ اس لئے میں اپنا ٹکٹ ری روٹ کرا کر واپسی میں لندن اور قاہرہ ہوتے ہوئے دہلی واپس جاؤں۔

اس واقعہ کے بعد مجھے فارسی کا مثل یاد آگیا کہ ڈھونڈنے والا پاتا ہے (جوینده یابنده) انسانی دماغ کی یہی وہ صلاحیت ہے جس کی بنا پر وہ قیامت کے یوم الحساب میں مسئول قرار پاتا ہے۔ کیونکہ انسان اپنی صلاحیت کے اعتبار سے اس پوزیشن میں ہے کہ وہ حقیقی طور پر جس چیز کا طالب ہو اس کو وہ جان سکے۔ ایسی حالت میں اگر ایک شخص موجودہ دنیا میں زندگی گزارتا ہے مگر وہ حق سے بے خبر رہتا ہے تو یہ لازمی طور پر اس کی اپنی کوتاہی ہے۔ اور جو شخص کوتاہی کرے وہ اس عالم اسباب میں اس کے انجام سے بچ نہیں سکتا۔

مجھے ٹیلی ویژن سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس لئے کمرہ کے ٹی وی سیٹ کو استعمال کرنے کا خیال بھی مجھے نہیں آتا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ سرہانے کی چھوٹی میز پر ریموٹ کنٹرول کا سگرٹ پیکٹ جیسا آلہ رکھا ہوا تھا۔ اس کا سوئچ اتفاق سے دب گیا۔ اس کے بعد ٹی وی سیٹ کے شیشہ پر نہایت عمدہ رنگین تصویریں آنے لگیں۔ دیکھا تو سمندری زندگی اور جنگل کی زندگی کے مناظر دکھائے جارہے تھے۔ فطرت کا یہ منظر حیران کن حد تک عجیب تھا۔ محویت کے ساتھ اس کو دیکھتا رہا۔ اس کو دیکھ کر یہ آیت زبان پر آگئی: فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔

قرآن میں فطرت کے مشاہدہ اور آیات کون پر غور و فکر کے لئے بہت زور دیا گیا ہے۔ اور اس کے علم کو خشیت الٰہی کا ذریعہ بتایا گیا ہے (اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا) اس سے معلوم ہوا کہ معرفت الٰہی کا اصل ذریعہ کائنات میں پھیلی ہوئی قدرت کی نشانیوں پر غور کرنا ہے۔

ہمارے ہوٹل سے لووین کا فاصلہ ۳۰ کیلو میٹر ہے۔ ۱۲ ستمبر کی شام کو جب میں اپنے ساتھی کے ہمراہ کار میں وہاں کی تقریب میں شرکت کے لئے جارہا تھا تو سارے راستہ میں صنعتی ترقی کے مناظر دکھائی دئے سڑکوں سے لے کر عمارتوں تک ہر چیز واضح طور پر ہندستان سے مختلف نظر آئی۔

یہی تمام مغربی ملکوں کا حال ہے۔ میں نے سوچا کہ مغرب کے وسائل سے زیادہ وسائل ہندستان

کے پاس موجود ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہندستان اب تک ایک غیر ترقی یافتہ ملک بنا ہوا ہے۔ اس معاملہ پر غور کرتے ہوئے سمجھ میں آیا کہ ہندستان کا مذہب لکشمی پوجا ہے اور مغرب کا مذہب جیون پوجا۔ ہندستانی آدمی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جیسے بھی ہو زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرے۔ اس کے مقابلہ میں مغربی انسان کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہر ممکن طریقہ سے زندگی کو بہتر بنائے۔ ہندستانی آدمی زر اندوزی کو سب کچھ سمجھتا ہے جب کہ مغرب کے آدمی کے لئے سب کچھ یہ ہے کہ وہ حیات مادی کی تعمیر کرے —— سوچ کا یہی فرق ہے جس نے دونوں دنیاؤں میں وہ فرق پیدا کر دیا ہے جس کو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔

۱۳ ستمبر کو ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد ڈاکٹر لیونارڈو شہر دکھانے کے لئے گئے۔ ڈاکٹر ثانی اثنین بھی میرے ساتھ تھے۔ شہر کا کچھ حصہ کار پر بیٹھ کر دیکھا۔ اس کے بعد میں نے ڈاکٹر لیونارڈو سے کہا کہ شہر کو زیادہ اچھی طرح دیکھنے کے لئے پیدل چلنا چاہئے۔ اس لئے اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو گاڑی کسی مقام پر پارک کر دیں اور ہم لوگ پیدل چل کر شہر کو دیکھیں۔ انھوں نے اتفاق کیا۔ چنانچہ گاڑی مسجد کے پاس پارک کر دی گئی اور ہم لوگ شہر دیکھنے کے لئے چل پڑے۔

بروسیلز نہایت منظم اور نہایت خوب صورت شہر ہے۔ سڑکیں نہایت عمدہ اور صاف ستھری ہیں۔ کہیں ٹوٹ پھوٹ کا منظر دکھائی نہیں دیتا۔ چاروں طرف گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ مگر نہ ہارن کی آواز تھی اور نہ دھواں۔ خوب صورت فوٹ پاتھ ہیں مگر خوانچہ فروشوں کا کہیں وجود نہیں۔ پارک ہیں مگر شور و غل نہیں۔ دکانیں ہیں مگر لوٹ نہیں۔ سرگرمیاں ہیں مگر بے قاعدگی نہیں، مکانات ہیں مگر غیر قانونی تعمیرات نہیں۔ سارا شہر ایک ڈھلا ہوا ماڈل نظر آتا ہے۔

ایک سڑک پر چلتے ہوئے ایک بہت بڑی عمارت نظر آئی۔ سیکڑوں لوگ اندر داخل ہونے کے لئے لمبی قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔ اس کے گیٹ پر مقامی تلفظ میں لکھا ہوا تھا پارلی منٹ (Parlement) سامنے بڑا سا جھنڈا لہرا رہا تھا جس کے اوپر بارہ ستارے بنے ہوئے تھے۔

معلوم ہوا کہ یہ "یورپین پارلی منٹ" ہے۔ متحدہ یورپ کا تصور اس وقت مغربی یورپ میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ چنانچہ اس کے بارہ میں شریک ملکوں کی نمائندگی کرتے ہوئے بارہ ستاروں کا جھنڈا اپنایا گیا ہے۔ اگرچہ ملکی قومیت کے ماننے والے اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ مگر اس تحریک نے عملی صورت اختیار کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور اگر کسی وقت یورپ متحد ہو گیا تو یقینی ہے

کہ امریکہ نمبر ۲ پر چلا جائے گا۔

ایک بار برو سلز میں نماز پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ یہاں میں مشرق کی سمت میں نماز پڑھ رہا ہوں اگر کوئی شخص مجھ کو دیکھ کر کہے کہ ہندستان میں تو آپ مغرب کی طرف رخ کرکے نماز ادا کرتے تھے اور بلجیم میں مشرق کی طرف رخ کرکے نماز پڑھ رہے ہیں۔ کیا آپ نے اپنا قبلہ بدل دیا۔ حالاں کہ اسلام میں جان بوجھ کر اپنا قبلہ بدلنا کفر کے ہم معنی ہے۔

یہ تنقید بظاہر صحیح مگر باعتبار حقیقت غلط ہوگی۔ کیوں کہ مسلمان کا اصل قبلہ مشرق یا مغرب نہیں ہے۔ بلکہ کعبہ ہے۔ ہندستان میں کعبہ چونکہ مغرب کی سمت میں واقع ہے اس لئے وہاں مغرب کے رخ پر نماز ادا کی جاتی ہے۔ بلجیم میں کعبہ مشرق کے رخ پر ہو جاتا ہے اس لئے یہاں مشرق کے رخ پر نماز ادا کی جاتی ہے۔

لاہور کے اردو روزنامہ نوائے وقت (۱۳ اگست ۱۹۹۲) میں میں نے بلجیم کے بارہ میں ایک رپورٹ پڑھی تھی۔ یہ بلجیم کے ایک سیاح سمٹ رونی سے نوائے وقت کے نمائندہ طاہر ملک کی گفتگو پر مشتمل تھی۔ بلجیم کو دیکھنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ مذکورہ سیاح کی بات تقریباً صدفی صد درست ہے۔ مزید یہ کہ اس نے جو بات پاکستان کے بارہ میں کہی، وہی ہندستان پر بھی پوری طرح چسپاں ہوتی ہے۔ اس رپورٹ کا ایک حصہ یہ ہے:

" میں چالیس سے زیادہ ممالک کی سیاحت کر چکا ہوں۔ مگر پولیس کی بہتات پاکستان میں سب سے زیادہ دیکھی ہے۔ یہاں بے شمار چیکنگ پوسٹ ہیں جہاں بلاوجہ شہریوں کو روک کر تلاشی لی جاتی ہے بلجیم میرا ملک ہے۔ وہاں نہ تو مسلح پولیس ہوتی ہے اور نہ ہی عوام کو روک کر جگہ جگہ چیک کیا جاتا ہے۔ صوبہ سرحد میں عام افراد کے ہاتھوں میں سرعام اسلحہ پہلی بار دیکھ کر میں خوف زدہ ہو گیا" ان خیالات کا اظہار بلجیم سے پاکستان سیاحت کیلئے آئے سمٹ رونی نے نمائندہ نوائے وقت کے سوال پر کہ آپ کو پاکستان میں سب سے منفرد کیا چیز لگی؟ کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے حوالے سے انھوں نے بتایا کہ ان کے ملک میں جرائم اور دہشت گردی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بلجیم مکمل طور پر ایک پرامن ملک ہے۔ انھوں نے بتایا کہ بلجیم میں قانونی طور پر پولیس، فوج اور عام شہریوں سمیت کسی کو آبادی میں سرعام اسلحہ لے کر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اپنی بات کی وضاحت

کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ان کے ملک میں قانون کے مطابق پولیس فوج یا لائسنس اسلحہ رکھنے والا کوئی بھی فرد شہری علاقوں میں اسلحہ کی نمائش نہیں کر سکتا۔

فوج کو عام حالات میں آبادی میں یونیفارم میں آنے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ قانونی طور پر فوج مسلح یونیفارم میں صرف ایمرجنسی کی صورت میں آبادی میں آنے کی مجاز ہے۔ انھوں نے بتایا کہ بلجیم میں فوج کی چھاؤنیاں آبادی سے دور بنائی جاتی ہیں تاکہ عوام کا فوجی چھاؤنی سے گزر بھی نہ ہو سکے۔ جس کی وجہ بیان کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ وہاں کی حکومت کے خیال میں آبادی کے علاقے میں قانون نافذ کرنے والے افراد کے پاس اسلحہ سے عام شہری کے خوف زدہ ہونے کے امکانات ہوتے ہیں۔ اس طرح عوام اپنے مقابلہ میں پولیس یا فوج کو برتر خیال کر سکتے ہیں۔ پولیس کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ پولیس اسلحہ کے بغیر اپنے فرائض انجام دیتی ہے اور صرف ضرورت کے وقت مسلح نظر آتی ہے۔ پولیس کا عوام سے رویہ نہایت دوستانہ اور ہمدردانہ ہوتا ہے۔ جرائم کی روک تھام کے علاوہ پولیس عوام کی ذاتی مشکلات میں امداد بھی کرتی ہے جس کی مثال دیتے ہوئے سمٹ رونی نے کہا کہ اگر کسی شخص کی گاڑی راستے میں خراب ہو جائے تو پولیس خراب گاڑی کو درست کرنے میں مدد کرتی ہے یا اس شخص کو سرکاری سواری میں منزل مقصود تک لے جاتی ہے۔ پاکستان سے موازنہ کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ یہاں جگہ جگہ مسلح پولیس والے نظر آتے ہیں جو کہ عوام کے دوست ہونے کی بجائے اتھارٹی کا تاثر دیتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ وہ یہاں جب مسلح پولیس والوں کو دیکھتے ہیں تو تحفظ کی بجائے خوف محسوس کرتے ہیں۔ سیاحت کے حوالے سے اخراجات پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ پاکستان میں ان کا کل خرچہ ۵۵ ہزار روپے کے قریب ہوا ہے اور بلجیم میں ان کی تنخواہ ماہانہ ۲۷ ہزار پاکستانی روپے ہے۔ وہ ہر سال بونس ملنے پر چھٹیوں میں آسانی سے غیر ملکی سیاحت کے لئے نکلتے ہیں۔ یوں وہ ہر سال ایک یا دو ملک کی سیاحت کرتے ہوئے پوری دنیا دیکھنے کا خواب پورا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں (صفحہ۲)

۱۳ ستمبر کو ہم نے بروسیلز کی جامع مسجد دیکھی۔ یہ مسجد شہر کی نہایت اہم سڑک کے کنارے واقع ہے۔ اس کا جائے وقوع نہایت شاندار ہے۔ اس کے ایک طرف مصروف سڑک کے کنارے شہر کی پرشوکت تجارتی عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں۔ دوسری طرف بے حد وسیع پارک ہے۔ اور

اس کی وجہ سے دور تک سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ ایک گنبد کی یہ مسجد خود بھی نہایت عظیم اور پر وقار عمارت کی صورت میں کھڑی ہوئی ہے۔

یہ مسجد رابطۃ العالم الاسلامی کے تعاون سے بنائی گئی ہے۔ اس کے دروازہ پر المسجد الجامع ببروکسل (Grande Mosque) لکھا ہوا ہے۔ ایک اور بورڈ بتا رہا ہے کہ اسی عمارت میں بلجیم کا اسلامی اور ثقافتی مرکز (المرکز الاسلامی والثقافی ببلجیکا) بھی قائم ہے۔ مسجد کے ساتھ وسیع احاطہ بھی موجود ہے۔ ہم یہاں ۱۲ بجے دن میں پہنچے تھے۔ اس وقت مسجد کے دونوں دروازے بند تھے۔ اس لئے ہم مسجد کے اندر داخل ہو کر تحیۃ المسجد ادا نہ کر سکے۔ دروازہ کے نوٹس بورڈ پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے: المسجد یفتح ابوابہ فی وقت الصلاۃ۔ یعنی مسجد کے دروازے نماز کے وقت کھلتے ہیں۔

اس کے بعد آگے بڑھے تو بروسیلز کا بڑا چرچ (St. Michael's Cathedral) نظر آیا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ زائرین کا ہجوم اندر جاتا اور باہر نکلتا ہوا نظر آیا۔ میں نے سوچا کہ اگر کوئی شخص بروسیلز کی مسجد اور یہاں کے کیتھڈرل کے اس فرق کو دیکھ کر خود مسیحیت اور اسلام کے بارہ میں رائے قائم کرے اور کہے کہ دیکھو، مسیحی مذہب شاندار طور پر زندہ ہے اور اسلام کی عمارت پر قفل پڑ چکے ہیں تو بظاہر صحیح دکھائی دینے کے باوجود وہ ایک لغو بات ہوگی۔ کیوں کہ یہ ایک مقامی معاملہ ہے نہ کہ عمومی طور پر پوری دنیا کا معاملہ۔

بروسیلز کا یہ تاریخی کیتھڈرل مکمل طور پر پتھروں کا بنا ہوا ہے۔ اس کی عمارت پر ہیبت حد تک بلند اور عظیم ہے۔ وہاں مفت تقسیم کے لئے ایک پمفلٹ موجود تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ گیارھویں صدی عیسوی میں اس مقام پر ایک بڑا رومن چرچ (Romanesque church) تھا۔ اس کے کھنڈر پر ہنری اول (Henry I) کے حکم سے تیرھویں صدی میں ایک بڑا چرچ بنایا گیا۔ اس کے بعد تین سو سال تک اس میں تعمیرات جاری رہیں۔ شاہ چارلس پنجم (Charles V) کے زمانہ میں موجودہ عظیم عمارت کی تکمیل ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک مذہبی تعلیمی ادارہ بھی ہے۔ یہاں مسیحیت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کو چرچ کالج (collegiate church of SS Michael) کہا جاتا ہے۔

تعمیری عظمت کے اعتبار سے یہ کیتھڈرل یہاں کی مسجد سے بہت زیادہ بڑا ہے۔ مگر کیتھڈرل کے چاروں طرف صرف عمارتوں کا ماحول ہے۔ جب کہ مسجد کے اردگرد ہرا بھرا ماحول ہے۔ مسجد گویا ایک بہت بڑے پارک کے درمیان کھڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ تاہم جیسا کہ عرض کیا گیا، کیتھڈرل کے اندر زبردست سرگرمیاں تھیں لیکن مسجد میں اس وقت کوئی انسانی سرگرمی نظر نہیں آئی۔ کیتھڈرل کے اندر مختلف قسم کے لٹریچر مسیحیت سے متعلق رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کو میں نے لے لیا۔

۱۳ دسمبر کی شام کو کانفرنس کا افتتاحی اجلاس تھا۔ یہ بروسیلز سے ۳۰ کیلو میٹر کے فاصلہ پر لووین (Louxain) کے اسپورٹس سنٹر میں رکھا گیا تھا۔ یہ سنٹر غیر معمولی طور پر بڑا ہے۔ اس کے جس ہال میں اجلاس کا انتظام تھا وہ اپنی غیر معمولی تعمیرات سے عجیب پر اثر معلوم ہو رہا تھا۔

وسیع ہال میں دو ہزار سے زیادہ اعلیٰ تعلیم یافتہ مرد اور عورت موجود تھے۔ اس سے متصل ایک کمرہ میں اخباری رپورٹروں کا انتظام تھا۔ یہ کمرہ اتنا بڑا تھا کہ وہ خود ایک ہال کی مانند نظر آرہا تھا۔ یہاں مختلف یورپی اخباروں کے نمائندے کثیر تعداد میں جدید ترین سامانوں کے ساتھ موجود تھے۔

افتتاحی اجلاس میں زیادہ تر رسمی انداز کی تقریریں ہوئیں۔ ہر مذہب کے نمائندہ نے اپنے مذہب میں امن اور انسانی ہمدردی کی اہمیت بیان کی۔ جاپان کے بدھسٹ پیشوا اتائی یمادا (Etair Yamada) نے بدھزم کی طرف سے جاپانی زبان میں تقریر کی۔ ان کی عمر ۹۰ سال ہو چکی ہے۔ وہ وھیل چیر کے ذریعہ ہال تک پہنچائے گئے تھے۔

زمبابوے کے وزیر اعظم رابرٹ موگابے (Robert G. Mugabe) نے انگریزی زبان میں پرجوش تقریر کی۔ ان کی تقریر پر سب سے زیادہ تالیاں بجائی گئیں۔ انھوں نے کہا کہ مسیح نے (اور دوسرے مذہبوں نے) یہ تعلیم دی ہے کہ پڑوسی کو اس کا حق دو۔ اس کا تعلق صرف فرد سے نہیں بلکہ قوموں سے بھی ہے۔ آج ہر قوم کا ایک "پڑوسی" ہے اور اس پڑوسی کے ساتھ اس کو مذہبی حکم کی تعمیل کرنا چاہئے۔ اس کے بعد انھوں نے بہت سے نام گنوائے۔ مثلاً یہودی کے پڑوسی فلسطینی ہیں۔ ہندوؤں کے پڑوسی ہندستانی مسلمان ہیں۔ جگہ جگہ مسلمانوں کے پڑوسی مسیحی ہیں اور مسیحی کے پڑوسی مسلمان وغیرہ۔ اسلام کی نمائندگی تیونس کے مفتی اعظم محمد مختار سلامی نے کی۔ ان کی تقریر عربی میں ہوئی۔ تمام تقریروں کے ترجمے عین اسی وقت مختلف زبانوں میں کئے جاتے رہے۔

افتتاحی اجلاس کا اہتمام غیر معمولی حد تک بڑے پیمانہ پر کیا گیا تھا۔ اس کا ہر جزء نہایت منظم اور باقاعدہ تھا۔ میرے قریب کی کرسی پر سوڈان کے شیخ اسحاق ادریس بیٹھے ہوئے تھے۔ آجکل وہ رابطۃ العالم الاسلامی (جدہ) سے وابستہ ہیں۔ ان سے میں نے کہا کہ : المسلمون لا یستطیعون ان یخططوا مثل ہذا التخطیط مع انہم یمتلکون کل الامکانیات فما ہو السبب۔ انھوں نے فوراً جواب دیا کہ انانیت۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کی بڑھی ہوئی انانیت نے انھیں اس کے لئے نااہل کر دیا ہے کہ وہ کوئی بڑا اجتماعی منصوبہ تیار کریں اور اس کو تکمیل

تک پہنچائیں۔

شام کا کھانا "فیکلٹی کلب" میں تھا۔ یہ لو وین یونیورسٹی کے تحت ہے اور اپنی وسعت کے اعتبار سے خود ایک پوری دنیا ہے۔ میں نے قصداً گوشت نہیں لیا۔ صرف سادہ سبزی پر قناعت کی۔ کھانے سے فراغت کے بعد ہم لوگ باہر گیٹ پر آئے۔ میرے ساتھ ڈاکٹر لیونارڈ اور ڈاکٹر ثانی اثنین تھے۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے آدمی نے حسب قاعدہ واکی ٹاکی پر، ہمارے ڈرائیور کو آواز دی۔ وہ ابھی کھانے میں مشغول تھا اس لئے وہ چند منٹ کی تاخیر سے پہنچا۔ گیٹ پر ہم لوگوں کو کھڑا دیکھ کر وہ دوڑتا ہوا اس مقام پر گیا جہاں گاڑیاں پارک کی گئی تھیں۔ اور فوراً ہی گاڑی لے کر آگیا۔

یہ منظر دیکھ کر مجھے وہ آیت یاد آگئی کہ اذا نودی للصلاۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الیٰ ذکر اللہ۔ میں نے سوچا کہ آج دنیا کے بے شمار لوگ تیز رفتاری کے ساتھ دوڑ رہے ہیں مگر دین کے لئے کوئی دوڑنے والا نہیں۔ اگر بظاہر کوئی شخص دین کے لئے دوڑ رہا ہے تو وہ بھی دین کے اس پہلو کے لئے ہے جس میں دنیوی اور مادی قدر پیدا ہو چکی ہے۔ دینی سرگرمیوں کے ہجوم میں دین کا وہ میدان بالکل خالی پڑا ہوا ہے جہاں دوڑنے میں کوئی دنیوی یا مادی کشش موجود نہیں۔

اس کانفرنس میں اٹلی کے لوگ کثرت سے شریک ہیں۔ ہوائی جہاز سے آنے والوں کے علاوہ ایک اسپیشل ٹرین روم سے یہاں آئی جس میں دو ہزار اطالوی سفر کرکے بروسیلز پہنچے ہیں۔

روم سے آنے والے ایک صاحب سے بات ہو رہی تھی۔ انھوں نے میرا کپڑا دیکھ کر پوچھا کہ اس کو انڈیا میں کیا کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ کرتا۔ پھر میں نے کہا کہ عربی میں اس کے لئے قمیص کا لفظ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اٹالین میں اس کو کمیشا (Kamisha) کہا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ عربی اور اٹالین میں بہت سے مشترک الفاظ موجود ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دور اول میں عربوں اور اطالیوں کے درمیان کتنا زیادہ تعلق پایا جاتا تھا۔

۱۴ ستمبر کو کانفرنس کے تمام شرکا مختلف گروپوں میں تقسیم کر دئے گئے۔ ہر گروپ کے لئے الگ الگ موضوع مقرر کر دیا گیا جس پر وہ ڈسکشن کریں۔ اس طرح آٹھ الگ الگ ہال میں آٹھ الگ الگ اجتماعات ہوئے۔ ہر ایک میں کچھ منتخب لوگوں نے اپنے پیپر پیش کئے اور اس کے بعد ان پر بحث و تنقید ہوئی۔ موضوعات حسب ذیل تھے:

The great religions in dialogue : from Assisi to Brussels.
Religions, the Middle East and Europe.
1492-1992: the Churches of America and Europe.
Christians and Jews: their common responsibility in the new Europe.
South-North: the Churches of Africa and Europe.
Peoples, differences and the new Europe.
Voices of peace from Asia.
The economic responsibilities of the new Europe: the cost of peace.
Towards an Islamic-Christian dialogue.

اس طرح کی انٹرنیشنل کانفرنس کے انعقاد کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ شرکاء کو کسی ایک ہوٹل میں ٹھہرایا جائے۔ اور اسی ہوٹل کے کسی ہال میں تمام کارروائیاں انجام دی جائیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ لوگوں کو ایک سے زیادہ ہوٹل میں ٹھہرایا جائے اور کانفرنس کی کارروائی بھی مختلف مقامات پر انجام دی جائے۔ موجودہ کانفرنس کے منتظمین نے دوسری صورت اختیار کی تھی۔ انھوں نے شرکاء کو دو ہوٹلوں میں ٹھہرایا اور تقریباً دس مختلف مقام پر اس کی کارروائیاں انجام پائیں۔

یہ صورت ذاتی طور پر میرے لئے تکلیف کا باعث ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس میں بار بار کار میں سفر کرنا پڑتا ہے اور اس طرح کے سفروں میں مجھے چکّر آنے لگتا ہے۔ ہمارے استعمال کے لئے اگرچہ نہایت نفیس اور جدید کار موجود تھی۔ مگر بار بار آنے جانے سے میرے سر میں چکر کی کیفیت پیدا ہو گئی۔

کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ میں شاید دنیا کا سب سے زیادہ کمزور انسان ہوں۔ میرا حال یہ ہے کہ پر تعیش ہوٹلوں میں ٹھہرنا اور شاندار کاروں میں سفر کرنا بھی میرے لئے عذاب کے ہم معنی ہے۔ میں سوچنے لگا کہ آخر اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنا کمزور کیوں بنایا۔ پھر سمجھ میں آیا کہ شاید اس لئے کہ عجز کی سطح پر انسان کو حقیقت کی دریافت کا تجربہ کرایا جائے۔ کیوں کہ قدرت کی سطح پر حقیقت کی دریافت اتنی نادر ہے کہ ساری تاریخ انسانی میں وہ صرف پیغمبروں ہی کو حاصل ہوئی ہے۔ اس میں صرف چند ہی قابل ذکر استثناء پائے جاتے ہیں، مثلاً عمر فاروق رضؓ۔

۲۴ ستمبر کے اجلاس میں میرا مقالہ تھا۔ کانفرنس کے منتظمین نے اس کا عنوان " جدید چیلنج اور اسلام" مقرر کیا تھا۔ اس سشن کے لئے مجھ کو چیرمین بھی بنایا گیا تھا۔ مگر میں نے کہا کہ مجھے " بیک سیٹ" پر بیٹھنا زیادہ پسند ہے۔ اس لئے آپ چیرمین کسی اور کو مقرر کر دیں۔ میں صرف اپنا مقالہ پیش کر دوں گا اور اس کے بعد جو سوالات ہوں گے ان کا جواب دے دوں گا۔ میرے اصرار پر وہ لوگ راضی ہو گئے۔ چنانچہ میں نے اس اجلاس میں اپنا مقالہ پیش کیا۔ یہ مقالہ انگریزی میں تھا۔ انشاء اللہ اس کو انگریزی الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔

ایک عرب نے اپنی تقریر میں سیکولرزم کی مخالفت کی۔ انھوں نے کہا کہ سیکولرزم کا ترجمہ عربی میں علمانیہ کیا جاتا ہے۔ مگر یہ ترجمہ درست نہیں۔ اس کا صحیح ترجمہ لادینیت ہے۔ سیکولرزم سادہ طور پر صرف فصل الدین عن الدولۃ کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب زندگی کے نظام کو غیر دینی بنیاد پر قائم کرنا ہے (المدلول الصحیح للعلمانیۃ ھو اقامۃ الحیاۃ علیٰ غیر الدین)

میں نے کہا کہ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو سیکولرزم کا مقصد مذہب کو رد کرنا (rejection) نہیں ہے بلکہ مذہب کے معاملہ میں ریاست کا غیر جانبداری (indifference) کی پالیسی کو اپنانا ہے۔ میں نے کہا کہ سیکولرزم کا نظریہ دراصل اس قدیم تصور کی تردید ہے جب کہ ریاست اور مذہب کو ایک دوسرے کے معاملہ میں دخل دینے کا اختیار ہوتا تھا۔

اس اعتبار سے سیکولرزم کی روح وہی ہے جو صلح حدیبیہ کی روح تھی۔ صلح حدیبیہ میں دونوں فریقوں کو اس بات کا پابند کیا گیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے معاملہ میں جنگی مداخلت نہیں کریں گے۔ اسی طرح سیکولرزم کے ذریعہ جدید ریاست نے اپنے آپ کو اس بات کا پابند کیا ہے کہ وہ مذہبی امور میں غیر جانب دار رہے گا۔ اس نظریہ نے موجودہ زمانہ میں دعوت کے وہ مواقع کھول دئے ہیں جو قدیم زمانہ میں موجود نہ تھے۔ چنانچہ آج دینی کام کے سب سے زیادہ مواقع سیکولر ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔

بالفرض اگر سیکولرزم کا نظریہ اصولی طور پر ہمارے مطابق نہ ہو تب بھی اس کا عملی نتیجہ یقینی طور پر ہمارے حق میں ہے۔ کیوں کہ وہ ہم کو ریاست کے تدخل سے محفوظ رکھ کر دعوتی عمل کے مواقع دیتا ہے۔ اس لئے اگر کسی کو سیکولرزم سے نظریاتی اتفاق نہ ہو تب بھی عقل مندی یہ ہے کہ اس کے نتیجہ میں پیدا شدہ

ماحول کو دعوتی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس کے نظری پہلو کو لے کر بے فائدہ طور پر اس سے الجھنا ہرگز دانش مندی نہیں۔

ایک مسیحی مقرر نے کہا تھا کہ اسلام میں فکری جبریت ہے۔ اسلام تنقید کو پسند نہیں کرتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسلام دوسروں کے ساتھ مفاہمت نہیں کر پاتا۔ مراکش کے ایک عرب عالم نے اس کی تردید میں کہا کہ اصل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اسلام میں نہ صرف تنقید کی اجازت ہے۔ بلکہ اسلام میں تنقید کو حد درجہ پسند کیا گیا ہے۔ اپنے خیال کی تائید میں انھوں نے خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ قول پیش کیا کہ اللہ اس آدمی پر رحم فرمائے جو مجھ کو میرے عیوب تحفہ میں دے (رَحِمَ اللّٰہ امرأً اَھدیٰ اِلیَّ عُیُوبی)

یہ بات نہایت درست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام سے پہلے "دورِ فتنہ" میں تنقید کا دروازہ بند تھا۔ اسلام کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس نے بند دروازہ کو کھولا اور صحابہ و تابعین کے زمانہ میں ہر شعبۂ حیات میں اس کی شاندار عملی مثالیں قائم ہوئیں۔ یہ جمود اور زوال کی نشانی ہوگی اگر تنقید کو ناپسند کیا جائے یا اس کے دروازہ کو دوبارہ بند کرنے کی کوشش کی جائے۔

۱۴ ستمبر کو شام کا کھانا البن کے بشپ کے یہاں تھا۔ کانفرنس کے تمام شرکاء وہاں لیجائے گئے۔ بشپ کی رہائش گاہ غیر معمولی طور پر بڑی اور شاندار تھی۔ چنانچہ اس کو "پیلس" کہا جاتا ہے۔ تاہم اس پیلس کے اندر ہر چیز بالکل سادہ تھی۔ حتی کہ ڈنر بھی سادہ انداز میں دیا گیا تھا۔ صدیوں پرانے اس محل میں بہت سے بشپ نے قیام کیا ہے۔ ان سب کی تصویریں ان کے سال پیدائش اور سال وفات کے ساتھ دیواروں پر پینٹنگ کی صورت میں نقش کی گئی تھیں۔

ایک مسیحی نے اپنا تعارف مانک (monk) کے لفظ سے کرایا۔ میں نے پوچھا کہ مانک نکاح نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا ہاں۔ پھر میں نے کہا کہ آپ اپنے تجربہ کی روشنی میں بتائیے کہ مانک بننے کے بعد آپ کو اپنی زندگی میں تنہائی (loneliness) کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا ہاں تنہائی کا احساس ہوتا ہے اور بعض اوقات بے حد شدید ہوتا ہے۔ میں نے سوچا کہ جو لوگ دین کی خدمت کے لئے غیر فطری طریقہ اختیار کریں اس کا سب سے پہلا نقصان خود ان کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ اس طرح ان کی شخصیت کا ارتقاء نہیں ہو سکتا۔

بلجیم کا نام سب سے پہلے میں نے تقریباً پچاس سال قبل پوسٹج اسٹمپ کے ذریعہ جانا۔ اس وقت میں عربی مدرسہ میں طالب علم تھا۔ مجھے ٹکٹ کا شوق ہوگیا۔ میں نے بہت سے ملکوں کے ٹکٹ اپنے البم میں جمع کر لئے۔ انھیں میں سے ایک بلجیم کا ٹکٹ بھی تھا۔ جس پر غالباً شاہ لیوپولڈ سوم (Leopold III) کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ ابتدائی عمر میں اکثر ملکوں کے نام میں نے ٹکٹ ہی کے ذریعہ جانے ہیں۔

پختہ عمر کو پہنچنے کے بعد میرا ٹکٹ جمع کرنے کا شوق ختم ہوگیا۔ مگر میں نے ایک صاحب کو دیکھا ہے کہ وہ ۹۰ سال کی عمر میں بھی بچوں کی طرح ٹکٹ کے شائق تھے۔ اس مثال سے دو قسم کے انسانوں کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ ایک انسان وہ ہے جس کا حال یہ ہے کہ ابتداءً وہ جیسا بن گیا، آخر تک وہ اسی طریقہ پر قائم رہتا ہے۔ دوسرا انسان وہ ہے جو ہمیشہ سوچتا رہے۔ جو علم اور عمر کے اضافہ کے بعد سفر حیات کے مزید مراحل طے کرے۔

بلجیم کی تاریخ چھٹی صدی قبل مسیح تک جاتی ہے۔ ۱۸۳۰ء میں یہاں آزاد بادشاہت قائم ہوئی دونوں عالمی جنگوں کے درمیان جرمنی نے بلجیم پر قبضہ کر لیا تھا۔ مگر دونوں بار جنگ کے بعد اس نے جرمنی کے قبضہ سے رہائی حاصل کر لی۔ انڈیا کے مقابلہ میں بلجیم بہت چھوٹا ہے مگر ترقیات کے اعتبار سے وہ انڈیا سے بہت زیادہ آگے ہے۔

ہندستان میں جب میں لوگوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر آدمی کے چہرہ پر لکھا ہوا ہے "میں قانون کو توڑنے والا ہوں" اس کے برعکس یہاں کے لوگوں پر جب میری نظر پڑتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر ایک کے چہرہ پر لکھا ہوا ہو: "میں قانون کا پالن کرنے والا ہوں" یہاں کے لوگ (جن میں کئی یورپی ملک کے لوگ شامل ہیں) اس طرح چلتے پھرتے اور اپنا کام کرتے ہیں جیسے کسی ریموٹ کنٹرول کے ذریعہ قانون ان سب کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہو۔ یہاں اگرچہ مکمل آزادی ہے، مگر اسی کے ساتھ یہاں اجتماعی آداب و قوانین کا مکمل احترام پایا جاتا ہے۔ ہندستان کی آبادیوں میں چلئے تو قانون شکنی کی تصویریں نظر آئیں گی۔ اس کے مقابلہ میں یہاں کی آبادیاں ہر طرف قانون کی پابندی کی تصویر بنی ہوئی نظر آتی ہیں۔

بروسیلز کانفرنس میں ۸۰ ملکوں کے لوگ شریک ہوئے۔ ۱۵ ستمبر کو صبح سے دوپہر تک

کے وقت میں اس کا عام اجلاس ہوا۔ یہ اجلاس لووین کے اسپورٹ سنٹر کے ہال میں تھا۔ وسیع ہال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ اس اجلاس میں مختلف مذاہب کے منتخب افراد نے اپنے اپنے مذہب کی روشنی میں مندرجہ ذیل موضوع پر اظہار خیال کیا:

Religions and Solidarity among peoples.

مجھے اس موقع پر ایک پیپر پڑھنا تھا۔ یہ پیپر انگریزی میں تیار کرکے میں نے پیشگی طور پر کانفرنس کے منتظمین کے پاس بھیج دیا تھا۔ مگر کانفرنس کے منتظمین نے بالکل آخر وقت میں کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ میں عربی زبان میں بھی کچھ کہوں۔ کیوں کہ یہاں قابل لحاظ تعداد میں عرب ہیں اور وہ عربی میں سننا پسند کریں گے۔

میرے پاس بمشکل آدھ گھنٹہ کا وقت تھا۔ منتظمین کے اصرار پر میں راضی ہوگیا۔ ڈائس پر جانے سے پہلے میں ہال کے کنارہ کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور فوری طور پر دو صفحہ عربی زبان میں لکھا۔ اس کے بعد میں ڈائس پر آیا۔ اپنے وقت پر میں نے پہلے عربی میں خطاب کیا۔ اس کے بعد انگریزی مقالہ پیش کیا۔

عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں تقریر، نیز اس کے مضمون کی بنا پر لوگ بہت خوش ہوئے۔ ہندستان کے جسٹس ایچ آر کھنا (ریٹائرڈ جج سپریم کورٹ) نے مجھ کو الگ کرسی پر بیٹھ کر عربی تقریر تیار کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اجتماع کے بعد وہ ملے اور کہا:

We are proud to have a scholar like you in India who can deliver an Arabic speech over an international assembly at such a short notice.

بہت سے مسلم اور غیر مسلم صاحبان نے خوشی کا اظہار کیا۔ ان میں سے ایک الحافظ صبری کوتشی (مفتی البانیہ) تھے۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے:

Hfz. Sabri Koei, Bashkesia Islamike,
Tirane, Albania (Tel. 70223701)

انھوں نے عربی تقریر کی ایک کاپی طلب کی اور کہا: فضيلة الشيخ، انى فهمت من كلماتكم التى القيتم بين الناس انكم تدعونهم الى الايمان۔ و فى قلبى وجدت هذا المعنى من كلماتكم الكريمة۔

فجزاکم اللہ خیر الجزاء۔ ایک لبنانی عالم نے کہا: اعجبتنی قرأتك العربیۃ۔ اس طرح اور کئی لوگوں نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

ایک مسیحی عالم نے اپنی تقریر میں کہا کہ چرچ اس قسم کی جو کوششیں آج کر رہا ہے، اس کے لئے کیچ ورڈ صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے باہمی اعتماد کی بحالی (confidence building) اس بات کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ انسان کو دوبارہ اس کی فطری حالت پر لے آنا۔ فطرت کے مطابق، اصل انسانی حالت یہی ہے کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے پہ اعتماد کرتے ہوئے زندگی گزاریں۔ لوگ ایک دوسرے کا احترام کریں۔ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ حسن ظن کے ساتھ معاملہ کریں۔ لوگ ایک دوسرے کے بارہ میں منفی نفسیات کا شکار نہ ہوں۔

اسی فطری حالت پر اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ زندگی میں ہمیشہ بگاڑ اس وقت آتا ہے جب کہ فطرت کا یہ نقشہ بگڑ جائے۔ جب بھی ایسا ہو تو اصلاح پسند افراد کا کام یہ ہے کہ لوگوں کے فطری احساسات کو زندہ کریں تاکہ حیات بشری کا نظام دوبارہ اپنی اصل حالت پر قائم ہو جائے۔

برسیلز کے ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے ایک بار ایک نوجوان سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ گفتگو شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ روم کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے اپنی عمر ۲۳ سال بتائی۔ وہ طالب علم تھے اور ان کا نام فیبیو لیبراٹوری (Fabio Liberatori) تھا۔

میں نے پوچھا کہ موجودہ اٹلی میں ارینجڈ میرج (arranged marriage) کا رواج ہے یا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ بہت کم ہے۔ میں نے کہا کہ انڈیا میں زیادہ تر ارینجڈ میرج کا رواج ہے اور مغربی ملکوں میں زیادہ تر لو میرج (Love marriage) کا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ انڈیا میں تفریق کے واقعات بہت کم ہوتے ہیں، جب کہ مغربی ملکوں میں شادی کے بعد تفریق کا رواج کثرت سے پایا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ لو میرج اور تفریق دونوں متضاد چیزیں ہیں۔ ایسی حالت میں اس کو لو میرج کہنا صحیح نظر نہیں آتا۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ موجودہ قسم کی لو میرج کو ایکسیڈنٹل میرج کہنا چاہئے۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ کو میری اس رائے سے اتفاق ہے۔ انھوں نے کچھ دیر سوچا پھر کہا کہ ہاں مجھے آپ کی رائے سے صد فی صد اتفاق ہے۔

اس دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک چیز کو کچھ سمجھ لیتا ہے۔ حالاں کہ حقیقت کے اعتبار سے وہ کچھ اور ہوتی ہے۔ اس کی بدترین مثال موجودہ زمانہ کے "اسلامسٹ" ہیں۔ وہ جگہ جگہ پرتشدد عمل چھیڑے ہوئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اسلامی حکومت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ حالاں کہ باعتبار حقیقت وہ بربادی کے سوا کسی اور منزل پر پہنچنے والے نہیں۔

الجزائر کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ جیسا کہ معلوم ہے، وہاں کے برسراقتدار طبقہ نے انتخابات کو معطل کرکے اسلام پسند جماعت کو اقتدار میں آنے سے روک دیا تھا۔ اب وہاں کی حکومت اور وہاں کے اسلام پسند طبقہ کے درمیان مسلسل کشمکش جاری ہے۔ حکومت اپنی پولیس کو اسلام پسند طبقہ کی سیاسی سرگرمیوں کو روکنے کے لئے استعمال کرتی ہے۔ اس کے جواب میں اسلام پسند طبقہ یہ کر رہا ہے کہ اس نے ناجائز ہتھیار جمع کرلئے ہیں اور پولیس افسروں یا سرکاری شخصیتوں کو اپنی گولی کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ حالاں کہ یہ قاتل اور مقتول دونوں مسلمان ہوتے ہیں۔

مذکورہ الجزائری نے بتایا کہ "اسلامی سیاست" کے ظہور سے پہلے الجزائر ایک بہترین ملک تھا۔ مگر نام نہاد اسلام پسندوں نے الجزائر کو ہر اعتبار سے تباہ کرکے رکھ دیا ہے۔

آخری اجلاس میں ڈائس پر جو چند افراد تھے، ان میں سے ایک پولینڈ کے کارڈینال جوزف گلمپ (Jozef glemp) تھے۔ وہ مسیحی دنیا میں پوپ کے بعد نمبر ۲ کی شخصیت سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے ڈچ زبان میں تقریر کی جس کا ترجمہ میں نے عربی زبان میں سنا جو ایک مسیحی مترجم کر رہا تھا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ موجودہ زمانہ میں رجال دین خدا سے دور ہوگئے اس لئے خدا بھی ان سے دور ہوگیا ہے۔

اس کو سن کر میں نے سوچا کہ ایک مسلم عالم بھی اپنی تقریر میں یہی کہتا ہے اور مسیحی عالم بھی یہی کہہ رہا ہے۔ پھر دونوں میں کیا فرق ہے۔ یہ بات ان لوگوں کے لئے بہت زیادہ قابل توجہ ہے جو صرف اس قسم کے کلمات بولنے کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ حق پر ہیں۔

۵ استمبر کی سہ پہر کو دعا (prayer) کا پروگرام تھا۔ تمام لوگ گاڑیوں کے ذریعہ ایک مقام پر لے جائے گئے۔ وہاں سے تقریباً ایک کیلو میٹر کا سفر پیدل طے کیا گیا۔ سڑک کے دونوں طرف مقامی لوگ کھڑے ہوئے تالیوں کے ذریعہ شرکاء کانفرنس کا استقبال کر رہے تھے۔

اگلے مقام پر ہر مذہب والوں کے لئے الگ الگ عبادت گاہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ اہل اسلام کے لئے ایک بڑے ہال کو خالی کرکے مسجد کی مانند بنایا گیا تھا۔ ہم لوگ تقریباً ۲۰ آدمی وہاں جمع ہوئے۔ کچھ دیر دینی موضوعات پر گفت گو ہوئی۔ پھر ایک عرب شیخ کی امامت میں ظہر اور عصر کی نماز جمع تقدیم کے ساتھ ادا کی گئی۔ امام مصلے پر کھڑے ہوئے تو انھوں نے مقتدیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: صلاۃ الظہر والعصر جمعاً وقصراً۔ اذان سے لے کر نماز تک کا پورا عمل ٹیلی وژن کے لوگ ریکارڈ کرتے رہے۔ ہال کے کنارے بڑی تعداد میں کھڑے ہوئے لوگ ہماری نماز کو دیکھ رہے تھے۔

نماز کے بعد پورا قافلہ ایک میدان میں جمع ہوا جو خاص طور پر اسی کے لئے بنایا گیا تھا۔ یہاں شرکاء کانفرنس کے علاوہ مقامی لوگ لاکھوں کی تعداد میں جمع ہوئے۔ وسیع میدان پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ یہاں امن (Peace) کے موضوع پر تقریریں اور دعائیں ہوئیں۔ کچھ اور رسوم ادا کرنے کے بعد یہاں سے روانہ ہوکر دوبارہ ہوٹل میں آگئے۔

جاپان کے بدھوں کی ایک ٹیم کانفرنس میں شریک ہوئی۔ ان کے علاوہ دو آدمی اور جاپان سے آئے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب انگریزی بول سکتے تھے۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے:

Yasuni Hirose, President, Jinrui Aizenkai
Ten' Onkyo, Kameoka, Kyoto, Japan

انھوں نے بتایا کہ وہ شنٹو مذہب کے ماننے والے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو اسلام سے خاص دلچسپی ہے۔ کیوں کہ ہم لوگ موحد ہیں۔ ہم نے کبھی جاپان کے بادشاہ کو کامی (خدا) نہیں مانا۔ اس کی وجہ سے پہلے ہم مسلسل تعذیب (Persecution) کا شکار رہتے تھے۔ مگر دوسری عالمی جنگ کے بعد خود جاپان میں یہ عقیدہ ختم ہوگیا کہ ہمارا بادشاہ کامی (خدا) ہے۔ اس لئے اب ہم کو آزادانہ کام کرنے کے مواقع حاصل ہوگئے ہیں۔

اسی طرح البانیہ کے مفتی الحافظ صبری کوتشی (۷۰ سال) نے بتایا کہ قدیم کمیونسٹ حکومت وہاں کے مسلمانوں پر بے حد ظلم کرتی تھی۔ خود مفتی صاحب ۲۱ سال تک شدید مشقت کے ساتھ جیل میں رہے ہیں۔ کمیونسٹ حکومت نے مدرسے بند کر دئے۔ مسجدیں ڈھادیں۔ مگر بالآخر

۱۹۹۱ میں سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد البانیہ کی کمیونسٹ حکومت بھی ختم ہوگئی۔ اب وہاں کامل مذہبی آزادی ہے۔

میں نے سوچا کہ قدیم زمانہ میں فتنہ (مذہبی جبر) کو ختم کرنے کے لئے جنگ کرنی پڑی تھی۔ اب اللہ تعالیٰ نے خود عالمی حالات میں ایسے اسباب پیدا کر دئے ہیں جو فتنہ بردار حکومتوں کا خاتمہ کر رہے ہیں۔ یہ زمانی فرق کا ایک معاملہ ہے جس کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ جو لوگ اس زمانی فرق کو نہ سمجھیں وہ موجودہ زمانہ میں دعوت توحید کی صحیح منصوبہ بندی نہیں کر سکتے۔

ایک تعلیم یافتہ عرب سے عالم اسلام کے قائدین کے بارہ میں گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ ایک ہے مفکر قائد، دوسرا ہے عوامی قائد۔ مفکر قائد وہ ہے جو خود اپنے تخلیقی افکار کی بنیاد پر لوگوں کے اندر ایک نئی سوچ پیدا کرے۔ اور عوامی قائد وہ ہے جو لوگوں کی خواہشات کی ترجمانی کرکے اپنے گرد ان کی بھیڑ اکھٹا کر لے۔

میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مشہور قائدین میں سے کوئی ایک شخص بھی نہیں جس کو فی الواقع مفکر قائد کہا جا سکتا ہو۔ موجودہ زمانہ کی مسلم شخصیتوں میں سے کسی بھی شخص کے یہاں تخلیقی فکر کا وجود نہیں۔ موجودہ زمانہ کے تمام مسلم قائدین عوامی قائد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے کسی ایک یا دوسری شکل میں عوامی خواہشات کی ترجمانی کرکے ان کے درمیان قیادت کا مقام حاصل کر لیا۔ مگر کسی قوم کی تعمیر صرف تخلیقی مفکرین کے ذریعہ ہوتی ہے۔ عوامی خواہشات کو استعمال کرنے والا قائد، خواہ وہ کتنا ہی مخلص ہو، وہ اپنی قوم کو صرف ہلاکت کے گڑھے میں پہنچاتا ہے۔ وہ کبھی اس کو فلاح کی منزل تک نہیں لے جا سکتا۔

ہمارا ابتدائی ٹکٹ صرف بروسیلز جانے اور وہاں سے واپس آنے کے لئے تھا۔ مگر لندن اور قاہرہ میں مقیم کچھ عرب نوجوانوں کے مسلسل ٹیلیفون آئے کہ واپسی میں لندن اور قاہرہ میں بھی قیام کیا جائے۔ چنانچہ ہم نے اپنا ٹکٹ ری روٹ کرایا۔ اس کے مطابق واپسی ہوئی۔

۱۶ ستمبر کو فجر کی نماز بروسیلز کی آخری نماز تھی۔ ناشتہ سے فراغت کے بعد ڈاکٹر لیونارڈو کے ہمراہ ایئر پورٹ کے لئے روانگی ہوئی۔ ضروری کارروائی کے بعد اندر داخل ہوئے تو ایئر پورٹ کے چرچ کے فادر مل گئے۔ انھوں نے ہم کو پہچان لیا، کیوں کہ انھوں نے کانفرنس میں ہمیں دیکھا تھا۔

انھوں نے بتایا کہ یہاں ایئر پورٹ کے احاطہ میں ایک مسجد بھی ہے۔ یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔ انھوں نے ہمارا شوق دیکھ کر ہم کو مسجد تک پہنچا یا۔ ہم نے کچھ وقت اس مسجد میں گزارا۔

یہ ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے۔ لمبائی میں وہ دس قدم ہے اور چوڑائی میں سات قدم۔ میں نے یہاں دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھی اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے میرے جیسے کمزور آدمی کو ایسے زمانہ میں پیدا کیا جب کہ مذہبی تشدد دنیا سے ختم ہو گیا ہے۔ حتی کہ غیر مسلم حکومت اپنے ہوائی اڈہ کے اندر اپنے مسافروں کی سہولت کے لئے مسجد کی تعمیر کر رہی ہے۔ مسجد میں چند کتابیں تھیں جن میں قرآن کا ایک انگریزی ترجمہ بھی شامل تھا۔

مسجد میں بہت سے مسافر آتے اور جاتے ہوئے نظر آئے۔ ایسا معلوم ہوا کہ چھوٹی ہونے کے باوجود وہ مسافروں کے لئے سکون کی ایک جگہ ہے۔ مسجد میں قیام کے دوران ایک سفید فام تندرست آدمی آئے۔ ان کا سر کھلا تھا۔ وہ نیکر پہنے ہوئے تھے جس میں گھٹنوں سے اوپر تک کا حصہ کھلا ہوا تھا۔ اسی حالت میں وہ نیت باندھ کر کھڑے ہو گئے اور دو رکعت نماز ادا کی۔ وہ لبنانی مسلمان ہیں اور امریکہ میں رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنا نام حسین مروّۃ (Hussein Mroiueh) بتایا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ تاجر ہیں۔ پنج وقتہ نماز پڑھتے ہیں۔ گفتگو میں کافی سنجیدہ نظر آئے۔

ایئر پورٹ پر چلتے ہوئے ایک جگہ سگریٹ کا اشتہار نظر آیا۔ یہ ایک مشہور سگریٹ کا خوبصورت اشتہار تھا۔ سگریٹ کے کھلے پیکٹ کے ساتھ سگریٹ کا نام روشن حرفوں میں درج تھا۔ اس کے اوپر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

The taste of success

سگریٹ کے نقصانات کو دیکھئے تو یہ برعکس نہند نام زنگی کا فور کا مصداق نظر آئے گا۔ الٹا نام رکھنے کا یہی طریقہ انسانی دنیا میں بھی رائج ہے۔ کہیں تشدد کی تحریک کو پرامن تحریک کہا جاتا ہے۔ کہیں کسی مخرب اعظم کا نام لوگوں نے مفکر اعظم رکھ لیا ہے۔ کہیں ایک استغلالی منصوبہ کو فلاحی منصوبہ کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ وغیرہ۔

۱۶ ستمبر کو برو سیلز سے لندن کے لئے برٹش ایئر ویز کی فلائٹ ۳۹۳ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں برٹش ایئر ویز کی میگزین (Highlife) کا شمارہ ستمبر ۱۹۹۲ دیکھا۔ ۱۷۰ صفحہ کے اس

میگزین میں زیادہ تر رنگین اشتہارات چھپے ہوئے تھے۔ جہاز، مکان، فرنیچر، گھڑی، زیور وغیرہ کے اشتہارات۔ اشتہارات میں بار بار اس قسم کے الفاظ درج تھے:

Pleasure, happiness, enjoyment,
desire, lovely, delight, charming.

میں نے سوچا کہ انسان ایک لذت پسند مخلوق ہے۔ اس کے اندر سب سے زیادہ جس چیز کی طلب ہے وہ خوشی اور لذت کا حصول ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کے الفاظ فیھا ما تشتمیہ الانفس وتلذ الاعین (الزخرف ۷۱) بہت بامعنی ہے۔ انسان کو سماجی حیوان یا سیاسی حیوان یا اقتصادی حیوان کہنا محض سطحی تعبیر ہے۔ صحیح یہ ہے کہ انسان ایک ایسا وجود ہے جو اپنی پسندیدہ چیزوں سے ابدی طور پر محظوظ ہونا چاہتا ہے۔ اور اس حظ کا حصول جنت کے سوا کہیں اور ممکن نہیں۔

بروسیلز سے جہاز ۱۲ بجے دن کو روانہ ہوا تھا۔ ۱۹ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک گھنٹہ پرواز کرنے کے بعد جب وہ لندن ایئر پورٹ پر اترا تو دوبارہ لندن کی گھڑیوں میں ۱۲ بج رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لندن کا وقت بروسیلز کے وقت سے ایک گھنٹہ پیچھے ہے۔

۱۶ ستمبر کو لندن کے ہیتھرو ایر پورٹ پر ضروری کارروائی کے بعد باہر آیا تو دو صاحبان ہمارے انتظار میں وہاں موجود تھے۔ ایک انیس تاری صاحب، دوسرے، عارف عبدالسلام احمد۔ میں نے سوچا کہ موجودہ زمانہ میں دعوتی کام کتنا آسان ہو چکا ہے۔ قدیم زمانہ میں ایک داعی کو اجنبی دنیا میں داخل ہو کر کام کرنا پڑتا تھا۔ آج یہ حال ہے کہ ایک داعی جس ملک میں بھی جائے وہاں مسلمانوں کی ایک جماعت اس کے استقبال کے لئے موجود ہوگی۔ حتی کہ زمانہ کی یہ تبدیلی یہاں تک پہنچی ہے کہ غیر مسلم صاحبان بھی یہ موقع دے رہے ہیں کہ ایک اسلامی داعی ان کے مقام تک پہنچے اور وہ اس کو اپنے اجتماع میں آزادانہ طور پر بولنے کا موقع دیں۔

یہاں میں نے ثانی اثنین خان کو لندن میں چھوڑ دیا۔ اور خود ایئر پورٹ ہی سے برادر عارف عبدالسلام احمد کے ساتھ مانچسٹر جانے کا فیصلہ کیا۔ لندن ایئر پورٹ سے ٹرین (انٹرسٹی) کے ذریعہ مانچسٹر کے لئے روانگی ہوئی۔ خوب صورت اور منظم انداز میں بنی ہوئی یہ ٹرین نہایت آرام دہ تھی۔ روانگی کے وقت سے آخر تک کسی سیٹی کی آواز نہیں آئی۔ کبھی چین پلنگ نہیں ہوئی۔ کسی قسم کا

شور یا جھگڑا دکھائی نہیں دیا۔ راجدھانی ایکسپریس کی طرح ساؤنڈ پروف ہونے کی وجہ سے ٹرین کا شور بھی اندر نہیں آرہا تھا۔ ہوائی جہاز کی کرسیوں کی طرح کشادہ الگ الگ سیٹوں پر لوگ خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ اکثر افراد کتاب یا اخبار پڑھنے میں مشغول تھے۔ میرے سامنے کی سیٹ پر ایک تعلیم یافتہ انگریز ایک کافی موٹی کتاب (Administrative law) پڑھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ وہ کاغذ پر نوٹ لیتا جاتا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان ایک کشادہ میز تھی جس پر اس نے اپنا کاغذ اور قلم رکھ لیا تھا۔ چلنے کی حالت میں ڈبہ اتنا کم ہل رہا تھا کہ آدمی میز کے اوپر کاغذ رکھ کر بآسانی لکھ سکتا تھا۔ میں نے اپنے سفر نامہ کی کچھ سطریں اسی میز پر چلتی ہوئی حالت میں لکھیں۔

ڈبہ کے دونوں طرف کھڑکی کے بجائے بڑے بڑے شیشہ لگے ہوئے تھے۔ ان سے باہر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ڈھائی گھنٹہ کے سفر میں دونوں طرف یا تو ہرے بھرے کھیت اور میدان نظر آئے یا خوب صورت مکانات۔ کہیں بھی جھگی جھونپڑی جیسا منظر دکھائی نہیں دیا۔ ٹرین ٹھیک وقت پر ایک منٹ کی تاخیر کے بغیر مطلوب اسٹیشن پر پہنچ گئی۔

ٹرین کا نظام اپنے مسافروں (customers) کے ساتھ ہر موقع پر تعاون دینے کے لئے تیار رہتا ہے۔ ایک مسافر نے گفت گو کے دوران بتایا کہ چند مہینے پہلے وہ اسی لائن پر مانچسٹر سے لندن کے لئے سفر کر رہا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ ٹرین کے لندن پہنچنے میں پانچ منٹ کی تاخیر ہوگئی۔ اس کی بنا پر وہ اور دوسرے مسافر اپنے گھروں کو جانے کے لئے انڈر گراؤنڈ ٹرین حاصل نہ کر سکے۔ کیونکہ ۱۲ بجے رات کے بعد اس کا چلنا موقوف ہو جاتا ہے۔ اب مجبوراً ان لوگوں کو ٹیکسی لینا تھا جب کہ انڈر گراؤنڈ ٹرین سے سفر بہت سستا ہے۔

کچھ مسافروں نے ریلوے عملہ کو اس مسئلہ کی طرف متوجہ کیا۔ فوراً ہی اعلان کر دیا گیا کہ جو لوگ تاخیر کی وجہ سے انڈر گراؤنڈ ٹرین نہیں لے سکے ہیں وہ فلاں کاؤنٹر پر آ کر ہم سے ٹیکسی کا کرایہ لے لیں، اور ٹیکسی کے ذریعہ اپنے گھروں کو چلے جائیں۔

میرا قیام وگن (Wigan) میں ایک تعلیم یافتہ عرب نوجوان طارق حسین الکردی کے مکان پر تھا۔ انھوں نے یہاں کی شہریت لے لی ہے اور اب اپنی آئرش اہلیہ کے ساتھ مستقل طور پر یہیں رہتے ہیں۔ ۱۶ ستمبر کی رات کو یہاں چند عرب نوجوانوں کے ساتھ دیر تک گفت گو ہوئی۔ میں نے قرآن کی آیت

(الآيات للمتوسمين) اور بخاری کی حدیث (ماخیّر بین امرین الا اختار ایسرهما) کی تشریح کی اور مختلف واقعات کے ذریعہ اس کو واضح کیا۔ لآیات للمتوسمین کے سلسلہ میں کہا کہ عربی میں کہا جاتا ہے کہ تَوَسَّمتُ فیہ الخیر۔ یعنی میں نے اس کے اندر کچھ علامتیں دیکھیں جن سے میں نے استنباط کیا کہ اس کے اندر خیر ہے۔ متوسّم وہ ہے جو ظاہری چیزوں سے باطنی حقیقتوں کو دریافت کرے اور ان کو اپنے لئے نصیحت بنائے۔

۷ ستمبر کو بھی عرب نوجوانوں کے ساتھ ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ طارق حسین الکردی نے آئرلینڈ کی شہریت لی ہے مگر آجکل وہ انگلینڈ میں رہ رہے ہیں۔ آئرلینڈ میں زیادہ تر پروٹسٹنٹ ہیں اور انگلینڈ میں زیادہ تر کیتھولک۔ دونوں میں سخت نفرت ہے۔ برنارڈ شا ایک آئرش مصنف تھا۔ وہ انگریزوں کی زبان اور کلچر کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ مثلاً انگریزی زبان کے تلفظ کے نقائص بتاتے ہوئے ایک بار اس نے کہا کہ اگر میں انگریزی کے لفظ (Fish) کو گھوٹی پڑھوں تو کوئی انگریز اس پر اعتراض کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

میں نے طارق حسین الکردی سے پوچھا کہ آپ کی جنسیہ آئرش ہے، پھر آپ انگلینڈ میں کس طرح رہتے ہیں اور یہاں کے قانون کے مطابق آپ کو یہاں کی تمام سہولتیں بھی حاصل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ دونوں کے درمیان نفرت پائی جاتی ہے۔ مگر دونوں ملکوں کے درمیان اتفاقیہ (ایگریمنٹ) ہے کہ ایک جگہ کے شہری کو دوسری جگہ وہی سہولتیں حاصل رہیں جو اس کو اپنے ملک میں حاصل ہیں۔

انگلینڈ اور آئرلینڈ میں جو اختلافات ہیں وہ تقریباً اسی قسم کے ہیں جو ہندستان اور پاکستان میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً آئرلینڈ والوں کو شکایت ہے کہ انگلینڈ والے عظیم تر انگلینڈ بنانا چاہتے ہیں اور اس میں آئرلینڈ کو ضم کرلینے کا منصوبہ بنائے ہوئے ہیں۔ وغیرہ۔ مگر اس قسم کے اختلافات کے باوجود یہاں دونوں ملکوں میں جو مفاہمت ہے وہ ہندستان اور پاکستان کے درمیان ناقابل تصور ہے۔ مغربی دنیا کا مزاج اس انگریزی مثل سے معلوم ہوتا ہے کہ آؤ، ہم اس پر اتفاق کرلیں کہ ہمارے درمیان اختلاف ہے:

Let us agree to disagree

جن دنوں میں طارق حسین الکر دی کے یہاں مقیم تھا، مقامی میٹرو پولیٹن کونسل کے چیف رننگ آفیسر مسٹر اے شا (A. Shaw) کی طرف سے ان کو ایک خط مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۹۲ ملا۔ طارق حسین الکر دی اس وقت کوئی کام نہیں کر رہے ہیں۔ اس لئے ان کو بے روزگاری کا الاؤنس اور دوسری رعایتیں ملی ہوئی ہیں۔ مذکورہ خط میں درج تھا کہ آپ نے اب تک (Housing Benefit) کا فارم پُر کر کے نہیں بھیجا ہے، جب کہ آپ اس کے حق دار ہیں۔ لہٰذا ہمارے آفس کی طرف سے آپ کو فارم بھیجا جا رہا ہے۔ آپ اس کو ایک ہفتہ کے اندر پر کر کے بھیج دیں تاکہ آپ کو مکان کے سلسلہ میں ضروری رعایت دی جاسکے۔

طارق حسین الکر دی نے بتایا کہ بے روزگار یا کم آمدنی والے شہریوں کو یہاں ۹۵ فی صد تک کرایہ مکان میں امداد دی جاتی ہے۔ یعنی کرایہ مکان کا بڑا حصہ کرایہ دار کی طرف سے مالک مکان کو حکومت کے خزانہ سے ادا کیا جاتا ہے۔ ہندستان میں اپنا حق حاصل کرنے کے لئے آدمی کو دفتروں میں دوڑنا پڑتا ہے۔ پھر بھی رشوت کی قیمت دئے بغیر اس کو اپنا واجبی حق نہیں ملتا۔ یہاں خود حکومت دوڑ رہی ہے کہ وہ حقدار تک ان کا حق پہنچائے۔ اور جہاں تک کرایہ دار کی طرف سے کرایہ ادا کرنے کا تعلق ہے، اس کا تو ہندستان میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اس قسم کے مختلف واقعات یہاں لوگوں کے ذریعہ معلوم ہوئے اس کے بعد میں نے سوچا کہ مسلم لیڈروں نے انگریزی قوم کے سلسلہ میں کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے نام نہاد آزادی کے مسئلہ کو لے کر انگریزوں سے اتنا متنفر کیا گیا کہ " نفرت انگریز " ان کے ایمان کا حصہ بن گیا۔ حتی کہ مقدس اکابر تک کے تذکرہ میں یہ لکھا جانے لگا کہ "حضرت کو انگریزوں سے سخت نفرت تھی"۔ ۱۹۴۷ کے بعد بھی " رشدی " جیسے مسائل کو لے کر یہ مخالفانہ پروپگنڈا جاری ہے۔

مسلم رہنماؤں پر فرض کے درجہ میں ضروری تھا کہ وہ انگریز قوم کو دعوت کا موضوع بنائیں۔ مگر انھوں نے اس کے برعکس یہ کیا کہ انگریز قوم کو نفرت اور عداوت کا موضوع بنا دیا۔ یہ ایک مجرمانہ غلطی تھی نہ کہ کوئی واقعی اسلامی کام۔ یہی وجہ ہے کہ ڈیڑھ سو سالہ انگریز مخالف کوششیں حبط اعمال کا شکار ہوگئیں۔ کسی بھی درجہ میں ان کا کوئی فائدہ حاصل نہ ہو سکا۔ حتی کہ جن اکابر نے انگریز کو اسلام کا ازلی دشمن بتایا تھا، انھیں کی اولادیں اور انھیں کے شاگرد اب انگریز کے ملک میں آکر آباد

ہورہے ہیں اور فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ میں یو کے میں سٹل ہوگیا ہوں۔

۷ استمبر کی شام کو بولٹن کی زکریا مسجد دیکھی۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ برطانیہ میں بنائی جانے والی دوسری مسجد ہے۔ باہر سے دیکھنے میں یہ مسجد یہاں کے معروف مکان کی مانند نظر آتی ہے نماز کا حصہ بڑے ہال کی مانند ہے۔ اس کے اندر بچوں کا مدرسہ قائم ہے۔ میں جس وقت مسجد میں داخل ہوا تو وہاں بچوں کے قرآن پڑھنے کی آواز اسی طرح سنائی دے رہی تھی جس طرح ہندستان کی ان مسجدوں میں سنائی دیتی ہیں جہاں مسجد کے ساتھ مدرسہ بھی قائم ہے۔ مسجد صاف ستھری تھی۔ تین آدمی ایک کنارے بیٹھے ہوئے قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ مسجد کے اندر سکون کا ماحول نظر آیا۔ مسجد کے بیرونی حصہ میں ایک بورڈ پر لکھا ہوا تھا:

To all Muslim brothers, please give your Lillah donations.

مسجد دیکھنے کے بعد میں اپنے تین عرب ساتھیوں کے ہمراہ شہر کے باہر گیا۔ یہاں پہاڑیاں تھیں۔ اور قدرتی مناظر کا ماحول تھا۔ یہاں کی خالص ہوا میں ہم لوگوں نے کچھ وقت گزارا۔ اور اس کے بعد گھر واپس آ گئے۔

پہاڑی کے دامن میں ایک مقام پر گھوڑے کا فارم تھا۔ ایک جگہ میں نے دیکھا کہ ایک انگریز بچہ ایک گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر اس کو گولائی میں دوڑا رہا ہے۔ بچہ کی عمر غالباً دس سال ہوگی۔ اور گھوڑا نہایت قوی ہیکل تھا۔ مگر وہ مکمل طور پر بچہ کے قابو میں تھا۔ بچہ جس طرف چاہتا اس کو لے جاتا اور جہاں چاہتا اس کو کدا تا۔ میں نے اپنے عرب ساتھیوں سے کہا کہ یہی تسخیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے گھوڑے کی فطرت اس طرح بنائی ہے کہ وہ انسان کی تابعداری کو قبول کر لے۔ اگر گھوڑے میں یہ پیدائشی صفت نہ ہوتی تو ناممکن تھا کہ انسان کا ایک بچہ اس طرح اس کو قابو میں کر کے اس کو اپنی سواری بنا سکے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو انسان کے لئے مسخر کر دیا ہے۔ یہ تسخیر کہیں براہ راست ہے اور کہیں بالواسطہ۔ یعنی کچھ چیزیں ایسی ہیئت پر بنائی گئی ہیں کہ وہ ہمیشہ انسان کے موافق ہیں۔ مثلاً زمین کی کشش یا سورج کی گرمی۔ اور کچھ چیزوں میں یہ صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ انسان اپنے تصرف سے ان کو اپنے موافق بنا سکے۔ مثلاً گھوڑا یا

مویشی۔ اگر تسخیر کا یہ عمل ہیشگی طور پر نہ کر دیا گیا ہوتا تو انسان کے لئے زمین پر زندہ رہنا یا تمدن کی تعمیر کرنا ممکن نہ ہوتا۔

وگن کے قیام کے دوران میری ملاقاتیں صرف عرب نوجوانوں سے یا کچھ انگریزوں سے ہوئیں۔ یہ عرب نوجوان یہاں غیر مسلموں میں دعوتی کام انجام دے رہے ہیں۔ وہ خاص اسی مقصد کے لئے یہاں آکر مقیم ہوئے ہیں۔ وہ الرسالہ انگریزی لوگوں کو پڑھنے کے لئے دیتے ہیں۔ اور ہمارے یہاں کی انگریزی مطبوعات منگوا کر اس کو پھیلا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ الرسالہ کے دعوتی مضامین چھوٹے چھوٹے پمفلٹ کی صورت میں چھپوا کر مفت تقسیم کرتے ہیں۔ یہ ایک خاموش دعوتی عمل ہے جس میں وہ لوگ رات دن مصروف رہتے ہیں۔

ان عرب نوجوانوں نے انگریزی زبان بخوبی سیکھ لی ہے۔ اب ان کا خیال ہے کہ ان میں سے ہر شخص کسی اور یورپی زبان کو کم از کم بقدر ضرورت سیکھے تاکہ وسیع تر دعوتی روابط قائم کرنے میں سہولت ہو۔ باہمی مشورہ سے طے ہوا کہ آپ لوگ کم از کم فی الحال اپنا کوئی الگ ادارہ قائم کرنے کی کوشش نہ کریں۔ بلکہ جو مسلم ادارے برطانیہ میں قائم ہو چکے ہیں یا پہلے سے کام کر رہے ہیں، ان سے جڑ کر اپنا مثبت کام جاری رکھیں۔

ایک مجلس میں کچھ لوگوں نے کہا کہ آپ اکابر پر تنقید کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے لوگ بھڑکتے ہیں۔ آپ کو تنقید چھوڑ دینا چاہئے تاکہ لوگ آپ کے قریب آسکیں۔

میں نے کہا کہ تنقید پر بگڑنا، ایک قسم کا ذہنی نقص ہے جس کو علماء نفسیات دو قسمی طرز فکر (dichotomous thinking) کہتے ہیں۔ ایسا آدمی چیزوں کو صرف دو قسم میں رکھ کر سوچ پاتا ہے۔ وہ کسی تیسری قسم کو نہیں جانتا۔ اس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ جب اس کے اکابر پر تنقید کی جائے تو وہ بگڑ جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ تنقید اس کے اکابر کو ڈسکریڈٹ کر رہی ہے۔ وہ یا تو بے تنقید حالت کو جانتا ہے یا باتنقید حالت کو۔ وہ سمجھتا ہے کہ جس آدمی پر تنقید کی جا رہی ہے وہ غلط انسان ہے اور جس آدمی پر تنقید نہ کی جائے وہ صحیح انسان۔

حالاں کہ یہاں ایک تیسری حالت بھی ہے جس کو حدیث میں اجتہادی خطا کی حالت بتایا گیا ہے۔ یعنی آدمی بذات خود صحیح اور قابل قدر ہو مگر کسی معاملہ میں اس سے اجتہادی غلطی ہو جائے۔

اس قسم کی غلطی کسی بھی شخص سے ہو سکتی ہے، حتی کہ صلحاء سے بھی۔ ایسی غلطی کی نشاندہی کرنا نہ تو کوئی نامحمود فعل ہے اور نہ کسی کے بارہ میں ایسی غلطی کا ثابت ہونا اس کی شخصیت کو ختم کرنے کے ہم معنی

میری قیام گاہ پر بہت سی عربی کتابیں تھیں، ان میں سے کچھ کتابوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ابن جوزی البغدادی (م ۵۹۷ ھ) کی مشہور کتاب تلبیس ابلیس کو پڑھتے ہوئے کئی سبق آموز چیزیں نظر آئیں۔ صفحہ ۲۸۳ ۔ ۲۸۴ پر انھوں نے لکھا ہے کہ سعید بن مسیب نے کہا کہ اصحاب رسول شام میں تجارت کرتے تھے، ان میں طلحہ بن عبید اللہ اور سعید بن زید ہوتے تھے۔ احمد بن حنبل نے توکل کے نام پر گھر بیٹھ رہنے کے خلاف کہا کہ اصحاب رسول بر اور بحر میں تجارت کرتے تھے۔ وہ کھجور کے باغوں میں کام کرتے تھے اور انھیں کے اندر ہمارے لئے نمونہ ہے (کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتجرون فی البر والبحر ویعملون فی نخیلھم ولنا القدوۃ بھم):

عن أحمد ان رجلا قال له۔ أرید الحج علی التوکل فقال له فاخرج فی غیر القافلۃ فقال لا ۔ قال فعلی جراب الناس توکلتَ	امام احمد سے ایک شخص نے کہا کہ میں توکل کی بنیاد پر حج کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے اس سے کہا کہ پھر تم قافلہ کے بغیر نکلو۔ اس نے کہا کہ نہیں۔ انھوں نے کہا کہ پھر تم نے لوگوں کے تھیلے پر توکل کیا ہے۔

ابن جوزی غیر معمولی ذہین اور قابل شخص تھے۔ ان کی تفسیر قرآن (زاد المسیر فی علم التفسیر) نہایت قیمتی ہے۔ جو لوگ قرآن کا گہرا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، ان کو ابن جوزی کی تفسیر قرآن ضرور پڑھنا چاہئے۔ یہ تفسیر ابھی تک صرف عربی زبان میں ہے۔ میرے علم کے مطابق اس کا ترجمہ ابھی تک کسی اور زبان میں شائع نہیں ہوا۔

۱۸ ستمبر کو جمعہ کا دن تھا۔ تین عرب نوجوانوں کے ساتھ میں وگن سے مانچسٹر گیا۔ ہم ایک بلڈنگ کے پاس اترے۔ معلوم ہوا کہ اس کی چوتھی منزل پر مسجد ہے۔ ہم لوگ ایک قدیم لفٹ میں داخل ہو کر اوپر پہنچے۔ یہاں دوبارہ ایک قدیم طرز کا ہال تھا۔ فرش سے لے کر دیوار تک ہر چیز فرسودہ حالت میں نظر آئی۔ میں نے چل کر دیکھا تو اس کا اندرونی حصہ چوڑائی میں ۲۳ قدم اور لمبائی میں ۳۱ قدم

تھا۔ باہر کے ایک بورڈ سے معلوم ہوا کہ نئی مسجد کی تعمیر کے لئے رقم کی فراہمی جاری ہے۔ مسجد کا وضو خانہ جدید اور صاف ستھرا نظر آیا۔

امام صاحب نے انگریزی میں خطبہ دیا۔ دو خطبوں میں کچھ عربی کلمات کے ساتھ انھوں نے انگریزی میں تقریر کی۔ تقریر کا مضمون آخری حد تک روایتی تھا۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ ان کی دونوں تقریروں سے حاضرین کوئی سبق کی بات لے کر گئے ہوں۔ کیوں کہ سبق کی کوئی بات سرے سے تقریر میں موجود تھی ہی نہیں۔ تقریر کے دوران وہ بار بار "آور پرافٹ صلی اللہ علیہ وسلم" کا لفظ بول رہے تھے۔ یہی تمام مسلمانوں کا حال ہے۔ اللہ نے اپنے آخری رسول کو سارے عالم کا پیغمبر بنا کر بھیجا تھا۔ مگر مسلمانوں نے اس کو اپنا پیغمبر بنا دیا۔ کیوں کہ جیسا کہ خطیب نے کہا، مسلمان پیغمبر کو اپنا پرائڈ سمجھتے ہیں۔ اور پرائڈ کی نفسیات کی تسکین کے لئے ضروری ہے کہ اس کو "اپنے پیغمبر" کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ دور زوال میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں ان میں سے ایک خرابی یہ ہے کہ ہمارے علما، قرآن و حدیث کو فروعی باتوں پر منطبق کرنا جانتے ہیں مگر وہ ان کو اساسی امور پر منطبق کرنا نہیں جانتے۔ مثلاً حدیث میں ہے کہ من احدث فی امرنا ھٰذا مالیس منه فهو رد۔ اسی طرح حدیث میں ہے کہ مونچھ کو تراشو اور داڑھی کو بڑھاؤ (اعفوا اللحی وقصوا الشوارب) اب اگر کوئی شخص کہے کہ داڑھی کو تراشو اور مونچھ کو بڑھاؤ تو علماء فوراً کہیں گے کہ یہ بدعت ہے۔ مگر زیادہ بڑے بڑے اور اساسی مسائل میں وہ خود احداث (بدعت) میں مبتلا رہتے ہیں اور انھیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔

مانچسٹر میں ایک دیندار مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران "یونی پولر ورلڈ" کا تذکرہ ہوا۔ انھوں نے غصہ اور تشویش کے انداز میں کہا کہ جارج بش نے کہا ہے کہ اب کسی ملک میں پریسیڈنٹ یا پرائم منسٹر ہماری مرضی کے بغیر نہیں بن سکتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ کے عزائم کتنے خطرناک ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ ماشاءاللہ دین دار ہیں۔ یقیناً آپ روزانہ قرآن کی تلاوت کرتے ہونگے۔ کیا آپ نے قرآن میں یہ آیت نہیں پڑھی: قل اللّٰھم مالک الملک تؤتی الملک

من تشاء وتنزع الملك ممّن تشاء وتعزّ من تشاء وتذلّ من تشاء بيدك الخير إنّك على كلّ شئ قدير (آل عمران ۲۶) آپ کو اس کے جواب میں کہنا چاہئے تھا کہ امریکی پریذیڈنٹ نے یہ ایسی بات کہی ہے جو اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ قرآن کی صراحت کے مطابق کسی کو حکمراں بنانا یا کسی کو حکمرانی سے ہٹانا یہ مکمل طور پر اللہ رب العالمین کے اختیار میں ہے۔ پھر ایسی بے معنی بات پر تشویش کی کیا ضرورت۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں قرآن پڑھنے والوں کا طرز فکر بھی قرآنی طرز فکر نہیں۔ لوگ ٹوپی اور داڑھی کے معاملہ میں سنت رسول کا اہتمام کرتے ہیں۔ مگر انھیں اس سنت رسول کی خبر نہیں کہ عرب کی ایک مشرک عورت نے آپ کو مذمّم کہا تو آپ نے اس کو لغو سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا اور فرمایا کہ اس عورت کو دیکھو، یہ مجھ کو مذمم کہہ رہی ہے حالاں کہ اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ مجھ کو تاریخ میں محمّد کا مقام عطا کرے۔

اسی بے خبری کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان ہر فضول گو سے لڑنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں حالاں کہ یہ بھی پیغمبر اسلام کی ایک سنت ہے کہ فضول گو لوگوں کو نظر انداز کر کے اپنا مثبت کام جاری رکھا جائے۔

وگن کی ایک چھوٹی لائبریری میں مشہور انگریز سائنس داں سر جیمز جینز کی کتاب طبیعیات اور فلسفہ (Physics and Philosophy) دیکھی۔ اس کے دیباچہ (Preface) کے نیچے مصنف کے دستخط کے ساتھ ۸ جولائی ۱۹۴۲ کی تاریخ درج ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب ۱۹۴۱ - ۴۲ میں لکھی گئی ہے۔ کتاب کا سب ٹائٹل مصنف نے ان الفاظ میں تجویز کیا ہے ـــــ ایک طبیعیات داں کے تاثرات کچھ فلسفیانہ مسائل کے بارہ میں:

The reflections of a physicist on some of the problems of philosophy.

مصنف نے زیر بحث موضوع کا مطالعہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کائنات کی سائنس نے ہم کو جہاں پہنچایا ہے اس کے بعد بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت کا دروازہ کھولنا ممکن ہے، بشرطیکہ ہم اس کا دستہ حاصل کر سکیں:

it almost seems to suggest that the door may be unlocked, if only we could find the handle. (p. 216)

مصنف نے مزید لکھا ہے کہ اگر جدید معلومات کی روشنی میں دیکھا جائے تومعلوم ہو گا کہ مادہ پرستی کے نظریہ کی نئی سائنسی معلومات کی روشنی میں از سر نو تشریح کرنے کی ضرورت ہے:

materialism need to be redefined in the light of our new scientific knowledge. (p. 216).

میں نے اس کو پڑھا تو میں نے سوچا کہ ۱۹۴۱ - ۴۲ میں ہمارے رہنما جس وقت انگریز کو نفرت اور عداوت کا موضوع بنا کر اس سے لڑ رہے تھے، عین اسی وقت انگریز کا علم اس کو اس مقام پر پہنچا رہا تھا کہ سائنس اور مادی تہذیب اپنی ساری ترقیوں کے باوجود ناکافی ہے۔ لمبا علمی سفر طے کرنے کے بعد وہ جہاں پہنچا ہے وہاں اس کو دکھائی دے رہا ہے کہ سامنے کا دروازہ بند ہے۔ اور اس کو کھولنے کے لئے جو ہینڈل درکار ہے وہ اس کو حاصل نہیں۔

یہ "ہینڈل" خوش قسمتی سے قرآن کی صورت میں ہمارے پاس تھا۔ اور مغربی طرز کی مادیت کے مقابلہ میں زیادہ صحیح دنیاوی نقطۂ نظر بھی قرآن وسنت کی صورت میں ہمارے پاس موجود تھا۔ مگر دعوتی ذہن کی غیر موجودگی کی بنا پر ہمارے رہنما اس امکان کو دریافت نہ کر سکے۔ وہ انگریزوں کو صرف دشمن کے روپ میں دیکھتے رہے، حالاں کہ امکانی طور پر وہ دوست اور رفیق کی حیثیت رکھتا تھا۔

۱۷ ستمبر کو میں وگن کے مکان میں تھا۔ صاحب بیت نے ایک اخبار لاکر دیا۔ اس کا نام وگن رپورٹر (Wigan Reporter) تھا۔ اور وہ ۸۰ صفحہ پر مشتمل تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ ہفتہ وار اخبار ہے اور لوگوں کے درمیان بلاقیمت تقسیم کیا جاتا ہے۔ ضخیم اخبار اشتہارات سے بھرا ہوا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہاں زندگی کا طریقہ کیا ہے۔ یہ "اخبار" کے نام پر اشتہار کو گھر گھر پہنچانے کی ایک تدبیر ہے۔ مگر شاید ہی کوئی شخص ہو جو اول سے آخر تک اسے دیکھتا ہو۔

برطانیہ سے قرآن کا ایک انگریزی ترجمہ چھپا ہے۔ اس کا ایک نسخہ میں نے دیکھا۔ متن کے بغیر وہ ۵۰۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ مترجم کی حیثیت سے اس پر دو نام لکھے ہوئے تھے:

مختلف مقامات پر اس ترجمہ کو دیکھا۔ مجھے زیادہ پسند نہ آسکا۔ سورہ الحجر میں آیت ۷۵
(وفی ذالك لآیات للمتوسمین) کا ترجمہ اس طرح کیا گیا تھا:

Surely in this are signs for those who reflect upon events.

اس ترجمہ سے آیت کا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ عبداللہ یوسف علی نے اس آیت کا جو ترجمہ کیا ہے وہ نسبتاً زیادہ واضح ہے۔ ان کے ترجمہ کے الفاظ یہ ہیں:

Surely in this are signs for those who by tokens do understand.

۱۶ ستمبر کو لندن ایئر پورٹ، ہی سے ثانی اثنین خان کا ساتھ چھوٹ گیا تھا۔ وہ ایئر پورٹ سے پروفیسر انیس قاری کے ساتھ چلے گئے اور ان کے تعاون سے لندن میں الرسالہ اور مطبوعات الرسالہ کے تعارف میں مشغول ہو گئے۔ میں ایئر پورٹ سے نکل کر ریلوے اسٹیشن گیا اور بذریعہ ٹرین وگن (Wigan) چلا آیا۔

وگن میں میں اردو دنیا سے کٹا ہوا ہوں۔ اب تک کسی بھی اردو داں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ یہاں میں ایک مکان میں مقیم ہوں۔ صبح سے شام تک یہاں ایک ہی مشغلہ ہے۔ چار عرب نوجوان اور میں ایک کمرہ میں بیٹھے ہیں۔ یہ تمام عرب تعلیم یافتہ ہیں۔ میں عربی زبان میں ان کے سامنے اسلامی موضوعات پر اظہار خیال کرتا ہوں۔ اس میں ایک طرف قرآن وسنت اور دوسری طرف جدید واقعات سے استشہاد کیا جاتا ہے۔ وہ لوگ ہمہ تن گوش ہو کر سنتے ہیں۔ اور جہاں سمجھ میں نہیں آتا، اس کے بارہ میں سوال کر کے مزید وضاحت کراتے ہیں۔

یہ ایک انوکھی قسم کی مجلس ہوتی ہے جس کی کوئی دوسری مثال میرے علم میں نہیں۔ میری عربی ہندستانی عربی ہوتی ہے۔ اس میں صلات کی اور تذکیر و تانیث کی بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ مگر ان عرب نوجوانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ایک طرف ٹیپ ریکارڈر پر ایک ایک لفظ محفوظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف قلم کاغذ لے کر اس کو برابر تحریر کرتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ نماز فجر کے بعد سے لے کر نماز عشاء کے بعد تک مسلسل جاری رہتا ہے۔

یہ اللہ کا شکر ہے کہ اس قسم کے سیکڑوں عرب نوجوان مختلف عرب ملکوں میں پیدا ہوچکے ہیں جو الرسالہ مشن سے شیفتگی کی حد تک تعلق رکھتے ہیں۔ الرسالہ مشن اردو میں جاری ہوا۔ اس کا لٹریچر زیادہ تر اردو زبان میں ہے۔ یہ عرب نوجوان اردو سے مکمل طور پر ناواقف ہیں، اس کے باوجود انھوں نے الرسالہ مشن کو جتنا زیادہ سمجھا ہے اور جتنا اس کو پایا ہے، اس کی مثال اردو داں لوگوں میں بھی مشکل سے ملے گی۔

ان عرب نوجوانوں میں ایک قابل لحاظ تعداد ایسے نوجوانوں کی ہے جنھوں نے اپنی زندگیاں اس کے لئے وقف کردی ہیں۔ اور مختلف ملکوں میں خاموشی کے ساتھ اس مشن کو پھیلانے میں مصروف ہیں۔ اس قسم کا ایک بڑا حلقہ قاہرہ میں ہے۔ وہ لوگ الرسالہ کے منتخب مضامین کا عربی میں ترجمہ کرواتے ہیں اور اس کو پمفلٹ کی صورت میں چھاپ کر عربوں کے درمیان پھیلا رہے ہیں۔ انگلینڈ میں مقیم عرب نوجوان یہی کام انگریزی کتابچوں کی صورت میں کر رہے ہیں۔ اسی طرح اور کئی ملک میں یہ کام خالص مثبت انداز میں جاری ہے۔

العارف عبدالسلام احمد (۳۲ سال) ایک عرب نوجوان ہیں۔ ان کی تعلیم برطانیہ (Red Car, Middlesborough) میں ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ۲ اگست ۱۹۹۲ کو وہ لیسٹر میں تھے۔ وہاں مشہور مصری عالم دکتور محمد صلاح الصاوی ایک مؤتمر میں اپنا مقالہ پیش کرنے کے لئے آئے تھے۔ وہاں ایک پاکستانی نوجوان ان سے بحث کرنے لگا کہ اسلام کی حاکمیت قائم کرنا امت پر فرض ہے اور یہی امت مسلمہ کا نصب العین ہے۔ دکتور صاوی نے کہا: الحاكمية ليست بآية ولا حديث ولكنها اجتهادُ بشرٍ عُرضة للخطأ (حاکمیت کا لفظ نہ آیت ہے اور نہ حدیث۔ بلکہ وہ ایک انسان کا اجتہاد ہے جو غلطی کا شکار ہوسکتا ہے)

وگن میں مجھے دکتور صلاح الصاوی کی کتاب قضية تطبيق الشريعة في العالم الاسلامي ملی۔ اس کے باب رابع کا عنوان ہے: اجماع الامة على كفر من أبى التحاكم الى الكتاب والسنة۔ اس باب میں دکتور یوسف القرضاوی کا ایک اقتباس ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے:

بل أن العلماني الذي يرفض مبدأ تحكيم الشريعة من الاساس ليس له من الاسلام الا اسمه۔ وهو مرتد عن الاسلام بيقين۔ يجب أن يستتاب وتزاح عنه

الشبهة وتقام عليه الحجة ۔ والاحکم القضاء عليه بالردة وجُرّدِ من انتماءه الى الاسلام او سحبت منه الجنسية الاسلامية ۔ وفرق بينه وبين زوجه وولده ۔ وجرت عليه احكام المرتدين المارقين فى الحياة وبعد الوفاة (صفحہ ۴۶)

علمانی (سیکولر) کا مذکورہ حکم اس وقت ہے جب کہ علمانیت (سیکولرزم) کو ایک اعتقادی چیز مانا جائے۔ مگر سیکولرزم اصلاً ایک عملی تدبیر ہے۔ سیکولرزم کا عمومی مطلب یہ ہے کہ کثیر مذہبی سماج میں ریاست اس بات کی پابندی قبول کرلے کہ وہ مذہبی امور میں عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کرے گی۔ گویا سیکولرزم صرف ایک سیاسی مسلک ہے نہ کہ کوئی مذہبی عقیدہ۔

۱۹ ستمبر کو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں جس مکان میں ٹھہرا تھا، اس کے پیچھے ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ کسی نے اس کا شیشہ توڑ دیا ہے۔ میں نے جاکر دیکھا تو ڈرائیور کی سیٹ کے پاس والا کھڑکی کا شیشہ مکمل طور پر ٹوٹ گیا تھا اور اس کے ٹکڑے زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہاں بے روزگار لڑکے اکثر اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں۔ یہ لڑکے عام طور پر شراب اور ڈرگ کے عادی ہو جاتے ہیں۔ جب ان کے پاس اپنی بری عادتوں کو پورا کرنے کے لئے پیسے نہیں ہوتے تو وہ چوری کرتے ہیں۔ مذکورہ گاڑی کا شیشہ کسی لڑکے نے اس لئے توڑا تھا کہ وہ اس کے اندر لگے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کو نکال لے اور پھر اس کو بیچ کر کچھ رقم حاصل کرے۔

جدید مغربی زندگی میں جہاں بہت سی مادی اور اخلاقی خوبیاں ہیں، ان میں بعض ایسی برائیاں پائی جاتی ہیں جن کا مشاہدہ مشرقی ملکوں میں نہیں ہوتا۔ یہاں کی سڑکوں پر چلتے ہوئے میں نے دیکھا کہ جگہ جگہ مکانوں کے سامنے برائے فروخت (for sale) کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس وقت برطانیہ میں اقتصادی گراوٹ (recession) کا دور ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ اپنے مکانوں کی قسط بینکوں کو ادا کرنے میں اپنے کو عاجز پا رہے ہیں۔ اس لئے انھوں نے اپنے مکانوں کو اپنے بینکوں کے حوالے کر دیا ہے تاکہ وہ کسی اور گاہک کو تلاش کرکے مکان ان کے حوالے کرسکیں۔ واضح ہو کہ یہاں مکانات عام طور پر بینکوں کے قرض کی بنیاد پر خریدے جاتے ہیں۔

ایک انگریز سے گفت گو کے دوران میں نے پوچھا کہ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کو اپنے

موجودہ حالات میں ذہنی سکون حاصل ہے :

Do you feel you are enjoying mental peace.

اس نے مسکرا کر کہا کہ ہماری زندگی اتنی زیادہ مشینی ہو چکی ہے کہ ہمارے لئے یہ سوچنے کا موقع بھی نہیں ہم میں سے اکثر لوگوں کو شاید ہی کبھی یہ موقع ملتا ہو کہ وہ آپ جیسے لوگوں کی طرح فلسفیانہ انداز میں سوچیں کہ انھیں پیس آف مائنڈ حاصل ہے یا نہیں۔

ترقی کے ساتھ بے ترقی کا کیسا عجیب نمونہ مغربی ملکوں میں پایا جاتا ہے۔

برطانیہ میں آپ جس سڑک یا جس مقام پر نکلیں ہر جگہ کتوں کا منظر دکھائی دے گا۔ مرد اور عورت کتے کی رسی اپنے ہاتھ میں لے کر چلتے ہوئے نظر آئیں گے۔ ۲۰ ستمبر کو میں نے ایک تعلیم یافتہ انگریز سے کہا معاف کیجئے، کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ آپ لوگ کتوں سے کیوں اتنا زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔

انگریز کچھ دیر چپ رہا۔ اس کے بعد بولا۔ میں نے فرانس کے بارہ میں ایک رپورٹ پڑھی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ فرانس میں سات ملین آدمی کتا پالے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کا ایک سروے کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خاندانی انتشار اور انڈسٹریل انقلاب کے نتیجہ میں لوگوں نے انسان کے اندر اپنا اعتماد کھو دیا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے دیکھا کہ بیٹا اور بیٹی بھی ان کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ جب کہ کتا اپنی وفاداری کی فطرت کی بنا پر انھیں یہ اعتماد دے رہا تھا۔ کتے کے اندر وہ اپنی اس مطلوب چیز کو پا رہے تھے جس کو وہ موجودہ انسان حتی کہ اپنے عزیزوں میں بھی نہیں پاتے۔ اس لئے وہ اپنی مطلوب فطرت کی تسکین کے لئے کتا پالنے لگے ہیں۔ پھر اس نے مسکرا کر کہا کہ یہی معاملہ غالباً برطانیہ کے لوگوں کا بھی ہے۔

میں نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ کتا ری ایکٹ نہیں کرتا، جب کہ انسان ری ایکٹ کرتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کتا انسان کے مقابلہ میں ایک غیر اختیاری مخلوق ہے۔ انسان با اختیار مخلوق ہونے کی وجہ سے ری ایکٹ کرتا ہے جو آپ کے لئے ناگوار ہے۔ جب کہ کتا اس طرح ری ایکٹ نہیں کرتا اس لئے اس کے اور آپ کے درمیان کامپلکس پیدا نہیں ہوتا۔

پھر میں نے قرآن کی آیت افغیر دین اللہ یبغون و لہ اسلم من فی السماوات والارض

طوعاوکرھا کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ خدا کی اسکیم میں انسان اور حیوان دونوں سے ایک ہی دین کی پیروی مطلوب ہے، اس فرق کے ساتھ کہ جس اصول کی پیروی حیوان جبلت (instinct) کے تحت مجبورانہ کررہے ہیں، اس دین کی پیروی انسان اختیارانہ کرنے لگے۔ اسی کا نام اسلام ہے۔ اسلام کا مطلب دراصل دین فطرت کی پیروی ہے۔ اگر انسان اسی طرح دین فطرت پر آجائے جس طرح حیوان دین فطرت پر قائم ہے تو اس کے بعد انسان سے ری ایکشن کا طریقہ چھوٹ جائے گا۔ اس کے بعد انسان بھی آپ کے لئے محبوب بن جائے گا جس طرح حیوان آپ کے لئے محبوب بنا ہوا ہے، کیوں کہ انسان ہر اعتبار سے حیوان کے مقابلہ میں افضل ہے۔ مثلاً ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان خیالات کا ایکسچینج ہوتا ہے، جب کہ انسان اور حیوان کے درمیان اس قسم کا ایکسچینج ممکن نہیں۔

دسمبر ۱۹۹۱ میں مانچسٹر میں ایک بڑی اسلامی کانفرنس ہوئی۔ اس میں مختلف ملکوں کے علماء شریک ہوئے۔ اس کا موضوع الاسلام والنظام العالمی الجدید تھا۔ طارق حسین الکردی (۳۰ سال) مانچسٹر کے قریب وگن میں رہتے ہیں۔ وہ موتمر میں شریک نہیں تھے۔ البتہ اس کا ویڈیو ٹیپ انھوں نے دیکھا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ ایک عرب محاضر نے اپنے محاضرہ میں بتایا کہ مغرب اسلام کا دشمن ہے۔ وہ اسلام کو تباہ کردینا چاہتا ہے (ان الغرب یرید تدمیر الاسلام) محاضرہ کے بعد حاضرین میں سے ایک نوجوان کھڑا ہوا۔ اس نے کہا کہ آپ کہتے ہیں مغرب اسلام کو تباہ و برباد کردینا چاہتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہمارے لئے کیسے یہ ممکن ہوا کہ ہم ایک مغربی ملک میں اتنے بڑے پیمانہ پر موجودہ اسلامی کانفرنس اور اس طرح کی دوسری کانفرنسیں منعقد کریں۔ محاضر نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ تم اس راز کو نہیں جانتے۔ یہ مغرب کی ایک گہری چال ہے۔ یہ مغرب کی فراخ دلی کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کی سوچی سمجھی اسٹریٹجی کا نتیجہ ہے۔

میں نے اس قصہ کو سنا تو میں نے کہا کہ استغفراللہ۔ محاضر اگر واقعی اسلام پسند تھے تو اس سوال کے بعد انھیں ڈھ پڑنا چاہئے تھا اور چیخ کر کہنا چاہئے تھا: کل الناس اعلم منی حتی العجائز سیدنا عمر کی یہ سنت بتاتی ہے کہ مومن کا مزاج کیا ہوتا ہے۔ مومن وہ ہے کہ جب اس کی غلطی بتائی

تو وہ اس کے عدم اعتراف کو افورڈ نہ کرسکے۔ میں نے کہا: المومن لا یستطیع ان یتحمل عدم الاعتراف۔

ایک عرب نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان کا نام پوچھا۔ انھوں نے کہا: حارب۔ میں نے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک بات عرض کروں۔ پھر میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی فاطمہ کا نکاح علی ابن ابی طالب سے کیا۔ ان کے یہاں ایک بچہ کی ولادت ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے پوچھا کہ اس کا نام کیا رکھا۔ انھوں نے کہا حرب۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں اس کا نام حسن رکھو۔

میں نے کہا کہ آپ کا نام ما انا علیہ واصحابی کے خلاف ہے۔ جس نام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رد کر دیا اس کو آپ دوبارہ پسند کر رہے ہیں۔ پھر میں نے کہا کہ یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ تاریخ میں دور حرب ختم ہوا، اور دور امن شروع ہوا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم زعماء اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے۔ رسول اور اصحاب رسول نے اپنی قربانیوں سے دور حرب کو ختم کرکے تاریخ انسانی میں دور امن شروع کیا۔ اور یہ مسلم زعماء دوبارہ تاریخ انسانی میں دور حرب واپس لانا چاہتے ہیں۔

۲۰ ستمبر کو عرب نوجوانوں کی ایک مجلس میں سورۃ النساء کی آیت ۱۰۱ کے بارہ میں سوال کیا گیا۔ اس سلسلہ میں وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس دنیا میں کبھی یکساں حالات نہیں ہوسکتے۔ یکساں حالات صرف جنت کے ماحول میں ممکن ہیں۔ یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ یہاں ہر ایک کو آزادی حاصل ہے اس لئے یہاں ہمیشہ نشیب و فراز کے حالات پیدا ہوتے رہیں گے۔ اس لئے قرآن وسنت میں ہر طرح کے احکام ہیں تاکہ اہل اسلام اپنے آپ کو جن حالات میں پائیں اس کے مطابق عمل کرسکیں۔

مثلاً اس دنیا میں اہل ایمان کو کبھی مسجد میں معتدل حالات میں نماز پڑھنے کا موقع ملتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انھیں جنگ کے میدان میں نماز پڑھنا پڑتا ہے۔ اس لئے قرآن و حدیث میں اگر عام حالات میں نماز کی ادائگی کا حکم بتایا گیا تو اسی کے ساتھ جنگ کے میدان کے لئے صلاۃ خوف کا حکم بھی بتادیا گیا۔

پھر میں نے کہا کہ مسلمانوں کے لئے موجودہ دنیا میں مختلف حالات ہوسکتے ہیں۔ اس لحاظ سے

سنت رسول کا مطالعہ کیا جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی وسیع تر تقسیم میں تین قسموں میں نظر آئے گی۔ اول، مکی دور۔ یہ وہ دور ہے جب کہ اہل اسلام کے ہاتھ میں سیاسی قوت نہیں تھی۔ دوم مدنی دور کا نصف اول۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مدینہ میں دو متوازی نظام قائم تھا۔ اس کا اقرار صحیفہ مدینہ میں ان لفظوں میں کیا گیا ہے: للیهود دینهم وللمسلمین دینهم۔ سوم، مدنی دور کا نصف ثانی۔ یہ وہ دور ہے جب کہ ماحول میں اہل اسلام کا غیر مشترک اقتدار قائم ہوگیا۔

میں نے کہا کہ سورہ النساء کی مذکورہ آیت (یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت) مدنی دور کے نصف اول والے حالات سے تعلق رکھتی ہے۔ آج اکثر ملکوں میں یہی صورت حال ہے۔ مثلاً برطانیہ میں ایک طرف برٹش کورٹ ہے۔ دوسری طرف مساجد اور اسلامی مراکز کے علماء ہیں جن کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ العلماء ورثۃ الانبیاء۔ برٹش کورٹ گویا کعب بن اشرف کے مماثل ہے۔ اور علماء (یا دار الافتاء) رسول کے نمائندہ۔ اب مذکورہ آیت کے مطابق، مسلمانوں کو یہ کرنا ہے کہ ان کے درمیان جب کوئی نزاع پیدا ہو تو وہ اپنے معاملہ کو ملکی عدالت میں نہ لے جائیں۔ بلکہ علماء یا دار الافتاء کے سامنے رکھ کر اس کا شرعی فیصلہ کریں اور قرآن وسنت کی روشنی میں جو فیصلہ دیا جائے اس کو بے چون وچرا تسلیم کرلیں۔

لندن میں مقیم ایک ہندستانی بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ پہلے میں آپ کا رسالہ پڑھتا تھا۔ مگر اب میں نے اس کو پڑھنا چھوڑ دیا۔ میں نے پوچھا کیوں۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے خلاف کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اور آپ کے خلاف مضامین چھپ رہے ہیں۔ ان کو دیکھنے کے بعد میں آپ کے مشن کے بارہ میں مشتبہ ہوگیا اور آپ کی تحریروں کو پڑھنا چھوڑ دیا۔

میں نے کہا کہ مخالفانہ مضامین تو ہر ایک کے خلاف لکھے گئے ہیں۔ تبلیغی جماعت جیسی بے ضرر جماعت کے خلاف بھی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ حتی کہ اکابر میں سے کوئی بھی شاید ہی اس قسم کی تحریروں سے بچا ہو۔ اس وقت میرے پاس محمد سرور بن نایف زین العابدین کی کتاب الحکم بغیر ما انزل اللہ واھل الغلو تھی۔ یہ کتاب دار القلم، برمنگھم (Tel. 021-449 4422) نے چھاپی ہے۔ میں نے اس کا صفحہ ۲۰۸ دکھایا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کچھ لوگوں نے امام النووی کے بارہ میں لکھا ہے کہ انھوں نے اپنی شرح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر، حضرت ابوذر پر اور اسلام پر

جھوٹ باندھا ہے (لقد کذب علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعلی ابی ذر وعلی الاسلام) اس کو دکھانے کے بعد میں نے پوچھا کہ کیا یہ صحیح ہوگا کہ اس الزام کو دیکھنے کے بعد آپ امام نووی کی کتابیں پڑھنا چھوڑ دیں۔

ایک عرب نوجوان نے کہا کہ "قرآن عرب کی زبان میں اترا ہے" میں نے کہا کہ یہ نہ کہئے، بلکہ یہ کہئے کہ قرآن انسان کی زبان میں اترا ہے۔ اگر آپ یہ سمجھیں کہ قرآن عربوں کی زبان میں اترا ہے تو آپ قرآن کے ۵۰ فیصد معانی سے محروم رہ جائیں گے۔

برطانی نومسلموں کے بارہ میں ایک کتاب نظر سے گزری۔ اس میں برطانی نومسلموں کے تاثرات ان کی تصویروں کے ساتھ نقل کئے گئے ہیں۔ اس کا نام و پتہ یہ ہے :

Islam Our Choice, compiled by Dr S.A. Khulus,
The Woking Muslim Mission & Literary Trust,
The Shah Jehan Mosque, Woking, Surrey, England.

۳۶۰ صفحہ کی اس کتاب میں سیکڑوں نومسلموں کے تاثرات نقل کئے گئے ہیں۔ کچھ لمبے ہیں اور کچھ صرف چند سطروں پر مشتمل ہیں۔ صفحہ ۱۳۹ پر جیو ٹائلر (Geo T. Tyler) کا ایک مختصر اقتباس ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے کہ میں نے مقدس قرآن کا مطالعہ کیا۔ اسلام ایک صاف اور خوبصورت مذہب ہے۔ وہ نجات کو اپنی محنت کا نتیجہ قرار دیتا ہے نہ کہ ایک خدا کے بیٹے کے سولی پر چڑھنے کا نتیجہ۔

I studied the Holy Qur'an. Islam is a clean, wholesome faith and makes the salvation of man his own duty, and not dependent on the sacrifice of a 'Son of God.' (p. 139)

مانچسٹر میں ایک مسیحی فادر سے میری گفتگو ہوئی۔ میں نے ان کے سامنے مذکورہ بات پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ آپ لوگ کہتے ہیں کہ اسلام کے سوا تمام دوسرے مذاہب محرف ہو چکے ہیں۔ یہ تو گویا خدا کو بلیم دینا ہے۔ کیوں کہ یہ آپ لوگ بھی مانتے ہیں کہ وہ مذاہب خدا کی طرف سے آئے۔ پھر جب وہ خدائی مذہب تھے تو خدا نے کیسے گوارا کیا کہ اس کے بھیجے ہوئے تمام مذاہب محرف ہو جائیں اور صرف ایک غیر محرف مذہب دنیا میں باقی رہے۔

میں نے کہا کہ یہ خدا کی ایک نعمت ہے جو اس نے اپنے بندوں پر کی ہے۔ اس طرح اس نے یہ انتظام کر دیا کہ ہمارے لئے چوائس کا مسئلہ نہ رہے۔ ہم کو یہ سوچنا نہ پڑے کہ یہ مذہب صحیح ہے یا وہ مذہب صحیح ہے۔ میدان میں ایک ہی صحیح مذہب ہو اور کسی فتنہ میں مبتلا ہوئے بغیر ہم اس واحد صحیح مذہب کو اختیار کر لیں۔ اس طرح خدا نے ہم کو ایک نازک امتحان سے بچا لیا ہے جس پر ہمیں اس کا شکر گزار ہونا چاہئے۔

۲۱ ستمبر کی صبح کو میں ایک عرب نوجوان کی رہنمائی میں وگن کی مسجد میں گیا۔ یہ یہاں کی واحد مسجد ہے اور اس کا نام مسجد طوبیٰ ہے۔ یہ ہال کی مانند ہے۔ میں نے اس کے احاطہ کی پیمائش کی تو لمبائی میں وہ ۶۱ قدم اور چوڑائی میں ۴۵ قدم تھی۔ مسجد سادہ مگر خوبصورت تھی۔ اس کے اندر عربی کتابوں کا اچھا ذخیرہ موجود تھا۔ کئی الماریوں میں قرینہ کے ساتھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہاں ابن الجوزی البغدادی (۵۹۷-۵۰۸ ھ) کی تفسیر زاد المسیر فی علم التفسیر (نو جلد) بھی موجود تھی۔ اس کو المکتب الاسلامی (ص ب 3771 / ۱۱، بیروت) نے ۱۹۸۴ء میں اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ مسجد کا اندرونی حصہ جس میں نماز ادا کی جاتی ہے وہ لمبائی میں ۲۵ قدم اور چوڑائی میں ۲۱ قدم تھا۔

مسجد میں دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھی۔ نماز کے بعد کی دعا کے دوران میں نے کہا: رَبِّ لِمَا أَنْزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْر ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے یہ الفاظ حالت سفر میں نکلے تھے۔ میں بھی اس وقت حالت سفر میں ہوں۔ اسی اشتراک کی بنا پر بے اختیارانہ یہ الفاظ زبان پر جاری ہو گئے۔

مجھے بتایا گیا کہ یہاں ابتداءً چرچ تھا۔ چرچ والوں نے اس کو فروخت کر دیا۔ اس کے بعد یہ عمارت ایک انگریز کی ملکیت میں چلی گئی۔ بعد کو اس انگریز نے اس کو فروخت کرنا چاہا۔ مقامی مسلمانوں نے تقریباً ۲۰ ہزار پونڈ مسجد کے لئے جمع کئے تھے۔ انھوں نے چاہا کہ اس عمارت کو خرید کر اس کو مسجد کی صورت دے دیں۔ مگر عین اسی وقت ایک اور انگریز خریدار پیدا ہو گیا۔ وہ دگنا قیمت ۴۰ ہزار پونڈ دینے کے لئے تیار تھا۔ مگر جب عمارت کے مالک کو جو مسیحی تھا، یہ بتایا گیا کہ مسلمان اس کو خرید کر وہاں مسجد بنانا چاہتے ہیں تو وہ بہت خوش ہوا۔ اور انگریز کو ۴۰ ہزار پونڈ میں دینے کے بجائے مسلمانوں کو صرف ۲۰ ہزار پونڈ میں دے دیا۔ ایسا ہی ایک اور قصہ لندن میں میرے علم

میں آیا۔

مذکورہ مسیحی نے ایسا کیوں کیا۔ اس نے کہاکہ یہ عمارت پہلے ایک عبادت خانہ تھی۔ اس لئے اس کا سب سے بہتر استعمال یہ ہے کہ اس کو دوبارہ عبادت خانہ بنایا جائے۔ اس لئے میں اس کو کم قیمت کے باوجود مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کررہا ہوں۔ کیوں کہ انھوں نے بتایاکہ وہ اس کو عبادت خانہ بنانا چاہتے ہیں۔

۲۲ ستمبر کو ایک برطانی نومسلم سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے پچھلے سال اسلام قبول کیا ہے۔ میں نے ان سے تعلیم کے بارہ میں پوچھا۔ انھوں نے بتایاکہ انھوں نے یہاں میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی دوران انھیں اسلام سے واقفیت ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے تعلیم چھوڑ دی اور اسلام میں سرگرم ہو گئے۔

میں نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ میں نے کہاکہ یہ صحیح ہے کہ اسلام کی دریافت نے آپ کے اندر ایک نیا جوش پیدا کیااور اسلام کو سیکھنے کا جذبہ آپ کے اندر ابھر آیا۔ مگر یہ کام آپ کو ساتھ ساتھ کرنا چاہئے۔ یعنی تعلیم اور تربیت دونوں کی طرف توجہ دینا چاہئے۔ آپ ایک طرف کالج اور یونیورسٹی میں اپنی تعلیم مکمل کریں اور اسی کے ساتھ مساجد اور اسلامی مراکز سے وابستہ ہوکر اسلامی تربیت اور اسلامی معلومات حاصل کریں۔ آپ ابھی ابتدائی عمر میں ہیں۔ آپ کو اپنے آپ کو تیار کرنا ہے۔ آپ کو اپنے سامنے دو نشانہ رکھنا چاہئے نہ کہ صرف ایک نشانہ۔

اس گفتگو کے وقت ایک عرب نوجوان ریاض عبدالسلام احمد (۲۸ سال) موجود تھے۔ وہ برطانیہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آئے ہیں۔ انھوں نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ انھوں نے اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہاکہ عربوں میں ایک مثل ہے کہ ایک پتھر سے دو گوریا کا شکار کرو (یضرب عصفورین بحجر واحد) میں نے کہاکہ یہ نہایت صحیح مثل ہے اور آپ لوگوں کو اسی پر عمل کرنا چاہئے۔ یعنی تعلیم اور تربیت دونوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہئے، نہ یہ کہ تعلیم کو چھوڑ کر آپ صرف تربیت کے لئے دوڑنا شروع کردیں۔

اس وقت مجلس میں کئی عرب نوجوان تھے۔ میں نے معاملہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ قرآن میں حکم دیا گیا ہے: واعدوا لہم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل

ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم (الانفال ۶۰) اس آیت میں ترھبون کالفظ بیحد اہم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوت کے اندر ارہاب کی صفت ہونی چاہئے۔ گویا قوت وہ ہے جو قوت مرہبہ ہو۔

میں نے کہا کہ اس وقت عالم اسلام میں بے شمار سرگرمیاں جاری ہیں۔ کیا اہل عالم اس سے خوف زدہ ہیں۔ ہرگز نہیں۔ بعض نادان لوگ یورپ یا امریکہ کے کسی اخبار میں مسلم فنڈ منٹلزم یا صحوۃ اسلامیہ کے خلاف کوئی مضمون پڑھ کر کہتے ہیں کہ دیکھو، مغرب ہماری ان سرگرمیوں سے خوف زدہ ہے۔ میں نے ایک امریکی سے ایک بار اس بارہ میں گفتگو کی۔ اس نے کہا کہ یہ لوگ کم سے کم کوئی ازعاج (nuisance) تو پیدا کر ہی سکتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہم کو کیا درجہ دے رہے ہیں۔

پھر میں نے کہا کہ ہمیں موجودہ دور کو سمجھنا چاہئے۔ اس دور میں جو چیز قوت مرہبہ کی حیثیت رکھتی ہے وہ صرف علم ہے۔ خاص طور پر سائنسی علم۔ اس لئے اس آیت کے مطابق، مسلمانوں کو یہ کرنا ہے کہ وہ وقت کی قوت مرہبہ (علم) حاصل کریں۔ اس کے بغیر موجودہ دنیا میں ہم کو باوزن حیثیت نہیں مل سکتی۔

ستمبر ۱۹۹۲ کی ۲۳ تاریخ ہے۔ میں وگن میں اپنی قیام گاہ کے اوپر کے کمرہ میں بیٹھا ہوں۔ یہ مکان ایک شاہراہ کے کنارے واقع ہے۔ سڑک پر دونوں طرف گاڑیوں کا لامتناہی سیلاب بہہ رہا ہے سامنے تکونی چھتوں (۸) کے مکانات کی قطاریں دکھائی دیتی ہیں۔ ایک طرف پارک ہے جس میں دور تک درختوں کا منظر پھیلا ہوا ہے۔ اپنی کھڑکی سے ان مناظر کو دیکھتے ہوئے میں سوچ رہا ہوں کہ یہی وہ قوم ہے جو کبھی برطانیہ عظمی کہی جاتی تھی۔ اس نے دنیا کے اتنے بڑے حصہ میں اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا کہ کہا جانے لگا کہ اس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا۔

میں سوچنے لگا کہ آخر اس قوم کی وہ کون سی صفت تھی جس نے اس کو اتنے وسیع رقبہ میں اتنی بڑی سلطنت قائم کرنے کے قابل بنایا۔ اتنے میں سڑک پر ایک معمر خاتون ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے جسم پر سبز رنگ کا کپڑا ہے۔ اپنے ہاتھ میں وہ لاٹھی جیسی ایک لمبی لکڑی لئے ہوئے ہے۔ اس لکڑی کے سرے پر ایک گول تختہ جڑا ہے۔ اس تختہ پر جلی حرفوں میں نیچے اوپر لکھا ہوا ہے:

یہ معمر خاتون اس نشان کو لے کر سڑک کے درمیان کھڑی ہو جاتی ہے۔ سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے اسکول کے بچے جو سب کے سب سفید فام ہیں، تیزی سے سڑک کو پار کرتے ہیں۔ خاتون اپنا یہ کام سڑک کی دونوں سائڈ میں کرتی ہے اور پھر تیزی سے اپنی لکڑی کا رخ الٹا کرکے دوبارہ سڑک کے کنارے کھڑی ہو جاتی ہے تاکہ مزید آنے والے بچوں کی مدد کر سکے۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہاں سڑکوں پر جگہ جگہ یہ انتظام کیا گیا ہے۔ کم آمدنی والی معمر خواتین معمولی معاوضہ پر یہ کام کرتی ہیں۔ ان کے جسم کا سبزی مائل کپڑا ان کی اس حیثیت کی علامت ہوتا ہے۔ صبح کے وقت جب بچے اسکول جاتے ہیں اور دوپہر بعد جب وہ لوٹتے ہیں، دونوں وقت یہ خواتین سڑک پر آکر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ان کے نشان کو دیکھ کر تمام سواریاں فوراً رک جاتی ہیں۔ ایسی خاتون کو اسکول کراسنگ گارڈ کہا جاتا ہے۔

مذکورہ خاتون کو اپنے کام کی ادائگی میں بیک وقت دو پہلوؤں کا لحاظ کرنا تھا۔ ایک طرف گاڑیوں کا اور دوسری طرف بچوں کا۔ بوڑھی خاتون نے اس کام کو اتنی پھرتی، اتنی باقاعدگی اور اتنے منظم انداز میں کیا کہ میں اس کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے سوچا کہ انگریزوں کی عالمی کامیابی کا راز یہ تھا کہ انھوں نے اپنی پوری قوم، حتی کہ عام مردوں اور عورتوں تک کے اندر ڈسپلن کی صلاحیت کمال درجہ میں پیدا کر دی۔

دوسری عالمی جنگ (۴۵ - ۱۹۳۹) کے دوران سرونسٹن چرچل برطانیہ کے وزیر اعظم تھے۔ وہ عام طور پر شدت پسند لیڈر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ مگر ان کی زندگی میں بہت سی قابل قدر مثالیں ملتی ہیں۔ ایک بوڑھے برطانی شخص نے مجھے بتایا کہ چرچل نے دوسری عالمی جنگ کے زمانہ میں برطانی قوم کو جو ماٹو دیا وہ یہ تھا ـــــ سب کچھ میرے اوپر منحصر ہے :

It all depends on me.

یہ بلاشبہ ایک بہترین ماٹو ہے۔ یہ جنگ اور امن دونوں حالتوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ میرے بھائی عبد المحیط خاں انجینیر نے بتایا کہ ایک بار وہ چنڈی گڑھ کے ایک ٹریننگ کیمپ میں شریک ہوئے۔ یہ کیمپ پالی ٹکنیک کے پرنسپلوں کی ٹریننگ کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اور ایک انگریز پروفیسر کو اس میں لکچر دینے کے لئے بلایا گیا تھا۔ اس کا افتتاح ایک ہندستانی منسٹر کو کرنا تھا۔

منسٹر صاحب جب مائک پر آئے تو اچانک بجلی چلی گئی اور لاؤڈ اسپیکر نے کام کرنا بند کر دیا۔ جلسہ گاہ میں متبادل انتظام کے طور پر بیٹری رکھی نہیں گئی تھی۔ البتہ کالج کے قریبی ورک شاپ میں بیٹری موجود تھی۔

جب یہ حادثہ ہوا تو زیر تربیت پرنسپل صاحبان کالج کے کسی چپراسی یا کسی ورکر کو تلاش کرنے لگے تاکہ اس کو بھیج کر ورکشاپ سے بیٹری منگوا سکیں۔ لیکن انگریز پروفیسر کو جیسے ہی صورتحال کا علم ہوا وہ خود بھاگ کر ورکشاپ پہنچا۔ بھاری بیٹری کو دونوں ہاتھوں سے اٹھاکر وہ دوڑتا ہوا آیا۔ اور لاؤڈ اسپیکر کے نظام سے جوڑ کر اس کو چند منٹ میں چلادیا۔

کسی قوم کے افراد کا یہی مزاج اس قوم کی اجتماعی ترقی کا سب سے بڑا راز ہے۔ افراد کے اندر یہ اسپرٹ جتنی زیادہ پائی جائے گی، اتنی ہی زیادہ وہ قوم ترقی کرے گی۔

میری قیام گاہ کے قریب ایک اسکول (Hawkley Hall High School) تھا۔ میں روزانہ صبح اور شام یہاں ٹہلنے جایا کرتا تھا۔ ۲۳ ستمبر کو موسم بہت خوشگوار تھا۔ میں ایک عرب نوجوان کے ساتھ اسکول کے سامنے کھلی جگہ پر ٹہل رہا تھا۔ اچانک پولیس کی کار آکر وہاں کھڑی ہوئی۔ اس میں سے پولیس کا ایک آدمی نکلا۔ وہ تیزی سے ہمارے پاس آیا اور انگلش لہجہ میں کہا: براہ کرم معاف کیجئے، اسکول کے لوگوں نے یہ شکایت کی ہے کہ دو داڑھی والے آدمی یہاں روزانہ آتے ہیں۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ لوگوں کا مقصد کیا ہے۔ میرے ساتھی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارے مہمان ہیں۔ ان کو ٹہلنے کی عادت ہے۔ چنانچہ ہم لوگ یہاں ٹہلنے کے لئے آجاتے ہیں۔ اس نے پوچھا کہ آپ لوگ کہاں رہتے ہیں۔ بتایا گیا کہ اسی ایریا کے مکان نمبر ۴ ۵۹ میں۔ اس کے بعد اس نے مسکراتے ہوئے کہا:

Oh, it is alright. I am sorry.

ہم سے بات کرنے کے بعد وہ اسکول کی عمارت میں داخل ہوا۔ وہاں اسکول کے ذمہ داروں سے بات کی۔ چند منٹ کے بعد وہ باہر نکلا اور اپنی کار میں بیٹھ کر واپس جانے لگا تو اتفاق سے اس کی کار ہمارے پاس سے گزری۔ شیشہ کے اندر سے اس نے ہماری طرف دیکھا اور ہاتھ ہلاکر دوبارہ اپنے اطمینان اور معذرت کا اظہار کیا۔

اس قسم کی ہزاروں مختلف باتیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ یہاں کی حکومت عدل اور انسانیت کی حکومت ہے۔ مگر شاید ہی کوئی مسلمان اس کا اعتراف کرتا ہوا ملے گا۔ مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ برطانیہ رشدی کو سزا کیوں نہیں دیتا۔ وہ بوسنیا کے معاملہ میں مداخلت کیوں نہیں کرتا۔ وغیرہ۔ بعض ذاتی شکایت کی بنا پر وہ نظام کی خوبیوں کا انکار کر رہے ہیں۔ یہ ابولولو فیروز کی سنت ہے نہ کہ صحابہ کی سنت۔ صحابہ جب ہجرت کر کے حبش گئے تو انھوں نے وہاں کے مسیحی بادشاہ کے عدل کا اعتراف کیا اور اس کے لئے دعائیں کیں۔ جب کہ ابولولو مجوسی کا یہ حال ہوا کہ وہ عمر فاروق کے بے مثال عادلانہ نظام کو دیکھنے کے لئے اندھا ہو گیا۔ اس کو صرف اپنی ذاتی شکایت نظر آئی، اور وہ بھی انتہائی مبالغہ آمیز انداز میں کہ اس نے عمر فاروق جیسے عادل حکمراں کو قتل کر دیا۔

ایک عرب نوجوان نے بتایا کہ جون ۱۹۹۲ میں وہ مانچسٹر میں تھے۔ اس وقت مانچسٹر کی جامع مسجد میں نومسلم انگریز یوسف اسلام کی تقریر ہوئی۔ وہ بوسنیا کا دورہ کر کے ابھی واپس آئے تھے۔ انھوں نے اپنی انگریزی تقریر میں جو کچھ کہا اس کا خلاصہ عرب نوجوان کے الفاظ میں یہ تھا:

إنّ الشئ الذی جعل المسلمین مستضعفین هو ذهاب الخلافة. فان كانت الخلافة قائمة لما استطاع احد ان يفعل بهم هذا. لان الخلافة الاسلامية ستكون لها ايدٍ تمتد لتحمیَ المسلمین فی كل مكان. فلابد من اقامة الخلافة فهي الحل لكل ما حل بالمسلمین من ضعف وهوان. والا ستكون النتيجة هي اليوم بوزنيا وغداً بريطانيا

میں نے کہا کہ ہمارا اصل مسئلہ ذہاب خلافت نہیں بلکہ ذہاب عصر ہے۔ ترکوں نے خلافت کو "تلوار" کے زور پر قائم کیا تھا۔ جب تک تلوار کا دور رہا، خلافت بھی باقی رہی۔ جب تلوار کا دور ختم ہو گیا تو ترکوں کی خلافت بھی ختم ہو گئی۔ اب علم کی طاقت کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے بے زور ہو جانے کا سبب یہ ہے کہ ان کے پاس وقت کا زور (علم) موجود نہیں۔ ایسی حالت میں اصل مسئلہ علم کی طاقت حاصل کرنے کا ہے نہ کہ بے فائدہ طور پر مفروضہ دشمنوں کے خلاف ایسی جنگ چھیڑنے کا جس کا نتیجہ خود اپنی مزید بربادی کے سوا کسی اور شکل میں نکلنے والا نہیں۔

یوسف اسلام نے جو بات کہی وہ ان کی اپنی بات نہیں۔ یہ دراصل ان مسلمانوں کی بات ہے

جن کے درمیان وہ قبول اسلام کے بعد اپنے کو پا رہے ہیں۔ ہر چیز کہ درکان نمک رفت نمک شد
عبدالعزیز حدو (۲۴ سال) المغرب (الدار البیضاء) کے رہنے والے ہیں۔ اس وقت وہ لندن میں کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ وہ ۱۲ ستمبر کو ایک انگریز نومسلم کو لے کر میری رہائش گاہ پر آئے۔ اس سفید فام انگریز نوجوان کی عمر ۲۱ سال تھی۔ انھوں نے جولائی ۱۹۹۲ میں اسلام قبول کیا ہے۔ ان کا اسلامی نام عبدالکریم ہے۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے:

Christian James Stone
27 Horsford Rd. Brixton SW2 5BW, London.

میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے کیوں اسلام قبول کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اسلام اس لئے قبول کیا کیوں کہ اسلام معیاری اور عقلی فہم عطا کرتا ہے۔ بچپن میں اور بڑا ہونے کے بعد میں اکثر تنہا سوچتا رہتا تھا۔ جب مجھے اسلام کا علم ہوا تو اس نے میری سوچ کی تکمیل کر دی:

I embraced Islam because Islam makes perfect, rational sense. As a child and adolescent I spent much time alone, just thinking. When Islam was explained to me, it complemented to what I thought.

میں نے کہا کہ مسیحیت کا عقیدہ (مثلاً ٹرینیٹی) عقلی طور پر ناقابل فہم ہے۔ وہ اس بدیہی حقیقت کے خلاف ہے کہ جو چیز تین ہو وہ ایک نہیں ہو سکتی، جو چیز ایک ہو وہ تین نہیں ہو سکتی۔ اس لئے مسیحی حضرات میں جو لوگ زیادہ سنجیدہ ہوں وہ سخت ذہنی تضاد میں مبتلا رہتے ہیں۔ کیوں کہ اگر وہ عقل کو لیں تو مذہب چھوٹتا ہے، اور اگر مذہب کو لیں تو عقل ساتھ نہیں دیتی۔ انھوں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں مسیحی باقی رہتا تو میرا خیال ہے کہ میں یا تو پاگل ہو جاتا یا منافق بن جاتا تاکہ مسیحی معاشرہ میں رہ سکوں:

If I was Christian I imagine that I must either be mad or hypocrite to exist in society.

ان سے دیر تک گفتگو ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد ایک روز وہ اپنے والد کے یہاں گئے۔ کھانے پر گوشت تھا۔ انھوں نے گوشت نہیں لیا۔ والد نے اصرار کیا تو اپنے اسلام کو چھپانے کے لئے کہہ دیا کہ میں ویجیٹرین ہوں۔ مگر والد گوشت کے لئے اصرار کرتے رہے تو انھوں نے

بتایا کہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ یہ سن کر والد نے کہا کہ میں جانتا تھا کہ تم ضرور ایسا کروگے :

I knew you would do.

میں نے اس واقعہ کو سنا تو میں نے کہا کہ بیٹے کے حق میں انگریز باپ کا یہ جملہ علامتی طور پر پوری انسانیت، کے حق میں ایک پیشگی بیان ہے۔ گویا کہ مغرب کی پچھلی نسل اپنی اگلی نسل سے کہہ رہی ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ ایک روز آئے گا جب کہ تم لوگ اسلام کے دائرہ میں داخل ہوجاؤ گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی دعوت کو اگر اس کے واقعی تقاضوں کے ساتھ انجام دیا جائے تو تمام باپوں کو اپنے بیٹوں سے وہی کہنا پڑے گا جو مذکورہ برطانی باپ نے اپنے بیٹے سے کہا تھا۔

لندن میں راجر ڈیوڈ اسٹون (Roger David Stone) سے ملاقات ہوئی۔ ان کا موضوع فلسفہ ہے۔ وہ کالج میں استاد تھے۔ اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے مذاہب کے مطالعہ سے دلچسپی ہوئی۔ اس سلسلہ میں میں نے اسلام کو سمجھنے کے لئے بعض صوفیاء سے ملاقات کی۔ انھوں نے مجھ کو بتایا کہ اللہ ازلی ہے، محمد ازلی ہے، قرآن ازلی ہے۔ اس کے بعد میرا خیال یہ ہوگیا کہ اسلام بھی ایک قسم کی تثلیث (Trinity) ہے، جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے۔

مسلمانوں میں مجھے کسی ایسے سلسلۂ صوفیاء کا علم نہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ عیسائیوں میں سے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ اسلام کو ایک قسم کے تثلیثی مذہب کے روپ میں پیش کرنے لگے۔ مسٹر راجر ڈیوڈ اسٹون مذکورہ صوفیاء کا پتہ نہ بتا سکے۔ اس لئے ممکن نہیں کہ میں ان سے ربط قائم کرسکوں۔

ایک مسلمان سے میں نے ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ یہ مسیحیوں کی سازش ہے۔ وہ اسلام اور مسیحیت کو ایک ثابت کرنے کے لئے ایسا کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ خواہ وہ سازش ہو یا غیر شعوری طور پر ہو، دونوں حالتوں میں اس کا حل یہ ہے کہ اسلام پر صحیح لٹریچر زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے۔ اسلام کو اتنا زیادہ معروف بنا دیا جائے کہ کوئی اس کی تصویر بگاڑنا چاہے تب بھی وہ اس کی تصویر بگاڑنے پر قادر نہ ہو۔

ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ جس طرح ہندستان میں صوفیاء کا طبقہ ویدانت سے متاثر ہوکر وحدت الوجود کا قائل ہوگیا۔ اسی طرح مسیحی دنیا میں کچھ لوگ مسیحی تثلیث سے متاثر ہوکر مذکورہ قسم کی باتیں

کرنے لگے ہیں۔ اس کو قرآن میں مضاہاۃ (التوبہ ۳۰) کہا گیا ہے۔ میرے نزدیک مضاہاۃ کا اس سے بھی زیادہ بڑا واقعہ وہ ہے جو سیاسی مضاہاۃ کی صورت میں پیدا ہوا ہے۔ موجودہ زمانہ میں سیاسی فلسفوں کا غلبہ ہوا۔ اس سے متاثر ہو کر کچھ لوگوں نے اسلام کی سیاسی تعبیر کر ڈالی۔ چوں کہ یہ زمانہ کے مزاج کے مطابق تھی۔ اس لئے وہ بہت جلد لوگوں میں پھیل گئی۔ اگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو مضاہاۃ کی تمام قسموں میں سب سے زیادہ نقصان دہ یہی سیاسی مضاہاۃ ہے۔

ایک عرب نوجوان نے اپنے کچھ قصے بتاتے ہوئے کہا کہ ایک بار میں اپنے بھائی کے ساتھ تھا۔ ہم لوگ انگور خریدنے کے لئے دکان پر گئے۔ میں نے بھائی کی مخالفت کے باوجود سستا انگور خریدا۔ گھر پہنچ کر جب اس کو کھول کر کھانے کی میز پر رکھا تو معلوم ہوا کہ اس میں بہت سے انگور خراب ہیں جو کھانے کے لائق نہیں۔ چنانچہ میں نے اس کا ایک حصہ کھایا اور دوسرا حصہ پھینک دیا۔ بھائی نے کہا کہ یہی مطلب ہے اس عربی مثل کا کہ الذی یعجبك رُخصه ستر می نصفه (جس چیز کا سستا ہونا تم کو پسند آتا ہے اس کا نصف حصہ تم کو پھینکنا پڑے گا)

ایک اخوانی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ ان کو معلوم تھا کہ میں مسلم حکومت کے خلاف خروج کو صحیح نہیں سمجھتا۔ انھوں نے کہا کہ آپ کیسے ایسا کہتے ہیں جب کہ امام احمد بن حنبل نے اپنے وقت کی حکومت سے ٹکراؤ کیا۔ ہم لوگ امام احمد کے اسی مسلک پر ہیں۔

میں نے کہا کہ انھوں نے ٹکراؤ نہیں کیا بلکہ ایک غیر سیاسی معاملہ میں ٹکراؤ پیش آیا۔ پھر میں نے فقہ کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ علماء اصول کا اتفاق ہے کہ جب ایک صورتحال کو دوسری صورت حال پر منطبق کیا جائے تو دونوں کے درمیان علۃ مشترکۃ کا پایا جانا ضروری ہے۔ اس فقہی اصول کی روشنی میں دیکھئے تو آپ کے اور امام احمد کے درمیان علت مشترک موجود نہیں۔ آپ موجودہ حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لئے ان کے خلاف مہم چلا رہے ہیں۔ جب کہ امام احمد نے نہ تو ایسا کیا اور نہ ہی ایسا کہا۔ انھوں نے کسی بھی سیاسی ٹکراؤ کے بغیر ایک غیر سیاسی مسئلہ (خلق قرآن) کے بارہ میں اپنی رائے دی تھی اور حکومت غلط فہمی کی بنا پر ان کو سزا دینے پر تل گئی۔ اس لئے آپ کے عمل اور امام احمد کے عمل کے درمیان علت مشترک موجود نہیں۔ اور جب علت مشترک موجود نہیں تو ان کا عمل آپ کے لئے دلیل بھی نہیں بن سکتا۔

اس معاملہ میں امام احمد کا مسلک حقیقۃً وہ ہے جو ابن رجب حنبلی نے اپنی کتاب جامع العلوم والحکم (صفحہ ۲۸۲) میں نقل کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سلطان کا سامنا مت کرو، کیوں کہ اس کی تلوار کھنچی ہوئی ہے (لا یتعرض الی السلطان فان سیفہ مسلول)۔ یہی امام احمد کا اصل مسلک ہے اور یہی تمام دوسرے محدثین کا مسلک بھی۔

وگن کے زمانہ قیام میں کچھ لوگ ایک انگریز نومسلم کو میرے پاس لے آئے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور اس کی عمر تقریباً ۲۵ سال تھی۔ اس کو میں نے دیکھا تو وہ مجھے مجذوبانہ انداز میں دکھائی دیا۔ میرا ابتدائی تاثر یہ تھا کہ وہ معتدل (sound mind) آدمی نہیں ہے۔ مگر بات کی تو وہ نہایت ذہین معلوم ہوا۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ وہ لندن سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے اپنے ذاتی مطالعہ سے اسلام قبول کیا تھا۔ اس کے بعد جب وہ لندن کے مسلمانوں سے قریب ہوا تو وہ سخت ذہنی خلجان میں مبتلا ہوگیا۔ وہ جس مسجد میں جاتا ہر مسجد والے کہتے کہ تمہاری نماز غلط ہے۔ تم اس طرح نہیں اُس طرح نماز پڑھو کوئی کہتا کہ کوٹ پتلون اتار کر تم کو اسلامی لباس پہننا چاہئے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد تم کو اپنی ظالم قوم سے متنفر ہوجانا چاہئے تھا اور تم اب تک اپنے دل میں انگریز قوم کی محبت لئے ہوئے ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ نظری اسلام سے وہ متاثر ہوا تھا مگر "عملی اسلام" کے بارہ میں وہ سخت توحش میں پڑگیا۔ چوں کہ وہ بے حد سنجیدہ تھا، اس تجربہ نے اس کو نیم پاگل بنا دیا۔ معلوم ہوا کہ اس طرح کے بہت سے نومسلم ہیں۔ حتی کہ یہ یہاں کا ایک مستقل مسئلہ بن گیا ہے۔

وگن میں ۲۲ ستمبر کو میں ایک عرب نوجوان کے ساتھ ٹہلنے کے لئے نکلا۔ ہم لوگ ایک مقام پر پہنچے وہاں سڑک کے دوسری طرف ایک اسکول تھا۔ سفید فام بچے اسکول کے سامنے کھلے میدان میں جمع تھے۔ میں وہاں میدان کے کنارے کھڑا ہوگیا۔ بچوں نے مجھ کو دیکھا تو ہاتھ ہلا ہلا کر بائی بائی کرنے لگے۔ پھر وہ دوڑ کر میرے قریب آئے۔ وہ کچھ کہہ رہے تھے۔ مگر میں اچھی طرح ان کی بات کو نہ سمجھ سکا۔ البتہ ایک بچہ جو مجھ سے کافی قریب آگیا تھا، اس نے بلند آواز میں کہا (Are you Father Christmas) میرے ساتھی نے مزید سوال کیا تو اس نے کہا (He looks like Father Christmas) اس اثناء میں ایک اور بچہ قریب آگیا۔ اس نے کہا:

Father Christmas, get me a computer

غالب گمان یہی ہے کہ بچوں نے یہ بات تفریح کے طور پر کہی۔ تاہم اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسیحی بچوں کی نفسیات کیا ہوتی ہے۔ میرا حلیہ انھیں عجیب نظر آیا۔ اس لئے انھوں نے مجھ کو فادر کرسمس سے تشبیہہ دی۔

ایک عرب نوجوان سے محمد قطب کی کتاب رؤیۃ اسلامیۃ لاحوال العالم المعاصر کے بارہ میں گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ آجکل عالم عربی میں جو کتابیں چھپ رہی ہیں وہ زیادہ تر ایسی ہیں جو تفکیر کو بگاڑنے والی ہیں۔ انھیں میں سے یہ کتاب بھی ہے۔ ان کو میرے اس بیان پر تعجب ہوا۔ میں نے مذکورہ کتاب (دار الوطن للنشر، الریاض) کا صفحہ ۱۸۶ دکھایا جس کا عنوان ہے: ماذا اخسر العالم بانحطاط المسلمین

میں نے کہا کہ پہلی بات یہ کہ یہ عنوان ہی صحیح نہیں۔ صحیح عنوان یہ ہونا چاہئے کہ ماذا اخسر المسلمون بانحطاطھم۔ بوقت انحطاط آدمی کی توجہ اپنے خسران کی طرف ہونی چاہئے تاکہ احتساب خویش کی نفسیات پیدا ہو نہ کہ دوسروں کے خسران پر جو بے بنیاد طور پر فخر کی نفسیات پیدا کرنے والا ہے۔

میں نے کہا کہ مصنف لکھتے ہیں کہ ان اللہ جعل مقادیر البشریہ کلہا مرتبطۃ باحوال ھٰذہ الامۃ، ان خیر أفخیر و ان شراً فشر (صفحہ ۱۸۶) میں نے کہا کہ قرآن وحدیث میں یہ بات کہاں ہے۔ اس کے برعکس قرآن میں ہے کہ و ان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم (محمد ۳۸) قرآن میں واضح طور پر یستبدل قوما غیرکم موجود ہے۔ مگر قرآن میں کہیں یہ نہیں فرمایا کہ نستبدل قرآنا غیر ھٰذا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن اور امت میں فرق ہے۔ جو چیز مستمر ہے وہ قرآن ہے نہ کہ امت۔ قرآن کی آیت فخلف من بعدھم خلف (مریم ۵۹) کے مطابق، ہم اخلاف الامہ ہیں نہ کہ الامہ۔

میں نے کہا کہ مقادیر بشریہ کو اللہ تعالیٰ نے اسلام سے مرتبط کیا ہے نہ کہ مسلمانوں سے۔ یہ عین وہی غلطی ہے جس میں یہود مبتلا ہوئے اور بالآخر انھوں نے خدائی دین کو نسلی دین بنا دیا۔ اب مختلف الفاظ میں یہی عقیدہ مسلمانوں میں پھیلایا جا رہا ہے۔

عرب نوجوانوں میں قابل لحاظ تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہوگئی ہے جو الرسالہ مشن سے پوری طرح واقف ہے اور اس سے مکمل اتفاق رکھتی ہے۔ اس سفر میں اس قسم کے کئی تجربے پیش آئے۔

اس کا اندازہ اس مثال سے ہوسکتا ہے۔ سفر کے دوران میری ملاقات ایک عرب نوجوان سے ہوئی۔ انھوں نے اپنا ایک واقعہ بتایا۔ یہ واقعہ ان کے الفاظ میں حسب ذیل تھا:

قال لی بعض الشباب یوما۔ انظر الی الذی یُفعل بالمسلمین فی انحاء العالم من بوزنیا الی کشمیر، الی کل مکان۔ فھولاء یریدون أن یقضوا علی الاسلام فلابد أن نقف لمواجھۃ الخطر بکل قوۃ (اراد القتال العسکری)، فقلت لہ ان الامر الذی یُحیّرنی ولم اجد لہ تفسیر، ھولماذا اصبح مسلموا لعصر الحدیث یعرفون کل شئ ماعدا الصبر۔ فلا یوجد شخص واحد فی العالم الاسلامی ینادی بالصبر رغم ان الصبر مذکور فی القرآن اکثر من القتال۔ فقال ھذا یعتمد علی الذی تقصدہ بالصبر۔ فقلت الصبر لا یعنی اللاعمل بل العمل مع التخطیط۔ فسکت۔

یہ ایک نئی سوچ ہے جو عالم اسلامی میں الرسالہ مشن کے ذریعہ پیدا ہوئی ہے اور دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ میں نے دیکھا کہ کئی عرب نوجوانوں نے اپنی پوری زندگی اس مشن کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ اس سلسلہ میں مزید تفصیلات بیان کرنے کی گنجائش سفر نامہ میں نہیں۔

ایک صاحب نے بتایا کہ حال ہی میں انھوں نے انگریز نومسلم یوسف اسلام کی تقریر سنی۔ وہ پوری کی پوری احتجاجی انداز کی تھی۔ انھوں نے اپنی پوری تقریر میں اعداء اسلام کی سازشوں اور مظالم کا ذکر کیا۔ مجھے یہ بات عجیب معلوم ہوئی۔ کیوں کہ یوسف اسلام نے جب اسلام قبول کیا تو ابتدائی زمانہ میں ان کا یہ انداز نہ تھا۔ ان کی ابتدائی زمانہ کی ایک تقریر الرسالہ میں شائع ہوچکی ہے۔ اس میں واضح طور پر انھوں نے یہ اقرار کیا ہے کہ اسلام کے روحانی پہلو نے ان کو متاثر کیا اور اس طرح وہ اسلام میں داخل ہوئے۔

اس معاملہ کی تحقیق کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی صحبت کے نتیجہ میں ان کے اندر یہ تبدیلی آئی ہے۔ مغربی دنیا میں کثیر تعداد میں مسلمان آباد ہیں۔ مگر حقیقی معنوں میں کوئی دعوتی کام وہ نہیں کر رہے ہیں۔ البتہ خود اپنی فطرت کے زور پر یا ذاتی مطالعہ سے مغرب میں اکثر لوگ اسلام قبول کرتے رہتے ہیں۔ یہ نومسلم جب اپنی سابقہ سوسائٹی سے کٹتے ہیں تو وہ اپنے لئے نئی سوسائٹی چاہتے ہیں۔ اس کمی کی تلافی کے لئے قدرتی طور پر وہ مغرب میں مقیم مسلمانوں سے قریب ہوتے ہیں۔ یہ مسلمان زیادہ تر

احتجاجی نفسیات میں جی رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دھیرے دھیرے ان نومسلموں کا مزاج بھی احتجاجی مزاج بن جاتا ہے۔

آج مسلمانوں کو دوسری قوموں کی طرف سے جن "زیادتیوں" کا تجربہ ہو رہا ہے وہ دراصل خدا کی تنبیہات ہیں۔ مگر مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے طبقہ نے ان زیادتیوں کو خود ان قوموں کی سازش اور ان کے ظلم کے خانہ میں ڈال دیا۔ اس کے نتیجہ میں بہت بڑی مزاجی خرابی واقع ہو گئی۔ مسلمان اگر ان زیادتیوں کو تنبیہات الٰہی سمجھتے تو ان کے اندر اصلاح خویش کا جذبہ ابھرتا۔ مگر جب انھوں نے ان زیادتیوں کو اقوام غیر کی سازشوں کا نتیجہ قرار دیا تو ان کے اندر برعکس طور پر احتجاج غیر کے جذبات ابھر آئے۔ اس غلطی نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے سارے معاملہ کو بگاڑ دیا۔

وگن کے زمانہ قیام میں میں جس مکان میں ٹھہرا تھا، اس کے سامنے سڑک کے کنارے زیر زمیں پانی کی پائپ میں کچھ خرابی آگئی۔ ۱۲ ستمبر کی صبح کو میں نے دیکھا کہ ایک بڑی سی بند گاڑی وہاں آکر کھڑی ہوئی۔ اس میں ہر قسم کا ضروری سامان موجود تھا۔ گاڑی میں سے ایک سفید فام تندرست آدمی نکلا۔ اس کے ہاتھ میں مخصوص قسم کا پھاوڑا تھا۔ وہ فوراً اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ مسلسل کام کرکے اس نے زمین کھودی۔ پائپ کو درست کیا۔ اس کے بعد پتھر کے ٹکڑوں اور تارکول سے خالی جگہ کو بھر کر پھر اس کو پختہ کیا اور چلا گیا۔

دہلی میں میں نے کئی بار دیکھا ہے کہ اس طرح کے ایک کام کے لئے بیک وقت کئی آدمی آئیں گے۔ وہ گھنٹوں وہاں ٹھہرنے کے بعد کام کو ادھورا چھوڑ دیں گے۔ اور اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہوگی کہ دوبارہ وہ کب آئیں گے اور کب اپنے چھوڑے ہوئے کام کو مکمل کریں گے۔

برطانیہ کے زمانہ قیام میں کبھی مکھی، مچھر وغیرہ دکھائی نہیں دیا۔ نہ حالت سفر میں اور نہ حالت قیام میں۔ میں اس کے بارہ میں کسی سے پوچھ نہ سکا۔ تاہم عملی تجربہ کے مطابق، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باقاعدہ مہم کے تحت اس کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کی نگرانی بھی کی جارہی ہے۔ کیوں کہ مسلسل نگرانی کے بغیر خاتمہ کی صورت حال کو باقی نہیں رکھا جا سکتا۔

انگریزی کا ایک مشہور مقولہ ہے جو انگریز قوم کے مزاج کو بتاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے، سست عمل مگر تیقن کے ساتھ (slow but sure) محمد قطب نے اپنی کتاب رویۃ اسلامیۃ

لاحوال العالم المعاصر میں اس کو مغرب کی شیطانی سیاست کے ایک اصول کے طور پر ذکر کیا ہے۔ اور اس کا ترجمہ التدرج البطیٔ الاکید المفعول (صفحہ ۴۹) کیا ہے۔ مگر میرے خیال سے اس کا اس کا صحیح مفہوم ان الفاظ میں ادا ہوتا ہے: بطیٔ وانما مؤکد یا بطیٔ ولکن مؤکد۔

انگریز صدیوں سے اسی اصول پر عمل کر رہے ہیں۔ اور ان کی کامیابی کا کم از کم ایک راز یہ بھی ہے اس مقولہ کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی تم کوئی اقدام کرو تو خواہ تمہارے سفر کی رفتار کتنا ہی سست ہو، مگر اس بات کا پورا اہتمام کرو کہ ہر قدم یقینی طور پر نتیجہ خیز ہو۔ غور کیجئے تو موجودہ مسلمانوں کا ذہن اس کے بالکل خلاف ہے۔ ان کا اصول برعکس طور پر یہ ہے کہ تیزی کے ساتھ بڑے بڑے اقدام کرو، خواہ عملی طور پر اس کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہ ہو۔

مذکورہ مثل کوئی غیر اسلامی مثل نہیں۔ یہ فطرت کی زبان میں عین وہی بات ہے جو قرآن میں ان الفاظ میں آئی ہے: فاصبر ... ولا تستعجل لھم (الاحقاف ۳۵) عجلت سے بچتے ہوئے صابرانہ عمل کرنا یہ ہے کہ آدمی جذباتی انداز میں دوڑ پڑنے کے بجائے سوچ سمجھ کر عمل کرے۔ اور ایک ایک قدم پختہ کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں ہر قسم کی سرگرمیاں ہیں مگر ان کے یہاں صبر اور عدم استعجال موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر اقدام الٹا پڑتا ہے۔ قربانیوں کے پہاڑ کھڑے کرنے کے باوجود موجودہ زمانہ میں وہ کوئی حقیقی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

۲۴ ستمبر کو وگن میں ایک صاحب نے بتایا کہ ان کی ملاقات ایک نومسلم انگریز سے ہوئی۔ اس وقت ان کے پاس اسلام ایز اٹ از (Islam as it is) کا ایک نسخہ موجود تھا۔ انھوں نے اس کتاب سے آخرت کا باب نومسلم انگریز کو پڑھایا۔ پڑھنے کے بعد اس نے اپنا تاثر ایک کاغذ پر لکھ دیا۔ یہ تاثر اس کے اپنے الفاظ میں یہ تھا:

> This is very good. This is based on reason. I haven't read any other book free of any sentimental emotional plea to belief in the hereafter.

ایک مغربی نومسلم سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے گاڈ ارائزز (God Arises) کا مطالعہ کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ جب میں نے اس کتاب کو پڑھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے کہ یہ وہی کتاب

ہے جس کا میں انتظار کر رہا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے کئی تعلیم یافتہ مسلمانوں سے پوچھا کہ کیا اسلامی لٹریچر کے ذخیرہ میں گاڈ ارائزز جیسی اور کتابیں پائی جاتی ہیں جو اسلام کی تعلیمات کو علمی اور عقلی دلیل کے ساتھ بیان کرتی ہوں۔ مگر کوئی شخص مجھے اس قسم کی کسی اور کتاب کا سراغ نہ دے سکا۔

انھوں نے کہا کہ مجھے حیرت ہے کہ قرآن تو سراپا عقلی کتاب ہے۔ وہ عقل کو مخاطب کرکے اپنا پیغام دیتا ہے۔ مگر آجکل کے مسلمانوں کے ذہن سے یہ پہلو مخفی ہوگیا۔ وہ عقلی دلیل اور عقل کو مطمئن کرنے والے اسلوب میں دین کے داعی نہ بن سکے۔ ورنہ ایسی بہت سی کتابیں اسلامی کتبخانہ میں موجود ہوتیں۔ آج کا انسان عقلی اطمینان کے بعد کسی عقیدہ کو اختیار کرتا ہے اور ہمارے پاس عقل کو مطمئن کرنے والی کتابیں نہیں۔ اس کے بعد انھوں نے عجیب انداز میں کہا کہ جب میں نماز پڑھتا ہوں اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہوں تو اکثر میری زبان سے اس قسم کے الفاظ نکلتے ہیں:

Oh, Allah, help us to do intellectual jihad. And bring the rational unbelievers to the fold of Islam.

۲۴ ستمبر کی شام کو وگن سے واپسی ہوئی۔ یہاں سے بذریعہ ٹرین مجھے برمنگھم پہنچنا تھا۔ دو عرب نوجوان جو ریلوے اسٹیشن تک مجھے پہنچانے آئے تھے۔ وہ میرے ساتھ ڈبہ میں داخل ہوگئے۔ وہ اترنا چاہتے تھے کہ ڈبہ کا دروازہ بند ہوگیا۔ یہاں ٹرین کے دروازہ کو ڈرائیور کھولتا ہے اور وہی بند کرتا ہے۔ ان لوگوں کے پاس ٹکٹ نہیں تھا۔ ہندستانی تجربہ کے تحت مجھے تشویش ہوئی۔ مگر ٹکٹ چیکر آیا تو اس نے پوچھ گچھ کی نہ جرمانہ لگایا۔ سادہ طور پر اس نے کرایہ لے کر وہی ٹکٹ دے دیا۔ جو اسٹیشن پر انھیں ملتا۔ اور پھر تھینک یو کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

ٹرین نہایت صاف ستھری تھی۔ سیٹ سے لے کر ٹائیلٹ تک ہر چیز بالکل ہوائی جہاز کے انداز کی نظر آئی۔ میں نے کہا کہ یہ ٹرین تو گویا زمین پر دوڑتا ہوا ہوائی جہاز ہے۔ ڈبہ میں جگہ جگہ نو اسموکنگ کا اعلان لگا ہوا تھا جس کے اوپر لکھا ہوا تھا کہ اس کی خلاف ورزی پر پچاس پونڈ جرمانہ ہے۔ یعنی ہندستانی روپیہ میں تقریباً ڈھائی ہزار روپیہ۔ ایک طرف ایک خوبصورت کیس میں ایک خوبصورت ہتھوڑا رکھا ہوا تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا کہ ایمرجنسی کی حالت میں کھڑکی کے شیشہ کو توڑنے کے لئے اس ہتھوڑے کو استعمال کیجئے:

In emergency use hammer to break window.

ڈبہ کے دونوں طرف بہت بڑے شیشے لگے ہوئے تھے جس سے باہر کا منظر بالکل صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ پورے راستہ میں دونوں طرف دور تک پھیلا ہوا سبزہ تھا اور اس کے درمیان کہیں کہیں خوبصورت مکانات۔ میری سیٹ کے قریب ایک علیٰحدہ اور کسی قدر کشادہ سیٹ تھی۔ یہ معذوروں کی رعایت سے بنائی گئی تھی۔ چنانچہ اس کے اوپر لکھا ہوا تھا:

Please give up this seat if a disabled person needs it.

اسٹیشن پر اترے تو وہ بالکل جدید طرز کے ہوائی اڈہ کی مانند بنا ہوا تھا۔ اگر آپ کو کسی تعاون کی ضرورت ہو تو فوراً آپ کو ریلوے کے ذمہ دار اس کے لئے تیار ملیں گے۔

میں نے سوچا کہ ہمارا لکھنے والا طبقہ برطانیہ کی جو تصویر پیش کرتا ہے وہ حقیقی برطانیہ سے کتنا زیادہ مختلف ہے۔ یہ طبقہ یہ کرتا ہے کہ اخباروں وغیرہ سے کچھ منفی پہلو لیتا ہے اور اس میں مبالغہ کے ذریعہ کچھ اور اضافہ کر کے اس کو لوگوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے برطانیہ کی نہایت مکروہ تصویر لوگوں کے سامنے آتی ہے۔ فارسی شاعر نے کہا تھا کہ "عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو" مگر ہمارے لکھنے اور بولنے والے لوگ یا تو صرف عیب بیان کرنا جانتے ہیں یا صرف ہنر۔ منصفانہ کلام کی جیسے ان کے اندر صلاحیت ہی نہیں۔

برمنگھم ریلوے اسٹیشن پر جناب شمشاد حسین خاں صاحب موجود تھے۔ وہ نہایت سلجھے ہوئے آدمی ہیں اور اپنے بزنس کے ساتھ یہاں دعوت کے کام میں مشغول ہیں۔ یہاں میرا قیام انھیں کی رہائش گاہ پر تھا۔ انھوں نے بتایا کہ چوں کہ مغرب کا وقت قریب تھا۔ اس لئے میں نے گھر سے چلتے ہوئے گاڑی میں مصلا رکھ لیا اور ریلوے اسٹیشن پر نماز پڑھی۔ انھوں نے کہا کہ اسٹیشن پر نماز پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ یہ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ آج ہم کو پوری آزادی حاصل ہے۔ ہم جہاں چاہیں نماز پڑھ سکتے ہیں جب کہ قدیم مکہ میں یہی کام عیاناً نہیں کیا جاسکتا تھا۔ راستہ میں انھوں نے ایک گفتگو کے دوران ایک جملہ کہا جو مجھے بہت پسند آیا۔ انھوں نے کہا: بندے کی عظمت بندگی میں ہے۔

۲۴ ستمبر کو مغرب بعد کا وقت تھا۔ ریلوے اسٹیشن سے نکل کر میں جناب شمشاد صاحب کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ ہماری گاڑی برمنگھم کی سڑکوں سے گزر رہی تھی۔ دونوں طرف پر رونق دکانیں

اور دفاتر رنگ برنگ روشنیوں کے ساتھ جگمگا رہے تھے۔ مگر اس ظاہری جگمگاہٹ کے پیچھے یہاں کی جو حقیقی اقتصادی حالت ہے وہ اطمینان بخش نہیں۔ صنعتی دور انسان کے لئے بہت سی خوبیاں لے آیا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اس نے ایسے مسائل بھی پیدا کر دئے ہیں جو اس سے پہلے کبھی موجود نہ تھے۔ لندن کے بعد برمنگھم یہاں کا دوسرا سب سے بڑا شہر ہے۔

یہاں میں نے ایک صاحب سے کہا کہ برطانیہ اس وقت ریشن کے مرحلہ سے گزر رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اتنا ہی نہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہاں ریشن (recession) آیا۔ پھر سلم (Slump) آیا۔ اور اب ہم ڈپریشن (depression) کے دور سے گزر رہے ہیں۔ ان تین دوروں کو سادہ طور پر اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ —— زیادہ خریداری، پھر کم خریداری، اور پھر بے خریداری۔

برمنگھم میں ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان ہیں۔ وہ یہاں کی آبادی میں تقریباً ۱۰ فیصد ہیں۔ یہاں کی چھوٹی بڑی مسجدوں کی تعداد ۹۰ تک پہنچتی ہے۔ ایک بار برمنگھم میں سفر کرتے ہوئے ہم ایک ایسے علاقہ سے گزرے جو مسلم علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں ایک دکان کے سامنے ایک اشتہار لگا ہوا تھا— "جہاد کشمیر کانفرنس"۔ میں نے سوچا کہ جہاد کانفرنس کی ہر طرف دھوم ہے مگر کوئی نہیں جو حل کانفرنس کرنے کا اہتمام کرے۔ موجودہ زمانہ میں دنیا امن کانفرنس کر رہی ہے اور مسلمان جنگ کانفرنس۔

میں جہاں ٹھہرا ہوں وہ نہایت پرفضا علاقہ ہے۔ کھلے کھلے مکانات قرینہ کے ساتھ سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کے چاروں طرف خوبصورت لان اور وسیع پارک کے مناظر ہیں۔ میں نے اپنے میزبان سے پوچھا کہ اس علاقہ کا نام کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک گاؤں ہے، اور اس کا نام ارلس وڈ (Earls wood) ہے۔ انڈیا میں گاؤں پچھڑی ہوئی بستی کا نام ہے۔ مغربی ملکوں میں گاؤں سے مراد وہ خوبصورت بستیاں ہیں جو شہروں کے باہر ہیں۔ جہاں شہری ہنگاموں کے سوا تمام جدید ترین سہولت پوری طرح موجود ہو۔

برطانیہ کے وقت میں اور انڈیا کے وقت میں ساڑھے چار گھنٹہ کا فرق ہے۔ یہاں میں نے عشا کی نماز پڑھی تو خیال آیا کہ عین اسی وقت اگر میں انڈیا پہنچ جاؤں تو وہاں کی مسجدوں میں عصر کی نماز کی تیاری ہو رہی ہوگی۔ یعنی جس وقت یہاں رات ہے عین اسی وقت وہاں دن ہے۔ اس فرق پر

میں نے غور کیا تو ذہن میں آیا کہ شاید یہی وہ چیز ہے جس کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے کہ : رَبّ المشارق والمغارب (المعارج ۴۰)

قدیم زمانہ کا انسان صرف مقامی دائرہ میں سوچتا تھا۔ اس کو اس بات کی کوئی خبر نہ تھی کہ جس وقت وہ اپنے افق پر سورج کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہے اس وقت دوسرے مقامات پر دوسری آفتابی حالت ہوگی۔ یا جس وقت وہ اپنے افق پر سورج کو غروب ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہے اس وقت دوسرے مقامات پر اس کے علاوہ دوسرا آفتابی منظر ہوگا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو قرآن کی یہ آیت قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کا ثبوت ہے۔ کیوں کہ چودہ سو سال پہلے جب کہ انسان تعدد مشارق اور تعدد مغارب کی حقیقت سے بے خبر تھا، یہ صرف کسی برتر ہستی ہی کے لئے ممکن تھا کہ وہ اس کائناتی حقیقت کو جانے اور اس کے بارہ میں نہایت صحیح بیان دے سکے۔

جناب شمشاد صاحب نے بتایا کہ برمنگھم سے کچھ فاصلہ پر نوریٹن (Nureaton) میں تقریباً ۱۵ سال پہلے گجراتیوں نے ایک مسجد بنائی۔ سب سے پہلا کام مسجد کی تعمیر کی اجازت لینا تھا۔ مقامی انگریزوں نے سخت اختلاف کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہاں مسجد تعمیر ہوئی تو یہ لوگ شور وغل کریں گے۔ گندگی پھیلائینگے اس کے بعد ہمیں اپنے گھروں کو چھوڑ دینا پڑے گا۔ تاہم ان کے اختلاف کے باوجود شہری کونسل (کارپوریشن) نے اس کی اجازت دے دی۔ اب یہاں کے مسلمان چندہ جمع کرنے کے لئے نکلے۔ لندن میں ان کی ملاقات ایک سعودی شیخ سے ہوئی۔ اس نے پوچھا کہ مسجد کی تعمیر کے لئے کتنے خرچ کا اندازہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک ملین پونڈ۔ شیخ نے تنہا اپنی جیب سے ایک ملین پونڈ دے دیا۔

اس کے بعد انھوں نے ایک خوبصورت مسجد تعمیر کی۔ انگریزوں کے اندیشے کے برعکس مسجد اس علاقہ میں خوبصورت تعمیر اور سکون اور صفائی کے ماحول کی مثال بن گئی۔ مسلمانوں کا خیال تھا کہ انگریز اپنے کہنے کے مطابق، مسجد کی تعمیر کے بعد اس علاقہ سے جانا شروع کر دیں گے اور ہم ان کے مکانوں کو خرید کر یہاں مسجد کے پاس آباد ہو جائیں گے۔ مگر کئی سال گزر گئے اور کوئی انگریز وہاں سے نہیں گیا۔ اس کے بعد ان سے پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ اس مسجد کے بننے کے بعد تو ہم اپنے آپ کو زیادہ سیکیور محسوس کرنے لگے ہیں۔ مسجد کے لوگ نہایت ڈسپلن کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے یہاں اچھے لوگوں کی آمدورفت بڑھ گئی ہے اور برگلری کا خطرہ ختم ہو گیا ہے جس کا اندیشہ ہم کو پہلے لگا رہتا تھا۔ بھر

ہم کیوں اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں اور جائیں۔

اس واقعہ کو سن کر میں نے کہا کہ آج ہمارے مسلم دانشوروں کا حال یہ ہے کہ وہ کہانی کے حصۂ اول کو لے کر کہنے لگتے ہیں کہ مغربی لوگ اسلام دشمن ہیں۔ وہ اسلام کے فروغ کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ حالاں کہ عین اسی وقت کہانی کا نصف ثانی ان کے لئے زبردست مثبت سبق کے طور پر موجود ہوتا ہے۔

آئی پی سی میں جناب عبد المجید صوفی (بریڈ فورڈ) سے ملاقات ہوئی۔ وہ قدیم کتابیں جمع کرنے کے شوقین ہیں۔ انھوں نے ایک کتاب دکھائی:

Thomas Carlyle, lectures on Heroes,
Chapman and Hall, London 1888

اس کتاب کا ایک لکچر ہیرو پیغمبر (The Hero As Prophet) ہے۔ یہ لکچر لندن میں ۸ مئی ۱۸۴۰ کو دیا گیا تھا۔ اس میں پیغمبر اسلام کو تمام پیغمبروں کا "ہیرو" بتایا گیا ہے۔

عبد المجید صوفی کے پاس اس کتاب کا ۱۸۸۸ کا نسخہ ہے۔ انھوں نے یہ کتاب مجھے دکھاتے ہوئے کہا کہ "یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ ساری دنیا ان کے قدموں میں تھی، جب یہ لوگ انسانوں کو کیڑے مکوڑے سمجھتے تھے۔ اس وقت کارلائل نے رسول اللہؐ کو پیغمبروں کا ہیرو بتایا۔

میں نے کہا کہ "۱۸۴۰ " میں اتنا بڑا واقعہ لندن میں ہوا۔ مگر اس وقت کے مسلم لیڈروں میں سے کوئی نہیں جو اس کو جانے اور اس سے مسلمانوں کو آگاہ کرے۔ ہمارے رہنما انگریز کے نام سے صرف "ڈائر" سے واقف تھے، وہ انگریز کے نام سے "کارلائل" سے واقف نہ ہو سکے۔

برمنگھم کے الہجرہ اسکول کے ہال میں ۲۴ ستمبر کو ایک تقریر تھی۔ اس میں تعلیم یافتہ حضرات جمع ہوئے۔ تقریر کا موضوع تھا: اسلام اور عصر حاضر۔ ڈیڑھ گھنٹہ کی تقریر میں موضوع کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا گیا۔ آخر میں سوال وجواب ہوا۔ اس کے علاوہ مختلف مواقع پر مجلسیں ہوئیں ان میں الرسالہ مشن اور دوسرے ملی موضوعات پر اظہار خیال کیا۔ اس طرح ۲۴ ستمبر کا تقریباً پورا دن لوگوں سے بات چیت میں گزر گیا۔

ایک اجتماع میں قاری صاحب نے قرآن کی وہ آیتیں تلاوت کیں جن میں لا ترفعوا اصواتکم

فوق صوت النبی (الحجرات ۲) ہے۔ میں نے اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ قاری صاحب نے جو آیت پڑھی، اس میں موجودہ زمانہ کے سب سے بڑے مسلم مسئلہ کا جواب ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی حالت ہر جگہ یہ ہو رہی ہے جیسے ان کے سامنے کوئی لائحہ عمل نہیں، حالاں کہ قرآن ابدی کتاب کی حیثیت سے محفوظ طور پر ان کے پاس موجود ہے۔

میں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ ایک نیا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں قرآن کے ازسرنو انطباق (reapplication) کی ضرورت تھی۔ مگر مسلمان جدید حالات پر قرآن کے انطباق میں کامیاب نہ ہو سکے۔ مثلاً لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی کا مطلب اسباب نزول کی روایات کے مطابق، یہ ہے کہ مدینہ میں لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے زور زور سے بولتے تھے۔ وہ رسول کی آواز پر اپنی آواز کو بلند کرتے تھے۔ قرآن میں اس سے منع کیا گیا اور اس پر حبط اعمال کا اندیشہ بتایا گیا۔ اب اس کا ازسرنو انطباق یہ ہے کہ اس کو موجودہ زمانہ میں لوگوں کے اس مزاج پر منطبق کیا جائے کہ ان کے سامنے قرآن و حدیث پیش کیا جائے تو وہ اس کے جواب میں اپنی ذاتی ریزننگ پیش کرنے لگتے ہیں۔ حالاں کہ یہ بھی رسول کی آواز پر اپنی آواز بلند کرنا ہے اور دوبارہ اس میں حبط اعمال کا اندیشہ ہے۔

اگر ہم ایسا کرسکیں کہ قرآن کی تعلیمات کو ازسرنو جدید حالات پر منطبق کریں تو فوراً ہی قرآن ہمارے لئے ایک رہنما کتاب بن جائے گا۔ اس میں ہم اپنے آج کے لئے رہنمائی پانے لگیں گے۔ جب کہ آج وہ ہمارے لئے بس ایک مقدس کتاب بن کر رہ گیا ہے، اور ظاہری احترام کے سوا اس کا کوئی اور حق ہم کو معلوم نہیں۔

۲۵ ستمبر کو جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز ہم نے برمنگھم کی جامع مسجد میں پڑھی۔ یہاں لوگوں کی فرمائش پر نماز سے پہلے آدھ گھنٹہ کی تقریر کی۔ تقریر کا موضوع ”اسلامی عبادت“ تھا۔ میں نے کہا کہ حدیث میں کہا گیا ہے کہ المساجد بیوت المتقین۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسجدیں تقوی کی تربیت کا مرکز ہیں۔ اس سلسلہ میں نماز کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ نماز کس طرح آدمی کو متقیانہ زندگی کے لئے تیار کرتی ہے۔

نماز سے پہلے ماہنامہ صراط مستقیم کے مدیر محترم نے ایک انٹرویو لیا۔ سوالات زیادہ تر ہندستان

اور عالم اسلام کے مسائل سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں الرسالہ کے نقطۂ نظر کو تفصیل کے ساتھ بتایا گیا۔

ایک سوال یہ تھا کہ کہا جاتا ہے کہ آپ کو ہر ایک سے اختلاف ہے اور آپ دوسری جماعتوں سے کٹ کر اپنا ایک نیا دین پیش کررہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بات سراسر غلط ہے۔ میں نے کہا کہ اختلاف کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اساسیات میں اختلاف، اور دوسرا فروع میں اختلاف۔ میرا اساسیات میں کسی سے کوئی اختلاف نہیں۔ مثلاً تمام لوگ رسول اللہؐ کو خاتم الرسل مانتے ہیں تو میں بھی رسول اللہؐ کو خاتم الرسل مانتا ہوں۔ میرا جو کچھ اختلاف ہے وہ فروعات میں ہے اور فروعات میں اختلاف صحابہ، تابعین، تبع تابعین، محدثین، فقہاء، علماء کے درمیان ہمیشہ رہا ہے۔ یہاں اصل مسئلہ اختلاف کا نہیں بلکہ غیر ضروری حساسیت کا ہے۔ لوگ غیر ضروری طور پر اختلاف کے معاملہ میں حساس ہو گئے ہیں۔ اس بنا پر وہ فروع میں اختلاف کو وہ درجہ دینے لگے ہیں جو اساسیات میں اختلاف کا درجہ ہوتا ہے۔ لوگوں کی یہی غیر ضروری حساسیت ہے جس نے مسئلہ پیدا کیا ہے نہ کہ نفس اختلاف نے۔

نماز کے بعد تعلیم یافتہ حضرات کا ایک حلقہ جمع ہو گیا اور دیر تک ان سے ملی اور اسلامی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ اس میں کچھ کشمیری حضرات تھے۔ ایک کشمیری صاحب نے پوچھا کہ الرسالہ (اگست ۱۹۹۲) میں کشمیر کے تعلق سے ایک پیغام شائع ہوا تھا۔ اس کا کیا رسپانس آپ کو ملا۔ میں نے کہا کہ اس کی اشاعت کے بعد کشمیر کے جنگجو نوجوان گن لے لے کر الرسالہ کے تمام ڈسٹری بیوٹرس کے یہاں پہنچے اور کہا کہ یا تو الرسالہ کا ڈسٹری بیوشن بند کر دو یا ہماری گولی کھانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

مجھ کو جب اس کی اطلاع ملی تو مجھے غم کے بجائے تعجب ہوا۔ میں نے کہا کہ جو تحریک اتنی کمزور ہو کہ الرسالہ جیسا ایک ماہنامہ اس کے لئے خطرہ بن جائے وہ میرے نزدیک تحریک ہی نہیں۔ وہ بچوں کا کھیل ہے نہ کہ کوئی حقیقی تحریک۔ جنگجو حضرات کا یہ جنگجویانہ اقدام خود اپنے خلاف تھا نہ کہ ہمارے خلاف۔ یہ گفتگو ۴ ۲ ستمبر کو نماز جمعہ کے بعد برمنگھم کی جامع مسجد میں ہوئی۔

برمنگھم میں ایک نہایت خوبصورت مرکز ہے جس کا نام اسلامک پروپیگیشن سنٹر (IPC) ہے۔ اس کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ یہ مرکز کی عمارت بذات خود نظم اور باقاعدگی اور منصوبہ بندی

کا ایک قابل تقلید نمونہ ہے۔ یہ مرکز اسلامی دعوت کا کام منظم انداز میں کر رہا ہے۔ وہ گھر گھر (door to door) اسکیم کے تحت اسلام کا پیغام ہر ایک تک پہنچانا چاہتا ہے۔

۲۶ ستمبر کی دوپہر کو برمنگھم سے لندن کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ سفر دوبارہ ٹرین کے ذریعہ طے ہوا۔ دو گھنٹہ کے بعد ٹرین ٹھیک وقت پر لندن ایوسٹن کے پلیٹ فارم پر آکر کھڑی ہوئی۔ ٹرین کے تمام دروازے اپنے آپ کھل گئے اور مسافر ایک کے بعد ایک باہر جانے لگے۔

آپ اس ٹرین (انٹرسٹی) کے ذریعہ لندن اسٹیشن پر پہنچیں اور آپ کو دوسرے مقام پر جانا ہے تو اسٹیشن سے ملحق انڈر گراؤنڈ ٹرین (ٹیوب) موجود ہوگی۔ آپ ایک بورڈ کے اندر پونڈ ڈالئے اور اپنے مقام کے نمبر کا بٹن دبا دیجئے۔ اس کے بعد آپ کا مطلوبہ ٹکٹ بھی نکل آئے گا اور فاضل رقم بھی۔ آپ آگے بڑھیں گے اور متحرک سیڑھیاں آپ کو نیچے پہنچا دیں گی۔ وہاں لکھا ہوا ہوگا کہ آپ کی مطلوبہ ٹرین ۲ منٹ میں آرہی ہے۔ اگر ایک ٹرین چھوٹ جائے تو دو منٹ کے بعد دوسری ٹرین آپ کے سامنے کھڑی ہوگی۔

انڈر گراؤنڈ ٹرین پورے شہر کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس لئے برٹش ٹرین بنائی گئی ہے۔ وہ بھی اگر آپ کے لئے کافی نہ ہو تو اس سے اتر کر آپ فوراً اپنے مقام کے لئے بس پکڑ سکتے ہیں۔ اس پورے سفر کے دوران آپ کو بار بار ٹکٹ کی لائن میں کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ ایک بار دن بھر کا ٹکٹ حاصل کر لیجیے۔ اس کے بعد اسی ٹکٹ سے سارے دن ٹیوب، برٹش ریل، بس تینوں سے سفر کر سکتے ہیں۔

اس طرح کی مختلف چیزیں بتاتی ہیں کہ یہاں کا نظام پیشگی طور پر انسان کی ضرورتوں کا اندازہ کرتا ہے اور قبل اس کے کہ آپ اس سے کہیں، وہ آپ کی ہر ضرورت کا انتظام کرتا چلا جاتا ہے۔ میں نے سوچا کہ حدیث میں ہے کہ جنت میں تم صرف خواہش کروگے اور تمہاری مطلوبہ چیز فوراً تمہارے سامنے آجائے گی۔ مذکورہ نظام گویا جنت کی اس صفت کا ایک ابتدائی تعارف ہے۔

مسز اسرہ خان (لندن) کئی سال سے الرسالہ پڑھ رہی ہیں اور اس کے مشن سے کافی متاثر ہیں۔ انھوں نے ٹیلیفون پر باصرار دعوت دی کہ ان کے یہاں ایک پروگرام رکھا جائے۔ اس کے مطابق ۲۶ ستمبر کی شام کو ان کے یہاں پہنچا۔ اجتماع کا انتظام انھوں نے ڈاکٹر صبیحہ سالم کے مکان (چیرل

ہرسٹ) پرکیا تھا۔ یہاں تعلیم یافتہ مرد اور عورت جمع تھے۔ اس موقع پر میری دو تقریریں ہوئیں۔ پہلی تقریر اقوال رسول کی روشنی میں۔ اور دوسری تقریر رسول اور اصحاب رسول کے واقعات کی روشنی میں۔ پہلی تقریر عشا کی نماز سے پہلے ہوئی اور دوسری تقریر عشا کی نماز کے بعد۔

مسز اسرہ خان نے الرسالہ کے بارہ میں اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ الرسالہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ہر مضمون آدمی کے اندر اسلامی فیلنگ کو جگاتا ہے۔ جب ہم اس کا کوئی صفحہ پڑھتے ہیں تو عین اس وقت ہمارا تعلق خدا و رسول سے جڑ جاتا ہے۔ الرسالہ وقت کے اسلوب میں اسلامی بیداری پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ ان کے شوہر اردو نہیں جانتے۔ وہ صرف انگریزی سمجھ سکتے ہیں۔ وہ اپنے شوہر کو الرسالہ کی باتیں انگریزی زبان میں بتاتی ہیں۔

۲۶ ستمبر ۱۹۹۲ کو جب میں لندن میں تھا۔ مسٹر فاروق جنگ کے یہاں ٹیلیفون آیا۔ آجکل وہ اپنی فیملی کے ساتھ بون میں مقیم ہیں۔ انھوں نے جرمنی آنے کی دعوت دی۔ مگر لندن سے بون جانا میرے لئے مشکل تھا۔ اس لئے میں ان کی دعوت کو قبول نہ کرسکا۔

انھوں نے کہا کہ ہم کو معلوم نہ تھا کہ آپ بروسیلز تک پہنچ چکے ہیں۔ ورنہ ہم بروسیلز آکر آپ کو کار سے بون لے جاتے۔ کیوں کہ بروسیلز سے بون تک بذریعہ کار صرف دو گھنٹہ کا سفر ہے۔ اتفاق سے مجھے اس کا اندازہ نہ تھا۔ ورنہ میں پہلے سے اس کا پروگرام بناتا اور بروسیلز سے بون ضرور جاتا۔

بون (Bonn) جرمنی کی انتہائی قدیم بستی ہے۔ جس کی تاریخ پہلی صدی قبل مسیح تک جاتی ہے۔ تاہم ماضی میں اسے زیادہ ترقی نہ مل سکی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد اس کی ترقی شروع ہوئی اب وہ جرمنی کا سب سے زیادہ خوبصورت شہر سمجھا جاتا ہے۔

اس کی خوبصورتی کا زیادہ بڑا سبب یہ ہے کہ دریائے رینے (Rhine) کے کنارے واقع اس شہر کو ارباب دولت نے اپنی رہائش کے لئے پسند کیا۔ دوسو سے زیادہ دولت مند (millionaires) یہاں آکر آباد ہو گئے۔ تعلیم یافتہ اور خوشحال طبقہ جہاں آباد ہو وہ خوبصورت بستی ہو گی اور جاہل اور غریب طبقہ جہاں آباد ہو وہ بد ہیئت بستی۔

بون سے بہت سی تاریخیں وابستہ ہیں۔ مثلاً مسیحیت کے دو مذہبی ادارے اینگلکن چرچ

اور اولڈ چرچ کے درمیان زبردست اختلافات تھے جو تقریباً سو سال تک شدت کے ساتھ جاری رہے۔ آخر کار دونوں کے درمیان گفت و شنید سے ایک معاہدہ ہوا۔ اس معاہدہ کا اعلان بون میں کیا گیا۔ اس لئے اس کو بون اعلان (Declaration of Bonn) کہا جاتا ہے۔ یہ اعلان ۱۹۳۱ میں کیا گیا۔ اس کے تحت دونوں نے ایک دوسرے کی آزاد حیثیت کو تسلیم کر لیا۔

جب اختلافات نظری اور اعتقادی سطح پر ختم نہ ہو رہے ہوں تو بہترین دانش مندی یہ ہے کہ نظری سطح پر اختلاف کو باقی رکھتے ہوئے عملی سطح پر اس کا خاتمہ کر دیا جائے۔

جرمنی میں ٹرانزٹ پسنجر کی حیثیت سے کئی بار جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ مگر کچھ دن قیام کر کے جرمنی کو باقاعدہ طور پر دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس دوران مطالعہ کے ذریعہ جو باتیں علم میں آئیں ان میں سے ایک قصہ یہ تھا۔

چند دن پہلے ۱۲ ستمبر ۱۹۹۲ کو ایک واقعہ فرینکفرٹ ایئرپورٹ پر ہوا۔ اس واقعہ کو میں نے اخبار میں پڑھا۔ ایک ہندستانی خاتون مسز مان سنگھ نے ایک جرمن مسٹر سونال (Mr Sonal) سے شادی کی ہے۔ وہ میونخ سے فرینکفرٹ پہنچیں۔ یہاں سے ان کو دہلی کی فلائٹ لینا تھا۔ ایئر پورٹ پر انتظار کے دوران وہ ایک بک شاپ (Julius Valtermahm) میں داخل ہوئیں۔ یہاں وہ ایک میگزین اٹھا کر دیکھنے لگیں۔ "سیلس وومن" جس کا نام ارسلا (Ursula) تھا، اس نے دیوار پر لگے ہوئے ایک کاغذ کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر لکھا تھا: پہلے خریدو، پھر پڑھو (Buy now, Read later)

بک شاپ میں کئی سفید فام عورتیں میگزین اٹھا اٹھا کر باقاعدہ طور پر پڑھ رہی تھیں۔ مسز مان سنگھ نے کہا کہ یہ عورتیں بھی تو پڑھ رہی ہیں۔ آپ ان کو کیوں نہیں منع کرتیں۔ اس پر دکان کی خاتون بگڑ گئیں۔ اس نے کہا کہ یہاں سے نکل جا، کالی عورت۔ یہ میری دکان ہے۔ میں جو چاہوں گی کروں گی:

Get out, you Black-head. This is my shop.
I will do what I like.

مسز مان سنگھ اس کے بعد ایئر پورٹ کے مختلف دفتروں میں گئیں تاکہ اپنی شکایت درج کرائیں۔ مگر

ایئرپورٹ کے کسی افسر نے ان کی طرف توجہ نہ دی۔ نہ ان کی شکایت درج کی گئی اور نہ اس کا دفعیہ کیا گیا۔ ہر ایک نے مسز مان سنگھ کو بیرونی راستہ دکھایا۔ یہ اس کے باوجود ہوا کہ مسز مان سنگھ جرمن زبان جانتی تھیں اور اپنی شکایت کو بخوبی طور پر جرمن میں بتا سکتی تھیں۔

یہ رپورٹ خود مسز مان سنگھ نے چھاپی ہے۔ انھوں نے اس کو ان الفاظ پر ختم کیا ہے کہ آخر کار میں ایئرپورٹ سے نکل کر ہوائی جہاز میں داخل ہوئی۔ میں کھڑکی کی طرف اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی آنسوؤں کے ساتھ جرمنی کو الوداع کہا جس سے مجھے محبت تھی مگر اب مجھے اس سے ڈر لگ رہا تھا۔ میں نے دوبارہ بدھا اور گاندھی کی سرزمین کی طرف اپنا سفر شروع کر دیا:

I sat in my window seat, bade a teary goodby to the Germany I had loved but now feared and started my journey back towards the land of Buddha and Gandhi.

مسز مان سنگھ کا یہ تقابل درست نہیں۔ کیوں کہ جرمنی میں جو نسلی امتیاز رنگ کی بنا پر ہے وہی نسلی امتیاز انڈیا میں ذات کی بنا پر موجود ہے۔ اگر انڈیا میں بدھا اور گاندھی پیدا ہوئے تو اسی طرح جرمنی میں گوئٹے (Goethe) اور رلکے (Rilke) جیسے افراد پیدا ہوئے۔ دونوں جگہ دونوں قسم کے واقعات یکساں طور پر موجود ہیں۔

مسز مان سنگھ کی غلطی یہ ہے کہ وہ جرمنی کے بارہ میں رائے قائم کرنے کے لئے "ارسلا" کی مثال لے رہی ہیں اور انڈیا کے بارہ میں رائے قائم کرنے کے لئے "گاندھی" کی مثال۔ یہ جنرلائزیشن درست نہیں۔ بیشتر غلط رائیں اسی قسم کے غلط جنرلائزیشن سے بنتی ہیں۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ اپنے پسندیدہ ملک سے ایک اچھی مثال لے کر اس کو عمومی بنا دیتے ہیں۔ اور جو ملک انھیں ناپسند ہو اس کی ایک بری مثال لے کر اس کو عموم کا درجہ دیدیتے ہیں۔ ایسے لوگ اِس ملک کے بارہ میں بھی اندھیرے میں رہتے ہیں اور اُس ملک کے بارہ میں بھی۔

میں نے کچھ مسلمانوں سے پوچھا کہ آپ لوگوں نے اپنے وطن کو چھوڑ کر مغربی ملکوں میں رہنا کیوں پسند کیا۔ ہر ایک کا جواب تھا کہ یہاں کے سسٹم کی خوبی انھیں یہاں رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ بعض اخلاقی برائیوں سے قطع نظر، ان ملکوں کا سسٹم بڑی حد تک معیاری ہے۔

" نظامی " ذہن کے ایک مسلمان سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ لوگ اسلام کو بہتر دنیوی نظام کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ اس میں آج کے انسان کے لئے زیادہ کشش نہیں۔کیونکہ اس قسم کا نظام تو آج بھی اس کو حاصل ہے۔ میں نے کہا کہ اسلامی قانون کے نفاذ کا تعلق اصلاً دنیوی آسودگی سے نہیں ہے بلکہ اخلاقی تحفظ سے ہے۔ دنیوی آسودگی زیادہ تر [انتم اعلم بامور دنیاکم] سے تعلق رکھتی ہے۔

ٹرین میں ایک تعلیم یافتہ انگریز سے ملاقات ہوئی۔ وہ لندن کے مضافات میں رہتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں کیرولین مورہیڈ (Caroline Moorehead) کی کتاب برٹرینڈ رسل (Bertrand Russell) تھی جو ابھی حال میں شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب برٹرینڈرسل کا کا ایک تنقیدی مطالعہ ہے۔ مثلاً اس میں رسل کو غیر منطقی (illogical) بتایا گیا ہے۔

مجھے ان سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ابتدائی تقریب کے بعد میں نے کہا کہ برٹرینڈرسل کے بارہ میں مورہیڈ کی اس کتاب کو میں دیکھ چکا ہوں۔ گفتگو کے دوران اندازہ ہوا کہ وہ برٹرینڈرسل کے خیالات سے متاثر ہیں۔ خاص طور پر خدا کے وجود کے بارہ میں ان کے خیالات تقریباً وہی ہیں جو برٹرینڈرسل کے خیالات تھے۔

انگریز اس طرح کسی اجنبی سے بات کرنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن ایک مسافر کے لئے عام انگریز سے بات کرنے کا کوئی اور موقع پانا بھی مشکل ہے۔ اس لئے میں اپنے ایشیائی ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس قسم کی مداخلت کر لیتا ہوں۔

میں نے کہا کہ میں نے برٹرینڈرسل کو کافی پڑھا ہے۔ رسل نے لکھا ہے کہ میں خدا کے وجود کو نہیں مانتا۔ اس کی دلیل رسل نے یہ دی ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ کائنات کو خدا نے پیدا کیا تو فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا۔ مگر رسل کا یہ اعتراض سراسر غیر منطقی ہے۔

میں نے کہا کہ رسل بلاشبہہ ذہین تھا۔ مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ اس معاملہ میں اس کے لئے انتخاب باخدا کائنات اور بے خدا کائنات میں نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی انتخاب باخدا کائنات اور غیر موجود کائنات کے درمیان ہے۔ چوں کہ ہم مجبور ہیں کہ کائنات کے وجود کو مانیں، اس لئے ہم اس پر بھی مجبور ہیں کہ خدا کے وجود کو تسلیم کریں:

It is true that Bertrand Russell was a great mind. But he failed to realize that in this case, the option was not between the universe with God and the universe without God. Rather the real option was between the universe with God or no universe at all. As we are bound to acknowledge the existence of the universe, so are we bound to acknolwedge the existence of its Creator — God.

مذکورہ انگریز نے ابتداءً بالواسطہ انداز میں برٹر ینڈ رسل کے الحادی نقطہ نظر کی حمایت کی تھی۔ مگر میری اس بات کو سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے کہا کہ آپ کی بات قابل لحاظ معلوم ہوتی ہے، میں اس پر غور کروں گا۔

لندن میں میرا قیام پروفیسر انیس تاری کی رہائشگاہ پر تھا۔ یہاں ۲۶ ستمبر کو جناب جاوید حسن صاحب (Tel. 5581523) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ میں ایک یہودی فرم میں کام کرتا ہوں۔ وہاں ایک کٹر قسم کا یہودی تھا۔ میں جب اس کے پاس سے گزرتا تو ہمیشہ اس کو گڈ مارننگ کہتا۔ مگر وہ مجھ کو جواب نہ دیتا، بلکہ منھ پھیر لیتا۔ آخر کار ایک روز اس نے کہہ دیا کہ تم کیوں مجھ کو گڈ مارننگ کہتے ہو۔ تم جانتے ہو کہ میں تم سے نفرت کرتا ہوں:

Why you say good morning to me.
You know, I hate you.

اس کے جواب میں جاوید صاحب نے کہا کہ آپ کا شکریہ۔ مگر میں تو آپ سے نفرت نہیں کرتا۔ (But I do not hate you) یہ جواب سن کر یہودی تعجب میں پڑ گیا۔ اس نے کہا میں تو سمجھتا تھا کہ سارے مسلمان یہودیوں سے نفرت کرتے ہیں اور تم بھی نفرت کرتے ہوگے، کیوں کہ میں ایک یہودی ہوں۔ اس دن کی گفت گو کے بعد وہ کافی نرم پڑ گیا۔ یہاں تک کہ چند دن کے بعد وہ نارمل ہو گیا۔ اس کا حال یہ ہو گیا کہ جاوید صاحب کو دیکھتا تو دور ہی سے ہیلو، ہیلو کرنے لگتا۔ لوگوں کو تعجب تھا کہ اتنا کٹر یہودی ایک مسلمان سے اتنا قریب کیسے ہو گیا۔ اس کا جواب ایک لفظ میں یہ ہے کہ: یک طرفہ حسن اخلاق سے۔

لندن میں ایک اسلامیہ اسکولس ٹرسٹ (Tel. 01-6076655) ہے۔ اس کی طرف سے اسلامک ٹیچنگ کورس کا ایک سٹ خصوصی اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ یہاں اس کی

پہلی جلد میں نے دیکھی۔ اس میں مذہب کی بحث کے تحت لکھا گیا ہے :

The whole notion of 'religion' as understood by Muslims is not restricted to rituals and religious observances, but it is an all encompassing concept which includes the social, economic and political: thus it is a way of life.

برمنگھم کے ایک مسلمان سے یہاں کے مسلمانوں کے بارہ میں گفت گو ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں کی مسلم کمیونٹی اخلاقی اعتبار سے سب سے زیادہ بدنام کمیونٹی ہے۔ عام طور پر یہاں اس کی اچھی امیج نہیں۔ ان کو میں نے کتاب کا مذکورہ مضمون دکھایا۔ میں نے کہا کہ مسلمان کہتے ہیں کہ ہمارا مذہب صرف کچھ عبادات اور مذہبی رسوم کا مذہب نہیں ہے بلکہ وہ مکمل ضابطہ حیات ہے جس میں زندگی کے تمام شعبے شامل ہیں۔ مگر زندگی کے معاملات میں مسلمان ہی سب سے زیادہ ناقص ہیں اور جن لوگوں کو آپ محدود مذہبی تصور کا الزام دیتے ہیں وہ زندگی کے معاملات میں آپ سے بہت زیادہ بہتر ہیں۔

پھر میں نے کہا کہ اسلام کی مذکورہ تعریف جو آجکل بہت زیادہ رائج ہے وہ بذات خود درست نہیں۔ یہ تمام تر ردعمل کا نتیجہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں سیاسی معاملات میں چرچ کے دخل کو ختم کرنے کے لئے کچھ لوگوں نے کہا کہ مذہب ایک ذاتی معاملہ ہے۔ اس کے ردعمل میں مسلمانوں کا لکھنے اور بولنے والا طبقہ یہ کہنے لگا کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے۔ حالاں کہ صحیح بات یہاں تیسری تھی۔ یعنی یہ کہ مذہب معرفت خداوندی کا نام ہے اور انسان کو جب خالق و مالک اور محاسب ومجازی خدا کی معرفت ہوجائے تو اس کے اندر ایک ذہنی انقلاب برپا ہوجاتا ہے۔ وہ اپنے تمام اختیاری معاملات میں اللہ کی پسند و ناپسند کا لحاظ کرنے لگتا ہے۔

جن لوگوں نے کہا کہ مذہب ایک ذاتی معاملہ ہے، ان کی تعریف کم از کم محدود حد تک انسانی شخصیت کو چھوتی تھی۔ مگر جدید مسلم مفکرین کی تعریف میں انسانی شخصیت سرے سے گرفت سے باہر چلی گئی۔ اس نظریہ کو ماننے والوں کا سارا دھیان حکومتی ادارہ کی طرف چلا گیا۔ کیوں کہ ان کی تعریف کے مطابق یہ صرف حکومتی ادارہ تھا جس کو قبضہ میں لے کر زندگی کے تمام شعبوں کی تشکیل اپنی مرضی کے مطابق کی جاسکتی تھی۔

ایک بوڑھے انگریز سے بات ہوئی۔ وہ انڈیا کے حالات سے واقف تھا۔ اس نے کہا کہ انڈیا

سے مجھے دلچسپی ہے۔ ایک بار میں نے انڈیا کی سیاحت بھی کی ہے۔ مگر میرا احساس یہ ہے کہ عقلی نقطۂ نظر اور علمی طرز فکر کے معاملہ میں ہندستانی ذہن یورپی ذہن سے بہت پیچھے ہے :

The Indian mind is far less rational and scientific than the European.

مذکورہ انگریز کی اس بات کو میں رد نہ کر سکا۔ کیوں کہ میرا اپنا خیال بھی ہندستانی ذہن کے بارہ میں یہی ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ پورے برصغیر ہند کی اصل کمی یہی ہے۔ انڈیا کے لیڈروں نے اصل مسئلہ سیاسی آزادی کو سمجھا۔ پاکستانی لیڈروں نے مسلم پاکٹ بنانے کو اصل مسئلہ قرار دیا۔ بنگلہ دیش کے لیڈروں نے یہ سمجھا کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ بنگلہ زبان اور بنگلہ تہذیب کو ایک آزاد علاقہ حاصل ہوجائے۔

مگر میرے نزدیک یہ سب کی سب سطحی سوچ تھی۔ یہ سب قیادت سازی کے نظریے ہیں، وہ قوم سازی کے نظریے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان خیالات کی بنیاد پر اٹھنے والی تحریکوں نے کچھ لیڈروں کے گنبد تو ضرور رکھڑے کر دئے۔ مگر یہ تحریکیں قوم کا مستقبل تعمیر کرنے میں سراسر ناکام رہیں۔

لندن کی ایک مجلس میں بوسنیا میں ہونے والے مظالم کا ذکر ہوا۔ اس سلسلہ میں ایک صاحب نے پرجوش طور پر کہا کہ عراق نے کویت کے خلاف ظلم کیا تو امریکی حکومت فی الفور پوری قوت کے ساتھ حرکت میں آگئی۔ بوسنیا میں سرب اور یوگوسلاوی حکومت نے وہاں کے مسلمانوں کے خلاف ظلم کی انتہا کر دی ہے۔ مگر امریکہ کی حکومت نے اس کے لئے کچھ نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بش انتظامیہ کے نزدیک صرف ان مسلمانوں کی اہمیت ہے جن کے پاس تیل ہو :

It would appear that only Muslims with oil count for the Bush administration.

میں نے کہا کہ اس معاملے میں خود مسلمان این گناہ است کہ در شہر شما نیز کنند کا مصداق ہیں۔ صدام حسین نے کویت کے خلاف جارحیت سے پہلے ایران کے خلاف جارحیت کی اور اس کو ۸ سال تک جاری رکھا، مگر ہمارے علماء اس جارحیت پر خاموش رہے۔ لیکن جب اسی صدام نے کویت (اور سعودی عرب) کے خلاف جارحیت کی تو تمام علماء چیخ اٹھے۔ کیوں کہ سعودی عرب اور کویت سے ان علماء کا مفاد وابستہ تھا۔ جب کہ ایران سے ان کا اس قسم کا مفاد وابستہ نہیں۔

ایک پاکستانی جریدہ" اخبار اردو" میں ڈاکٹر مختار الدین احمد کا ایک مضمون پڑھا۔ وہ بریڈ فورڈ میں رہتے ہیں۔ وہ طبی پیشہ کے ساتھ شعر و ادب سے بھی لگاؤ رکھتے ہیں۔ انھوں نے بتایا تھا کہ " اس وقت برطانیہ میں جس قدر مشاعرے ہوتے ہیں، شاید پاکستان میں بھی نہیں ہوتے۔ لندن، برمنگھم آکسفورڈ، مانچسٹر، بریڈ فورڈ، گلاسگو، اڈنبرا اور نائیٹکم جیسے برطانی شہروں میں کئی کئی ادارے اور ادبی انجمنیں قائم ہیں۔ یہ کسی نہ کسی موضوع پر جلسے، مذاکرے اور مشاعرے منعقد کراتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ بیرون برطانیہ، بالخصوص پاکستان سے بلائے اور بن بلائے شاعر اور ادیب اور اہل قلم تشریف لاتے رہتے ہیں۔ ان کے اعزاز میں مشاعرے یا ادبی تقاریب منعقد ہوتی ہیں"۔

ڈاکٹر اقبال ۱۹۰۵ میں یورپ گئے۔ وہاں وہ تعلیم کے سلسلہ میں انگلینڈ اور جرمنی میں ۱۹۰۸ تک رہے۔ اس قیام کے دوران انھیں احساس ہوا کہ یہ زمانہ شعر و شاعری کا نہیں ہے۔ بلکہ سائنس کا ہے۔ انھوں نے شاعری کو چھوڑنے کا ارادہ کیا اور اپنے دوست سر عبد القادر (مدیر مخزن) کو ایک منظوم خط میں لکھا :

مدیر مخزن سے جا کے اقبال کوئی میرا پیام کہدے   کہ کام جو کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاق سخن نہیں ہے

مگر اقبال کے دوستوں نے اصرار کر کے انھیں شعر گوئی کے مشغلہ پر باقی رکھا۔ عجیب بات ہے کہ تقریباً نوے سال بعد بھی مسلمان یورپ تک میں شعر و شاعری کے مشغلہ کو بدستور اختیار کئے ہوئے ہیں۔ شاید اس لئے کہ ان کے محبوب رہنما (اقبال) شاعری کو بے فائدہ سمجھنے کے باوجود اس کو چھوڑنے پر اپنے آپ کو راضی نہ کر سکے تھے۔

ایک برطانی تاجر سے ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا کہ برطانیہ میں (اور پوری مغربی دنیا میں) دکھائی دے رہا ہے کہ جاپان نے اقتصادی حملہ کر رکھا ہے۔ وہ آپ لوگوں کی سپر یمیسی کو چھین رہا ہے ۱۹ ویں صدی کو برٹش صدی کہا جاتا ہے۔ ۲۰ ویں صدی امریکی صدی تھی۔ مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۲۱ ویں صدی جاپانی صدی ہوگی۔ موجودہ صورتحال یہ ہے کہ امریکہ میں جاپان کو دشمن نمبر ایک کہا جانے لگا ہے۔ جاپان کی پر کیپٹا جی این پی امریکہ سے ۲۲ فیصد زیادہ ہے۔ اور اسی طرح برطانیہ سے بھی اس کا ٹریڈ سرپلس ۱۲۰ بلین سالانہ ہے۔ اس طرح کی کچھ باتوں کا تذکرہ کرنے کے بعد میں نے پوچھا کہ آپ کے نزدیک اس کا سبب کیا ہے۔ اس نے کہا کہ میں خود جاپان گیا ہوں۔ اور اس کو قریب

سے دیکھا ہے۔ میرے نزدیک اس کا بنیادی سبب ایجوکیشن ہے۔

The educational achievements of Japanese workers at all levels are unmatched in the world.

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کی تحریروں میں اختلاف رائے اور تنقید بہت ہوتی ہے۔ یہاں کے کچھ لوگ کہنے لگے ہیں کہ آپ کو تنقید کے سوا کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بے بنیاد الزام ہے۔ آپ کسی بھی مہینہ کے الرسالہ کو اٹھا کر دیکھئے اور ہر مضمون کو پڑھ کر پتہ کیجئے کہ اس میں اختلاف رائے والا پہلو کتنا ہے۔ آپ پائیں گے کہ کسی پرچہ میں سرے سے ایسا کوئی مضمون نہ ہو گا اور کسی میں ہو گا بھی تو صرف ایک یا دو فیصد۔

پھر میں نے کہا کہ اصل مسئلہ اختلاف رائے نہیں ہے۔ اصل مسئلہ لوگوں کی غیر ضروری حساسیت ہے۔ صحابہ کے زمانہ سے لے کر ہر اگلے دور تک علماء کے درمیان اختلاف ہوتا تھا مگر کبھی کسی نے اختلاف کو برا نہیں بتایا۔ مثلاً امام محمد اور امام ابو یوسف دونوں امام ابو حنیفہ کے شاگرد تھے۔ دونوں نے امام ابو حنیفہ کی رایوں سے ۸۲ ا معاملہ میں اختلاف کیا ہے۔ مگر اس کو کبھی کسی نے برا نہیں مانا۔ حقیقت یہ ہے کہ اختلاف رائے یا علمی و فکری تبصرہ قوموں کی زندگی ہے۔ اس کو اسلام میں اتنا زیادہ جگہ دی گئی ہے کہ آدم کی پیدائش کی کہانی کا ایک جزء جو بائبل میں حذف ہو گیا تھا اس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں درج فرمایا۔ یہ خود اللہ تعالیٰ سے فرشتوں کا یہ کہنا تھا کہ اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفك الدماء (البقرۃ ۳۰)

ایک صاحب نے تنہائی میں ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ جب کمرہ کے اندر تنہا ملاقات ہوئی تو وہ اپنے گھریلو حالات بتاتے ہوئے رونے لگے۔ یہاں بہت سے لوگ ہیں جو بظاہر دیکھنے میں ٹھیک معلوم ہوں گے لیکن اگر تحقیق کیجئے تو معلوم ہو گا کہ لوگ سخت الجھنوں میں مبتلا ہیں۔ کہیں باپ اور بیٹے کے درمیان کش مکش، کہیں شوہر اور بیوی کے تعلقات میں بگاڑ، کہیں ساس اور بہو کے درمیان جھگڑا۔

اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ مسلمانوں میں اتنی شدت کے ساتھ ان مسائل کے پیدا ہونے کا کم از کم ایک سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کی جدید نسلوں کو دو سو برس سے صرف ایک ہی

تعلیم دی جارہی ہے، اور وہ جہاد ہے۔ ہر لکھنے اور بولنے والا صرف جہاد کو گلوریفائی کرنے میں مشغول ہے۔ کوئی بھی نہیں جو صبر، اعراض اور مفاہمت کی قدروں کو جانے اور اس کو امت کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ امت کا مزاج یہ بن گیا ہے کہ مسائل کو حل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ جہاد اور ٹکراؤ ہے۔ چنانچہ آدمی جب کسی مسئلہ سے دوچار ہوتا ہے، خواہ وہ گھر کے باہر ہو یا گھر کے اندر، تو فوراً جہادی تدبیریں اس کے ذہن میں آنے لگتی ہیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ اس صورت کو بدلا جائے اور لوگوں کو صبر و اعراض اور حسن تدبیر کی قدروں سے آشنا کرایا جائے۔

برمنگھم میں علماء کی ایک مجلس میں ایک بزرگ نے سوال کیا کہ اردو خواں طبقہ یا انگریزی خواں طبقہ میں تو آپ کا مشن پھیل رہا ہے۔ عرب دنیا میں اس کو کس حد تک قبولیت حاصل ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ پچھلے چند سالوں میں عرب نوجوانوں میں یہ مشن تیزی سے پھیلا ہے اور پھیلتا جارہا ہے۔ اسی لئے میں یہاں سے قاہرہ جارہا ہوں۔ کیوں کہ وہاں عرب نوجوان جمع ہوں گے۔ انھوں نے شدت سے اس کی خواہش ظاہر کی ہے۔

میں نے کہا کہ عرب نوجوانوں میں اس مشن کے پھیلنے کی خاص وجہ ہے۔ آپ لوگوں کو اگر عرب دنیا کے داخلی حالات کا علم ہو تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام کی سیاسی تفسیر عرب دنیا میں تیزی سے پھیلی۔ اس کے نتیجہ میں عرب دنیا کے اسلام پسندوں اور وہاں کی حکومتوں کے درمیان ٹکراؤ ہوگیا۔ کیوں کہ سیاسی اسلام کا نظریہ براہ راست طور پر موجودہ عرب حکمرانوں کے نظام سے ٹکراتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہر عرب ملک میں "اسلام پسند" حضرات کی تعذیب شروع ہوگئی جو تاحال جاری ہے۔

اس صورت حال کے نتیجہ میں عرب نوجوانوں کے لئے صرف دو میں سے ایک کا انتخاب رہ گیا تھا۔ یا تعذیب یا منافقت۔ اگر وہ اپنے نظریہ کے مطابق رہنا چاہیں تو حکمرانوں کے شدید عتاب کا شکار بنیں۔ اور اگر اپنے نظریہ کو اپنے اندر چھپائیں تو منافق بن کر زندگی گزاریں۔ اس کے بعد جب ان کا تعارف الرسالہ مشن سے ہوا تو ان پر منکشف ہوا کہ ہم کو نہ عذاب سہنے کی ضرورت ہے اور نہ منافق بننے کی۔ خیر الامور اوسطہا کے اصول کے مطابق یہاں ان کے لئے ایک تیسری صورت

موجود ہے جو زیادہ بہتر اور زیادہ صحیح ہے۔ چنانچہ وہ الرسالہ مشن کو دل وجان سے قبول کر رہے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہندستان میں اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کی سازشیں ہو رہی ہیں، اس کے لئے آپ کیا کر رہے ہیں۔ یہ گفت گو رات کے وقت ہو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی کہے کہ دنیا میں اندھیرا چھا رہا ہے، اس کو دور کرنے کے لئے آپ کیا کر رہے ہیں۔ بظاہر اس وقت اندھیرا ہے، مگر دوسرا اس سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ پورا کائناتی نظام اس اندھیرے کو ختم کرکے دوبارہ صبح طلوع کرنے کی طرف متحرک ہے۔ پھر آپ اندھیرے کے خلاف احتجاج کیوں کریں۔ آپ آنے والی صبح کو سوچ کر اللہ کا شکر کیوں نہ کریں۔

میں نے کہا کہ اس دین کے ساتھ اللہ نے محفوظیت (الحجر ۹) کا معاملہ کیا ہے۔ اس معاملہ کی نشانیاں آپ ساری تاریخ میں دیکھ سکتے ہیں۔ تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاریوں نے اسلام اور مسلمانوں کو مٹانا چاہا۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ خود تاتاری دین کے خادم بن گئے۔ بیسویں صدی میں اتاترک اور عصمت انونو نے ترکی سے اسلام کو ختم کرنا چاہا۔ مگر دو نسلوں تک حکومت کی ساری طاقت ختم کرنے کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ عصمت انونو (۱۹۷۳-۱۸۸۴) نے انتقال کے وقت کہا کہ میں نے اپنی زندگی میں یہ عجیب چیز دیکھی کہ ہم نے ترکی میں سیکولرزم کا پودا بویا مگر جب پھل نکلا تو وہ اسلام تھا۔

یہی معاملہ ہندستان میں ہو رہا ہے۔ لوگوں کے بیان کے مطابق ۱۹۴۷ سے پہلے ہندوؤں نے انڈیا سے مسلمانوں کے وجود کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مگر ساری کوششوں کے بعد یہ حال ہوا کہ ۱۹۴۷ میں غیر منقسم ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد چھ کروڑ تھی۔ آج اسی ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً چوگنا ہو چکی ہے۔ میوات میں کچھ جاہل مسلمان تھے جو چوٹیاں رکھتے تھے اور ہندو رسوم مناتے تھے۔ ہندوؤں نے ان کو شدھی کرکے انھیں دوبارہ ہندو بنانے کی تحریک چلائی۔ اس کے جواب میں مولانا الیاس صاحب نے میواتیوں کی دینی اصلاح کی کوشش شروع کی۔ آج یہ حال ہے کہ نہ صرف میواتیوں کی دینی اصلاح ہوئی بلکہ مولانا الیاس صاحب کی اٹھائی ہوئی تحریک ایک عالمی اصلاحی تحریک بن گئی۔ تقسیم کے بعد کچھ ہندوؤں نے اجودھیا کی بابری مسجد پر قبضہ کرلیکی

کوشش کی۔ اس کے بعد مسلمانوں میں یہ ذہن پیدا ہوا کہ اجودھیا کی مسجد میں ہندوؤں کو داخلہ کا موقع اس لئے ملا کہ وہ غیر آباد تھی۔ کیوں کہ خانۂ خالی را دیو می گیرد۔ اس احساس نے دوسری مسجدوں کی آبادی کا ذہن پیدا کیا۔ آج ہندستان کی تین لاکھ سے زیادہ مسجدیں مزید بہت زیادہ آباد اور پر رونق ہو چکی ہیں۔

پھر جب حالت یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہر سازش برعکس طور پر خود اسلام اور مسلمانوں کی ترقی کا باعث ہوتی ہے تو ہم کو لوگوں کی سازش پر پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔

چیزل ہرسٹ کے پروگرام سے فارغ ہونے کے بعد نیوہیم نارتھ (Newham North) کے لئے روانگی ہوئی۔ اس سفر کے درمیان لندن کا مشہور دریائے ٹیمز پڑتا ہے۔ اس دریا کے نیچے سے لمبی سرنگ بنا کر راستہ نکالا گیا ہے۔ اس کے اندر سے ہماری گاڑی گزری تو عجیب احساس ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کیسی کیسی قوتیں عطا فرمائی ہیں۔ وہ نہ صرف دریا کے اوپر کشتی کے ذریعہ سفر کرتا ہے۔ بلکہ دریا کے نیچے سے سڑک نکال کر خشکی کا راستہ بنا سکتا ہے۔ اوپر دریا بہہ رہا ہے اور نیچے سے کاروں کے قافلے گزر رہے ہیں۔

۲۷ ستمبر کی صبح کو ہم گھر سے نکلے کہ نیوہیم نارتھ (گرین اسٹریٹ) کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھیں۔ یہ صبح ۶ بجے کا وقت تھا۔ وہاں پہنچے تو اس کے دونوں دروازوں پر تالا لگا ہوا تھا۔ اوپر انگریزی میں لکھا ہوا بورڈ دکھائی دے رہا تھا: دی مسلم کمیونٹی سنٹر۔ کچھ دیر تک سڑک پر کھڑے ہو کر انتظار کیا کہ شاید کوئی صاحب آ رہے ہوں اور مسجد کا دروازہ کھولیں۔ مگر کوئی صاحب نہیں آئے۔ چنانچہ واپس آ کر اپنی قیام گاہ پر فجر کی نماز ادا کی۔

۲۷ ستمبر کو اتوار کا دن تھا۔ صبح ہوئی تو مجھے سو سال پہلے کی انگریزی کتاب یاد آئی جس کو میں نے تقریباً پچاس سال پہلے پڑھا تھا۔ یہ بچوں کی کتاب تھی۔ اس میں لندن کی صبح کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ الفاظ لکھے گئے تھے ـــــ لندن کے گھنٹے بجنے لگے:

The bells of London begun to ring.

میں نے سننے کی کوشش کی تو لندن کے گھنٹوں کی آواز مجھے سنائی نہ دی۔ البتہ اس کے بجائے سڑک سے گزرنے والی کاروں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ لندن کے یہ گھنٹے

لندن کے چرچ کے گھنٹے تھے۔ سو سال پہلے صبح کے وقت سب سے زیادہ عام آواز یہاں کے چرچ کے گھنٹوں کی آوازیں تھیں۔ مگر صنعتی دور نے حالات میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ اب عبادت خانوں کی اہمیت گھٹ گئی اور اس کے بجائے مشینوں کی اہمیت زیادہ ہو گئی۔

لندن میں چھوٹی بڑی تقریباً ۷۰۰ مسجدیں ہیں۔ میری قیام گاہ کے قریب ایک مسجد تھی۔ اس سے بالکل متصل ایک مکان تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ مکان ایک انگریز کا تھا۔ وہ مکان بیچنا چاہتا تھا۔ کئی انگریز اس کو خریدنے کے لئے آئے۔ انھیں میں سے ایک مسلمان بھی تھا جو مسجد کی توسیع کے لئے اس مکان کو خریدنا چاہتا تھا۔ انگریز نے اپنے ہم قوموں کو مکان نہیں دیا۔ اس نے اپنا مکان مسجد والوں کو دے دیا اور کہا کہ آپ لوگ اس کو مسجد میں شامل کر کے مسجد کی توسیع کریں۔ یہ میرے لئے زیادہ خوشی کی بات ہے کہ میرا مکان آئندہ ایک عبادت خانہ کا حصہ بن جائے۔ میں نے خود جا کر اس مسجد اور اس مکان کو دیکھا۔

لندن میں مجھے بون (جرمنی) سے مسٹر فاروق جنگ کا ٹیلی فون ملا۔ انھوں نے پہلے ہی سے اس سفر میں مجھے جرمنی آنے کی دعوت دی تھی۔ انھوں نے یہ انتظام کیا تھا کہ بروسیلز سے بذریعہ کار مجھ کو بون لے جائیں۔ مگر بعض وجوہ سے میں ایسا نہ کر سکا۔

ذاتی طور پر میں جرمنی جانے کا خواہش مند تھا۔ خاص طور پر میں برلن وال کو دیکھنا چاہتا تھا۔ جو اب ٹوٹ کر ختم ہو چکی ہے۔ برلن وال ایک سو میل لمبی تھی جو مشرقی برلن کو مغربی برلن سے جدا کرتی تھی۔ یہ سیمنٹ کنکریٹ سے سابق سوویت یونین کے زیر حکم بنائی گئی تھی۔ ونسٹن چرچل نے اس کو آہنی پردہ (Iron Curtain) کا نام دیا تھا دیا تھا۔ برلن وال اگست ۱۹۶۱ میں بنائی گئی تھی۔ اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ مشرقی جرمنی سے بھاگ کر مغربی جرمنی میں داخل ہونے والوں کو روکا جائے:

> It was built in August 1961, mainly with the aim to contain the massive exodus of East Germans to the West.

مگر ۹ نومبر ۱۹۸۹ کی رات کو برلن وال ہمیشہ کے لئے توڑ دی گئی۔ حتی کہ مشرقی جرمنی اور مغربی جرمنی کی تقسیم بھی ختم ہو گئی۔ دونوں مل کر ایک ملک بن گئے اور ایک حصہ کے لوگوں کے لئے دوسرے حصہ کی طرف جانے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔

اس دنیا میں تمام فیصلے خدا کی طرف سے کئے جاتے ہیں، اور جب خدا کا فیصلہ آتا ہے تو تمام انسانی نشانات اس طرح مٹ جاتے ہیں جیسے کہ وہ ایک تنکا تھا جو طوفان کی رو میں بہہ گیا۔

پروفیسر انیس قاری نے بتایا کہ یہاں لوگ مسلمان ہوتے رہتے ہیں۔ اور اکثر بظاہر معمولی سی چیز ان کے قبول اسلام کا سبب بن جاتی ہے۔ مثلاً ایک انگریز نے اسلام قبول کیا۔ قاری صاحب نے اس سے پوچھا کہ تم نے کیوں اسلام قبول کیا۔ اس نے کہا کہ اسلام کی ایک چیز نے مجھ کو بہت متاثر کیا، اور وہ پانچ وقت وضو (5 time ablution) ہے۔ میں نے سوچا کہ وہ مذہب کتنا اچھا ہوگا جو آدمی کو روزانہ پانچ وقت صفائی کرنا سکھائے۔ ایک اور نومسلم سے انھوں نے پوچھا اس نے بتایا کہ میں نے قرآن کو دیکھا تو میں نے پایا کہ اس میں کوئی سورہ محمد کی فیملی (عائشہ، فاطمہ) کے نام پر نہیں ہے۔ جب کہ قرآن کی ایک پوری سورہ کا نام مریم ہے۔ یہ چیز مجھ کو قرآن کے دین کی طرف لانے کا سبب بنی۔

پارک روڈ کی مرکزی مسجد کے بورڈ پر انگریزی روزنامہ سن (The Sun) کے شمارہ ۲۲ ستمبر ۱۹۹۲ کے ایک صفحہ کی فوٹو کاپی لگی ہوئی تھی۔ اس باتصویر رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ برطانی ایکٹرس میریا بیکر پالین (Maria Baker Pawline) کی ۲۸ سالہ لڑکی لوئی پالین (Louise Pawline) نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ وہ حجاب کے ساتھ اسلامی لباس پہنتی ہے اور گھر کے اندر رہ کر اپنے گیارہ سالہ بچہ کی تربیت اور نگہداشت میں وقت گزارتی ہے۔ اس نے ایک مصری طالب علم ممدوح بریکہ (۳۵ سال) سے نکاح کر لیا ہے۔ اسکاٹ لینڈ کے ایک چھوٹے مکان میں دونوں بالکل سادہ زندگی گزارتے ہیں۔ دونوں پنج وقتہ نماز ادا کرتے ہیں خبر کی سرخی ان الفاظ میں تھی کہ بیٹی نے اپنی ماں کا مذہب چھوڑ دیا:

Louise turns her back on mum's faith.

میں نے اس خبر کو پڑھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ حدیث رسول موجودہ زمانہ میں واقعہ بن رہی ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ زمین کی سطح پر کوئی چھوٹا یا بڑا گھر نہیں بچے گا مگر یہ کہ اللہ اسلام کے کلمہ کو اس میں داخل کر دے گا۔

دی سنڈے ٹیلی گراف (لندن) میں ایک مضمون پڑھا۔ اس پر لکھنے والے کا نام فرانسس ویش

(Frances Weich) درج تھا۔ یہ مضمون مسٹر نراد چودھری کے بارہ میں تھا۔ نراد چودھری ۱۸۹۷ میں بنگال میں پیدا ہوئے۔ ان کو انگریزی لٹریچر سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ ۱۹۵۵ میں وہ پہلی بار انگلینڈ گئے۔ پچھلے ۲۲ سال سے وہ مستقل طور پر یہاں ہیں اور آکسفورڈ کے قریب ایک گاؤں میں رہتے ہیں۔ وہ ان چند ہندستانیوں میں سے ایک ہیں جن کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ وہ پرفکٹ انگلش لکھتے ہیں۔ اپنے مضامین اور کتابوں کے ذریعہ ان کو جو محدود آمدنی ہوتی ہے، اسی پر وہ گزر کرتے ہیں اور حد درجہ سادہ زندگی گزارتے ہیں۔

حال ہی میں انھوں نے آکسفورڈ میں ایک تقریر کی۔ تقریر کا موضوع تھا کہ برطانیہ میں تہذیب کے زوال کا سبب کیا ہے۔ وہ ڈائس پر کھڑے ہوئے۔ اپنے منھ سے اپنا مصنوعی دانت نکالا اور اس کے بعد حاضرین سے سوال کیا کہ اپنے یہ دانت میں نے کیوں کھو دئے:

Why have I lost my teeth?

یعنی یہ سادہ طور پر عمر کا معاملہ ہے۔ ایک فرد بوڑھا ہونے پر اپنے دانت کھو دیتا ہے، اسی طرح قومیں لمبی مدت گزرنے کے بعد عروج کا مقام کھو دیتی ہیں۔ یہ فطرت کا ایک قانون ہے، اور برطانیہ اس وقت اسی قانون فطرت کی زد میں ہے۔

لندن میں پروفیسر انیس قاری نے بتایا کہ ایک انگریز ان کا ملاقاتی ہے۔ اس کا نام ڈاکٹر مارٹن (Dr Martin) ہے۔ وہ اچھی اردو جانتا ہے۔ حتی کہ اس نے ایم اے اور ڈاکٹریٹ اردو میں کیا ہے۔ قاری صاحب نے اس سے پوچھا کہ تم نے اردو کیسے پڑھی۔ اس نے بتایا کہ نوجوانی کی عمر میں جاب کی تلاش میں بریڈفورڈ گیا۔ وہاں میں نے ایک مسلمان کا مکان کرایہ پر لیا۔ یہ پاکستان (میرپور) سے آیا ہوا ایک مسلمان تھا۔ معمولی پڑھا لکھا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ابھی میرے پاس جاب نہیں ہے تو اس نے مجھ سے کرایہ بھی نہیں مانگا۔ اس نے کہا کہ جب جاب مل جائے تو کرایہ دے دینا۔ اگلے مہینہ مجھے جاب مل گیا تب بھی اس نے مجھ سے کرایہ نہیں لیا۔ اس نے کہا کہ ابھی تم کو پہلی تنخواہ ملی ہے۔ تم کو کام ہوگا، تم اپنا کام چلاؤ۔ آئندہ مجھے دیدینا۔

مسلمان کے اس غیر معمولی سلوک کا ڈاکٹر مارٹن پر بہت اثر پڑا۔ انھوں نے سوچا کہ مجھے اس زبان کو پڑھنا چاہئے جو اس عجیب آدمی کی زبان ہے۔ تاکہ اس کے کلچر سے مجھے واقفیت ہو۔ چنانچہ

وہ پاکستان اور انڈیا گئے۔ انھوں نے باقاعدہ داخلہ لے کر اردو پڑھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹریٹ تک اردو پڑھ ڈالی۔ اب وہ برطانیہ کے کسی تعلیمی ادارہ میں اردو کے استاد ہیں۔

ہندو اور مسلمان اور سکھ بڑی تعداد میں برطانیہ میں آباد ہیں۔ یہاں کے مادی فائدے ان کو یہاں لائے اور انھوں نے یہاں کی شہریت اختیار کر لی۔ مگر ہر ایک کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کی اگلی نسل اپنے آبائی مذہب اور کلچر سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ یہ صورت حال ہر ایک کو پریشان کئے ہوئے ہے۔ یہاں کی مادی کشش انھیں برطانیہ چھوڑنے میں مانع بن رہی ہے۔ اسی کے ساتھ اپنے بچوں کے تہذیبی مستقبل کے بارہ میں وہ مستقل طور پر تردد میں رہتے ہیں۔

اس کا حل تینوں فرقوں نے یہ نکالا ہے کہ وہ اپنے اپنے اسکول کھول رہے ہیں۔ کتابیں چھاپ رہے ہیں۔ اپنے بچوں کو اپنے قدیم کلچر پر باقی رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر مجھے اس کوشش کا کوئی واقعی مستقبل نظر نہیں آتا۔ میں نے ایک صاحب سے کہا: کلچرل سیلاب کا مقابلہ آپ لوگ کلچرل تحفظ سے کرنا چاہتے ہیں۔ مگر تحفظ کی تدبیر کبھی اقدامی یلغار کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اگر سابق سوویت یونین کی طرح یہاں جبر ہو رہا ہوتا تو آپ کامیاب ہو سکتے تھے۔ مگر یہاں تو آپ کی نسلیں خود اپنی رغبت سے مغربی کلچر کی طرف دوڑ رہی ہیں۔ ایسی حالت میں آپ کی روایتی قسم کی تحفظاتی کوشش کس طرح موثر ہو سکتی ہے۔

۲۷ ستمبر کولندن سے واپسی تھی۔ پروفیسر انیس فاری کے ساتھ ایرپورٹ کے لئے روانہ ہوا۔ انھوں نے سیدھے ایئرپورٹ جانے کے بجائے مختلف راستے اختیار کئے تاکہ لندن کے اہم مقامات دیکھے جا سکیں۔ ہماری گاڑی مختلف راستوں سے گزر رہی تھی اور پروفیسر انیس فاری سڑک کے دونوں طرف کھڑی ہوئی بلڈنگوں کا تعارف کراتے جا رہے تھے ــــــ یہ ٹاور برج ہے، یہ ۱۰ ڈاوننگ اسٹریٹ ہے، یہ پارلیمنٹ ہاؤس ہے، یہ بگ بینگ ہے، یہ بکنگھم پیلس ہے، یہ ہائڈ پارک ہے، یہ ہیرڈس (Harrods) ہے، یہ البرٹ وکٹوریہ میوزیم ہے، یہ اسماعیلی سنٹر ہے، یہ امپیریل سائنس کالج ہے، یہ آکسفورڈ اسٹریٹ ہے، یہ برٹش میوزیم ہے، یہ لندن یونیورسٹی ہے، یہ سائنس میوزیم ہے، یہ اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز ہے، یہ لندن پلے نیٹیریم ہے، یہ گاندھی گارڈن ہے، یہ ریجنٹ پارک ہے، یہ چڑیا گھر ہے۔ اس طرح وہ ایک ایک چیز بتا رہے تھے اور

میرا ذہن مسلسل ان کے الفاظ کو اپنی یادداشت سے وابستہ کرتے ہوئے انھیں سمجھتا جا رہا تھا۔
میں نے سوچا کہ دین فطرت کی دعوت کا معاملہ بھی یہی ہے۔ ہر آدمی کے لاشعور میں خدا کے دین کا تصور پیشگی طور پر موجود ہے۔ جب ایک داعی خدا کے دین کو بے آمیز روپ میں پیش کرتا ہے تو انسان محسوس کرتا ہے کہ یہ عین وہی چیز ہے جس کا تصور پہلے سے میرے ذہن میں موجود تھا۔ اپنے تصور اور خارجی واقعہ کی یہ مطابقت اس کے لاشعور کو شعور بنا دیتی ہے، وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ اس کا اعتراف کرکے خدا کے بندوں میں شامل ہو جائے۔
راستہ میں ایسٹ لندن کی مسجد تھی۔ عین سڑک کے کنارے کافی بڑی اور شاندار مسجد ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ پارک روڈ پر پہنچے تو وہاں لندن کی مرکزی مسجد تھی۔ یہ مسجد اور مرکز عربوں نے تعمیر کرایا ہے۔ یہاں ٹھہر کر اندر داخل ہوئے۔ یہ بہت بڑے رقبہ میں واقع ہے۔ مسجد کا اندرونی حصہ جو ایک بڑے گنبد کے نیچے ہال کی مانند ہے، اس کو میں نے ناپا تو ایک طرف ۳۶ قدم اور دوسری طرف ۴۰ قدم تھا۔
یہاں دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھی۔ نماز پڑھتے ہوئے ایک عجیب احساس ہوا۔ میرے دل نے کہا کہ تحیۃ المسجد دراصل تحیۃ الخالق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی دنیا کے مناظر سے گزر رہا ہے۔ اس کے بعد اس کے سامنے مسجد آتی ہے جو خدا کا عبادت خانہ ہے۔ اس وقت مسجد گویا خاموش زبان میں کہتی ہے کہ خدا کے عظمت و جلال کا اعتراف کرو۔ اس احساس اعتراف کو لئے ہوئے آدمی مسجد کے اندر داخل ہوتا ہے اور بے تابانہ طور پر خدا کے سامنے گر جاتا ہے۔
مسجد کے صحن میں دو ٹرک کھڑے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ اس پر عطیہ کے کپڑے اور کمبل لدے ہوئے ہیں اور وہ بوسنیا کے ستم رسیدہ مسلمانوں کے لئے بھیجے جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ بوسنیا کے حادثہ کے بعد ساری دنیا کے مسلمانوں نے جتنے بڑے پیمانہ پر اپنی ہمدردی کا اظہار کیا ہے، اگر یہی ہمدردی وہ اس سے پہلے بوسنیا میں تبلیغ کے لئے کرتے تو وہاں کے مسلمانوں کی تعداد ۴۳ فیصد سے بڑھ کر شاید ۸۳ فیصد ہو جاتی اور پھر اس قسم کے حادثہ کی جڑ کٹ جاتی۔ مگر مسلمان قومی جذبہ کے تحت خرچ کرنا جانتے ہیں، وہ دعوتی جذبہ کے تحت خرچ کرنا نہیں جانتے۔
۲۷ ستمبر کو برٹش ایرویز کی فلائٹ ۱۵۵ کے ذریعہ لندن سے قاہرہ روانہ ہونا تھا۔ ساری

کارروائی معمول کے مطابق ہوئی۔ لندن سے اس جہاز کی روانگی کا وقت شام کو ساڑھے چار بجے تھا۔ مگر آخر وقت میں اعلان کیا گیا کہ ٹکنکل خرابی کے سبب سے یہ جہاز نہیں جا سکتا۔ اس کے بجائے دوسرا جہاز مسافروں کو لے کر یہاں سے جائے گا۔

دوسرے جہاز کی روانگی میں چھ گھنٹہ سے زیادہ تاخیر ہو گئی۔ یہ چھ گھنٹے شدید کیفیات کے عالم میں گزرے۔ یہ گویا الانتظار اشد من الموت کا منظر تھا۔ آخر کار تمام مسافر دوسرے جہاز میں بٹھائے گئے اور ساڑھے چار گھنٹہ کا سفر طے کر کے ہم لوگ قاہرہ کے ہوائی اڈہ پر اتر گئے۔

جہاز زمین سے بلند ہوا تو اسکائی وژن (جہاز کے اندر لگے ہوئے ویڈیو) پر ضروری ہدایات تصویر اور آواز کی صورت میں بتائی جانے لگیں۔ اناؤنسر نے کہا کہ آپ ان ہدایات کو غور سے سنیں، خواہ آپ ہوائی جہاز کے مستقل مسافر کیوں نہ ہوں:

Even if you are a regular traveller.

میں نے سوچا کہ دوسری تمام چیزوں کا معاملہ بھی یہی ہے۔ جب کوئی بات بتائی جائے تو اس کو اس لئے نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ اس کو آپ اس سے پہلے سن چکے ہیں۔ بلکہ اس طرح سننا چاہئے گویا کہ آپ اس کو پہلی بار سن رہے ہیں۔ جن لوگوں کے اندر یہ صلاحیت ہو وہی شعور کی اعلیٰ ترقی کو پا سکتے ہیں۔

جہاز ۳۳ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑ رہا تھا۔ میں نے اپنی سیٹ کے خانہ سے برٹش ایرویز کا فلائٹ میگزین ہائی لائف (High life) نکالا۔ یہ ستمبر ۱۹۹۲ کا شمارہ تھا۔ اس میں "ورلڈ ٹریول نیوز" کے عنوان کے تحت تاج محل کی تصویر تھی۔ یہ اس عمارت کی ایک خصوصی تصویر تھی اور اس کے نیچے لکھا ہوا تھا:

Photo: courtesy of British Airways — Image Bank.

یعنی تاج محل کا یہ فوٹو ہائی لائف نے برٹش ایرویز کے امیج بینک (تصویری ذخیرہ) سے حاصل کیا ہے۔ یہ باتوں کو خوبصورت الفاظ میں کہنے کا زمانہ ہے۔ اوپر کا فقرہ اس کی ایک مثال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ایک نئے فتنہ کا اضافہ ہوا ہے، یہ الفاظ کا فتنہ ہے۔ بہت زیادہ باشعور آدمی ہی اس فتنہ سے بچ سکتا ہے۔

قاہرہ ایرپورٹ پر کچھ عرب حضرات موجود تھے۔ ان کے ساتھ روانہ ہوکر جدید قاہرہ پہنچا۔ اس وقت ۲۸ ستمبر کا سورج نکل چکا تھا۔ سفر اگر معمول کے مطابق طے ہوتا تو میں ۲۷ ستمبر کو عشاء کی نماز قاہرہ میں پڑھتا مگر جہاز کی خرابی کی وجہ سے ۲۸ ستمبر کی فجر کی نماز کے وقت بھی میں قاہرہ نہ پہنچ سکا۔

کرسٹوفر کولمبس یورپ اور انڈیا کے درمیان بحری راستہ معلوم کرنے کے لئے نکلا۔ مگر اس کا سمندری جہاز بھٹک کر امریکہ کے ساحل پر پہنچ گیا۔ وہ یورپ سے انڈیا آنے کا راستہ تو معلوم نہ کرسکا۔ مگر اس نے نئی دنیا (امریکہ) کو معلوم کرلیا۔ یہ ۱۲ اکتوبر ۱۴۹۲ کا واقعہ ہے۔

آج کولمبس کے نام کے ساتھ یہ لکھا جاتا ہے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے امریکی برّاعظم کو دریافت کیا۔ مگر کولمبس کی اپنی زندگی میں اس کو کوئی عظمت یا قدر دانی حاصل نہ ہوسکی۔ یہاں تک کہ ۲۰ مئی ۱۵۰۶ کو وہ مایوسی اور رنج نامی کی حالت میں اسپین کے ایک مقام پر مرگیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ پندرہویں صدی کے یورپی تاجروں کی اصل خواہش یہ تھی کہ وہ انڈیا پہنچنے کا آسان راستہ معلوم کریں۔ کیوں کہ انڈیا کو وہ اپنی تجارت کے لئے بہت مفید سمجھتے تھے۔ انڈیا سے وہ تمباکو، سونا اور مسالہ وغیرہ لے کر جاتے تھے اور اس کو فروخت کرکے بڑے بڑے منافع حاصل کرتے تھے۔ اس وقت امریکہ سے تجارتی فائدے قائم نہیں ہوئے تھے۔ یورپی تاجروں کے لئے اس وقت امریکہ کی دریافت صرف ایک بے فائدہ دریافت کے ہم معنی تھی۔

کولمبس کے بعد واسکوڈی گاما بھی انڈیا کا بحری راستہ تلاش کرنے کے لئے نکلا۔ اس کا جہاز ۲۰ مئی ۱۴۹۸ کو کالی کٹ کے ساحل پر پہنچ گیا۔ اس نے ہندستان کا سمندری راستہ دریافت کرلیا۔ اس کے بعد یورپ میں واسکوڈی گاما کو تو ہیرو کا مقام حاصل ہوگیا۔ اور کولمبس کے متعلق یہ تصور ہوگیا کہ وہ ایک بے وقوف آدمی ہے۔ برسوں کی محنت کے بعد بھی وہ حقیقی معنوں میں کوئی نفع بخش چیز حاصل نہ کرسکا۔

ایک اخبار میں کولمبس کے تذکرہ کے تحت لکھا تھا کہ اس کی موت کو کسی نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ سولھویں صدی کے وسط تک بھی اس کی دریافت کی اہمیت سمجھی نہ جاسکی۔ یہاں تک کہ

وہ وقت آیا جب میکسیکو، پیرو اور دوسرے علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد جہاز سونا اور چاندی لے کر اسپین آنے لگے:

His death went unnoticed. Not until the middle of the 16th century was the importance of his discoveries realised. With the conquest of Mexico, Peru and other areas, fleets of gold and silver started arriving in Spain.

تاریخ کا یہ صفحہ مجھے اس وقت یاد آیا جب میں نے دیکھا کہ آج یورپ میں ساری اہمیت امریکہ کے لئے ہے۔ جدید یورپ میں انڈیا کو کسی بھی اعتبار سے کوئی مقام حاصل نہیں۔

لندن کا روزنامہ دی سنڈے ٹیلی گراف (۲۷ ستمبر ۱۹۹۲) دیکھا۔ اس کے صفحہ ۱۱ پر ایک مضمون تھا۔ اس کا لکھنے والا راجر کوپر (Roger Cooper) تھا جو پانچ سال سے زیادہ مدت تک ایران کی قید میں رہ چکا ہے۔ اس نے برائن کینان کی کتاب کا تعارف کرایا تھا۔ کینان ایک آئرش ہے۔ وہ بھی لبنان کے ایران نواز مسلمانوں کی قید میں رہا ہے۔ اور اس سے رہائی کے بعد اپنی یادداشت لکھ کر شائع کی ہے:

Brian Keenan, An Evil Cradling, Hutchinson.

کینان پیشہ کے اعتبار سے ہیٹنگ انجینئر ہے۔ بیروت میں اس کو آفس کے راستہ سے اغوا کر لیا گیا۔ اس کے بعد وہ، کتاب کے مطابق، مسلم کیپٹرس کے ہاتھوں انسانی درندگی (man's brutality) کا تجربہ کرتا رہا۔ اس مضمون کا عنوان تھا — جہنم کی طرف سفر اور اس سے واپسی:

A journey to hell and back again

میں نے اس کو پڑھ کر کہا کہ یہ نام نہاد اسلام پسند اگر اس قسم کے مسلمان ہوتے جیسا کہ دور نبوت میں مدینہ کے مسلمان تھے تو قیدیوں کا بیان اس کے برعکس ہوتا۔ ایسی حالت میں یہ قیدی وہاں سے واپس آنے کے بعد کہتے کہ ہم تو ان کے یہاں گویا جنت میں تھے، اب ہم اپنے ملک میں واپس آئے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی جہنم میں پہنچ گئے ہیں۔

۲۸ ستمبر کو ظہر کی نماز قاہرہ کی مسجد ابی بکر الصدیق (شارع عبد العزیز فہمی) میں پڑھی۔

اس پر تعمیر کا سن ۱۹۵۷ لکھا ہوا تھا۔ مسجد کشادہ تھی۔ مسجد سے متصل ایک کمرہ تھا جس میں امام کا دفتر تھا۔ اس میں میز کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میز کے اوپر ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ نمازیوں کی اکثریت کے سر پر ٹوپی نہ تھی۔ امام نے نماز ختم کی تو اجتماعی دعا کے بغیر اٹھ کر اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ اس قسم کی چیزیں ہندستان میں اجنبی سمجھی جائیں گی۔ مگر عرب دنیا میں اس قسم کی چیزیں عام ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہی جھگڑے صرف برصغیر ہند میں پلئے جاتے ہیں۔ عالم عرب میں اس قسم کے جھگڑوں کا کوئی وجود نہیں۔

اس فرق کی وضاحت کرتے ہوئے کچھ عرب حضرات سے میں نے کہا کہ عبادت میں کچھ ارکان ہیں اور کچھ آداب۔ ارکان میں کوئی اختلاف نہیں۔ مگر آداب کے بارہ میں صحابہ کی روایتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ جب احادیث جمع کی گئیں اور یہ اختلافات سامنے آئے تو محدثین نے ان کو توسع پر محمول کیا اور کہا کہ اِس پر عمل کرلو تب بھی ٹھیک ہے، اور اُس پر عمل کر لو تب بھی ٹھیک ہے۔ مگر فقہاء نے کہا کہ الحق لا یتعدد (حق کئی نہیں ہو سکتا) اس وقت عالم اسلام، بڑی تقسیم میں دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ عرب ملکوں میں محدثین کا نقطۂ نظر مقبول ہوا۔ اور برصغیر ہند میں فقہاء کا نقطۂ نظر پھیلا۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ میں محدثین کا نقطۂ نظر ہی درست ہے۔ اور اگر عرب دنیا کی طرح برصغیر میں بھی محدثین کا نقطۂ نظر آجائے تو تمام غیر ضروری جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں۔

قاہرہ میں عربوں کی ایک مجلس تھی۔ ایک صاحب نے کہا کہ قرآن لغتِ عرب میں اترا۔ اور حدیث کی زبان عربی ہے۔ میں نے کہا کہ اکثر علماء اس قسم کی باتیں کہتے ہیں۔ مگر زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ قرآن لغتِ انسان میں اترا۔ لغتِ انسان میں لغتِ عرب شامل ہے۔ مگر لغتِ عرب میں لغتِ انسان شامل نہیں۔

پھر میں نے کہا کہ لغت عرب لغت الفاظ ہے اور لغت انسان لغت معانی۔ مثلاً آپ حدیث میں پڑھتے ہیں: من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ۔ لغت عرب کا تصور ذہن میں ہو تو یہاں آپ قول کو تلفظ کے معنی میں لے لیں گے۔ کیوں کہ قال کا مطلب یہی ہے۔ لیکن اگر لغت انسان کا تصور ذہن میں ہو تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ آدمی جب اللہ کے الٰہ واحد

ہونے کی حقیقت دریافت کرلے اور اس کا اظہار اپنی زبان سے کرے تو وہ ایک زلزلہ خیز تجربہ کالسانی اظہار ہوتا ہے نہ کہ محض کچھ حروف کا تلفظ۔

اسی طرح بخاری کے آخر میں جب آپ پڑھیں گے کہ کلمتان خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان تو اس کو لغت عرب میں سمجھنے کی صورت میں آپ اس کو لفظی ورد کے طور پر لے لیں گے۔ مگر جب آپ اس کو لغت انسان کے طور پر لیں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ اللہ کی عظمت و قدوسیت کا ادراک ایسی چیز ہے جو روح انسانی میں ہلچل پیدا کر دینے والا ہے۔ ایسی حالت میں مذکورہ کلمہ سادہ طور پر صرف تلفظ نہیں ہوسکتا۔ بلکہ وہ ایک روحانی انقلاب کا لفظوں میں ڈھل جانا ہے۔

قاہرہ کے قیام میں یہاں کی کوئی چیز دیکھنے کے لئے نہ جاسکا۔ سارا وقت عربوں کے ساتھ گفت گو اور سوال و جواب میں گزرا۔ ایک عرب نوجوان جو الرسالہ مشن سے گہرے طور پر متاثر ہیں انھوں نے کہا کہ الرسالہ مشن سے واقفیت سے پہلے ہمارے ذہنوں پر سازش کے انداز میں سوچنے کا طرز فکر چھایا ہوا تھا (کانت تسیطر علینا فکرۃ المؤامرۃ) مگر اب ہم خدا کے فضل سے اس فکری مصیبت سے نکل چکے ہیں۔ اب ہم دعوتی انداز میں سوچتے ہیں۔ اب ہم کو دنیا امکانات اور فُرص سے بھری ہوئی نظر آتی ہے، جب کہ اس سے پہلے یہ دنیا سازشوں اور مشکلات سے بھری ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

عربوں کی ایک مجلس میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ آج کل کچھ حضرات کی پسندیدہ تعبیر یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم اسلام کو مکمل طور پر اختیار کریں۔ یجب علینا ان ناخذ الاسلام ککل) مگر یہ طریقہ سنت رسول سے ثابت نہیں۔ حضرت عائشہ رضؓ کہتی ہیں کہ: ماخُیّر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین الّا اختار ایسرھما۔ اس روایت کے مطابق، اعسر کو چھوڑنا اور ایسر کو لینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا۔ مگر ان لوگوں کا قول اس کے خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو امر میں سے ایک کو لیتے تھے اور یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں بیک وقت دونوں کو لینا چاہئے (فکان الرسول یاخذ احد الامرین وھم یقولون علینا ان نأخذ کلا الامرین)

قاہرہ میں عرب نوجوانوں کا ایک بڑا حلقہ بن گیا ہے جو الرسالہ کے مشن سے گہری شیفتگی رکھتا ہے اور اس کے لئے عملاً کوشاں ہے۔ ان کی مختلف سرگرمیوں میں سے ایک یہ ہے کہ انھوں نے الرسالة للاعلام الدولی (مدينة نصر، قاهرة) کے نام سے ادارہ قائم کیا ہے۔ وہ مستقل طور پر الرسالہ مطبوعات کو عربی میں منتقل کرنے اور اس کو چھاپنے کا انتظام کر رہا ہے۔

(ٹیلی فون: ۲۶۲۲۳۱۰۵، ۲۶۲۸۴۹۹، ۲۶۲۲۴۴۰)

انھوں نے دین کامل کو الدین الکامل کے نام سے ۴۰۰ صفحات پر شائع کیا ہے۔ اسی طرح وہ تقریباً ۲۰ کتابیں چھپوا چکے ہیں اور کئی کتابیں اس وقت زیر تیاری ہیں۔ پمفلٹ کی صورت میں وہ مستقل کتابچے تیار کر کے چھاپ رہے ہیں جن کی تعداد پندرہ تک پہنچ چکی ہے۔

قاہرہ کے ایک ادارہ دار الصحوة للنشر والتوزيع (ٹیلی فون: ۳۷۴۰۰۱۷، ۹۸۷۹۲۴) نے اسلامی مرکز کی مختلف کتابوں کے عربی ترجمے شائع کئے ہیں۔ ۱۹۹۲ میں انھوں نے "خلیج ڈائری" کا عربی ترجمہ (مع اضافہ) شائع کیا ہے جو ۱۲۸ صفحہ پر مشتمل ہے۔ اس کا نام یومیات حرب الخلیج ہے۔ اور اس کا سب ٹائٹل ہے: ليس التاريخ مجرد قصة لاحداث مضت۔ بل التاريخ سجل حافل بالعبر والدروس للحاضر والمستقبل۔

ایک مجلس میں ایک صاحب نے اس حدیث کا تذکرہ کیا کہ من جرّ ازاره خيلاء... میں نے اس کے جواب میں کہا کہ اس حدیث میں کلیدی لفظ خیلاء ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل بری چیز کبر ہے۔ اگر آپ اپنی ازار اوپر باندھیں مگر دوسری چیزوں کی بنیاد پر کبر کی نفسیات آپ کے اندر پائی جائے تو گویا کہ ظاہری صورت نہ ہونے کے باوجود اصل حقیقت آپ کے اندر موجود ہے۔ اس پر حاضرین میں سے ایک عرب نے کہا کہ آج اگر اس بات کو کہنا ہو تو شاید اس طرح کہنا زیادہ بامعنی ہوگا کہ: من اشترى سيارة مرسيدس خيلاء فهو...

۲۹ ستمبر کو عصر کی نماز قاہرہ کی مسجد الامین (شارع اسماعیل صبری باشا) میں پڑھی۔ یہ ایک چھوٹی مگر صاف ستھری مسجد تھی۔ اس کے ایک گوشہ کو منبر کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ مسجد کے اندر دو الماریوں میں مجلد عربی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ کتابیں تفسیر، حدیث، فقہ، علم العقائد وغیرہ سے تعلق رکھتی تھیں۔

وقت ہوا تو امام مصلے پر کھڑا ہوگیا۔ اس نے اقامت کہی، اس کے بعد خود ہی نماز پڑھائی۔ نمازیوں کی تعداد ایک صف سے زیادہ نہ تھی۔ نماز پوری کرنے کے بعد امام نے اپنے دائیں طرف چہرہ کرکے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا اور بائیں طرف السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ اس کے بعد اجتماعی دعا کے بغیر لوگ اٹھ کر چلے گئے۔

برصغیر ہند میں فقہی اختلاف نے ملّت کو مختلف طبقوں میں بانٹ رکھا ہے۔ عالم عرب میں یہ چیز بس موجود نہیں۔ البتہ ایک اور چیز مزید شدت کے ساتھ موجود ہے، اور وہ سیاسی اختلاف ہے۔

ڈاکٹر عبد الحلیم عویس نے کچھ مسلم لیڈروں کا ذکر کیا جنھوں نے اپنے غلط عمل کے ذریعہ ملت کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ مگر مسلمانوں کے درمیان اب بھی ان کو بڑائی کا مقام حاصل ہے۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ مسلمان ایک ایسی قوم ہیں جو اپنے مفسدین کو عظمت کا درجہ دیتے ہیں (امۃ تُعَظِّمُ مفسدیھا)

میں نے کہا کہ یہ غالباً پریس اور ریڈیو اور ٹیلیویژن کے دور کا ظاہرہ ہے۔ اس قسم کے رہنما بڑے بڑے الفاظ بولتے ہیں۔ وہ مظاہراتی قسم کے اقدامات کرتے ہیں۔ اس بنا پر وہ نیوز میڈیا اور الکٹرانک میڈیا میں نمایاں کئے جاتے ہیں۔ اس طرح انھیں اپنی غلط فکری یا غلط کاری کے باوجود شہرت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور جن لوگوں کو ایک بار شہرت حاصل ہو جائے وہ لوگوں کے درمیان ہمیشہ عظمت کا مقام حاصل کر لیتے ہیں۔

یہاں اخوانی فکر کے ایک عرب عالم سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اس زمانہ کا سب سے بڑا فتنہ فصل الدین عن الدولۃ کا مغربی نظریہ ہے۔ یہ دشمنان اسلام کی سازش ہے۔ اس طرح وہ چاہتے ہیں کہ اسلام کو بالکل بے جان کرکے چھوڑ دیں۔ اور دین کی پشت پر سیاسی طاقت کا زور باقی نہ رہے۔ میں ان کی تقریر سنتا رہا۔ پھر میں نے کہا: الفصل بین الدین والدولۃ کعقیدۃ، فلا۔ اما الفصل بین الدین والدولۃ کمنھج فنعم۔

میں نے کہا کہ قرآن وسنت میں بلاشبہ زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق احکام ہیں۔ لیکن اگر دعوت اسلامی کا مطلب یہ ہو کہ اول روز سے پورے دین کو ایک مکمل ریاستی نظام کی حیثیت سے قائم کرنے کی جد وجہد کی جائے تو یہ ایک ایسی تکلیف ہے جس کا مکلف انبیاء کو بھی (بشمول پیغمبر

اسلام) نہیں کیا گیا۔ پھر ہم کو اس کا مکلف کیونکر بنایا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ فہرست احکام کے اعتبار سے مکلف نہیں ہوتا بلکہ اپنی وسع کے اعتبار سے مکلف ہوتا ہے۔ (لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا)

الاہرام قاہرہ کا مشہور اخبار ہے۔ یہ نام ان قدیم عمارتوں کے نام پر ہے جن کو اہرام مصر کہا جاتا ہے اور جو سیاحوں کی خصوصی دلچسپی کا مرکز ہیں۔ نجیب حداد نے لکھا ہے کہ مصر میں دو اہرام ہیں۔ ایک وہ جس کو دیکھنے کے لئے لوگ چل کر اس کے پاس آتے ہیں۔ دوسرا اہرام وہ چل کر دوسروں کے پاس جاتا ہے۔

الاہرام کا شمارہ ۲۷ ستمبر ۱۹۹۲ دیکھا۔ اس کے صفحہ اول پر ایک خبر کا عنوان تھا: احجار الاھرامات وابی الھول ؛ ھل جاءت من الکوکب الاحمر (اہرام اور ابوالہول کے پتھر کیا مریخ سے لائے گئے تھے) امریکہ کے ادارہ ناسا (NASA) نے مصنوعی سیاروں کے ذریعہ مریخ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کی ہیں۔ ان کی بنیاد پر قیاس کرکے یہ خبر بنائی گئی تھی۔ مگر اس قسم کی خبریں محض تفنن کے لئے ہوتی ہیں۔ خالص علمی اعتبار سے ان کی کوئی حقیقت نہیں۔

روزنامہ الاخبار (۲۸ ستمبر) میں ایران کے بارہ میں ایک مضمون تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ایران کا کہنا ہے کہ جزیرہ ابوموسیٰ کے مسئلہ کا حل صرف فوجی طاقت کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کو شکایت نہیں ہونا چاہئے اگر عرب بھی تسلیح کا طریقہ اختیار کریں۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو مغربی ممالک بیک وقت دونوں کی مدد کریں گے۔ کیوں کہ یہ ثابت ہو چکا ہے شیطان اکبر عراق اور ایران دونوں کو ان کی اس جنگ کے دوران مسلح کر رہا تھا جس کو انور سادات نے احمقانہ جنگ قرار دیا تھا (فقد ثبت ان الشیطان الاکبر کان یسلح العراق وایران معاً خلال حربھما الغبیۃ کما وصفھا السادات)

دکتور عبدالحلیم عویس نے گفتگو کے دوران کہا کہ مصر کا شاہی دور (العصر الملکی) موجودہ دور کے مقابلہ میں بہت اچھا تھا۔ اس زمانہ کے حالات میں مصر میں بڑے بڑے اہل علم اور اہل ادب اٹھے۔ اس زمانہ میں مصر علمی اور مادی ترقی پر تھا۔ حتیٰ کہ اسلامی ترقی بھی اس وقت آج سے زیادہ تھی۔ آج مصر ہر لحاظ سے پہلے کے مقابلہ میں کم نظر آتا ہے۔

مگر یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مصر کے شاہی دور کو کس نے ختم کیا۔ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ شاہی دور اس طرح ختم ہوا کہ حسن البنا نے اپنی پرجوش تقریروں کے ذریعہ لوگوں کو اس کے خلاف اکسایا۔ اس کے بعد اسی بنیاد پر جوشیلے نوجوانوں کی ایک جماعت بنی۔ اس حلقہ نے فوجی افسروں کے ساتھ مل کر مصر کے شاہ فاروق کے خلاف وہ منصوبہ بنایا جس کو آجکل کی زبان میں سازش کہا جاتا ہے۔ اس طرح الاخوان المسلمون اور فوجی افسروں نے مشترکہ کوشش سے شاہ فاروق کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور اس کو اور اس کے خاندان کو مصر سے باہر نکال دیا۔

اس کے بعد مصر میں سخت ناگفتہ بہ حالات پیدا ہو گئے۔ اگر اخوانی لیڈر اس کو جانتے تھے تو ان کی سنجیدگی مشتبہ ہوتی ہے، اور اگر وہ اس کو نہیں جانتے تھے تو ان کی قائدانہ صلاحیت مشتبہ ہوتی ہے۔ اب یہ اخوان کے معتقدین کے اوپر ہے کہ وہ دونوں میں سے کس توجیہہ کو اپنے لئے پسند کرتے ہیں۔

شیخ محمد عبدہ (۱۹۰۵ - ۱۸۴۹) مصر کے مشہور عالم اور مصلح تھے۔ ڈاکٹر عبد الحلیم عویس نے ان کے تذکرہ کے ذیل میں بتایا کہ محمد عبدہ نے ابتداءً سید جمال الدین افغانی کے ساتھ سیاسی کام کیا۔ مگر آخر میں وہ اس سے مایوس ہو گئے۔ اس وقت انھوں نے سیاسی کام سے سخت نفرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اللہ کی لعنت ہو سیاست پر اور سیاست دانوں پر اور ہر اس چیز پر جو سیاست کے لفظ سے تعلق رکھتا ہو (قال محمد عبده بعد ان يئس من العمل السياسي مع جمال الدين الافغاني : لعن الله السياسة والساسة وكل ما يتصل بكلمة ساسَ يسُوسُ)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں ایسا ہوا کہ مصر کے ایک بڑے عالم نے جس سیاست پر اس طرح لعنت بھیجی تھی، اسی سیاست کو دوبارہ مصری نوجوانوں نے مزید شدت کے ساتھ اختیار کر لیا اور وہ جماعت وجود میں آئی جس کو الاخوان المسلمون (قائم شدہ ۱۹۲۸) کہا جاتا ہے۔ آخر اس کا سبب کیا ہے۔ مفتی محمد عبدہ کا اظہار لعنت مصری نوجوانوں کو اس ہلاکت خیز سیاست سے روکنے میں کامیاب کیوں نہ ہوا۔

اس کی کم از کم ایک خاص وجہ یہ ہے کہ مفتی محمد عبدہ نے لعنت کی زبان میں تو اس کے خلاف اظہار خیال کیا، مگر وہ دلیل کی زبان میں اس کو لوگوں کے سامنے ثابت نہ کر سکے۔ انسان کو

ایک عمل سے دوسرے عمل کی طرف پھرنے کے لئے ضروری ہے کہ سابقہ عمل کا غلط ہونا اور دوسرے عمل کا صحیح ہونا دلائل سے ثابت شدہ بنا دیا جائے۔ مگر مفتی محمد عبدہ کی بعد کی تحریروں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انھوں نے یہ کام انجام دیا۔ رشید رضا کی کتاب تاریخ الاستاذ الامام الشیخ محمد عبدہ بھی اس سلسلہ میں کوئی واقعی مواد پیش نہیں کرتی۔

۲۹ ستمبر کو قاہرہ میں ایک عرب نوجوان عبد السلام احمد حدود (۳۲ سال) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ تقریباً چار سال (۱۹۹۲ - ۱۹۸۸) الجزائر میں رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پہلے وہاں عمل کی پوری آزادی تھی۔ مسجد کے اندر بھی اور مسجد کے باہر بھی۔ یہ ایک "فرصۃ عظیمۃ" تھی جو کسی اور عرب ملک میں موجود نہیں۔ مگر افسوس کہ ہمارے الجزائری بھائی ان مواقع کو دعوت اور اشاعت اسلام کے لئے استعمال نہ کر سکے۔ بلکہ اس آزادی کو حکام کے خلاف سیاسی تحریک چلانے میں استعمال کیا۔ اس کی وجہ سے الجزائر میں مشکلات پیدا ہو گئیں۔

میں نے کہا کہ مسلم اخبارات میں کثرت سے میں نے الجزائر کے بارہ میں پڑھا ہے۔ مگر تمام مسلم اخبارات صرف کہانی کا نصف ثانی بتلاتے ہیں، وہ کہانی کا نصف اول اپنے قارئین کو نہیں بتاتے۔ یہ قرآن کے الفاظ میں تطفیف ہے۔ ان پر لازم تھا کہ وہ اس طرح لکھیں کہ الجزائر میں دینی عمل کی آزادی تھی۔ مگر ہم نے حکمرانوں سے سیاسی نزاع کی، اس کے بعد آزادی باقی نہ رہی۔ (لقد قرأت کثیرا عن الجزائر فی جرائد المسلمین۔ ولکن کلھم یکتبون عن النصف الثانی۔ وھم لا یکتبون عن النصف الاول۔ فکان علیھم ان یکتبوا انہ کان فی الجزائر حریۃ دینیۃ۔ ولکن عند ما قاموا للسیاسۃ جاءت ھذہ الصعوبات)

۲۹ ستمبر کی شام کو دکتور عبد الحلیم عویس سے ملاقات ہوئی۔ وہ ریاض کی جامعۃ الامام میں علوم اجتماعی کے پروفیسر ہیں۔ ان کے ساتھ قاہرہ الجدیدہ سے حلوان کی طرف روانگی ہوئی۔ یہ ایک لمبا راستہ تھا۔ قاہرہ کا بڑا حصہ سفر کے دوران آنکھوں کے سامنے گزرتا رہا۔

ایک مقام پر نیل کے کنارے ایک بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس پر عصفور الجنۃ لکھا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے اس کا تلفظ عصفور الگنۃ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے سفر ہندستان کے تحت بنارس کا ذکر کیا تو انھوں نے ایک جملہ میں نھر جنجا کا لفظ استعمال کیا۔

ابتداءً یہ لفظ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان کی مراد اس سے دریائے گنگا ہے۔ مصر کے لوگ ج کو گ پڑھتے ہیں۔ مگر غیر عربی الفاظ بولنا ہو تو اس وقت وہ گ کو ج کی مانند پڑھیں گے۔

مصر میں بڑے شہروں کے تعلیم یافتہ لوگ ج کو گ بولنے لگے ہیں۔ مگر شہروں کے باہر دیہات کے لوگ اب بھی ج کو ج ہی بولتے ہیں۔ چنانچہ جو شخص ج کو ج کی آواز سے بولے اس کو تعلیم یافتہ لوگ قروی (دیہاتی) کہتے ہیں۔

۲۹ ستمبر کی شام کو میں دکتور عبد الحلیم عویس کے مکان پر تھا۔ میری موجودگی اطلاع پاکر وہاں الاستاذ محمود محمد خلیل آگئے۔ ان کا تعلق ریڈیو قاہرہ سے ہے۔ انھوں نے ریڈیو کے لئے ایک مفصل انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق کچھ الرسالہ مشن سے تھا۔ اور کچھ موجودہ زمانہ میں امت مسلمہ کے مسائل سے۔

ایک سوال "اولویات العمل الاسلامی" سے متعلق تھا۔ یعنی اعمال اسلامی کو اختیار کرنے کے سلسلہ میں ہماری ترجیح کیا ہونی چاہئے۔ میں نے کہا کہ اس کا واضح جواب صحیح بخاری کی روایت میں موجود ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ما خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین الا اختار ایسرھما۔ ترجیح کے سلسلہ میں ہمارا طریقہ اختیار ایسر کا ہونا چاہئے۔ یہاں ایسر سے مراد وہ چیز ہے جو ممکن ہو۔ مصر میں اسلام پسند حضرات کے لئے عمل کے دو میدان تھے۔ ایک، تعلیم و دعوت۔ دوسرا، انقلاب حکومت۔ پہلا ممکن تھا۔ اور دوسرا غیر ممکن۔ اس لئے سنت رسول کے مطابق، ان کے لئے صحیح طریقہ یہ تھا کہ وہ انقلاب حکومت کے میدان میں نہ اتریں۔ اور تعلیم و دعوت کے میدان میں کام کریں۔

شام کی اس مجلس میں حکومت مصر کے ایک قانونی مستشار محروس فودہ موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ اخوانی نوجوانوں کے اندر جذبہ تھا مگر ان کے اندر شعور نہ تھا (کانوا متحمسین ولکن غیر واعین) انھوں نے کہا کہ میں نے اخوانی نوجوانوں سے ملاقات کی اور ان سے کہا کہ تمہارے لئے دعوت کا میدان کھلا ہوا ہے، اس میں کام کرو۔ تم پہلے گہرے مطالعہ کے لئے دین اور دنیا کا علم حاصل کرو۔ اور پھر سیاسی مشاکل سے صرف نظر کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے غیر

سیاسی میدان کے مواقع کو استعمال کرو۔ مگر اخوانی نوجوانوں نے اس نصیحت کو قبول نہیں کیا۔

یہ سن کر دکتور عبد الحلیم عویس نے کہا : انھم لا یریدون ان یعملوا فی المیدان الصعب وذھبوا الی میدان سھل (وہ مشکل میدان میں عمل کرنا نہیں چاہتے اس لئے انھوں نے آسان میدان کو اختیار کرلیا) یعنی دعوت کے میدان میں عمل کرنے کے لئے صبر کی صبر کی ضرورت ہے اور صبر انسان کے لئے سب سے زیادہ مشکل چیز ہے۔

ایک عرب نوجوان مختار احمد الشیبانی سے ملاقات ہوئی تو وہ دیر تک مجھ سے لپٹ کر روتے رہے۔ انھوں نے کہا کہ میں ایسے مقام پر پہنچ گیا تھا کہ یا تو پاگل ہوجاؤں یا خودکشی کرلوں۔ مگر الرسالہ مشن نے عین وقت پر مجھ کو بچالیا۔ انھوں نے کہا کہ اس مشن سے واقف ہونے سے پہلے میں ایک شعوری قید خانہ میں جی رہا تھا۔ اس مشن سے واقف ہونے کے بعد میں نے محسوس کیا گویا کہ میں کرۂ زمین کا بوجھ اپنے اوپر لادے ہوئے تھا۔ اب یہ بوجھ میرے اوپر سے اتر گیا۔ قبل التعرف علی الرسالۃ کنت اعیش فی سجنٍ شعوریٍّ۔ اما بعد التعرف علی الرسالۃ فاحسست کأنی کنت احمل الکرۃ الارضیۃ ثم وقعتْ من علی کاھلی۔

اس کا پس منظر یہ ہے کہ پچھلے تقریباً ۵۰ سال سے عالم عرب کے نوجوان اور سوچنے والے لوگ ایک شدید فتنہ میں مبتلا تھے۔ یہ اسلام کی سیاسی اور نظامی تعبیر کا فتنہ تھا۔ یہ فکر حسن البنا اور سید قطب کی تحریروں کے ذریعہ عرب ملکوں میں پھیلا۔ پھر سید ابو الاعلیٰ مودودی کی کتابوں کے عربی ترجموں سے اس میں مزید اضافہ ہوا۔

اس انقلابی فکر سے متاثر افراد کے لئے دو میں سے ایک کا اختیار باقی رہ گیا تھا۔ یا حکومتی تشدد کا نشانہ بننا یا نفاق کا طریقہ اختیار کرنا۔ سنجیدہ افراد اس صورت حال سے مطمئن نہیں ہوسکتے تھے۔ چنانچہ وہ سخت قسم کے ذہنی اضطراب میں مبتلا تھے۔ اب الرسالہ مشن ایسے لوگوں کو حیات نو کا پیغام دکھائی دے رہا ہے۔

عربوں کی ایک مجلس میں میں نے کہا کہ موجودہ شرحوں اور تفسیروں کی ایک کمی یہ ہے کہ ان میں آیات و احادیث کو فروع پر تو منطبق کیا جاتا ہے، مگر اساسات پر منطبق نہیں کیا جاتا۔ مثلاً حدیث میں ہے کہ لتتبعن سنن مَن کان قبلکم شبراً بشبر وذراعاً بذراع حتی

لو دخلوا جحر ضب دخلتموہ۔ اس حدیث کی تشریح کو تعویذ اور عملیات جیسے اعمال پر تو چسپاں کیا جاتا ہے۔ مگر ان کو زیادہ اہم امور پر چسپاں نہیں کیا جاتا۔

مثلاً قدیم زمانہ میں دوسری قوموں نے یہود کے اوپر سخت معاملہ کیا۔ یہود اگر ان سختیوں کو خدائی تنبیہہ سمجھتے تو ان کے اندر تضرع اور رجوع کی کیفیت پیدا ہوتی۔ مگر انھوں نے ان متشددانہ واقعات کو دوسری قوموں کی عداوت اور مخالفانہ سازش قرار دیا۔ اس کے نتیجہ میں ان کی قساوت اور تمرد میں اضافہ ہوگیا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا لکھنے اور بولنے والا طبقہ جو کچھ کر رہا ہے وہ اسی سنت یہود کا اتباع ہے، غیر مسلم قوموں کی طرف سے پیش آنے والے شدائد کو وہ اسلام دشمنوں کی سازش قرار دینے میں مصروف ہیں۔ اگر وہ ان شدائد کو تنبیہہ خداوندی سمجھتے تو ان کے اندر انابت اور رجوع الی اللہ کی کیفیت پیدا ہوتی لیکن جب انھوں نے اس کو مؤامرہ (سازش) بتایا تو اس سے انھیں قساوت اور سرکشی کے سوا کوئی اور غذا حاصل نہ ہو سکی۔

۳۰ ستمبر کی شام کو قاہرہ سے دہلی کے لیے روانگی ہوئی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایرپورٹ کے لئے روانہ ہوا۔ لمبے سفر کے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے آج میں آخری منزل طرف جا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوا کہ اسی طرح ہر آدمی اپنے دنیوی مراحل حیات کو طے کرکے آخرت کی طرف روانہ ہوتا ہے جہاں وہ اپنے ابدی مقام کا تجربہ کرسکے۔ یہ احساسات دعا کی صورت میں ڈھلنا چاہتے تھے مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مجھے دعا کے لئے الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔

مجھے اپنے بھائی کا قصہ یاد آیا۔ وہ ایک ہندو کالج میں بی ایس سی کے داخلہ کے لئے گئے۔ مگر وہ دو مہینہ لیٹ ہو چکے تھے۔ پرنسپل نے کہا کہ تم کو معلوم ہے کہ داخلہ دو مہینے پہلے بند ہو چکا ہے۔ مگر مزید سوال وجواب کے بعد وہ ان کے لئے ہمدرد بن گیا۔ اس نے فارم منگوایا اور کہا کہ اس کو پر کرو۔ پھر اس کو محسوس ہوا کہ بیک ڈیٹ میں فارم بھرنا شاید ان کے لئے مشکل ہوگا، اس لئے فارم ان کے ہاتھ سے لے کر پرنسپل نے خود اس کو پر کیا اور ان کو داخلہ دے دیا۔

میں نے کہا کہ خدایا، میں آپ کا وہ عاجز بندہ ہوں جس کے پاس دعا کے الفاظ بھی نہیں ہیں۔ آپ خود ہی میری طرف سے دعا کے الفاظ متعین کرکے اس کی قبولیت کا فیصلہ فرما دیجئے۔

قاہرہ ایئرپورٹ میں داخل ہوا تو وہاں ایک نئی چیز نظر آئی۔ ایک شیشہ کا کیس تھا۔ اس میں بہت سے نوٹ پڑے ہوئے تھے۔ قریب سے دیکھا تو لکھا ہوا تھا: بعض النقود لحماية البيئة یعنی ماحول (environment) کو بچانے کے لئے یہاں کچھ رقم ڈالیں۔ ہزار سال پہلے اگر اس قسم کا کیس رکھا جاتا تو کوئی شخص اس کا مطلب نہیں سمجھ سکتا تھا۔ کیوں کہ ماحول کی حفاظت کا مسئلہ صنعتی تہذیب نے پیدا کیا ہے۔ اور صنعتی تہذیب کی عمر چند سو سال سے زیادہ نہیں۔ اور ماحول کی کثافت کا مسئلہ تو موجودہ شدت کے ساتھ صرف بیسویں صدی کے نصف آخر میں پیدا ہوا ہے۔

قاہرہ سے عرب امارات کی فلائٹ ۴۰۲ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں اس کی فلائٹ میگزین الامارات (Emirates) کا شمارہ ستمبر ۱۹۹۲ دیکھا۔ ایک مضمون میں مارٹن سلجمان (Martin Seligman) کی کتاب التفاؤل المكتسب (Learned Optimism) کا تعارف تھا۔ اس کتاب میں تحقیق کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ مایوس کن حالات میں بھی ہمیشہ روشن امکان کا ایک پہلو موجود ہوتا ہے۔ وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو روشن پہلو پر اپنی ساری توجہ لگا دیتے ہیں۔ جب آپ کسی چیز کے ممکن ہونے پر یقین کر لیتے ہیں تو آپ کی عقل اس کے حصول کے لئے متحرک ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد آپ کا دماغ اپنے آپ اس کے عملی وسائل دریافت کر لیتا ہے (فالايمان بامكانية عمل شئ مايحرك العقل للعمل من اجل انجازه وعندما تؤمن لبشئ يستنبط دماغك وسائل تنفيذه)

جہاز میں صفائی اور باقاعدگی کا معیار نہایت عمدہ تھا۔ اس میں ایک نئی چیز یہ نظر آئی کہ جہاز کے اندر ویڈیو اسکرین پر قبلہ کا رخ بتانے کا انتظام تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ اسکرین پر بار بار ایک جہاز کی تصویر آجاتی تھی۔ اس تصویری جہاز کا رخ عین وہی ہوتا تھا جو ہمارے واقعی جہاز کا تھا۔ اس کے بعد اس تصویری جہاز کے کنارے تیر کا ایک نشانہ ظاہر ہو جاتا تھا۔ یہ تیر بتاتا رہتا تھا کہ اب قبلہ کا رخ کس طرف ہے۔ جب ہوائی جہاز کی صنعت شروع ہوتی تو کچھ لوگوں نے بطور طنز کہا کہ یہ نمازی لوگ اڑتے ہوئے ہوائی جہاز کے اندر اپنے قبلہ کا رخ کس طرح معلوم کریں گے۔ مگر اللہ کی نشانی نے ظاہر ہو کر بتایا کہ اللہ اس سے عاجز نہیں کہ وہ آسمانی فضاؤں

ہیں بھی اپنے بندوں کو اپنی عبادت کی سمت سے آگاہ کردے۔

ساڑھے چار گھنٹہ کی پرواز کے بعد جہاز دوبئی میں اترا۔ یہاں چار گھنٹہ کے انتظار کے بعد دہلی کے لئے جہاز لینا تھا۔ دوبئی کا ہوائی اڈہ اور یہاں کی ہر چیز انٹرنیشنل معیار کے مطابق نظر آئی۔ البتہ یورپ کے ملکوں کے ہوائی اڈوں پر انسانوں کی بھیڑ بہت کم ہوتی ہے، جب کہ دبئی کے ہوائی اڈہ پر ہر طرف انسانوں کی بھیڑ نظر آئی۔ یہ ایک مصروف ترین ہوائی اڈہ ہے۔ یہاں سے روزانہ تقریباً سو اسو ہوائی جہاز اڑتے ہیں اور وہ دنیا کے تقریباً ایک سو ملکوں میں اترتے ہیں۔

دبئی کے ہوائی اڈہ پر ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے۔ وہاں پہنچ کر نماز پڑھی اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ مسجد کے باہر عربی میں اماکن الصلاۃ اور انگریزی میں (Prayer Room) لکھا ہوا تھا۔ مسجد اللہ کے بندوں کے لئے مامن ہے۔ اس کے اندر داخل ہو کر ایک خاص طرح کا سکون حاصل ہوتا ہے۔ مسجد نہ صرف عبادت گاہ ہے بلکہ وہ اہل ایمان کے لئے روحانی پناہ گاہ بھی ہے۔

میں نے سوچا کہ دنیا کے ہر ملک میں اور ہر شہر میں کثرت سے مساجد کی موجودگی مسلمانوں کے لئے ایک غیر معمولی ایڈوانٹج کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ یہ کہ وہ اسلامی تحریک کو مساجد کی بنیاد پر اٹھائیں، اور پھر دنیا کے ہر گوشہ میں اپنے لئے بنا بنایا مرکز عمل پالیں۔

دبئی سے دہلی کے لئے الامارات (Emirates) کی فلائٹ نمبر ۷۰۰ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ ہم ساڑھے گیارہ بجے رات کو دبئی اترے۔ اس وقت کیلنڈر میں ستمبر کی ۳۰ تاریخ تھی۔ مگر یہاں چار گھنٹہ قیام کے بعد جب اگلے جہاز پر بیٹھے تو اکتوبر ۱۹۹۲ کی پہلی تاریخ آچکی تھی۔ وقت کتنی تیزی سے گزر رہا ہے۔ مگر انسان کتنا کم اس کا اندازہ کرتا ہے۔

راستہ میں قاہرہ کا روزنامہ الاخبار (۳۰ اکتوبر ۱۹۹۲) پڑھا۔ اس کے ایک مضمون کا عنوان تھا: دعاۃ الحرب الصلیبیۃ ... ماذا یریدون۔ اس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا تھا کہ اور اب، مذہبی جنگ کے مبلغین کا نشانہ کیا ہے، جو کہ نقارہ بجا رہے ہیں اور لوگوں کو صلیبی جنگ کے نام پر جمع کر رہے ہیں (والآن۔ ماھی اھداف دعاۃ الحرب الدینیۃ والذین یدقون الطبول الآن ویجمعون الناس حول شعار الحرب الصلیبیۃ)

دین کے نام پر جنگ کی باتیں کرنے والوں کی اس نے تین قسم بتائی تھی۔ ان میں قسم اول الاخوان المسلمون کی تھی۔

اسی کے ساتھ عرب امارات کا روزنامہ الاتحاد (۳۰ اکتوبر) پڑھا۔ یہ ۲۸ صفحات پر نکلتا ہے۔ ان اخبارات کو پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ مصر اور اس قسم کے دوسرے ملکوں کے عوام کا ایک ایڈوانٹج یہ ہے کہ ان کی زبان اور قومی صحافت کی زبان ایک ہے۔ اس لئے دونوں کے درمیان براہ راست رشتہ مسلسل قائم رہتا ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کی سرگرمیاں بھی بآسانی ملکی صحافت میں جگہ پاتی رہتی ہیں۔ اس کے برعکس ہندستان میں قومی صحافت کی زبان اور مسلمانوں کی زبان الگ الگ ہیں۔ اس کے نتیجہ میں مسلمان قومی صحافت کی سطح پر ایک غیر متعلق گروہ بن گئے ہیں۔ ملک کو ان کی شخصیتوں اور ان کی سرگرمیوں کی کوئی اطلاع نہیں ہوتی اس کے کہ یہاں کی صحافت کبھی مسلمانوں کی کسی خبر کو خود اپنے مقاصد کے لئے چھاپنا پسند کرے۔

ڈھائی گھنٹہ کی پرواز کے بعد یکم اکتوبر ۱۹۹۲ کو ۹ بجے ہمارا جہاز دہلی ایرپورٹ پر اتر گیا۔ طویل سفر اس طرح ختم ہوا کہ ہم جہاں سے چلے تھے، دوبارہ وہیں پہنچ گئے۔ میں نے سوچا کہ آخرت کا معاملہ بھی یہی ہے۔ آدمی خدا کے پاس سے آیا ہے۔ اور دوبارہ اس کو خدا کی عدالت میں پہنچادیا جائے گا۔ یہ معاملہ واپسی کا معاملہ ہوگا نہ کہ کسی نئے مقام پر جانے کا۔

ٹامس فلر (Thomas Fuller) ایک انگریز مصنف تھا۔ وہ ۱۶۰۸ میں پیدا ہوا۔ اور ۱۶۶۱ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا قول ہے کہ سفر عقل مند آدمی کو زیادہ بہتر بناتا ہے۔ اور بیوقوف آدمی کو اور زیادہ خراب کر دیتا ہے:

Travel makes a wise man better, but a fool worse.

اس کی وجہ یہ ہے کہ واقعات خارج میں خواہ کچھ ہوں، آدمی ان کو اپنی نظر سے دیکھتا ہے۔ جتنی آدمی کی نظر ہوگی اتنا ہی وہ واقعات کو دیکھ اور سمجھ پائے گا۔

سفرنامہ لکھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ اگر میں ایسا کروں کہ صرف ایک سطر کا سفرنامہ شائع کر دوں جس میں بس یہ لکھا ہوا ہو کہ "میں دہلی سے فلاں فلاں مقام پر گیا اور پھر دوبارہ دہلی واپس آگیا" تو پڑھنے والے کہیں گے کہ یہ تو صرف ایک خبر ہے۔ اس سے ہم سفر کی بابت کیا

جان سکتے ہیں۔ مگر کئی قسط میں چھپنے والا سفرنامہ بھی اتنا ہی نامکمل ہوتا ہے جتنا مذکورہ قسم کا ایک سطر کا خبرنامہ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر بات غیر مذکور رہے۔ بولے ہوئے تمام الفاظ اور لکھے ہوئے تمام مضامین اصل واقعہ کو بیان کرنے کے لئے اتنا ہی نامکمل ہیں جتنا ٹیلی فون کے پورے نظام کو بتلانے کے لئے لفظ "ٹیلی فون" حقائق کی دنیا اس سے زیادہ ہے کہ الفاظ کا کوئی بھی ذخیرہ اس کو بیان کر سکے۔ اس دنیا میں آدمی صرف اپنے سوچنے کی صلاحیت سے باتوں کو جانتا ہے نہ کہ دوسروں کے لکھے یا بولے ہوئے الفاظ سے۔

مجھے ہر سفر میں کچھ ایسے تجربات ہوتے ہیں جن کو لفظوں میں لکھا جائے تو وہ لفظوں میں نہیں سماتے۔ اور اگر ان تجربات کو نہ لکھا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا سفرنامہ لکھا ہی نہیں گیا۔ یہ ایک اعتبار سے گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل جیسا معاملہ ہے۔ تاہم یہ ایک انسان کے احساسات ہیں، اور اصل حقیقت کا علم اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں۔

اظہار حقیقت کا اصل مقام آخرت ہے۔ عین ممکن ہے کہ جب آخرت آئے تو کہا ہوا بے کہا بن جائے، اور جو بے کہا ہے، وہی کہا ہوا قرار پائے۔ انسان کے لئے صرف یہی سزاوار ہے کہ وہ اپنے عجز کا اقرار کرے اور مالک حقیقی سے رحمت و مغفرت کی دعا کرتا رہے۔

ایک سفر

اسلامک سوسائٹی آف آرنج کاونٹی (کیلی فورنیا، امریکہ) کے زیر اہتمام چھٹی انٹرنیشنل سیرت کانفرنس کیلی فورنیا میں ۲۵ - ۲۶ دسمبر ۱۹۹۳ کو ہوئی۔ اس میں خطاب کرنے کے لئے مجھے مدعو کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں امریکہ کا سفر ہوا۔ ذیل میں اس سفر کی روداد درج کی جاتی ہے۔

دہلی سے روانگی ۲۲ اور ۲۳ دسمبر کی درمیانی رات کو ہوئی۔ اب سے ۴۴ سال پہلے اسی تاریخ کی درمیانی رات میں اجودھیا کی بابری مسجد کے اندر رام کی مورتیاں رکھ دی گئی تھیں۔ اس کے بعد دونوں فرقوں کے درمیان مختلف واقعات پیش آتے رہے۔ یہاں تک کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو اکثریتی فرقہ سے تعلق رکھنے والی ایک بھیڑ اجودھیا میں اکٹھا ہوئی اور اس نے بابری مسجد کو ڈھاکر وہاں ایک عارضی مندر بنا دیا۔

آج کے اردو اخبار میں دہلی کے ایک خود ساختہ مسلم لیڈر نے مسلمانوں سے یہ اپیل کی تھی کہ وہ ۲۳ دسمبر کو بابری مسجد پر غیر قانونی قبضہ کی یادگار منائیں۔ عملاً یہ اپیل غیر مسموع ہو کر رہ گئی۔ تاہم میں نے سوچا کہ یہ نام نہاد مسلم لیڈر اگر ہوش مند ہوتے تو وہ مسلمانوں سے کہتے کہ اب تم "یوم احتجاج" منانا چھوڑ دو، اب تم "یوم شکر" مناؤ۔ کیوں کہ ملک کی انتہا پسند طاقتوں نے ۴۴ سال کے اندر اپنی تمام تخریبی طاقت استعمال کر ڈالی۔ اس کے باوجود ملت اسلامی کا قافلہ انڈیا میں اور ساری دنیا میں آگے بڑھ رہا ہے۔ اس قسم کے واقعات تو ہماری گاڑی کے لئے گویا راستہ کی وہ رکاوٹیں (frictions) ہیں جو گاڑی کو تیز دوڑنے میں مددگار کا کام کرتی ہیں۔

رات کو ساڑھے گیارہ بجے گھر سے نکلا تو میری زبان پر یہ دعا تھی: اَللّٰهُمَّ انتَ الصاحبُ فی السفر و الخلیفة فی الاهل (اے اللہ، تو ہی میرے سفر کا ساتھی ہے اور تو ہی میرے اہل میں خلیفہ ہے)

میرے بچپن میں مولانا اسماعیل میرٹھی کی اردو ریڈریں پڑھائی جاتی تھیں۔ اگرچہ اس کے بعد سیکڑوں یا شاید ہزاروں درسی کتابیں لکھی گئی ہیں مگر ویسی اردو ریڈر آج بھی کوئی دوسری

موجود نہیں۔

اس ریڈر میں دو کبوتروں کا قصہ تھا۔ ایک کا نام تھا یازندہ ، دوسرے کا بازندہ۔ ایک نے دوسرے سے کہا چلو ، دنیا کی سیر کریں۔ اس نے ہچکچاہٹ ظاہر کی۔ اس پر پہلے والے نے کہا :

سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں   زندگی گر کچھ رہی تو نوجوانی پھر کہاں

میرا حال یہ ہے کہ " نوجوانی " کی عمر میں بھی سفر میرے لئے پسندیدہ چیز نہ تھا۔ اب " بڑھاپے " کی عمر میں تو اس کے پسندیدہ ہونے کا سوال ہی نہیں۔ پہلے اگر سفر میرے لئے غیر مرغوب تھا تو اب سفر میرے لئے مصیبت بن چکا ہے۔ تاہم ایک شخص جو کوئی مشن چلا رہا ہو اس کے لئے اس دنیا میں سفر کے بغیر چارہ بھی نہیں۔

گھر سے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے رات کو روانہ ہوا۔ دہلی ایئرپورٹ پہنچا تو گھڑی میں سوا بارہ کا وقت تھا۔ گویا کہ گھر سے میں ۲۲ دسمبر کو نکلا اور ایئرپورٹ پہنچا تو ۲۳ دسمبر کی تاریخ شروع ہو چکی تھی۔ ایئرپورٹ کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے آخری گیٹ پر پہنچا جہاں لوگوں کا سفری بیگ ایک خاص مشین سے گزارا جاتا ہے۔ یہاں پولیس کے دو آدمی بیٹھے ہوئے اسکرین پر اپنی نظر جمائے ہوئے تھے۔ اسکرین پر ہر آدمی کے بیگ کا اندر کا حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ مثلاً ایک بیگ کے اندر کالی لمبی سی چیز دکھائی دی۔ وہ بیگ فوراً روک لیا گیا۔ مسافر سے پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ اس کے اندر ایک لمبی چھری رکھی ہوئی تھی۔

میں نے سوچا کہ اسی طرح خدا اپنے عالمی انتظام کے تحت ہر شخص کے اندرون کو دیکھ رہا ہے۔ اوپر سے آدمی خواہ جو بھی لبادہ اوڑھے ہوئے ہو ، مگر خدا اندر کی حقیقتوں تک سے واقف ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو آدمی کے اندر احتساب ذات کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ آدمی چاہنے لگتا ہے کہ خدا کے یہاں حساب کئے جانے سے پہلے وہ خود اپنا حساب کر لے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو حدیث میں ان لفظوں میں بتائی گئی ہے ـــــ حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا۔

ایئرپورٹ کی انتظار گاہ میں میرے پاس دو آدمی اجنبی زبان میں بات کر رہے تھے۔ لباس سے وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ معلوم ہوتے تھے۔ میں نے انگریزی میں پوچھا کہ آپ لوگ کون سی زبان

بول رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ تبتی زبان۔ مزید گفت گو سے معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک تبتی ہے اور دوسرا بھوٹانی۔ دونوں کا تعلق بدھ مذہب سے تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ لوگ دلائی لاما کو ریلیجس ہیڈ سمجھتے ہیں یا گاڈ۔ مسٹر وانگچوک (Jigme Wangchuk) نے جواب دیا:

He is everything for us.

(وہ ہمارے لئے سب کچھ ہیں) یہ لوگ دلائی لاما کو خدا کی طرح مقدس سمجھتے ہیں۔ موجودہ دلائی لاما چودھویں دلائی لاما ہیں۔ ۱۹۴۰ میں وہ تبت میں روحانی اور دنیوی حاکم مقرر ہوئے۔ مگر تبت پر چینی قبضہ کے خلاف ناکام بغاوت کے بعد ۱۹۰۹ میں وہ بھاگ کر انڈیا آگئے۔ تاہم تبتیوں کی نظر میں ان کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔

دہلی ایئر پورٹ پر ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ مسلم عورتوں کے پچھڑے پن کی بات کرنے لگے۔ میں نے کہا کہ یہ ایک چلی ہوئی بات ہے جس کو لوگ سوچے سمجھے بغیر دہراتے ہیں۔ ورنہ آج مسلم خواتین کا تعلیمی معیار چالیس سال پہلے کے مقابلہ میں بہت بڑھ چکا ہے۔

اتفاق سے میرے پاس آج کا ٹائمس آف انڈیا (۲۲ دسمبر) تھا۔ اس کے درمیانی صفحہ پر ایک رپورٹ مسلم خواتین کی تعلیمی حالت کے بارہ میں چھپی ہوئی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ آج مسلم خواتین تعلیم کے میدان میں تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ مثال کے طور پر اس میں بتایا گیا تھا کہ حال میں پٹنہ کی ایک لڑکی بہار پبلک سروس کمیشن کے انٹرویو میں شریک ہوئی۔ یہ انٹرویو آیورویدک سسٹم کی ایک پوسٹ کے بارہ میں تھا۔ مسلم خاتون نے مقابلہ میں ٹاپ کیا۔ اس نے ویدوں کے اشلوک اتنی روانی کے ساتھ سنائے کہ انٹرویو لینے والے ماہرین حیرت زدہ رہ گئے:

A Muslim girl from Patna appeared for the Bihar Public Service Commission examination for a post in Ayurvedic system and topped the list. All the examiners which included Ayurvedic experts judged her to be the best candidate. She could, with great fluency, cite vedic slokas which surprised everyone.

میں نے کہا کہ پچھلے پچاس سال کے دوران نا اہل مسلم لیڈروں نے مسائل کی اتنی رٹ

لگائی کہ مسلمان وقتی طور پر بھول گئے کہ مسائل کے باوجود یہاں بے شمار مواقع بھی ان کے لئے موجود ہیں۔ اب تجربات کے بعد ہندستانی مسلمان اپنے نااہل لیڈروں کی گرفت سے باہر آگئے ہیں۔ اب وہ مسائل کے خلاف چیخ پکار کے بجائے مواقع کو استعمال کرنے پر توجہ دے رہے ہیں۔ اس تبدیلی نے اب مسلمانوں کو ایک نئے دور ترقی میں داخل کر دیا ہے۔

دہلی سے سوئس ایر کی فلائٹ ۱۹۵ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ ۲۳ دسمبر کو ٹھیک دو بجے جہاز روانہ ہوا۔ آجکل سوئس ایر اول درجہ کی ہوائی کمپنی سمجھی جاتی ہے۔ اس کا انتظام معیاری نظر آیا۔ میں نے دہلی میں لکھوا دیا تھا کہ میرے لئے ایشیائی ویجٹیرین کھانا (Asian Vegetarian meal) دیا جائے۔ چنانچہ مزید فرمائش کے بغیر میری سیٹ پر ویجیٹرین کھانا پہنچتا رہا۔ کچھ وقت سونے میں اور کچھ اخبار اور میگزین پڑھتے گزرا۔

انٹرنیشنل ہرالڈ ٹریبون (۲۲ دسمبر) میں ایڈورڈ ڈیمنگ (W.Edwards Deming) کے حالات شائع ہوئے تھے جن کا ابھی ۲۰ دسمبر ۱۹۹۳ کو ۹۳ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ایڈورڈ ڈیمنگ ایک امریکی ماہر شماریات (statistician) تھے۔ جاپان پر امریکی قبضہ کے بعد ۱۹۴۷ میں وہ امریکی حکومت کے مشیر کی حیثیت سے جاپان آئے۔ ۱۹۵۰ میں انھوں نے ٹوکیو میں ایک لکچر دیا۔ یہ لکچر کوالٹی کنٹرول کے بارہ میں تھا۔ انھوں نے جاپانیوں کو بتایا کہ کس طرح شماریاتی طریقہ کو اشیاء کے نقص کو دریافت کرنے میں استعمال کیا جاسکتا ہے بجائے اس کے کہ صرف نگرانی پر اعتماد کیا جائے:

> He taught Japanese how to use statistical methods to discover the cause of product defects, instead of relying only on inspections.

جاپانیوں نے بہت دلچسپی لی اور فوراً اس کو پکڑلیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جاپان کے کارخانے جو پہلے خراب سامان کے لئے مشہور تھے، اب بے نقص سامان بنانے لگے۔ انھوں نے ڈیمنگ کو اتنی اہمیت دی کہ اس کے نام پر ایک ڈیمنگ انعام (Deming Prize) جاری کر دیا۔ جاپان میں مقبولیت کے ۳۰ سال بعد اپنے وطن امریکہ میں ڈیمنگ کا اعتراف کیا گیا جب کہ فورڈ کمپنی نے ۱۹۸۱ میں اس کو اپنا مشیر مقرر کیا۔ جاپان کے لوگ اس امریکی کو کوالٹی کنٹرول کا دیوتا

(god of quality control) کہتے ہیں۔

اعتراف کا یہ مزاج کسی بھی ترقی کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ جاپانی اگر اپنے آپ میں گم رہتے، وہ باہر سے نئی چیز لینے کی کوشش نہ کرتے تو وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتے تھے۔ جاپانیوں کے اسی مزاج کا نتیجہ ہے کہ فیکس کا طریقہ امریکہ میں دریافت ہوا مگر اس کو سب سے پہلے مارکٹ میں لانے والے جاپانی تھے۔

جس وقت ہمارا جہاز یورپ کے اوپر سے پرواز کر رہا تھا، مجھے یاد آیا کہ یہی وہ سرزمین ہے جس کے بارہ میں مسلم دنیا میں روز سازش اور ظلم کی داستانیں چھپتی رہتی ہیں۔ مثلاً موجودہ سفر پر روانگی سے پہلے میں نے ایک پاکستانی اخبار (نوائے وقت ۳ دسمبر ۹۳) میں ایک رپورٹ پڑھی اس کا عنوان تھا "مغرب کا مسلم دشمن رویہ"۔

اس میں بتایا گیا تھا کہ سارا مسیحی یورپ مسلمانوں کے خلاف نفرت سے بھرا ہوا ہے۔ مسلم دشمنی یورپ کی رگ رگ میں سرایت کر چکی ہے۔ اس سلسلہ میں کہا گیا تھا: مغربی عیسائیوں میں یہ رجحان واضح ہے کہ یورپ میں کوئی مسلمان مملکت نہ ہو۔ اس پس منظر میں جب یورپ کے عین قلب میں بوسنیا کی مسلم مملکت ابھری تو سرب عیسائی اس پر چڑھ دوڑے اور مغربی ممالک نے ہر ممکن طریق سے ان کی مدد کی تاکہ عین یورپ میں واقع اس مسلم مملکت سے چھٹکارا حاصل ہو۔ یورپ اور امریکہ نے اپنے سیکولرزم کے تمام بلند بانگ نعروں کے باوجود بوسنیا میں مسلمانوں کا قتل عام نہیں روکا۔ بلکہ بوسنیا کو ہتھیاروں کی فراہمی بند کر کے اس قتل عام کو سہل بنادیا تاکہ نہتے مسلمان کسی مزاحمت کے قابل ہی نہ رہیں (صفحہ ٦)

آجکل تمام مسلم دانشور بوسنیا کے معاملہ کو اس طرح پیش کر رہے ہیں گویا کہ وہ یورپ کی مسلم دشمنی کی یقینی علامت ہے، حالاں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ بوسنیا خود نام نہاد مسلم دانشوروں اور نااہل مسلم رہنماؤں کی اپنی نادانی کی عبرت ناک مثال ہے۔

بوسنیا اور اس طرح کے دوسرے مقامات میں جو کچھ پیش آیا وہ دراصل شریعت کے اصول ترك المصلحة للمفسدة کی خلاف ورزی کا نتیجہ تھا۔ اس شرعی اصول کا مطلب یہ ہے کہ ہر اس اقدام سے پرہیز کیا جائے جو نتیجہ کے اعتبار سے الٹا (counter-productive)

ثابت ہونے والا ہو۔ بوسنیا اور کشمیر اور فلپائن اور اراکان، اور اس طرح کے ہر دوسرے مقام پر نااہل مسلم لیڈروں نے وہی غلطی کی جس کو عوامی مثل میں "آبیل مجھے مار" کہا جاتا ہے۔ ہر جگہ وہ خود اپنے غیر دانشمندانہ اقدام کی سزا بھگت رہے ہیں اور اس کا الزام غلط طور پر وہ فریق ثانی کے اوپر ڈالنا چاہتے ہیں۔ مزید تعجب یہ ہے کہ انھیں لوگوں کو سروس آف اسلام کا خطاب دیا جا رہا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اگر یہ سروس آف اسلام ہے تو ڈس سروس آف اسلام آخر کس چیز کا نام ہوگا۔ ان کی زیادہ صحیح تصویر اس انگریزی مثل میں ہے:

Fools rush in where angels fear to tread.

سوئس کمپنی کا فلائٹ میگزین (Swissair Gazette) دسمبر ۱۹۹۳ دیکھا۔ اس میں سب کے سب اشتہار یا اشتہاری مضامین تھے۔ ایک اشتہار میں ایک مخصوص بریف کیس کی تصویر تھی۔ اس میں سٹلائٹ ٹیلیفون نصب تھا۔ اور یہ لکھا ہوا تھا کہ یہ عالمی ٹیلیفون (global telephone) آپ اپنے ساتھ رکھئے اور پھر آپ کسی بھی مقام سے کسی بھی مقام پر ربط قائم کر سکتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں عوامی مواصلاتی انقلاب کہاں تک پہنچ گیا ہے۔

ساڑھے آٹھ گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد جہاز زیورک (سوئزرلینڈ) میں اتر گیا۔ ایئر پورٹ کے اندر چلتے ہوئے ایک دیوار پر ایک روشن بورڈ نظر سے گزرا۔ یہ مقامی ہوٹل کا اشتہار تھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے:

Another 10 minutes and you'll be at the Hilton singing in the shower.

(مزید دس منٹ، اور آپ ہلٹن ہوٹل کے غسل خانہ میں گا رہے ہوں گے) میں نے سوچا کہ کاش، دنیا کے لوگوں کو بتایا جا سکتا کہ اس سے بھی زیادہ بڑا ایک امکان ۱۰ منٹ بعد تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ وہ ہے باایمان موت اور اس کے بعد خدا کی جنت میں داخلہ۔

زیورک میں مجھے اگلی فلائٹ کے لئے چھ گھنٹہ تک ٹھہرنا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ متعلقہ کاؤنٹر پر پہنچ کر معلومات حاصل کروں۔ مگر وسیع ایئرپورٹ میں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اتنے میں ایک سفید فام نوجوان نظر آیا جو ایک جگہ کھڑا ہوا تھا۔ اس سے میں نے کہا کہ میری مدد کیجئے۔ کیوں کہ میں یہاں نووارد (new commer) ہوں۔ وہ فوراً میرا ٹکٹ لے کر ساتھ ہو گیا۔ اور متعلقہ کاؤنٹر پر پہنچ کر

ساری معلومات حاصل کیں۔ میں نے شکریہ ادا کیا تو اس نے کہا کہ کوئی بات نہیں، میں بھی کہیں نووارد ہوں گا اور وہاں کوئی شخص اسی طرح میری مدد کرے گا۔ اس نے اپنا نام کلاؤس بتایا۔

اس سفر میں اپنے عجز کا احساس بہت زیادہ غالب رہا۔ ۲ دسمبر کی دوپہر کو جبکہ میں زیورک ایئرپورٹ پر بیٹھا ہوا تھا، غیر معمولی احساس عجز کے تحت یہ شعر میری زبان پر آگیا:

نہ گلے نہ برگ سبزے نہ ثمر نہ سایہ دارم در حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

زیورک ہی میں ۱۹۵۹ میں ترکوں اور قبرص کے عیسائیوں کے درمیان وہ معاہدہ ہوا جس کو زیورک معاہدہ (Zurich Agreement) کہا جاتا ہے۔ عثمانی ترکوں نے ۱۵۷۰ میں قبرص کو فتح کیا تھا۔ ۱۹۱۴ میں وہ برطانیہ کے قبضہ میں چلا گیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد جب برطانیہ کی طاقت کمزور ہوئی تو قبرص کے یونانیوں اور ترکوں کے درمیان مسلح تصادم شروع ہوا۔ ترک مسلمان قبرص کی تقسیم چاہتے تھے تاکہ مشرقی قبرص کے مسلم اکثریتی علاقہ کو علیحدہ ملک بنایا جاسکے۔ لمبے خونیں ٹکراؤ کے بعد آخر کار برطانیہ کے دباؤ کے تحت مذکورہ زیورک معاہدہ ہوا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی امن قائم نہ ہوسکا۔ پرتشدد ٹکراؤ کے نتیجہ میں ترکوں نے بہت سی ملی ہوئی چیزیں بھی کھودیں۔ اور اپنا سیاسی مقصود بھی حاصل نہ کرسکے۔

۲۳ دسمبر کی سہ پہر کو زیورک سے لاس اینجلز کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ سفر سوئس ایئر کی فلائٹ ۱۰۶ کے ذریعہ طے ہوا۔ راستہ میں روزنامہ فائننشل ٹائمس (۲۳ دسمبر) کا مطالعہ کیا۔ ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ ساؤتھ افریقہ کی آخری سفید فام پارلیمنٹ نے ۴۵ کے مقابلہ میں ۲۳۷ ووٹوں سے فیصلہ کیا کہ ایک عارضی دستور بنایا جائے جو اکثریت کی حکومت کی بنیاد پر ہو اور اپریل ۱۹۹۴ء میں تمام نسلوں کی شرکت کے ساتھ الکشن کرایا جائے۔

> South Africa's last white parliament voted by 237 to 45 to adopt an interim constitution leading to majority rule after all-race elections next April.

ساؤتھ افریقہ کے اس واقعہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ ساؤتھ افریقہ میں سفید فام لوگوں نے اپنی حکومت قائم کر رکھی تھی۔ سیاہ فام لوگوں کو ہر قسم کے حقوق سے محروم کئے ہوئے تھے۔ اس کے

خلاف وہاں تحریک اٹھی۔ مگر انھوں نے اس تحریک کو پوری طرح پرامن طریق پر چلایا۔ سفید فام حکومت نے ان کے خلاف تشدد کیا۔ مگر اس کا جواب انھوں نے گن کلچر سے نہیں دیا۔ وہ ہر حال میں عدم تشدد کے اصول پر قائم رہے۔ اس کا نتیجہ آخر کار سیاہ فام نسل کی کامیابی کی صورت میں نکلا۔

اس کے مقابلہ میں ان مسلم تحریکوں کی مثال لیجئے جو گن کلچر کے طریقہ پر چلائی گئیں۔ ان تحریکوں نے اپنی قوم کو یا ملک کو بربادی کے سوا کوئی اور تحفہ نہیں دیا۔

زیورک سے لاس اینجلز کا سفر ساڑھے گیارہ گھنٹہ کا تھا۔ یہ طوالت بہت زیادہ تھکا دینے والی تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے نیند کی صورت میں انسان کو بڑی عجیب نعمت عطا فرمائی ہے۔ نیند روزمرہ کی زندگی میں وہی کام کرتی ہے جو آپریشن تھیٹر میں مخدرات۔ چنانچہ سفر کے دوران کئی بار گہری نیند آئی اور یہ لمبا گھبرا دینے والا سفر بہ آسانی طے ہو گیا۔

لاس اینجلیز میں کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے ہوئے سفید فام امریکی نے میرے پاسپورٹ کو چیک کرتے ہوئے پوچھا کہ آپ کا مقصد سفر کیا ہے۔ میں نے کہا کہ کانفرنس میں شرکت۔ دوبارہ پوچھا کہ کونسی کانفرنس۔ میں نے کہا کہ اسلامی کانفرنس۔ بظاہر ایسا محسوس ہوا کہ وہ اب بھی نہیں سمجھا ہے۔ اس نے کہا:

So it is business or pleasure.

میں نے کہا کہ نہ بزنس اور نہ پلیزر بلکہ مشن۔ اس نے مسکرا کر او کے کہا اور پاسپورٹ پر اسٹمپ لگا کر مجھے دیتے ہوئے کہا: تھینک یو۔

امریکی ذہن کے مطابق، باہر کا ایک شخص جب امریکہ آئے گا تو اس کا مقصد دو میں سے ایک ہو گا ــــــ تجارت یا تفریح۔ اس کے ذہنی سانچہ میں "اسلامی کانفرنس" ایک اجنبی چیز ہے۔ چنانچہ ہوائی جہاز کے اندر جو فارم ہم کو دیا گیا، اس میں مقصد سفر کے خانہ میں یہی دو لفظ لکھے ہوئے تھے۔

لاس اینجلیز ایئرپورٹ پر دو گیٹ ہیں۔ گیٹ اے، اور گیٹ بی۔ میں غلط طور پر گیٹ اے سے باہر آ گیا۔ یہاں کوئی صاحب دکھائی نہیں دئے۔ میں کسی قدر پریشانی کے عالم میں کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اسلامک سوسائٹی کو ٹیلیفون کر کے معلوم کروں۔ اتنے میں ایئر پورٹ کے

ایک صاحب "سید بشیر شاہ" آ گئے۔ دریافت حال کے بعد وہ مجھ کو گیٹ بی کی طرف لے گئے۔ وہاں دو صاحبان میرے انتظار میں موجود تھے۔

ایئر پورٹ سے ڈاکٹر سلمان ندوی اور عبد الحمید سیمجی صاحب کے ساتھ روانگی ہوئی۔ راستہ میں دونوں صاحبان سے گفتگو ہوتی رہی۔ ڈاکٹر سلمان ندوی ساؤتھ افریقہ کی ایک یونیورسٹی میں اسلامیات کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ فلسطین میں اسرائیل کا اپنے سابقہ موقف سے ہٹ کر فلسطینیوں سے صلح کرنا اور ساؤتھ افریقہ میں سفید فام لوگوں کا سیاہ فام لوگوں کو یکساں سیاسی حقوق دینا، دونوں کے پیچھے تشدد کا زور کام کر رہا ہے۔ اسرائیل انتفاضہ کی سرگرمیوں سے جھکا ہے اور ساؤتھ افریقہ میں جب بم پھٹنے لگے تو ان لوگوں کو جھکنا پڑا۔ تاہم میں اس سوچ سے اتفاق نہ کر سکا۔

عبد الحمید سیمجی صاحب نے بتایا کہ آرنج کاونٹی میں ایشین ۵ فیصد ہیں۔ مگر یہاں کی یونیورسٹی میں ایشیائی طلبہ کی تعداد ۳۵ فیصد ہے۔ یہی حال امریکہ کی اکثر یونیورسٹیوں کا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ امریکہ کی سب سے زیادہ پرسٹیجس یونیورسٹی ہارورڈ میں وہاں کے ۲۰ ہزار طلبہ میں ایشیائی کافی ہیں۔ گیارہ سو کے اسٹاف میں ایک سو ایشیائی استاد ہیں۔ خود ان کے بھی دو لڑکے وہاں پڑھتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہاں انتہائی سخت ڈسپلن ہے۔ مثلاً استاد، طلبہ یا کارکن کے سوا کوئی وہاں داخل نہیں ہو سکتا۔ حتی کہ والدین بھی نہیں۔ وہاں صرف آئیڈنٹٹی کارڈ پر کیمپس میں داخلہ ہوتا ہے۔ امریکہ کی یونیورسٹیوں میں لائبریریاں ۲۴ گھنٹہ کھلی رہتی ہیں۔ اور طلبہ کثرت سے اس میں مطالعہ کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔ لائبریری میں فاضل بات تو درکنار، کوئی شخص زور سے بول بھی نہیں سکتا۔ حال میں اسلام کے مطالعہ کے لئے ہارورڈ یونیورسٹی میں ایک اسلامک ریسرچ کا شعبہ قائم ہوا ہے، اس شعبہ کو شاہ فہد کی طرف سے پانچ ملین ڈالر کا عطیہ دیا گیا ہے۔

یہاں میرا قیام جناب صغیر اسلم صاحب (پریسیڈنٹ اسلامک سوسائٹی آف آرنج کاونٹی) کے مکان پر تھا۔ میں ان کے یہاں پہنچا تو مغرب بعد کا وقت ہو چکا تھا۔ اتفاق سے اسی وقت جناب تشبیہ سید اور ان کے ایک ساتھی آ گئے۔ ان لوگوں سے دیر تک بات ہوتی رہی۔

تشبیہ سید صاحب نے بتایا کہ ایک کمیونسٹ مسلمان کو ایک بار میں نے دیکھا کہ وہ ہاتھ اٹھا کر

مسجد میں دعا کر رہا ہے۔ میں نے کہا کہ تم کو تو لینن اور ماو سے دعا کرنا چاہئے۔ مگر تم اللہ سے دعا کر رہے ہو۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو ہماری ذہنی کنڈیشننگ کی وجہ سے ہے۔ میں نے کہا کہ انھوں نے ایک صحیح بات غلط لفظ میں کہی۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ہر آدمی مشکل اوقات میں اللہ سے دعا کرنے لگتا ہے۔ مگر اس کا سبب سماج کی طرف سے ہونے والی کنڈیشننگ نہیں ہے۔ اس کا اصل سبب نیچر ہے۔ اور نیچر پیدائش سے آتا ہے نہ کہ کسی خارجی قسم کی کنڈیشننگ سے۔

۲۴ دسمبر کو عشاء کی نماز جناب صغیر اسلم صاحب کے مکان پر پڑھی۔ نماز کے بعد جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا تو زبان پر یہ الفاظ آگئے: خدایا، میرے سفر کو اور میرے قیام کو، میرے چلنے اور میرے ٹھہرنے کو، میرے بولنے اور میرے چپ رہنے کو میرے لئے خیر کا باعث بنا، مجھے تمام آفتوں سے اپنی پناہ میں لے لے۔

ایک تعلیم یافتہ پاکستانی سے گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ میاں نواز شریف کے مداح تھے۔ انھوں نے کہا کہ بے نظیر بھٹو کی حکومت ایٹم بم بنانا نہیں چاہتی۔ میں نے کہا کہ نواز شریف کا بیان تو یہ ہے کہ بے نظیر نے تین سال پہلے ایٹمی عمل کو رول بیک کر دیا تھا۔ پھر اس کے بعد جب نواز شریف وزیر اعظم بنے تو انھوں نے کیوں نہیں اس کو دوبارہ جاری کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ یہ امریکہ کے اشارہ پر ہوا۔

میں نے بہت سے پاکستانیوں سے بات کی۔ تقریباً ہر شخص امریکی مخالف بات کرتا ہے۔ اس کے باوجود پاکستان میں امریکہ کا عمل دخل کیوں۔ انھوں نے اس سوال کے جواب میں کہا کہ پاکستان کبھی بھی امریکہ کی مخالفت کو افورڈ نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا کہ آخر کیوں۔ انھوں نے کہا: انڈیا کا خوف۔ میں نے کہا کہ یہ پاکستانی سیاست کی پہلی اینٹ ہے، اور یہ پہلی اینٹ ہی غلط ہے۔ انڈیا پاکستان کا دشمن نہیں، انڈیا پاکستان کا ایک طاقت ور پڑوسی ہے۔ اگر آپ طاقتور امریکہ سے خود اس کے ٹرم پر دوستی کر سکتے ہیں تو انڈیا سے بھی آپ ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔

ایک عرب نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ وہ اخوانی فکر سے متاثر تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے آپ کی کئی چیزیں پڑھی ہیں۔ العالم الاسلامی (۳۱ اکتوبر ۱۹۹۳) میں آپ کا مفصل انٹرویو بھی پڑھا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ مسلمانوں کو بس پرامن داعی بنا دینا چاہتے ہیں اور

INFORMATIONAL HANDOUT

Muslim Populations

According to U.S. Census Bureau records, the total population of the world is five and a half billion people. Over twenty percent(over one billion) of these five billion are Muslims. Furthermore, Muslims live in all parts of the world, including Asia, Africa, the Middle East, Southeast Asia, Australia, Europe, and the Americas. The following chart lists the populations of Muslims in various regions of the world.

India/Pakistan	250-300 million
Africa	200 million
Arab countries	180 million
Southeast Asia	170 million
Europe	65 million
Iran	50 million
Central Asia	50 million
China	50 million
Afghanistan	15 million
North America	6 million
South America	3 million
Australia	1 million
Worldwide	***over 1 billion***

Sources (1993):
American Muslim Council, Washington, D.C.
Islamic Affairs Dept., Embassy of Saudi Arabia, Washington, D.C.
World Almanac

ان کے اندر سے لڑنے مرنے کی اسپرٹ نکال دینا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اس پر آپ کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔ یہ تو عین سنت ہے۔ جیسا کہ بخاری میں حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ :
ماخیّر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین الا اختار أیسرھما۔
وہ مزید بحث کرنے لگے اور باطل سے مقابلہ اور اس کی راہ میں جان دینے کی عظمت بیان کرنے لگے۔ میں نے کہا کہ میں حضرت سفیان الثوری (۱۶۱ - ۹۷ ھ) کا ایک قول آپ کو سناتا ہوں۔ یہی میری طرف سے آپ کی بات کا جواب ہے۔ انھوں نے کہا تھا : انّما الفقہُ الرخصۃ من ثقۃٍ۔ امّا التّشدُّد فیحسنہ کل آحدٍ (فقہ تو یہ ہے کہ کسی مستند ذریعہ سے دین میں آسانی کا پہلو معلوم کیا جائے۔ جہاں تک شدت پسندی کا تعلق ہے تو اس کا ماہر تو ہر شخص ہوتا ہے)
ایک میگزین میں ایک مضمون امریکی زندگی کے بارہ میں تھا۔ ایک تصویر میں دکھایا گیا تھا کہ ایک بس کھڑی ہوئی ہے۔ اس کے پچھلے دروازے سے ایک معذور آدمی اپنی وھیل چیئر پر بیٹھا ہوا باہر نکل رہا ہے۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا ــــــ امریکہ میں نئی بسوں کے لئے ضروری ہے کہ ان میں وھیل چیئر کے مسافروں کے لئے انتظام ہو :

New buses in America, such as this one in Portland, must be equipped to accommodate wheelchair-bound passengers.

۲۶ جولائی ۱۹۹۰ کو واشنگٹن میں وھائٹ ہاؤس کے لان میں دو ہزار آدمی جمع ہوئے ان میں سے اکثر وھیل چیئر پر تھے۔ وہ اس لئے آئے تھے کہ معذوری کے قانون (Disabilities Act) پر دستخط کریں۔ میگزین کے مطابق، اس ایکٹ نے امریکہ کے معذور باشندوں کو ایسے حقوق دئے ہیں جو کسی بھی دوسرے ملک کے لوگوں کو حاصل نہیں ــــ امریکہ میں معذور ہونا کسی آدمی کو خصوصی حق دیتا ہے، جب کہ ہندستان اور پاکستان جیسے ملکوں میں معذور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ناقابل لحاظ ہو جائے۔
ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۲ دسمبر ۱۹۹۳) میں بتایا گیا تھا کہ سعودی عرب کی حکومت نے ایک لاکھ تیرہ ہزار (113,000) قرآن کے نسخے با ترجمہ اور بغیر ترجمہ امریکہ کے مختلف اسلامی مرکزوں اور مسجدوں کو فراہم کئے ہیں۔ یہ صرف ایک خبر کا معاملہ ہے۔ اس کے

علاوہ مسلسل امریکہ میں اسلامی لٹریچر مغربی زبانوں میں پہنچ رہا ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کا بحیثیت قوم تعلق ہے، ان کی حالت کسی بھی ملک میں اچھی نہیں۔ مگر عین اسی وقت اسلامی دعوت کا عمل ہمیشہ کی طرح جاری ہے۔ اس میں کوئی وقفہ نہیں آیا۔ یہ بھی اسلام کا ایک معجزہ ہے کہ کوئی بھی طوفان اس کے تاریخی تسلسل کو روکنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

ایک پرچہ میں دنیا بھر میں مسلمانوں کی تعداد کے بارہ میں نقشہ چھپا تھا۔ یہ یہاں علیحدہ صفحہ پر نقل کیا جا رہا ہے۔

۲۴ دسمبر کو جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں پڑھی۔ اندر سے لیکر باہر تک پوری مسجد بھری ہوئی تھی۔ نہایت پرسکون ماحول میں نماز ہوئی۔ پہلی اذان اور دوسری اذان دونوں لاؤڈ اسپیکر کے بغیر ہوئی۔ مگر اتنے بڑے مجمع میں کسی بھی شخص نے یہ تجویز پیش نہیں کی کہ لاؤڈ اسپیکر پر اذان ہونا چاہئے تاکہ اسلام کی عظمت یہاں کی فضاؤں میں گونجے۔ اس کے برعکس ہندستان میں لاؤڈ اسپیکر اسلام کی عظمت کا نشان بن گیا ہے۔ اگر وہاں کی مسجدوں کی چھت سے لاؤڈ اسپیکر اتارنے کی بات کی جائے تو فوراً کچھ لوگ اس کو اسلامی وقار کا مسئلہ بنا لیں گے۔ اور نادان لیڈروں کی رہنمائی میں بہت سے مسلمان کفن بردوش ہوکر سڑکوں پر نکل آئیں گے۔

لاؤڈ اسپیکر کی اذان امریکہ کی سوسائٹی میں غیر ضروری شور کے ہم معنی ہے۔ اب مسلمان یہ نہیں کرتے کہ جلسہ کرکے کہیں کہ یہ شور نہیں ہے، یہ اذان ہے۔ اس طرح باہر کے ملکوں میں مسلمان وہاں کے حالات سے ہم آہنگ ہوکر رہتے ہیں، چنانچہ وہاں ان کو امن بھی حاصل ہے اور ترقی کے مواقع بھی۔ ہندستان کے مسلمان یہاں کے حالات سے موافقت کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے یہاں وہ امن سے بھی محروم ہیں اور ترقی سے بھی۔

ایک صاحب نے مسجد میں تقریر کی۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ امریکہ میں ہمارا اصل مسئلہ اپنے اسلامی تشخص کی حفاظت ہے۔ اگر ہم نے اپنا اسلامی تشخص کھو دیا تو اس ملک میں مسلمان کی حیثیت سے ہمارا کوئی وجود باقی نہیں رہے گا۔

مغربی ملکوں میں ہر "اسلام پسند" مسلمان یہی لکھتا یا بولتا دکھائی دیتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس

قسم کی باتیں محض فریاد کی حیثیت رکھتی ہیں اور فریاد سے کبھی کسی قوم کا مستقبل تعمیر ہونے والا نہیں۔ یہاں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہاں کا مسلم نوجوان دو چیزوں کے درمیان ہے۔ ایک طرف جدید تہذیب کی رونقیں ہیں۔ دوسری طرف آپ اسلامی تشخص یا ملی تشخص کے نام پر جو چیز ان کو دے رہے ہیں اس میں انھیں اسلام بظاہر کمتر دکھائی دیتا ہے اور جدید تہذیب برتر نظر آتی ہے۔ اور یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے کہ وہ جس چیز کو بہتر سمجھے اس کو چھوڑ کر کمتر کو اختیار کرے۔

میں نے کہا کہ اس کا حل یہ ہے کہ آپ جدید تہذیب کے مقابلہ میں اسلام کی برتر آئیڈیالوجی کو پیش کریں نہ کہ اس چیز کو جس کو اسلامی تشخص کہا جاتا ہے۔ اسلامی آئیڈیالوجی بلاشبہ تمام چیزوں سے اعلیٰ ہے۔ جو آدمی اسلامی آئیڈیالوجی کو اعلیٰ فکری سطح پر پالے اس کو بقیہ تمام چیزیں اتنی حقیر معلوم ہوں گی کہ وہ خود ہی ان کو چھوڑ کر اسلام کو اپنی عزیز ترین متاع بنالے گا۔

ایک صاحب نے تعجب کے ساتھ کہا کہ ہندستان میں ہریجن ترقی کر رہے ہیں اور مسلمان پیچھے جارہے ہیں۔ اس میں ہندستانی حکومت کی کوئی بہت گہری سازش نظر آتی ہے۔ میں نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا ہے۔ مگر وہ کسی سازش کی بنا پر نہیں ہو رہا ہے بلکہ خود قانون قدرت کے تحت ہو رہا ہے۔

ہریجنوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اپنی پوری تاریخ میں ترقی سے محروم رہے ہیں۔ جس قوم نے ترقی نہ کی ہو وہ ہزاروں سال تک بھی زندہ رہتی ہے، اس پر موت طاری نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی قوم مسلسل دباؤ میں رہتی ہے۔ یہ دباؤ اس کی زندگی کا ضامن بن جاتا ہے۔

زندہ سے مردہ بن جانے کا واقعہ ہمیشہ اس قوم کے ساتھ ہوتا ہے جو ترقی اور عروج کا درجہ حاصل کرلے۔ ایسی قوم میں وہ صورت پیش آتی ہے جو مسلمانوں میں پیش آئی۔ ان میں ایسے شعراء اور خطباء اور انشاپرداز پیدا ہوتے ہیں جو قوم کی گزری ہوئی عظمت کے ترانے گاتے ہیں۔ بطور خود وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ قوم کو جگا رہے ہیں۔ حالاں کہ باعتبار نتیجہ وہ ان کی عملی قوت کو سرد کر رہے ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ اس سے پدرم سلطان بود (paranoic character) کا مزاج پیدا ہوتا ہے۔ ایسے لوگ اپنا تشخص ماضی کے اعتبار سے قائم کرتے ہیں۔ جب کہ ان کے معاصر لوگ ان کے ساتھ ان کے آج کے اعتبار سے معاملہ کرتے ہیں۔ یہی فرق مذکورہ نفسیات

کو جنم دیتا ہے۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے سانحہ کے بعد بمبئی میں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے، اس کی رپورٹ امریکی اخبارات میں بھی شائع ہوئی تھی۔ ایک امریکی صحافی اینڈریو وارڈ (Andrew Ward) نے بمبئی جاکر وہاں کے حالات کا مشاہدہ کیا۔ اس کی رپورٹ واشنگٹن پوسٹ ۱۶ مارچ ۱۹۹۳ میں چھپی۔ اس رپورٹ کا خلاصہ میں نے یہاں کے مسلم میگزین (The Orange Crescent) کے شمارہ دسمبر ۱۹۹۳ میں دیکھا۔

اینڈریو وارڈ نے اپنا ایک احساس اس طرح لکھا ہے کہ جب میں نے بمبئی کے ہندوؤں سے پوچھا کہ وہ متعین طور پر بتائیں کہ مسلم پڑوسیوں کے ہاتھوں سے انھیں کیا تکلیف پہنچی ہے تو انھوں نے ہمیشہ قومی واقعات بیان کئے۔ انھوں نے پڑوس کے اچھے مسلم خاندان سے اپنے ذاتی تجربات کو نظر انداز کرتے ہوئے ناقابل لحاظ مستثنیات کو عموم کی حیثیت دے دی:

> When I asked Hindus how, specifically they had suffered at the hands of their Muslim neighbours, they reverted to nation alist abstractions and reduced their own experiences with the nice Muslim family next door to insignificant exceptions to the general rule.

اس معاملہ میں ٹھیک یہی حال مسلمانوں کا بھی ہے۔ ہر مسلمان اپنے قریبی ہندو سے اچھے سلوک کا تجربہ کر رہا ہے۔ مگر جب قومی سطح پر رائے قائم کرنا ہو تو وہ بعض مستثنیٰ واقعات (مثلاً اجودھیا) کو لے کر پوری ہندو قوم کے بارہ میں منفی احساسات کا شکار ہو جاتا ہے۔ طرز فکر کی اسی غلطی نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان باہمی تعلقات کو غیر ضروری طور پر تلخ بنا دیا ہے۔

شکاگو کے ایک مسلم ادارہ کی طرف سے بڑے سائز پر چھپا ہوا ایک آرٹیکل نظر سے گزرا۔ اس کا عنوان تھا — اسلام کو عقلی انداز میں کس طرح پیش کیا جائے:

How to present Islam : A rational approach

اس آرٹیکل میں اسلام کی مختلف تعلیمات کا مختصر تعارف تھا۔ مگر اس کو پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ وہ بس عام روایتی انداز میں ہے۔ اس کا انداز مجھے ریشنل کے بجائے ٹریڈیشنل نظر آیا، صرف اس فرق کے ساتھ کہ وہ انگریزی میں تھا۔

صبر کے بارہ میں اس میں بتایا گیا تھا کہ مسلمان کی زندگی مستقل جہاد کی زندگی ہے۔ اس جہاد میں مسلمان کو مخالفین کی طرف سے مختلف قسم کی مصیبتیں پیش آتی ہیں۔ ان مصیبتوں کو سہتے ہوئے جہاد جاری رکھنے کا نام صبر ہے (صفحہ ۱۹) پھر جہاد کے تعارف میں بتایا گیا تھا کہ جہاد اس کوشش کا نام ہے کہ خدا کے مکمل قانون کو زمین پر نافذ کیا جائے:

> This is hardest of the struggles (jihad), that is,to implement the rule of God on earth.

اصل حقیقت یہ ہے کہ صبر ایک عبادت ہے۔ موجودہ دنیا آدمی کے لئے آزمائش گاہ ہے۔ اس آزمائش میں اترنے کے لئے مستقل صبر کی ضرورت ہے۔ مومن کا اصل مقصد زمین پر نفاذ قانون نہیں ہے بلکہ اپنی ذات کو خدا کی مرضی کے مطابق ڈھالنا ہے۔ اس صابرانہ زندگی میں کبھی مخالفین سے مقابلہ بھی پیش آسکتا ہے۔ اس وقت بشرط استطاعت، مخالفین کے مقابلہ میں جمنے کا نام صبر ہوگا۔

میں نے ایک ہندستانی بزرگ کا عربی مقالہ پڑھا۔ اس کا عنوان تھا: الأُمّةُ الاسلامیۃ مُعَرّضَةٌ لِلخطر (امت اسلامیہ خطرات کی زد میں) اسی طرح ایک اردو ہفت روزہ میں ایک اور عالم کا مضمون تھا۔ اس کا عنوان تھا "امت اسلامیہ عالمی سازش کے نرغہ میں" ان مقالات میں بتایا گیا تھا کہ مسلم ملت اس وقت ساری دنیا میں خطرات ومسائل میں گھری ہوئی ہے۔ ہر جگہ اس کے وجود کو چیلنج کیا جارہا ہے۔ تمام قومیں اس کے خلاف سازش کا جال بچھانے میں مصروف ہیں۔ وغیرہ۔

یہ بات میں نے ہندستان میں پڑھی تھی۔ امریکہ کے مسلمانوں سے ملاقات اور گفتگو میں میں نے پایا کہ ان کا ذہن بھی ٹھیک یہی ہے۔ ایک صاحب جو امریکہ میں عزت اور خوشحالی کی زندگی گزار رہے ہیں انھوں نے جب یہی بات دہرائی تو میں نے کہا کہ آپ اس "دشمن ملک" میں اتنی اچھی زندگی گزار رہے ہیں، پھر آپ اپنی سوچ کو خود اپنے آپ سے کیوں نہیں شروع کرتے۔ آپ اخباری خبروں کی بنیاد پر کیوں ملت مسلمہ کے بارہ میں تبصرہ کر رہے ہیں۔

آجکل کے تعلیم یافتہ مسلمان مغربی پریس پر منفی خبررسانی (disinformation) کا الزام دیتے

ہیں۔ مگر یہ الزام خود مسلم پریس پر اس سے زیادہ بڑے پیمانے پر چسپاں ہوتا ہے۔ مسلم پریس اچھی خبروں کو نمایاں نہیں کرتا۔ وہ صرف ان خبروں کو مبالغہ آمیز انداز میں چھاپتا ہے جو منفی نوعیت کی ہیں۔ مسلم پریس کی اس منفی رپورٹنگ نے ساری دنیا میں مسلمانوں کے ذہن کو اس طرح بگاڑا ہے کہ وہ مثبت طرز فکر سے محروم ہو کر رہ گئے ہیں۔

اسلامی تاریخ کا ایک واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ صحابۂ کرامؓ ایک بار کسی علاقہ میں پیش قدمی کر رہے تھے۔ اس دوران انھیں ایک قلعہ کا محاصرہ کرنا پڑا۔ مگر انھوں نے پایا کہ محاصرہ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو رہا ہے۔ لمبی مدت تک قلعہ کا محاصرہ کرنے کے باوجود قلعہ فتح نہ ہو سکا۔

محاصرہ کی مدت جب غیر معمولی طور پر طویل ہو گئی تو ایک روز وہ لوگ مشورہ کے لئے بیٹھے۔ مشورہ میں جو بات خاص طور پر سامنے آئی وہ یہ تھی کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی تعلیمات میں سے کوئی تعلیم ہم سے چھوٹ گئی ہے۔ اسی لئے قلعہ کی فتح میں ہم کامیاب نہیں ہو رہے ہیں۔ چنانچہ تمام لوگ بیٹھ کر یہ سوچنے لگے کہ وہ کون سی اسلامی تعلیم ہے جو ہم سے چھوٹی ہے تاکہ اس پر فوراً عمل شروع کر دیا جائے۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آج اگر مسلم دنیا کے نمائندہ افراد ایک مقام پر جمع ہوں اور اس اسوۂ صحابہ کی روشنی میں یہ سوچیں کہ ہم سے کون سی سنت نبوی چھوٹ گئی ہے جس کی وجہ سے ہم پر موجودہ مصیبتیں آ رہی ہیں، تو مجھے یقین ہے کہ وہ اس رائے پر پہنچیں گے کہ ہم سے سنت دعوت چھوٹ گئی ہے۔ اس لئے کہ آج ہر سنت مسلمانوں میں دکھائی دیتی ہے مگر واحد سنت جس پر آج عمل مفقود ہے وہ سنت دعوت ہے۔

سیرت کانفرنس کا آغاز بوُینا ہوٹل (Buena Park Hotel) میں ۲۵ دسمبر ۱۹۹۳ کو ہوا۔ وسیع ہال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ ہال میں ڈیڑھ ہزار کے لئے کرسیاں تھیں۔ کھڑے ہوئے لوگوں کو ملا کر تقریباً سترہ سو آدمی موجود تھے۔ مختلف ملکوں سے آئے ہوئے لوگوں نے تقریریں کیں۔ مقررین کے نام یہ ہیں:

مسٹر صغیر اسلم صدر اسلامک سوسائٹی، ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی، ڈاکٹر جعفر عبدالسلام

ڈاکٹر سید سلمان ندوی، ڈاکٹر حسن حتحوت، ڈاکٹر جعفر شیخ ادریس، ڈاکٹر سلیمان نیانگ، ڈاکٹر عبد اللہ غازی، ڈاکٹر اسلم عبد اللہ، ڈاکٹر فضل مرزا، ڈاکٹر احمد صقر، ڈاکٹر مدثر حسین صدیقی، ڈاکٹر یحییٰ عبد الرحمان، ڈاکٹر احسان باغبی، ڈاکٹر نثار رحمٰی، ڈاکٹر نذیر خواجہ، ڈاکٹر حسن الدین ہاشمی، ڈاکٹر احمد النجار، ڈاکٹر محمد یونس، ڈاکٹر غلام نبی فائی، وغیرہ۔

میرے ساتھ عجیب قصہ ہوا۔ میں دہلی سے چلا تو میرے ذہن میں یہ تھا کہ کانفرنس میں زیادہ تر اردو داں لوگ ہوں گے اور میں زبانی تقریر کی صورت میں وہاں اپنے خیالات کا اظہار کر دوں گا۔ مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ اس میں سارا انگریزی کا ماحول ہوگا اور انگریزی ہی میں تمام تقریریں ہوں گی۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ ۲۳ دسمبر کی شام کو میں صغیر اسلم صاحب کے مکان میں اپنے کمرہ میں سو گیا۔ پہلی نیند کے بعد آنکھ کھلی تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور کل کے لئے انگریزی میں پیپر لکھنا شروع کر دیا۔ فجر کے وقت تک پانچ صفحہ کا ایک مضمون تیار ہو گیا۔ اس میں سیرت کی روشنی میں زندگی کی کامیابی کے دس اصول بتائے گئے تھے۔

اب سوال ٹائپ کرانے کا تھا۔ صغیر اسلم صاحب نے اس کو اسلامک سوسائٹی کے ٹائپسٹ کو دیا۔ مگر وہ شروع کرنے کے بعد اس کو پورا نہ کر سکے۔ کیوں کہ آج ان کو غیر معمولی مصروفیت تھی۔ اس کے بعد اس کو ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی نے لے لیا۔ وہ اس کو اپنے گھر لے گئے۔ وہاں ان کے صاحبزادہ نے اس کو کمپیوٹر پر ٹائپ کیا۔ پھر انھوں نے فیکس کے ذریعہ اس کو میری قیام گاہ پر بھیج دیا۔ یہ سب کام جمعہ کی رات تک ہو گیا۔ اگلے دن اجلاس میں میں نے اس کو پڑھا۔

لوگوں نے اس کو پسند کیا۔ بہت سے لوگوں نے اس کی کاپی طلب کی۔ ایک صاحب نے کہا کہ اس کو فریم کرکے ہر جگہ لٹکا دینا چاہئے۔ ڈاکٹر یحییٰ رحمان نے کہا:

It is because of people like you, that Islam keeps growing.

یہ مقالہ انشاء اللہ الرسالہ انگریزی میں شائع کر دیا جائے گا۔

اس کانفرنس میں امریکہ کے مختلف حصوں سے ڈیڑھ ہزار مسلمان شریک ہوئے۔ یہ سب تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ ان میں بہت سے الرسالہ پڑھنے والے بھی ملے۔ میں نے پایا کہ جو لوگ الرسالہ برابر پڑھتے ہیں انھیں کے اندر مثبت طرز فکر ہے۔ دوسرے لوگ عام طور پر منفی طرز فکر میں

مبتلا نظر آئے۔

قرآن وحدیث کا مطالعہ خالی الذہن ہو کر کیا جائے تو ان میں مثبت تفکیر کا پیغام ملے گا۔ مثلاً آپ قرآن کھولیں تو پہلی آیت شکر کی آیت ملے گی (الحمد للہ رب العالمین) گویا کہ قرآن وہ ذہن بنانا چاہتا ہے جو احساس یافت سے سرشار ہو۔ مگر آج مسلمانوں کا ذہن احساس محرومی سے بھرا ہوا ہے۔ اسی طرح آپ صحیح بخاری کھولیں تو شروع ہی میں آپ کو یہ حدیث پڑھنے کو ملے گی کہ انما الاعمال بالنیات۔ گویا پیغمبر اسلام مسلمانوں میں وہ ذہن پیدا کرنا چاہتے ہیں جو اندرونی حقیقتوں کو اہمیت دے، ظاہری باتوں کو وہ نظرانداز کر دے۔ مگر آج مسلمانوں کی پوری سوچ ظواہر پر اٹکی ہوئی ہے۔ حقائق کی انھیں سرے سے خبر ہی نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے فہم اسلامی کا ماخذ حقیقۃً قرآن وحدیث نہیں ہے۔ اس کا ماخذ ان مفکرین کی کتابیں ہیں جو ردعمل کی نفسیات میں مبتلا تھے۔ اسی نفسیات کے تحت انھوں نے اسلام کی تعبیر پیش کی۔ اس تعبیری لٹریچر نے مسلمانوں کے اندر قرآن وسنت والا ذہن نہیں بنایا بلکہ ردعمل کا ذہن بنا دیا۔ یہی منفی ذہن ہے جس کا مظاہرہ آج ہر طرف نظر آتا ہے۔ اسی ذہن کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ہر جگہ یا تو لفظی ٹکراؤ جاری ہے یا شمشیری ٹکراؤ۔

ایک سیاہ فام نومسلم نے تقریر کرتے ہوئے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی انٹلکچول نہیں تھے:

Prophet Muhammad was not an intellectual.

اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ میرا خیال ہے کہ مذکورہ نومسلم کی نیت بخیر تھی۔ وہ جو بات کہنا چاہتا تھا اس کے لئے اس نے غلط لفظ کا استعمال کیا۔ غالباً وہ کہنا چاہتا تھا کہ پیغمبر اسلام آجکل کے رسمی تعلیمی تصور کے مطابق کوئی ڈگری یافتہ آدمی نہیں تھے۔ اسی بنا پر آپ کو اُمّی کہا گیا ہے۔ مگر انٹلکچول ہونا اس سے الگ چیز ہے، اور اس اعتبار سے بلاشبہ آپ ایک سپر انٹلکچول انسان تھے۔

۲۵ دسمبر کی شام کو نماز مغرب کے بعد اعزازی دعوت (banquet) کا انتظام تھا۔ اس میں پرنس محمد فیصل السعود بھی شریک ہوئے۔ وہ امریکہ کی سعودی ایمبیسی میں ڈپارٹمنٹ آف

اسلامک ایفرس کے چیرمین ہیں۔ چند خاص افراد ان کے ساتھ کھانے میں بٹھائے گئے تھے۔ مجھ کو بھی بلاکر اس میں شریک کیا گیا تھا۔ میں خاموشی سے آکر بیٹھ گیا۔ انھوں نے ابتداءً مجھ کو پہچانا نہیں۔ وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ گفت گو میں مشغول رہے۔ اس درمیان ایک عرب ڈاکٹر عبد القادر النجار آگئے۔ انھوں نے میرے بارہ میں بتایا کہ یہ فلاں شخص ہیں اور ان کی بہت سی کتابیں ہیں۔ پرنس فیصل اس سے پہلے رزرویشن کے ساتھ بات کر رہے تھے۔ مگر میرے بارہ میں جانتے ہی وہ بہت خوش ہوئے اور کھل کر باتیں کرنے لگے۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے آپ کی کتاب الاسلام یتحدیٰ اس وقت پڑھی جب کہ میری عمر ۱۶ سال تھی۔ ہم لوگ اس کے بارہ میں مذاکرے کیا کرتے تھے۔ شیخ نجار نے میرے بارہ میں بتایا کہ انھوں نے انگریزی میں انسائیکلوپیڈیا آف قرآن تیار کی ہے اور اب اس کو چھپوا رہے ہیں۔ پرنس نے بہت دلچسپی ظاہر کی اور کہا کہ چھپتے ہی ان کے نام ایک نسخہ روانہ کیا جائے۔

ان کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی گئی وہاں بھی انھوں نے اپنی انگریزی تقریر میں سب سے پہلے یہی بات کہی کہ مجھے آکر جب معلوم ہوا کہ یہاں شیخ وحید الدین موجود ہیں تو مجھے تعجب انگیز خوشی (pleasant surprise) ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ مسلم نوجوانوں کو یہ کتاب خاص طور پر پڑھنا چاہئے جو عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں موجود ہے۔ وغیرہ۔

جلسہ کے خاتمہ پر جب پرنس محمد فیصل السعود باہر نکلے تو گیٹ پر تین مسلم نوجوان انگریزی میں ان کے خلاف زور زور سے بولنے لگے۔ منتظمین جلسہ کے بارہ میں انھوں نے کہا کہ آپ لوگ ان کو ہزاکسی لنسی کہکر خطاب کرتے ہیں، حالاں کہ سعودی تو ایسے اور ایسے ہوتے ہیں۔ پرنس تو فوراً چلے گئے۔ مگر نوجوان بدستور زور زور سے چلّاتے رہے۔

میں وہاں کھڑا ہوکر اس منظر کو خاموش دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ہوٹل کے جنرل مینجر مسٹر جاوید نواز آگئے۔ اگرچہ لڑکے نہایت اشتعال انگیز انداز اختیار کئے ہوئے تھے۔ مگر مسٹر جاوید نواز ذرا بھی مشتعل نہیں ہوئے۔ انتہائی ٹھنڈے انداز میں انھوں نے کہا کہ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ پرائیویٹ پراپرٹی ہے۔ آپ کو میں پانچ سکنڈ دیتا ہوں۔ آپ پانچ سکنڈ میں یہاں سے چلے جائیے۔ ورنہ میں آپ کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ یہ سنتے ہی ان نوجوانوں کا حال ایسا ہوگیا

جیسے غبارہ کی ہوا نکل جائے۔ وہ خاموش ہو کر تیزی سے باہر چلے گئے —— میں نے سوچا کہ جھوٹی بہادری ہمیشہ جھوٹی بز دلی پر ختم ہوتی ہے۔

امریکہ میں مسلم نوجوانوں کی ایک انتہاپسند جماعت ہے۔ غالباً یہ لوگ اسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ لوگ ان مسلمانوں کو گمراہ سمجھتے ہیں جو "خلافت" کے لئے کوشش نہ کر رہے ہوں۔ وہ امریکہ میں اسلامی خلافت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کیلی فورنیا دراصل خلیفورنیا ہے۔ اور سب سے پہلے اسلامی خلافت یہیں قائم ہوگی۔

اس طرح کی کانفرنسوں میں عام طور پر اہل علم جمع ہوتے ہیں۔ اس لئے ان میں اسٹیج کی تقریریں ہی سب کچھ نہیں ہوتیں۔ یہاں کھانے کی میز پر یا دوسرے مواقع پر جو ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں، ان میں بھی اکثر علمی باتیں جاری رہتی ہیں۔

ایک بار کھانے کی میز پر طرز تحریر کے بارہ میں باتیں ہونے لگیں۔ مختلف لوگوں نے مختلف باتیں سنائیں۔ ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی نے بتایا کہ ٹامس جیفرسن کی عادت تھی کہ وہ مختصر خط لکھا کرتا تھا۔ کسی نے اس سے کہا کہ آپ ہمیشہ مختصر خط لکھتے ہیں۔ ٹامس جیفرسن نے جواب دیا کہ اگر میرے پاس زیادہ وقت ہوتا تو میں اور بھی مختصر خط لکھتا:

If I had more time, I would have written even shorter letters.

نیویارک کے انگریزی سہ روزہ (The Minaret) کے اڈیٹر مسٹر محمد عبدالمنعم نے ۲۶ دسمبر کی شام کو انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے حالات سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ بہت سے لوگ انڈیا کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جیسے وہ کوئی استثنائی ملک ہو اور وہاں مسلمانوں کے لئے ظلم ہی ظلم ہو۔ میں اس قسم کے نظریہ کو بالکل بے بنیاد سمجھتا ہوں۔ انڈیا میں بھی مسلمانوں کے لئے ترقی کے وہی مواقع ہیں جو دوسرے ملکوں میں ان کے لئے ہیں۔ ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ پچھلے سو سال میں بدقسمتی سے انڈیا میں ایسے مسلم لیڈر اٹھے جو مسلمانوں کو زندگی کی شاہراہ سے بھٹکاتے رہے۔ انھوں نے مسلمانوں کے ذہن کو مسائل میں الجھائے رکھا۔ جب کہ صحیح رہنمائی یہ ہے کہ لوگوں کو مواقع کو استعمال کرنے کی طرف متوجہ کیا جائے۔

انھوں نے کہا کہ حیدرآباد میں تقسیم سے پہلے ایک بار ایسا ہوا کہ بہادر یار جنگ کے ایک عزیز کو ہندوؤں نے قتل کر دیا۔ اس کے بعد مسلمان تلوار لے کر نکل آئے۔ وہ ایک طرف سے ہندوؤں کو مارنا چاہتے تھے۔ مگر بہادر یار جنگ نے کہا کہ جس ہندو نے میرے عزیز کو قتل کیا ہے تم صرف اس کو مار سکتے ہو، سارے ہندوؤں کو نہیں مار سکتے۔ کیا آپ ہندوؤں میں ایسی کوئی ایک مثال بتا سکتے ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ کو ایک نہیں، بہت سی مثالیں بتا سکتا ہوں۔ میرے خود اپنے وطن کا قصہ ہے۔ ایک مسلمان نے ایک ہندو (چھتر دھاری سنگھ) کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد سیکڑوں ہندو مقتول کے گھر پر جمع ہوگئے۔ انھوں نے چاہا کہ قاتل مسلمان کا تعلق جس گاؤں سے ہے اس گاؤں کے تمام مسلمانوں کو سخت سزا دیں۔ مگر مقتول کے بھائی نے زبردست مخالفت کی۔ اس نے ہندوؤں کی بھیڑ کو گاؤں میں داخل ہونے نہیں دیا۔ اس نے کہا کہ ہم دوسرے مسلمانوں کو نہیں ماریں گے اور نہ ہم قانون کو اپنے ہاتھ میں لیں گے۔ ہم قاتل مسلمان کو عدالت سے سزا دلوائیں گے۔ چنانچہ اس نے عدالتی کارروائی کی۔ چند سال تک مقدمہ جاری رہا۔ آخر کار عدالت سے قاتل کو لمبی مدت کی قید کی سزا ملی۔ ہندو مقتول کے بھائی نے روکا نہ ہوتا تو یقیناً بپھری ہوئی بھیڑ مسلمان قاتل کے گاؤں کو جلا دیتی۔ مقتول کے بھائی چتری سنگھ ابھی زندہ موجود ہیں۔

۲۷ دسمبر کو فجر کی نماز اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں پڑھی۔ ایک عرب امامت کر رہے تھے۔ انھوں نے پہلی رکعت میں قرأت یہاں سے شروع کی: انّ ھٰذا القرآن یَقُصّ علیٰ بَنیٓ اسرائیل اکثر الذی ھم فیہ یختلفون (النمل ۷۶) اس آیت پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ ٹھیک یہی کام خود مسلمانوں میں بھی جاری رہتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ اللہ ہر سو سال میں ایک شخص اٹھاتا ہے جو دین کی تجدید کرتا ہے۔ یہ تجدید عین وہی چیز ہے جس کا مذکورہ آیت میں ذکر ہے۔ وقت گزرنے پر ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ مختلف معاملات میں دینی نقطۂ نظر کیا ہے، یہ گم ہو جاتا ہے۔ طرح طرح کے منحرف نقطۂ نظر رائج ہو جاتے ہیں۔ اس وقت اللہ کی توفیق سے ایک آدمی فہم و بصیرت والا اٹھتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں صحیح دینی نقطۂ نظر کا اعلان کرتا ہے۔ وہ تطہیر افکار کا کام انجام دیتا ہے۔ یہی کام بذریعہ قرآن اہل کتاب کے درمیان انجام پایا۔ اور یہی کام، ختم نبوت کے بعد، مجدد

کے ذریعہ امت محمدی میں جاری رہے گا۔

امام صاحب نے دوسری رکعت کے آخر میں لمبی قنوت نازلہ پڑھی۔ اس میں دو بار انھوں نے کہا: اللّٰھم دمّر دیار الکافرین۔ اسی قسم کے الفاظ انڈیا کی مسجدوں میں بھی سنائی دیتے ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے مسلمانوں کی اس دعا کو قبول نہیں کیا۔ اگر فی الواقع یہ دعا قبول ہوجاتی اور کافروں کی تدمیر دیار کر دی جاتی تو خود دعا کرنے والوں کا بھی خاتمہ ہوجاتا۔ کیوں کہ یہ حضرات خود بھی انھیں کافروں کے درمیان رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دعا ہجرت کے بعد ہے نہ کہ ہجرت سے پہلے۔

دوسری بات یہ ہے کہ موجودہ حالات میں ہمارے لئے یہ دعا جائز ہی نہیں۔ اس وقت ہم دعوت کے مرحلہ میں ہیں نہ کہ براءت کے مرحلہ میں۔ دعوت کے مرحلہ میں صبر ہے نہ کہ بد دعا۔ داعی کو یک طرفہ طور پر مدعو کی زیادتیوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے، اس کے بغیر دعوت کے عمل کو انجام دینا ممکن نہیں۔

آرنج کاونٹی کے روزنامہ رجسٹر (۲۷ دسمبر ۱۹۹۳) کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا صفحہ ۴ جنگ (War) کی خبروں کے لئے تھا۔ اس صفحہ پر تین بڑے بڑے اشتہار تھے۔ صرف ایک خبر جنگ کی تھی اور وہ بوسنیا کے بارہ میں تھی۔ اس کی سرخی یہ تھی:

Muslim-led forces fight to win back lost territory.

دوسری خبر صفحہ ۸ پر اختلاف (Dispute) کے زیر عنوان تھی۔ یہ پیرس کے بارہ میں تھی۔ اس کا خلاصہ اس کی سرخی میں اس طرح تھا:

Muslim leader criticized schools' anti-scarf rules.

موجودہ زمانہ کے عالمی میڈیا میں مسلمان تشدد، اختلاف اور ٹکراؤ کا نشان بن گئے ہیں۔ مسلم دانشور اس کو غلط اطلاع (disinformation) کہتے ہیں۔ میں نے بہت غور کیا کہ یہ لوگ کیوں ایسا کہتے ہیں جب کہ بطور واقعہ ہر جگہ وہ یہی کر رہے ہیں۔ مسلم ملکوں میں نفاذ قانون کے نام پر، غیر مسلم ملکوں میں مداخلت فی الدین کے نام پر، اسی طرح کہیں جہاد حریت کے نام پر۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لیڈر چاہتے ہیں کہ وہ خواہ جو کچھ کریں ہر حال میں ان کو اسلام کا کریڈٹ

حاصل رہے۔ وہ دنیا کے لئے رحمت بنیں اس کے باوجود دنیا ان کو رحمت کا خطاب دے۔ مگر خدا کی دنیا میں کبھی ایسا ہونے والا نہیں۔ مسلمان کی تصویر ان کے اپنے اعمال کی بنیاد پر بنے گی نہ کہ ان کی خواہش کی بنیاد پر۔

کشمیر کے ڈاکٹر غلام نبی فائی بھی اس کانفرنس میں آئے تھے۔ ان کے خط کے جواب میں صدر کلنٹن کے خط (مورخہ ۲۷ دسمبر ۱۹۹۳) کا ہندستانی اخباروں میں کافی چرچا ہوا۔ انھوں نے اس خط کی ایک کاپی مجھے دی۔ امریکہ کے شعبہ خارجہ کے ایک افسر مسٹر ایوجین پرائس جونیر (Eugene D. Price Jr.) سے میں نے اس خط کی بابت پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ انڈیا نے غیر ضروری طور پر اس خط کو اہمیت دے دی۔ اس طرح کا خط تو روٹین کے طور پہ ہمارے یہاں سے روزانہ جاتا رہتا ہے۔ دفتر خارجہ کے کارکنوں کو ایک عام پالیسی بتا دی جاتی ہے۔ اس کے تحت وہ خود اس طرح کے خطوط کے جوابات دیتے رہتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ خود صدر کلنٹن ڈکٹیٹ کرا کے اس خط کو لکھوائیں۔ انھوں نے کہا کہ کشمیر کے بارہ میں ہماری پالیسی وہی ہے جو پہلے تھی۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

ایک کشمیری مسلمان نے کہا کہ فلپائن کا ایک کھلاڑی ٹینس کا ماہر تھا۔ وہ شاندار کھیل دکھا رہا تھا کہ اچانک فیلڈ کے اندر ہی گر پڑا اور فوراً مر گیا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اس واقعہ کو اخبار میں پڑھا تو میں نے کہا کہ آج مجھے یقین ہو گیا کہ کشمیر آزاد ہو کر رہے گا۔

یہ صاحب اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ وہ کشمیری تحریک میں ایک لیڈر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو لوگ کشمیر کی پر تشدد تحریک چلا رہے ہیں وہ کتنے سادہ لوح لوگ ہیں۔

شکاگو کے الینوئی انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی (I.I.T.) میں انڈین طلبہ اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ لوگ مذاق سے اس کو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کہنے لگے ہیں۔ یہ بات عبد الحمید سیمجی نے بتائی۔ کھانے کی میز پر ایک صاحب نے کہا کہ "یہودی مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں"۔ عبد الحمید سیمجی نے کہا کہ ہم لوگوں کا یہی ذہن ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ انھوں نے کہا کہ میری لڑکی نیوجرسی کے اسپتال میں ڈاکٹر ہے۔ وہاں ایک یہودی جونیر ڈاکٹر میری بیٹی کو آنٹی کہتا ہے۔ جو کام وہ کہتی ہے فوراً بھاگ کر اس کو کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ ایک مسلم خاتون ہیں۔ مگر وہ

THE WHITE HOUSE

WASHINGTON

December 27, 1993

Dr. Ghulam Nabi Fai
Executive Director
Kashmiri-American Council
Suite 1100
733 15th Street, N.W.
Washington, D.C. 20005

Dear Ghulam:

Thank you so much for your kind words about my recent speech to the United Nations General Assembly.

I share your belief that, in order to face the dilemmas of a post-Cold War global landscape, we all must look closely at our policies with regard to human rights. I am confident that we can bring about changes that are consistent with what the U.N. founders envisioned.

I look forward to working with you and others to help bring peace to Kashmir, and I appreciate your input.

Sincerely,

Bill Clinton

صرف اس لئے ایسا کرتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح وہ اپنی تعلیمی ترقی جاری رکھ سکے گا۔ لوگوں کا اصل کنسرن ان کا اپنا انٹرسٹ ہے نہ کہ دوسروں کی دشمنی۔ عبدالحمید سیجی صاحب اس راز کو سمجھ گئے ہیں کہ اس دور میں ترقی کا راز تعلیم ہے۔ اپنے سب بچوں کو انھوں نے اعلیٰ تعلیم پر لگایا ہے۔

ایک بچہ جو یہاں کے ایک اسلامی اسکول میں پڑھتا ہے، اس سے میں نے کہا کہ کوئی آپ سے یہ پوچھے کہ اسلام کیا ہے (What is Islam) تو آپ کیا جواب دیں گے۔ بچہ کچھ جواب نہ دے سکا۔ پھر میں نے کہا کہ اچھا یہ بتائیے کہ اسلام کے ارکان (Pillars) کتنے ہیں۔ اس نے فوراً جواب دیا: پانچ، اور پھر شہادہ سے لے کر حج تک پانچ ارکان گنا دئے۔ میں نے سوچا کہ اس طرح کے اسلامی اسکولوں سے بچہ ایک رٹے ہوئے اسلام کو تو جان لے گا مگر وہ اس اسلام کو نہیں سیکھ سکتا جو اس کے ذہن کا جزء بن گیا ہو۔ وہ رٹی ہوئی باتوں کا جواب دہرائے گا۔ مگر اپنی سمجھ کو کام میں لاکر کوئی جواب دینا ہو تو وہ ایسا جواب دینے سے عاجز ثابت ہوگا۔

ایک صاحب کی تقریر یہاں کی ایک مسجد میں سنی۔ وہ انگریزی میں بول رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ کیوں ایسا ہے کہ ساری دنیا اسلام کی مخالف ہوگئی ہے:

Why is it that the whole of the world is against Islam.

اس کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کی دنیا میں تمام لوگ سیکولر ہوگئے ہیں۔ حتی کہ مسلم ممالک بھی سیکولرزم کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ سوال اور یہ جواب دونوں ہی غلط ہیں۔ نہ تو ایسا ہے کہ ساری دنیا اسلام کے خلاف ہوگئی ہے، اور نہ ایسا ہے کہ سیکولرزم اسلام کا دشمن ہے۔

بالفرض اگر دنیا اسلام کی مخالف ہوگئی ہو اور بالفرض سیکولرزم اسلام کے دشمن کے طور پر ظاہر ہوا ہو تب بھی اس قسم کی تقریر کرنا درست نہیں۔ ایسی حالت میں بھی مقرر کو یہ کہنا چاہئے کہ اسلام کی مخالفت اسلام کے نئے دور کی تمہید ہے۔ کیوں کہ جس نظریہ کی زیادہ مخالفت کی جائے وہ ہمیشہ ابھر کر رہتا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اسلام کی مخالفت کو اسلام کے چرچا کے معنی میں لیں اور اس کو اسلام کی دعوت کے لئے استعمال کریں۔

ایک مسلم ملک کے خطیب قائد امریکہ آئے۔ یہاں انھوں نے اردو داں مسلمانوں کے

سامنے ایک تقریر کی۔ یہ تقریر چھپی ہوئی مجھ کو ملی جس کو میں نے پڑھا۔ اس میں انھوں نے کہا تھا کہ "اسلامی تحریک، خواہ وہ امریکہ میں ہو یا اور کسی ملک میں، وہ کوئی تبلیغی تحریک نہیں، وہ اسلامی نظام قائم کرنے کی انقلابی مہم ہے۔ ہم اللہ کے دین کو ایک کامل سماجی سیاسی، سماجی، اقتصادی نظام (politico-socio-economic system) کی حیثیت سے قائم و نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اس قیام و نفاذ کے لئے ہم مسلح ٹکراؤ تک جانے کے لئے تیار ہیں۔" اسلام کی یہ تشریح سراسر بے بنیاد ہے۔ اسلامی تحریک اصلاً تبلیغی تحریک ہی ہے۔ امریکہ میں یہ اعلان لغویت کی حد تک بے معنی ہے کہ تم اپنے ملک میں اسلام کا سیاسی، سماجی، معاشی قانون نافذ کرو، ورنہ ہم تم سے مسلح جہاد شروع کر دیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ میں ہماری اصل ذمہ داری یہ ہے کہ ان کو ہم توحید اور آخرت کی حقیقت سے آگاہ کریں۔ اسلام کے اجتماعی قانون کا نفاذ ثانوی دعوت نہیں ہے۔ وہ کسی خطۂ ارض میں مسلم معاشرہ بن جانے کے بعد اس معاشرہ کی ذمہ داری ہے۔

انڈو اسلامک فاؤنڈیشن آف امریکا (شکاگو) نے ۸ صفحہ کی ایک کتاب بابری مسجد کے موضوع پر ۱۹۹۳ میں چھاپی ہے۔ اس کے مؤلف ڈاکٹر عبد اللہ غازی ہیں۔ اس انگریزی کتاب کے آغاز میں اقبال کی اردو نظم "رام" ایک صفحہ پر نمایاں انداز میں چھاپی گئی ہے اور اگلے صفحہ پر اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں پہلی بار میں نے اقبال کی یہ پوری نظم دیکھی۔ وہ اس طرح تھی:

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند

یہ ہندیوں کے فکرِ فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بامِ ہند

اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نامِ ہند

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شامِ ہند

تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں مرد تھا
پاکیزگی میں، جوشِ محبّت میں فرد تھا

ایک پاکستانی مسلمان (مسٹر ریاض احمد۔ مقیم نیویارک) نے کہا کہ میں آپ کے الرسالہ کا قاری ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کی تحریریں دورِ حاضر کے لئے بے حد مفید ہیں۔ مگر ایک چیز مجھے

کھٹکتی ہے۔ وہ یہ کہ آپ کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ تقسیم ہند کے خلاف ہیں۔ مگر آپ کی یہ رائے درست نہیں۔ جب سے میں امریکہ آیا ہوں مجھے یقین ہوگیا کہ جناح صاحب نے پاکستان بنوا کر بہت اچھا کیا۔ کیوں کہ ہم مسلمانوں کا اپنا ایک دیش تو ہے جو ہماری قومی پہچان ہے۔

میں نے کہا کہ جب آپ اور آپ جیسے لاکھوں پاکستانی مسلمان علٰحدہ دیش کو اتنا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں تو اپنا الگ دیش بنوا نے کے بعد وہ دوبارہ یورپ اور امریکہ میں آ کر بے دیش کیوں ہورہے ہیں۔ آپ لوگوں کا پاکستان چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں آباد ہونا خود آپ کے بیان کی تردید ہے۔ اگر پاکستان بننے کے بعد بھی آپ لوگوں کو غیر پاکستان میں رہنا تھا تو ایسی حالت میں پاکستان بنوانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ آپ لوگ علٰحدہ ملک بنوانے کے بعد دوبارہ مشترک ملک میں رہ رہے ہیں۔ مزید یہ کہ اس تقسیمی سیاست نے مسلمانوں کو اتنا زیادہ نقصان پہنچایا ہے جس کی تلافی صدیوں میں بھی نہیں ہوسکتی۔

واشنگٹن کے سعودی سفارت خانہ کی طرف سے ایک عربی پمفلٹ تقسیم کیا گیا۔ اس میں شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کے کچھ فتاویٰ جمع کئے گئے تھے۔ ایک سوال وجواب یہ تھا:

س هل يجوز أنْ يُعطى الكافر نسخة من معاني القرآن الكريم علماً انها تحتوي على القرآن الكريم كاملاً في الصفحة المقابلة۔

ج لاحرج في اعطاء الكافر نسخة من معاني القرآن الكريم لِان الحكم للترجمة ولما في ذالك من البلاغ والدعوة الى الاسلام۔

یعنی ایک کافر کو با ترجمہ قرآن دیا جاسکتا ہے۔ اس میں اگرچہ متن شامل ہے مگر وہ ترجمہ کے حکم میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں تبلیغ ودعوت کا فائدہ مضمر ہے۔ یہ بلاشبہ صحیح فتویٰ ہے۔ جو لوگ غیر مسلموں کو باترجمہ قرآن دینے سے منع کرتے ہیں وہ دعوت وتبلیغ کے احساس سے خالی ہیں۔ وہ اسلام کی اسپرٹ کو سمجھنے سے محروم ہیں۔

ایک امریکی خاتون نے اسلام قبول کرلیا۔ اب وہ ایک پاکستانی مسلمان نصیر احمد مرزا سے نکاح کرکے اوٹا (Utah) میں رہتی ہیں۔ ان کا نام جے اے مرزا (Jeanine Aisha Mirza) ہے۔ ان کا ایک انٹرویو میں نے پڑھا۔ اس کا ایک حصہ یہ تھا کہ اکثر امریکی یہ سمجھتے ہیں کہ مسلم بیویاں

زیادتی کا شکار ہوتی ہیں۔ مگر ان کے نزدیک یہ خیال درست نہیں۔ یہ تو محض ایک تقسیم ہے۔ گھر کے باہر میرا شوہر باس ہے۔ لیکن گھر کے اندر میں باس ہوں :

While most Americans are under the impression that Muslim wives are oppressed, Mirza said, she hasn't found that to be true. "It's just a different division. Outside the home, my husband's the boss. But in my house, I'm the boss."

اس طرح کے متعدد واقعات میرے علم میں آئے۔ امریکہ کی لڑکیاں سفید فام نسل کے لڑکوں سے شادی کرنے میں متردد رہتی ہیں۔ کیوں کہ انھیں ہر وقت طلاق کا ڈر لگا رہتا ہے۔ اس بنا پر اکثر سنجیدہ لڑکیاں مسلمان لڑکوں سے شادی کرنا پسند کرتی ہیں۔ یہ وہ لڑکے ہیں جو تعلیم وغیرہ کے مقصد سے امریکہ آتے ہیں۔ اس طرح کی شادیاں اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بن رہی ہیں۔ کیوں کہ اخبار کے لوگ ان امریکی لڑکیوں سے سوالات کرتے ہیں۔ اور وہ نہایت عمدہ انداز میں اسلام کی طرف سے دفاع کرتی ہیں۔ جس کی ایک مثال اوپر نقل ہوئی۔

امریکہ میں انڈیا کے "مظلوم مسلمانوں" کے نام پر بہت سی تنظیمیں قائم ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو انڈیا سے براہ راست یا براستہ پاکستان امریکہ گئے اور پھر وہاں کے شہروں میں آباد ہو گئے۔ اپنی معاشی سرگرمیوں کے ساتھ انھوں نے انڈین مسلمانوں کی ہمدردی میں مختلف ناموں سے ادارے قائم کر رکھے ہیں۔

اس قسم کے ایک مسلمان نے مجھے ۸۰ صفحہ کی ایک انگریزی کتاب دی۔ اس میں مختلف اخبارات سے انڈیا کے مسلمانوں کے بارہ میں خبروں اور رپورٹوں کو جمع کیا گیا تھا۔ اس کا نام تھا:

Oppression in India : A Case Study of Human Rights Violations

میں نے ان سے کہا کہ آپ لوگوں کو اگر انڈیا کے مسلمانوں سے واقعی ہمدردی ہے تو آپ ان کو چھوڑ کر یہاں کیوں چلے آئے۔ میں نے کہا کہ اس قسم کے مضامین اور کتابیں چھاپ کر آپ انڈیا کے مسلمانوں کی کوئی خدمت نہیں کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ انڈیا کے مسلمانوں کے جو مسائل ہیں اس کے ذمہ دار خود آپ جیسے مسلم دانش ور ہیں۔ آپ لوگ خود تو امریکہ میں آخری حد تک ایڈجسٹ کر کے رہتے ہیں اور ہندستانی مسلمانوں کو یہ سکھلاتے ہیں کہ وہاں وہ ٹکراؤ کر کے رہنے کی کوشش کریں۔

امریکہ میں آپ لوگوں کو جو پیس حاصل ہے وہ ایڈجسٹمنٹ کی قیمت ہے، اور انڈیا کے مسلمانوں کو جو مسائل درپیش ہیں وہ ایڈجسٹمنٹ نہ کرنے کا نتیجہ ہیں۔

انھوں نے کچھ جواب دینے کی کوشش کی۔ مگر ان کے ایک ساتھی نے یہ کہہ کر انھیں چپ کر دیا کہ مولانا صاحب صحیح کہہ رہے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ آپ لوگ انڈیا اور پاکستان میں گاڑی چلاتے ہیں تو بار بار ہارن بجاتے ہیں مگر آپ ہی لوگ جب امریکہ کی سڑکوں پر گاڑی چلاتے ہیں تو کبھی ہارن نہیں بجاتے۔ یہی تو وہ کہہ رہے ہیں۔ آپ کو اگر ہمت ہے تو یہاں اسی طرح ہارن بجا کر دیکھ لیجئے۔

۲۷ دسمبر کی شام کو میں صغیر اسلم صاحب کے دفتر میں تھا۔ انھوں نے ایک پیکٹ نکالا۔ اور اس کو مجھے دیتے ہوئے کہا کہ یہ کیلی فورنیا کی کھجور ہے۔ میں نے ایک کھجور ہاتھ میں لی۔ پھر میں نے صغیر اسلم صاحب سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں ایک بار بھوک کی حالت میں تھے۔ ایک انصاری آپ کو اور چند صحابہ کو اپنے ساتھ لے کر اپنے باغ میں گئے۔ وہاں وہ درخت سے کھجوروں کا ایک خوشہ توڑ کر لائے اور پانی پیش کیا۔ آپ نے کھجور کھا کر پانی پیا۔ پھر آپ نے فرمایا: یہ بھی ان نعمتوں میں سے ہے جس کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ تم سے سوال کیا جائے گا۔ (ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ)

میں نے کہا کہ ایک صورت یہ ہے کہ آدمی کھجور کو بس امریکہ کی کھجور سمجھے۔ ایسی حالت میں اس نے اس کھجور کو صرف پیداوار امریکہ کے طور پر پایا، اس نے اسے تخلیق خداوندی کے طور پر نہیں پایا۔ گویا کہ وہ امریکی صنعت کو دیکھ سکا مگر وہ خدائی صنعت کو دیکھنے سے محروم رہا۔ ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ: من كان في هٰذه أعمىٰ فهو في الآخرة أعمىٰ (الاسراء ۷۲)

خدا اس دنیا میں اپنی صفات کے ساتھ ظاہر ہوا ہے۔ آخرت میں وہ اپنی ذات کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ جو آدمی صفات کی صورت میں خدا کو نہ دیکھ سکے وہ ذات کی صورت میں بھی خدا کو دیکھنے سے محروم رہے گا۔ اور بلا شبہ اس سے بڑی محرومی اور کوئی نہیں۔

میں نے کہا کہ میکسیکو کا ایک سیاح اسپین گیا۔ وہاں وہ قصر الحمرا، دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک اندھا فقیر وہاں آکر کھڑا ہوگیا۔ سیاح نے اپنی بیوی سے کہا کہ اس فقیر کو بہت زیادہ دے دو۔

کیوں کہ کسی آدمی کی اس سے بڑی محرومی اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ وہ الحمراء کے سامنے اندھا ہو۔

بلاشبہ یہ محرومی بڑی عجیب ہے کہ آدمی الحمراء جیسے خوبصورت محل کے سامنے کھڑا ہو اور وہ اس کو دیکھنے کے لئے اندھا ہو۔ مگر اس سے بے شمار گنا زیادہ محرومی وہ ہوگی جب کہ خدا اپنے جمال و کمال کے ساتھ آخرت میں ظہور فرمائے گا مگر حال یہ ہوگا کہ بہت سے لوگ وہاں کھڑے ہونگے مگر وہ اپنے اندھے پن کی وجہ سے اس کو دیکھنے کی سعادت نہیں پائیں گے۔

اسلامک سوسائٹی آف آرنج کاونٹی کے ریڈنگ روم میں مختلف زبانوں کے کئی پرچے دیکھے ریاض کے عربی ہفت روزہ المسلمون (۲۴ دسمبر ۱۹۹۳) کے آخری صفحہ پر ایک خبر تھی جس کا عنوان تھا: الآلاف دخلوا الاسلام (ہزاروں آدمی اسلام میں داخل ہوگئے) دکتور صلاح الصاوی (استاذ جامعۃ الازہر) کے حوالے سے ایک رپورٹ تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ امریکی فوجیوں کی پانچ ہزار تعداد اسلام میں داخل ہوگئی۔ یہ خلیج کے بحران کے دوران اس وقت ہوا جبکہ امریکی فوجیوں اور سعودی نوجوانوں کے درمیان اختلاط ہوا:

ان أعداد أكبير ة قيل انها ۵۰۰۰ جندی امریکی قد دخلوا الاسلام حينما اتيح لهم الاختلاط بالشباب السعودی۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہندستانی مسلمانوں کے مسائل کے بارہ میں مجھے بہت زیادہ تشویش ہے۔ وہ مظلوم ہیں۔ وہ نصف صدی سے زیادتی کا شکار ہورہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہندستان جاکر ان کی خدمت کروں۔ میں نے کہا کہ اگر آپ وہاں جاکر انھیں یہی سبق دینا چاہتے ہیں کہ تم مظلوم ہو تو آپ خود ان کے اوپر سب سے بڑا ظلم کریں گے۔ کیوں کہ کسی قوم کو مظلوم و مقہور بتانا، اور اس کو شکست کے احساس میں مبتلا کرنا گویا نفسیاتی اعتبار سے اس کو قتل کرنا ہے۔ کسی قوم کو آپ احساس یافت پر کھڑا کرسکتے ہیں، احساس محرومی پر کسی قوم کو کھڑا کرنا ممکن نہیں۔

انھوں نے مزید کہا کہ مسلم ممالک ہندستان میں اپنے مسلم بھائیوں کا کوئی خیال نہیں کرتے جیسا کہ انھیں کرنا چاہئے:

Muslim countries do not care about their Indian Muslim brothers as they should.

میں نے کہا کہ اس سے آپ کا مطلب اگر یہ ہے کہ مسلم ممالک ہمارے بارہ میں بیانات دیں اور حکومت ہند سے مطالبات کریں تو ایسا کرنا ہرگز ہندستانی مسلمانوں کی کوئی خدمت نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کا الٹا نتیجہ برآمد ہوگا اور ہمارے مسائل مزید پیچیدہ ہو جائیں گے۔ ہندستانی مسلمانوں کے مسائل خود ہندستانی مسلمانوں کو دانش مندی کے ساتھ حل کرنا ہے۔ باہر سے اس کا کوئی حل امپورٹ نہیں کیا جاسکتا۔

جناب صفی قریشی صاحب نے بتایا کہ ۱۹۸۳ میں جب کہ رونالڈ ریگن امریکہ کے پریسیڈنٹ تھے۔ مسٹر کرین (Robert Crane) کو عرب امارات کا سفیر بنایا گیا۔ ان کے کاغذات جب مخصوص کمیٹی کے سامنے پیش ہوئے تو اس نے دیکھا کہ مذہب کے خانہ میں ان کے فارم میں اسلام لکھا ہوا ہے۔ انھوں نے دراصل کچھ پہلے اسلام قبول کر لیا تھا اور ان کا اسلامی نام فاروق عبدالحق تھا۔ کمیٹی کے ارکان کو اس پر اعتراض ہوا۔ اس وقت کمیٹی کے ایک سینئر ممبر مسٹر ریمزے کلارک (Ramsey Clarke) نے اس تقرر کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ امریکہ مسلم ملک میں ایک مسلم سفیر بھیجے:

> It is time that America should send a Muslim Ambassador to a Muslim country.

ڈاکٹر سلمان ندوی (پیدائش ۱۹۳۳) مولانا سید سلیمان ندوی کے صاحبزادے ہیں۔ تقسیم کے بعد وہ اپنے والد کے ساتھ کراچی چلے گئے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک بار انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی سے پوچھا کہ آپ کانگرسی ہیں یا مسلم لیگی۔ سید صاحب نے جواب دیا: دماغ سے کانگرسی ہوں مگر دل سے مسلم لیگی ہوں۔ ان کا اشارہ اس طرف تھا کہ ان کے علمی استاد مولانا شبلی نعمانی کا تعلق کانگرس سے تھا، اور ان کے مرشد مولانا اشرف علی تھانوی کا جھکاؤ مسلم لیگ کی طرف تھا۔ اس لئے دل مسلم لیگ کی طرف مائل ہے۔

میرے نزدیک یہ اکابر پرستی ہے۔ اسی اکابر پرستی نے موجودہ زمانہ میں مجتہدانہ طرز فکر کا دروازہ مسلمانوں کے اوپر بند کر دیا۔

ڈاکٹر سلمان ندوی نے بتایا کہ ۱۹۰۶ میں ندوہ (لکھنو) کا دستار بندی کا جلسہ تھا۔ اسی

سال مولانا سید سلیمان ندوی وہاں کی تعلیم سے فارغ ہوئے تھے۔ حاضرین میں بڑے بڑے لوگ موجود تھے۔ غلام السیدین صاحب نے عین جلسہ میں مولانا شبلی نعمانی سے کہا کہ اگر ندوہ کا کوئی طالب برجستہ عربی میں تقریر کرے تو میں ندوہ کی اہمیت کو مانوں گا، ورنہ نہیں۔

مولانا شبلی نے سید صاحب کو بلایا اور ان کے کان میں پوچھا کہ تم عربی میں تقریر کرسکتے ہو۔ سید صاحب نے کہا کہ ہاں۔ اس کے بعد مولانا شبلی نے غلام السیدین سے کہا کہ یہ طالب علم عربی میں تقریر کرنے کے لئے تیار ہے، آپ عنوان بتائیں۔ انھوں نے یہ عنوان دیا کہ ہندستان میں اسلام کی اشاعت کس طرح کی جائے۔ اب سید صاحب کا نام پکارا گیا۔ وہ اسٹیج پر آئے اور برجستہ تقریر کرنا شروع کیا۔ تاہم مولانا شبلی بے چین تھے کہ اگر کہیں یہ صاحب تقریر نہ کرسکے تو ندوہ کی سخت بے عزتی ہوگی۔ اس بے چینی میں وہ ہال کے باہر چلے گئے۔ اور گھبراہٹ کے عالم میں باہر ٹہلتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد ہال کے اندر احسنت، مرحبا کا شور بلند ہوا۔ اب مولانا شبلی اندر آئے۔ سید صاحب کی اس کامیابی پر وہ اتنا خوش ہوئے کہ خود اپنا عمامہ اپنے سر سے اتار کر سید صاحب کے سر پر رکھ دیا۔

اسلام کے بارہ میں یہاں میں نے جو کتاب یا مقالہ دیکھا۔ تقریباً سب میں ایک بات مشترک تھی۔ سب میں یہ نظریہ موجود تھا کہ اسلام میں مذہب اور سیاست کی تفریق نہیں۔ مثلاً مسٹر غلام سرور کی کتاب دیکھی اس کا نام تھا :

Islam : beliefs and teachings (1987)

اس کا دسواں باب پولیٹیکل سسٹم آف اسلام ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے ـــــ مذہب اور سیاست اسلام میں بالکل ایک ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں :

Religion and politics are one and the same in Islam. They are intertwined. (p. 177)

اسی طرح ڈاکٹر احمد ایچ صقر کا مقالہ آورٹائم (یکم ستمبر ۱۹۹۳) میں پڑھا۔ یہ میگزین کیلی فورنیا سے چھپتا ہے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ اسلام مغربی مذاہب کی طرح ایک مذہب نہیں ہے۔ وہ ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ اس میں مذہب اور اسٹیٹ کا فرق نہیں :

Islam is not a religion as is the case with western religions. It is a total way of life, and has complete systems for mankind. This means that there is no separation between state and religion. (p. 41)

اس موضوع پر ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہاکہ موجودہ زمانہ کے دانش ور اس طرح لکھتے ہیں گویا کہ اسلام اور دوسرے مذاہب میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے مذاہب ناقص نظام ہیں اور اسلام کامل نظام۔ یہ ایک غیر علمی بات ہے۔ دونوں میں اصل فرق یہ ہے کہ اسلام محفوظ مذہب ہے اور دوسرے مذاہب محرف اور غیر محفوظ۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے بات ہورہی تھی۔ میں نے کہاکہ یہاں کے مسلمانوں کے بارہ میں جو معلومات مجھے ہوئی ہے اس سے میں نے پایاکہ یہاں کا جو دینی طبقہ ہے وہ زیادہ تر تشخص (آئیڈنٹٹی) کی بات کرتا ہے۔ میں نے کہاکہ اگر آپ یہاں کے ہندوؤں سے بات کریں تو وہ بھی تشخص ہی کے مسئلہ میں الجھے ہوئے نظر آئیں گے۔ اس پر غور کرتے ہوئے میں نے سمجھاکہ یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک قومی ظاہرہ ہے نہ کہ فی الواقع کوئی دینی ظاہرہ۔ تشخص اصلاً ظاہری ہیئت سے تعلق رکھنے والی چیز ہے۔ دینی اعتبار سے ہمارا اصل کنسرن تشخص نہیں ہونا چاہئے بلکہ کردار ہونا چاہئے۔

انھوں نے میری بات سُن کر کہا ــــ آپ موحد قوم کا تقابل مشرک قوم سے کررہے ہیں۔ یہ کتنا غلط تقابل ہے۔ وغیرہ

میں اکثر سوچتا ہوں کہ موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا فتنہ اہلِ علم (intellectuals) ہیں۔ ان کے پاس خوبصورت الفاظ کا وافر ذخیرہ ہوتا ہے اور وہ فیاضانہ طور پر ان کا استعمال کرتے ہیں۔ آپ ایک کارآمد بات کہیں گے اور وہ ایک خوبصورت لفظی مجموعہ بول کر اس کو رد کردیں گے۔ آپ مینیمم کی بات کریں گے اور وہ میکسیمم پر تقریر کرنا شروع کردیں گے۔ آپ نقطۂ آغاز کی بات کریں گے اور وہ نقطۂ اختتام کا مسئلہ چھیڑ دیں گے۔ آپ عملی حل پیش کریں گے اور وہ اس کے مقابلہ میں معیاری حل لاکر بحث شروع کردیں گے۔ آپ کسی لفظ کو ایک خاص معنی میں استعمال کریں گے اور وہ اس لفظ کو دوسرے معنی میں استعمال کرکے اس کو بے قیمت ثابت کردیں گے۔ آپ ایک سنجیدہ نقطۂ نظر پیش کریں گے اور وہ ایک لطیفہ چھیڑ کر اس کو مذاق میں اڑا دیں گے۔

۲۷ دسمبر کو نماز عشاء کے بعد اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں خطاب تھا۔ میں نے کہا کہ امریکہ میں اور دوسرے مغربی ملکوں میں جو مسلمان آباد ہیں ان سے گفتگو کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان کا سب سے بڑا کنسرن آئیڈنٹٹی ہے۔ مگر آئیڈنٹٹی پر زور دینے سے آئیڈنٹٹی قائم نہیں ہوسکتی۔ آدمی کا نیچر یہ ہے کہ وہ اسی چیز کو لیتا ہے جو اس کو برتر دکھائی دے۔ اس لئے آپ کو یہ کرنا ہوگا کہ اسلام کی آئیڈیالوجیکل سپیریریٹی کو نئی نسلوں کے دماغ میں اتاریں۔

اس مقصد کے لئے آپ کو اعلیٰ اسلامی لٹریچر کی ضرورت ہے۔ مگر یہ لٹریچر انگریزی میں موجود نہیں۔ لٹریچر اس طرح نہیں بنتا کہ کسی کو ہائر کرکے آپ کہیں کہ تم "واٹ از اسلام" کے نام سے ایک کتاب لکھ دو۔ لٹریچر ہمیشہ ہسٹاریکل پراسس کے دوران بنتا ہے۔ یہ تاریخی عمل انگریزی زبان میں جاری ہو چکا ہے۔ اسی طرح اردو زبان میں بھی کئی سو سال کے عمل کے دوران کافی لٹریچر تیار ہو چکا ہے۔ اس لئے کم از کم فی الحال آپ کو یا عربی یا اردو زبان میں اپنے بچوں کو سکھانا ہوگا۔ سنجیدہ کوشش اور قربانی کے بغیر یہ کام نہیں ہوسکتا۔

۲۸ دسمبر کو نماز عشاء کے بعد دوبارہ اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں خطاب ہوا۔ میں نے بعض احادیث کی روشنی میں دینی تقاضوں کی وضاحت کی۔ امریکہ میں قیام کے دوران ہر روز صغیر اسلم صاحب کے مکان پر احادیث مع تشریح ریکارڈ کراتا رہا۔ اس کا انتظام صغیر اسلم صاحب نے کیا تھا۔

برصغیر ہند سے امریکہ جانے والے لوگوں نے وہاں بہت سی چھوٹی بڑی تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں۔ انھیں میں سے ایک تنظیم وہ ہے جو امریکن فیڈریشن کہی جاتی ہے:

American Federation of Muslims from India,
29008-W, 8 Mile Road, Farmington, Michigan 48336

اس فیڈریشن کی طرف سے ۲۹۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۳ کو شکاگو میں "تھرڈ انٹرنیشنل کانفرنس" ہوئی۔ اس میں امریکہ کے علاوہ ہندستان سے کئی ہریجن اور مسلمان مقررین شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کی تھیم یہ تھی:

The Role of Muslims in the socio-economic development of India

کانفرنس کا موضوع بظاہر یہ تھا کہ انڈیا کی سماجی اور اقتصادی ترقی میں مسلمانوں کا رول۔ مگر وہاں جو تقریریں ہوئیں، اس کے لحاظ سے اس کا موضوع ہونا چاہئے تھا ـــــ ہندستان کی سماجی اور اقتصادی ترقی میں مسلمانوں کے لئے حصہ داری کی مانگ۔ تقریروں اور رزولیوشن کا خلاصہ یہ تھا کہ "ہندو نازی ازم" ختم کرو۔ مسلمانوں کو ملازمت میں اور تعلیمی داخلہ میں رزرویشن دو۔ ایڈمنسٹریشن میں مسلمانوں کو ان کی تعداد کے بقدر حصہ دو۔ دلت مقررین نے کہا کہ بھارت میں برہمن واد کو ختم کرنے کے لئے دلت اور مسلمانوں کو ایک ہونا چاہئے۔" وغیرہ

میرے نزدیک اس قسم کی باتیں صرف نادانی کی چیخ پکار ہیں۔ یہ ایک برائی کے جواب میں دوسری برائی کا طوفان کھڑا کرنا ہے۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ تفریقی دہشت گردی کو ختم کرکے ملکی سطح پر ایکتا لانے کی کوشش کی جائے۔ رعایت اور ریزرویشن کے بجائے محنت اور لیاقت کے ذریعہ آگے بڑھنے کا مزاج بنایا جائے۔ ردعمل والی سوچ کو ختم کرکے مثبت اور تعمیری سوچ پیدا کی جائے۔ عجیب بات ہے کہ جو لوگ امریکہ جاکر وہاں کے نظام سے آخری حد تک موافقت کرکے رہتے ہیں، وہ وہاں سے ہندستانی مسلمانوں کے لئے ٹکراؤ کی پالیسی برآمد کر رہے ہیں۔ اس دوعملی میں بیشتر امریکی مسلمان بتلا ہیں۔ اس قسم کی دوعملی کی روش سطحی لیڈری ہے نہ کہ فی الواقع کوئی رہنمائی۔

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۸ نومبر ۱۹۹۳) میں ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس کا عنوان تھا: عندھم کل شئ إلا ... اس میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ میں ہر چیز پائی جاتی ہے سوا خیر کے (فی امریکا یوجد کل شئ إلا الخیر) اور پھر حدیث رسول کو امریکہ پر چسپاں کیا گیا تھا: انا برئ من مسلم یقیم بین ظھرانی المشرکین۔

مگر یہ دین کی صحیح تشریح نہیں۔ امریکہ میں بلاشبہ ایک بہت بڑا خیر ہے، اور وہ وہی چیز ہے جس کو حدیث میں سرخ اونٹ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی دعوت اسلام کا کام کرنا اور خدا کے ان بندوں کو خدا کی رحمت کے سایہ میں داخل کرنا۔

مجھ کو اپنے سفر کے دوران کچھ سفید فام امریکنوں سے بات کرنے کا موقع ملا۔ ذاتی تجربہ کی بنا پر میرا خیال ہے کہ عام امریکی میں قبولیت کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ کسی معقول بات کو

ان کا ذہن فوراً جان لیتا ہے۔ سفید فام امریکنوں کے مزاج کے بارہ میں اپنے اس تاثر کا ذکر میں نے جناب صغیر اسلم صاحب سے کیا جو یہاں ۳۵ سال سے رہتے ہیں، انھوں نے میرے احساس کی تصدیق کی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں برابر لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ امریکی روزنامہ وال اسٹریٹ جرنل (۵ اکتوبر ۱۹۹۰) کی رپورٹ کے مطابق، ماہرین مذہب کا خیال ہے کہ اسلام امریکہ میں سب سے زیادہ تیزی سے بڑھنے والا مذہب ہے:

Many religious experts say Islam is the fastest-growing faith in the United States.

ایسی حالت میں کہنے والوں کو کہنا چاہئے کہ امریکہ میں بہت بڑا خیر موجود ہے۔ وہاں کے لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچاؤ اور پھر سرخ اونٹوں کی دولت حاصل کرو۔

ایک ہندستانی مسلمان جو اب امریکہ میں رہتے ہیں، انھوں نے شکایت کی کہ ہندستان میں مسلمانوں کے ساتھ تعصب برتا جا رہا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کے ذمہ دار آپ جیسے لوگ ہیں۔ آپ لوگ خود تو امریکہ میں یک جہتی کی پالیسی اختیار کئے ہوئے ہیں اور ہندستان کے معاملہ میں وہاں کے استحصالی لیڈروں کی مدد کرتے ہیں جو مسلمانوں کو علیٰحدگی پسندی کے راستہ پر چلانا چاہتے ہیں۔

پھر میں نے ان کو مقامی اخبار آرنج کاونٹی (Orange County) کا شمارہ ۹ نومبر ۱۹۹۳ دکھایا۔ اس میں ایک مسلم لیڈر شبیر منصوری کا ایک انٹرویو چھپا ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے کہا تھا کہ مجھے امریکی مسلمان ہونے پر فخر ہے:

I am proud to be a Muslim-American.

میں نے کہا کہ ہندستان کے لیڈر، خواہ باریش ہوں یا بے ریش، کبھی یہ نہیں کہتے کہ مجھے ہندستانی مسلمان ہونے پر فخر ہے۔ ایسی حالت میں اگر اکثریتی فرقہ اور مسلمانوں کے درمیان معتدل تعلقات نہ پائے جائیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ ڈبل اسٹینڈرڈ ہیں۔ آپ لوگ ہندستانی مسلمانوں کے لئے کچھ پسند کرتے ہیں اور خود اپنے لئے کچھ اور پسند کئے ہوئے ہیں۔

جیسا کہ مشہور ہے، کرسٹوفر کولمبس نے امریکہ کو دریافت کیا تھا۔ وہ ۱۲ اکتوبر ۱۴۹۲ کو امریکہ کے ساحل پر پہنچا تھا۔ اس دن اس نے اپنی ڈائری کا جو صفحہ لکھا، اس میں اس نے ۱۳۹ بار سونا کا لفظ استعمال کیا۔ اس وقت کولمبس کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت سونے کی تھی۔ کولمبس کو معلوم نہ تھا کہ چند سو سال بعد امریکہ ایک ایسے فن کا مرکز بننے والا ہے جو سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہے اور وہ جدید ٹکنالوجی ہے۔

دہلی سے ایک انگریزی ہفت روزہ آرگنائزر شائع ہوتا ہے۔ یہ ریڈئنس کا ہندو مثنیٰ ہے۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ آرگنائزر ہندوؤں کا ریڈئنس ہے، اور ریڈئنس مسلمانوں کا آرگنائزر۔ دونوں ہی منفی اصولِ صحافت پر چلائے جا رہے ہیں۔

آرگنائزر کے شمارہ ۵ دسمبر ۱۹۹۳ میں ایک مضمون اتل راوت کے قلم سے چھپا تھا۔ اس کا عنوان تھا ــــــ اجودھیا امریکی پریس میں:

Ayodhya in American Press

امریکی اخباروں میں اجودھیا کے واقعات پر جو کچھ چھپا تھا اس میں انھیں برا بھلا کہتے ہوئے مضمون میں بتایا گیا تھا کہ انڈیا کی خبریں اور خاص طور پر ہندوؤں کی خبریں امریکی پریس میں ہمیشہ غلط طور پر یا غلط رخ سے پیش کی جاتی ہیں:

> The news dealing with India in general and Hindus in particular is, more often than not, misrepresented and misinterpreted in American press.

مضمون نگار کو مثلاً یہ شکایت تھی کہ نیویارک ٹائمس نے اپنے شمارہ ۷ دسمبر ۱۹۹۲ میں اجودھیا کے واقعہ کی رپورٹ دیتے ہوئے یہ لکھا کہ ہزاروں ہندو انتہاپسندوں نے اجودھیا میں گھس کر ۱۶ ویں صدی کی تعمیر شدہ "مسجد" کو ڈھا دیا۔ نیویارک ٹائمس اجودھیا کے متنازعہ ڈھانچہ کو برابر مسجد بتاتا رہا:

> Consistently the New York Times had been describing the disputed structure as mosque.

ٹھیک یہی ذہن مزید اضافہ کے ساتھ موجودہ زمانہ کے نام نہاد مسلم دانشوروں میں ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ نفرت کی باتیں کریں مگر دنیا اس کو محبت کا عنوان دے۔ وہ تشدد کی کارروائی

کریں مگر دنیا اس کو امن کا اقدام بتائے۔ وہ لوگوں کے راستے میں کانٹے بکھیریں مگر دنیا یہ اعلان کرے کہ انھوں نے ہمارے راستہ کو پھولوں سے بھر دیا ہے۔ اور جب دنیا ایسا نہیں کرتی تو وہ پرجوش طور پر اعلان کرتے ہیں کہ ساری دنیا کا میڈیا مسلم دشمن ہے، وہ گہری سازش کے تحت مسلمانوں کے بارہ میں غلط خبر رسانی (disinformation) کا فعل انجام دے رہا ہے۔

آرنج کاونٹی کی اسلامک سوسائٹی کی مسجد ایک متروکہ چرچ کو خرید کر بنائی گئی ہے۔ اس قسم کے واقعات امریکہ اور یورپ میں عام ہیں۔ متروکہ چرچ کی عمارت کو کہیں مسلمانوں نے خرید کر مسجد بنالی ہے اور کہیں ہندوؤں نے خرید کر اس کو مندر میں تبدیل کرلیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مسیحی تصور کے مطابق، چرچ کسی مقام یا عمارت کا نام نہیں ہے۔ چرچ، قدیم لفظ اکلیسیا (ekklesia) کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ قدیم یونان میں اکلیسیا اجتماع (اسمبلی) کے معنی میں بولا جاتا تھا۔ اس کے بعد مسیحیوں نے اس کو مذہبی اجتماع کے معنی میں بولنا شروع کیا۔ اب اکلیسیا یا چرچ ہم معنی طور پر مذہبی اجتماع یا مذہبی ایسوسی ایشن کے مفہوم میں بولا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی مقام پر مسیحیوں کے نہ ہونے کی وجہ سے چرچ کی بلڈنگ کا مذہبی استعمال باقی نہ رہے تو تو اس کی مذہبی حیثیت بھی ختم ہوجاتی ہے۔ اور پھر اس کو بیچنا ایسا ہی بن جاتا ہے جیسے کسی خالی گھر کو بیچ دینا۔ تاہم مسیحی حضرات اس کو پسند کرتے ہیں کہ ایک مذہبی عمارت دوبارہ مذہبی عمارت ہی کی حیثیت سے باقی رہے۔ اسی لئے اس قسم کے چرچ نہایت آسانی سے مسجد یا مندر والوں کو حاصل ہوجاتے ہیں۔

لاس اینجلس کے مسٹر عبدالحکیم نے اپنا ایک پیپر (Muslims of India) پڑھنے کو دیا۔ اس کا عنوان یہ تھا کہ ہوشیار دشمن بیوقوف دوست سے اچھا ہے۔ اس کی تشریح میں نیچے لکھا ہوا تھا کہ ہندستان کی مسلم لیڈرشپ بھی جزئی طور پر ذمہ دار ہے:

A smart enemy is better than a foolish friend (Muslim leadership is also partly responsible)

میں نے کہا کہ جزئی طور پر نہیں بلکہ کلی طور پر مسلمانوں کی نااہل لیڈرشپ ہی ان کے تمام مسائل کی ذمہ دار ہے۔ مثلاً ڈزرولیشن کے دور میں اس نے مسلمانوں کے اندر رزرولیشن کا ذہن بنایا۔

موجودہ زمانہ میں صحافت ایک انڈسٹری ہے۔ اس کو جو لوگ چلاتے ہیں وہ اظہار حق کے لئے اس کو نہیں چلاتے بلکہ خالص تجارتی مصلحت کے تحت چلاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اخبارات ہمیشہ گرماگرم خبروں کو اہمیت دیتے ہیں۔ کیوں کہ عوام ایسی خبروں کو پڑھنے میں خاص دلچسپی لیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان اخبارات میں زیادہ تر انتہاپسند مسلمانوں کی باتیں نمایاں کی جاتی ہیں۔ مثلاً کچھ مسلمانوں نے جب امریکہ کے ٹریڈ سنٹر پر بم مارا تو یہ خبر فوراً تمام اخباروں میں چھپ گئی۔ جب کہ دوسری اچھی خبریں ان اخباروں کے صفحات میں بہت کم جگہ پاتی ہیں۔ اس بنا پر ایسا ہے کہ جو امریکی اخبار کی خبروں سے اسلام کے بارہ میں واقف ہوتے ہیں وہ اسلام کو ایک دہشت گرد مذہب سمجھتے ہیں، کیوں کہ اسلام کی نسبت سے وہ ہمیشہ اسی قسم کی خبریں اپنے اخباروں میں دیکھتے ہیں۔

اس مسئلہ کا حل یہ نہیں ہے کہ ہم امریکی صحافت کی مذمت کریں۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ ان مسلمانوں کی حوصلہ شکنی کی جائے جو منفی طرز فکر میں مبتلا ہیں اور متشددانہ قسم کے واقعات برپا کرکے اہل صحافت کو یہ موقع دیتے ہیں کہ وہ اسلام کی تصویر کو خراب کریں۔

ایک جائزہ کے مطابق، ۴۰ فیصد امریکی اسلام کے بارہ میں کچھ نہیں جانتے۔ ۳۰ فیصد کا یہ کہنا ہے کہ وہ اسلام کے ساتھ موافقت کرکے رہ سکتے ہیں۔ ۳۰ فیصد امریکیوں نے واضح طور پر اسلام سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا۔

Omar ibn Khattab Mosque, in Los Angeles, America.

لاہور کے اردو روزنامہ نوائے وقت (۱۰ جنوری ۱۹۹۴) میں ایک رپورٹ نظر سے گزری. یہ ایک پاکستانی نژاد مقیم امریکہ ڈاکٹر مقبول راشد کا انٹرویو تھا جو انھوں نے نوائے وقت کے نمائندہ کو دیا تھا۔ انھوں نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ "امریکہ میں نقل مکانی کرنے والے غیر سفید فام باشندوں میں بھارتی نژاد ہندو سب سے زیادہ طاقت ور اور دولت مند ہیں. بھارتی افراد میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی شرح سب سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ بھارتی نژاد شہری امریکہ میں کلیدی سرکاری عہدوں پر بھی کام کر رہے ہیں۔ امریکی معیشت کا بھی بہت بڑا حصہ بھارتی نژاد باشندوں کے ہاتھ میں ہے۔ امریکہ میں یہ بھارتی باشندے تعداد، وسائل اور اثر ورسوخ میں پاکستانی مسلمانوں سے بہت آگے ہیں" صفحہ ۳

یہ بات بالکل درست ہے۔ میں نے خود بھی اپنے سفر امریکہ کے دوران اس فرق کا مشاہدہ کیا۔ اب اگر پاکستانی مسلمانوں کے ساتھ ہندستانی مسلمانوں کو ملالیا جائے تو امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد اور ہندوؤں کی تعداد برابر ہے۔ ہر ایک کی تعداد پانچ اور چھ لاکھ کے درمیان ہے۔ دوسری طرف خود نوائے وقت کے شمارہ ۷ جنوری ۱۹۹۴ میں ایک پاکستانی نژاد امریکی خاتون سائرہ چودھری کا انٹرویو اس کے مخصوص کالم مہمان شہر (گیسٹ ان ٹاؤن) میں چھپا ہے۔ موصوفہ نے زور دے کر بتایا کہ امریکہ میں کسی قسم کا تعصب یا طرفداری نہیں۔ وہاں ہر شخص کو یکساں طور پر ترقی کے مواقع حاصل ہیں (صفحہ ۳)

مسٹر محمد علی جناح تقسیم کی تائید میں کہتے تھے کہ غیر منقسم ہندستان میں ہندوؤں کا تعصب مستقل طور پر مسلمانوں کی ترقی میں رکاوٹ بنا رہے گا۔ اب موجودہ انڈیا میں نام نہاد مسلم لیڈروں کے بیان کے مطابق دوبارہ ہندوؤں کا تعصب مسلمانوں کا راستہ روکے ہوئے ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو سوال یہ ہے کہ امریکہ جیسے آزاد ملک میں مسلمان کیوں ہندوؤں سے پیچھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قدیم جناح سے لے کر جدید جناح تک جن لوگوں نے مسلمانوں میں اس قسم کا ذہن بنایا وہ مسلمانوں کے نادان دوست تھے، اور مشہور مقولہ کے مطابق، نادان دوست دشمن سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

مسٹر صغیر اسلم صاحب نے بتایا کہ ۱۹۸۸ میں اسلامک سوسائٹی میں عید کے دن تقریر کی۔

تقریباً پانچ ہزار مسلمان تھے۔ انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مجھے امریکی ہونے پر فخر ہے۔ یہ ہمارا ملک ہے۔ ہم کو اس سے محبت کرنا چاہئے۔ اس کے بعد ہی اس ملک میں اسلام انشاء اللہ پھیل سکتا ہے:

I am proud to be an American Muslim. This is our country and we must love this country. Only then, Insha Allah, Islam will spread in America.

لوگوں نے ان الفاظ پر سخت برہمی کا اظہار کیا۔ لوگوں نے کہا کہ امریکہ تو ایک اسلام دشمن ملک ہے۔ پھر ہم اس سے محبت کیسے کر سکتے ہیں۔ صغیر اسلم صاحب نے کہا کہ اگر آپ سچ مچ ایسا ہی سمجھتے ہیں تو سب سے پہلے آپ کو چاہئے کہ امریکہ میں اپنی شہریت کو ختم کر کے یہاں سے واپس چلے جائیں۔ امریکی شہریت کے دستاویز پر دستخط کرنا اور امریکہ کے ساتھ وطنی تعلق قائم نہ کرنا دو متضاد روش ہے۔ یہ دوہرا معیار ہے، اور دوہرے معیار کا آدمی کبھی کسی ملک میں اسلامی دعوت کا کام نہیں کر سکتا۔

صغیر اسلم صاحب کے دادا چودھری محمد عیسیٰ (م ۱۹۴۸) بہت سمجھدار آدمی تھے۔ صغیر اسلم صاحب نے بتایا کہ ان کے دادا کہا کرتے تھے کہ دوسروں کی اچھائی اور اپنی برائی کو دیکھو۔ یہ دو لفظ میں نہایت اعلیٰ اصول ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر صرف یہی دو لفظ کا اصول لوگ پکڑ لیں تو سارے جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں۔ آج ہر طرف جو جھگڑے ہیں اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ آج لوگوں کا مزاج اس کے برعکس ہو گیا ہے۔ آج لوگوں کا حال یہ ہے کہ اپنا معاملہ ہو تو وہ صرف اچھائی کو دیکھیں گے اور دوسرے کا معاملہ ہو تو صرف برائی کو۔

موجودہ سفر میں میری ملاقات ایک امریکی مسلمان سے ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں ہم لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ بچوں کی آزادی ہے۔ مثلاً انھوں نے بتایا کہ پچھلی رات کو ۱۰ بجے میرے لڑکے کے پاس اس کے ساتھی کا ٹیلی فون۔ وہ اس کو ایک پارٹی میں بلا رہا تھا۔ میرے لڑکے نے فوراً گاڑی اٹھائی اور روانہ ہو گیا۔ میں جانتا ہوں کہ وہاں لڑکے اور لڑکیاں مل کر تفریح کرتے ہیں، شراب پیتے ہیں، وغیرہ۔ یہاں کے نظام کی وجہ سے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میرا خون کھولتا رہا۔ مگر میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ بے بسی کے ساتھ اس کو برداشت کروں۔

میں نے کہا کہ آپ ایسا کیجئے کہ ہر سال اپنے بچوں کو مہینہ دو مہینہ کے لئے اپنے سابقہ وطن میں

بھیج دیجئے۔ وہاں وہ اردو سیکھیں گے اور اسلامی ماحول میں رہیں گے۔ اس طرح ان کی اصلاح ہوتی رہے گی۔ انھوں نے بتایا کہ یہ بھی سخت مشکل ہے۔ پچھلے سال میں اپنے بچوں کو لے کر وطن گیا۔ مگر وہاں کے ماحول میں وہ رہ نہیں سکے۔ وہاں کا پانی پی کر ان کا پیٹ خراب ہوگیا۔ وہاں کے بیت الخلا میں انھوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ اس طرح کے مختلف مسئلے پیش آئے۔ وہاں جب تک میں تھا ان کو لے کر بس ڈاکٹروں کے یہاں دوڑتا رہا۔

اس قسم کے عجیب عجیب مسائل ہیں جن میں یہاں کے مسلمان بتلا ہیں۔ ان مسائل کی کم از کم ایک وجہ ان کا مصنوعی معیار زندگی ہے۔ یہاں ہر شخص مصنوعی طور پر اپنا معیار زندگی بڑھا لیتا ہے اس کے نتیجہ میں وہ طرح طرح کے مصنوعی مسائل میں مبتلا رہتا ہے۔

یہاں آپ کسی سے ملاقات کے لئے جائیں تو وہ ایک شاندار گھر میں آپ کا استقبال کریگا۔ لیکن یہ گھر سودی قرض پر ہوگا۔ یہاں تمام لوگ سودی قرض پر مکان خریدتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ کے لائف اسٹائل کے مطابق، کوئی آدمی اپنا جو اسٹیٹس سمجھتا ہے، اس سے مطابقت رکھنے والا گھر وہ نقد رقم دے کر خرید نہیں سکتا۔ اس لئے وہ سودی قرض لے کر مکان خریدتا ہے جو بہت آسانی سے اس کو مل جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ کما کما کر ساری زندگی اس کی قسط مع سود ادا کرتا رہتا ہے۔ اَب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جو گھر یا زندگی کا جو ڈھانچہ سارا کا سارا سود کے اوپر بنا ہو اس کے اندر رہنے والے بچوں میں صالح مزاج کیوں کر پرورش پاسکتا ہے۔

اس مسئلہ کا حل کیا ہے، وہ اس وقت میری سمجھ میں آیا جب کہ میں نے جانا کہ جناب صغیر اسلم صاحب ان انتہائی چند مستثنیات میں سے ہیں جو ایسے گھر میں رہتے ہیں جو انھوں نے نقد ادائیگی کی بنیاد پر حاصل کیا ہے، اس میں سود کی آمیزش شامل نہیں۔ ایسا کیوں کر ممکن ہوا۔ اس طرح کہ اپنے اسٹیٹس کے اعتبار سے انھیں ۲۰ لاکھ ڈالر کے مکان میں رہنا چاہئے تھا مگر وہ صرف دو لاکھ ڈالر قیمت کے مکان میں رہتے ہیں۔

امریکی نظام میں سود سے بچنے کی قیمت یہ ہے کہ آدمی کے اندر یہ جرأت ہو کہ وہ بظاہر کم تر معیار حیات پر اپنے کو راضی کرے۔ وہ اس کی پروانہ کرے کہ لوگ اس کے بارہ میں کیا کہیں گے۔ اس کے اندر یہ بلند نگاہی ہو کہ وہ اپنے آپ کو خود اپنی نظر سے دیکھے نہ کہ دوسروں کی نظر سے۔

کچھ لوگ جو انڈیا اور پاکستان سے آئے ہیں، انھوں نے کہا کہ ہم اپنی اگلی جنریشن کو کھو رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ عربی کا ایک مثل ہے کہ تعرف الأشياء بأضدادها (چیزیں اپنے ضد سے پہچانی جاتی ہیں) اس حیثیت سے غور کیجئے تو یہاں بھی ایک ضد موجود ہے اور ان دونوں کا تقابلی مطالعہ کرکے آپ معاملہ کو سمجھ سکتے ہیں۔

یہ ضد آپ لوگ خود ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ ہم اپنی اگلی جنریشن کو کھو رہے ہیں۔ مگر آپ لوگ (پچھلی جنریشن) تو پھر بھی ضائع ہونے سے بچی ہوئی ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب اگلی نسل ضائع ہو رہی ہے تو پچھلی نسل کس طرح محفوظ ہے۔ اس تقابلی مطالعہ کی ضرورت اس لئے ہے کہ آپ محفوظ نسل کے کیس کو سمجھ کر اس کو ضائع ہونے والی نسل پر استعمال کر سکتے ہیں۔

اس بات کو سادہ طور پر اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ پچھلی نسل کی پرورش "اردو کلچر" میں ہوئی تھی اور نئی نسل کی پرورش "انگلش کلچر" میں ہو رہی ہے۔ ہر زبان الگ الگ مذہب اور روایات کی نمائندہ ہوتی ہے۔ انگلش اگر مادی تہذیب میں رچی بسی ہے تو اردو روحانی تہذیب میں رچی بسی ہوئی ہے۔ اگر آپ اپنی اگلی نسل کو اپنے جیسا دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو یہ انتظام کرنا ہوگا کہ ان کی پرورش بھی آپ والے کلچر میں ہو۔ اس کے بغیر اگلی نسلوں کی حفاظت ممکن نہیں۔

۲۸ دسمبر کو کیلی فورنیا کے انگریزی میگزین آور ٹائمس (Our Times) کے اڈیٹر مسٹر تشبیہ سید نے تفصیلی انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر موجودہ زمانہ میں اسلام اور مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے دانشور یہ کہتے ہیں کہ مسلم ملکوں میں جو لوگ حکومت کے عہدہ پر ہیں وہ سب اسلام کے مخالف ہیں اور مغربی طاقتوں کے ایجنٹ ہیں۔ یہ نظریہ سید جمال الدین افغانی کے زمانہ سے چل رہا ہے۔ مگر میں اس کو سراسر بے معنی سمجھتا ہوں۔

یہ درست ہے کہ موجودہ مسلم حکمراں کچھ مسلم تنظیموں پر تشدد کر رہے ہیں، مگر اس کی ذمہ داری خود ان مسلم تنظیموں پر ہے۔ یہ لوگ مسلم حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی تحریک چلا رہے ہیں۔ اور جب بھی کسی کے اقتدار کے خلاف تحریک چلائی جائے تو وہ یہی کرتا ہے۔ مسلم اداروں میں لوگوں کو چھوٹے چھوٹے اقتدار حاصل ہیں۔ اگر آپ ان کو ان کے مقام سے ہٹانے کی تحریک چلائیں تو وہاں بھی آپ کا وہی انجام ہوگا جس کی شکایت آپ سیاسی حکمرانوں سے کر رہے ہیں۔

۲۸ دسمبر کو نماز عشاء کے بعد اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں ایک اجتماع ہوا۔ یہاں میری تقریر ہوئی۔ میں نے تقریباً ایک گھنٹہ تقریر کی۔ اس کے بعد سوال و جواب ہوا۔

میں نے کہا کہ اس ملک میں جو مسلمان آباد ہیں وہ اکثر مسائل کا ذکر کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس دنیا میں ہمیشہ مسائل رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ آپ امریکہ چھوڑ کر مکہ مدینہ چلے جائیں تو وہاں بھی آپ دیکھیں گے کہ مسائل موجود ہیں۔ اس لئے اصل مسئلہ مسئلہ کا ہونا نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مسئلہ کا سامنا کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی منصوبہ نہ ہو۔ آپ کو چاہئے کہ مسئلہ کے خلاف احتجاج کرنے کے بجائے اس کے بارہ میں سوچیں اور اپنے جوابی عمل کا نقشہ بنائیں۔

آرنج کاونٹی رجسٹر (۳۰ دسمبر) میں رائٹر کے حوالے سے ایک خبر تھی۔ اس نے سرخیل (افغانستان) سے یہ رپورٹ بھیجی تھی کہ تغب وادی میں حریف افغانی گروہوں کے درمیان سخت لڑائیاں (fierce battles) جاری ہیں۔ یہ علاقہ کابل کے مشرق میں واقع ہے۔ ان لڑائیوں کے نتیجہ میں دس ہزار سے زیادہ افغانی اپنے وطن کو چھوڑ کر بھاگے ہیں۔ ریڈ کراس نے ان کے قیام کا انتظام عارضی کیمپوں میں کیا ہے۔ یہ لڑائی دو مہینہ سے جاری ہے۔ اس خبر کی سرخی یہ تھی:

10,000 flee fierce Afghan factional strife.

سوویت یونین سے آزادی حاصل کرنے کے بعد افغانی اس طرح کیوں آپس میں لڑ رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لڑائی ہی ان کا طریق زندگی ہے۔ گن کلچر کے سوا کسی اور کلچر کو وہ جانتے ہی نہیں۔ افغانیوں کی اصل ضرورت ہتھیاروں کی سپلائی نہیں ہے۔ ان کی اصل ضرورت یہ ہے کہ ان کو تعمیری سوچ دی جائے۔ ان کو تعلیم کی طرف موڑا جائے۔ ان کو بتایا جائے کہ عزت اور ترقی کا راز گولی میں نہیں ہے بلکہ علم میں ہے۔

ایک صاحب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ دور اول کے مسلمانوں کے لئے ہر طرف کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ آج وہ شکایت کرتے ہیں کہ ہر طرف کے دروازے ان کے لئے بند ہیں۔ پہلے ہر جگہ ان کو حمایت مل رہی تھی، آج ہر جگہ ان کو مخالفت سے سابقہ پیش آرہا ہے۔ اس کی وجہ دونوں زمانوں کے مسلمانوں کا ذہنی فرق ہے۔ دور اول کے مسلمان دنیا میں اس احساس کے ساتھ رہتے تھے کہ ہر انسان مسٹر نیچر ہے۔ آج کے مسلمانوں کا ذہن اس کے

برعکس یہ ہے کہ ہر انسان مسٹر دشمن ہے۔ اس تصور نے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سلوک دوسرے لوگوں سے غیر اسلامی بنا دیا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کے تمام معاملات بگڑ کر رہ گئے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا: آپ ایڈجسٹمنٹ کا جو نظریہ پیش کرتے ہیں اس کو انڈیا میں کتنے لوگ مانتے ہیں۔ میں نے کہا کہ انڈیا ہی میں نہیں ساری دنیا کے تمام مسلمان میرے ہم خیال ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ کیسے۔ میں نے کہا کہ ذاتی مسائل میں ہر آدمی ایڈجسٹمنٹ ہی کے اصول پر زندگی گزار رہا ہے۔ حتی کہ آپ خود بھی۔ کوئی آدمی اگر ایڈجسٹمنٹ نہ کرے تو زندگی گزارنا ہی اس کے لئے ناممکن ہو جائے گا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ لوگ ڈبل اسٹنڈرڈ بنے ہوئے ہیں۔ ذاتی معاملات میں وہ ایڈجسٹمنٹ کے اصول پر چلتے ہیں اور جب ملت کے موضوع پر لکھنا یا بولنا ہو تو وہ فوراً ٹکراؤ کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔

ایک بار میں صغیر اسلم صاحب کے کمرہ میں داخل ہوا۔ وہ قرآن ہاتھ میں لئے ہوئے اس کو پڑھ رہے تھے۔ میں نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ قرآن فہمی کی کنجی کیا ہے۔ اس کی ایک ہی کنجی ہے اور وہ ہے ابن تیمیہ کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرنا کہ یامعلّم ابراھیم علّمنی میں نے کہا کہ قرآن واحد کتاب ہے جس کے مصنف سے آپ ہر وقت کنسلٹ کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ مصنف قرآن کے ساتھ آپ کے ربط کا یقینی ذریعہ یہی دعا ہے۔

۲۹ دسمبر کی شام کو مسٹر صغیر اسلم صاحب کی رہائش گاہ پر ایک اجتماع ہوا۔ اس میں کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس موقع پر میں نے کچھ احادیث کا درس دیا۔ ان احادیث کا تعلق اسلام کی روح اور اس کی بنیادی اسپرٹ سے تھا۔ ڈاکٹر سلمان ندوی بھی اس اجتماع میں موجود تھے۔ انھوں نے ساؤتھ افریقہ کے مسلمانوں کے دینی حالات بتائے، جو بہت سبق آموز تھے۔

آخر میں سوال وجواب ہوا۔ ایک سوال یہ تھا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمان ہر جگہ غیر قوموں کے ظلم کا شکار ہو رہے ہیں۔ یہ مسلم امت کی بڑی مایوس کن تصویر ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ ظلم کو میں چیلنج کے روپ میں دیکھتا ہوں۔ اس لئے جس چیز سے لوگ مایوسی کا تاثر لے رہے ہیں اس میں مجھے امید کی روشنی دکھائی دیتی ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو اس کی طرف مصیبتوں کو اس طرح بھیج دیتا ہے جیسے ڈھلوان کی طرف سیلاب کا پانی۔ میں مسلمانوں کے موجودہ معاملہ کو اسی حدیث کے ذیل میں شمار کرتا ہوں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور آرنلڈ ٹوائن بی نے اس کو بہت اچھی طرح ثابت کیا ہے کہ وہی قوم ترقی کرتی ہے جو دباؤ کے حالات سے دوچار ہو۔ دباؤ کے حالات ہمیشہ قوموں کو ابھارنے کا سبب بنتے ہیں۔ جیسے کہ صلیبی جنگوں میں مسیحی قوموں کی شکست نے انھیں دوبارہ زیادہ طاقت ور بنا کر اٹھایا۔ یہی معاملہ اس وقت مسلمانوں کے ساتھ پیش آرہا ہے۔ یہ چیلنج انشاءاللہ مسلمانوں کے لئے احیاء نو کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

اس اجتماع میں خواتین اور بچے بھی شریک تھے۔ ان کی طرف سے بہت سے سوالات کئے گئے۔ ایک بچے نے انگریزی میں یہ سوال لکھ کر دیا:

Why did the Kuffar not like Prophet Muhammad?

میں نے کہا کہ اس لئے کہ پیغمبر اسلام ان کی خواہش کے خلاف بولتے تھے۔ آج بھی کسی کے خلاف بولا جائے تو وہ بھی آپ کا اسی طرح مخالف ہو جائے گا جس طرح وہ لوگ مخالف بن گئے۔

امریکہ کی تاریخ کے بارہ میں ایک کتاب دیکھی۔ یہ کتاب ۱۹۸۹ میں چھپی تھی اور وہ ۹۵۰ صفحات پر مشتمل تھی۔ اس کا نام تھا:

The Story of America, by John A. Garraty.

اس کو پڑھتے ہوئے ایک مقام پر نظر سے گزرا کہ ۵ اکتوبر ۱۹۷۳ کو جب کہ یہودیوں کا مقدس دن تھا، مصر اور شام نے دوبارہ اسرائیل پر حملہ کر دیا۔ اسی دوران اوپیک نے جو عربوں کے کنٹرول میں تھی، امریکہ، جاپان، مغربی یورپ کو اس انتقام میں تیل کی سپلائی بند کر دی کہ انھوں نے اسرائیل کی مدد کی تھی۔ اس کا اثر امریکی صارفین پر نہایت گہرا پڑا۔ گیسولین پر راشن لگ گیا۔ سارے امریکہ میں گیس پمپ پر کار کی لمبی لمبی لائن لگنے لگی۔ عربوں کے پیدا کردہ تیل کے اس بحران نے امریکیوں کو بتایا کہ یہ پابندی جاری رہی تو بیشتر عوام کی اقتصادیات اور طرز زندگی خطرہ میں پڑ جائیگی:

This Arab oil crisis caused Americans to realize that an extended ban would threaten the economy and life style of most people. (p. 863)

قدیم زمانہ میں افسانوی شہزادہ کی جان کسی طوطے میں ہوتی تھی جو کسی دور کے مقام پر رکھا ہوا تھا۔ "ترقی یافتہ امریکہ" کی جان دوبارہ عربوں کی سرزمین میں ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ قدیم شہزادہ کے طوطے کا پنجرہ اس کے اپنے قبضہ میں نہیں ہوتا تھا۔ مگر آج کے امریکہ نے عرب ورلڈ کو پوری طرح اپنے قبضہ میں لے رکھا ہے۔

میں ایک مسلم لائبریری کے ریڈنگ روم میں بیٹھا ہوں۔ سامنے کی میز پر مختلف قسم کے پرچے رکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کو یہاں کے مسلمان نکالتے ہیں۔ کچھ ٹائٹل یہ ہیں:

Muslim World Monitor
American Muslim
Bosnia News Letter
The Minaret
The Pakistan Link
Muslim Journal

اس قسم کے بہت سے پرچے تھے۔ مگر ان کے مندرجات میں احتجاجی پہلو نمایاں تھا۔ مثلاً یہ کہ کلنٹن نے واشنگٹن میں سلمان رشدی سے ملاقات کرکے اسلام اور مسلمانوں کی انسلٹ کی ہے۔ مغرب کی تخریبی پالیسیوں کا نشانہ یہ ہے کہ اسلامی احیا کی تحریکوں کو کچل دیا جائے، وغیرہ:

Clinton's insult to Islam.

West's disruptive policies aimed at undermining the revival of Islam

میز پر جتنے بھی مسلم پرچے تھے سب میں احتجاجی پہلو غالب تھا۔ اگر ان سب کا مشترک نام پروٹسٹ رکھ دیا جائے تو وہ غلط نہ ہوگا۔ انھیں کے درمیان ایک اور ہفت روزہ تھا۔ اس کا نام تھا ——— (L.A. India Journal) یہ ہفت روزہ ایک ہندو تنظیم نکالتی ہے۔ اس کا انداز بڑی حد تک مختلف تھا۔ معلوم ہوا کہ امریکہ میں ہندوؤں کے پرچے زیادہ معیاری اور زیادہ کامیاب ہیں۔ عجیب بات ہے کہ امریکہ میں بھی ہندو اور مسلمان کا فرق باقی ہے۔ حالاں کہ تعداد کے اعتبار سے دونوں تقریباً یکساں ہیں۔ یعنی ہر ایک چھ ملین۔

۲۹ دسمبر کی شام کو جناب عبداللطیف صاحب کے مکان پر کھانا تھا۔ یہاں کئی لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ جناب عبدالوہاب صاحب نے انڈسٹری کے بارہ میں کئی باتیں بتائیں۔ ایک

بات انھوں نے یہ بتائی کہ جاپان امریکہ سے بہت بڑی مقدار میں لوہے کے ٹکڑے (scraps) خریدتا ہے۔ یہ ٹکڑے بڑے بڑے جہازوں میں لد کر یہاں سے جاپان جاتے ہیں۔ ان جہازوں میں کارخانے بھی لگے ہوتے ہیں۔ چنانچہ سمندر کے اندر دوران سفر ہی میں ان ٹکڑوں کو چادر میں تبدیل کرلیا جاتا ہے۔ اس سے انھیں ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ سفر کا وقت مزید استعمال ہوجاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس قسم کی چادروں کو ٹھنڈا کرنے کے لئے بہت زیادہ پانی کی ضرورت ہے۔ ان کو سمندر میں مفت کا پانی وافر مقدار میں مل جاتا ہے جس سے وہ بنی ہوئی انتہائی گرم چادروں کو ٹھنڈا کرسکیں۔ یہ ہے ایک کام کے دوران دوسرا کام کرنا۔

یہاں جو لوگ تھے ان میں سے ایک مسٹر شبیر دادابھائی تھے۔ ایک صاحب نے کہا کہ آج کل مسلمانوں کے خلاف ہر جگہ سازشیں ہورہی ہیں۔ مسلمانوں کو فنا کرنے کی تدبیر کی جارہی ہے۔ مسٹر دادابھائی نے کہا: پھر ہم نے کیا گھاس کھا رکھی ہے۔ آخر ہماری سمجھ کہاں چلی گئی ہے۔ وہ اکسپلائٹ کرنا چاہتے ہیں تو ہم اکسپلائٹ کیوں ہوجاتے ہیں۔ وہ سازش کرتے ہیں تو ہم ان کی سازش کا شکار کیوں ہوتے ہیں۔

مسٹر اعظم سجاد قریشی سے ملاقات ہوئی۔ وہ مینیجمنٹ کے آدمی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جدید مینیجمنٹ میں لگاتار ترقی (continuous improvement) کا اصول ہے۔ جاپان کی ترقی اسی اصول کو اختیار کرکے ہورہی ہے۔ وہ لوگ مسلسل سوچتے رہتے ہیں کہ مزید ہم کیا نئی بات نکالیں۔ ہم اور کون سی بہتری پیدا کریں۔ اس طرح ان کا نظام برابر آگے بڑھتا جارہا ہے۔

لگاتار ترقی کا یہی اصول دین میں بھی ہے۔ مومن کا ایمان ایک اضافہ پذیر چیز ہے۔ وہ اللہ کے ذکر، قرآن وحدیث کے مطالعہ، کائنات خداوندی میں غور وفکر سے ربانی غذائیں لے کر برابر بڑھتا رہتا ہے۔ اضافہ کا یہ عمل مومن کی شخصیت میں موت کے آخری لمحہ تک جاری رہتا ہے۔

ایک موقع پر میں نے بخاری کی یہ حدیث سنائی کہ ایک دیہاتی شخص مدینہ آیا۔ اس نے مسجد نبوی میں پیشاب کردیا۔ صحابہ اس کو مارنے کے لئے دوڑے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو۔ اور پیشاب کی جگہ پر پانی لے کر بہادو۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ تم آسانی پیدا کرنے کے لئے اٹھائے گئے ہو، مشکل پیدا کرنے کے لئے نہیں اٹھائے گئے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسجد میں اگر کوئی شخص پیشاب کر دے یا اور کوئی گندگی ڈال دے۔ مثلاً وہ خنزیر کو مسجد میں ڈال دے۔ یا ہولی کا رنگ پھینک دے تو ایسی حالت میں مسلمان کو کیا کرنا چاہئے۔ مسلمان کو چاہئے کہ وہ اس کو مسجد کی بے حرمتی کا مسئلہ نہ بنائیں بلکہ وہ اس کو مسجد کی صفائی کا مسئلہ بنائیں۔ اس طرح کے کسی واقعہ کو اگر مسجد کی بے حرمتی کا سوال بنا دیا جائے تو اس سے فساد برپا ہوتا ہے اور اگر اس کو مسجد کی صفائی کا سوال بنایا جائے تو ایک ڈول پانی پر معاملہ ختم ہوجاتا ہے۔ ایک صورت میں خون بہائے جلتے ہیں اور دوسری صورت میں پانی کو بہانا کافی ہوجاتا ہے۔

آسانی پیدا کرنے والے اور مشکل پیدا کرنے والے کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ اہل ایمان کو چاہئے کہ جب کوئی مسئلہ پیدا ہو تو وہ اس کو گھٹانے والے بنیں، وہ اس کو بڑھانے والے نہ بنیں۔ یہ بھی ایک سنت رسول ہے۔ آجکل اگر کسی سے پوچھیں کہ سنت کیا ہے تو وہ کہے گا کہ داڑھی میں خضاب لگانا، سر پر عمامہ باندھنا۔ مسواک کرنا وغیرہ۔ لوگوں کو معلوم نہیں کہ یہ بھی ایک عظیم سنت ہے کہ کوئی شخص اگر مسجد جیسی مقدس جگہ پر گندگی ڈال دے تو آپ مشتعل نہ ہوں۔ آپ معاملہ کو مزید نہ بڑھائیں۔ بلکہ جس مقام پر مسئلہ پیدا ہوا ہے وہیں دھوکر اسے ختم کر دیں۔

امریکی مسلمانوں کی ایک تنظیم کے ایک عہدیدار نے اپنے یہاں کا چھپا ہوا پمفلٹ مجھے دیا۔ یہ اجودھیا کی بابری مسجد کے بارہ میں تھا۔ اس میں بابری مسجد کی تصویر کے ساتھ یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

The Babari Masjid at Ayodhya was demolished on December 6, 1992 by a frenzied mob of thousands of militant Hindus.

یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ دنیا بھر کے مسلمانوں نے مختلف الفاظ میں یہی بات لکھ رکھی ہے۔ مگر اس کو پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ ۶ دسمبر کے واقعہ کو جس طرح انھوں نے لکھا ہے اسی طرح خدا کے فرشتوں نے بھی اس کو یقینی طور پر لکھ رکھا ہے۔ اور مسلم دانشوروں کی اس تحریر کی قیمت صرف اس وقت ہے جب کہ وہ فرشتوں کے اندراج کے مطابق ہو۔ مجھے سخت شبہ ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ فرشتوں کے رجسٹر میں غالباً اس واقعہ کی بابت برعکس طور پر یہ الفاظ لکھے گئے ہوں گے:

Incompentent Muslim leaders of India turned Hindus into a frenzied mob and they demolished the Babari Masjid at Ayodhya on December 6, 1992.

سان فرانسسکو سے ڈاکٹر منظور غوری نے ٹیلیفون کیا اور اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔ اس کے مطابق ۳۱ دسمبر کو ایک ملکی سفر ہوا۔ صبح کو جناب یونس سیجی کے ساتھ گارڈن گروو سے ایئرپورٹ کے لئے روانہ ہوا۔ یونس سیجی صاحب گجراتی ہیں۔ حسب عادت راستہ میں ان سے سوال کر کے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ ہر آدمی سے اس کے میدان کی بات کرتا ہوں۔ اور اس طرح معلومات میں اضافہ کرتا ہوں۔

میں نے ان سے پوچھا کہ کہا جاتا ہے کہ گجرات میں دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ دینداری ہے۔ انھوں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے اس کی وجہ یہ بتائی کہ گجراتی لوگ علماء کرام سے بہت زیادہ عقیدت اور تعلق رکھتے ہیں۔ ہم لوگوں کو بچپن سے بتایا جاتا ہے کہ علماء کرام وارث انبیاء ہیں۔ پھر میں نے پوچھا کہ گجراتیوں کے جو ادارے ہیں، ان میں آپس میں جھگڑا بہت کم ہوتا ہے۔ مقابلۃً ان میں زیادہ اتحاد پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہاں بھی گجراتیوں کا مزاج ہی اس کا سبب ہے۔ گجراتیوں کا مزاج یہ ہے کہ وہ ادارہ میں ۵۰۰ روپیہ دے کر الگ ہو جائے گا۔ مگر وہ پانچ پیسہ خود اس سے لینے کی کوشش نہیں کرے گا۔

اس طرح بات کرتے ہوئے مقامی ایئر پورٹ پہنچا۔ یہ ایئرپورٹ چھوٹا مگر نہایت منظم تھا۔ امریکن ایئر لائنز کی فلائٹ ۱۶۱۲ کے ذریعہ سین جوزے کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ ایک گھنٹہ کی پرواز تھی۔

جہاز کے اندر امریکن ایئر لائنز کا میگزین (American Way) دیکھا۔ اس میں ایک امریکی سائنس داں (Hans Christian Von Baeyer) کی کتاب (The Fermi Solution) کا ایک باب نقل کیا گیا تھا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کائنات کا تقریباً ۹۰ فیصد حصہ ناقابل مشاہدہ مادہ (invisible material) پر مشتمل ہے۔ اس کو عام طور پر تاریک مادہ (dark matter) کہا جاتا ہے۔ اس کو براہ راست دیکھا نہیں جا سکتا۔ البتہ اس کو بالواسطہ دیکھنے کا ایک طریقہ موجود ہے:

but there is an indirect way of detecting it.

یہ بالواسطہ طریقہ یہ ہے کہ ان ناقابل مشاہدہ اجرام سماوی کا رنگ اسپکٹرم پر بدلتا ہوا دکھائی

دیتا ہے :

their colors shift toward the red end of the spectrum. (p. 44)

سائنس چار سو سال سے پر اسراریت کی کہر کو ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہے جو کہ تاریک ادوار میں دنیا کو گھیرے ہوئی تھی۔ اس کوشش میں سائنس نے نہ صرف علم کے کچھ جزیروں کو دریافت کیا ہے بلکہ بے علمی کے وسیع سمندر سے بھی آدمی کو واقف کرایا ہے :

> Science, in clearing away the fog of myth and mysticism that shrouded the world in the Dark Ages, has exposed not only sharply delineated islands of knowledge but also boundless seas of ignorance. (p. 47)

۲۹ دسمبر کی سہ پہر کو جہاز سین جوزے ایئر پورٹ پر اتر گیا۔ یہاں ڈاکٹر جہاں گیر عالم موجود تھے۔ ان کے ساتھ آگے کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ پورا علاقہ نہایت صاف ستھرا ہے، اس کو عام طور پر (Bay Area) کہا جاتا ہے۔ پہلے ہم لوگ پالو آلٹو (Palo Alto) گئے۔ یہاں جناب منظور غوری صاحب کے مکان پر کچھ دیر قیام رہا۔ پالو آلٹو عالمی تجارت کا مرکز ہے اور بہت زیادہ مہنگا علاقہ ہے۔

منظور غوری صاحب علی گڑھ سے آکر یہاں آباد ہوئے ہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ نے ہجرت سے اپنا مسئلہ حل کیا ہے۔ ہمیں بھی ہجرت ہی سے اپنا مسئلہ حل کرنا ہوگا۔ اگر چہ دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ آپ لوگوں نے ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف ہجرت کی ہے۔ ہم کو ایک طریق کار سے دوسرے طریق کار کی طرف ہجرت کرنا ہوگا۔ اب تک ہندستانی مسلمان احتجاجی طریق کار پر چل رہے تھے، اب انھیں صابرانہ طریق کار اختیار کرنا ہوگا۔

۲۹ دسمبر کو جمعہ کا دن تھا۔ منظور غوری صاحب کے ساتھ فری مانٹ (Fremont) گیا۔ وہاں کی زیر تعمیر مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ یہ مسجد ایک مکان خرید کر بنائی جا رہی ہے۔ یہاں مختلف لوگوں سے انفرادی انداز میں گفتگو ہوئی۔ منظور غوری صاحب ہندستان کے مسلمانوں میں تعلیم کو عام کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک کالج چلانے کے لئے دس ہائی اسکول چاہئے۔ ایک ہائی اسکول کے لئے پانچ ایلمنٹری ایجوکیشن کا ادارہ چاہئے۔ نیچے کی تعلیم جب تک مضبوط نہیں ہوگی اوپر کی تعلیم مضبوط نہیں ہو سکتی۔ پہلے تو ہم نے یونیورسٹی بنائی تھی۔ اب ہمارا فوکس یہ ہونا چاہئے کہ ایلمنٹری اسکول بناؤ۔ وہ ہندستان کے دیہات دیہات میں تعلیم کو پھیلانا چاہتے ہیں اور اس سلسلہ میں ہر قسم کا

Muslim Community Association

(Santa Clara, CA)

Invites you to a talk by

Maulana Waheed-ud-Deen Khan

President, Islamic Center, New Delhi, India

Leading Muslim Intellectual and Author of Many Books including the Famous "Ilm Jadeed ka Challenge"

Titled

The Modernists' Attack on Islam: Historical Prospective and Response

Place: Masjid Annoor, Santa Clara
Time: 7:45PM (after salat Al-Isha)
Date: Friday, December 30, 1993

تعاون دینے کے لئے تیار رہیں۔

۳۱ دسمبر کو پالو آلٹو (Palo Alto) میں ڈاکٹر مرغوب احمد قریشی (پیدائش ۱۹۳۱) سے ملاقات ہوئی۔ ۱۹۹۱ میں انھوں نے ایک مسلم تحقیقی ادارہ (Muslim think tank) بنایا ہے۔ ان سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ انھوں نے اپنا کچھ لٹریچر بھی پڑھنے کے لئے دیا۔

ان کا خیال ہے کہ مغربی قوموں کا عالمی غلبہ اس طرح ممکن ہوا ہے کہ انھوں نے اپنے اعلیٰ دماغوں کا تھنک ٹینک بنایا۔ یہ لوگ عالمی ریسرچ کے ذریعہ اسٹریٹجی طے کرتے ہیں۔ ان پر عمل کرکے کہیں جنگ کرائی جاتی ہے۔ کہیں کسی کو گرایا اور کسی کو اٹھایا جاتا ہے۔ میڈیا کے ذریعہ لوگوں کے دماغوں پر قبضہ کیا جاتا ہے، وغیرہ۔ ڈاکٹر قریشی اور ان کے ساتھیوں نے ریسرچ کرکے مسلم امت کے لئے ایک طریق کار طے کیا ہے۔ یہ طریق کار اسی مغربی نمونہ پر ہے۔ مثلاً مختلف مغربی ملکوں میں لابی گروپ بنانا، ناٹو کی مانند مسلم ملکوں کا مشترک دفاعی ٹاسک فورس تیار کرنا، مسلمانوں کا آزاد سنٹرل بینک بنانا، مسلم ملکوں کے درمیان کامن مارکٹ اور کامن کرنسی قائم کرنا۔ مسلم ملکوں کے باہمی تعاون سے ملٹری ہارڈ ویر تیار کرنا تاکہ مستحکم دفاع کیا جاسکے۔ مسلم دنیا کے نزاعات کے تصفیہ کے لئے ایک انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس وضع کرنا۔

Will Muslims, living in the United States, Europe and the rest of the world, be facing economic and political crisis in the next 10-15 years and what resources they must develop to meet those crisis? Some potential policy options regarding these questions and above scenarios which the scholars may consider are:

1. The formation of strong lobby groups in the United States, U.K., France, Germany, and Russia to influence the media and counter the influence of anti-Islam lobbies.

2. The formation of a collective defensive task force by Muslim countries similar to NATO.

3. The formation of a central independent Muslim bank for international settlements for banking transactions between Muslim countries similar to the Bank for International Settlements (BIS) in Switzerland.

3. The formation of an independent organization of Muslim countries similar to the General Agreement on Trade and Tariffs (GATT), as a preamble to establish: (a) a Muslim Common Market with preferential treatment or free flow of goods between the Muslim world, (b) common currency or a monetary unit.

4. The establishment of an international court of justice for the Muslim world to settle inter-country disputes.

5. Forging close collaboration between relatively advanced Muslim countries to develop and manufacture military hardware for the collective defense of the Muslim world as well as to provide a balance of power between future power blocks.

مذکورہ مسلم تھنک ٹینک نے اپنا یہ نقشۂ عمل مغربی قوموں کا مطالعہ کرکے انھیں کے نمونہ پر تیار کیا ہے۔ مگر موجودہ حالات میں یہ نہ صرف ناممکن ہے، بلکہ وہ مسلم مسائل کا حل بھی نہیں۔ مسلمانوں کے لئے صرف دو نکاتی پروگرام یہ ہے کہ داخلی اعتبار سے تعلیم اور خارجی اعتبار سے دعوت۔ یہ پروگرام پوری طرح قابل عمل ہے اور وہی سنت رسول کے مطابق ہے۔ پروگرام کسی خیالی نقشہ کا نام نہیں۔ حقیقی پروگرام وہ ہے جس کو زیر عمل لانا فوری طور پر ممکن ہو اور نتائج کے اعتبار سے وہ دوررس ثابت ہونے والا ہو۔

واپسی میں جہاز کے اندر امریکن ایئرلائنز کا میگزین امریکن وے (یکم جنوری ۱۹۹۴) پڑھا۔ اس میں مضامین کم اور اشتہارات زیادہ تھے۔ امریکہ میں گفت وشنید (negotiating programs) کو ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ بڑے بڑے ادارے صرف اس کام کے لئے قائم ہیں اور ضرورتمند لوگ بڑی بڑی قیمت دے کر ان کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔

اسی قسم کی ایک بڑی امریکی کمپنی کا اشتہار میگزین میں چھپا ہوا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ گفت وشنید آپ کا سب سے زیادہ طاقت ور تجارتی آلہ (business tool) ہے۔ مؤثر بات چیت (effective negotiating) کی تفصیلات دیتے ہوئے اس میں درج تھا کہ :

In business, you don't get what you deserve,
you get what you negotiate.

اس کو پڑھ کر میں نے سوچا کہ یہی معاملہ زندگی کا بھی ہے۔ ایک آدمی امکانی طور پر ایک چیز کا مستحق ہوسکتا ہے۔ مگر امکانی استحقاق کو واقعہ بنانے کے لئے اپنی قوت کلام کو پرامن طور پر استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کلام کی صورت میں آدمی کو بہت بڑی طاقت دیدی ہے۔ مگر نادان آدمی معنوی حقیقتوں سے بے خبر ہونے کی بنا پر گولی کو سب سے بڑی چیز سمجھ لیتا ہے۔

بے ایریا سے واپس ہوکر دوبارہ میں آرنج کاونٹی آگیا۔ یہاں روزنامہ آرنج کاونٹی رجسٹر (یکم جنوری ۱۹۹۴) میں ایڈورڈ گارگن (Edward A. Gargan) کے قلم سے ایک رپورٹ چھپی تھی اس کا عنوان تھا :

In India, good dowry is key to a decent marriage.

اس میں بتایا گیا تھا کہ مہاتما گاندھی نے آزادی سے پہلے جہیز کی رسم کی سخت مذمت کی تھی۔ انھوں نے لکھا تھا کہ جو آدمی جہیز طلب کرے اس کو برادری سے خارج کر دیا جانا چاہئے۔ اس کے بعد جب ہندستان آزاد ہوا تو نئی ہندستانی گورنمنٹ نے ممانعت جہیز کا قانون (Dowry Prohibition Act) پاس کیا۔ لیکن آج بھی اضافہ کے ساتھ جہیز کا مذموم طریقہ رائج ہے۔ امیر اور غریب، منسٹر اور کلرک، قانون داں اور انجنیئر تک ہر ایک اس رسم میں مبتلا ہے۔

یہاں ایک صاحب نے بڑے جوش سے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہندستان میں آپ لوگوں کو مسلم قانون دانوں کا ایک بورڈ بنانا چاہئے جس کا کام لیگل فائٹنگ ہو۔ وہ مسلمانوں کے خلاف قوانین کو سپریم کورٹ میں چیلنج کرے اور مسلم موافق قوانین پارلیمنٹ سے بنوائے۔ میں نے ان کو مذکورہ اخباری رپورٹ دکھاتے ہوئے کہا کہ جہیز کو مہاتما گاندھی نے کنڈم کیا۔ تمام اخباروں نے اس کے خلاف آرٹیکل شائع کئے۔ اور اس کے خلاف باقاعدہ ایک قانون بھی بنا دیا گیا۔ اس کے باوجود ہندستانی سماج سے ایک فیصد بھی جہیز ختم نہ ہوسکا۔ پھر آپ کس بنا پر یقین کرتے ہیں کہ قانونی دفعات کے ذریعہ ہندستانی مسلمانوں کا تحفظ ہو جائے گا۔

کیلی فورنیا سے نکلنے والے مسلم میگزین (Our Times) کے شمارہ یکم ستمبر ۱۹۹۳ میں سابق مرکزی وزیر مسٹر اندر کمار گجرال کا ایک انٹرویو چھپا ہوا تھا۔ اس انٹرویو میں مسٹر گجرال کے اس قول کو سرخی بنایا گیا تھا کہ انڈیا دنیا میں دوسرا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے:

India is the 2nd largest Islamic country in the world.

اس کو پڑھتے ہوئے میں نے سوچا کہ ۱۹۴۷ میں تقسیم کی قیادتی حماقت کے باوجود انڈیا میں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد ہمارے لئے ایک عظیم امکان تھا۔ مگر بدقسمتی سے تقسیم کے بعد دوبارہ نااہل مسلم قائدین کی فوج اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے امکانات کو استعمال کرنے کے بجائے مسلمانوں کو صرف مسائل میں الجھا دیا۔ اگر یہ دوسری نادانی نہ کی گئی ہوتی تو اب تک انڈیا کے مسلمان عالمی نقشہ پر نمبر ایک ملک کی حیثیت حاصل کر چکے ہوتے۔ مگر قائدین کی ناقابل بیان حماقتوں کے نتیجہ میں انڈیا کے مسلمان صرف ایک غیر اہم اقلیت بن کر رہ گئے۔

نیویارک کے مسلم اخبار مینارہ (The Minaret) کے شمارہ ۱۶ دسمبر ۱۹۹۳ میں بتایا گیا تھا کہ کراچی میں تعلیم کے موضوع پر ایک سیمینار ہوا۔ اس میں پاکستان کی ایجوکیشن منسٹری کی طرف سے ایک پیپر پیش کیا گیا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ کم تعلیم والے ۱۲۱ ملکوں میں پاکستان ۱۱۱ ویں نمبر پر ہے:

Pakistan occupies 111th position among 121 countries with the lowest literacy rates.

پاکستان بننے کے بعد وہاں درجنوں 'مفکرین اسلام' اٹھے جن کا نعرہ تھا پاکستان میں مکمل اسلامی نظام کا نفاذ تاکہ خلافت ارضی اور قیادت عالم کا مقام پاکستان کو مل سکے۔ یہ سراسر ایک لغو نعرہ تھا۔ اور اس کی لغویت کا ثبوت یہ ہے کہ پچاس سالہ ہنگامہ آرائی کے باوجود اس کا کچھ بھی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ان تمام اشخاص کے کرنے کا واحد کام یہ تھا کہ وہ پاکستان کو تعلیم یافتہ بنانے کی کوشش کرتے۔ اگر یہ تمام لوگ تعلیم کے میدان میں محنت کرتے تو آج یقینی طور پر پاکستان صد فی صد تعلیم یافتہ ہو چکا ہوتا اور اس کے بعد اس کے لئے ہر مقصد کو حاصل کرنا آسان ہو جاتا۔

یکم جنوری ۱۹۹۴ کی شام کو یہاں کچھ کشمیری لیڈروں سے ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ آپ لوگوں نے کس لئے امریکہ کا سفر کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم کشمیری اشو کو انٹرنیشنلائز کرنے کے امریکہ آئے ہیں۔ میں نے کہا کہ حدیث میں ہے کہ مومن ایک بل سے دوبارڈسا نہیں جاتا، اور آپ لوگ بار بار کے ناکام تجربہ کے باوجود پھر اسی بل پر اپنا ہاتھ ڈال رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کا کیا مطلب۔ میں نے کہا کہ اس طرح کے معاملات کبھی انٹرنیشنلائزیشن سے حل نہیں ہوتے۔ سلطان ٹیپو نے دوسو سال پہلے انگریزی استعمار کے مسئلہ کو انٹرنیشنلائز کیا مگر وہ مکمل طور پر ناکام رہے۔ پھر علماء نے ریشمی رومال تحریک کی صورت میں آزادئ ہند کے مسئلہ کو انٹرنیشنلائز کیا مگر وہ بھی بے سود ثابت ہوا۔ پھر مسلمانوں نے فلسطین اور بوسنیا کے مسائل کو انٹرنیشنلائز کیا مگر وہ کچھ بھی حاصل نہ کر سکے۔ اسی طرح بابری مسجد کے مقامی اشو کو نیشنلائز اور پھر انٹرنیشنلائز کیا گیا مگر بابری مسجد کو بچایا نہ جا سکا۔ پھر اب آپ کس بنا پر اس قسم کی تدبیر کے ذریعہ کامیاب ہو جائیں گے۔

میں نے کہا کہ کشمیر میں آپ اپنے ناپختہ نوجوانوں کو ایک ریگولر آرمی سے لڑوا رہے ہیں۔

آخر اس نامساوی ٹکراؤ سے آپ کس طرح فتح کی امید قائم کئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ علامہ اقبال نے کہا ہے کہ لڑا دے ممولے کو شہباز سے۔ میں نے کہا کہ اقبال تو ایک شاعر تھے۔ اور قرآن کے مطابق، شاعر کبھی ایک بات کہتا ہے اور کبھی دوسری بات۔ چنانچہ جس اقبال نے لڑا دے ممولے کو شہباز سے کہا تھا، اسی اقبال نے یہ بھی کہا ہے کہ:

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر   تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ

انھوں نے کہا کہ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ جنگ بدر میں صرف ۳۱۳ مسلمان تھے اور وہ ایک ہزار طاقت ور فوج پر غالب آئے۔ میں نے کہا کہ جنگ بدر کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے پیشگی یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ اس میں فرشتے مدد کے لئے اتارے جائیں گے اور وہ مسلمانوں کے حق میں کامیابی کی ضمانت ہوں گے۔ کیا آپ لوگوں کے پاس بھی اس قسم کی کوئی وحی آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

پھر انھوں نے کہا کہ جواہر لال نہرو کی یقین دہانی اور اقوام متحدہ کا رزولیوشن ریفرنڈم کے حق میں موجود ہے۔ پھر انڈیا کیوں نہیں اس مسئلہ پر ریفرنڈم کرواتا۔ میں نے کہا کہ آپ کی یہ بات محض ایک پرنسپل کی بات ہے اور متشددانہ جنگ میں لفظی پرنسپل کا حوالہ کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ پرنسپل پرامن لڑائی میں طاقت کا کام کرسکتا ہے مگر متشددانہ لڑائی میں وہ ہرگز کسی کے لئے کوئی طاقت نہیں۔

انھوں نے کہا کہ کیا آپ جانتے ہیں کہ انڈیا ہمارے اوپر کتنا زیادہ ظلم کر رہا ہے۔ اس نے ہمارے عزت داروں کو بے عزت کیا۔ اس نے کشمیری سماج کو تباہ کر دیا۔ میں نے کہا کہ قرآن میں حکم ہے کہ دشمنی میں بے انصاف نہ بن جاؤ بلکہ ہمیشہ انصاف کی بات کہو۔ آپ جس ظلم کا حوالہ دے رہے ہیں وہ ۱۹۸۹ کے بعد پیش آیا ہے جب کہ آپ نے سری نگر کی سرکاری عمارتوں پر بم مارا اور اس طرح تشدد اور جوابی تشدد کی سیاست کشمیر میں چلائی۔ ۱۹۸۹ سے پہلے انڈیا کی فوج کشمیر میں تھی مگر اس نے کبھی بھی کشمیری آبادیوں پر کوئی زیادتی نہیں کی۔ قرآن میں ملکہ سبا کے قصہ کے ذیل میں بتایا گیا ہے کہ جب تم بادشاہوں کے خلاف جنگی اقدام کروگے تو وہ تمہاری بستیوں میں داخل ہو کر فساد کریں گے اور عزت داروں کو بے عزت کریں گے۔ اس لئے تم بادشاہوں کے خلاف اس قسم کا اقدام

کرنے سے پرہیز کرو۔ جب آپ نے تشدد دانہ اقدام کر دیا تو اس کے بعد آپ کو اس شکایت کا حق باقی نہیں رہتا کہ فریق ثانی آپ کے خلاف تشدد کی کارروائی کر رہا ہے۔

پھر انھوں نے افغانستان کی مثال دی۔ انھوں نے کہا کہ افغانی مجاہدین ایک سپر پاور سے لڑے اور کامیاب ہوئے۔ اسی طرح کشمیری مجاہدین بھی اپنی لڑائی میں کامیاب رہیں گے۔ میں نے کہا کہ یہ ادھوری بات ہے۔ افغانستان کی جنگ میں ایک اور سپر پاور کھلم کھلا پوری طرح افغانیوں کے ساتھ تھا۔ آپ کی موجودہ جنگ میں کس پاور یا سپر پاور کی حمایت اس طرح آپ کو حاصل ہے۔ وہ کسی بھی ملک کا نام نہ لے سکے

پھر انھوں نے کہا کہ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ انڈیا کا اقتصادی ڈھانچہ ٹوٹ رہا ہے۔ انڈیا کی اقتصادی کمزوری ہماری سب سے بڑی طاقت ہے۔ جلد ہی آپ دیکھیں گے کہ انڈیا کی اقتصادی طاقت تباہ ہوگی اور وہ کشمیر کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا۔ میں نے کہا کہ یہ معاملہ دونوں فریقوں کے ساتھ ہے۔ اور اس میں اصل فیصلہ کن چیز وقت ہے۔ آپ اور انڈیا میں سے جس فریق کی اقتصادی طاقت پہلے ٹوٹے گی وہ دوسرے فریق کی جیت کا باعث بنے گی۔ ایسی حالت میں آپ کے پاس کون سی مزید دلیل ہے جس کی بنا پر آپ یہ یقین کر رہے ہیں کہ انڈیا کی اقتصادی حالت آپ سے پہلے تباہ ہو جائے گی۔ اس کا بھی ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی نام نہاد لیڈر شپ کتنا زیادہ بے شعور ہے۔ پچھلے دو سو سال سے ایک ہی نادانی مسلمانوں کے درمیان جاری ہے۔ کچھ نااہل افراد پر جوش طور پر قیادت کے میدان میں کود پڑتے ہیں، حالاں کہ بے شعوری کے سوا ان کے پاس کوئی سرمایہ نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ افراد صرف مسلمانوں کی تباہی میں اضافہ کا سبب بن رہے ہیں۔ خود ساختہ قائدین کے اس پورے گروہ پر انگریزی کی یہ مثل صادق آتی ہے کہ نادان لوگ وہاں گھس پڑتے ہیں جہاں فرشتے بھی قدم رکھنے سے ڈرتے ہیں:

Fools rush in where angels fear to tread.

ٹائم میگزین (۱۰ جنوری ۱۹۹۴) ۳ جنوری کی ڈاک میں ملا۔ اس سے پہلے اس کے ۲۰ دسمبر ۹۳ کے شمارہ کی کور اسٹوری امریکہ میں بڑھتے ہوئے تشدد کے بارہ میں تھی۔ موجودہ شمارہ میں اس

سے متعلق قارئین کے خطوط شائع ہوئے تھے۔ ان خطوط میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ میں ہر دن تشدد کے واقعات ہو رہے ہیں۔ امریکی دستور کی مشہور دوسری ترمیم (second amendment) نے ہتھیار رکھنے کو ایک امریکی کا شہری حق قرار دیدیا ہے۔ اس کی وجہ سے یہاں ایجوکیشن یا جاب حاصل کرنے سے بھی زیادہ آسان گن حاصل کرنا ہو گیا ہے۔ حتی کہ مسٹر مارک جیرول (Mark Jerol) کے الفاظ میں، امریکہ کے گن پرابلم کی وجہ سے ہم ایک زندہ جہنم (living hell) کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ایک جرمن قاری (Elke Zschaebitz) نے لکھا تھا کہ امریکی دنیا کی واحد قوم ہیں جو محفوظ زندگی سے بھی زیادہ گن رکھنے کے حق کی حمایت کرتے ہیں :

> Americans are the only people who support the right to own a gun rather than the right to walk safely along the street or to feel secure in their homes. (p. 6)

سان ڈیگو کے (Ray R. Dunakin III) نے لکھا تھا کہ امریکہ میں سنگین جرائم کی موجودگی کی وجہ یہ ہے کہ یہاں مجرم کو سزا نہیں ملتی۔ ہم کو آج گن کنٹرول کی ضرورت نہیں بلکہ کرائم کنٹرول کی ضرورت ہے :

> Criminals who commit serious crimes are given light sentences and turned back onto the streets to rob or kill again and again. We don't need gun control, we need crime control.

ایک فلسطینی نوجوان سے اسلامک سوسائٹی (آرنج کاونٹی) میں ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے بعد انھوں نے فرائڈے رپورٹ (The Friday Report) کے تین شمارے برائے مطالعہ دئے۔ یہ دار کہ ڈینور (Denver) کی طرف سے ہر ماہ "اسلامک نیوز لیٹر" کے طور پر شائع ہوتا ہے۔

(Tel. 303-6912201)

اس نیوز لیٹر کے شمارہ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۹۳ (جمادی الاول ۱۴۱۴ھ) کے اڈیٹوریل میں فلسطین کے حالیہ معاہدہ کو غیر نمائندہ افراد کی طرف سے فلسطین کی فروخت (sale) قرار دیا گیا تھا۔ ایک صفحہ فتاویٰ کا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ یہ فتاویٰ اہل السنۃ والجماعۃ کے علماء کی طرف سے دئے گئے ہیں۔ ایک سوال یہ تھا کہ کیا یہ جائز ہے کہ ایک غیر اسلامی ملک میں ایک مسجد بیچ کر دوسری زیادہ بڑی جگہ خریدی جائے۔ اس کے جواب میں بتایا گیا تھا کہ بیچنا اور جگہ کا بدلنا دونوں جائز ہے۔

Q. Is it permissible to sell a mosque in a non-Islamic country in order to buy a bigger one?

A. If the mosque is ruined or not big enough and they have to demolish or sell it, it is permissible to sell it and to buy or build another one or transfer it to another place for the interest of the Muslims. (p. 3)

اس کو پڑھ کر میں نے ایک صاحب سے کہا کہ اس قسم کا فتویٰ اگر انڈیا کا کوئی عالم دے تو شاید فوراً ہی دوسرا جوابی فتویٰ شائع ہوگا جس میں اعلان کیا جائے گا کہ جس شخص نے ایسا فتویٰ دیا ہے وہ مباح الدم ہے، اس کو ذلت کے ساتھ قتل کر دینا چاہئے۔ مگر امریکہ میں یہ فتویٰ چھپ رہا ہے اور انٹرنیشنل سیرت کانفرنس میں وہ تقسیم کیا جا رہا ہے مگر کوئی اس کے خلاف احتجاج کرنے والا نہیں۔ ہندستان اور امریکہ کا یہی فرق ہے جس نے ایک ملک کو مسلمانوں کے لئے فساد کا ملک بنا دیا ہے اور دوسرے کو امن کا ملک۔

۳ جنوری کی شام کو مجھے جناب صفی قریشی صاحب کے یہاں جانا تھا۔ صغیر اسلم صاحب کے ساتھ روانہ ہوا۔ راستہ میں ہم لوگ ایک خاص مقام سے گزرے۔ صغیر اسلم صاحب نے بتایا کہ پہلے ہم لوگ یہاں رہتے تھے۔ یہاں ان کے پاس چھ ہزار مربع فٹ کا مکان تھا۔ خوبصورت پارک کے کنارے کا یہ مکان بہت وسیع اور بہت شاندار تھا۔ مگر صغیر اسلم صاحب نے اپنے بچوں کی تربیت کے لئے اس کو چھوڑ کر مسجد کے قریب چھوٹا مکان لے لیا۔ یہ دوسرا مکان دو ہزار مربع فٹ کا ہے۔ علاقہ کے لحاظ سے بھی پہلا مکان نہایت اہم علاقہ میں تھا۔ جب کہ موجودہ مکان دوسرے درجہ کے علاقہ میں ہے۔ جب انھوں نے یہ مکان بدلا تو اکثر لوگ ان کا مذاق اڑا رہے تھے کہ اتنا اچھا مکان چھوڑ کر معمولی مکان میں آ گئے۔

یہاں ہر آدمی بچوں کے بگڑنے کی شکایت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر یہ شکایت میرے نزدیک بے معنی ہے۔ اس لئے کہ اس معاملہ کا تعلق بچوں سے زیادہ ان کے بڑوں سے ہے۔ بڑے لوگ اپنے چاہنے کی قیمت ادا نہیں کرتے اسی لئے وہ اپنے بچوں کی اصلاح نہیں کر پاتے۔ اگر آپ اپنے بچوں کو آخرت پسند بنانا چاہتے ہیں تو اپنے گھر کے ماحول کو دنیوی شان و شوکت سے پاک کرنا ہوگا۔ اس کے بجائے اپنے آپ کو مسجد والے ماحول سے قریب کرنا ہوگا۔

یہی معاملہ پوری ملت کا ہے۔ لوگ جو کچھ چاہتے ہیں، اس کی قیمت ادا کرنے کے لئے وہ تیار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مطلوب چیز بھی ان کو نہیں ملتی۔ مثلاً ہر آدمی اتحاد کی بات کرتا ہے مگر وہ اختلاف اور شکایت کو نظر انداز کرنے کے لئے تیار نہیں، حالاں کہ یہی اتحاد کی واحد قیمت ہے۔ لوگ دعوت کی بات کرتے ہیں، مگر وہ مدعو کی طرف سے پیش آنے والی زیادتیوں پر صبر کرنے کے لئے تیار نہیں۔ حالاں کہ مدعو کی زیادتیوں پر صبر کئے بغیر دعوت کا عمل ممکن ہی نہیں۔ لوگ ملت کی تعلیم وترقی کی بات کرتے ہیں مگر وہ نزاعات کو اوائڈ کرنے کے لئے تیار نہیں، حالاں کہ تعلیم وترقی کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نزاعات کو ہر حال میں اوائڈ کیا جائے۔

۳ جنوری کو میں جناب صغیر اسلم صاحب کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں فیکس پر ایک خط آیا۔ یہ خط لیزبرگ (Leesburg) سے آیا تھا جو امریکہ کے ایسٹ کوسٹ میں واقع ہے۔ اس پر مزانڈا اڈی ہایوز (Inda de Hoyos) کا دستخط تھا۔ انھوں نے دعوت دی تھی کہ میں امریکہ سے رخصت ہونے سے پہلے ان کے ادارہ میں آؤں۔ تاہم وقت کم ہونے کی وجہ سے میں سفر کا پروگرام نہ بنا سکا۔ (Tel. 03-882-4771)

مذکورہ خاتون ایک امریکی ادارہ کے ایشیائی شعبہ کی صدر ہیں۔ اس ادارہ کا نظریہ یہ ہے کہ اضافہ آبادی کے بارہ میں مالتھس کا نظریہ غلط تھا۔ زمین میں زندگی کے ذرائع اتنے زیادہ ہیں کہ ہمیں مصنوعی طور پر آبادی پر کنٹرول کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف وسائل ارض کو درست طور پر منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے راقم الحروف کی کتاب عظمت قرآن (صفحہ ۲۳ ـ ۲۶) کا انگریزی ترجمہ پڑھا۔ وہ ان کو بہت پسند آیا۔ چنانچہ ان کا خیال تھا کہ میں ان کے ادارہ میں آؤں اور وہاں اس موضوع پر مزید لکچر دوں۔ مگر ان کا پیغام مجھے دیر سے ملا اس لئے میں وہاں کا پروگرام نہ بنا سکا:

Inda de Hoyos, 62 Sycolin Road, Leesburg, Va 22075
Tel. 703-777-9451, 03-882-4771. Fax 703-771-9492

۳ جنوری کی شام کو اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں نماز عشاء کے بعد ایک اجتماع ہوا۔ اس موقع پر میں نے کچھ احادیث کی روشنی میں دین کی تفہیم کی۔ ان حدیثوں کا تعلق دین کی اسپرٹ سے تھا۔

۴ جنوری کی شام کو جناب جاوید نواز صاحب کے مکان پر ایک اجتماع ہوا۔ اس میں کچھ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ یہاں میں نے تقریباً آدھ گھنٹہ کی تقریر کی۔ اس میں بتایا کہ ہمیشہ مسائل کے ساتھ مواقع موجود رہتے ہیں اور آج بھی ہیں۔ ہم کو چاہئے کہ مسائل کو نظر انداز کریں اور مواقع کو استعمال کریں۔

آخر میں سوال وجواب ہوا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ امریکہ میں مسلم نسلوں کے (assimilation) کا عمل تیزی سے جاری ہے۔ چھ ملین مسلمانوں کے درمیان یہاں چھوٹی بڑی ڈیڑھ ہزار مسجدیں ہیں۔ ان مسجدوں میں خاص طور پر جمعہ کے دن معقول تعداد میں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اجتماع عبادت سے زیادہ سوشلائزنگ کے لئے ہوتا ہے۔ ترکی اور سوویت یونین میں مسلمانوں نے اپنا تشخص نہیں کھویا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں چیلنج تھا۔ چیلنج ہمیشہ مقاومت (resistance) پیدا کرتا ہے اور وہ زندگی کی ضمانت بن جاتا ہے۔ امریکہ میں یہ چیلنج نہیں اس لئے یہاں مسلمانوں کے لئے جذب ہوجانے کا خطرہ نظر آتا ہے۔

تاہم ایک پرامید علامت یہ ہے کہ خبروں کے مطابق، امریکی حکومت اسلام کو مغربی تہذیب کے دشمن کے طور پر پروجیکٹ کر رہی ہے۔ اگر فی الواقع یہ امریکی ایڈمنسٹریشن کا سوچا سمجھا فیصلہ ہو تو یہ چیز مسلمانوں کی بقاء کی ضامن بن جائے گی۔ کیوں کہ اس کے بعد یہاں بھی چیلنج اور اس کے جواب میں مقاومت کا ماحول بن جائے گا جو اسلامی تشخص کے بقاء کی ضمانت ہوگا۔

ہندستان کے جو مسلمان امریکہ میں آباد ہیں انھوں نے ہندستانی مسلمانوں کے نام پر بہت سی چھوٹی بڑی تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں۔ تنظیمی اعتبار سے یہ سب الگ الگ ہیں۔ مگر طرز فکر کے اعتبار سے سب کی سب یکساں ہیں۔ ہر گروہ ہندستانی مسلمانوں کا تعارف مظلوم فرقہ (oppressed community) کی حیثیت سے کراتا ہے اور ہندوؤں کا تعارف جنگجو ہندو (Hindu militants) کی حیثیت سے۔

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہندستان بھی ویسا ہی ایک ملک ہے جیسا کہ امریکہ۔ ہندستان میں نہ مسلمان مظلوم ہے اور نہ ہندو ظالم۔ جو بگاڑ وہاں آپ دیکھتے ہیں

اس کے اصل ذمہ دار نا اہل مسلم لیڈر رہیں۔ ان کے نکمے لیڈروں نے پچھلے سو سال سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو غیر ضروری طور پر ایک دوسرے سے متصادم رکھا ہے۔ آپ لوگوں کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس قسم کے نکمے لیڈر آپ کے یہاں نہیں اٹھے یا آپ لوگوں نے انھیں اٹھنے نہیں دیا۔ اگر امریکہ میں اسلام کے نام پر وہی ہنگامے جاری ہو جاتے جو برصغیر ہند میں جاری کئے گئے تو امریکہ بھی آپ کے لئے ویسا ہی ہوتا جیسا کہ آپ انڈیا کو سمجھتے ہیں۔

امریکہ میں دو ہفتہ تک رہا۔ اس مدت میں وہاں کبھی بجلی فیل نہیں ہوئی۔ ٹیلی فون کبھی ڈیڈ نہیں ہوا۔ کبھی سڑکوں پر ہارن کی آواز نہیں آئی۔ کبھی مجھے لاؤڈ اسپیکر کا شور سننے پر مجبور نہیں ہونا پڑا۔ فٹ پاتھ پر کہیں خوانچہ فروش نظر نہیں آئے۔ کہیں کوئی گداگر دکھائی نہیں دیا۔ بے شمار گاڑیوں کے باوجود سڑکوں پر پولیوشن بہت کم تھا۔ کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ کا کوئی وجود نہ تھا۔ غرض زندگی ہر اعتبار سے پر راحت تھی۔ گھر، سڑک، بازار، دفاتر، ہر جگہ صفائی اور باقاعدگی نظر آتی تھی۔

اس کے بعد جب سفر سے واپس آیا اور دہلی میں داخل ہوا تو یہاں ہر چیز بالکل مختلف تھی۔ وہاں اگر ہر چیز اعلیٰ تھی تو یہاں ہر چیز ادنیٰ نظر آئی۔ تاہم میرے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ مجھے ہندستان چھوڑ دینا چاہئے اور امریکہ میں جا کر رہنا چاہئے۔ امریکہ بلاشبہ ہندستان کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے۔ اس کے باوجود میں ہندستان کو اور صرف ہندستان کو پسند کرتا ہوں۔ کیوں کہ ہندستان میرا وطن ہے۔ میری تمنا ہے کہ میرا ملک بھی دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کی طرح اعلیٰ ترقی کرے۔

دوسروں کی ترقی میں جینا مجھے اپنی غیرت کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ میں خود اپنے وطن کی ترقی میں جینا چاہتا ہوں۔ اگر مجھے اپنی عمر میں ایک ترقی یافتہ ہندستان نہ ملے تو یہ احساس بھی میرے اطمینان کے لئے کافی ہے کہ ہندستان کے مستقبل کی تعمیر میں کچھ اینٹیں میں نے بھی اپنے کمزور ہاتھوں سے رکھی تھیں۔

۵ جنوری ۱۹۹۴ کو واپسی کا دن تھا۔ گارڈن گروو سے لاس اینجلیز کے لئے جناب عبدالحمید سیمجی اور جناب حبیب الدین ملک کے ساتھ روانگی ہوئی۔ حبیب الدین ملک صاحب کا تعلق

پشاور سے ہے۔ انھوں نے افغانستان کی جنگ میں عملی حصہ لیا ہے۔ وہ اس زمانہ میں افغانستان گئے تھے جب کہ روسی فوجیں واپس جا چکی تھیں مگر ڈاکٹر نجیب اللہ کی حکومت ابھی باقی تھی۔ انھوں کہا کہ میرا یہ ارمان رہ گیا کہ اس جہاد میں مجھے کوئی زخم لگتا۔ مگر ایسا نہ ہوسکا۔

میں نے پوچھا کہ اب تو افغانستان سے روس واپس جا چکا ہے۔ اب سب کے سب افغانی لوگ وہاں ہیں۔ حتی کہ حکمتیار اور ربرہان الدین دونوں مجاہدین کے سردار تھے۔ پھر یہ باہمی لڑائی کیوں ابھی جاری ہے۔ انھوں نے فوراً کہا کہ اقتدار۔ لیکن اگر یہ اقتدار کی جنگ ہے تو اس سے پہلے وہاں جہاد کی جنگ نہ تھی۔ اور اگر وہ جہاد کی جنگ تھی تو اب اقتدار کی جنگ نہ ہونا چاہئے۔

ہوائی اڈہ تک ایک گھنٹہ کا سفر" فری وے" کے ذریعہ طے ہوا۔ کہیں بھی ریڈ لائٹ نہیں آئی اور نہ گاڑی روکنے کی ضرورت ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فری وے کی سڑکوں پر کراسنگ نہیں ہوتی۔ جہاں کہیں کراسنگ ہوتی ہے وہاں اوربرج بنا دیا جاتا ہے تاکہ گاڑیاں اوپر سے گزرسکیں۔ ایئرپورٹ کے پاس پہنچے تو سڑک کے اوپر رن وے بنا ہوا تھا۔ اوپر سے جہاز دوڑرہا تھا اور نیچے سے کار۔

لاس اینجلیز سے سوئس ایئر کی فلائٹ ۱۰۷ کے ذریعہ سفر ہوا۔ مقامی وقت کے لحاظ سے رات کو ۹ بجے جہاز یہاں سے روانہ ہوا۔ ۹۵۶۰ کیلومیٹر کی نان اسٹاپ پرواز تھی، ۳۳ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتا ہوا یہ جہاز ساڑھے دس گھنٹہ میں زیورک پہنچا۔ اس وقت زیورک میں شام کے ساڑھے چار بجے کا وقت تھا اور جنوری ۱۹۹۴ کی ٦ تاریخ۔ یہ سفر بہت تھکا دینے والا تھا۔ مگر نیند اللہ تعالی کی بہت بڑی نعمت ہے۔ راستہ میں بار بار گہری نیند آتی رہی اور یہ سفر بآسانی طے ہوگیا۔

راستہ میں سوئس ایئر کا فلائٹ میگزین سوئس ایئر گزٹ (جنوری ۱۹۹۴) پڑھا۔ اس کا ایک مضمون اس موضوع پر تھا کہ آسمان نیلا کیوں ہے (why is the sky blue) اس سلسلہ میں مختلف تفصیلات درج تھیں۔ زمین سے ہم سورج اور آسمان کو گیسوں کی ۵۰ کیلومیٹر موٹی چادر (thick sheet) کے واسطہ سے دیکھتے ہیں جس کو فضا (atmosphere) کہا جاتا ہے۔

آسمان میں جو رنگ ہم دیکھتے ہیں وہ اسی فضا کے اوپر سورج کی روشنی کے فزیکل ری ایکشن کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ۱۹ویں صدی کے آخر میں لارڈ ریلے (Lord Rayleigh) نے اس کی تحقیق کی۔ ان کی تشریح نے بتایا کہ آسمان کا نیلاپن ہر ایک گرام ہوا میں کئی بلین ایٹم کا نتیجہ ہوتا ہے:

> His explanation showed that the blueness of the sky implies many billion atoms in every gram of air. If air had no atomic structure, the sky would not scatter light. (p. 31)

مضمون میں مزید بتایا گیا تھا کہ ہماری کہکشاں (Milky Way) میں ایک سو بلین ستارے ہیں۔ مزید یہ کہ اس طرح کی تقریباً ایک سو بلین کہکشائیں وسیع کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں۔ کائنات کی یہ وسعت کتنی زیادہ عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو اتنا زیادہ عظیم اس لئے بنایا تاکہ انسان خالق کائنات کی اتھاہ عظمت کا تصور کر سکے۔

۶ جنوری کی شام کو زیورک پہنچا۔ یہاں مجھے اگلے جہاز کے لئے تقریباً ڈیڑھ دن ٹھہرنا تھا۔ یہاں ویزا لینا تھا۔ اس کے بعد سوئس ایئرویز کی طرف سے ہوٹل میں قیام کا انتظام کیا جاتا۔ زیورک کا ایئرپورٹ بہت بڑا ہے اور ادھر سے اُدھر جانا، اس کاونٹر سے اُس کاونٹر پر کھڑا ہونا میرے بس میں نہیں۔ میں نے ایئرپورٹ کے ایک نوجوان مسٹر اوور ایگیٹر (Ouver Aegeter) سے کہا۔ انھوں نے میرا ٹکٹ اور پاسپورٹ لیا۔ سارے کام خود ہی کرائے۔ اس کے بعد ایئرپورٹ کے اندر چلنے والی مخصوص کھلی کار میں بٹھا کر وہاں پہنچا دیا جہاں مجھ کو ٹھہرنا تھا۔

ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے ان کا نام پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ کیا آپ میری کمپلینٹ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں میں آپ کی تعریف کرنے کے لئے آپ کا نام پوچھ رہا ہوں۔ اس کے بعد انھوں نے ایک کاغذ پر اپنا پورا نام لکھ کر دیا۔

زیورک ایئرپورٹ پر اتفاقاً ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ کیپٹن پی کے سنگھل تھے۔ وہ دہلی میں رہتے ہیں (Tel. 5592315) اور انڈین لائنز میں پائلٹ ہیں۔ ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ میں حسب عادت ہوابازی کے متعلق سوالات کرتا اور وہ ہر سوال کا جواب دیتے رہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ پرواز کے دوران کسی پائلٹ کے لئے سب سے زیادہ پریشان کن صورت حال کون سی ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا —— جب آپ کو رن وے نہ ملے لینڈ

کرنے کے لئے۔

انھوں نے بتایا کہ ایک بار ان کے ساتھ ایسا ہوا کہ جس ہوائی اڈہ پر انھیں اترنا تھا وہاں سخت فاگ تھا۔ اس لئے وہ وہاں اپنا جہاز اتار نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے آس پاس کے کئی مقامات سے بذریعہ وائرلیس ربط قائم کیا۔ ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ ایئر پورٹ کے اوپر گھرا کہر چھایا ہوا ہے۔ اس کے بعد بمبئی جاکر انھوں نے اپنا جہاز اتارا۔ خوش قسمتی سے انھوں نے زیادہ پٹرول لے لیا تھا ورنہ بمبئی پہنچنا ممکن نہ ہوتا۔

زندگی میں بھی اس طرح کے نازک لمحات آتے ہیں جب کہ مطلوب منزل کی طرف بڑھنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس وقت آدمی کے اندر اتنی بصیرت ہونی چاہئے کہ وہ یہ جان سکے کہ دوسرے کون سے مقامات ہیں جس طرف وہ اپنے سفر کے رخ کو موڑ سکتا ہے۔

زیورک سے بہت سی تاریخی داستانیں وابستہ ہیں۔ آئن سٹین کے سوانح نگار رونالڈ کلارک (Ronal W. Clark) نے لکھا ہے کہ ۱۹۰۸ میں زیورک یونیورسٹی میں نظریاتی طبیعیات (theoretical physics) کے شعبہ میں ایک پروفیسر کی ضرورت تھی۔ آئن سٹین اس کے لئے امیدوار تھا۔ لیکن بورڈ آف ایجوکیشن نے بعض سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے آئن سٹین کو نہیں لیا۔ اس کے بجائے انھوں نے فریڈرش ایڈلر (Friedrich Adler) کا تقرر کر دیا۔

مگر نوجوان ایڈلر ایک انوکھا آدمی تھا جس میں علمی دیانت داری غیر معمولی حد تک پائی جاتی تھی، بعد کو جب اسے معلوم ہوا کہ اگر وہ اس پوسٹ پر نہ ہوتا اور اس کی پیش کش آئن سٹین کو کی جاتی تو وہ اس کو قبول کر لیتا۔ اس نے کہا کہ محض سیاسی اسباب سے ہمیں ایسا موقع کھونا نہیں چاہئے جب کہ ہم ایک ایسے شخص کو پا سکتے ہیں جو یونیورسٹی کے معیار کو بہت زیادہ بڑھا دینے والا ہے۔ اس نے بورڈ آف ایجوکیشن کو اپنا استعفا بھیجتے ہوئے لکھا کہ اگر یہ ممکن ہے کہ ہم اپنی یونیورسٹی کے لئے آئن سٹین جیسے لائق شخص کو پا سکتے ہیں تو اس پوسٹ پر میرے جیسے ایک آدمی کو رکھنا بالکل لغو ہوگا۔

میں بالکل صفائی کے ساتھ کہوں گا کہ طبیعیاتی عالم کی حیثیت سے میرا اور آئن سٹین کا کچھ بھی مقابلہ نہیں:

If it is possible to obtain a man like Einstein for our university, it would be absurd to appoint me. I must quite frankly say that my ability as a research physicist does not bear even the slightest comparison to Einstein's. (p. 165)

واضح ہو کہ یہ بات ۱۹۰۸ کی ہے جب کہ آئن سٹین کو ابھی عظمت کا مقام نہیں ملا تھا۔ پہلی بار ۱۹۱۹ء میں اس کو عالمی شہرت حاصل ہوئی جب کہ اس کے نظریہ اضافیت کو سائنس دانوں نے قبول کر لیا۔ اس کے دو سال بعد اس کو طبیعیات کا نوبل انعام دیا گیا۔

زیورک ایئر پورٹ پر ایک مسافر سے لے کر ریڈرس ڈائجسٹ (دسمبر ۱۹۹۳) دیکھا۔ اس میں ایک مضمون شراب نوشی کے بارہ میں تھا۔ اس کا عنوان تھا کہ شراب پی کر گاڑی چلانا قتل کا لائسنس:

Drunk driving : a license to kill

مضمون میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ کی سڑکوں پر ہر ۳۰ منٹ میں ایک مرنے والا وہ ہوتا ہے جس کا تعلق شراب نوشی سے متعلق ایکسیڈنٹ سے ہوتا ہے۔ اس میں بہت سے واقعات درج کئے گئے تھے اور بتایا گیا تھا کہ شراب پی کر گاڑی چلانے والا جب کسی کی موت کا سبب بنتا ہے اور اس پر کیس چلایا جاتا ہے تو یا تو وہ بچ جاتا ہے یا معمولی سزا پر چھوٹ جاتا ہے:

How long must it be — and how many must die — before we make . the punishment fit the crime? (p. 132)

موجودہ زمانہ میں ایک طرف وہ لوگ ہیں جو نام نہاد جدید تعزیرات (modern penology) کا حوالہ دے کر یہ کہہ رہے ہیں کہ اسلام کا قانون سزا وحشیانہ ہے۔ دوسری طرف انسانی فطرت جدید نظریہ سزا کے خلاف احتجاج کر رہی ہے کہ اس نے مجرموں کے حق میں نرم رویہ اختیار کر کے جرائم کو اتنا زیادہ بڑھا دیا ہے کہ اب پورا انسانی سماج اس کی زد میں ہے۔

۷ جنوری کو زیورک سے دہلی کے لئے سوئس ایئر کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں مختلف اخبار اور رسالے کا مطالعہ جاری رہا۔ سوئس ایئر کی فلائٹ میگزین میں ایک مضمون خلا کے بارہ میں تھا۔ اس میں بہت سی سائنسی معلومات درج تھیں۔

اس میں بتایا گیا تھا کہ زمین سے جب ہم آسمان کو دیکھتے ہیں تو ہمارا یہ مشاہدہ براہ راست نہیں ہوتا بلکہ ۵۰ کیلومیٹر موٹی چادر درمیان میں حائل ہوتی ہے جو مختلف قسم کی گیسوں سے بھری ہوئی ہے۔ آسمان کا نیلا رنگ جو ہم زمین سے دیکھتے ہیں وہ اسی درمیانی چادر میں ہونے والے طبیعیاتی ردعمل (physical reaction) کا نتیجہ ہوتی ہے۔ آسمان کا نیلاپن ہر ایک گرام ہوا میں اربوں ایٹم کی موجودگی کا نتیجہ ہے:

The blueness of the sky implies many billion atoms in every gram of air.

رنگ کی مختلف قسموں میں سے آسمان کے لئے نیلے رنگ کا انتخاب ایک اعلیٰ ذہانت کا ثبوت ہے۔ کیوں کہ اس سے بہتر کوئی رنگ تصور میں نہیں آتا۔ اسی طرح زمین پر سبزہ کے لئے ہرے رنگ کا انتخاب آخری اعلیٰ انتخاب ہے۔ اگر آدمی صرف ان دو رنگوں پر غور کرے تو وہ یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ اس کائنات کے پیچھے ایک خدائی ذہن کارفرما ہے۔ کیوں کہ ایک برتر خدائی ذہن کے بغیر اس قسم کا آخری بہتر انتخاب ممکن ہی نہیں۔

۷ جنوری ۱۹۸۴ کی دوپہر کو سوئس ایئر کی فلائٹ ۱۹۴ کے ذریعہ میں زیورک سے دہلی کی طرف جا رہا تھا۔ جہاز روانہ ہوا تو کیپٹن کی طرف سے اعلان ہوا کہ آپ جس جہاز پر سوار ہیں وہ انتہائی ترقی یافتہ مواصلاتی نظام سے لیس ہے۔ آپ جہاز کے اندر سے کسی بھی وقت کسی بھی مقام کے لئے ٹیلیفون کر سکتے ہیں۔

راستہ میں انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون (۷ جنوری ۱۹۹۳) پڑھا۔ ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ موجودہ امریکی صدر بل کلنٹن کی والدہ کیلی (Virginia Kelley) کا ۷۰ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ انھوں نے تین نکاح کئے۔ پہلے شوہر کا انتقال کار ایکسیڈنٹ میں ہوگیا۔ یہ حادثہ مستقبل کے صدر امریکہ کی پیدائش سے چار ماہ پہلے پیش آیا:

He died in a car accident about four months before the future president was born

جہاز دلّی کے قریب پہنچ گیا تھا۔ ہندستانی وقت کے لحاظ سے رات کے گیارہ بجے کا وقت تھا۔

اس وقت ایک تجربہ گزرا۔ اس کے بعد میں نے کہا ـــــ اس دنیا میں انسان کے لئے قابل حصول لذت صرف ایک ہے۔ وہ ہے اللہ کی یاد میں رونا۔ اللہ کی یاد میں رونا انسانی روح کے لئے لذیذ اس لئے ہے کہ وہ خدائے کامل سے قربت کا لمحہ ہوتا ہے۔ اس کے سوا جن چیزوں کو انسان لذت سمجھے ہوئے ہے وہ فریب لذت ہیں نہ کہ حقیقی معنوں میں لذت۔

رات کو ۱۲ بجکر دس منٹ پر جہاز دہلی کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ شمسی کیلنڈر کے اعتبار سے ہم جنوری کی آٹھویں تاریخ میں داخل ہو چکے تھے۔ اسی طرح ایک دن ختم ہوکر دوسرا دن آتا رہے گا۔ یہاں تک کہ وہ آخری دن آجائے گا جب کہ انسان محدود دنیا سے نکل کر ابدی دنیا میں داخل ہو جائے گا۔

ایک سفر

مراکو (المغرب) کی راجدھانی رباط میں ملک الحسن الثانی کی طرف سے ایک سالانہ پروگرام ہوتا ہے۔ یہ پروگرام ہر سال رمضان میں ہوتا ہے۔ اس میں مراکو اور عالم اسلام کے بڑے بڑے علماء شریک ہوتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ افطار سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے اہل علم بڑی تعداد میں قصر سلطانی میں جمع ہوتے ہیں۔ سلطان بذات خود بھی اس میں شرکت کرتے ہیں۔ ہر روز کوئی ایک عالم ۴۵ منٹ تک قرآن کی کسی آیت یا کسی حدیث کو عنوان بنا کر اس پر خطاب کرتا ہے۔ آخر میں ملک الحسن الثانی کی دعا پر اس کا اختتام ہوتا ہے۔ اس کو الدروس الحسنیہ کہا جاتا ہے۔

رمضان کے بعد ان خطابات کا مجموعہ مراکو کی وزارت اوقاف کی طرف سے چار زبانوں میں شائع کیا جاتا ہے ——— عربی، فرانسیسی، انگریزی، اسپینی۔ اس بار رمضان ۱۴۱۴ھ کے موقع پر مجھ کو دعوت نامہ ملا کہ اس پروگرام میں شرکت کروں اور ایک مقالہ وہاں پیش کروں۔ اس کے مطابق مراکو کا سفر ہوا۔ اس موقع کے لئے میں نے جو مقالہ تیار کیا وہ الیوم اکملت لکم دینکم کی قرآنی آیت پر مبنی تھا۔

۱۱ فروری ۱۹۹۴ کو صبح ۹ بجے کا وقت ہے۔ ابتدائی مراحل سے گزر کر میں دہلی انٹرنیشنل ایئر پورٹ کے گیٹ نمبر ۱ کے سامنے بیٹھا ہوں اور گیٹ کھلنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ اتنے میں ایک مکھی آکر میرے اوپر بیٹھ گئی۔ مجھے یاد آیا کہ پچھلے مہینہ میں دو ہفتہ تک امریکہ میں رہا۔ مگر وہاں کسی بھی جگہ مجھے کوئی مکھی دکھائی نہیں دی۔ یہاں اندرا گاندھی ایئر پورٹ جیسے پرسٹیجس مقام پر بھی مکھی موجود ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ مکھی کو ختم کرنا کوئی بہت بڑا انسانی کارنامہ نہیں۔ مکھی گندگی کو صاف کرتی ہے، جب کہ انسان گندگی پھیلاتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو مکھی کو ختم کرنے والے اور مکھی کو ختم نہ کرنے والے دونوں کے درمیان بہت زیادہ فرق نہیں ملے گا۔ کیوں کہ دونوں ہی جگہ کا انسان ابھی اصل معاملہ میں بہت پیچھے ہے۔

دہلی سے پیرس کے لئے روانگی ایئرانڈیا کی فلائٹ ۱۴۹ کے ذریعہ ہوئی۔ یہ جہاز فرینک فرٹ ہوتے ہوئے پیرس جارہا ہے۔ قدیم زمانہ میں ۶۸۱۰ کیلومیٹر کا سفر نو گھنٹے میں طے کرنا ناممکن تھا۔ آج یہ ممکن ہوگیا ہے۔ عام طور پر اس کو ٹکنکل ترقی کا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر بہت کم ایسے لوگ ہونگے جو یہ سوچیں کہ یہ دراصل ان امکانات کا کارنامہ ہے جو فطرت کے اندر پہلے سے موجود تھے۔ انسان نے صرف یہ کیا کہ خدا کی دی ہوئی عقل سے ان کو دریافت کرکے انھیں استعمال کیا۔

دہلی سے جہاز کی روانگی کا وقت نو بجکر ۳۰ منٹ تھا۔ مگر جب جہاز دہلی سے اڑا تو گھڑی میں دس بجکر ۳۰ منٹ ہوچکے تھے۔ یہ مجھے اس بات کی قیمت ادا کرنی پڑی کہ میں نے "دیش بھگتی" کی خاطر باہر کی کسی ایئرلائنز (مثلاً ایئر فرانس) سے سفر کرنے کے بجائے ایئرانڈیا کا انتخاب کیا۔ بیرونی ایئر کمپنیاں عام طور پر بالکل ٹھیک وقت پر سفر کرتی ہیں۔ لیکن ایئرانڈیا اور انڈین ایئرلائنز دونوں کے لئے تاخیر ایک معمول کی بات ہوگئی ہے۔ پرواز شروع ہوئی تو ایئر ہاسٹس نے اعلان کیا "ویمان کے لیٹ اڑانوں کے کارن اس دیری کے لئے ہم آپ سے چھما چاہتے ہیں"۔

میرے نزدیک اس قسم کی خرابیاں نہرو دور کی دین ہیں۔ نہرو کے سوشلزم نے ملک کو صرف ناقص کارکردگی اور کرپشن کا تحفہ دیا۔ سوشلزم یا اسٹیٹ کنٹرول والے سماج کا لازمی نتیجہ ہے، ذاتی محرک اور مقابلہ کے ماحول کا ختم ہوجانا۔ یہ فطرت کے قانون کے خلاف ہے۔ اور فطرت کے خلاف کوئی اسکیم کبھی مفید نہیں ہوسکتی۔ میرا ذاتی احساس یہ ہے کہ نہرو کے نام نہاد سوشلزم نے پچاس سال میں ہندستان کو اس سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے جتنا کہ انگریزوں نے دو سو سال کی مدت میں اس ملک کو پہنچایا تھا۔ تاہم یہ ایک امید کی بات ہے کہ موجودہ حکومت لبرلائزیشن کی پالیسی اختیار کرکے اس برائی کو ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

"سر، آپ ہندی فلم دیکھیں گے یا انگلش فلم، کون سی فلم آپ کو دکھائیں" جہاز کے عملہ کے ایک صاحب نے پوچھا۔ میں نے کہا کہ نہیں، مجھے فلم نہیں دیکھنا ہے، میں تو یہ اخبارات پڑھوں گا۔ میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی، اس نے کم از کم تین بار مجھ سے یہی سوال کیا۔ آج کا انسان "منورنجن" کے لئے صرف ایک بات جانتا ہے اور وہ فلم ہے۔ اس کو علم نہیں کہ اس دنیا میں اس سے زیادہ بڑا ایک منورنجن ہے اور وہ علم ہے۔ علم کے اضافہ میں جو لذت ہے وہ کسی بھی دوسری چیز میں نہیں۔ اور

علم جب معرفت کے درجہ کو پہنچ جائے تو اس کی یہ لذت اتنی زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ اس کا کوئی حساب ہی نہیں۔

دوران سفر ایئر انڈیا کا فلائٹ میگزین نمسکار (جنوری۔ فروری ۱۹۹۴) دیکھا۔ اس میں ایک مضمون کا عنوان تھا: وطن کی طرف واپسی (The home coming) اس میں بتایا گیا تھا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کی اکانومی کے لبرلائزیشن کی اسکیم اور ریڈ ٹیپ میں کمی اور پرمٹ راج کو ختم کرنے کی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ نان ریزیڈنٹ انڈین کی واپسی کے لئے گویا فلڈ گیٹ کھل گیا ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق، بیرونی ملکوں میں رہائش پذیر ہندستانیوں کی تعداد ۱۲ ملین ہے۔ یہ لوگ تقریباً ۳۵ بلین ڈالر کی قابل سرمایہ کاری (investible) دولت رکھتے ہیں۔ اب تک یہ لوگ اپنی دولت باہر لگانا پسند کرتے تھے۔ مگر اب وہ ہندستان میں سرمایہ کاری سے خصوصی دلچسپی لے رہے ہیں۔

پچھلی نصف صدی میں بے شمار بیرونی دولت جو ملک میں آسکتی تھی وہ باہر کی باہر رہ گئی۔ وہ ہندستان کی خوش حالی میں اضافہ کا سبب نہ بن سکی۔ اس کی واحد وجہ ملکی صنعتوں کے لئے تحفظ (protection) کے نام پر بننے والے مصنوعی قوانین اور ضوابط تھے۔ ہندستان کی جدید اقتصادی تاریخ کا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اصلاح کے نام پر ہونے والا ایک عمل بھی کتنے بڑے فساد کا باعث ہو سکتا ہے۔ یہی اصلاحی فساد مزید اضافہ کے ساتھ خود مسلم رہنماؤں نے بھی ساری مسلم دنیا میں برپا کر رکھا ہے۔

جہاز میں کئی اخبار پڑھے۔ ہندی اخبار نو بھارت ٹائمس (۱۱ فروری ۹۴) بھی موجود تھا۔ کانپور کے فساد کی خبر کی سرخی یہ تھی: کانپور میں سیناتینات، ۱۵ تھانہ چھیتروں میں کرفیو۔ اس جملہ میں اردو کا تعینات ہندی میں جا کر تینات بن گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سماج کے مختلف طبقات کے میل جول سے زبانیں کس طرح بدلتی رہتی ہیں۔

یہی تبدیلی قدیم زمانہ میں مذہب کی مقدس کتابوں میں بھی ہوئی ہے۔ چنانچہ ہر مذہبی کتاب کے متن میں طرح طرح کے فرق واقع ہو گئے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات اس کا اصل ابتدائی مفہوم ہی خبط ہو کر رہ گیا ہے۔ مثال کے طور پر بائبل میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جن کے واقعی معنی معلوم نہیں۔ ان کا مفہوم صرف اٹکل سے قائم کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب: Historical Jesus

اس عمومی تاریخی ظاہرہ میں صرف ایک استثناء ہے اور وہ قرآن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے نزول کے وقت ہی سے اس کی کتابت اور حفظ دونوں کا اہتمام کیا گیا۔ اس طرح قرآن میں مذکورہ قسم کی تبدیلی نہ ہو سکی۔

ایک ائیرہاسٹس نے اپنا نام مسز اشرفی بتایا اور کہا کہ وہ ایک مسلم پیر کی مرید ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کی جو سروس ہے وہ آپ کے لئے بورنگ ہے یا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ ہمارے لئے تو یہ کام ایک ہابی بن چکا ہے۔ میں نے کہا کہ مگر میرا حال تو یہ ہے کہ میں فرسٹ کلاس کے سفر میں بھی سخت اکتاہٹ میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ایک جگہ بیٹھے یا لیٹے رہتے ہیں۔ ہم کو تو ہر وقت حرکت میں رہنا پڑتا ہے۔ ہر وقت ہمارے سامنے کوئی کام ہوتا ہے۔ ہم لوگ کسی بھی وقت اپنے کو غیر مصروف نہیں پاتے۔

یہ بات مجھے درست نظر آئی۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ہر وقت سرگرم رہنا چاہتا ہے۔ کسی آدمی کو آپ ایک کمرہ میں بند کر دیں تو خواہ اس کمرے میں عیش وعشرت کا تمام سامان موجود ہو، وہ بہت جلد گھبرا جائے گا۔ انسان حرکت وعمل کے ماحول میں زندہ رہتا ہے۔ اس کی فطرت چاہتی ہے کہ اس کے سامنے ہر وقت کوئی چیلنج یا کوئی عملی تقاضا موجود رہے جس میں لگ کر وہ محسوس کرے کہ میں نے ایک کام کیا۔ کسی فرد یا کسی قوم کو متحرک کرنے کا واحد راز یہ ہے کہ اس کو ایک پروگرام دے دیا جائے جس پر اس کو یقین ہو اور جس کے لئے وہ اپنی صلاحیت کو متحرک کر سکے۔

یہ ہوائی جہاز کا فرسٹ کلاس ہے۔ ہر قسم کے پر راحت سامان اس کے اندر افراط کے ساتھ موجود ہیں۔ تربیت یافتہ عورت اور مرد ہر وقت خدمت کے لئے حاضر ہیں۔ آپ صرف ایک بٹن دبا دیں اور ایک منٹ کے اندر ایک مستعد ایئر ہاسٹس آکر آپ کی ضرورت پوری کر چکی ہوگی۔ ایک عام آدمی ایسے حالات میں ہو تو اس کے چہرے پر سکون اور مسرت کی چمک واضح طور پر دکھائی دے گی۔ گویا کہ وہ زبان حال سے کہہ رہا ہو: میں اس وقت ایک آسمانی محل میں ہوں۔ میرا معاملہ وہ ہے جس کو شاعر نے ان لفظوں میں نظم کیا تھا:

فرحت وراحت وعشرت ہمہ فرماں بہ دار

مگر عین اس کے درمیان اللہ کا ایک بندہ سراپا اضطراب بنا ہوا ہے۔ اس کے سینہ میں بے چینی کا طوفان برپا ہے۔ کوئی راحت اس کے لئے راحت نہیں، سکون کی کوئی چیز اس کے لئے سکون بخش نہیں۔

اس انتہائی فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عام لوگوں کی نگاہ جہاز کے سامان پر ہے، اور اس بندۂ خدا کی نگاہ جہاز کی غیر محفوظیت (vulnerability) پر۔ کیوں کہ جہاز کے اندر خواہ عیش وعشرت کا کتنا ہی زیادہ سامان جمع کر دیا جائے، یہ حقیقت اپنی جگہ باقی رہتی ہے کہ وہ آخری حد تک غیر محفوظ ہے۔ کوئی بھی اتفاقی حادثہ حتی کہ فضا میں اڑتے ہوئے ایک گدھ کا اس سے ٹکرا جانا بھی پورے جہاز کی کامل تباہی کے لئے کافی ہے۔

یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانے پر خود موجودہ زمین کے اوپر انسان کا ہے۔ ہر آدمی یہاں اپنے لئے ایک کامیاب زندگی بنانے میں مصروف ہے۔ اگر جائز طریقے سے اس کے حوصلے پورے نہ ہو رہے ہوں تو وہ ناجائز طریقوں سے اپنے مقاصد کو سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ کسی کو بھی اس حقیقت کی خبر نہیں کہ اس کے راحت کدہ سمیت پورا کرۂ ارض ہر آن ایک بھونچال کی زد میں ہے۔

نو گھنٹہ کی پرواز میں ۶۸۱۰ کیلو میٹر کا فاصلہ طے کرکے ہمارا جہاز فرینکفرٹ پہنچا۔ یہ ہمارے سفر کی پہلی منزل تھی۔ ہندستانی وقت کے لحاظ سے اس وقت ۱۱ فروری کے ساڑھے سات بجے کا وقت تھا، یہاں باہر کا ٹمپریچر چار ڈگری سلسیس تھا۔ ہر طرف بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور بارش کا پانی جگہ جگہ دکھائی دے رہا تھا۔ جہاز کا پورا عملہ یہاں اتر گیا۔ اور دوسرا عملہ اس کی جگہ آگیا۔

فرینکفرٹ جرمنی کا صنعتی شہر ہے۔ فرینکفرٹ کی سڑکوں پر چلتے ہوئے ایک عظیم اور خوبصورت شہر کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ یہ جرمنی کی ترقی کی ایک علامت ہے۔ مگر اس ترقی کے پیچھے بہت سی ناخوشگوار باتیں چھپی ہوئی ہیں۔ انھیں میں سے ایک بے روزگاری ہے۔ ۸ فروری ۱۹۹۴ کو حکومت جرمنی کی طرف سے جو اعداد وشمار بتائے گئے ہیں ان کے مطابق اس وقت جرمنی میں بے روزگاروں کی تعداد چالیس لاکھ سے زیادہ ہے۔

انسانی صنعت کی ترقی اپنے ساتھ بہت سی ناپسندیدہ چیزیں لاتی ہے۔ مثلاً فضائی آلودگی،

بے روزگاری، وغیرہ۔ مگر اسی دنیا میں بہت بڑے پیمانے پر خدائی صنعت قائم ہے اور وہ کسی قسم کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتی۔ آدمی اس حقیقت پر غور کرے تو بے اختیار وہ پکار اٹھے گا: فتبارک اللّٰہ اَحسَنُ الخالقین۔

۱۱ فروری کی شام کو جہاز ابھی فرینکفرٹ میں کھڑا ہوا تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا تو ہر طرف اندھیرا دکھائی دیا۔ میں نے سمجھا کہ سورج ڈوب چکا ہے۔ چنانچہ میں نے وضو کرکے مغرب کی نماز پڑھ لی۔ اس کے چند منٹ بعد جہاز اڑکر اوپر فضا میں پہنچا تو اچانک نظر آیا کہ سورج آسمان میں چمک رہا ہے۔ یہ معاملہ گہرے بادلوں کی وجہ سے پیش آیا۔ چنانچہ ہمارے نیچے بھورے رنگ کے بادلوں کی گہری تہہ جمی ہوئی تھی۔ اوپر دن کا سماں تھا اور نیچے رات کا سماں۔ انسان کا مشاہدہ اکثر حالات میں کتنا زیادہ ناقص ہوتا ہے۔

فرینکفرٹ میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ قیام کے بعد آگے کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ نسبتاً مختصر سفر تھا۔ جلد ہی ہمارا جہاز پیرس کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ یہاں میں ایئر انڈیا کے جہاز سے اتر کر باہر آگیا۔ کیوں کہ یہاں سے مجھے دوسرا جہاز لینا تھا۔

فرینکفرٹ سے پیرس کا سفر ۵۷۵ کیلومیٹر کا تھا جو ایک گھنٹہ میں طے ہوا۔ ایئر انڈیا والوں نے دہلی سے میسیج بھیج دیا تھا۔ چنانچہ میں جہاز سے باہر نکلا تو جہاز کے دروازہ پر ہی ایک فرانسیسی خاتون مجھے گائڈ کرنے کے لئے موجود تھیں۔ ان کے ساتھ کاؤنٹر پر آیا۔ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی ہوئی لیڈی نے پوچھا، کیا آپ کے پاس فرانس کا ویزا ہے۔ میں نے کہا ہاں۔ اس کے بعد میں نے پاسپورٹ نکال کر دکھانا چاہا تو اس نے فوراً کہا کہ بس، آپ کا کہہ دینا کافی ہے۔ یہ غیر ملک کا حال ہے۔ مگر یہی اعتماد خود اپنے ملک میں ہم کو حاصل نہیں۔ نئے ایئر پورٹ پر، ہمیشہ کئی مراحل طے کرنے ہوتے ہیں۔ مگر ان لوگوں نے ہر کام بالکل مشین کی طرح انجام دیا۔ مجھے خود کچھ نہیں کرنا پڑا۔

میں نے سوچا کہ مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں جو اخلاقیات ہیں، اس کا راز کیا ہے۔ میری سمجھ میں آیا کہ یہ "مشین" کی روایات کا نتیجہ ہے۔ پچھلی صدیوں میں ان قوموں میں مشینی سائنس کا عمل بہت بڑے پیمانہ پر ہوا۔ اس کے دوران یہاں حقیقت پسندی اور واقعیت کی مشینی روایات قائم ہوگئیں جو اب تک چلی جارہی ہیں۔ صنعتی ملکوں کی اخلاقیات دراصل مشینی کارکردگی

کاانسانی اڈیشن ہیں۔ یہی اخلاقی ماحول خود ہندستان میں ۱۹۴۷ سے پہلے تھا۔ وہاں یہ اخلاق مذہبی عمل سے بننے والی روایات کے دوران قائم ہوا تھا۔ آزادی کے بھونچال میں ہمارے یہاں یہ روایات ٹوٹ گئیں۔ اس کے بعد کوئی نیا عمل جاری نہیں ہوا، جو روایت سازی کا کام کرنے والا ہو۔ چنانچہ پورا برصغیر ہند اعلیٰ روایات سے محروم ایک خطہ بن کر رہ گیا۔

پیرس ایئر پورٹ پر ضروری کارروائی مکمل کرنے کے بعد مجھے ہلٹن ہوٹل جانا تھا جہاں ایئر انڈیا نے میرے لئے ایک کمرہ رزرو کرادیا تھا۔ ۱۱ فروری کی شام کو مذکورہ فرانسیسی لیڈی نے کاؤنٹر کی کارروائی کے بعد مجھے ایک اور خاتون کے حوالے کیا اور کہا یہ آپ کو ایئر پورٹ سے باہر لے جاکر ٹیکسی کا انتظام کریں گی۔ یہ خاتون ایئر پورٹ کی عام خواتین سے کافی مختلف تھیں۔ انھوں نے بہت زیادہ ہمدردی کے ساتھ بقیہ مراحل طے کرائے۔ آخر وقت میں میں نے ان کا نام پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ سبینہ۔ میرا خیال ہے وہ کوئی مسلم خاتون تھیں۔ اگرچہ ان کے مذہب کے بارہ میں دریافت نہ کرسکا۔

ٹیکسی والا مجھ کو لے کر شہر کی طرف روانہ ہوا۔ سڑکیں نہایت عمدہ اور معیاری تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف کے شہری مناظر نہایت گرینڈ اسکیل پر نظر آئے۔ میرا ذہن اس کا تقابل دہلی سے کر رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ پیرس کے مقابلہ میں دہلی کی شہری حیثیت ایسی ہی ہے جیسے خود دہلی کے مقابلے میں ہندستان کے کسی چھوٹے شہر کی۔

دہلی میں مجھے بتایا گیا تھا کہ ہلٹن ہوٹل ایئر پورٹ سے بہت قریب ہے۔ مگر کافی دیر ہوگئی اور ہوٹل ابھی تک نہیں آیا۔ ٹیکسی ڈرائیور مسلسل اپنی گاڑی دوڑائے چلا جارہا تھا۔ میں نے اس سے انگریزی میں کہا کہ ہلٹن ہوٹل تو ایئر پورٹ سے بہت قریب ہے، تم مجھ کو اتنی دور کہاں لے جارہے ہو۔ وہ فرنچ میں جواب دینے لگا اور بالکل وہی کیفیت پیدا ہوگئی کہ زبان یارمن ترکی ومن ترکی نمی دانم۔ میں نے بار بار کہا کہ انگلش۔ مگر وہ انگلش کے صرف کچھ الفاظ جانتا تھا۔ اس نے کہا: ہلٹن ... اورلی ... تھری زیرو ... نو پرابلم ... مسلم ... احمدو ... سینگال۔ میں نے اس کے الفاظ کو جوڑ کر سمجھا کہ وہ کہہ رہا ہے ـــــ ہلٹن ہوٹل اورلی میں ہے۔ وہ یہاں سے ۳۰ میل دور ہے۔ میں وہیں جارہا ہوں، کوئی فکر نہ کریں۔ میں مسلمان ہوں۔ میرا نام احمدو ہے۔ میں سینگال سے آیا ہوں۔

آخر کار گاڑی ہلٹن ہوٹل کے سامنے رکی۔ رسپشن نے ضروری کارروائی کی۔ انھوں نے ہی ایئر انڈیا کی طرف سے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا۔ اس کے بعد ہوٹل کے ایک آدمی نے مجھے کمرہ نمبر ۲۲۷ میں پہنچا دیا۔ رات کے کھانے کے لئے یہاں کے مطعم میں گیا۔ طرح طرح کے کھانے تھے مگر سب فرانسیسی انداز کے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کھاؤں۔ مشکل سے تھوڑا سا کھایا اور کمرہ میں واپس آگیا۔

۱۱ فروری کو عشاء کی نماز ہلٹن ہوٹل کے کمرہ میں پڑھی۔ ہوٹل کا میگزین ہلٹن گیسٹ دیکھتے ہوئے اس کے ایک صفحہ پر نظر پڑی۔ اس میں عالمی بینکنگ کے ایک ادارہ کا اشتہار تھا۔ پہاڑی کے پس منظر میں بنی ہوئی ایک وسیع بلڈنگ کی تصویر تھی۔ بتایا گیا تھا کہ ہمارے دفاتر ہر جگہ اور ہر شہر میں موجود ہیں۔ اس کے نیچے جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا ــــ آپ جہاں بھی ہوں آپ ہم سے زیادہ دور نہیں ہیں:

Wherever you are, you are never far from Credit Suisse.

میں نے سوچا کہ یہ الفاظ زیادہ صحیح طور پر آخرت کے معاملہ پر چسپاں ہوتے ہیں۔ انسان جہاں بھی ہو، وہ ہر لمحہ آخرت کی دنیا میں کھڑا ہوا ہے۔ کسی بھی لمحہ دروازہ کھلے گا اور وہ اچانک اس کے اندر داخل ہو جائے گا۔

فرانس اور انگلینڈ کے درمیان انگلش چینل حائل ہے۔ دونوں کو ملانے کے لئے اس سمندری حصہ کے نیچے لمبی سرنگ (tunnel) بنائی جارہی ہے۔ ابتداءً اس کا کام ۱۸۸۰ میں شروع ہوا۔ مگر اس کے بعد یہ کام رک گیا۔ دوبارہ یہ کام ۱۹۸۵ میں شروع ہوا۔ یہ کام انگلینڈ اور فرانس کی حکومتوں کے تعاون سے انجام دیا جارہا ہے۔ اس کا نام یورپی سرنگ (Eurotunnel) ہے۔ اندازہ ہے کہ اس کی تکمیل میں ۵ سال لگ جائیں گے۔ اس کے بعد ایک کار صرف ۳۵ منٹ میں فرانس سے انگلینڈ پہنچ جائے گی جبکہ سمندری کشتیوں کے ذریعہ اِدھر سے اُدھر پہنچنے میں تقریباً ۱۵۰ منٹ لگتے ہیں۔ زیر تعمیر سرنگ تقریباً دو ہزار میٹر لمبی ہوگی۔ وہ جدید ترین ٹکنیک کے ذریعہ تیار کی جارہی ہے۔

مغربی ملکوں میں مسلسل نئی ریسرچ ہوتی رہتی ہے۔ جاپان میں یہ مشینی طریقہ رائج ہو چکا ہے کہ ایک آدمی اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو استعمال کئے بغیر آواز کو پہچاننے والے مخصوص کمپیوٹر (voice-recognising computer) کے سامنے اپنا خط ڈکٹیٹ کرتا ہے اور وہ اپنے آپ اس کو ٹائپ کرتا چلا جاتا ہے۔ اب ایسے ٹیلیفون بنانے کی کوشش کی جارہی ہے جس میں ریسیور کو ہاتھ میں

لے کر اس کے سامنے بولنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ آپ بس اپنے ٹیلی فون سے بول کر کہیں گے کہ مجھے فلاں سے بات کرنا ہے۔ وہ اپنے آپ اس کا نمبر معلوم کر کے اس کو ڈائل کرے گا اور پھر صرف بول کر آپ کی اس سے گفت گو شروع ہو جائے گی۔ گویا کار چلاتے ہوئے آپ کو اس کی ضرورت نہ ہو گی کہ آپ وھیل سے اپنا ہاتھ ہٹا کر اپنا موبائل ٹیلیفون ڈائل کریں۔

کویت کے عربی ماہنامہ الوعی الاسلامی (رمضان ۱۴۱۴ھ، فروری ۱۹۹۴ء) میں ایک عربی مقیم پیرس کا مضمون (رمضان فی فرنسا) چھپا تھا۔ اس میں وہ بتاتے ہیں کہ فرانس کے مسلمان طرح طرح کے باہمی اختلافات میں مبتلا ہیں۔ مثلاً فرانس میں دو بڑی مسلم تنظیمیں ہیں، اتحاد المنظمات الاسلامیہ اور المعہد الاسلامی لمسجد باریس۔ رویت ہلال کے بارہ میں دونوں کے اعلانات اکثر مختلف ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعض اوقات یہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ ایک ہی مسجد میں کچھ لوگ روزہ دار ہیں اور کچھ لوگ بے روزہ (وتری احیاناً فی المسجد الواحد قوماً صائمین وآخرین مفطرین) اس صورت حال نے اغیار کی نظر میں اسلام کو مذاق بنا دیا ہے۔

فرانس میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً پانچ ملین ہے۔ ان مسلمانوں کے کرنے کا اصل کام یہ تھا کہ وہ دین رحمت کے داعی بنتے مگر نام نہاد انقلابی لیڈر انھیں اسلامی جہاد کے نام پر تشدد کے راستہ پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ مکہ کے ہفت روزہ اخبار العالم الاسلامی (۲۴ جنوری ۱۹۹۴) کے انگریزی صفحہ پر ایک رپورٹ فرانس کے بارہ میں ہے، اس میں یہ الفاظ درج ہیں:

Some fanatic and fundamentalist Muslims are harming Islam more than the Christians.

پچھلے دنوں یہ خبر تمام دنیا کے مسلم اخباروں میں چھپی تھی کہ فرانس کے ایک شہر (Namuta) کے اسکول (Xavier Bichat High School) میں مراکو کی دو لڑکیوں فوزیہ (۱۱ سال) فاطمہ (۱۳ سال) کو نکال دیا گیا۔ ان لڑکیوں کو اسکول کی طرف سے ستمبر ۱۹۹۳ میں یہ نوٹس دی گئی تھی کہ وہ سر پر اسکارف باندھ کر اسکول نہ آئیں۔ مگر ان لڑکیوں نے اپنے باپ کی ہدایت پر اس سے انکار کر دیا۔ یہ معاملہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ ۵ نومبر ۱۹۹۳ کو ان لڑکیوں کو اسکول سے خارج کر دیا گیا۔

جس طرح اسکارف کے معاملہ میں مسلمانوں کا نقطۂ نظر مغرب کے خلاف ہے، اسی طرح ٹی وی

کے معاملہ میں مسلمانوں کا نقطہ نظر شدید طور پر مغربی تہذیب کے خلاف ہے۔ میں نے یورپ اور امریکہ کے سفروں میں دیکھا کہ اکثر مسلمان باپ ٹی وی کو اپنے بچوں کے لئے سخت مضر سمجھتے ہیں۔ ایک باپ نے کہا کہ ٹی وی ہمارے بچوں کے لئے ایک شیطانی معلم ہے۔ اس کے باوجود تمام مسلمان باپ اپنے گھروں کو خوبصورت ٹی وی سٹ سے سجائے ہوئے ہیں۔

اس فرق کا سبب کیا ہے۔ کیوں وہ اسکارف کے معاملہ میں شدید ہیں اور ٹی وی کے معاملہ میں شدید نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی غیر مسلم اسکول میں جب ایک مسلمان لڑکی کو اسکارف پہننے سے روکا جائے تو یہ مسلمانوں کے لئے اہانت کا کیس بن جاتا ہے۔ اور خود مسلمان اپنے گھروں میں اسکارف کی مخالف تہذیب کا نمائندہ (ٹی وی) کو لاکر رکھیں، یا خود اپنی لڑکیوں کو اسکارف کے بغیر بازار میں گھومنے کی اجازت دیں تو وہ اہانت کا معاملہ نہیں بنتا۔

یہی صورت ہندستان میں بابری مسجد کے معاملے میں پیش آئی۔ اکثر مسلم ملکوں میں سیکڑوں کی تعداد میں مسجدیں ڈھائی گئی ہیں اور مسجد کی جگہ سڑک یا اور کوئی چیز بنا دی گئی ہے۔ مگر ان کے اوپر نہ ہمارے علماء نے کوئی بیان دیا۔ نہ انھوں نے ان مسلم ملکوں کا بائیکاٹ کیا اور نہ ان واقعات پر کوئی ایجی ٹیشن چلایا گیا۔ مگر بابری مسجد کا مسئلہ چوں کہ غیروں نے پیدا کیا اس لئے وہ مسلمانوں کے لئے اہانت کا کیس بن گیا اور تمام مسلمان اس پر بھڑک اٹھے۔

قومی اہانت کے واقعہ پر بھڑکنا اور اسلام کے تقاضوں کے مجروح ہونے پر نہ بھڑکنا، یہ خدا پرستی نہیں ہے بلکہ قوم پرستی ہے۔ اور قوم پرستی کا مذہب خدا کے یہاں مقبول نہیں خواہ اس کے اوپر اسلام کا لیبل لگا دیا گیا ہو۔

علمی اعتبار سے آج فرانس اور مسلم دنیا میں کوئی نسبت نہیں۔ آج دنیا بھر کے مسلمان فرانس صرف اس لئے جاتے ہیں کہ وہاں کمائیں یا اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ مگر آٹھ سو سال پہلے صورت حال اس سے بالکل مختلف تھی۔

اسٹینن لی لین پول (Lane-Poole) نے اس زمانہ کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فرانس، جرمنی، انگلینڈ اور یورپ کے ہر حصہ سے طلبہ اسپین جاتے تھے تاکہ علم کے اس سرچشمہ سے سیراب ہو سکیں جو اس وقت صرف مسلم شہروں میں بہہ رہا تھا:

Students flocked from France, Germany, England and every part of Europe to drink from the fountain of learning which flowed only in the city of Moors. (The Moors in Spain)

فرانس کے شہر نموتہ (Namuta) میں ایک اسکول ہے جس کا نام ہے زیویر بشات اسکول (Xavier Bichat High School) یہاں ۵ انومبر ۱۹۹۳ کو یہ واقعہ ہوا کہ مراکو کی دو لڑکیاں فوزیہ (۱۱ سال) اور فاطمہ (۱۳ سال) اسکول سے خارج کر دی گئیں۔ وہ سر پر اسکارف باندھ کر آتی تھیں۔ اسکول کے ذمہ داروں نے انھیں منع کیا، کیوں کہ یہ ان کے اسکول کے آداب کے خلاف تھا۔ لڑکیوں نے اپنے باپ میمون عقیل کی ہدایت پر یہ حکم ماننے سے انکار کیا۔ اس کے بعد انھیں اسکول سے خارج کر دیا گیا۔

تمام دنیا کے مسلم اخباروں میں اس پر احتجاجی رپورٹیں شائع ہوئیں۔ اس کو یورپ کی اسلام دشمنی پر محمول کیا گیا۔ کہا گیا کہ یورپ مسلمانوں سے صلیبی جنگوں کا بدلہ لینا چاہتا ہے اور اسکارف کی مخالفت اس انتقامی عمل کا آغاز ہے۔ رباط کے ایک عربی ہفت روزہ الرایۃ (۴ رمضان ۱۴۱۴ھ، ۱۵ فروری ۱۹۹۴ء) میں میں نے استاذ ابراہیم الغشبانی کا ایک مضمون اس کی بابت پڑھا۔ اس کا عنوان تھا: اوربا تخوض حربا ضد وجود الاسلام۔ یعنی یورپ نے اسلام کے وجود کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ لڑکیوں کے والد میمون عقیل نے کہا کہ ہم اسلامی لباس کیوں کر چھوڑ سکتے ہیں۔ حالاں کہ یہ بہت بڑا گناہ ہے اور جو اس پر عمل نہیں کرے گا خدا اس کو سخت عذاب دے گا۔

(العالم الاسلامی، مکہ، ۱۵ جنوری ۱۹۹۴)

ایک طرف فرانس بلکہ سارے یورپ کے خلاف یہ غوغا ہے۔ دوسری طرف مراکو میں دو ہفتہ تک رہا۔ وہاں میں نے اسکول اور کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ اور طالبات کو دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ ہر جگہ مراکشی لڑکیاں عام طور پر کھلے سر کے ساتھ گھوم رہی ہیں۔ فرانس میں لڑکیوں کا سر کھلا ہونا اسلام کے لئے خطرہ تھا مگر اپنے وطن میں سر کھولنے کے باوجود اسلام پوری طرح محفوظ تھا۔

فرانس کا اقتدار ایک عرصہ تک افریقہ میں رہا ہے۔ مثلاً مالی میں ۷۵ سال تک فرانس کا اقتدار قائم تھا۔ سعودی عرب میں مالی کے سفیر دکتور محمود الزبیر کا ایک انٹرویو ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۹ شعبان ۱۴۱۴ھ) میں چھپا ہے۔ انٹرویو نے پوچھا کہ مالی لمبی مدت تک فرانسیسی

استعمار کے تحت رہا ہے، اس کے اثرات ملک کے عوام پر کیسے تھے۔ سفیر مذکور نے جواب دیا کہ فرانس نے مالی کے مسلمانوں کی دینی شخصیت کو مسخ کرنے کی پوری کوشش کی۔ اس کے لئے انھوں نے اسلامی مدارس کو ختم کرکے فرانسیسی اسکول قائم کئے۔ اس کی وجہ سے مالی کی نسل تعلیم سے محروم ہوگئی۔ کیوں کہ لوگوں نے اپنے بچوں کو ان اسکولوں میں نہیں بھیجا:

فقضوا على التعليم الاسلامى وفتحوا بدلا من المدارس الاسلامية مدارس فرنسية وهذا ما جعل السكان يبقون أولادهم بدون تعليم على ان يلحقوهم بتلك المدارس۔

یہی واقعہ خود ہندستان میں بھی پیش آیا۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی صحیح پالیسی نہیں۔ تعلیم کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ ایک دن کے لئے بھی اس کو روکا نہیں جا سکتا۔ ایسے حالات میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ زمانی تعلیم کے لئے طلبہ کو اسکولوں اور کالجوں میں بھیجا جائے۔ مگر اسی کے ساتھ گھر پر یا شبینہ مدارس کی صورت میں دینی تعلیم کا طاقت ور انتظام کیا جائے۔ ایسے حالات میں مسلمان کے لئے علیحدگی نہیں ہے بلکہ مقابلہ ہے۔ بدقسمتی سے اکثر لوگ مقابلہ کے نام سے صرف مسلح ٹکراؤ کو جانتے ہیں وہ تدبیری جدوجہد کی اہمیت سے واقف نہیں۔

فرانس سے نپولین بوناپارٹ کا نام وابستہ ہے۔ وہ ۱۷۶۹ میں کورسیکا میں پیدا ہوا، اور ۱۸۲۱ میں جزیرہ سینٹ ہیلینا میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ مغرب کی تاریخ میں چند انتہائی نمایاں شخصیتوں میں سے ایک ہے۔ اس نے فرانس کا اقتدار یورپ کے بڑے حصہ پر قائم کر دیا تھا۔ تاہم اس کا آخری انجام یہ ہوا کہ اس کے حریف انگریز نے اس پر قابو پا کر اس کو جنوبی اٹلانٹک کے ایک جزیرہ میں نظر بند کر دیا۔ اور وہیں اس کا انتقال ہوگیا۔

ایک شخص جس نے ۲۰ سال تک واقعات سے بھری ہوئی زندگی گزاری۔ جو اپنی طاقتور فوج کے ساتھ زمین کے پورب اور پچھم، اتر اور دکھن مارچ کرتا رہا۔ وہ آخر کار ایک چھوٹے سے جزیرہ میں تنہائی کی حالت میں مرگیا۔ جزیرہ کی قید کے زمانہ میں اس کو ایک برطانی افسر کے ہمراہ پورے جزیرہ میں چلنے پھرنے کی اجازت تھی۔ مگر ہمراہی کی شرط کو اس نے قبول نہیں کیا۔ چنانچہ زیادہ تر وقت وہ اپنے گھر پر گزارتا رہا۔

قید کے زمانہ میں اس نے انگریزی سیکھنا شروع کیا۔ اس نے اتنی انگریزی سیکھ لی کہ وہ

انگریزی کا اخبار پڑھنے لگا۔ ۵ مئی ۱۸۲۱ کو اس کی حالت زیادہ خراب ہوئی۔ آخر وقت میں وہ کوئی مربوط کلام بولنے کے قابل نہ تھا۔ اس کی زبان سے حسب ذیل الفاظ غیر مربوط طور پر سنے گئے —
میرے خدا ... فرانسیسی قوم ... میرا بیٹا ... فوج کا سردار :

My God... The French nation.. my son... head of the army.

شام کو اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی عمر بمشکل ۵۲ سال تھی۔ اس کے جنازہ میں صرف چند آدمی تھے۔ سینٹ ہیلینا کے ایک گوشہ میں اس کو دفن کر دیا گیا۔ اس کی قبر پر جو کتبہ لگایا گیا، اس پر اس کے نام کے بغیر صرف یہ دو لفظ لکھے ہوئے ہیں: یہاں مدفون ہے (Here lies)

موت کا قانون اسی طرح ہر آدمی کی نفی کر رہا ہے۔ وہ ہر نامور کو بے نام بنا رہا ہے۔ وہ ہر جتھے والے کو بے جتھا کر رہا ہے اور ہر ملک والے کو بے ملک۔ یہ بلاشبہ سب سے بڑا اعلان ہے جو ہزاروں سال سے اس زمین پر کیا جا رہا ہے۔ مگر کوئی نہیں جو اس کو سنے۔ کوئی نہیں جو اپنے مستقبل کو اپنے حال میں دیکھ لے۔

۱۲ فروری کی رات ہوٹل کے کمرہ میں گزری۔ سو کر اٹھا تو حوائج سے فارغ ہو کر وضو کیا۔ پھر دو رکعت نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا تو بے اختیار یہ الفاظ زبان پر آگئے : خدایا، دو رکعت نماز قبول فرمائیے فرانس کی سرزمین پر جہاں بارہ سو سال پہلے اسلام کی بڑھتی ہوئی پیش قدمی روک دی گئی۔

ہوٹل کی طرف سے ہر پندرہ منٹ پر ایک کوچ ایئر پورٹ کی طرف جاتی ہے۔ اس سے روانہ ہو کر اورلی ایئر پورٹ پہنچا۔ یہاں سے ایئر فرانس کی فلائٹ ۸۷۸۸ کے ذریعہ کیسابلانکا کے لئے روانگی ہوئی۔ راستہ میں فلائٹ میگزین ایئر فرانس دیکھا۔ یہ فرانسیسی اور انگریزی دو زبانوں میں تھا۔ ایک مضمون یورپ کے بارہ میں تھا۔ اس میں آغاز کے وقت سے بتایا گیا تھا کہ جب زمین خشکی اور تری میں تقسیم ہوئی، اس وقت یورپ کا جغرافی نقشہ کیا تھا۔ پھر تفصیل سے بتایا گیا تھا کہ نیچر نے یہاں کیا کیا وسائل جمع کئے۔ ان وسائل کی فہرست دیتے ہوئے آخر میں کہا گیا تھا کہ ان کے علاوہ ایک اور چیز بھی جس کو الفاظ میں بتایا نہیں جا سکتا :

...and another substance that language cannot describe.

اس کو پڑھ کر میں نے سوچا کہ یہی معاملہ ہر چیز کا ہے، حتی کہ گھاس اور مکھی جیسی چیزوں کا بھی۔ ہر چیز بے شمار عناصر کا مجموعہ ہے۔ اس میں سے کچھ کو ہم اپنی زبان میں کسی حد تک بتاتے ہیں۔ مگر اس کے علاوہ ہر چیز میں کچھ اور عناصر ہیں جن کو انسانی زبان میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون (۱۲-۱۳ فروری ۱۹۹۴) کا پیرس اڈیشن دیکھا۔ امریکہ نے اقوام متحدہ کے فیصلہ کے تحت بوسنیا کی جنگ کو روکنے کے لئے فوجی اقدام کیا ہے۔ آج کے اخبار میں کئی خبریں اور تصویریں اس کے بارہ میں تھیں۔ ایک رپورٹ میں اس علاقہ کے لوگوں کے تاثرات نقل کئے گئے تھے۔ بوسنیا کے ایک ۵۸ سالہ مسلمان (Ferid Hodzic) نے کہا کہ پچھلے دو دن سے میں محسوس کر رہا ہوں جیسے کہ جنگ ختم ہوگئی اور سراجیوو میں امن واپس آرہا ہے:

The last two days, I have been feeling like the war is over and peace is returning to Sarajevo.

خدا کرے کہ بوسنیا ہرزے گووینا میں جنگ کی تباہ کاری ختم ہو جائے اور وہاں دوبارہ امن کا دور آجائے۔

پیرس سے کیسا بلانکا جاتے ہوئے میری سیٹ کے قریب ایک تندرست فرانسیسی بچہ تھا۔ اس کو دیکھ کر میں نے کہا کہ ایسا انسان بھلا ارتقا کے بے شعور طبیعی قانون کے ذریعہ کیسے بن سکتا ہے۔ ارتقاء تو ایک مفروضہ اندھا قانون ہے۔ مگر انسان ایک زندہ اور ذہین وجود ہے۔ سارے انسان مل کر بھی گھاس کی ایک پتی کی تخلیق نہیں کر سکتے۔ پھر اگر ایک معلوم وجود تخلیق کی قدرت نہیں رکھتا تو ایک نامعلوم وجود اتنے عظیم اور اتنے بامعنی عالم کو کس طرح پیدا کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ارتقاء کا نظریہ بے معنی الفاظ کے مجموعہ کے سوا اور کچھ نہیں۔

پیرس سے کیسا بلانکا کا سفر ڈھائی گھنٹہ کا تھا۔ اس دوران جہاز نے ۲۹ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کیا۔ میں کل ایشیا سے روانہ ہوا تھا۔ پھر میں یورپ پہنچا۔ اور اب میں افریقہ کی زمین پر پہنچ کر یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ مجموعی مدت پرواز کے لحاظ سے اس سفر میں ساڑھے بارہ گھنٹے صرف ہوئے۔

کیسا بلانکا میں وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیہ کے نمائندہ کے طور پر ایک صاحب موجود تھے۔ ایئرپورٹ سے ان کے ساتھ رباط کے لئے روانہ ہوا۔ تقریباً ایک سو کلو میٹر کا راستہ شروع سے

لے کر آخر تک نہایت شاندار ہے۔ عمدہ سڑک کے دونوں طرف سرسبز ماحول دور تک پھیلا ہوا تھا۔

مراکو کے اوپر سے سیاسی اقتدار اگرچہ ختم ہوگیا۔ مگر فرانس کا اقتصادی غلبہ مراکو کے اوپر بدستور باقی ہے۔ اس کا اندازہ مجھے مراکو میں داخل ہونے سے پہلے اس وقت ہوا جب کہ جہاز کے اندر ایمبارکیشن / ڈس ایمبارکیشن فارم پر کرنے کے لئے دیا گیا۔ اس فارم کے نیچے لکھا ہوا تھا کہ فرانس میں چھپا ہوا (Printed in France) قدیم زمانہ میں کسی ملک سے سیاسی اقتدار ختم ہونے کے بعد ناممکن ہوجاتا تھا کہ اس کو دوبارہ قائم رکھا جاسکے۔ مگر آج صنعتی ترقی کے بعد ایسا کرنا عین ممکن ہوگیا ہے۔

رباط میں میرا قیام ہوٹل (Hyatt Regency) کے کمرہ نمبر ۳۰۷ میں تھا۔ یہاں میں نے ۱۳ فروری کو رمضان ۱۴۱۴ھ کا پہلا روزہ رکھا۔ ایک عرب نوجوان سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ روزہ کا مقصد انسان کو یہ بتانا ہے کہ دنیا میں جو چیزیں ہیں ان سب کا مالک خدا ہے ، انسان کسی بھی چیز کا مالک نہیں۔ خدا نے اپنی اس حیثیت کو بتانے کے لئے کھانے پینے کو بطور علامت اختیار کیا۔ روزہ کا مقصد آدمی کے اندر یہ نفسیات پیدا کرنا ہے کہ خدایا ، تو ہی ہر چیز کا مالک ہے۔ جب تونے روکا تو میں رک گیا ، اور جب تونے اجازت دی تو میں نے ان کو استعمال کیا۔

کیسابلانکا (عربی : الدار البیضاء) مراکو کا قدیم شہر ہے۔ اس کا یہ نام پرتگالیوں اور اسپینیوں نے رکھا تھا۔ بارھویں صدی عیسوی میں وہ صرف ایک گاؤں تھا۔ آج وہ قاہرہ ، اسکندریہ ، بغداد کے بعد عرب دنیا کا چوتھا سب سے بڑا شہر ہے۔ ۱۹۱۲ سے ۱۹۵٦ تک وہ فرانس کی ماتحتی میں رہا۔ فرانسیسی زبان اور فرانسیسی تہذیب کی چھاپ یہاں بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔

رباط اٹلانٹک کے کنارے ایک قدیم شہر ہے۔ وہ مراکو کی راجدھانی ہے۔ اسپین سے جب مسلمان نکالے گئے تو ان کی بڑی تعداد اسی علاقہ میں آکر آباد ہوئی۔ ۱۹۵٦ میں وہ فرانس کے سیاسی قبضہ سے آزاد ہوا۔ ۱۹۱۲ میں جب مراکو پر فرانس کا سیاسی قبضہ ہوا تو مولانا شبلی نعمانی نے ایک نظم میں کہا تھا :

مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے   کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

مسلم ملکوں پر مغرب کے استعمار کو مسلم رہنماؤں نے صرف اس کے تاریک رخ سے دیکھا۔ حالاں کہ اس میں ایک روشن پہلو بھی موجود تھا۔ اسی کے نتیجہ میں لاکھوں مسلمان مسلم ملکوں سے نکل کر مغربی ملکوں میں

آباد ہو گئے۔ آج یورپ میں مسلمانوں کی جو تعداد پائی جاتی ہے اور وہاں اسلام کو زندہ کئے ہوئے ہے وہ زیادہ تر وہی ہے جو نو آبادیاتی دور میں وہاں جاکر آباد ہوئی تھی۔

۱۳ فروری کو ہوٹل سے نکلا کہ کسی مسجد میں ظہر کی نماز ادا کروں۔ ڈرائیور السید محمد البدوائی جو ایک گاڑی کے ساتھ مستقل میرے لئے مخصوص کئے گئے تھے، انھوں نے بہت چاہا کہ میں گاڑی پر چلوں۔ مگر میں نے عذر کر دیا اور ایک عرب نوجوان کے ساتھ پیدل چل کر مسجد حنصالی (جامع الحنصالی) پہنچا۔ وہاں جماعت تیار تھی۔ مجھے مسجد کا ماحول طبعی طور پر بہت پسند ہے۔ چنانچہ نماز سے فراغت کے بعد میں مسجد میں بیٹھ گیا۔ میں خاموش دیر تک بیٹھا رہا، یہاں تک کہ تمام نمازی مسجد سے چلے گئے۔ آخر میں مسجد کے موذن صاحب میرے پاس آئے اور کہا: نريد ان نسدّ ابواب المسجد، بارك الله فيكم (ہم مسجد کے دروازے بند کرنا چاہتے ہیں، اللہ آپ پر برکت نازل فرمائے) چنانچہ میں فوراً اٹھ کر مسجد کے باہر آگیا۔

یہی اکثر عرب ملکوں کا حال ہے۔ وہاں نماز کے بعد مسجد کے دروازہ پر تالا لگا دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اگلی نماز کے وقت یہ تالا کھلتا ہے۔ صرف اس لئے کہ دوبارہ نماز کے بعد اسے بند کر دیا جائے۔ ان ملکوں میں ایسا حکومت کے احکام کے تحت کیا جاتا ہے۔ اگر ہندستان کی حکومت یہاں کی مسجدوں کے بارہ میں ایسا حکم جاری کر دے تو فوراً اس کو مداخلت فی الدین قرار دیکر اس کے خلاف احتجاجی مہم شروع کر دی جائیگی۔ ممکن ہے کہ کچھ مقدس لوگ اپنے حجروں سے نکل کر اس کے خلاف دھرنا دینے کے لئے دہلی پہنچ جائیں۔ مگر یہی مقدس حضرات عرب ملکوں میں نہایت اطمینان کے ساتھ اس کو برداشت کئے ہوئے ہیں۔ ہمارے نااہل رہنماؤں کی یہی دو عملی موجودہ مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

مسجد کے راستہ میں مغرب کے ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا نام عبدالمجید الکامل بتایا۔ ان سے میں نے کہا کہ میں یہاں دروس حسنیہ میں شرکت کے لئے آیا ہوں۔ انھوں نے کہا: المكتبة الاسلامية مليئة بالكتب ولكن الاعمال مفقودة. نقرء ولا نعمل، نخطط ولا نطبق (اسلامی کتب خانہ کتابوں سے بھرا ہوا ہے۔ مگر اعمال غائب ہیں۔ ہم پڑھتے ہیں مگر ہم عمل نہیں کرتے، ہم نقشہ بناتے ہیں مگر ان کو نافذ نہیں کرتے)

اکثر کہا جاتا ہے کہ یہ کہنے والے صرف کہتے ہیں اس لئے سننے والے لوگ بھی صرف سن کر رہ جاتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ خدا کے پیغمبروں نے تو کامل اخلاص کے ساتھ دعوت دی۔ اس کے باوجود ان کے معاصرین ان کی بات ماننے پر راضی نہیں ہوئے۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ صورت داعی کے غیر مخلص ہونے کی بنا پر نہیں ہے بلکہ مخاطبین کی عدم قبولیت کی بنا پر ہے۔ موجودہ زمانہ میں مادی چیزوں کی طرف رغبت اتنی زیادہ بڑھ چکی ہے کہ لوگوں کو مادی چیزوں کے سوا کسی اور چیز سے کوئی دلچسپی نہیں۔

مسجد سے واپس ہو کر ہوٹل پہنچا تو یہاں دکتور محمد الکبیر علوی میرا انتظار کر رہے تھے۔ وہ وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیۃ میں مدیر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بہت عرصہ ہوا میں نے آپ کی کتاب الاسلام یتحدی پڑھی تھی۔ اس کے بعد کوئی اور کتاب مجھ کو نہیں ملی۔ وہ میرے ساتھ میرے کمرہ میں آئے تو یہاں میں نے ان کو الاسلام یتحدی سمیت کئی اور عربی کتابیں دیں۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے تجویز کیا کہ ان کتابوں کا ایک سٹ جلالۃ الملک اور وزیر اوقاف کو ضرور دیں۔ وہ بہت خوش ہوں گے۔

ایک بار میں رباط جدید کے علاقہ میں نکلا۔ یہاں مکانوں کے سامنے نارنگی (برتقال) کے بڑے بڑے درخت تھے، وہ لال رنگ کی نارنگیوں سے لدے ہوئے تھے۔ میرے ایک عرب ساتھی نے بتایا کہ یہ لوگ ان درختوں کو اپنے گھر کے سامنے صرف خوبصورتی کے لئے لگاتے ہیں، وہ ان کے پھلوں کو استعمال نہیں کرتے، نہ کوئی اور ان کو توڑتا۔

یہ میرے لئے بڑے تعجب کی بات تھی۔ دہلی میں اگر کوئی اپنے گھر کے سامنے اس طرح پھل دار درخت لگائے تو ایک بھی پھل درخت پر باقی نہیں رہے گا، خواہ وہ نئی دہلی میں ہو یا پرانی دہلی میں۔

مراکش (مراکو) ایک سیاحتی ملک ہے۔ اس بنا پر یہاں مغربی آزادی کے آثار کافی دکھائی دیتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ یہاں کے لوگوں میں دینی تعلق بھی بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک مراکشی عالم کا قصہ قابل ذکر ہے جو اس طرح بیان کیا جاتا ہے:

جدہ میں شیخ محمد نصیف کے گھر پر ایک مراکشی عالم ایک بے داڑھی والے مصری سے الجھ گئے۔ مصری عالم سے انھوں نے پوچھا کہ آپ کہاں سے ہیں۔ مصری عالم نے جواب دیا: من احسن

دولۃ فی العالم (دنیا کے سب سے اچھے ملک سے) مراکشی عالم نے دوبارہ پوچھا کہ سعودیہ کے کس شہر سے۔ مصری عالم نے جواب دیا : من احسن دولۃ فی العالم وھی مصر ومن احسن مدینۃ فی العالم وھی القاھرۃ (دنیا کے سب سے اچھے ملک مصر سے اور دنیا کے سب سے اچھے شہر قاہرہ سے) مراکشی عالم اس جواب پر غصہ ہو گئے اور کہا کہ تمہارے ملک کے بارہ میں اللہ نے فرمایا ہے سأوریکم دار الفاسقین۔ میں بہت جلد تم کو فاسقوں کا گھر دکھاؤں گا ، یعنی مصر۔ مصری عالم غصہ میں آکر کھڑے ہو گئے اور مراکشی عالم کی داڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے حمار کہہ کر چپ ہو گئے۔ (البلاغ بمبئی، جنوری ۱۹۹۴ صفحہ ۲۵)

اس واقعہ میں مصری عالم کی غلطی اگر بے جا فخر ہے تو مراکشی عالم کی غلطی یہ ہے کہ ایک واقعہ جو اعراض کے حکم کے تحت آتا تھا اس کو انھوں نے نہی عن المنکر کے حکم سے متعلق سمجھ لیا۔

۱۳ فروری کو مصر وغیرہ کے کچھ نوجوان یہاں میری آمد کی خبر سن کر آگئے۔ آج کا بیشتر وقت ان سے گفتگو میں گزرا۔ مختلف مقامات پر آجکل کچھ مسلم جماعتیں "مسلح انقلاب" کی کوشش کر رہی ہیں۔ وہ قائم شدہ حکومتوں سے مسلح ٹکراؤ چھیڑے ہوئے ہیں۔ ان کے بارہ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ یہ سب اسلام کے نام پر غیر اسلام ہے۔ کیوں کہ اسلام میں قائم شدہ حکومت کے خلاف خروج کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ (شرح نوو وی ۱۲/۲۲۹)

اس کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ کسی قائم شدہ حکومتی نظام کو توڑنا محض کسی شخص یا گروہ کی کوشش سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ہمیشہ تاریخ کی مساعدت درکار ہوتی ہے۔ اگر تاریخی تبدیلیاں مساعدت کے لئے موجود نہ ہوں تو ایسی ہر تحریک فساد اور خوں ریزی پر منتج ہوتی ہے اہل اسلام کو چاہئے کہ وہ اپنے عمل کو صرف پر امن دعوتی جد و جہد تک محدود رکھیں۔ یہاں تک کہ وہ ضروری تاریخی امکانات پیدا ہو جائیں جن کو استعمال کر کے سیاسی انقلاب کے مرحلہ تک پہنچنا ممکن ہو جائے۔

رباط پہنچنے کے بعد کل شام کو میں نے اپنے دہلی کے دفتر کو ایک فیکس روانہ کیا تھا۔ آج وہاں سے اس کا جواب آگیا۔ اس کو دیکھ کر میری زبان سے شکر کا کلمہ نکلا۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کیسے کیسے وسائل دے دئے ہیں۔ یہ سن کر ایک عرب نوجوان نے

کہاکہ آپ ان چیزوں پر شکر ادا کر رہے ہیں، حالاں کہ میں نے ایک بڑے شیخ کو ان ذرائع کی مذمت کرتے ہوئے سنا۔ انھوں نے کہاکہ موجودہ زمانہ میں ان ذرائع مواصلات کے ذریعہ شیطانی باتیں ہر جگہ تیزی سے پہنچائی جا رہی ہیں۔ یہ جدید آلات سب شیطان کے کام ہیں اور ہمیں ان سے جنگ کرنا چاہئے:

الکلمات الشیطانیۃ فی ھٰذہ الایام تُرسَل عن طریق الاتصالات الحدیثۃ (ومنھا الفاکس) الیٰ کل مکان بسرعۃ، فھٰذہ الاجھزۃ المنظورۃ کلھا عمل شیطانی یجب علینا محاربتھا۔

میں نے کہاکہ شیخ نے بڑی عجیب بات کہی۔ یہ جدید ذرائع تو امکانات فطرت کا استعمال ہیں۔ جو چیز بری ہے وہ استعمال ہے نہ کہ خود ذرائع۔ اور برا استعمال تو لوگ مذہب تک کا کرتے ہیں۔ اس لئے ہمیں برے استعمال کی مذمت کرنا چاہئے نہ کہ خود ان اشیاء کی۔

رباط میں لیبیا کے ایک صاحب (شیخ صالح) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ لیبیا میں ۱۹۶۷ میں جب انقلاب آیا تو اس کے لیڈر سوشلسٹ افکار سے متاثر تھے۔ انھوں نے ملک میں جو تبدیلیاں کیں ان میں سے ایک یہ تھا کہ انھوں نے اعلان کیا کہ گھر اس کا ہے جو گھر میں رہے۔ ہر طرف دیواروں پر لکھ دیا گیا: البیت لساکنہ۔ مگر لیبیا میں بہت ہی کم ایسے افراد تھے جنھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ بیشتر لوگوں نے اس قانون کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ کرایہ دار بدستور کرایہ دیتے رہے۔ مکانوں کی خرید و فروخت پہلے ہی کی طرح جاری رہی۔

تھوڑے سے افراد جنھوں نے اس حکومتی اعلان کا فائدہ اٹھایا وہ معاشرہ میں سخت معیوب نظروں سے دیکھے جانے لگے۔ ان کو اپنی جائداد کے لئے خریدار یا کرایہ دار ملنا سخت مشکل ہوگیا۔ شیخ صالح نے بتایا کہ میں نے خود اپنے لئے ایک مکان خریدا ہے۔ مجھے مذکورہ قسم کا مغصوبہ مکان کم قیمت پر مل رہا تھا۔ مگر میں نے اس کو نہیں لیا۔ اس کے بجائے جائز ملکیت والا مکان اپنے لئے خریدا۔

یہ نہایت عجیب ہے۔ ہندستان میں، ہم نے دیکھا ہے کہ آزادی کے بعد خاتمہ زمینداری کا قانون منظور کیا گیا۔ اور حکومت نے اعلان کیا کہ "جو جوتے اس کا کھیت" اس کا نتیجہ ہوا کہ تمام کسان اپنے زیر

استعمال کھیتوں پر قبضہ کر کے بیٹھ گئے۔ زمینوں کے مالک اچانک بے زمین ہو کر رہ گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ لیبیا کی قوم کو اگر صحیح اور دانش مند قائد ملا ہوتا تو آج وہ مسلم دنیا کی سب سے زیادہ ممتاز قوم ہوتی۔ ان کے پاس ذرائع و وسائل وافر مقدار میں موجود تھے۔ وہ بہترین جائے وقوع کا مالک تھا۔ مگر سوشلسٹ قائدین نے لیبیا کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

۱۴ فروری کو میرا دوسرا روزہ تھا۔ سحری کے لئے کل میں نے دودھ اور کھجور لیا تھا۔ آج بھی میں نے صرف دودھ اور کھجور منگوایا۔ اکثر لوگ سحری کے وقت خوب زیادہ کھاتے ہیں۔ مگر یہ طریقہ درست نہیں۔ اس سے روزہ کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ لوگوں کی توجہ صرف اس پر ہوتی ہے کہ دن کے وقت بھوک نہ لگے۔ حالاں کہ روزہ رکھ کر آدمی کو بھوک لگنا چاہئے تاکہ اس پر روحانی تجربات گزریں اور اس کے اندر توجہ الی اللہ کی کیفیت پیدا ہو۔

کل اچھی دھوپ تھی۔ چنانچہ میں ہوٹل سے نکل کر سامنے کے پارک میں دیر تک ٹہلتا رہا۔ آج بادل چھائے ہوئے ہیں اور ہلکی بارش بھی ہوئی ہے۔ اگر میں بادلوں کی جمی ہوئی تہہ کے اوپر چلا جاؤں تو آج بھی سورج بدستور چمک رہا ہوگا۔ مگر بادلوں کے نیچے سورج کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کا مشاہدہ صرف اضافی ہے، کوئی انسانی مشاہدہ حقیقی مشاہدہ نہیں۔

۱۴ فروری کی دوپہر کو وزارۃ الاوقاف والشئون الاسلامیہ کے وزیر عبد الکبیر العلوی المدغری سے اجتماعی ملاقات ہوئی۔ مختلف ملکوں سے آئے ہوئے علماء ان کے دفتر میں لے جائے گئے جو القصر الملکی کے وسیع احاطہ میں واقع ہے۔ ان کا لباس اور ان کی گفتگو ہر چیز میں تواضع نظر آئی۔ انھوں نے الدروس الحسنیہ الرمضانیہ کے بارہ میں بتایا کہ وہ المغرب میں اور دوسرے عرب ملکوں میں ساتھ ساتھ ٹی وی پر دکھایا جاتا ہے۔ ملک حسن الثانی خود اس میں شروع سے آخر تک موجود رہتے ہیں اور وہ صرف ملک نہیں ہیں بلکہ ایک اچھے عالم بھی ہیں۔

آنے والوں میں سے ایک جرمنی کے نومسلم بھی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا پچھلا نام (Thomas Haacke) تھا۔ ۱۹۷۵ میں انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ موجودہ نام حسن ہاکے ہے۔ ان کی عمر ۳۱ سال ہے۔ برلن میں مولانا صدر الدین لاہوری نے ۱۹۲۴ میں ایک سہ ماہی جرمن رسالہ نکالا

تھا۔ اس کا نام (Moslemische Revue) ہے۔ اس کا تازہ شمارہ انھوں نے مجھ کو دکھایا۔ وہ اس کے اڈیٹوریل بورڈ میں بھی ہیں۔ جرمنی میں ترکی وغیرہ کے مسلمانوں سے ان کا ملنا جلنا ہوتا تھا۔ اس کے دوران وہ اسلام سے متاثر ہوئے اور اسلام میں داخل ہوگئے۔ وہ ایک کمپیوٹر فیکٹری میں کام کرتے ہیں۔

جب میں نے بتایا کہ میں انڈیا سے آیا ہوں تو انھوں نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ ہندوؤں نے ایک قدیم مسجد کو ڈھا دیا۔ اب وہاں کیا حال ہے۔ انڈیا میں باہر کے لوگ صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ وہاں بابری مسجد ڈھائی گئی ہے۔ اس کے سوا یہاں بے شمار تعمیری واقعات بھی ہیں مگر لوگوں کو اس کی خبر نہیں۔

۱۵ فروری کو بادل ہٹ گئے اور دوبارہ آسمان صاف ہوگیا۔ یہاں کا موسم اہل یورپ کے لئے بہت پسندیدہ موسم ہے۔ چنانچہ یورپی سیاح کثرت سے مراکو آتے ہیں۔ یہاں کی آمدنی کا قابل لحاظ حصہ سیاحت انڈسٹری کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے آزادی کے بعد بھی یہاں کے کلچر پر یورپی سیاحوں کا بہت زیادہ اثر ہے۔ بلکہ یہاں کے کلچر کو اگر سیاح کلچر کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔

ایک ' حادثہ ' پیش آیا۔ میں اپنے کمرہ سے باہر نکلا۔ کنجی اندر تھی۔ دروازہ اپنے آپ بند ہوگیا۔ اب میں دروازہ کو کھول نہیں سکتا تھا۔ اس کے بعد میں ریسپشن کے ڈسک پر گیا۔ ان کو اپنے مسئلہ کی بابت بتایا۔ ان کا ایک آدمی فوراً ایک خاص کنجی لے کر آیا۔ یہ ماسٹر کی تھی جس سے ہوٹل کے تمام تالے کھولے جاسکتے ہیں۔ اس نے ماسٹر کی کے ذریعہ فوراً تالا کھول دیا۔ اب میں کمرہ کے اندر تھا۔

میں نے سوچا کہ یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانے پر زندگی کا بھی ہے۔ زندگی میں ایک قسم کی کنجیاں وہ ہیں جن سے صرف ایک مسئلہ حل کیا جاسکتا ہے۔ ایک کنجی صرف ایک تالے کو کھولتی ہے۔ دوسری کنجی ماسٹر کنجی ہے۔ اس کنجی کے استعمال سے تمام تالے کھولے جاسکتے ہیں۔ یہ ماسٹر کی اہل اسلام کے لئے دعوت ہے۔ اہل اسلام کے لئے بلاشبہ دعوت الی اللہ وہ ماسٹر کی ہے جس کو استعمال کیا جائے تو وہ تنہا تمام بند تالوں کو کھولنے کے لئے کافی ہے۔ تاہم دعوت کی ماسٹر کی کو استعمال کرنے کی لازمی شرط مدعو کی زیادتیوں پر صبر ہے۔ مسلمان اگر صبر کی قیمت ادا نہ کریں تو وہ دعوت کی ماسٹر کی

کو بھی استعمال نہیں کر سکیں گے۔

میرے سائق (السید محمد البدوائی) تعلیم یافتہ اور نہایت مہذب ہیں۔ وہ بار بار کہتے تھے کہ میں ہر وقت یہاں آپ کے لئے سیارہ لے کر موجود رہتا ہوں۔ مگر آپ اس کو استعمال نہیں کرتے۔ آج ان کے اصرار پر ہوٹل سے نکلا اور شہر رباط دیکھنے کے لئے گیا۔ شہر نہایت خوبصورت نظر آیا۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ بے شمار گاڑیوں کے باوجود پلیوشن بہت کم تھا۔

انھوں نے مختلف چیزیں دکھائیں۔ مثلاً تقلیدی صنعت کے مراکز، وزارتی دفاتر، القصر الملکی وغیرہ۔ ہر جگہ بورڈ عربی اور فرنچ میں مشترک طور پر نظر آیا۔ پورے شہر میں صرف ایک فقیر دکھائی دیا۔ سمندر کے ساحل سے گزرتے ہوئے ایک مقام پر روشنی کا مینار (light house) بنا ہوا تھا۔ اس کو دیکھ کر قدیم دور کی جہازرانی کا منظر سامنے آگیا۔

یہاں کے قدیم متحف کو دیکھا۔ اس میں قدیم بادشاہوں نیز عام انسانوں کے آثار تھے۔ ایک جگہ شیشہ کے کیس کے اندر ایک قدیم انسان کا ڈھانچہ رکھا ہوا تھا جو کسی مقام پر ملا ہے۔ وہ ٹوٹی پھوٹی ہڈیوں کی صورت میں تھا۔ میں اس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ میں نے سوچا کہ ایک روز آئے گا جبکہ میرا جسم بھی اسی طرح ہڈیوں کا ایک وحشت خیز ڈھانچہ بن چکا ہوگا۔ پھر وہ مجھ کو ''ضریح محمد حسن ثانی'' دکھانے کے لئے لے گئے۔ یہاں غیر معمولی اہتمام کیا گیا تھا۔ خاص قبر مکمل طور پر سفید سنگ مرمر کی ہے۔ دیواروں پر سونے کے کام ہیں۔ چاروں طرف غیر معمولی اہتمام ہے۔

تاج محل کو دیکھ کر کسی یورپین خاتون نے کہا تھا کہ اگر میری قبر پر اس قسم کا تاج محل بنایا جائے تو میں ابھی مرنے کے لئے تیار ہوں۔ اسی طرح بادشاہوں کے عظیم الشان مقبروں کو دیکھ کر بہت سے لوگ حرص کرتے ہیں کہ کاش ہمارا بھی ایسا ہی شاندار مقبرہ ہوتا۔ مگر میرا حال یہ ہے کہ میں مٹی کی قبر اور سنگ مرمر کے تاج محل میں کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ اصل اہمیت مرنے کے بعد والے اخروی انجام کی ہے نہ کہ مرنے کے بعد دنیا میں بننے والے ڈھانچہ کی۔

ہوٹل یہاں کے اہم ترین علاقہ میں واقع ہے۔ اس کے چاروں طرف بہت بڑے بڑے پارک ہیں۔ میں ایک پارک میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے اندر سے ایک سڑک گزرتی ہے۔ چنانچہ گھوڑوں کا ایک دستہ گزرا۔ تمام گھوڑے نہایت تندرست تھے۔ اور نہایت شان کے ساتھ چل رہے

تھے۔ ان کو دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ قدیم زمانہ میں ہزاروں سال تک تاریخ کا سفر گھوڑوں ہی پر ہوا ہے۔ گھوڑوں نے تاریخ انسانی کو ابتدائی حرکت دی ہے۔ میں گھوڑے کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ مشینی سواریوں کے ظہور میں آنے سے پہلے خدا نے زندہ سواری کے لئے انسان کو گھوڑا دے دیا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ عظیم احسان ہے۔ اس کے بغیر انسانی تاریخ کا سفر ہی شاید رک جاتا۔

آج ایک واقعہ گزرا۔ اس کے بعد میری سمجھ میں آیا کہ غماً بغم لکیلا تأسوا علیٰ ما فاتکم ولا تفرحوا بما اٰتاکم کا مطلب یہ ہے کہ غم پر غم ڈال کر آزمائش کی گئی کہ کیا تمہارے اندر یہ صفت پائی جاتی ہے کہ فوت ہونے پر تمہارے اندر یاس نہ پیدا ہوا ور یافت پر تمہارے اندر فرحت نہ پیدا ہو۔

۱۶ فروری کو یہاں کے ریڈیو کے نمائندہ عبد الرحیم برقیہ آئے اور الاسلام یتحدی کے مباحث پر انٹرویو لیا۔ ان کے چار خاص سوال تھے۔

۱۔ نیچرل لا کی بنیاد پر جدید ملحدین کا جو استدلال ہے اس کو آپ کیوں بے بنیاد سمجھتے ہیں۔ کیا یہ ملحدانہ استدلال اب بھی کوئی علمی اہمیت رکھتا ہے۔

۲۔ لاشعور کے نظریہ کے تحت کہا جاتا ہے کہ دینی عقائد محض ذہنی اختلال کا نتیجہ ہیں، اس دعویٰ کا علمی رد آپ کے نزدیک کیا ہے۔

۳۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ آفات جن کے مقابلہ میں انسان بے بس ہے، ان کو دیکھ کر انسان کے اندر جو خوف کی نفسیات پیدا ہوئی، اس نے خدا کا عقیدہ پیدا کیا۔

۴۔ آپ نے لکھا ہے کہ اس بحث میں سب سے اہم مسئلہ طریق استدلال کا مسئلہ ہے۔ آپ کیوں سمجھتے ہیں کہ استدلال کا طریقہ اب پوری طرح دین کے حق میں ہے۔

ان سوالات کے جوابات میں نے اپنی ہندستانی عربی میں دئے۔ تاہم اس کو انھوں نے سمجھا اور خوش ہوئے۔ اگر ممکن ہوا تو ان شاء اللہ ان جوابات کو مزید مفصل کرکے الرسالہ میں سوال وجواب کی صورت میں چھاپ دیا جائے گا۔

۱۶ فروری کو الدروس الحسنیہ کا آغاز ہوا۔ مختلف ملکوں سے آئے ہوئے شرکا راجتماعی طور پر

القصر الملکی میں لے جائے گئے۔ وہاں فرداً فرداً ہر ایک سے الملک الحسن الثانی نے ملاقات کی۔ میں نے ملاقات کے وقت اپنی عربی کتابوں کا سٹ انھیں پیش کیا۔ میں اپنے ساتھ دہلی سے کوئی کتاب نہیں لایا تھا۔ یہ سب تیونس سے آنے والے ایک نوجوان نے مجھے دیا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لئے رباط آئے تھے۔ اور اپنے ساتھ یہ کتابیں بھی لے آئے۔

۱۶ فروری (۵ رمضان ۱۴۱۴ھ) کا درس الاستاذ عبد الکبیر العلوی المدغری (وزیر الاوقاف والشئون الاسلامیہ) نے دیا۔ موضوع علم الناسخ والمنسوخ تھا۔ انھوں نے کہا کہ علماء نے پانچ سو سے بھی زیادہ منسوخات بتائے ہیں۔ اس کو مانا جائے تو قرآن کا معظم حصہ منسوخ قرار پاتا ہے۔ یہ ناقابل فہم ہے۔ مفسرین عام طور پر قتال کی آیت کو صبر واعراض اور عفو وصفح کی آیتوں کے لئے ناسخ مانتے ہیں۔ حالاں کہ صبر واعراض اور عفو وصفح دین کی اہم ترین تعلیمات ہیں۔ نسخ کے معاملہ میں یہی نقطہ نظر صحیح ہے۔ چنانچہ الزرکشی نے البرھان فی علوم القرآن میں نسخ کی بابت لکھا ہے کہ ھو تبدیل الحکم لِتَبدُّلِ المصلحۃ العملیۃ۔ یعنی نسخ حقیقۃً عملی مصالح کے بدلنے کی بنا پر (وقتی طور پر) حکم میں تبدیلی کا نام ہے۔

ہوٹل کے نیچے ہال میں آنے والے کئی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے پاس کی نشست پر زیادہ عمر کے ایک شیخ تھے جو لبنان سے آئے تھے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہند سے۔ انھوں نے پوچھا کہ ہند میں مسلمانوں کا حال کیسا ہے (کیف احوال المسلمین فی الھند) میں نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ انھوں نے دوبارہ کہا: مصائب، مش مصیبۃ واحدۃ۔ یعنی ہندستان کے مسلمان کسی ایک مصیبت میں نہیں بلکہ بہت سی مصیبتوں میں مبتلا ہیں۔ ہندستان کے بارہ میں زرد صحافت اور زرد قیادت کے پروپگنڈے کے نتیجہ میں لوگوں کو یہ بات تو معلوم ہے کہ بابری مسجد کو ہندوؤں نے ڈھادیا۔ مگر یہ بات انھیں سرے سے معلوم نہیں کہ خود نا اہل مسلم رہنماؤں نے نہایت غلط سیاست چلا کر اس معاملہ کو بگاڑا۔ اسی طرح لوگوں کو یہ بات بھی معلوم نہیں کہ ہندستانی مسلمانوں کے خود ساختہ نمائندہ بن کر جو لوگ مسلمانوں کی تباہی کا چرچا کر رہے ہیں وہ خود اسی ہندستان میں اپنے پورے خاندان سمیت نہایت شاندار زندگی گزار رہے ہیں۔ باریش رہنما بھی اور بے ریش رہنما بھی۔

یہاں معلوم ہوا کہ ایک عرب نوجوان روس (ماسکو) میں فضائی دفاع کے موضوع پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ وہ الرسالہ مشن سے کافی متاثر ہیں۔ انھوں نے طے کیا ہے کہ اس مشن کی تمام انگریزی کتابوں کو روسی زبان میں چھپوائیں۔ ان کی کوشش سے ایک تعلیم یافتہ روسی نے اسلام قبول کرلیا ہے۔ اس روسی نومسلم کی مدد سے وہ اسلامی مرکز کی کتابوں کا روسی زبان میں ترجمہ کروا رہے ہیں۔ اب تک انھوں نے سترہ کتابوں کا روسی ترجمہ تیار کرلیا ہے۔

بنگلہ دیش کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان جو عرب میں رہتے ہیں۔ وہ "انسان اپنے آپ کو پہچان" کا ترجمہ بنگالی زبان میں کرکے چھپوا رہے ہیں۔ یہ کام انھوں نے بنگلہ دیش کے ایک اور مسلمان کے ساتھ مل کر کیا ہے۔ ایک صاحب نے ترجمہ کیا ہے، دوسرے نے طباعت کے سلسلہ میں مالیاتی مدد کی ہے۔

ایک صاحب نے ایک عربی مثل بتائی: اذا اردتَ ان تَنجح کل وَوَکِّلْ۔ اس مثل میں وَکِّلْ کا لفظ فصیح عربی نہیں ہے بلکہ دارجہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم کامیاب ہونا چاہتے ہو تو خود کھاؤ اور دوسروں کو بھی کھلاؤ۔ یعنی لا تأ کل وحدك

۷فروری کو درس کا موضوع تھا: مهمات من قواعد الاسلام۔ آج الاستاذ محمد الحبیب بلخوجۃ نے درس دیا۔ انھوں نے اپنے درس کی بنیاد اس حدیث پر رکھی:

الطهور شطر الایمان والحمد لله تملأ الميزان وسبحان الله والحمد لله تملأ ما بین السماوات والارض والصلاة نور والصدقة برهان والصبر ضياء والقرآن حجة لك او عليك كل الناس يغدو فبائع نفسه فمعتقها او موبقها

یہ حدیث جس کو امام مسلم نے کتاب الطہارت (باب فضل الوضوء) میں نقل کیا ہے، اس میں صبر کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ وہ اہل ایمان کے لئے روشنی ہے۔ گویا کہ صبر ایک انتہائی اعلیٰ درجہ کا مثبت رویہ ہے جو آنکھ کھولنے والا اور راستہ کو صاف کرنے والا ہے۔ ایسی حالت میں یہ بات کتنی زیادہ غلط ہوگی کہ صبر کو ایک سلبی رویہ یا مجبورانہ خاموشی کے ہم معنی سمجھ لیا جائے۔

آج درس سے پہلے وزارۃ الاوقاف کے ہال میں مختلف ملکوں سے آئے ہوئے علماء جمع ہوئے۔ اور کل کے درس پر مناقشہ ہوا۔ سب سے پہلے کل کی تقریر اور مجلس کا پورا ٹیپ وی سی آر پہ دکھایا

گیا تاکہ اصل بحث لوگوں کے ذہن میں تازہ ہو جائے۔ جو واقعہ میں نے کل دیکھا اور سنا تھا، آج ٹھیک اسی طرح اس کو مشینی سطح پر دہرایا جا رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر مجھے قرآن کی آیت وھو یبدئ ویعید یاد آئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ عملی مشاھدہ بن کر آنکھوں کے سامنے آگئی ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ نسخ کی چار قسمیں ہیں: نسخ التلاوۃ والحکم، نسخ التلاوۃ و بقاء الحکم، نسخ الحکم وبقاء التلاوۃ، نسخ الکتاب بالسنۃ ونسخ السنۃ بالکتاب۔ ایک صاحب نے کہا کہ قرآن میں تقریباً ۲۰ نسخ ثابت ہوتے ہیں مگر افسوس ہے کہ علماء نے اس میں وسعت دی اور اس کی تعداد کو پانچ سو تک پہنچا دیا۔ (ان العلماء مع الاسف الشدید، توسعوا فی الناسخ والمنسوخ) کسی نے کہا نسخ صرف فرع میں ہے، اصل میں نہیں۔ اسی لئے نسخ کی آیتیں مدینہ میں اتریں، مکہ میں نسخ کی آیتیں نہیں اتریں۔ ایک صاحب نے کہا کہ قرآن اترنے کے بعد اور رسول اللہ کی وفات کے بعد اب کسی کو حق نہیں کہ وہ کسی حکم کو ناسخ یا منسوخ قرار دے۔ وغیرہ

میں نے کہا کہ نسخ کے معاملہ کو محض کچھ آیتوں یا حدیثوں کا مسئلہ سمجھنا درست نہیں۔ نسخ ایک اصول (مبدأ) ہے نہ کہ محض کچھ آیتوں کی تفسیر کا مسئلہ۔ اگر آپ نسخ کو صرف کچھ آیتوں سے جوڑ دیں تو وہ انھیں آیتوں تک محدود ہو کر رہ جائے گا۔ مگر اس کو اصول شریعت ماننے کی صورت میں وہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ یہ در اصل عملی حالات کی رعایت کا مسئلہ ہے اور اس اعتبار سے وہ ایک حکیمانہ اصول کے طور پر ہمیشہ باقی رہے گا۔ مذکورہ آیتوں کی حیثیت اس معاملہ میں علامتی نمونہ کی ہے۔ یہ آیتیں برائے توضیح ہیں نہ کہ برائے تعیین۔

اس سفر میں حسب معمول میں اپنے ساتھ کوئی کتاب یا الرسالہ کا کوئی شمارہ نہیں لے گیا تھا۔ رباط پہنچا اور وہاں آنے والے علماء سے ملاقاتیں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ اکثر لوگ الاسلام یتحدی کا مطالعہ کئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اکثر لوگوں نے مزید عربی کتابوں کا مطالبہ کیا۔ اتفاق سے ایک نوجوان (سید صالح الشوکات) قاہرہ سے آگئے تھے۔ وہ میری آمد کی خبر سن کر مجھ سے ملنے کے لئے آئے تھے کیوں کہ یہاں کے نظام کے مطابق الدروس الحسنیہ کا پروگرام ہر روز ساتھ ساتھ ٹی وی پر نشر کیا

جاتا ہے جو پوری عرب دنیا میں دیکھا جاتا ہے۔ وہ عربی کتابوں کا ایک بنڈل بھی اپنے ساتھ لائے تھے جو قاہرہ سے چھپی ہیں۔ یہ کتابیں یہاں کے بہت سے لوگوں کو دی گئیں۔ چند نام یہ ہیں: الملك المغربي الحسن الثاني، الاستاذ عبد الكبير العلوي المدغري (وزير الاوقاف والشئون الاسلاميه) محمد الكبير العلوي (مدير وزارة الاوقاف) دكتور ابراهيم السيد الرفاعي (چیرمین ڈپارٹمنٹ آف جیالوجی، کویت یونیورسٹی)، الشيخ طٰه الولي (لبنان) دكتور محمد يعقوبي خبيزه (فاس، المغرب) دكتور عبد الرحيم برقيه (رباط)، عبد السلام اديمي (ٹوکیو) الحاج عبد الله المنشري (موريتانيه)، دكتور محمد السليماني (الجزائر) وغیرہ

۱۸ فروری کو الاستاذ احمد الغازی الحسینی (استاذ کرسی التوحید بجامع القرویین بفاس) کا درس تھا۔ اس کا عنوان تھا: مجامع مکارم الاخلاق۔ اپنے درس کے لئے انھوں نے اس آیت کو منتخب کیا: خذ العفو وأمر بالعرف واعرض عن الجاهلين. واما ينزغنك من الشيطٰن نزغ فاستعذ بالله انه سميع عليم (الاعراف ۲۰۰)

درس زیادہ تر نحوی اور فنی انداز میں تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس آیت میں اہم نکتہ یہ ہے کہ عفو اور اعراض کا حکم دیتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ اگر تمہارے دل میں شیطان کوئی وسوسہ ڈالے تو تم اس کے بارہ میں اللہ سے پناہ مانگو۔ اس سیاق میں شیطانی وسوسہ کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کوئی ایسا فعل کرتا ہے جس کے بارہ میں اللہ نے عفو اور اعراض کا حکم دیا ہے اور اس وقت تمہارے دل میں انتقامی جذبہ آجاتا ہے یا وقار کا سوال تم کو اس سے روکنے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے تو اس قسم کے جذبات و احساسات کو تم شیطانی وسوسہ سمجھو۔ تم کو چاہئے کہ غصہ اور انتقام کے جذبہ کو دباؤ اور وقار کے سوال کو اس طرح کے سلوک میں رکاوٹ نہ بننے دو۔ انسانی زیادتی کو اللہ کے خانہ میں ڈالتے ہوئے ہر حال میں عفو اور اعراض کے مسلک پر قائم رہو۔

۱۸ فروری کو جمعہ کا دن تھا۔ دروس حسنیہ کے شرکاء کار دن پر رباط سے الدار البیضاء لے جائے گئے۔ یہ سو کلومیٹر کا راستہ تھا جو ڈیڑھ گھنٹہ میں طے ہوا۔ میں نے سنا اور پڑھا تھا کہ الدار البیضاء کی مسجد حسن ثانی حرمین کے بعد دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ واقعۃً وہ ایسی ہی نظر آئی۔ بہت بڑی اور بہت خوبصورت انداز میں بنائی گئی ہے۔ سمندر اٹلانٹک کے عین کنارے ہونے کی وجہ سے

اس کی خوبصورتی میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔

نمازیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ صف کے آگے مسلسل جوتوں کی قطار نظر آئی۔ لوگ زور زور سے قرآن پڑھ رہے تھے اس لئے مسجد کے اندر آواز کافی گونج رہی تھی۔ نمازیوں کو قرآن برائے تلاوت تقسیم کیا جارہا تھا۔ مجھ کو بھی ایک مجلد قرآن دیا گیا۔ اس کو کھولا تو اندازہ ہوا کہ اس کے انداز تحریر کی وجہ سے اس کو پڑھنا مشکل ہو رہا ہے۔ آخر میں دیکھا تو "وفقاً للخط العثمانی" لکھا ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ یہاں کے لوگ اس کے عادی ہوں مگر عام مسلمانوں کے لئے اس کے ذریعہ تلاوت کرنا آسان نہیں۔

مغربی لہجہ میں لاؤڈ اسپیکر پر قرآن پڑھا جارہا تھا۔ یہ بھی ہم لوگوں کے لہجہ سے بہت مختلف تھا اس پر غور کرتے ہوئے سمجھ میں آیا کہ لہجوں کا فرق کیوں واقع ہوتا ہے۔ قرآن ابتداءً قریش کے لہجہ پر اترا۔ اس کے بعد وہ پھیلا یہاں تک کہ دور دور کے علاقوں میں پہنچ گیا۔ یہ لوگ اپنے اپنے لہجہ میں اپنی زبان بولتے تھے۔ اب انھوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد جب قرآن پڑھا تو اس کو انھوں نے اپنے لہجہ میں پڑھا۔ ہر ایک اپنے مقامی لہجہ میں قرآن کے عربی الفاظ دہرانے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف مسلم قوموں کا مکتوب قرآن اگرچہ ایک ہے۔ مگر اس کو پڑھنے کے لئے ہر ایک کا لہجہ الگ الگ ہوگیا ہے۔

مسجد الحسن الثانی (الدار البیضاء) کے تعارف کے لئے جو باتصویر کتاب چھاپی گئی ہے، اس کے آغاز میں یہ آیت درج ہے: وکان عرشہ علی الماء (ہود ۷) اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عظیم مسجد پانی کے اوپر بنائی گئی ہے۔ یعنی سمندر (اٹلانٹک) کے ساحل پر ہے اور پانی کو پاٹ کر اور اس کے اوپر ستون قائم کرکے اس کو تعمیر کیا گیا ہے۔ الملک الحسن الثانی، جن کو صوفی بادشاہ کہا جاتا ہے انھوں نے ۸ جولائی ۱۹۸۸ کو مسجد کی تعمیر کا اعلان کرتے ہوئے اس کی مصلحت ان الفاظ میں بیان کی تھی: أردتُ أن أبنی ھٰذا المسجد علی الماء (وکان عرشہ علی الماء) کما اردتُ ان یکون المصلّی فیہ والداعی والذاکر والشاکر والراکع والساجد محمولا علی الارض ولکن اینما نظر یجد سماء ربہ ویحر ربہ۔

۱۸ فروری کو افطار کا انتظام ایک وزیر کی رہائش گاہ پر تھا۔ جس ہوٹل میں ہم لوگوں کا قیام ہے وہ ایک امریکی ہوٹل ہے۔ وہاں کھانے کا انتظام زیادہ تر مغربی انداز کا ہے۔ وزیر صاحب کا معاملہ

اس سے مختلف تھا۔ وہاں وہ انداز تھا جو عرب رؤساء کے یہاں رمضان کی دعوت میں اختیار کیا جاتا ہے۔ پہلے انواع واقسام کی چیزوں کے ساتھ افطار کرایا گیا۔ پھر مغرب کی نماز ہوئی۔ اس کے بعد تمام لوگ ایک بڑے کمرہ میں جمع ہوئے۔ یہاں دیر تک قرآن کی قرأت کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ نماز کا وقت ہوگیا اور عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی گئی۔ اس کے بعد تمام لوگ کھانے کے کمرہ میں آئے۔ جہاں دوبارہ قسم قسم کے کھانوں سے میز بھرا ہوا تھا۔ اس طرح ایک کے بعد ایک کھانے پینے کا دور جاری رہا۔ یہ سلسلہ سوا چھ بجے افطار سے شروع ہوا تھا۔ جب ہم لوگ واپس لوٹے تو گھڑی میں ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔

لوگ خوش ہوکر کھا رہے تھے مگر میں غم سے نڈھال ہو رہا تھا۔ مجھے اس قسم کی دعوتوں سے کوئی رغبت نہیں۔ وہ چیز جس کو پرتکلف دعوت کہا جاتا ہے وہ میرے لئے صرف پرتکلیف دعوت ہے۔ مجھے سادہ اور مختصر کھانا پسند ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں بہت کم لوگ ہیں جو اس قسم کی دعوت کریں، اور اس سے بھی کم وہ لوگ ہیں جو اس قسم کی دعوت کو دل سے پسند کریں۔

ٹوکیو سے جاپان مسلم ایسوسی ایشن کے نمائندہ عبد السلام اریمی آئے تھے۔ وہ ایک نومسلم نوجوان ہیں۔ انھوں نے اپنا قدیم نام جیرو اریمی (Jiro Arimi) بتایا۔ ان سے معلوم ہوا کہ جاپان کے مسلمان انوکھے قسم کے مسائل سے دوچار ہیں جن سے ہم لوگ اپنے ملک میں واقف نہیں۔ مثلاً تدفین کا مسئلہ۔ قبر کی معروف تدفین جاپان میں غیر قانونی ہے۔ تدفین کے لئے لاش کو مخصوص قسم کے تابوت میں بند کرنا ضروری ہے جو بہت مہنگا ہوتا ہے۔ اس کام کو بھی کوئی رجسٹرڈ ادارہ ہی کرسکتا ہے۔ ابھی تک ان کے پاس کوئی باقاعدہ مقبرہ نہیں۔

ہندستان میں مقامی کرنسی کے مقابلہ میں ڈالر کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ مگر جاپان میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ جاپان مسلم اسوسی ایشن کو رابطۃ العالم الاسلامی (مکہ) کی طرف سے مالی تعاون ملتا ہے جو ڈالر کی صورت میں ہوتا ہے۔ مگر اس وقت یہ صورت حال ہے کہ جب وہ اس تعاون کو جاپانی سکہ ین میں تبدیل کرتے ہیں تو وہ بہت کم ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ ین کے مقابلہ میں امریکی ڈالر کی شرح گھٹ گئی ہے۔ انھوں نے کہا: وبما ان الدعم المادی تقدمه رابطة العالم الاسلامی یُرسل بالدولار فانه تأثر کثیراً بارتفاع قیمة الین الیابانی۔ وهٰکذا فهو یفقد

حالیا بعشرۃ آلاف ین یابانی فقط شہریا۔

۱۹ فروری کو الاستاذ طٰہ الولی (لبنان) کا درس تھا۔ موضوع تھا: المسجد ودورہ فی حضارۃ الاسلام وتراث المسلمین۔ انھوں نے اپنے درس کے لئے اس آیت کو بنیاد بنایا: انما یعمر مساجد اللہ من آمن باللہ والیوم الآخر واقام الصلاۃ وآتی الزکوٰۃ ولم یخش الا اللہ فعسیٰ اولئک ان یکونوا من المھتدین (التوبہ)

مسجد کے بارہ میں انھوں نے مختلف تفصیلات بتائیں۔ انھوں نے بتایا کہ گستاولی بان نے لکھا ہے کہ مسجد مسلمانوں کے لئے مرکز حیات کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ بات یقیناً درست ہے۔ مگر اکثر لوگ مرکز حیات کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ مسجد کے اندر ہر قسم کی سرگرمیاں جاری ہوں۔ حتیٰ کہ مسجد کے اندر قید خانہ بھی موجود ہو۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ تمام ظاہری نوعیت کی چیزیں ہیں۔ مسجد اصلاً خشیت الٰہی کی تربیت کا مرکز ہے۔ مسجد سے لوگوں کو سب سے زیادہ جو چیز ملنی چاہئے وہ یہی خشیت اور تقویٰ کی غذا ہے۔

دکتور ابراہیم الرفاعی نہایت سلجھے ہوئے ذہن کے آدمی ہیں۔ انھوں نے مغربی دنیا اور مسلم دنیا کا تقابل کرتے ہوئے کہا کہ مغرب کے لوگوں کی طاقت یہ ہے کہ وہ تنقید کو برداشت کرتے ہیں۔ ان کو ان کی غلطی بتائی جائے تو وہ اس کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ جب کہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ تنقید کو سننے کے لئے تیار نہیں۔ وہ اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتے (ھم یعترفون بخطایاھم ونحن لا نعترف بخطایانا) یہی وجہ ہے کہ ہر قسم کے امکانات کے باوجود مسلم دنیا خائب وخاسر بنی ہوئی ہے۔

رباط سے ایک عربی اخبار العلم (جاری شدہ ۱۹۴۶) نکلتا ہے۔ یہ حزب الاستقلال کا ترجمان ہے۔ اس کا شمارہ ۹ افروری ۱۹۹۴ دیکھا۔ اس کے صفحہ اول پر ایک رپورٹ چھپی ہوئی تھی جس کا عنوان تھا —— مصر: حرب بین السلطۃ والاسلامیین۔ یعنی مصر میں ارباب اقتدار اور اسلام پسندوں کے درمیان جنگ۔ ایک اور خبر میں بتایا گیا تھا کہ حکومت الجزائر نے پاکستان اور ایران پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ الجزائر کے اسلام پسندوں کو مسلح کر رہے ہیں (الجزائر: اتھام باکستان وایران بتسلیح الاسلامیین)

میں سمجھتا ہوں کہ جو مسلمان نفاذ اسلام کے نام پر حکمرانوں سے مسلح جنگ چھیڑے ہوئے ہیں

وہ دور جدید کا سب سے بڑا جرم کر رہے ہیں۔ یہی وہ نادانی ہے جس نے موجودہ زمانہ میں اسلام کی دعوت کا راستہ روک رکھا ہے۔ یہ برائی جس دن ختم ہوگی اسی دن اسلام کی اشاعت کے دروازے کھل جائیں گے۔

۲۰ فروری کو ایک نوجوان ملاقات کے لئے آئے۔ ان کا نام الھیلۃ لی مُصدِّق ہے۔ الھیلہ لی ان کا خاندانی نام ہے جو عام رواج کے خلاف شروع میں لکھا جاتا ہے۔ یہ نوجوان جریدہ الرائے (رباط) کے نمائندہ تھے۔ انھوں نے الرائے کے لئے انٹرویو لیا۔ سوالات زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے دینی اور سیاسی مسائل سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک سوال یہ تھا کہ: ما ھی نصیحتکم الی الشباب المسلم (مسلم نوجوانوں کے لئے آپ کی نصیحت کیا ہے)، میں نے کہا کہ میری نصیحت صرف ایک ہے ــــ وہ سیاست سے دور رہیں اور اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔

الھیلہ لی مصدق نے الاسلام یتحدی اور بعض دوسری عربی کتابیں پڑھی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ مغرب (مراکو) میں خاص طور پر الاسلام یتحدی بہت پھیلی ہے۔ انھوں نے کہا کہ رباط میں ہم مسلم نوجوانوں کو اکٹھا کریں گے، آپ وہاں چل کر انھیں خطاب کریں۔ مگر بعض وجوہ سے میں اس کے لئے وقت نہ نکال سکا۔

مجھے یہ دیکھ کر تعجب تھا کہ مراکو کے بیشتر تعلیم یافتہ حضرات الاسلام یتحدی سے واقف ہیں اور اس کو پڑھے ہوئے ہیں۔ اس کا راز استاذ محمد مقر (وزارۃ الاوقاف) کے ذریعہ معلوم ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ الاسلام یتحدی مراکو کے ثانوی مرحلہ کے نصاب میں عرصہ سے داخل ہے۔ اس بنا پر وہ بہت بڑی تعداد میں یہاں بار بار منگوائی گئی اور کثرت سے پھیلی۔ رباط کے ایک نوجوان الحبشی علال نے کہا: حتی لا یکاد یخلو منہ بیت۔ اس طرح کے احساسات بہت سے لوگوں نے بیان کئے۔

دکتور محمد فتحی عثمان نے کہا کہ امریکہ میں لوگ سمجھتے ہیں کہ اسلام تشدد کا مذہب ہے اور مسیحیت محبت کا مذہب (ان الدین الاسلام دین تشدد و دین المسیحیۃ دین حب)
انھوں نے اس غلطی کی ذمہ داری مسلمانوں پر ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ برداشت سے کام لیں اور جذبات میں آکر ایسی کارروائی نہ کریں جس سے خدا کے دین کی تصویر اغیار کی نظر میں بگڑ جائے۔ انھوں نے ایک تقریر میں واضح طور پر کہا کہ آجکل کے اسلام پسند

(اسلامیین) بدقسمتی سے تشدد کو اسلام کی اقامت کا ذریعہ سمجھ بیٹھے ہیں، اسی کی وجہ سے یہ ساری غلط فہمی پیدا ہوئی ہے۔

یہی بات دکتور ابراہیم الرفاعی نے کہی۔ انھوں نے کہا کہ ضروری ہے کہ ہم دوبارہ نبوی اصول کی طرف واپس لوٹیں (لابد من الرجوع الی القاعدة النبوية)

اخوانی فکر کے ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ سلمان رشدی کے قتل کے فتوے کو غلط سمجھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ میں میری رائے کوئی نئی یا منفرد رائے نہیں ہے۔ ایک رائے بلاشبہ وہ ہے جس کو امام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب الصارم المسلول علی شاتم الرسول میں بیان کیا ہے۔ مگر علماء کے درمیان ایک اور رائے بھی موجود ہے۔ چنانچہ مرتد کے بارہ میں (اور اس پر قیاس کرتے ہوئے شاتم کے بارہ میں بھی) ابراہیم النخعی اور سفیان الثوری کی رائے یہ ہے کہ اس سے ہمیشہ صرف توبہ کا تقاضا کیا جائے گا، اس کو قتل نہیں کیا جائے گا (یستتاب ابداً ولا یقتل)۔

عمر عبد السلام رباط میں عربی اخبار الشرق الاوسط کے نمائندہ ہیں۔ انھوں نے ۱۹ فروری کو انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے حالات اور معاملات سے تھا۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ ہندستانی مسلمان جن مسائل سے دوچار ہیں عام طور پر اس کی ذمہ داری ہندستان کے غیر مسلم فرقہ پر ڈالی جاتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کے مسائل کے واحد ذمہ دار خود مسلمانوں کے نااہل لیڈر ہیں۔ یہ نام نہاد لیڈر اس عربی مثل کے مصداق ثابت ہوئے ہیں:

اذا كان الغراب رئيس قوم   سيهديهم الى دار البوار

افغانستان کے بارہ میں سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ جنگجوئی افغانیوں کی قومی صفت ہے۔ کبھی ان کے اس مزاج کا مظاہرہ اغیار کے خلاف ہوتا ہے اور کبھی خود اپنوں کے خلاف:

واحيانا على بكر اخينا   اذا ما لم نجد الا اخانا

۲۰ فروری کی شام کو شہر کے ایک ہوٹل نزل المارشی میں تعلیم یافتہ عرب نوجوانوں کا ایک اجتماع تھا۔ اس میں شرکت کی۔ ڈھائی گھنٹہ تک ان کے سامنے دین کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی۔

اس اجتماع سے واپسی میں رات کے گیارہ بجے کا وقت ہوگیا۔ جب میں مقام اجتماع سے نکل کر باہر آیا تو سڑک پر مردوں اور عورتوں کی زبردست بھیڑ نظر آئی۔ میں نے پوچھا کہ آدھی رات کو آخر اتنے زیادہ لوگ کیوں چل رہے ہیں اور یہ کہاں جارہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ رمضان میں یہی عرب ملکوں کا دستور ہے۔ رمضان کی رات کا زیادہ حصہ وہ بازاریں خرید وفروخت میں گزارتے ہیں۔ پرانی دہلی کے مسلم محلوں میں بھی اسی قسم کی بھیڑ ہوتی ہے۔ مگر وہ رمضان کے آخری عشرہ میں ہوتی ہے۔ عرب ملکوں میں یہ بھیڑ رمضان کے پورے مہینہ میں جاری رہتی ہے۔

ایک مجلس میں ایک عالم نے یہ مشہور مقولہ دہرایا: ان للہ عبادا اذا ارادوا اراد۔ میں نے کہا کہ یہ بندے وہ ہیں جو اپنے آپ کو اتنا زیادہ مٹاتے ہیں کہ وہ ذاتی خواہش سے بلند ہوجاتے ہیں حتی کہ وہ خود بھی وہی چاہنے لگتے ہیں جو خدا چاہتا ہے۔ اور جب ان کی روحانی ترقی کا یہ درجہ آجائے تو اس کے بعد وہی واقعہ رونما ہوتا ہے جس کا اوپر کے مقولہ میں ذکر ہے۔ تاہم یہ ایک ایسا لطیف معاملہ ہے جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

۲۱ فروری کی صبح کو عرب نوجوانوں کا ایک اجتماع ہوا۔ اس میں دور جدید میں اسلام کے احیاء کے مسائل پر گفت گو ہوئی۔ ان میں سے ایک عرب ڈاکٹر بھی تھے۔ انھوں نے کہا کہ میرے بھائی روسی زبان جانتے ہیں اور وہ ماسکو میں رہتے ہیں۔ انھوں نے ایک روسی ادیب کی مدد سے الرسالہ مشن کی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے۔ انسان اپنے آپ کو پہچان (انگریزی) کا ترجمہ روسی زبان میں وہ چھپوا چکے ہیں۔ اسی طرح تمام کتابوں کو چھپوانا چاہتے ہیں۔

دوپہر کو وزارۃ الاوقاف کے ہال میں مناقشہ ہوا۔ یہ مناقشہ مجامع مکارم الاخلاق والے مقالہ پر تھا۔ ڈاکٹر ابراہیم الرفاعی نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں اسلام پسندوں نے تشدد کے ذریعہ اسلامی انقلاب لانے کی جو مہم شروع کر رکھی ہے اس سے رجوع کرنا ضروری ہے۔ اس کے بجائے اسلامی تحریک کو دعوت کے اصول پر چلانا چاہئے۔ اس رجوع کے بغیر اسلام کی تاریخ کو آگے نہیں بڑھایا جاسکتا۔

شام کو ۹ بجے ملک محمد الخامس کی ضریح پر "الحفل الدینی" منعقد کیا گیا۔ یہاں اعیان سلطنت اور اور شرکاء درس بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ ملک محمد حسن الثانی بھی اس میں موجود تھے۔ پہلے

قرآن کی تلاوت ہوئی۔ پھر عربی نعت پڑھی گئی۔ اس کے بعد دعا پر مجلس برخاست ہوئی۔

ایک گفتگو کے ذیل میں میں نے کچھ عرب حضرات سے کہا کہ عمر ابوریشہ کی ایک مشہور نظم ہے۔ اس میں وہ جذباتی انداز میں کہتے ہیں کہ اے میری قوم کیا دنیا کی قوموں کے درمیان تلوار یا قلم میں تیرا کوئی مقام ہے:

أُمّتی هَـلْ لكِ بَـیْنَ الاُمَــمِ　　مِنـبرٌ للسیفِ اَو لِلقَــلَمِ

میں نے کہا کہ یہ شعر موجودہ زمانہ کے مسلم دانشوروں کی ترجمانی کر رہا ہے۔ وہ مسلمانوں کو صرف ان کی قومی تاریخ کے اعتبار سے دیکھتے ہیں۔ قومی تاریخ کے اعتبار سے مسلمان بلند نظر آئیں تو وہ بلند ہیں اور قومی تاریخ کے اعتبار سے وہ پست نظر آئیں تو وہ پست ہیں۔ یہ مسلم دانشور شعوری طور پر اس سے بے خبر ہو گئے ہیں کہ مسلمانوں کے پاس ان کی قومی تاریخ کے علاوہ ایک اور چیز ہے، اور وہ دین اسلام ہے۔ تاریخ پستی اور بلندی کا شکار ہوتی ہے، مگر دین اسلام جو خدا کا محفوظ دین ہے، وہ اپنی نظریاتی صداقت کے اعتبار سے ہمیشہ بلند رہتا ہے، اس کے لئے پستی کا کوئی سوال نہیں۔

۲۲ فروری کی صبح کو کئی عرب نوجوان میرے کمرہ میں آگئے۔ ان سے کئی گھنٹہ تک دینی اور علمی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ آخرت میں تین قسم کے لوگ ہوں گے۔ ایک وہ جن کا بدن اور جن کی روح دونوں دنیا میں پاک رہی۔ وہ سیدھے جنت میں داخل کر دئے جائیں گے۔ دوسرے وہ جن کی روح گندی نہیں ہوئی تاہم ان کا جسم بعض اوقات گناہوں سے آلودہ ہوا۔ ایسے لوگوں پر خدا اپنی رحمت کا پانی بہا دے گا۔ وہ پاک وصاف ہو کر جنت میں بسائے جانے کے قابل ہو جائیں گے۔ تیسرے وہ لوگ جن کا جسم بھی گندا تھا اور جن کی روح بھی گندی تھی۔ یہ لوگ قابل تزکیہ نہیں ہوں گے۔ وہ جنت میں داخلہ کے لئے نااہل قرار دیدئے جائیں گے۔

آج دوپہر کو وزارۃ الاوقاف کے ہال میں مناقشہ کی مجلس ہوئی۔ یہ مناقشہ المسجد ودورها فی الاسلام والے محاضرہ پر تھا۔ اسٹیج پر بولتے ہوئے ایک صاحب نے آیت پڑھی۔ اس کو انھوں نے اس طرح کہا: فلا تقربوا بعد عامهم هٰذا فوراً ہی حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا تقربوا نہیں یقربوا۔ اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے خدا نے اپنی کتاب کی حفاظت کے لئے

یہ غیر معمولی انتظام کیا ہے کہ ہر جگہ ایسے لوگ کھڑے ہوئے ہیں جو ایک لفظ کی غلطی کو بھی پکڑ لیں اور فوراً اس کی تصحیح کر دیں۔

سنیگال کے ایک صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ آجکل المساجد قبل الساجد کے اصول پر عمل کر رہے ہیں۔ اس کے بجائے ہم کو الساجد قبل المساجد کے اصول پر عمل کرنا چاہئے۔ یعنی پہلے عبادت کی روح لوگوں کے اندر پیدا کرنا چاہئے، اس کے بعد مسجدیں اپنے آپ بن جائیں گی۔

انڈونیشیا کے الاستاذ مسلم نے کہا کہ ادخالُ غیر المسلمین فی المسجد حرام۔ انھوں نے کہا کہ فقہاء اس معاملہ میں اس آیت سے استدلال کرتے ہیں: انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامہم ھٰذا۔ مگر اس آیت سے یہ مسئلہ نہیں نکلتا۔ اس آیت میں "مشرکین" سے مراد ساری دنیا کی مشرک کمیونٹی نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ مشرکین ہیں جن پر خدا کے پیغمبرؐ نے اتمام حجت کی حد تک دعوت پہنچائی۔ اس کے باوجود انھوں نے حق کو نہیں مانا یہاں تک کہ سنت اللہ کے مطابق ان کے استیصال کا فیصلہ کیا گیا۔

ایک صاحب نے ایک عربی مقولہ سنایا: معرفۃ الرجال کنز (آدمیوں کو پہچاننا ایک خزانہ ہے)

رباط کے عربی ہفت روزہ الرائے کے مراسل الھیلہ لی مصدق نے بوسنیا کے صدر علی عزت بیغوفتش کی کتاب کا عربی ترجمہ البیان الاسلامی دیا۔ اس تقریب سے ان سے جہاد اسلامی کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ آجکل مسلمان جگہ جگہ لڑ رہے ہیں اور اس کو جہاد کا نام دیتے ہیں۔ مگر جہاد کی ایک لازمی شرط ہے، اس شرط کے بغیر جو حربی اقدام کیا جائے وہ شرعی اعتبار سے جہاد نہیں ہوگا۔ وہ شرط قرآن کی اس آیت میں ہے: واعدوا لہم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد سے پہلے اعداد (تیاری) ضروری ہے۔ اس کا معیار ہے ـــــ اعداد الی حد الارھاب۔ میں نے کہا کہ موجودہ مجاہدین نے کیا ارہاب کی حد تک تیاری کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ جب شرط ہی پوری نہ کی گئی ہو تو وہ جہاد کیسے ہو جائے گا۔ کیا وضو کی شرط پوری کئے بغیر

کوئی نماز شرعی نماز ہوسکتی ہے۔

دکتور حسن محمد الفاتح قریب اللہ سوڈان کی جامعہ ام درمان میں استاد ہیں۔ انھوں نے گفتگو کے دوران کہا کہ آپ تو لیبیا میں رہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں، میں تو دہلی میں رہتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ مجھ سے ایک شخص نے کہا کہ آپ لیبیا میں رہتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں کتنی غیر ذمہ داری لوگوں کے اندر آگئی ہے۔ کسی کے بارہ میں کوئی بھی الٹی بات کہنے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتے۔ حالاں کہ زبان کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ بعض باتیں آدمی کو جہنم میں پہنچادیتی ہیں۔

۲۲ فروری کی شام کو تمام لوگ والیٔ رباط (گورنر رباط) کی رہائش گاہ پر لے جائے گئے۔ یہاں والی کی طرف سے افطار کا انتظام تھا۔ ہم لوگ پہنچے تو افطار کے سامان سے میز بھری ہوئی تھی۔ لمبی افطار کے بعد نماز باجماعت ادا کی گئی۔ اس کے بعد لوگ ایک کمرہ میں بیٹھ کر دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد تین بار کھانے کے سامان سے میز لبریز کی گئی۔ حسب عادت میں نے چند سادہ چیزیں کم مقدار میں کھائیں۔ ہر ایک کی پلیٹ میں بریڈ رکھی جانے لگی۔ میں نے دکتور ابراہیم الرفاعی سے کہا کہ نصف لی و نصف لک اور ان کی بریڈ میں سے آدھا لے لیا۔ اس کے بعد میں روٹی اور سلاد ملاکر دھیرے دھیرے کھاتا رہا۔ دکتور حسن محمد الفاتح قریب اللہ (سوڈان) مجھ سے نزدیک کی کرسی پر تھے، آخر میں انھوں نے کہا کہ آپ تو کھانتے ہی نہیں۔

کھانے کی بڑی میز پر مختلف قسم کے کھانے جمع تھے۔ لوگ کھا رہے تھے اور تفریحی باتیں کر رہے تھے۔ میں نہ ان کی ہنسی میں شریک ہوسکا اور نہ ان کی باتوں میں۔ میں بس خاموش بیٹھا ہوا سنتا رہا۔ دکتور احمد علی الامام (مدیر جامعہ ام درمان، سوڈان) بھی قریب ہی تھے۔ وہ دیر تک میری حالت دیکھتے رہے۔ اس کے بعد میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور یہ عربی شعر پڑھا:

وحید من الخلان فی کل مَهْمَهٍ　　اذا اعظم المطلوب قلَّ المساعد

ایک بار کھانے سے فراغت کے بعد کچھ عرب علما بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک مصری کو نعتیں یاد تھیں انھوں نے مختلف عربی نعتیں سنانا شروع کیا۔ میں سنتا رہا۔ آخر میں میں نے کہا کہ یہ نعتیں جو آپ نے سنائی ہیں وہ سب کی سب لفظی تعریف کی حیثیت رکھتی ہیں۔ میں آپ کو ایک اور نعت سناتا ہوں

جو پیغمبر کی معنوی تعریف میں ہے۔ یہ ایک برطانی مستشرق ای ای کیلیٹ کی منثور نعت ہے۔ کم ازکم اپنے بارہ میں میں کہہ سکتا ہوں کہ اردو، فارسی، عربی میں نعتیہ اشعار کا جو ذخیرہ ہے، یہ نعت ان سب پر بھاری ہے۔ یہ منثور نعت انگریزی میں ہے، اس کا عربی ترجمہ یہ ہے: محمد واجه الصعوبات بعزم ان يعصر الفور من الفشل۔

ایک مجلس میں ایک عرب عالم نے کہا کہ آج کی سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ ہمارے درمیان عزالدین عبدالسلام جیسے علماء موجود نہیں جن کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ: اذا خرج خرجت الامة كلها (جب وہ نکلے تو پوری امت ان کے ساتھ نکل پڑی)

میں نے کہا کہ یہ بات صحیح نہیں۔ آج بھی ہمارے یہاں بہت سے علماء پیدا ہوئے۔ مثلاً حسن البنا ۱۹۴۸ میں یہ کہہ کر اٹھے کہ لبیك يا فلسطين تو ان کے ساتھ مصری قوم سڑکوں پر نکل آئی۔ انڈیا میں مولانا محمد علی جوہر نے خلافت کا نعرہ لگایا تو تمام مسلمان ان کے پیچھے چل پڑے۔ الجزائر میں کچھ علماء نے استعمار سے آزادی کا نعرہ دیا تو لاکھوں لوگ گولی کھانے کے لئے تیار ہو گئے۔ وغیرہ۔

اصل یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں جب کوئی عالم ایک کام کے لئے اٹھا تو اس کے عمل کا نتیجہ برآمد ہوا۔ موجودہ زمانہ میں جو علماء اٹھے ان کی کوششیں مکمل طور پر بے نتیجہ ہو کر رہ گئیں۔ لوگوں کی کمزوری یہ ہے کہ وہ نتیجۂ عالم کے فقدان کو خود عالم کے فقدان پر محمول کر رہے ہیں۔ حالانکہ جو چیز مفقود ہے وہ نتیجۂ عالم ہے نہ کہ عالم۔

ایک صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے اپنا نام العمرانی بتایا۔ وہ مراکو ریڈیو کے دفتر سے بول رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ روزانہ ہم ریڈیو پر آپ کی ٹاک رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ رمضان کے آخر مہینہ تک میں یہاں رہوں گا۔ میں نے معذرت کی۔ میں نے کہا کہ اب تو میرا جانے کا وقت آگیا ہے۔ اب میں آپ کی فرمائش پوری نہیں کر سکتا۔

۲۳ فروری کو کوئی پروگرام نہیں تھا۔ سارے دن ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ ملاقاتیں زیادہ تر عرب نوجوانوں سے ہوئیں۔ ایک نوجوان نے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے مسائل و مشکلات کے بارہ میں سوال کیا۔ میں نے کہا کہ موجودہ حالات کو دوسرے لوگ مشکلات کا نام

دیتے ہیں مگر میں ان کو چیلنج کہتا ہوں۔ اور چیلنج ہمیشہ فرد یا قوم کی صلاحیتوں کو ابھارنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ یہ حالات مسلمانوں کے لئے نئی کامیابی کا زینہ ہیں۔

شام کو تمام شرکاء جنرل قادری کی رہائش گاہ پر لے جائے گئے۔ یہاں افطار کا انتظام تھا۔ دیر تک افطار کا سلسلہ جاری رہا۔ لوگ ذوق و شوق کے ساتھ کھاتے رہے اور تفریحی باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک شخص نے اعلان کیا کہ مغرب کی نماز پڑھنے کے لئے آجائیں۔ ایک عرب عالم نے اٹھتے ہوئے کہا: ما اکلنا لا یُمضم الا بالصلاۃ۔

ہندستان میں جہاں کہیں کچھ پڑھے لکھے لوگ جمع ہوتے ہیں تو زیادہ تر وہ تفریحی باتیں کرتے ہیں۔ اگر کسی علمی نکتہ کا ذکر آتا ہے تو وہ بھی تفریح کے انداز میں۔ یہاں بھی تقریباً یہی حال تھا، اس فرق کے ساتھ کہ ہندستان میں اردو میں تفریحی باتیں ہوتی ہیں اور یہاں عربی میں۔ میز پر کیلا آیا تو ایک صاحب نے اس کو ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا: الامام مالک کان یحب الموز۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ وہ کیلے کو بھی پسند کرتے تھے اور موت کو بھی۔

ایک لبنانی عالم تھے۔ انھوں نے کہا کہ ویحمل عرش ربك فوقهم يومئذٍ ثمانية (الحاقہ) میں ثمانیہ سے مراد آٹھ پہاڑ ہیں، ان میں سے ایک لبنان کا پہاڑ ہے۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ یہ تفسیر غلط ہے۔ لبنانی بزرگ نے کہا کہ ہم تو کتابوں میں جو پڑھتے ہیں اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ الراسخون في العلم يقولون آمنا بہ۔ تفریح کے موڈ میں ان کو یاد نہیں رہا کہ آیت میں ایمان سے مراد قرآن پر ایمان ہے نہ کہ تفسیری حاشیوں پر ایمان۔

ایک مجلس میں چند علماء بیٹھے ہوئے تھے۔ دکتور ابراہیم الرفاعی نے ایک مراکشی عالم سے میرا تعارف کرانا چاہا۔ انھوں نے کہا: ان کو کون نہیں جانتا ان کی کتابیں تو اسلامی بیداری کی تمہید ہیں۔ (کتبہ مقدمۃ الصحوۃ)

۲۴ فروری کی صبح کو فجر کی نماز ادا کی تو ذہن پر یہ خیال طاری تھا کہ کل صبح کو مجھ کو یہاں سے روانہ ہونا ہے۔ نماز کے بعد دعا کرتے ہوئے یہ الفاظ زبان پر آگئے: رب ادخلني مدخل صدق واخرجني مخرج صدق واجعل لي من لدنك سلطانا نصيرا (اے میرے رب، مجھ کو داخل کر سچا داخل کرنا، اور مجھ کو نکال سچا نکالنا۔ اور مجھ کو اپنے پاس سے مددگار قوت عطا فرما) بنی اسرائیل ۸۰

۲۴ فروری کو الاستاذ التلماحی الراجی الہاشمی کا درس تھا۔ اس کا موضوع تھا: القرأت المتواترۃ والوقف القیروانی۔ انھوں نے الترمذی میں انس ابن مالک کی اس روایت کو عنوان بنایا تھا کہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قرأ اَنّ النفسَ بالنفسِ وَالعینُ بالعینِ (المائدہ) انھوں نے خالص فنی انداز میں قرآن میں اختلاف قرأت اور اختلاف وقف کے اوپر روشنی ڈالی۔

درس کے فوراً بعد افطار کے لئے جانا تھا۔ یہ افطار قصر ملکی کے جنرل کی رہائش گاہ پر تھا۔ رؤساد عرب کے عام دستور کے مطابق بے شمار قسم کے کھانے وافر مقدار میں میزوں پر سجائے ہوئے تھے۔ سو اچھ بجے افطار شروع ہوا۔ واپس فندق میں آئے تو رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔

سب سے پہلے انواع واقسام کی چیزوں سے افطار کیا گیا جو پورے کھانے کے برابر تھا۔ کھانے کے دوران لوگ طرح طرح کی تفریحی باتیں کرتے رہے۔ آدمی پانی کی ٹرے لے کر آیا تو ایک صاحب نے کہا: الماء لمن طلب۔ دوسرے نے کہا والحلیب لمن حلب۔ اس طرح تفریحی باتوں کے درمیان لوگ کھاتے رہے۔ اس کے بعد مغرب کی نماز کا اعلان ہوا تو ایک صاحب نے کہا: ما اکلنا لا یھضم الا بالصلاۃ۔

مغرب کی نماز کے بعد ایک بڑے کمرہ میں نشست ہوئی۔ یہاں لوگوں کے اوپر عطر چھڑکا گیا۔ بخور جلائے گئے۔ مختلف قاریوں نے قرآن کی تلاوت کی۔ ایک قاری نے اقرأ باسم ربك الذی خلق۔ کو سات قرأتوں کے ساتھ پڑھ کر سنایا۔ ایک بار دو قاریوں نے مل کر کورس کی صورت میں قرآن کے کچھ حصے پڑھے۔ کسی نے یمن کی قرأت سنائی، کسی نے مغرب کی اور کسی نے مصر کی۔

اس کے بعد کھانے کا دور شروع ہوا۔ ایک کے بعد ایک تین بڑی بڑی ٹرے میں لاکر ہر میز پر گوشت رکھ دیا گیا۔ میں تو گوشت کا ایک ریزہ بھی نہ لے سکا۔ تاہم لوگ نہایت ذوق وشوق کے ساتھ کھاتے رہے۔ حمامہ (کبوتر) کی ٹرے آئی تو ہر شخص نے ایک ایک مسلم کبوتر اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھ لی۔ ایک صاحب نے کہا: کل واحد بحمام دوسرے صاحب نے کہا: فکل انسان طائرہ فی عنقہ۔ میں اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا صرف کھانے والوں کا منظر دیکھتا رہا۔ ہر بار گوشت اتنا زیادہ ہوتا تھا کہ کافی کھانے کے بعد بھی بہت زیادہ بچ جاتا تھا۔

عربوں میں بہت بڑی تعداد میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جن کو الرسالہ مشن سے گہری دلچسپی ہے۔ عرب نوجوانوں کا ایک حلقہ ہے جس نے ایک درجن سے زیادہ کتابوں کا عربی ترجمہ کروایا ہے۔ اور ان کو قاہرہ سے شائع کیا ہے۔ یہ لوگ ایک اردو داں عالم کی مدد سے ہر ماہ اردو الرسالہ کا مکمل ترجمہ عربی میں کراتے ہیں اور پھر اس کو اجتماعی طور پر پڑھتے ہیں۔ اس حلقہ کے کئی نوجوان ربا ط آئے۔ کئی دن تک ان سے اسلام اور الرسالہ مشن کے بارہ میں گفتگو ہوتی رہی۔

دکتور عبد الصبور شاہین (قاہرہ) نے ۲۴ فروری کی ملاقات میں کہا کہ جمال عبد الناصر اقتدار پانے سے پہلے ایک اخوانی تھا۔ اس کی پرورش اخوان کے اندر ہوئی، اس کے بعد اس نے خیانت کی (جمال عبد الناصر رُبِّیَ فی الاخوان ثم خان) انھوں نے بتایا کہ ناصر کے ساتھی حسن تہامی کی شہادت ہے کہ ناصر کافر تھا، وہ منکر تھا۔ عبد الصبور شاہین نے کہا کہ ناصر بیسویں صدی کا سب سے بڑا دشمن اسلام تھا۔

میں نے کہا کہ اس قسم کی باتوں کو پہلے میں اہمیت دیتا تھا، مگر اب میں ایسی باتیں سنتا ہوں تو میں اس کو اہمیت نہیں دے پاتا۔ اس کا سبب میرا ذاتی تجربہ ہے۔ میں نے کہا کہ یہی اسلام پسند لوگ میرے بارہ میں کہتے ہیں کہ میں اسلام دشمنوں کا ایجنٹ ہوں۔ میں اسلام دشمن طاقتوں سے پیسے لیتا ہوں۔ حالاں کہ یہ باتیں سراسر جھوٹ اور اتہام ہیں۔ میں جو کچھ کہتا ہوں صرف قرآن وسنت کے مطالعہ کی بنیاد پر کہتا ہوں، کسی بھی دوسرے شخص یا گروہ کے اشارہ پر ہرگز نہیں کہتا ہوں۔ اس ذاتی تجربہ سے میں نے جانا کہ لوگ اپنے مخالفین کے بارہ میں کتنی زیادہ بے بنیاد بات کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے اب میں وہی بات مانتا ہوں جس کا مجھے خود براہ راست علم حاصل ہوا ہو۔

مراکو کے کچھ نوجوانوں نے ایک دینی اور اصلاحی تنظیم قائم کی ہے۔ اس کا نام ہے: حرکۃ الاصلاح والتجدید المغربیۃ۔ ایک نوجوان نے اس کا ۴۲ صفحہ کا میثاق دیا۔ اس کا دسواں قاعدہ التعاون مع الغیر لمصلحۃ المسلمین۔ اس کے تحت درج تھا: ان التعاون علیٰ تحقیق الخیر قد یتجاوز دائرۃ الاسلامیین لیشمل غیرھم من الطاقات الفاعلۃ فی البلد علیٰ ان تحکم ذالک التعاون مصلحۃ راجحۃ للاسلام۔ ومالم یستلزم ذالک مفسدۃ اکبر مصداقا لقول الرسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ لقد شھدت فی دار عبد اللہ بن جدعان حلفا ما احب ان لی بہ حمر النعم۔ ولو دعیت بہ فی الاسلام لاجبت)

۲۵ فروری کی صبح کو رباط سے واپسی تھی۔ فجر کی نماز پڑھ کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا تو یہ الفاظ زبان پر آگئے: خدایا آپ ہی مجھ کو خیریت کے ساتھ دہلی سے مراکو لے آئے۔ اب آپ ہی مجھ کو خیریت کے ساتھ دوبارہ دہلی پہنچائیں گے۔ آپ ہی نے مجھ کو پیدا کر کے دنیا میں رکھا، آپ ہی مجھ کو آخرت میں خیریت کے ساتھ داخل کریں گے۔

روانہ ہوا تو خیال آیا کہ سفر میں روزہ رکھ لوں تاکہ ناغہ نہ ہو۔ پھر یہ حدیث یاد آئی کہ لیس من البر الصیام فی السفر۔ چنانچہ میں نے ۲۵ فروری کو روزہ نہیں رکھا۔ البتہ ۲۶ فروری کی صبح آئی تو روزہ کی نیت کر لی۔

۲۵ فروری کی صبح کو واپسی تھی۔ ہوٹل سے ائیر پورٹ کے لئے روانگی ہوئی۔ ڈکتور ابراہیم الرفاعی کا ساتھ رہا۔ وہ بیک وقت علمی اور صوفیانہ مزاج کے آدمی ہیں۔ اتفاق سے یہی میرا مزاج بھی ہے۔ چنانچہ راستہ میں اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ ایئر پورٹ پہنچے تو میرے ساتھ حسب معمول صرف ایک بیگ تھا۔ اس کو دیکھ کر انھوں نے کہا: فاز المخفّفون۔

الدار البیضاء (کیسابلانکا) سے پیرس کے لئے ایئر مراک، فلائٹ ۳۸۰ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں مختلف چیزیں پڑھیں۔ نیوز ویک (۲۸ فروری ۱۹۹۴) کی کور اسٹوری کا عنوان تھا:

A child's diary of war.

ایک تیرہ سالہ لڑکی (Zlata Filipovic) بوسنیا کے شہر سراجیبو (Sarajevo) میں رہتی تھی۔ اب وہ پیرس میں ہے۔ اس نے سراجیو میں ڈائری لکھنا شروع کیا۔ اس کی یہ ڈائری حال ہی میں امریکہ سے چھپی ہے۔ اس میں اس نے اپنے احساسات درج کئے ہیں جو پڑھنے کے قابل ہیں۔ اس کا ایک تاثر انگریزی میں اس طرح نقل کیا گیا تھا کہ سرب، کرواٹ اور مسلمان سب ایک قوم کے لوگ ہیں۔ سیاست کیوں ہم کو الگ کر رہی ہے۔ یہ سیاست بڑی عمر کے لوگ چلا رہے ہیں۔ ہم نوجوان اس کو زیادہ بہتر طور پر چلا سکتے ہیں:

Serbs, Croats and Muslims — they are all people. Why is politics separating us. Politics are conducted by grown-ups. We young would do it better. (12)

اس ڈائری کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ بوسنیا میں اسی قسم کی سیاست چلائی گئی جو برصغیر ہند میں چلائی

گئی۔مسلم لیڈروں نے تقسیم ہند کی تحریک چلائی۔ اس کے جواب میں اکھنڈ بھارت کی تحریک چلی۔ ان تحریکوں کے نتیجہ میں جو گرمی پیدا ہوئی اس نے ہندستان کو جھلس کر رکھ دیا۔ ٹھیک یہی بوسنیا میں بھی پیش آیا۔

راستہ میں ایئر انڈیا کا فلائٹ میگزین (جنوری۔ فروری ۱۹۹۴) دیکھا۔ اس کے صفحہ ۱۷ پر یہ جاذب سرخی تھی ـــــ سمائی ٹیلیفون (sky phone) اس سرخی کے نیچے لکھا ہوا تھا کہ دنیا آپ کی انگلی کے تحت (The world at your tip) اس میں بتایا گیا تھا کہ ایئر انڈیا کے بوئنگ جہاز میں سفر کرتے ہوئے آپ سمائی ٹیلیفون کے ذریعہ دنیا کے کسی بھی مقام پر ٹیلیفون کر سکتے ہیں:

On the Boeing 747-400, you can call anywhere around the globe, using skyphone.

ان سطروں کو پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ موجودہ زمانہ میں اس قسم کے مشینی واقعات گویا قدرت الٰہی کا تعارف ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ساری کائنات خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ وہ ہر جگہ جو چاہتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے اپنے حکم کی تنفیذ کر رہا ہے۔ یہ عظیم واقعہ کیوں کر انجام پاتا ہے، موجودہ مشینی ترقیاں اسی کا ابتدائی سطح پر امکانی تعارف ہیں۔

اگر آپ نقشہ پر دیکھیں تو کیسا بلانکا سے دہلی آنے کے لئے سیدھا راستہ اس طرح ہے ـــــ کیسا بلانکا، طرابلس، اسکندریہ، کویت، بندرعباس، دہلی۔ مگر میں کیسا نکا سے پیرس جا رہا ہوں۔ یہ گویا الٹی طرف سفر ہے۔ پھر پیرس سے میں دہلی کے لئے فلائٹ لوں گا۔ یہ مسلم دنیا کے بچھڑے پن کی قیمت ہے۔ کیوں کہ مناسب پرواز مجھے پیرس ہی سے مل سکتی ہے۔

کیسا بلانکا (الدارالبیضاء) سے پیرس جاتے ہوئے ہمارا جہاز اسپین کے اوپر سے گزرا۔ اسپین کے تصور سے ماضی کی تاریخ کی بہت سی باتیں تازہ ہو گئیں۔ اسپین میں مسلمانوں کا دور ایک بے حد پُراز واقعات دور تھا۔ شاید کسی بھی دوسرے مقام سے اتنے زیادہ اسلامی واقعات وابستہ نہیں ہیں جتنا کہ اسپین سے وابستہ ہیں۔ اسپین میں تقریباً ہر قسم کے واقعات موجود ہیں۔ وہ بذاتِ خود ایک مکمل تاریخ ہے۔ تاہم اس وقت میں مسلم اسپین کے بارے میں کچھ نہیں لکھوں گا۔ کیوں کہ جلد ہی اِن شاء اللہ اسپین کے لیے میرا ایک سفر ہوگا۔ اس وقت سفرنامہ اسپین کے تحت اِن شاء اللہ اس کا تذکرہ کیا جائے گا۔

انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون (۲۵ فروری) دیکھا۔ اس کے ایڈورٹائزمنٹ سکشن میں نوصفحہ کویت کے بارہ میں تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ خلیج کی جنگ کے بعد کویت کس طرح دوبارہ معمول پر آگیا ہے اور ترقی کی طرف اپنا سفر طے کر رہا ہے۔ اس دنیا میں نقصانات پیش آتے ہیں، مگر اسی کے ساتھ دنیا میں یہ امکان بھی وافر مقدار میں موجود ہے کہ اگر ہمت اور منصوبہ بندی سے کام لیا جائے تو ہر نقصان نئے عظیم تر فائدہ کا زینہ بن جاتا ہے۔ اخبار میں نئے کویت کی جو تصویریں دی گئی تھیں ان میں سے ایک مسجد بھی تھی جو جدید کویت کے اوپر گویا خدائی نگراں کے طور پر کھڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

مذکورہ ٹریبون کی ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ بوسنیا کے مسلمان اور کرواٹ دونوں کے نمائندے واشنگٹن میں اس ہفتہ کے آخر میں ملنے والے ہیں تاکہ بوسنیا میں مشترکہ دوقومی ریاست (unified bi-national Bosnian state) کی تجویز پر گفت گو کر سکیں۔ حالات بتاتے ہیں کہ بوسنیا کے لوگوں نے زندگی کا یہ راز پا لیا ہے ـــــ لیک بعد از خرابی بسیار۔

Mosques and minarets across a changing skyline in Kuwait City. Falling oil prices may slow construction activity.

ہرزبان میں ایک مقام اور دوسرے مقام کے لہجہ میں فرق ہوتا ہے۔یہی معاملہ عربی زبان کا بھی ہے۔مراکو مغربی سمت میں عرب دنیا کا بعید ترین ملک ہے۔ چنانچہ یہاں آتے آتے لہجہ کا فرق آخری حد تک مختلف ہوگیا ہے۔یہاں کے علما،ہم لوگوں سے فصیح زبان میں بولتے تھے۔اس لئے ان کی بات تو بخوبی سمجھ میں آتی تھی۔مگر عوام کی بولی سمجھنا میرے لئے سخت مشکل تھا۔

عوام کی سطح پر یہاں کا عربی لہجہ اتنا زیادہ مختلف ہے کہ جب ایک شخص بولتا ہے اگرچہ وہ عربی بول رہا ہوتا ہے مگر کتابی عربی جاننے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کوئی غیر زبان بول رہا ہے۔مثلاً میرے ساتھ جو سائق تھا، اس نے اپنا نام لبدوی محمد بتایا۔تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ لبدوی اصل میں البدوی ہے۔سائق جب کچھ کہتا تو مشکل سے اس کا کوئی لفظ میری سمجھ میں آتا۔میں صرف اندازہ سے سمجھتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔مثلاً ایک بار جب مجھے درس میں شرکت کے لئے شاہی قصر میں جانا تھا، میں نے ایک صاحب کی بابت پوچھا۔ سائق (ڈرائیور) نے کہا: ماشٗ کافی سوچنے کے بعد سمجھ میں آیا کہ وہ کہہ رہا ہے: مَشَیٰ یعنی وہ چلے گئے۔

یہ قرآن کی طاقت تھی جس نے عربی زبان کو سابقہ حالت پر باقی رکھا۔ورنہ اب تک عربی زبان بگڑ کر کچھ سے کچھ ہوگئی ہوتی۔بلکہ لہجوں میں تقسیم ہوتے ہوتے وہ کئی الگ الگ زبان کی صورت اختیار کر لیتی۔

کیسابلانکا سے آنے والے جہاز نے مجھ کو اورلی (مقامی ایئرپورٹ) پر اتارا تھا۔اس کے بعد مجھ کو چارلس ڈیگال (انٹرنیشنل ایئرپورٹ) پر جانا تھا۔ دونوں ایئرپورٹ کے درمیان کافی فاصلہ ہے۔تاہم ایئرفرانس کی طرف سے ہر وقت بس آتی جاتی رہتی ہے۔ ایئرپورٹ کے باہر آکر میں نے یہ بس پکڑی اور اس کے بعد چارلس ڈیگال ایئرپورٹ آگیا۔یہاں سے ایئرانڈیا کی فلائٹ ۱۴۸ کے ذریعہ دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔یہ نان اسٹاپ فلائٹ تھی۔پیرس سے دہلی تک ۶۵۹۲ کیلومیٹر کا سفر تقریباً آٹھ گھنٹہ میں طے ہوا۔

پیرس ایئرپورٹ پر فرانسیسی پولیس نے میرا پاسپورٹ لے لیا اور مجھ کو "انٹروگیشن" کے کمرہ میں لے گئی۔وہاں پہنچا تو ایک اور داڑھی والے مسلمان کو پولیس نے بٹھا رکھا تھا۔تعارف کے بعد معلوم ہوا کہ وہ مراکو کے بن حماد مولای عمر ہیں جو کہ کلیتہ الآداب والعلوم الانسانیہ (المحمدیہ) میں

استاد ہیں۔ تعارف کے بعد وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ میرے پاس الاسلام یتحدی کے دو نسخے ہیں۔ میں نے اس کو بار بار پڑھا ہے اور اپنی تقریروں میں اس سے بہت کام لیتا ہوں۔

فرانسیسی پولیس نے میری ایک ایک چیز کی نہایت مکمل جانچ کی۔ اور دیر تک مجھے ایئر پورٹ پر روکے رکھا۔ مذکورہ مراکشی عالم سے میں نے پوچھا کہ آخر یہ لوگ اتنی سخت جانچ کیوں کر رہے ہیں۔ پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ انھوں نے کہا کہ خود اپنے کچھ لوگوں کی نادانی کے نتیجہ میں ایسا پیش آیا ہے۔ کچھ مسلمان ان کے ملکوں میں تخریبی کارروائی کرتے ہیں اور تمام مسلمانوں کو وہ مشتبہ سمجھ لیتے ہیں۔ ہم اسی کی قیمت ادا کر رہے ہیں (نحن نؤدی الثمن)

پیرس سے دہلی کے راستہ میں مختلف پرچے دیکھے۔ الشرق الاوسط (۲۵ فروری) میں صفحہ پر ایک مضمون کا عنوان تھا: الآخرون تعلموا من مصائبنا، فمتی نتعلم (دوسروں نے ہماری مصیبتوں سے سبق لیا، پھر ہم کب سبق لیں گے) اسی طرح ادارتی نوٹ کا عنوان ان لفظوں میں تھا: الحرب الباردة وھبّا تھا الساخنة (سرد جنگ اور اس کے گرم جھونکے) اس کو پڑھ کر خیال آیا کہ آجکل ہر مسلم اخبار، خواہ وہ کسی زبان میں ہو، اسی قسم کی شکایتی باتوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ کی مسلم صحافت فریاد اور احتجاج کی صحافت بن کر رہ گئی ہے۔

یہ پیرس سے دہلی تک کی نان اسٹاپ فلائٹ تھی۔ تقریباً آٹھ گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد ۲۶ فروری ۱۹۹۴ کی صبح کو جہاز دہلی کے انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اتر گیا۔ جہاز سے باہر آیا تو کسٹم کے ہال میں بہت بڑی تعداد میں لوگ اپنے بھاری سامانوں کے ساتھ مختلف کھڑکیوں پر کھڑے ہوئے تھے۔ میرے ساتھ دستی بیگ کے سوا کوئی سامان نہ تھا۔ چنانچہ میں کسی حساب کتاب کے بغیر چلتا ہوا ایئرپورٹ کے باہر آگیا۔

ایک سفر

اٹلی کی راجدھانی روم ہے۔ مگر وہاں کا سب سے بڑا شہر میلان (Milan) ہے۔اس کو اطالوی زبان میں میلانو کہاجاتا ہے۔ یہاں ستمبر۱۹۹۳ میں انٹرنیشنل سطح کی ایک مذہبی کانفرنس ہوئی۔اس سلسلہ میں اٹلی اور انگلینڈ کا سفر ہوا۔

اس کا دعوت نامہ ۱۰ ماہ پہلے نومبر۱۹۹۲ میں مجھے مل گیا تھا۔اس کے بعد کاغذات موصول ہوتے رہے۔ سفر پر روانہ ہونے سے کافی پہلے کانفرنس کی پوری تفصیل مجھے دہلی میں مل چکی تھی۔ یہ موجودہ زمانہ میں مواصلات (communications) کے جدید ذرائع کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ جدید مواصلات نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ آدمی ایک مقام پر بیٹھ کر سارے عالم میں اشاعت افکار کی مہم چلاسکے۔ قدیم نوآبادیاتی نظام کی علامت اگر ٹیلی گرافک پیغام رسانی تھی تو جدید نوآبادیاتی نظام کی علامت الیکٹرانک پیغام رسانی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ نہ قدیم مواصلاتی دور میں اس کو حقیقی طور پر دعوت کے مقاصد میں استعمال کیا جاسکا اور نہ جدید مواصلاتی دور میں اس کو دعوت کے لئے استعمال کیا جارہا ہے۔اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں میں دعوتی شعور سرے سے موجود ہی نہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما خلافت ارضی اور قیادت عالمی کے حصول کو دعوت سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ یہ محض سیاسی ہنگامہ آرائی ہے نہ کہ دعوت الی اللہ۔

ستمبر۱۹۹۳ کی ۱۸ تاریخ شروع ہوئی تو گاڑی مجھ کو لئے ہوئے تیزی سے دہلی ایئرپورٹ کی طرف جارہی تھی۔ آج مجھے دہلی سے اٹلی جانا تھا۔ وہاں چند دن قیام کرکے ایک انٹرنیشنل کانفرنس میں شرکت کرنا تھا۔ اس کے بعد مزید سفر کرکے انگلینڈ جانا تھا۔ وہاں دوبارہ چند شہروں میں خطاب اور ملاقات کے پروگرام تھے۔ ان سے فارغ ہوکر مجھے دہلی واپس آنا تھا۔اس سفر کی روداد یہاں درج کی جاتی ہے۔

۱۸ ستمبر کو صبح تین بجے میں دہلی کے انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ مختلف قسم کے لوگ اپنے اپنے سامان کے ساتھ دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ چلتے ہوئے، کچھ بیٹھے ہوئے۔ اچانک ایک سوال میرے ذہن میں آیا" یہ مختلف قومیتوں کے اور مختلف مذہبوں کے لوگ یہاں لڑتے کیوں

نہیں۔" یہ سوال عجیب بھی تھا اور غیر متعلق بھی۔ مگر اس سوال نے ایک اہم حقیقت مجھ پر واضح کر دی۔ اس پر غور کرتے ہوئے مجھ پر کھلا کہ اس کی وجہ ذاتی مشغولیت ہے۔ ہر شخص اپنے مسائل اور اپنے انٹرسٹ میں اتنا زیادہ گم ہے کہ کسی کو دوسرے سے الجھنے کا موقع نہیں۔

میں نے کہا کہ یہ باہمی لڑائی کے خلاف قدرت کا ایک طاقت ور چیک ہے، اس طرح قدرت نے ہر ایک کو اپنی ذات میں اتنا زیادہ گم کر دیا ہے کہ اگر اس کو چھیڑا نہ جائے تو کبھی دنگا اور فساد کی نوبت نہ آئے۔

میں ایئر پورٹ کی انتظار گاہ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے ساتھی ایئر پورٹ ٹیکس ادا کرنے چلے گئے۔ کیوں کہ ایئر پورٹ ٹیکس کی ادائیگی کی رسید حاصل کئے بغیر بورڈنگ پاس نہیں مل سکتا تھا۔ دو آدمی کے لئے چھ سو روپیہ ایئر پورٹ ٹیکس ادا کیا گیا۔ یہ ایئر پورٹ ٹیکس سب کو دینا پڑتا ہے۔ صرف حاجیوں کے لئے یہ سفر ٹیکس معاف ہے ــــــ سیکولر ملک میں بھی کیسی کیسی غیر سیکولر نعمتیں مسلمانوں کو حاصل ہیں۔

بورڈنگ کارڈ اور دوسرے مراحل سے گزر کر چیکنگ کاؤنٹر پر پہنچا تو وہاں بیٹھے ہوئے آدمی نے میرا پاسپورٹ دیکھتے ہوئے پوچھا: آپ آتھر ہیں۔ ہاں۔ کیا ناول لکھتے ہیں۔ نہیں، میرا موضوع نان فکشن ہے۔ اس طرح کے مختصر سوال وجواب کے بعد آگے بڑھا تو میں یہ سوچ رہا تھا کہ عام انسان کے نزدیک کتاب سے مراد بس ناول یا افسانہ ہے۔ کیوں کہ لوگوں کے نزدیک زندگی کا اصل مقصد پیسہ کمانا ہے۔ کتاب وغیرہ کو وہ صرف تفریح کی چیز سمجھتے ہیں۔ اور تفریح ناول افسانہ سے ہوتی ہے نہ کہ سنجیدہ کتابوں کے مطالعہ سے۔ کتاب یا مطالعہ کا مقصد شعور کا ارتقا تھا۔ مگر آج وہ بس وقتی تفریح کا سامان بن کر رہ گیا ہے۔

دہلی ایئر پورٹ پر انتظار گاہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایئر پورٹ کا ایک آدمی آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں واکی ٹاکی تھی اور دوسرے ہاتھ میں چوڑا ٹیپ۔ اس نے بلند آواز سے پکارا: پسنجر راجندر سنگھ۔ مسافر اٹھا تو اس نے کہا کہ آپ کا ایک سامان ڈیمیج (damage) ہو گیا ہے۔ چل کر اس کو پہچان کرلیں۔ پہچان کرانے کے بعد اس نے اپنا ٹیپ کھولا اور اس کو چاروں طرف سے لگا کر ان کے بنڈل کو خوب مضبوط کر دیا۔

یہ منظر دیکھ کر میرا جی بھر آیا۔ باچشم گریہ میں نے کہا: خدایا، اس مسافر کا تو ایک سامان ڈیمیج ہوا تھا اور تلاش کرنے والے نے تلاش کرکے اس کو درست کر دیا۔ میرا تو سب کچھ ڈیمیج ہوچکا ہے۔ حتی کہ اِس عمر کو پہنچ کر آپ کا دیا ہوا جسم بھی اب ڈیمیج ہوگیا۔ خدایا، تو اپنے فرشتوں کو نہ بھیج دے جو تیری قدرت کی "ٹیپ" کے ذریعہ میرے تمام ڈیمیج کو درست کر دیں۔

دہلی سے روم کے لئے ایئر انڈیا کی فلائٹ ۱۷۱ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ ایئر انڈیا کی میگزین نمسکار (ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۹۳) دیکھا۔ اس کے ایک مضمون کا عنوان تھا ـــــ برٹش راج کا تاج:

The Taj of the Raj

یہ مضمون کلکتہ کی ۷۲ سالہ بلڈنگ وکٹوریہ میموریل کے بارہ میں تھا۔ بتایا گیا تھا کہ ۱۹۰۱ میں جب کوئن وکٹوریہ کا انتقال ہوا اس وقت لارڈ کرزن انڈیا میں برٹش وائسرائے تھے۔ انھوں نے تجویز کیا کہ کوئن کی ایک یادگار کلکتہ میں قائم کی جائے۔ اس وقت کلکتہ یہاں کی راجدھانی تھا۔ اس کے مطابق کلکتہ کا وکٹوریہ میموریل ہال تعمیر کیا گیا۔ مضمون میں اس کے مختلف پہلوؤں کا تعارف کراتے ہوئے آخر میں یہ جملہ درج تھا کہ اس سال جب کہ میموریل اپنی ۷۲ سالہ تقریب منارہا ہے، وہ ماضی کی ایک شاندار یادگار کے طور پر اب بھی باقی ہے، ایک ماضی جو ناقابل انقطاع طور پر حال سے جڑا ہوا ہے:

it remains quintessentially a majestic testimony to the past — a past that is inexorably linked to the present. (36)

یہ خوبصورت جملہ صرف آدھے معنی میں درست ہے۔ عمارت کے اعتبار سے وہ ماضی سے حال تک جڑا ہوا ہے۔ مگر جس راج کے نام پر یہ عمارت بنائی گئی تھی وہ راج ۱۹۴۷ میں ختم ہوگیا۔ جو لوگ اس فرق کو نہ سمجھیں اور عمارت کے اوپر سیاست کو قیاس کرکے ماضی کے راج کو حال تک وسیع کرنا چاہیں وہ ملے ہوئے حال کو بھی برباد کر دیں گے۔

یہ فلائٹ براہ راست دہلی سے روم کے لئے تھی۔ دونوں کے درمیان مسافت ۶۳۸۵ کیلو میٹر ہے۔ یہ سفر پورے آٹھ گھنٹہ میں طے ہوا۔ کچھ وقت سونے میں گزرا اور کچھ وقت پڑھنے میں۔ یہاں تک کہ جہاز پرسکون طور پر روم کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔

روم کے بارہ میں ایک دلچسپ خبر نظر سے گزری۔ ایک اطالوی اخبار (PAESE SERA) کے حوالے سے بتایا گیا تھا کہ اٹلی کے دار السلطنت کو پندرہ ملین چوہے کتر رہے ہیں:

The capital of Italy is now being gnawed away by some 15 million rats.

خبر میں کہا گیا تھا کہ چوہوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اس ابدی شہر (Eternal city) کے لئے زبردست خطرہ بن گئی ہے۔ کبھی ٹیلیفون کام نہیں کرتا اور تحقیق کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ چوہے نے لائن کاٹ دی ہے۔ کبھی بجلی فیل ہو جاتی ہے اور اس کا سبب چوہے ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ابھی تک اس مسئلہ کا کوئی مؤثر حل دریافت نہیں کیا جا سکا ہے ـــــ مہلک گیس چھڑک کر تمام چوہوں کو مارا جا سکتا ہے۔ مگر چوہوں کا یہ خاتمہ اس قیمت پر ہوگا کہ اسی کے ساتھ انسان بھی ختم ہو چکے ہوں ـــــ وہ روم جو انسانی فوجوں کے لئے ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا، وہ چوہے کی فوج کا مقابلہ کرنے سے بھی عاجز ہے۔

مہاتما گاندھی ایک سفر کے دوران دسمبر ۱۹۳۱ میں روم آئے تھے۔ انھوں نے پوپ اور مسولینی دونوں سے ملاقات کی کوشش کی۔ ان کے سوانح نگار مسٹر لوئی فشر نے اپنی ۵۵۰ صفحہ کی کتاب (The Life of Mahatma Gandhi) میں لکھا ہے کہ پوپ نے کسی وجہ سے ملاقات کا وقت نہیں دیا۔ مسولینی سے ان کی ملاقات ہوئی جو صرف دس منٹ تک جاری رہ سکی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ گاندھی عدم تشدد کی بات کرتے تھے اور مسولینی تشدد کے طریقے پر یقین رکھتا تھا۔ مہاتما گاندھی کا بیان ہے کہ عمارت کے جس راستہ سے گزار کر انھیں مسولینی کے کمرہ میں پہنچایا گیا، اس کی دیواروں پر ہر طرف تلواریں لگی ہوئی تھیں۔ خود دفتر کی دیواریں بھی تلواروں اور دوسرے ہتھیاروں سے مزین کی گئی تھیں (صفحہ ۲۹۵)

مسولینی نے دوسری عالمی جنگ میں یہ سمجھ کر شرکت کی کہ وہ دوبارہ عظیم اطالوی ایمپائر قائم کرنے جا رہا ہے۔ مگر اس کے جنگی اقدامات نے صرف اٹلی کو تباہ کیا۔ جولائی ۱۹۴۳ میں وہ خود اپنے ملک میں گرفتار کر کے قید کر دیا گیا۔ وہاں سے بھاگ کر وہ جرمنی پہنچا۔ مگر جرمنی میں بھی اس کو سکون کی جگہ نہ مل سکی۔ ۲۸ اپریل ۱۹۴۵ کو جرمن فوجیوں نے اس کو عین اس وقت گولی مار کر ہلاک

کر دیا جب کہ وہ بھیس بدل کر جرمنی سے فرار ہونا چاہتا تھا۔

جو لوگ موجودہ زمانہ میں "تلوار" کی بات کرتے ہیں، انھیں مسولینی اور اس کے جیسے دوسرے دیوانوں کے انجام سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔

روم میں حال میں ایک شاندار مسجد تعمیر ہوئی ہے۔ اس کی تجویز سب سے پہلے ۱۹۳۰ء میں اٹلی کے حکمراں مسولینی کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ اس کے مجوز ایرانی نسل کے اطالوی مسلمان عبد الجاسم ایمنی تھے۔ مگر مسولینی نے اس کو منظور نہیں کیا۔ شاہ فیصل کی کوششوں سے ۱۹۷۳ میں اٹلی کی حکومت نے اس کی اجازت دے دی۔ دو ہزار مربع میٹر کا ایک پلاٹ بھی حاصل ہوگیا۔ ۱۹۸۳ میں اس کی تعمیر شروع ہوئی۔ دس سال میں ۵۰ ملین ڈالر کے خرچ سے یہ مسجد اور اسلامی مرکز تیار ہوا۔ خرچ کی بیشتر رقم سعودی عرب نے ادا کی ہے۔

یہ ایک دو منزلہ عمارت ہے جس میں دو ہزار آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اس کے اندر ایک کافی بڑی لائبریری ہے۔ پانچ سو نشستوں کا خوبصورت کانفرنس ہال ہے۔ میں نے جس وقت اس سنٹر کو دیکھا اس وقت ڈاکٹر عبد القیوم خاں اس کے ڈائرکٹر تھے۔ وہ الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ روم میں ایک ہزار چرچ ہیں۔ مگر پرفضا ماحول کے اعتبار سے یہ واحد اسلامی سنٹر سب سے زیادہ خوب صورت ہے۔ اٹلی میں تقریباً چار لاکھ مسلمان ہیں۔ ان میں سے ۱۰ ہزار نومسلم ہیں۔

Rome's Islamic centre promotes Islamic activities

The Islamic Centre based in the Italian capital, Rome, after gaining recognition by the Government has redoubled its efforts to propagate Islamic Faith and culture throughout the country. Besides providing necessary facilities, the Centre periodically holds seminars and lectures on various aspects of the Islamic culture and civilization. The Centre has also established special institutes for studies on the Holy Qur'an and the tradition of the Prophet (peace be on him). One of the outstanding achievements of the Centre is production of a television series in the Italian language on the condition of the Muslim immigrants in Italy focussing on the problems faced by the immigrants in, carrying out their religious and cultural obligations in the country. The Centre has also published 5000 copies of a book on Islamic worship and other subjects with Italian translation for the benefit of non-Arabs. The production of the book was financed by a prominent Italian Baron Bourna Nova who had embraced Islam a few years ago. The Islamic Centre in Rome has established an institution for teaching Arabic, English and Italian languages for the Muslims living in the various parts of the country and the centre also offers this facility to non-Muslims interested in acquiring the knowledge of Islamic Faith, culture and its civilization.

مکہ کے ہفت روزہ العالم الاسلامی (The Muslim World) کے شمارہ ۱۱-۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳ کے انگریزی حصہ میں ایک رپورٹ چھپی تھی۔ یہ روم کے اس اسلامک سنٹر کے بارہ میں تھی جو عربوں کے تعاون سے وہاں تعمیر کیا گیا ہے۔ اس رپورٹ کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر عبد اللہ عمر نصیف سعودی عرب کی مشہور دینی شخصیت ہیں۔ وہ رابطۂ عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے روم گئے۔ وہاں انھوں نے پوپ جان پال دوم سے ملاقات کی۔ روم میں انھوں نے ورلڈ نیوز لنک کو ایک مفصل انٹرویو دیا۔ یہ انٹرویو حیدرآباد کے انگریزی روزنامہ نیوز ٹائم (Newstime) کے شمارہ ۷ فروری ۱۹۹۳ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ان سے ایک سوال یہ کیا گیا کہ فنڈمنٹلسٹ تحریکیں جو مسلم دنیا میں پھیل رہی ہیں ان کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں ان کے تشددانہ طریقوں کی تائید نہیں کرتا۔ تشدد کا طریقہ اختیار کرنا مکمل طور پر غیر اسلامی ہے:

It is totally unIslamic to use violence.

ایک اور سوال سلمان رشدی کے خلاف قتل کے فتویٰ کے بارے میں تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس قسم کی بات سراسر جذباتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج انسانی حقوق کو فروغ دینا چاہئے۔ موت کی سزا صرف ان مجرمین کو دینا چاہئے جو لوگوں کو قتل کریں۔ بقیہ ہر شخص کو انسانی حقوق دیا جانا چاہئے:

Q. What is your opinion of the death penalty imposed on the British author Salman Rushdie.

A. Some people, in emotion, pass these resolutions. I think that today we must promote human rights. The death penalty should be only for criminals who commit the crime of killing people. But otherwise, human rights should be given to everybody.

یہ باتیں اگر ہندستان کا کوئی عالم کہے تو تمام مسلمان اس کی جان کے دشمن ہو جائیںگے اور اس کے سر پر لاکھوں روپیہ کا انعام مقرر کریں گے۔ لیکن یہی بات جب سعودی عرب کا ایک عالم کہتا ہے تو اس پر کوئی شور برپا نہیں ہوتا اور نہ کوئی ہنگامہ کھڑا ہوتا۔ ہمارے خود ساختہ نمائندگان اسلام

اس کے خلاف احتجاج نہیں کرتے۔ جو لوگ سعودی عرب میں ایک رویہ اختیار کریں اور بقیہ ملکوں میں دوسرا رویہ، ایسے لوگ حدیث کی زبان میں ذو الوجہین ہیں۔ اور ذوالوجہین ہونا انسانیت کے مطابق بھی نہیں، کجاکہ وہ ایمان واسلام کے مطابق ہو۔

روم سے میلانو کے لئے الیتالیا کی ڈومسٹک فلائٹ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز ٹھیک وقت پر روم سے روانہ ہوا۔ اس کی کارکردگی اور اندرونی سروس، ہر چیز انٹرنیشنل معیار کے مطابق تھی۔

مجھے یاد آیا کہ اورنگ آباد میں جب انڈین ایئرلائنز کا ایک کمرشیل جہاز (Boeing 377) حادثہ کا شکار ہوا اور اس میں ۵۵ مسافر ہلاک ہوگئے تو اٹلی کی حکومت نے ایک ٹریول ایڈوائس جاری کی۔ اس میں اطالوی سیاحوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ انڈیا میں انڈین ایئرلائنز کے ذریعہ سفر کو وائڈ کریں۔ کیوں کہ اس سے سفر کرنا غیر محفوظ (unsafe) ہے۔ اس پر حکومت ہند نے ایک بیان (ٹائمس آف انڈیا ۳۰ جون) جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ اس قسم کا مشورہ سراسر احمقانہ اور بے بنیاد ہے:

Such an advice was absolutely silly and baseless.

میں نے جب انڈین ایئرلائنز اور الیتالیا کا عملی تقابل کیا تو مجھے خود یہ تردید بے بنیاد نظر آئی۔ یہ انسان کی عام کمزوری ہے کہ جب اس کی کسی کوتاہی کو بتایا جائے تو وہ اصلاح کے بجائے تردید کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ حالاں کہ اگر کوتاہی کی نشاندہی کے بعد اصلاح پر توجہ صرف کی جائے تو وہ زیادہ مؤثر تردید کا کام کرے گی۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے۔ یہ واقعہ ۱۴ جون کو دہلی ایئرپورٹ پر پیش آیا۔ وزیر اعظم ہند مسٹر نرسمہا راؤ سرکاری وزٹ پر عمان (مسقط) جارہے تھے۔ اس سفر کا مقصد یہ تھا کہ سرحد پار سے دہشت گردی کو روکنے کے لئے حکومت مسقط کا تعاون حاصل کیا جائے۔ اس تعاون کے جواب میں حکومت ہند نے مسقط کو جدید ٹکنالوجی کی تربیت دینے میں تعاون کی پیش کش کی۔

وزیر اعظم اپنے خصوصی ہوائی جہاز پر پوری ٹیم سمیت سوار ہوچکے۔ ہوائی جہاز کے دروازے

بند کر دئے گئے۔ قریب تھا کہ جہاز اپنے سفر پر روانہ ہو۔ اچانک معلوم ہوا کہ ایک صاحب (مسٹر نریندر) بھی جہاز کے اندر بند ہو گئے ہیں جو وزیر اعظم کے ساتھ جانے والے نہیں تھے اور صرف پہنچانے کے لئے جہاز کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ اس علم کے فوراً بعد ہوائی جہاز کے اندر اور باہر تیزی سے حرکت شروع ہو گئی۔ مخصوص سیڑھی واپس لائی گئی۔ جہاز کا پچھلا دروازہ دوبارہ کھولا گیا۔ اور مذکورہ صاحب جہاز کے باہر تشریف لائے (ملاحظہ ہو ذیل کی تصویر جو ہندستان ٹائمس ۱۵ جون ۱۹۹۳ سے لی گئی ہے)

جس ملک میں وزیر اعظم تک کے معاملہ میں کارکردگی کا یہ حال ہو، اس ملک میں عوام کو اگر سرکاری شعبوں میں ناقص کارکردگی کا تجربہ ہو تو اس پر نہ تعجب کرنے کی ضرورت ہے اور نہ افسوس کرنے کی ضرورت۔

اس سفر میں میرے ساتھ ڈاکٹر ثانی اثنین خاں بھی ہیں۔ روم سے میلان کے لئے روانگی

A flutter was caused at the airport in New Delhi on Monday as the ramp was brought back and the rear door of Prime Minister's special plane opened again minutes after it was closed. Out came P I O S Narendra who was not scheduled to accompany the Prime Minister but found himself locked in — PTI photo

ہوئی۔ روم سے میلان کی پرواز تقریباً ۴۵ منٹ کی ہے۔ ہم لوگ میلان پہنچے تو سہ پہر کا وقت تھا۔ جب کہ اس وقت دہلی میں رات ہو چکی تھی۔ ایئرپورٹ کے وی آئی پی لاونج میں کچھ وقت گزرا یہاں کانفرنس کے منتظمین سے پہلی ملاقات ہوئی۔ ان سے دیر تک میلان کی شہری اور تاریخی معلومات پر گفتگو ہوئی۔ ایئرپورٹ سے روانہ ہوئے تو گاڑی سیدھے ہوٹل نہیں گئی بلکہ شہر کے مختلف راستوں سے گزرتی ہوئی ہوٹل پہنچی۔ اس طرح پہلے ہی دن شہر کا بڑا حصہ دیکھ لیا۔

میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ ان ملکوں میں ہر چیز کا ایک معیار مقرر ہو گیا ہے۔ مثلاً سڑکوں پر کثرت سے گاڑیاں دوڑ رہی ہیں، مگر وہ نہ آواز نکالتیں اور نہ ہی ہارن بجاتیں۔ فٹ پاتھ پر کہیں خرید و فروخت کا منظر دکھائی نہیں دیتا۔ مکانات کی ایک خوبصورت وضع ہر جگہ برقرار رہتی ہے۔ دہلی میں کہیں لال بتی پر گاڑی کھڑی ہوتی ہے تو مانگنے والے اس کو گھیر لیتے ہیں۔ یہاں اس قسم کا منظر بھی کہیں نہ تھا۔ بدنظمی اور بے ترتیبی کی مثالیں بھی دکھائی نہیں دیں۔

عام لوگ جب ان چیزوں کو دیکھتے ہیں تو ان کو پہلا خیال یہ آتا ہے کہ ان کو بھی یہاں بسنے کا موقع مل جائے۔ مگر میرے دل میں ہمیشہ یہ تڑپ پیدا ہوتی ہے کہ ہمارا وطن بھی کاش ایسا ہی ترقی یافتہ ہو جائے۔ مگر سرگرمیوں کے طوفان میں ابھی تک ہمارے یہاں اس کی شروعات بھی نظر نہیں آتی۔

میلان میں میرا قیام ہوٹل (Hotel Palazzo Delle Stelline) کے کمرہ نمبر ۲۴۵ میں تھا۔ ۱۸ ستمبر کو عشاء کی نماز میں نے یہیں پڑھی۔ اس کے بعد سو گیا۔ جلد ہی گہری نیند آگئی۔ رات کو ایک عجیب اور نئے قسم کا خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے کہ ایک وقت آئے گا جب کہ تمہاری کتابیں بخاری کی کتاب کی طرح ہو جائیں گی۔

یہ خواب غالباً دونوں میں ایک ظاہری مشابہت کی بنا پر ہے۔ محمد بن اسماعیل البخاری (۱۹۴ - ۲۵۶ ھ) صاحب صحیح کے بارہ میں امام مسلم نے کہا تھا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ دنیا میں آپ کے مثل کوئی نہیں۔ آپ سے صرف اسی کو بغض ہو سکتا ہے جو حاسد ہو (البدایہ والنھایہ ۱۱/ ۶۶) اس عظمت کے باوجود حضرت امام کا یہ حال ہوا کہ وہ بخارا میں تھے کہ ایک گروہ کو ان سے تعصب ہو گیا۔ اس نے ان کے اوپر تہمتیں لگائیں یہاں تک کہ امام بخاری اپنے وطن سے نکل کر خرتنگ چلے گئے اور وہیں ان کی وفات ہوئی (الاعلام

۳۴/۶) مگر آخر کار صحیح بخاری دنیا کی مقبول ترین کتاب بن گئی۔ اسی طرح ان شاء اللہ ابتدائی مخالفتوں کے بعد وہ وقت آئے گا جب کہ یہ غبار ہٹے اور میری تحریریں مقبول عام تحریریں بن جائیں۔

مسیحیوں میں ایک سینٹ ایجی ڈیو (Egidio) گزرے ہیں۔ ان کا ابتدائی نام البورنو Gil Alvarez Carrillo de Albornoz) تھا۔ وہ ۱۳۱۰ میں اسپین میں پیدا ہوئے، ۱۳۶۷ میں اٹلی میں ان کی وفات ہوئی۔ انھوں نے سپاہی کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے بعد وہ چرچ سے وابستہ ہو گئے اور کارڈینال کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ اس زمانہ میں بعض وجوہ سے پوپ یازدہم (Pope Gregory XI) کو روم چھوڑ کر فرانس کے شہر اوگنوں (Avignon) چلا جانا پڑا تھا۔ سینٹ ایجی ڈیو اپنی خصوصی کوشش سے پوپ کو دوبارہ روم واپس لانے میں کامیاب ہوئے۔

انھیں سینٹ ایجی ڈیو کے نام سے ایک مسیحی تنظیم ہے جس کا صدر دفتر روم میں ہے۔ اس کا نام کمیونٹی آف سینٹ ایجی ڈیو (Community of S. Egidio) ہے۔ میلان کی انٹرنیشنل کانفرنس اسی کمیونٹی کی طرف سے کی گئی تھی۔

یہاں کی تاریخی شخصیتوں میں سے ایک گیان گالیزو وسکونتی (Gian Galeazzo Visconti) ہے۔ وہ ۱۳۵۱ء میں میلان میں پیدا ہوا۔ پچاس سال کی عمر کو پہنچ کر ۳ ستمبر ۱۴۰۲ء کو اچانک اس کی وفات ہو گئی۔

گیان گالیزو کا والد میلان کا نواب تھا۔ والد کی وفات کے بعد میلان کی سیاسی تقسیم ہوئی۔ نصف حصہ گیان گالیزو کو ملا اور بقیہ نصف اس کے بھائی برنابو (Bernabo) کے پاس رہا۔ برنابو نے فرانس سے تعلقات پیدا کر کے اپنی طاقت بڑھانا شروع کیا۔ اس کو گیان گالیزو نے اپنے لئے ایک سیاسی خطرہ سمجھا، اس نے گھات لگا کر برنابو کو گرفتار کر لیا اور اس کو قید خانہ میں ڈال دیا۔ برنابو ایک سال کے اندر ہی قید خانہ میں مر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ گیان گالیزو نے اس کو زہر دے کر مروایا تھا۔

اب گیان گالیزو کے لئے میدان خالی تھا۔ اس نے اپنی حکومت کو مستحکم کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اس نے پورے شمالی اٹلی میں غالب حیثیت حاصل کر لی۔ اپنی غیر معمولی صلاحیت کی بنا پر وہ

مسلسل اپنی حکومت کا رقبہ اور طاقت بڑھاتا رہا۔ کہا جانے لگا کہ وہ دن دور نہیں جب کہ وہ پورے اٹلی کا حکمراں بن جائے۔ مگر حکومت پر قبضہ کے ۴۴ سال گزرے تھے کہ وہ پلیگ میں مبتلا ہوا اور چند دن بیمار رہ کر مرگیا۔

یہی ہر شخص کی کہانی ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی کو صرف "۴۴ سال" ملتے ہیں، مگر ہر آدمی اس طرح عمل کرتا ہے گویا کہ وہ ۴۴ ہزار سال تک زندہ رہنے والا ہے۔ کسی بھی اگلے شخص نے اپنے پچھلے شخص سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔

نویں صدی عیسوی میں اغالبہ اٹلی کے جنوبی حصہ میں داخل ہوئے۔ یہ لوگ بڑھتے ہوئے ۸۴۶ میں روم تک پہنچ گئے۔ مگر روم کی مضبوط دیواروں کو عبور کرنا ان کے لئے ممکن نہ ہوسکا۔ اس لئے وہ یہیں سے واپس ہوگئے۔ ہوائی جہاز کے دور میں کوئی دیوار پیش قدمی میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ مگر قدیم زمانہ میں تمام بڑے بڑے شہر دیواروں سے گھرے ہوئے تھے، اور ان دیواروں کو عبور کرنا عام طور پر سخت دشوار ہوتا تھا۔

تاہم اٹلی کے ساحلی علاقہ باری (Bari) میں عربوں کی حکومت تقریباً ۳۰ سال تک قائم رہی۔ ۸۷۱ء میں عیسائیوں نے دوبارہ باری کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اٹلی میں مسلمانوں کا زور اس حد تک بڑھا کہ پوپ جان ہشتم (۸۸۲-۸۷۲) نے مسلم حکمرانوں کو خراج ادا کیا۔ سسلی پر مسلمانوں کا قبضہ ۸۲۷ میں شروع ہوا تھا جو تقریباً ۲۰۰ سال تک جاری رہا۔ مگر خاص اٹلی میں ان کا نفوذ زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ مسلمانوں کے جن فوجی سرداروں نے باری پر قبضہ کیا تھا، انھوں نے اپنے "سلطان" ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح وہ سسلی کی مسلم حکومت سے کٹ گئے:

Philip K. Hitti, 'History of Arabs, p. 605

یہ کمزوری آج بھی مسلمانوں میں بہت بڑے پیمانہ پر پائی جاتی ہے۔ جس مسلمان کو بھی کہیں موقع ملتا ہے وہ مرکز سے بغاوت کرکے شاخ پر قبضہ کرلیتا ہے۔ یہی واحد سب سے بڑا سبب ہے جس کی بنا پر مسلمانوں میں کوئی بڑا کام نہیں ہو پاتا۔

اٹلی ہی کا ایک حصہ جزیرۂ سسلی ہے۔ یہاں کے شہر پلرمو (Palermo) پر عربوں نے ۸۳۱ء

میں قبضہ کیا اور اس کے بعد پورے سسلی (صقلیہ) پر اپنی حکومت قائم کی۔ پلرمو اور سسلی کو انھوں نے ہر لحاظ سے ترقی دی۔ وہ تجارتی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ انھوں نے یہاں نئے زرعی طریقے رائج کئے۔ اور باغبانی کو غیر معمولی ترقی کے درجہ تک پہنچا دیا:

The city prospered under Muslim rule as an emporium of the rich trade with North Africa. New agricultural techniques were introduced, and luxuriant gardens were planted in the Conca d'Oro (13/930).

دور اول میں مسلمانوں کو عظمت کا جو مقام ملا اس کا راز "شمشیر و سنان" نہیں تھا۔ اس کا حقیقی راز صرف ایک تھا۔ اور وہ نفع بخشی تھا۔ دور اول کے مسلمان اہلِ عالم کے لئے نفع بخش بنے، اس لئے اہل عالم نے ان کو عزت اور سرداری کے مقام پر بٹھایا۔ موجودہ زمانہ کی مسلم نسلوں نے نفع بخشی کی صلاحیت کھودی ہے، اس لئے موجودہ زمانہ میں انھیں عزت و سرداری بھی نہ مل سکی۔ اب کھوئی ہوئی حیثیت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے ہمیں دوبارہ دوسروں کے لئے نفع بخش بننا پڑے گا۔ لفظی شور و غل یا منفی ہنگاموں سے کبھی مسلمانوں کو کچھ ملنے والا نہیں ہے۔ یہ قدرت کا قانون ہے، اور قدرت کے قانون میں تبدیلی ممکن نہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، مسلمانوں کی یلغار یورپ کی طرف جاری رہی۔ یہاں تک کہ وہ ویانا اور وینس (Venice) اور روم تک پہنچ گئے۔ ٹائم میگزین کا اسلام پر خصوصی الشو ۱۵ جون ۱۹۹۲ میں نکلا تھا۔

اس میں اس نے لکھا تھا کہ موجودہ مسلمان یورپ کی زیادتیوں کی شکایت کرتے ہیں، حالاں کہ مسلمانوں کے پورے دور اقتدار میں مسیحی دنیا اپنے آپ کو محاصرہ کے اندر محسوس کرتی تھی۔ ۶۳۲ میں پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد ایک صدی کے اندر مسلمانوں نے اسپین کو فتح کر لیا تھا اور وہ فرانس کے دروازہ پر دستک دے رہے تھے۔ شارلیمن کے باپ چارلس مارٹل نے تورس کی جنگ میں ان کی پیش قدمی کو روک دیا۔ تاہم ۱۴۵۳ میں عثمانی ترکوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا اور بلقان کے راستہ سے یورپ کی طرف بڑھنے لگے۔ ۱۶۸۳ میں ویانا کے ناکام محاصرہ نے ان کی مزید توسیع کو آخر کار روک دیا:

Yet if Muslims today see themselves as victimized by the West, for most of their history it was Christendom that felt under siege. Within a century of the Prophet's death in 632, the Moors had conquered Spain and were knocking on the doors of France. Charles Martel, father of the Frankish Emperor Charlemagne, stopped them at the Battle of Tours. By 1453, however, the Ottoman Turks had captured Constantinople and were marching through the Balkans toward the back door of Europe. The last, failed siege of Vienna in 1683 halted that expansion. (p.23)

پچھلے ہزار برس کی تاریخ کا بیشتر پہلا حصہ مسلم یلغار کا دور تھا۔ اس کا دوسرا حصہ مغربی یلغار کا دور ہے۔ یہ انصاف کے خلاف ہوگا کہ ابتدائی حصہ کو بھلا دیا جائے اور صرف آخری حصہ کو یاد رکھا جائے ۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کو قرآن کی اس آیت سے نصیحت لینا چاہئے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر تم کو کوئی زخم پہنچا ہے تو ان کو بھی اسی طرح کا زخم پہنچا ہے۔ اور ہم ان ایام کو لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں (آل عمران ۱۴۰)

میلان کی قدیم تاریخ سے جو واقعات وابستہ ہیں، ان میں سے ایک وہ ہے جو الرازی (۹۲۳ - ۸۶۵ء) سے متعلق ہے جو اسلامی تاریخ کا مشہور فلسفی اور طبیب تھا۔ الرازی کی ایک مشہور طبی تصنیف کتاب الطب المنصوری ہے۔ یہ کتاب اس نے دس جلدوں میں تیار کی تھی۔ اس کتاب کا ترجمہ لاتینی زبان میں گیرارڈ (Gerard of Cremona) نے کیا۔ یہ لاتینی ترجمہ پہلی بار میلان سے پندرھویں صدی کی ثمانینات میں شائع ہوا۔

گیرارڈ اٹلی کے شہر کریمونا میں ۱۱۱۴ء میں پیدا ہوا۔ یہ مقام میلان سے قریب ہے۔ گیرارڈ چاہتا تھا کہ وہ بطلیموس کی کتاب المجسطی کا ترجمہ لاتینی زبان میں کرے۔ اس وقت یہ کتاب صرف عربی میں دستیاب تھی۔ چنانچہ گیرارڈ عربی زبان سیکھنے کے لئے طلیطلہ (Toledo) گیا۔ وہاں عربی سیکھ کر اس نے المجسطی کا ترجمہ لاتینی زبان میں کیا۔ اس کے بعد وہ طلیطلہ میں رہ گیا۔ مسلم اسپین کے اسی شہر میں ۱۱۸۷ء میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے تقریباً ۸۰ عربی کتابوں کا ترجمہ لاتینی زبان میں کیا۔

یہ آٹھ سو سال پہلے کی بات ہے جب کہ یورپ کو خود اپنے علوم سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے عربی زبان کی ضرورت ہوتی تھی۔ آج یہ حالت ہے کہ دنیا کی اکثر یونیورسٹیوں اور لائبریریوں اور تحقیقی اداروں میں عربی زبان موجود ہے مگر زیادہ تر تاریخی اعتبار سے۔

اٹلی کی روشن خیالی (Enlightenement) کو عام طور پر بیساریا (Beccaria) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جس نے اپنی قوم کو یہ نعرہ دیا کہ زیادہ سے زیادہ تعداد کے لئے زیادہ سے زیادہ خوشی :

the greatest happiness for the greatest number.

مگر سوال یہ ہے کہ خود بیساریہ کو یہ تصور کہاں سے ملا۔ کیوں کہ اس سے پہلے رومن ایمپائر کے طویل دور میں اہل اٹلی صرف یہ جانتے تھے کہ ہم اپنے بادشاہ کی رعایا ہیں۔ ہمارا اپنا کوئی حق نہیں۔ ہمارے لئے بس وہی ہے جو تاجدار طبقہ ہمیں دیدے۔ اہل اسلام نے جب رومن ایمپائر کے مشرقی حصہ کو توڑا اور تمام انسانوں کی برابری کا انقلابی اعلان کیا، اس کے بعد ہی وہ وقت آیا جب کہ کوئی شخص یہ سوچ سکے کہ خوشی سب کے لئے ہے نہ کہ صرف کچھ لوگوں کے لئے۔

اٹلی کی تاریخ میں بہت سے سبق ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت مسیح کے ابتدائی شاگردوں کی تبلیغ سے اس علاقہ میں مسیحیت داخل ہوئی۔ مگر اس زمانہ کے رومی بادشاہوں ڈیسیس (Decius) اور ویلیرین (Valerian) نے اس کو اپنے قدیم مشرکانہ مذہب کے خلاف سمجھا جس میں سورج کو سب سے بڑے خدا کا مقام حاصل تھا۔ چنانچہ ان کے زمانہ میں مسیحیوں کی سخت تعذیب (Persecution) شروع ہوئی جو چوتھی صدی عیسوی کے آغاز میں تقریباً ۲۰ سال تک جاری رہی۔

مگر قسطنطین اول (Constantine I) مسیحیت سے متاثر ہو گیا۔ کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ اپنی ۳۱۲ء کی جنگ اس نے اس مسیحی مونوگرام کی وجہ سے جیتی ہے جو اس نے اپنی فوجوں کی ڈھال پر نقش کرائی تھی۔ اس کے بعد اس نے مسیحی مذہب قبول کر لیا۔ اور پوری مسیحی سلطنت میں مسیحیوں کے خلاف داروگیر ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس سلسلہ میں اس نے اس معاہدہ پر دستخط کئے جو میلان میں لکھا گیا تھا۔ اس لئے وہ (Edict of Miloan) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ زمانہ الناس علیٰ دین ملوکہم کا تھا۔ چنانچہ اس کے جلد ہی بعد مسیحیت سارے رومن ایمپائر میں پھیل گئی۔

چوتھی صدی عیسوی کے شروع میں مسیحیت رومن ایمپائر میں ایک مظلوم مذہب کی حیثیت رکھتی تھی۔ مگر اس صدی کے آخر میں مسیحیت نے رومن ایمپائر میں فاتح مذہب کی

حیثیت حاصل کرلی۔ یہ دنیا انقلابات کی دنیا ہے۔ یہاں کوئی صورتحال پیش آنے پر نہ کسی کے لئے فخر کا موقع ہے اور نہ کسی کے لئے مایوسی کا۔ ہر فخر یہاں آخر کار ٹوٹ جاتا ہے۔ اور ہر مایوسی آخر کار امید کے نئے واقعہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

یورپ میں جو ابتدائی میڈیکل کالج قائم ہوئے ان میں سے ایک میڈیکل کالج وہ ہے جو پندرھویں صدی عیسوی میں اٹلی کے شہر سلرنو (Salerno) میں قائم کیا گیا۔ اس میں ابوالقاسم (Abulcasis) کی کتاب بطور نصاب داخل کی گئی۔

ابوالقاسم الزہراوی (۱۱۰۶ - ۱۰۳۰) مشہور ترین عرب سرجن ہے۔ اس کا تعلق قرطبہ سے تھا۔ اس کی کتاب التصریف لمن عجز عن التالیف کا لاتینی ترجمہ گیرارڈ آف کریمونا نے کیا تھا۔ وہ ۱۴۹۷ میں وینس سے چھپا۔ اس کے بعد ۱۵۴۱ میں بیسل سے اور ۱۷۷۸ میں آکسفورڈ سے شائع ہوا۔ یہ کتاب صدیوں تک یورپ کے طبی اداروں میں خصوصی اہمیت کے ساتھ پڑھائی جاتی رہی ہے۔

ایک مستشرق کے الفاظ میں، الزہراوی کی اس کتاب کو یورپ میں اتنی زیادہ اہمیت حاصل ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس میں فن سرجری کے بارہ میں نئے خیالات (new ideas) موجود تھے۔ جو اس وقت کی کسی کتاب میں نہیں پائے جاتے تھے ——— اس دنیا میں نئے پن کی قیمت ہوتی ہے۔ جو شخص کوئی نیا تخلیقی آئیڈیا پیش کرے، وہ لازمی طور پر لوگوں کے درمیان قبولیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

ایک مسلم میگزین میں میں نے پڑھا کہ "اسلام اٹلی کا دوسرا سب سے بڑا مذہب ہے۔" یہ بظاہر بہت بڑی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت میں وہ اتنی بڑی نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اٹلی کی ۵۷ ملین آبادی میں کیتھولک عیسائیوں کا تناسب ۹۸ فیصد ہے۔ دو فیصد میں پروٹسٹنٹ عیسائی اور یہودی وغیرہ ہیں۔ اس دو فیصد آبادی میں مسلمانوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے، ان کی آبادی ملک میں تقریباً چار لاکھ ہے۔ اطالوی مسلمان زیادہ تر شمالی افریقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو روزگار کی تلاش میں یہاں آئے تھے۔

دوسری عالمی جنگ کے زمانہ میں جرمنی، اٹلی اور جاپان نے ایک مشترک فوجی محاذ بنایا۔

جس کو محوری اتحاد (Axis coalition) کہا جاتا تھا۔ انھوں نے تمام طاقتوں کے خلاف مکمل جنگ (total war) کا اعلان کیا (19/564)۔ اٹلی کے ڈکٹیٹر مسولینی نے اس سے پہلے ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۲کو میلان کی ایک خصوصی میٹنگ میں بتایا تھا کہ آج میں دل کے پورے اطمینان کے ساتھ آپ لوگوں سے کہتا ہوں کہ بیسویں صدی فاشزم کی صدی ہوگی۔ اطالوی طاقت کی صدی، ایک ایسی صدی جس کے دوران اٹلی تیسری بار عالم انسانیت کا قائد بن جائے گا:

On October 25, 1932, Mussolini assured a Milan audience of the world leadership of fascist Italy. Today, with a fully tranquil conscience, I say to you, that the twentieth century will be a century of fascism, the century of Italian Power, the century during which Italy will become for the third time the leader of mankind. (7/185)

میلان اپنی جغرافی خصوصیت کی بنا پر مسلسل مختلف قوموں کے حملوں کا شکار رہا ہے۔ رومیوں نے اس کو ۲۲۲ ق م میں گال (Gauls) سے چھینا۔ اس کے بعد بار بار وہ مختلف حملہ آوروں کی زد میں آتا رہا۔ تاہم میلان کے باشندوں کے لئے یہ صورت حال ایک فائدہ کا سبب بن گئی۔ ایک مورخ کے الفاظ میں، ذاتی تحفظ کی ضرورت نے اس کے باشندوں میں ہمت کی صفت پیدا کر دی۔ مزید یہ کہ وہ مال دار اور طاقت ور ہو گئے:

The need of self-protection developed courage in the Milanese, and they also grew rich and powerful. (p.205)

اس دنیا میں ہر ناموافق کے ساتھ موافق موجود ہے۔ تاہم ناموافق واقعہ میں موافق پہلو کو پانے کی ایک لازمی شرط ہے، وہ یہ کہ ایسے مواقع پر آدمی کسی بھی حال میں اپنے اندر شکایتی ذہن پیدا نہ ہونے دے۔

۱۹ ستمبر کے شام کے پروگرام میں میرا مقالہ تھا۔ اس اجلاس کا موضوع تھا: مذہبی بقاء باھم ہندستان میں:

Religious coexistence in India.

میں نے انگریزی میں اپنا مقالہ پڑھا۔ میرے علاوہ تین مقالے اور اس مجلس میں پڑھے گئے۔ ۲۱ ستمبر کی صبح کو اٹالین ٹی وی نے انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو کیتھولک یونیورسٹی کے ہال میں ریکارڈ

کیا گیا۔ سوالات کا تعلق کچھ موجودہ کانفرنس سے تھا اور کچھ ہندستان کے حالات سے۔

۱۸ ستمبر کو شام کا کھانا اجتماعی تھا۔ سب چیزیں اطالوی انداز کی تھیں۔ میں اپنے سادہ کھانے کا اتنا زیادہ عادی ہوگیا ہوں کہ اب دوسرے انداز کی چیزیں کھانا میرے لئے سخت مشکل ہوتا ہے۔

میرے ساتھ کھانے کی بڑی میز پر دوسرے تمام مسیحی حضرات تھے۔ ایک فادر روانی کے ساتھ عربی بول رہے تھے۔ اگرچہ لہجہ خالص عربی نہ تھا۔ میرے پاس ایک کرسی خالی تھی۔ اس پر ایک خاتون آکر بیٹھ گئیں۔ وہ مجھ سے عربی زبان میں سوالات کرنے لگیں۔ وہ بے تکلف عربی بول رہی تھیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ کا تعلق لبنان سے ہے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں اطالوی ہوں۔ میں نے روم کی یونیورسٹی میں عربی زبان پڑھی۔ پھر میں کئی سال تک شام میں رہی ہوں۔ اب میں روم کی یونیورسٹی میں عربی کے شعبہ میں استاد ہوں

مسیحیت کے مذہبی حلقہ میں کثرت سے ایسے لوگ ہیں جو دوسری زبانوں میں مہارت رکھتے ہیں۔ جبکہ مسلمانوں کے مذہبی حلقہ میں ایسے لوگ شاذ و نادر پائے جاتے ہیں۔ اور شاذ کا کوئی اعتبار نہیں، کیوں کہ الشاذ کالمعدوم۔

۱۹ ستمبر کو صبح کے ناشتہ پر الجزائر کے دو تعلیم یافتہ مسلمانوں سے ملاقات ہوئی۔ وہ کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ الجزائر میں اس وقت امن و امان مفقود ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک صاحب الجزائر چھوڑ کر دوسرے ملک میں چلے گئے ہیں۔ اور دوسرے صاحب وہیں ایک یونیورسٹی میں استاد ہیں۔

انھوں نے کہا کہ الجزائر کی حکومت ایک علمانی حکومت ہے۔ اور اس کے خلاف موجودہ تحریک ایک اسلامی تحریک ہے۔ اس کا مقصد عدل کی حکومت قائم کرنا ہے۔ مگر اس حکومت کو امریکہ اور دُوَلِ یورپ کی تائید حاصل ہے۔ مسلم ممالک بھی اس کے ساتھ ہیں۔ الجزائر کی فوج کے اعلیٰ افسران بھی حکومت کے ساتھ ہیں۔ چنانچہ وہ اسلامی تحریک پر ظلم کرنے میں پوری طرح جری ہوگئے ہیں۔ انھوں نے الجزائر کی کئی مسجدیں یہ کہہ کر ڈھادیں کہ ان کے اندر حکومت کے خلاف تقریریں ہوتی ہیں اور انقلاب کی سازشیں کی جاتی ہیں۔ یہ مسجدیں اب

تک کھنڈر کی صورت میں پڑی ہوئی ہیں۔

مزید گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ یہ وہ خروج نہیں ہے جو شریعت میں حرام ہے۔ کیوں کہ امام عادل کے خلاف خروج حرام ہے، جب کہ الجزائر کے حکمراں ظالم اور جائر ہیں۔ مگر یہ شرط صحیح نہیں۔ خروج (سیاسی بغاوت) کا مسئلہ عادل اور غیر عادل کے فرق پر مبنی نہیں ہے بلکہ قائم شدہ اور غیر قائم شدہ کے فرق پر مبنی ہے۔ جو حکومت عملاً قائم ہو جائے خواہ وہ کسی کے نزدیک عادل ہو یا غیر عادل، اس کے خلاف خروج لازماً حرام ہوگا۔ اس اعتبار سے الجزائر اور مصر وغیرہ ملکوں میں اسلام کے نام پر سیاسی بغاوت کی جو تحریکیں چل رہی ہیں وہ شرعی مسئلہ کے اعتبار سے سراسر ناجائز ہیں۔ کیوں کہ یہ تحریکیں قائم شدہ حکومتوں کے خلاف چلائی جا رہی ہیں۔

۱۹ ستمبر کی شام کو میلان کے سب سے بڑے تھیٹر میں افتتاحی اجلاس ہوا۔ یہ ایک عالمی شہرت یافتہ تھیٹر ہے جو ۱۷۷۶ میں تعمیر کیا گیا تھا۔ وہ غیر معمولی عظیم ہے۔ زیادہ بڑی بڑی تقریبات اسی کے اندر انجام پاتی ہیں۔ افتتاحی اجلاس میں تین بڑی تقریریں ہوئیں۔ مقررین میں سابق سوویت یونین کے سابق حکمراں گورباچیف بھی شامل تھے۔

میری سیٹ پہلی صف میں دائیں طرف تھی۔ اس لئے میں گورباچیف کو بہت صاف دیکھ سکتا تھا۔ مسیحی دنیا میں گورباچیف کا استقبال غالباً اس لئے ہوا ہے کہ اس کی پالیسی کی وجہ سے سابق سوویت یونین میں چرچ کو آزادی ملی اور مقفل چرچ دوبارہ کھول دئے گئے۔

پہلے یہاں کی رسم کے مطابق بعض خاص تقریبات ہوئیں میری سیٹ کا نمبر ۱۱ تھا اور گورباچیف کا نمبر ۱۴۔ گورباچیف اپنی اہلیہ کے ساتھ ہال میں داخل ہوئے۔ وہ پہلی صف میں میرے قریب پہنچے تو مجھ سے اور چند لوگوں سے مصافحہ کیا۔ ان کا چہرہ بظاہر سوکھا ہوا تھا۔ تاہم انھوں نے مصافحہ کرتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔ جب میں نے گورباچیف کو قریب سے دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک دیکھے ہوئے شخص کو دیکھ رہا ہوں۔ کیوں کہ اخباروں کی تصویروں میں بار بار میں ان کو دیکھ چکا تھا۔ مجھے قرآن کی وہ آیت یاد آئی کہ واُتوا بہ متشابھا (بقرہ ۲۵) میں نے اس سے پہلے گورباچیف کو نہیں دیکھا تھا مگر میں نے ان کی تصویر کو دیکھا تھا۔ اسی طرح اہل جنت نے اگرچہ اس سے پہلے

جنت کو نہیں دیکھا ہو گا مگر انھوں نے اس کی تصویر کو دیکھا ہو گا۔ موجودہ دنیا کی ہر نعمت دراصل نعمت جنت کی ایک تصویر ہے۔

آخر میں گوربا چیف نے روسی زبان میں تقریر کی۔ میں نے اس کا انگریزی ترجمہ سنا۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ آج کی دنیا کی طاقت ہتھیار نہیں ہے بلکہ ریزن ہے۔ یہ بات ایک ایسا شخص کہہ رہا تھا کہ جو تاریخ کے ہولناک ترین ہتھیاروں کا مالک رہ چکا ہے۔

کانفرنس میں ایک عرب شیخ سے ملاقات ہوئی۔ فلسطینیوں کی طرف سے اسرائیل کے اعتراف کا ذکر ہوا۔ میں نے کہا کہ تمام عرب ممالک اس پر چپ ہیں۔ کسی نے بھی اس کی مذمت نہیں کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ راضی ہیں۔ انھوں نے پرمسرت چہرہ کے ساتھ کہا: انا فرحان، واللہ انا فرحان (میں خوش ہوں، بخدا میں خوش ہوں) اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ پچاس سالہ ٹکراؤ کے نتیجے میں ان کا سب کچھ کھو یا گیا تھا۔ ان کے لئے نہ امن تھا، نہ رہنے کی جگہ اور نہ معاش کا انتظام۔ ایسی حالت میں ان کے لئے کوئی اور صورت باقی نہیں رہی تھی۔

میں نے پوچھا کہ کیا آپ کے نام کے ساتھ آپ کی اس رائے کو اپنے سفرنامہ میں لکھ سکتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ نہیں نہیں (لا لا)

مجھ میں اور دوسروں میں یہی فرق ہے۔ میں جو حالات سے موافقت کی بات کرتا ہوں وہ کسی بھی درجہ میں تنہا میری رائے نہیں ہے۔ وہی تمام باشعور مسلمانوں کے دل کی آواز ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دوسرے لوگ صرف نجی ملاقاتوں میں اس کا ذکر کرتے ہیں، وہ اس کے لئے اعلان کی ہمت نہیں کرتے۔ جب کہ میرا معاملہ یہ ہے کہ جو کچھ میرے دل میں ہوتا ہے وہی میری زبان پر بھی ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس دہرے معیار کا تحمل نہیں کر سکتا کہ میرے دل میں کچھ اور ہو اور میری زبان پر کچھ اور۔

۲۰ ستمبر کو کانفرنس کے تمام شرکا چھ گروپ میں بانٹ دئے گئے۔ ہر گروپ کے لئے الگ الگ موضوع مقرر کر دیا گیا۔ یہ پروگرام یہاں کی مشہور کیتھولک یونیورسٹی میں تھا۔ یونیورسٹی کے طلبہ نیز شہر کے لوگ بڑی تعداد میں ان پروگراموں میں شریک ہوئے۔ ایک گروپ کا موضوع وسط ایشیا میں امن تھا۔ میں اس میں شریک ہوا۔

اس میں مختلف ملکوں کے یہودی علماء بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ ایک یہودی ربی نے کہا کہ واشنگٹن میں اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان امن کا جو عمل شروع ہوا وہ بہت مشکل ہے۔ تاہم امید ہے کہ خدا کی مدد سے امن کی کوشش کرنے والے اپنی کوشش میں کامیاب ہوں گے:

By the help of God, peace makers will make it.

۲۰ ستمبر کو شام کا کھانا میلان کے پرانے قلعہ میں تھا۔ یہ قلعہ چودھویں صدی عیسوی میں بنایا گیا تھا مگر ابھی تک وہ نہایت اچھی حالت میں ہے۔ اس میں ایک میوزیم قائم ہے۔
یہاں مختلف لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ایک دکتور کمال الشریف تھے جو اردن سے آئے تھے۔ وہ فرانسیسی زبان جانتے تھے۔ انھوں نے فرانس کے مشہور مصنف اینڈرے مالراکس (Andre Malraux) کے بارہ میں بتایا کہ اس نے کہا ہے کہ اکیسویں صدی یا تو مذہبی صدی ہوگی یا سرے سے اس کا وجود ہی نہ ہوگا:

القرن الواحد والعشرون اما ان یکون قرن الدین او لا یکون

یہ بات نہایت درست معلوم ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ حالات بظاہر پہلے امکان کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ کیوں کہ ساری دنیا میں بہت بڑے پیمانہ پر مذہب کا احیاء جاری ہے۔ حالات انسان کو تیزی سے مذہب کی طرف لے جا رہے ہیں۔ پہلے مرحلے میں بظاہر ہر مذہب ابھرے گا۔ اس کے بعد انسان صحیح تر مذہب کی تلاش کرنا چاہے گا۔ اور یہ دوسری کوشش اس کو "دین محفوظ" تک پہنچانے کا سبب بن جائے گی۔

۲۱ ستمبر کی صبح کو دوبارہ مجھے چھ پینل میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ میں نے اس پینل کا انتخاب کیا جو بوسنیا کے مسئلہ پر تھا۔ ہال میں پہنچا تو وسیع ہال پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ غالباً آج سب سے زیادہ لوگ اس کو سننے کے لئے آئے تھے۔ حاضرین میں سے کثیر تعداد شہر کے لوگوں کی تھی۔

مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔ زیادہ تر تقریریں انگریزی میں ہوئیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ بوسنیا کا مسئلہ یورپ کی امیج کے لئے فنڈ منٹل انجری کے ہم معنی ہے۔ یہ کوئی مذہبی مسئلہ نہیں۔

بوسنیا کی ٹریجڈی کا کچھ بھی تعلق مذہب سے نہیں ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ اسلام سولھویں صدی میں بوسنیا میں پھیلا۔ ایک صاحب نے کہا کہ :

It is nothing to do with the gospel. It is not a religious conflict; but a political one

ایک صاحب نے کہا کہ مارشل ٹیٹو نے ساری دنیا کو دھوکہ دیا۔ اس نے پورے یوگوسلاویہ کو ایک نیشن بتایا۔ حالاں کہ وہاں مختلف گروہ تھے، کوئی ایک نیشن نہیں تھی۔ ایک صاحب نے کہا کہ بوسنیا میں آرمی پوری طرح سرب کے ہاتھ میں تھی۔ یہ مسئلہ اس لئے اتنا بڑھا کہ آرمی سب کی سب سرب پر مشتمل ہے۔ ایک صاحب نے کہا کہ کیتھولک چرچ مسلمانوں کے خلاف نہیں ہے۔ وہ صرف زیادتی (atrocity) کے خلاف ہے۔ ایک پادری نے کہا کہ بوسنیا میں صرف مسلمان ہلاک نہیں ہو رہے ہیں بلکہ کرسچین بھی بڑی تعداد میں ہلاک ہو رہے ہیں۔ انھوں نے جذباتی انداز میں کہا :

Where is the conscience of mankind.

ایک پادری نے کہا کہ میں اپنے گھر میں عبادت اور دعا میں مشغول تھا کہ مسلح افراد کا ایک گروہ میرے گھر میں داخل ہوا۔ انھوں نے پوچھا کہ تم کیا کر رہے ہو۔ میں نے کہا کہ میں دعا کر رہا ہوں۔ انھوں نے پوچھا کہ کس کے لئے۔ انھوں نے جواب دیا کہ اے میرے بچو، تمھارے لئے۔ وہ لوگ باہر نکلے اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ان کو چھوڑ دو۔ انھیں کچھ نہ کہو۔ ان کو یقین نہیں تھا کہ کوئی اپنے دشمن کے لئے نیک دعا کر سکتا ہے۔ وہ لوگ واپس چلے گئے۔

اس کانفرنس میں بوسنیا کے ایک عالم شیخ یعقوب سلیموسکی بھی شریک تھے۔ آجکل وہ مقدونیہ (Macedonia) میں مقیم ہیں۔ وہ ادھیڑ عمر کے ہیں اور روانی کے ساتھ عربی زبان بولتے ہیں۔ ان کا مقدونیہ کا ٹیلیفون نمبر یہ ہے: 38-91-255650 انھوں نے عربی میں تقریر کرتے ہوئے کہا :

مارچ ۱۹۹۲ میں بوسنیا کے مسلمانوں کے خلاف ظلم شروع ہوا۔ بوسنیا کی حیثیت پہلے منطقہ عسکریہ کی تھی۔ چنانچہ وہاں نہایت طاقت ور یوگوسلاوی فوج موجود تھی جس میں بیشتر سرب سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ یورپ کی پانچویں سب سے بڑی فوج تھی۔ ہر یورپی ملک میں مسلمان موجود ہیں۔ مگر بوسنیا و ہرسک میں یورپ کو مسلمانوں کا وجود برداشت نہیں۔ کیوں کہ ہم وہاں عالم اسلامی کا جزء

لا تجزیٰ بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ آغاز جنگ سے پہلے یہاں دو ملین مسلمان تھے۔ یورپ یہاں کے مظلوم مسلمانوں کو مقابلہ کی اجازت بھی نہیں دے رہا ہے۔ غیر سربیوں کو ختم کرنا، یہ سرب کا مقصد ہے۔ موجودہ آرمی جو کیمونسٹ دور میں بنی تھی اس میں بیشتر افراد ملحد اور مذہب مخالف ہیں۔

شیخ یعقوب سیلموسکی کی جذباتی تقریر کو تمام حاضرین آلات کے ذریعہ انگریزی اور اطالوی زبان میں سن رہے تھے۔ انھوں نے تقریر ختم کی تو ہال میں دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ کسی اور کی تقریر پر اتنی تالی نہیں بجی۔ انھوں نے کہا: مجھے یقین ہے کہ یہ تالیاں ہمارے نقطۂ نظر کی پرجوش تائید کر رہی ہیں۔

۲۲ ستمبر کو آخری اجلاس تھا۔ صبح سے دوپہر تک کے اجلاس میں لوگوں نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ اور آخر میں امن کے قیام کے موضوع پر تجویز پیش ہوئی اور منظور ہوئی۔

دوپہر بعد حسب روایت "پریر" کی تقریب تھی۔ یعنی امن کے قیام کے لئے اجتماعی دعا۔ مختلف مذہب کے لوگوں کے لئے الگ الگ جگہیں متعین کی گئی تھیں۔ ہمیں ایک چرچ تک پہنچایا گیا۔ یہاں چرچ کی عمارت کے وسیع حصہ کو خالی کر کے مسجد کے انداز میں بنایا گیا تھا۔

امن عالم کے لئے یہ ساتویں انٹرنیشنل مٹینگ تھی۔ اس سے پہلے اس قسم کی مٹینگ اسپین، روم، وارسا، باری، مالٹا، بروسیلز میں ہو چکی ہے۔ اب یہ ساتویں مٹینگ میلان (اٹلی) میں ہوئی ہے۔ ان عالمی اجتماعات میں مخصوص تقریب کے دوران اس کے شرکاء امن کی اپیل پر دستخط کرتے ہیں۔

شیخ یعقوب سیلموسکی کا پتہ یہ ہے:

S. Selimoski Yakub, Rijpset Islamike Ajednice, Sarajeyo (B.H.)

۲۲ ستمبر ۱۹۹۳ کو میلان کے جس وسیع مکان میں مسلمانوں کے لئے اجتماعی عبادت کا پروگرام رکھا گیا تھا۔ اس کے ایک کمرہ میں کانفرنس کے مسلم شرکاء جمع ہوئے۔ سب کی فرمائش پر شیخ یعقوب سیلموسکی نے بوسنیا کے موجودہ حالات پر ایک تقریر کی۔ یہاں سامعین سب مسلمان تھے۔ ابتدائی تقریر میں انھوں نے صرف مسلمانوں پر ہونے والے مظالم بیان کئے۔ تقریر کے بعد لوگوں نے سوالات کئے۔ سوال وجواب کے دوران انھوں نے کئی نئی باتیں بتائیں۔

ایک شخص نے کہا کہ موجودہ حالات کا تقابل ماضی کے حالات سے کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بوسنیا کے مسلمانوں نے بہتر حالت سے بری حالت کی طرف چھلانگ لگائی ہے۔ شیخ نے اقرار کیا اور کہا کہ ہاں، لوگوں نے غلطیاں بھی کیں (طبعا كانت هناك أخطاء) انھوں نے کہا کہ جنگ چھڑنے سے پہلے وہاں جذباتی تحریک (حركة عاطفية) پائی جارہی تھی نہ کہ عقلی تحریک (حركة عقلية)۔ مسلمانوں کے پاس کوئی عسکری طاقت نہ تھی جب کہ بوسنیا میں نہایت طاقتور سرب فوج موجود تھی۔ اسی فوج نے اعلان آزادی کے بعد مسلمانوں کو مارنا شروع کیا۔

شیخ یعقوب کی تقریر سننے کے بعد میں نے ایک عرب عالم (شیخ سکوتہ) سے کہا کہ جب بوسنیا میں سرب کی طاقت ور فوج موجود تھی اور مسلمانوں کے پاس کوئی طاقت نہ تھی تو انھوں نے حالات کا لحاظ کئے بغیر آزادی کا اعلان کیوں کر دیا۔ شیخ نے کہا (غفلة كبيرة)

میلان میں ایک بہت بڑا ادارہ ہے جس میں چرچ بھی ہے اور اس کے علاوہ مختلف قسم کی سماجی اور معاشی اور تعلیمی سرگرمیاں جاری ہیں۔ اس میں اسی ہزار طلبہ کے قیام کا انتظام ہے۔ اس کا نام یہ ہے:

Parrocehia S. Giovanni B. alla Creta

ان کی طرف سے پیغام ملا کہ وہ اپنے یہاں ایک خطاب رکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہاں کے عیسائی لوگ اسلام کے بارہ میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ آپ آکر انھیں بتائیں کہ اسلام کیا ہے۔ میں نے ان کی دعوت قبول کر لی۔

۲۱ ستمبر کی شام کو فادر تارونی (Massimiliano Taroni) اپنے وقت پر آگئے۔ ان کے ساتھ ہم تین آدمی روانہ ہوئے۔ میں، ثانی اثنین اور ڈاکٹر اندریا دلوکا۔ رات کا کھانا ان کے یہاں کھایا گیا۔ کھانا اور ڈائننگ ہال اور اس کی ہر چیز سادہ مگر انتہائی صاف ستھری تھی۔ کھانے کے بعد ان کے ہال میں پروگرام ہوا۔ پورا ہال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ یہ پروگرام اچانک بنا تھا۔ میں نے ۲۰ ستمبر کی شام کا اجلاس چھوڑ دیا۔ اور اپنے کمرہ میں بیٹھ کر پانچ صفحہ پر مشتمل انگریزی میں ایک تقریر تیار کی۔ اس میں قرآن وحدیث کی روشنی میں اسلام کی سادہ تشریح کی گئی تھی۔ لوگوں نے غیر معمولی دلچسپی لی۔ میری تقریر لے کر کئی لوگوں نے پوری طور پر فوٹو کاپی کر کے حاصل کیا۔ تقریر کے بعد ایک

درجن سے زیادہ سوال کئے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ میں ہر سوال کا جواب انگریزی میں دیتا تھا اور ڈاکٹر اندریا دلوکا اس کو اطالوی زبان میں کہتے تھے۔ لوگوں نے اس پروگرام سے بے حد خوشی کا اظہار کیا۔

مندوبین میں میرے اور ثانی اثنین کے سوا سب کے سب عیسائی تھے۔ ان کے سوالات سب کے سب وہ تھے جو غیر مسلم کے ذہن میں اسلام کے بارہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ لوگوں کے تاثر سے اندازہ ہوا کہ اللہ کی توفیق سے ہر سوال کا اطمینان بخش جواب ان کو ملا۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ اسلام میں روزانہ کی عبادت کیا ہوتی ہے۔ میں نے نماز کا ذکر کرتے ہوئے پوچھا کہ آپ میں سے کسی نے کیا کبھی کسی مسلمان کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ سب نے کہا کہ نہیں۔ پھر میں نے نماز کا مختصر تعارف کرایا اور اس کے بعد اسٹیج پر کھڑے ہو کر ایک رکعت مکمل طور پر عملی صورت میں ادا کی۔

ایک خاتون نے کہا کہ اسلام نے عورت کو کیا درجہ دیا ہے۔ میں نے کہا کہ جہاں تک عزت اور احترام اور حقوق کا تعلق ہے تو اسلام میں عورت اور مرد کا درجہ یکساں ہے۔ البتہ دونوں میں حیاتیاتی فرق کی بنا پر دونوں کا ورک پلیس الگ الگ رکھا گیا ہے۔ مزید سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے حج کی مثال دی۔ میں نے کہا کہ حج کا ایک رکن صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا ہے۔ یہ دوڑنا ایک عورت کے طریقہ کی پیروی ہے۔ تمام حاجی خواہ وہ امیر ہو یا غریب، بادشاہ ہو یا رعایا، سب کے سب یہاں عورت کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "عورت پہلے" کے اصول کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ شاندار انداز میں اسلام میں قائم کیا گیا ہے۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ انڈیا میں مسلمانوں کا حال کیسا ہے۔ میں نے کہا کہ انڈیا میں مسلمان آزاد ہیں اور وہاں ہر قسم کی اسلامی سرگرمیاں آزادانہ طور پر جاری ہیں۔ کسی بھی اسلامی معاملہ میں کوئی پابندی نہیں۔

مثال دیتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ نے شاید بابری مسجد کو ڈھائے جانے کا قصہ اخبار میں پڑھا ہو۔ کیوں کہ میڈیا نے اس کا بہت زیادہ پرچار کیا۔ مگر یہی کل بات نہیں۔ میں نے کہا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں ہمیشہ عسر کے ساتھ یسر بھی موجود رہتا ہے۔ یعنی

ڈس ایڈوانٹج کے ساتھ یہاں ایڈوانٹج بھی ضرور پایا جائے گا۔ اور انڈیا یقینی طور پر کوئی مستثنیٰ ملک نہیں۔ چنانچہ انڈیا میں اگر ایک بابری مسجد ڈھائی گئی ہے تو اس کے بعد بھی انڈیا میں ساڑھے تین لاکھ مسجدیں باقی ہیں۔ اور وہاں پوری آزادی کے ساتھ عبادت کا عمل کیا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انڈیا میں اگر ایک عسر ہے تو عین اسی وقت وہاں یسر کی تعداد ساڑھے تین لاکھ ہے۔ اس لئے ہمارے لئے مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔

مرکز کے اس اجتماع میں ایک اطالوی نوجوان بھی موجود تھا۔ ان سے پہلی ملاقات یہیں ہوئی وہ سائنس کے مضمون میں پوسٹ گریجویٹ کا کورس کر رہے ہیں۔ وہ ایک سادہ فطرت نوجوان تھے۔ اسلام سے کچھ واقفیت ہوئی۔ اس سے وہ متاثر ہوگئے۔ اب وہ اسلام کے برحق ہونے پر پوری طرح مطمئن ہیں۔ ان کے کمرہ میں اسلامی کتابیں سب سے زیادہ نظر آتی ہیں۔

وہ ابھی تک اپنے والدین کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی ماں کٹر مسیحی ہیں۔ ان کے اندر تڑپ ہے کہ وہ باقاعدہ نماز ادا کریں۔ انھیں اندیشہ ہے کہ اگر انھوں نے نماز پڑھنا شروع کیا تو ان کی ماں سخت ناراض ہوگی اور پھر اس کے بعد انھیں غیر معمولی مشکلات پیش آئیں گی۔

کسی مسلمان سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اس نے ان کا کیس سننے کے بعد کہا کہ جب آپ اسلام کو اپنا مذہب مان چکے ہیں تو اب تمہارے لئے نماز پڑھنا ضروری ہے ورنہ تم جہنم میں جاؤ گے۔

وہ نوجوان اس سے بہت گھبرایا ہوا تھا۔ مجھ سے گفتگو ہوئی تو میں نے کہا کہ مذکورہ مسلمان نے آپ کو غلط بتایا۔ قرآن میں صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ انسان کے اوپر بقدر استطاعت ذمہ داری ہے۔ آپ کو جب موقع ہو پردہ میں نماز پڑھ لیں۔ مگر اعلان کے ساتھ آپ نماز نہ پڑھیں۔ فی الحال سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ آپ کی تعلیم مکمل ہو جائے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد آپ کہیں بھی رہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کے لئے اس قسم کا مسئلہ نہیں رہے گا۔

مذکورہ قسم کے مسلمانوں کے بارہ میں کم سے کم جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ وہ مسائل فقہ کو جانتے ہیں۔ مگر وہ مسائل دعوت کو نہیں جانتے۔

مغرب کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان بودساموت الحسین (۱۹۶۴) سے ملاقات ہوئی۔ ان کا اصل

نام الحسین ہے اور بودساموت خاندانی لقب ہے۔ دوسرے ملکوں میں خاندانی نام آخر میں ہوتا ہے اور مغرب میں فرانس کے اثر سے پہلے لکھا جاتا ہے۔ جیسے کہ میرا نام وحید الدین خان لکھا جاتا ہے۔ مغرب کے اصول پر لکھنا ہو تو اس کو خان وحید الدین لکھا جائے گا۔

بودساموت الحسین بولونیا میں رہتے ہیں جو میلان سے تین سو کیلومیٹر دور اٹلی کا ایک شہر ہے۔ پچھلی شام کو انھوں نے ٹی وی پر مجھ کو گوربا چیف سے ہاتھ ملاتے ہوئے دیکھا۔ اس سے انھیں معلوم ہوا کہ اس وقت میں میلان میں ہوں۔ وہ رات کو سفر کر کے صبح سویرے میلان پہنچے۔ اور ہوٹل میں مجھ سے ملاقات کی۔

انھوں نے بتایا کہ میں اطالویوں میں دعوت کا کام کر رہا ہوں۔ مگر اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خود مسلمان ہیں۔ نام نہاد مسلم جماعتوں کے لوگ یہاں ہر شہر میں موجود ہیں۔ وہ صرف ایک کام میں مشغول ہیں۔ مسلم حکمرانوں کے خلاف لوگوں کے جذبات ابھار کر مال جمع کرنا اور لیڈری حاصل کرنا۔ خالص دعوت کے کام کو وہ پسند نہیں کرتے کیوں کہ اس میں انھیں اپنی جڑ کٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس ملک میں بہت سے لوگ حق کے متلاشی ہیں۔ مگر وہ ان کے لئے ہدایت کا دروازہ بند کر رہے ہیں (وبهذا المنهج المنحرف يتم اغلاق ابواب الهداية عوض فتحها امام الباحثين عن الحق، وما أكثرهم)

میں نے کہا کہ آپ نے صحیح کہا۔ اسلامی تحریکات کے نام پر آجکل جو جماعتیں ہر جگہ کام کر رہی ہیں وہ اپنے منحرف فکر کی بنا پر صحیح اسلام کی راہ میں سخت رکاوٹ پیدا کر رہی ہیں۔ مگر آپ جیسے لوگوں کے لئے مایوسی کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ دشواریوں کے اضافہ سے اجر میں اضافہ ہوتا ہے (مع كثرة العراقيل يزداد الاجر)

ایک پروگرام میں شنتو مذہب کے عبادتی پروگرام کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک شخص سیدھا کھڑا ہوا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ باندھے۔ اس کے بعد وہ چند بار رکوع کے انداز میں جھکا۔ اس کے بعد چھوٹی سی کتاب لے کر اس سے پڑھنا شروع کیا۔ غالباً یہ دعا کی کتاب تھی۔

دوسرے مذاہب کی عبادت میں جھکنا ہے مگر سجدہ نہیں ہے۔ جھکنا اطاعت کی علامت ہے اور سجدہ قربت کی علامت۔ اسلام کے سوا دوسرے مذاہب کی عبادتیں اطاعت کا سبق دیتی ہیں مگر

وہ آدمی کو قربت خداوندی کا تجربہ نہیں کراتیں۔ یہ اسلام کی خاص صفت ہے، جیساکہ قرآن میں کہا گیا ہے واسجد واقترب۔

۲۲ ستمبر کی صبح کو اٹالین ٹی وی نے انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق انڈیا میں اسلام اور مسلمانوں سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہاکہ انڈیا میں مسلمانوں کے لئے ہر قسم کے مواقع موجود ہیں۔ اخباروں میں جو باتیں آتی ہیں وہ حقیقت سے زیادہ مبالغہ ہیں۔ میں نے مثال دیتے ہوئے کہاکہ اجودھیا کی مسجد مسلمانوں نے کھودی۔ مگر عین اسی زمانہ میں دہلی میں دو درجن مسجدیں غیر مسلموں کے قبضہ میں تھیں اور ان مسجدوں کو مسلمان دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس فرق کا سبب طریق کار کا فرق ہے۔ اجودھیا میں مسلم لیڈروں نے اپنی تحریک ٹکراؤ کے انداز میں چلائی اور دہلی کی مسجدوں کو واگزار کرانے کی تحریک پرامن انداز میں چلائی گئی طریق عمل کے اسی فرق کی وجہ سے مسلمانوں نے اجودھیا کی مسجد کھودی۔ اور دہلی کی مسجدوں کو حاصل کرلیا۔

ایک اور سوال کے جواب میں میں نے کہاکہ اسلام کا سب سے بڑا کنٹری بیوشن جدید دنیا کے لئے "ایک خدا اور ایک انسان" کا نظریہ ہے۔ یہ نظریہ ایک طرف آدمی کو صحیح ڈائرکشن دیتا ہے، اور دوسری طرف تمام انسانوں کو یکساں بنیاد پر متحد کرتا ہے۔

میلان میں ایک اور پرائیویٹ ٹیلیویژن (Tele Chiara) نے انٹرویو لیا۔ یہ کیتھولک ٹی وی کہا جاتا ہے۔ اس کا پورا نام یہ ہے:

Gestione Telecomunicazioni S.R.L.

انھوں نے مختلف سوالات کئے۔ میں نے انگریزی میں جواب دیا جس کا ترجمہ ڈاکٹر اندریا دلوکا (روم) اطالوی زبان میں کرتے رہے۔ ایک سوال یہ تھاکہ موجودہ پیس کانفرنس کے بارہ میں آپ کی رائے کیا ہے۔ میں نے کہاکہ یہ عالمی پراسس کا ایک حصہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں ساری دنیا میں ایک پراسس جاری ہوا ہے۔ ساری دنیا جنگ اور ٹکراؤ کے راستہ کو چھوڑ کر امن کے راستہ کی طرف جارہی ہے۔ یہ ایک عالمی پراسس ہے جو انسانی تاریخ میں جاری ہوا ہے۔ موجودہ کانفرنس اسی کا ایک حصہ ہے۔ اس طرح کا پراسس جب تاریخ میں جاری ہو جائے تو لازمی طور پر وہ اپنے نتیجہ تک پہنچ کر رہتا ہے۔

ایک اور سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ میں مشکلات کو چیلنج کے روپ میں دیکھتا ہوں۔ اسی لئے مجھے مشکلات کو دیکھ کر پریشانی نہیں ہوتی۔ قدرت نے ہماری ترقی کے لئے یہی راستہ مقرر کیا ہے۔ چیلنج نہیں تو ترقی بھی نہیں۔

میلان میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں مسلمان ہوں اور میں وینس (Venice) میں رہتا ہوں۔ انھوں نے اپنا نام ——— ایلی میناٹو دی الاّ (illuminatto de Alla) بتایا۔ یہ نام مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ پوچھنے پر انھوں نے کہا کہ یہ اصل نام کا اطالوی زبان میں ترجمہ ہے۔ میرا اصل نام ظہور احمد ہے۔

نام کے ترجمہ کا یہ طریقہ بہت عجیب ہے۔ یہ خطرناک بھی ہے۔ کیوں کہ چند نسلوں کے بعد ایسے لوگوں کا تشخص ہی ختم ہو جائے گا۔ وہ اسی کلچر میں ضم ہو جائیں گے جس کے زیر اثر انھوں نے اپنے نام کا یہ ترجمہ کیا تھا۔

۲۲ ستمبر کی شام کا کھانا "بشپ ہاؤس" میں تھا۔ یہ ایک محل نما عمارت ہے جو کئی سو سال پہلے بنائی گئی تھی۔ اس میں بشپ کی رہائش گاہ اور اس کے دفاتر واقع ہیں۔

۲۳ ستمبر کو میلانو سے واپسی تھی۔ فجر کی نماز یہاں کے ہوٹل میں پڑھی اور صبح سات بجے اپنے کمرہ سے نکلا۔ اس وقت بے اختیارانہ طور پر زبان پر یہ دعا جاری ہوگئی اَللّٰهُمَّ اَدْخِلْنِی مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِی مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّی مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَاناً نَصِيْراً

میلانو ایئرپورٹ پر پہنچنے میں بعض اتفاقی اسباب سے دیر ہوگئی۔ ہماری فلائٹ روانہ ہوگئی اور ہم اس پر سوار نہ ہوسکے۔ دوسری فلائٹ میں ہمارا نام ویٹنگ لسٹ میں تھا۔ وہ بھی نہ مل سکی۔ آخر تین گھنٹہ کی تاخیر سے تیسری فلائٹ لی گئی۔ اب یہ سوال تھا کہ لندن میں جو لوگ ہماری رہنمائی کے لئے آنے والے تھے ان سے ہم کیسے مل سکیں گے۔ اس احساس کو لئے ہوئے ہم برٹش ایئرویز کی فلائٹ ۲۳/۵۶۵ کے ذریعہ لندن ایئرپورٹ پر اترے تھے۔

میلان سے لندن کے راستہ میں لندن کا اخبار ٹائمس (The Times) کا شمارہ ۲۳ ستمبر ۱۹۹۳ دیکھا۔ اس شمارہ کے ساتھ ۱۶ صفحہ کا تین رنگ میں چھپا ہوا ضمیمہ شامل تھا جس کا نام سعودی عرب (Saudi Arabia) تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ پچھلے چند برسوں کے حالات کے نتیجہ میں

سعودی عرب میں " ماڈرنائزیشن " کا عمل تیزی سے جاری ہوگیا ہے جو یہاں کے ہر شعبہ میں محسوس طور پر نظر آتا ہے۔ ایک مضمون کا عنوان تھا :

Arabs count the cost of peace.

اس میں بتایا گیا تھا کہ ۱۹۷۹ میں ایران کے " اسلامی ریولیوشن " کے بعد سعودی عرب پہلے سے زیادہ امریکہ پر (dependent) ہوگیا۔ کیوں کہ اس انقلاب کے بعد ایران اسلامک ورلڈ کی لیڈرشپ حاصل کرنے کے لئے سعودیہ کا حریف بن گیا تھا۔ اب ویسٹرن ٹکنالوجی کے لئے ریاض کی ضرورت بہت بڑھ گئی۔ سعودی عرب ساری دنیا کے مسلمانوں کو بہت بڑی مالی امداد دیتا ہے۔ ۱۹۹۲ میں سعودیہ نے مختلف ملکوں کے مسلمانوں کو ۸۰۰ ملین پونڈ دئے۔ عراق۔ کویت جنگ میں سعودیہ نے ۳۷ بلین پونڈ خرچ کیا۔

سعودیہ نے اس سے پہلے عراق کی بڑے پیمانہ پر مالی مدد کی تھی۔ مگر ۱۹۹۲ میں جب سعودیہ پر عراقی میزائل (scud missiles) گرنے لگے تو معلوم ہوا کہ پیسہ اچھے تعلقات کے لئے کافی نہیں۔

اردن اور پی ایل او کو سعودی عرب سے بہت بڑی مالی امداد مل رہی تھی۔ مگر دونوں نے عراق کا ساتھ دیا۔ یمن کا بہت بڑا اقتصادی انحصار سعودی عرب پر تھا مگر وہ بھی عراق کا ساتھی بن گیا۔ اس پورے علاقہ میں ایران کا خطرہ ایک مستقل مسئلہ تھا۔ ان چیزوں نے سعودی عرب کو اس قطعی رائے تک پہنچا دیا کہ وہ عربوں یا مسلم ملکوں کے مقابلہ میں مغربی ٹکنالوجی کے ذریعہ اپنے آپ کو زیادہ محفوظ بنا سکتے ہیں۔

مغربی پریس کتنی مہارت کے ساتھ چیزوں کو پیش کرتا ہے، اس کی ایک مثال ٹائمس کا صفحہ ۴ کا ایک مضمون تھا۔ اس مضمون کے اوپر ایک تصویر دی گئی تھی جس کو ہم اس صفحہ کے نیچے نقل کر رہے ہیں۔ فلسطین کے ایک بے حد چھوٹے سے علاقہ میں اسرائیل نے فلسطینیوں کو محدود آزادی (limited autonomy) کا حق دیا ہے۔ یہاں فلسطینیوں نے ایک سرحدی دیوار پر جلی حرفوں میں یہ لکھ دیا ہے: پی ایل او کی مملکت میں خوش آمدید۔ اس کے ساتھ کیپشن میں لکھا ہوا تھا کہ شرق اوسط کی تاریخ کے ایک نازک موقع پر، تیل کی گرتی ہوئی قیمتوں اور خلیج کی جنگ کی قیمت نے سعودیوں اور فلسطینیوں کو نوشتۂ دیوار پڑھنے پر مجبور کر دیا ہے۔

فلسطینی سمیت پوری مسلم دنیا ستمبر ۱۹۹۳ سے پہلے فلسطین سے اسرائیلی حکومت ختم کرنے سے کم کسی بات کو سننے پر راضی نہ تھی۔ مگر آج اس کے محدود ٹکڑے پر وہ خوش آمدید کے الفاظ رقم کر رہے ہیں۔ شعوری فیصلہ کے تحت وہ حقیقت پسندی کو اختیار نہ کرسکے۔ مگر حالات کے دباؤ نے انھیں حقیقت پسندی کی روش اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔

یہی ساری دنیا میں مسلمانوں کا حال ہے۔ فیصلہ صرف وہ ہے جو شعور اور ارادہ کے تحت ظہور میں آیا ہو۔ دباؤ کے تحت کیا جانے والا فیصلہ کوئی فیصلہ نہیں۔ اور نہ ایسے فیصلہ کا کوئی دوررس نتیجہ کبھی برآمد ہو سکتا ہے۔

۲۳ ستمبر کو دو بجے لندن پہنچا۔ جہاز سے اتر کر ایئر پورٹ پر چلتے ہوئے ایک جگہ تین دروازے بنے ہوئے تھے۔ دو دروازوں پر لکھا ہوا تھا:

European Community Nationals

اور ایک کنارے کے دروازہ پر یہ الفاظ تھے:

All other passports

یہ صرف گزرگاہ کے لئے تھا۔ انتظامی ضرورت کے تحت ایسی تقسیم میں کوئی حرج نہیں مگر مجرد گزرگاہ کے لئے یہ تقسیم racism کی طرف لے جاتی ہے۔

جس فلائٹ سے ہمیں لندن پہنچنا تھا چوں کہ وہ میلان میں چھوٹ گئی اور ہم دوسرے جہاز سے لندن پہنچے۔ اس لئے لندن ایئر پورٹ پر جو لوگ ہماری رہنمائی کے لئے آئے تھے وہ مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔ اب ہمارے سامنے سوال یہ تھا کہ ان سے کس طرح ربط قائم کیا جائے۔ ہم نے برمنگھم میں جناب شمشاد خاں صاحب کو خبر دی کہ ہم لندن ایئر پورٹ پر ہیں۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ لندن کے ساتھیوں نے بھی شمشاد خاں صاحب سے برائے معلومات ربط قائم کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ہم لندن ایئر پورٹ پر پہنچ چکے ہیں۔ چنانچہ وہ دوبارہ ایئر پورٹ پر آئے اور آگے کے لئے ہماری رہنمائی کی۔ کیوں کہ ہمیں بذریعہ ٹرین وگن پہنچنا تھا۔

۲۳ ستمبر کی دوپہر کو، ہم برٹش ریلوے اسٹیشن ایوسٹن (Euston) پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ٹرین جلد ہی آنے والی تھی جس کے ذریعہ ہمیں وگن جانا تھا۔ اتنے میں پولیس کی وردی میں کئی

آدمی ظاہر ہوئے۔ انھوں نے بلند آواز سے کہنا شروع کیا۔ آپ لوگ اسٹیشن چھوڑ دیں۔ تمام لوگ اپنا سامان لے کر باہر آگئے۔ پولیس والے مزید ان کو دور جانے کی ہدایت کرتے رہے۔ آخر کار دور کے ایک فاصلہ پر سب لوگ جمع ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ کسی نے ٹیلیفون پر بم کی اطلاع کر دی۔ کچھ دیر کے بعد پولیس والوں نے ہری جھنڈی دکھائی اور تمام لوگ دوبارہ اسٹیشن کے اندر آگئے۔ تاہم اس درمیان میں ہماری پہلی گاڑی چھوٹ چکی تھی۔

اکثر افواہیں غلط ہوتی ہیں۔ یہ بار بار کا تجربہ ہے۔ اس کے باوجود ہر افواہ پر لوگ دوڑ پڑتے ہیں۔ ہر افواہ کو صحیح گمان کر لیتے ہیں۔

میں اسٹیشن پر ٹرین کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک روشن بورڈ پر نظر پڑی۔ اس پر لکھا ہوا تھا۔ کیا آپ کا مقصد بزنس میں کامیابی حاصل کرنا ہے۔ اس وقت آپ اپنے نشانہ سے صرف دو سو میل کے فاصلہ پر ہیں:

Aiming for business success?
Right now you're about 200 miles off target.

ڈگن میں میرا قیام ایک عرب نوجوان کے مکان پر تھا۔ یہ مکان انھوں نے ایک ہفتہ کے لئے خالی کر دیا تھا۔ یہاں نصف درجن نوجوان جمع تھے۔ ان کے ساتھ دن اور رات کو مجلس کی صورت میں گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ گفتگو کی صورت یہ تھی کہ میں اپنی بات عربی میں کہتا تھا جس کو وہ لوگ بیک وقت ٹیپ ریکارڈر پر ٹیپ کرتے رہتے تھے اور ساتھ ہی کاغذ پر لکھتے جاتے تھے۔ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد میں ان کی لکھی ہوئی تحریر کو سنتا تھا۔ اگر اس میں کوئی تعبیری فرق ہوتا تو اس کو درست کر دیتا۔ اس طرح یہ سلسلہ ۲۳ ستمبر کی شام سے آخر وقت تک مسلسل جاری رہا۔

اس درمیان بہت سی دینی و ملی و تاریخی باتیں زیر بحث آئیں۔ کثیر تعداد میں سوالات ہوئے جن کا جواب میں دیتا رہا۔ خود میرے پاس تو اس کا ریکارڈ موجود نہیں مگر ان عرب نوجوانوں کے پاس تمام چیزوں کا مکمل ریکارڈ ٹیپ یا تحریر کی صورت میں موجود ہے۔ وہ لوگ ان کو دوبارہ مرتب کر کے دوسرے عرب نوجوانوں تک پہنچائیں گے۔ ان ملاقاتوں میں میری خاص کوشش یہ رہی کہ دور جدید کے اعتبار سے اسلام کو واضح کروں اور لوگوں کو یہ بتاؤں کہ اسلام

کا اصل اقدامی عمل دعوت ہے۔

وگن (Wigan) برطانیہ کا ایک شہر ہے جو گریٹر مانچسٹر میں شامل ہے۔ وہ دریائے ڈگلس کے کنارے واقع ہے۔ وہ رومن عہد میں ۱۱۰۰ء میں بنایا گیا۔ اٹھارویں صدی میں صنعتی دور کا آغاز ہوا تو اس کے بعد وگن کو کافی ترقی ہوئی۔ یہاں کوئلہ اور کپاس اور لوہے کی صنعتیں قائم ہوئیں۔

مغرب کا فیملی اسٹرکچر ہندستان کے فیملی اسٹرکچر سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندستان کا بچہ "ہم" کی اصطلاح میں سوچتا ہے، جب کہ مغرب کا بچہ "میں" کو جانتا ہے۔ مغرب کے بچہ کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ میں ہی سب کچھ ہوں:

'I' am the only one who matters.

مغرب کا پورا ماحول اسی آزادانہ انفرادیت کا مبلغ ہے۔ آزادی یا انفرادیت بذات خود غلط نہیں۔ مگر ہر چیز اپنی حد سے تجاوز کرنے کے بعد غلط ہو جاتی ہے۔ اور مغرب اس معاملہ میں آخری حد سے بھی زیادہ تجاوز کر چکا ہے۔ بظاہر حالات مستقبل قریب میں اس کی واپسی کا امکان نہیں۔

مغربی ملکوں میں جو مسلمان آباد ہیں ان کی تعداد تقریباً ۱ ملین ہے۔ ان میں سے نصف تعداد یورپ میں ہے اور نصف تعداد شمالی امریکہ میں۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ آپ کے اکابر نے اس نام پر قربانی دی کہ مغرب ہمارا دشمن ہے۔ اس کو مسلم ملکوں سے نکالنا ضروری ہے۔ مگر بے شمار قربانی کے بعد جب ان مغربی قوموں کا سیاسی اخراج ہو گیا تو ان اکابر کی اگلی نسل خود ہی دوڑ کر اہل مغرب کے ملکوں میں جا بسی۔ اب یہ بتائیے کہ آپ کے اکابر غلط تھے یا آپ لوگ غلطی کر رہے ہیں۔ وہ صاحب دونوں ہی کو صحیح ثابت کرتے رہے۔ یہی دو طرفہ سوچ ہے جو صحیح تفکیر میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اعتراف صحیح تفکیر کی لازمی شرط ہے۔ جس آدمی کے اندر اعتراف کا حوصلہ نہیں، وہ تفکیر صحیح سے بھی یقینی طور پر محروم رہے گا۔

ایک صاحب نے کہا کہ مغرب والوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انھیں ہر چیز میں اول (first in everything) بنے رہنا ہے۔ اس اسپرٹ کو زندہ رکھنے کے لئے انھیں طاقت ور حریف (strong opponent) کی ضرورت ہے۔ پہلے کمیونزم یہ کام کر رہا تھا۔ اب کمیونزم کے خاتمہ کے بعد انھوں نے اسلام کو اپنا حریف بنا لیا ہے۔ اب وہ اسلام کا فرضی یا حقیقی خطرہ بتا کر مذکورہ اسپرٹ

کو اپنے لوگوں میں باقی رکھنا چاہتے ہیں۔
میں نے کہا کہ اگر بالفرض ایسا ہو تو یہ وہی ہے جو موجودہ زمانہ کے مسلمان ان سے بھی زیادہ بڑے پیمانے پر اختیار کئے ہوئے ہیں۔ پاکستان والے ہندستان کے خطرہ پر اپنے قومی جذبہ کو زندہ کئے ہوئے ہیں۔ عرب دنیا صہیونی خطرہ کو اپنی حیات قومی کی بنیاد بنائے ہوئے ہے۔ ہندستان کے مسلمان ہندو خطرہ کے نام پر جی رہے ہیں۔ اسی منفی ذہن کا یہ نتیجہ ہے کہ سلمان رشدی یا بوسنیا کا مسئلہ ان کو متحد کر سکتا ہے مگر کوئی مثبت چیز انھیں متحد نہیں کرتی:

Salman Rushdie or Bosnia might bring them together, but not something positive.

۲۴ ستمبر کو وگن میں عربوں کی ایک مجلس میں میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں کو عرب ممالک بہت بڑے پیمانہ پر مالی مدد دے رہے ہیں۔ حالاں کہ ان کے انقلابی نظریات ملوکیت کے سراسر خلاف ہیں۔ پھر یہ ملک کیوں ایسا کرتے ہیں۔ ایک عرب نوجوان نے کہا: لماذا البلاد العربیۃ تدعم ھٰذہ الحرکات۔ لان البلاد العربیۃ ترید ان تحتوی ھٰذہ الحرکات لتتجنب خطر ھٰذہ الحرکات۔
میں نے کہا: گویا کہ یہاں عرب ملکوں اور ان تحریکوں کے درمیان ایک خاموش انڈر سٹینڈنگ ہے۔ تم ہم کو مال دیتے رہو، ہم تم سے ٹکراؤ نہیں کریں گے۔
مغربی یورپ میں نسلی امتیاز کی برائی پہلے سے موجود ہے۔ اب وہ مزید شدت کے ساتھ زندہ ہو رہی ہے۔ خاص طور پر جرمنی، فرانس اور برطانیہ میں اس کی لہر زیادہ تیز ہے۔ نوآبادیاتی دور میں ان ملکوں میں بڑی تعداد میں ایشیائی اور افریقی باشندے بطور مزدور لے جائے گئے تھے۔ وہ لوگ وہیں آباد ہو گئے اور اب وہ وہاں کے شہری بن چکے ہیں۔ مگر نئے نسل پرستوں کا کہنا ہے کہ وہ ہمارے مہمان کارکن (guest workers) تھے نہ کہ ہمارے ملک کے باقاعدہ شہری۔ اس طرح جو نسلی پالیسی (racist policy) ابھر رہی ہے، اس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ایک نئی سماجی تفریق (social divide) وجود میں آنے والی ہے جو وھائٹ اور غیر وھائٹ کی تقسیم پر مبنی ہو گی۔ اس میں غالباً صرف جاپانیوں کو آنریری وھائٹ (honorary whites) کے طور پر

تسلیم کیا جائے گا۔ تاہم یورپ کے سنجیدہ لوگ اس کو خود یورپ کے لئے ایک خطرہ سمجھتے ہیں۔ ایک بوڑھے پروفیسر نے کہا :

If the Europe of the future deals with the rest of the world on the basis of race, it would make itself ineligible for world leadership.

یعنی اگر مستقبل کا یورپ بقیہ دنیا سے نسل کی بنیاد پر معاملہ کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو عالمی قیادت کے لئے نااہل بنالے گا۔ ایک اور بوڑھے یورپین نے کہا کہ یہ چیز یورپ کے لئے اس کے عالمی کردار میں رکاوٹ بن سکتی ہے اور امریکہ دوبارہ آزادی اور ترقی کا واحد علم بردار بن کر ظاہر ہو سکتا ہے :

It may deprive Europe of its world role. And the United States might again emerge as the real defender of liberty and progress.

یہاں تجارتی مقاصد کے لئے نئے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ میں وگن میں اپنی قیام گاہ کی بیرونی کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ سامنے کی سڑک پر مسلسل دونوں طرف کاریں دوڑتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ اس درمیان سڑک کے کنارے لگے ہوئے ایک بورڈ پر نظر پڑی، اس پر لکھا ہوا تھا — ۶۷ پونڈ فی ہفتہ کے ذریعہ اس گھر کو اپنالو :

Own this house from £ 67 per week.

انڈیا میں اس طرح کا بورڈ میں نے نہیں دیکھا۔ تاہم اگر یہاں ایسا بورڈ لگایا جائے تو شاید اس پر لکھا ہوا ہوگا کہ اس گھر کا کرایہ ۶۷ پونڈ فی ہفتہ ہے۔ مگر یورپ کے لوگوں کی نفسیات اس اسلوب سے مطابقت نہیں رکھتی۔ مذکورہ اشتہار اسی کی ایک مثال ہے۔

۲۴ ستمبر کو جمعہ کا دن تھا۔ چند عرب نوجوانوں کے ساتھ میں مانچسٹر گیا۔ وہاں کی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ یہاں کے امام کوئی فلسطینی یا اردنی تھے۔ انھوں نے فلسطین میں دشمنان اسلام کے ظلم اور سازش پر انگریزی میں پرجوش تقریر کی۔ دنیا کے جس حصہ میں بھی آپ جائیں وہاں کے مسلمانوں کے مجالس یا اجتماعات کا مشترک موضوع صلیبیوں، صہیونیوں وغیرہ کی سازش ہوتا ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ ان نام نہاد سازشوں کا اعلان تو سو سال سے کیا جا رہا ہے۔ مگر اس کا ذرہ برابر

بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا. پھر اس کو مزید جاری رکھنے کا کیا فائدہ ۔

میں نے ایک مجلس میں کہا کہ دو سو سال پہلے مسلمان غلبہ کی حالت میں تھے. اس کے بعد ان پر ضعف کا دور آیا۔ اس کے بعد یورپی استعمار نے ان کو مغلوب کر لیا۔ ۱۳ستمبر ۱۹۹۳ کو فلسطینی لیڈروں کا اسرائیل کا اعتراف کر لینے کے بعد ملت کی تاریخ ذلت کے دور میں داخل ہو گئی۔ اس درمیان میں ہزاروں بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں، سیکڑوں بڑی بڑی تحریکیں اٹھیں۔ مسلمانوں نے بے شمار قربانیاں دیں مگر نتیجہ معکوس صورت میں نکلا. غلبہ کے بعد ضعف، اس کے بعد مغلوبیت اور اس کے بعد ذلت، یہ تاریخ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں موجودہ پرشور تحریکوں کی کوئی قیمت نہیں۔ اگر ان کی قیمت ہوتی تو موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا یہ انجام نہ ہوتا۔

یہاں کی ایک مسجد میں دیوار پر ایک تختی لگی ہوئی نظر آئی ۔ نیچے رحل کی صورت میں پیتل کی دو تلواریں بنی ہوئی تھیں اور اس کے اوپر اللہ لکھا ہوا تھا۔ پوچھنے پر لوگوں نے بتایا کہ عرب ممالک میں اس قسم کی تختی عام ہو گئی ہے۔ مسجد ، ادارہ ، مکان ہر جگہ لوگوں نے اس کو لگا رکھا ہے۔

مجھے اس کو دیکھ کر سخت تکلیف ہوئی۔ میں نے کہا کہ اللہ کے رسول نے تو دعا میں کہا تھا کہ اَللّٰھم انت السلام ومنك السلام وإليك يرجع السلام ۔مگر یہ مسلمان اس پر راضی نہیں ہوئے. اس کو بدل کر انھوں نے اپنی دیواروں پر یہ لکھ دیا کہ ـــــ اَللّٰھمَّ اَنْتَ السَّيف۔ یہ بلا شبہ جرم ہے نہ کہ کوئی اسلامی عمل۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ اسلامی عقیدہ کے مطابق خدا لامحدود ہے۔ وہ کیسے؟ میں نے کہا کائنات محدود ہے اور محدود کو محدود پیدا نہیں کر سکتا۔ صرف لامحدود ہی محدود کو پیدا کر سکتا ہے۔ (الكون محدود وهٰذا يدل على ان الخالق لا محدود۔ فان لم يكن الخالق لا محدود لما استطاع ان يخلق المحدود)

وگن کا ایک علاقائی اخبار نکلتا ہے اس کا نام وگن رپورٹر (Wigan Reporter) ہے۔ اس کے شمارہ ۲۳ستمبر ۱۹۹۳ میں جیک وھٹکر (Jack Whittacker) کے نام سے ایک مراسلہ پڑھا ۔ اس

کے آخر میں یہ الفاظ درج تھے کہ میں خود سوچتا ہوں اور میں خود اپنی رائے قائم کرتا ہوں۔ مگر ہمیشہ دوسروں کا نقطۂ نظر سننے کا خواہش مند رہتا ہوں۔ ممکن ہے کہ میں ان سے اتفاق نہ کروں مگر میں ان کا احترام کرتا ہوں:

I do my own thinking and form my own opinions but always willing to listen to other people's opinions. I may not agree but I do respect them. (Jack Whittacker)

مکہ مدینہ کا فرق بتاتے ہوئے کچھ عرب نوجوانوں سے میں نے ہجرت کے بارہ میں کہا:

بعد ما نظرت فی ھٰذہ الحقائق فسوف تقول ان الھجرۃ لم یکن کفرار ربل الھجرۃ کانت الذھاب من اللافرصۃ الی الفرصۃ۔

ایک عرب نوجوان نے ۲۵ ستمبر کی ملاقات میں بتایا کہ وہ اسلامی مرکز کی عربی مطبوعات سے متاثر ہوئے۔ اس کے بعد ایک تقلیدی شخص ان سے جھگڑنے لگا۔ اور کہا کہ "وحید الدین خاں کی کتاب مت پڑھو ورنہ تم گمراہ ہو جاؤ گے"۔ آخر کار دونوں میں طے ہوا کہ وہ مانچسٹر کے ایک عالم کے پاس جائیں اور اس سے اس کا فیصلہ لیں۔ چنانچہ دونوں مانچسٹر کے عالم کے پاس گئے۔

عالم نے مذکورہ شخص سے پوچھا کہ وحید الدین خاں کی کتابوں میں آپ نے کیا غلطی پائی ہے۔ اس کے بعد اس شخص نے "حکمۃ الدعوۃ" پیش کی اور اس کی ایک غلطی بتائی۔ عالم نے کتاب کا مذکورہ صفحہ پڑھا اور اس شخص نے کہا کہ تم مجھ کو غبی معلوم ہوتے ہو۔ اس عبارت میں وہ بات موجود ہی نہیں جو تم اس کی طرف منسوب کرتے ہو۔ وہ اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔

آخر میں جب دونوں وہاں سے اٹھے تو مذکورہ عالم نے عرب نوجوان کے کان میں آہستہ سے کہا کہ: لقد أظهَرَ اللّٰہُ لَکَ الحق۔ یہ واقعہ ۱۰ جون ۱۹۹۳ کا ہے جو مانچسٹر میں پیش آیا۔

قاہرہ سے ایک مجلہ شائع ہوتا ہے۔ اس کا نام احداث العالم الاسلامی ہے۔ اس کا شمارہ ۱۹۹۳ میں نے دیکھا جو ۷۰۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس میں ہندستان کے مسلمانوں کے بارہ میں ۸ صفحات کی رپورٹ تھی۔ اس کو پڑھ کر میں نے کچھ عربوں سے کہا:

اذا ما قرأتم ھٰذہ الصفحات عن الھند فسوف تستنبطون منھا ان الھند ھی بلد المشاکل ولیست بلد الامکانیات۔ والھند فی الحقیقۃ، کغیرھا من البلدان، ھی بلد الفرص

والإمكانيات. وكيف لا تكون كذالك. والله سبحانه وتعالىٰ يقول في القرآن: إنّ مع العسر يسراً، إنّ مع العسر يسراً۔

۲۶ ستمبر کو لیبیا کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ کسی ضرورت کے تحت انگلینڈ آئے تھے۔ میں نے پوچھا کہ امریکہ نے لیبیا کے خلاف جو پابندیاں لگائی ہیں ان کے بارہ میں لیبی عوام کی کیا رائے ہے۔ انھوں نے فوراً کہا:

الليبيون نتيجة الظلم السياسي والحرمان الاقتصادي وللتحرر من القيد الداخلي ينتظرون أميركا كي تأتي وتستلم البلاد۔ فهٰذا احديث رجل الشارع اليوم۔

میں نے کہا کہ یہ صرف لیبیا کی بات نہیں ہے بلکہ تقریباً تمام مسلم ملکوں کا معاملہ یہی ہے۔ ہر جگہ یہی صورتحال ہے کہ اگر کسی طرح امریکہ ان ملکوں پر قابض ہو جائے تو ہر ملک کے عوام خوش دلی کے ساتھ اس کو قبول کر لیں گے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہر مسلم ملک میں جس شخص کو موقع ملتا ہے وہ فوراً پرواز کر کے امریکہ پہنچ جاتا ہے:

هٰذه حالة كل البلدان الاسلامية۔ والدليل على هٰذا هو ان كل من تو اتيه الفرصة فانه يستقل أول طائرة لكي يصل الى امريكا۔

۲۴ ستمبر کی شام کو میں ایک عرب نوجوان کے ساتھ قریب کے ایک پارک میں ٹہلنے کے لئے گیا۔ ہم لوگ ایک راستہ پر چل رہے تھے۔ اتنے میں دو سفید فام نوجوان ہمارے پاس سے گزرے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر ان میں سے ایک شخص نے کہا:

Nigger, Nigger, Black

سفید فاموں کی خاص کمزوری نسل پرستی ہے۔ اپنے اس ذہن کی بنا پر وہ ایشیائی اور افریقی لوگوں کو بلیک (سیاہ) کہتے ہیں۔ مذکورہ جملہ تحقیر اور استہزاء کے طور پر تھا۔

میں نے ایک ہندستانی مسلمان سے کہا کہ آپ لوگ انگلینڈ میں آکر بسے ہوئے ہیں۔ اور وہ آپ کو بلیک کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سب انگریز ایسے نہیں۔ انگریزوں کی اقلیت ایسا کرتی ہے۔ میں نے کہا کہ انڈیا میں بھی ہندوؤں کی صرف اقلیت مسلم مخالف بات کرتی ہے نہ کہ سارے ہندو۔ پھر یہی اصول آپ انڈیا میں بھی کیوں اختیار نہیں کرتے۔ جس طرح یہاں

آپ اس طرح کی باتوں کو اقلیت کی بات کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں، اسی طرح انڈیا میں بھی اس طرح کی باتوں کو اقلیت کی بات کہہ کر نظر انداز کر دیجئے اور پھر انڈیا آپ کے لئے انگلینڈ بن جائے گا۔

اخوانی مزاج کے بعض عرب نوجوانوں کی مجلس میں میں نے کہا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے فاعرض عمن تولی۔ یہ نہیں فرمایا کہ قاتل عمن تولی یا حارب عمن تولیٰ اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ اسلامی عمل (Islamic activism) کا بنیادی اصول ٹکراؤ نہیں ہے بلکہ اعراض ہے۔

اعراض کوئی سادہ چیز نہیں وہ نہایت گہرا عمل ہے۔ اعراض کا طریقہ اختیار کر کے داعی ایک مدعو کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ اپنی روش پر مزید غور کرے، دوسری طرف داعی خود اپنے لئے یہ امکان حاصل کرتا ہے کہ اس کو صبر کا انعام دیا جائے جو کہ قرآن اور حدیث کے مطابق، سب سے بڑا اسلامی عمل ہے۔

اسی کے ساتھ اعراض کا طریقہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ جنگ اور ٹکراؤ میں اپنی طاقت کو ضائع نہ کرے بلکہ اپنی پوری طاقت کو اپنی تعمیر اور اپنے استحکام میں لگائے۔ اعراض اگرچہ ابتدائی مرحلہ میں برداشت کی قیمت چاہتا ہے۔ مگر جب اعراض کے ذریعہ فرصتِ عمل حاصل کر کے کوئی گروہ اپنے کو طاقت ور بنالے تو اس کے بعد اپنے آپ ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اس کے مقاصد کسی جنگ کے بغیر پورے ہو جاتے ہیں۔

ایک مغربی نوجوان نے سوال کیا کہ قرآن میں ہے کہ عورتیں نافرمانی کریں تو ان کو مارو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن عورتوں کے حق میں غیر عادل ہے۔ وہ مرد کو مارنے کی اجازت دیتا ہے۔

میں نے کہا کہ خود مغربی ذرائع میں چھپی ہوئی رپورٹیں بتاتی ہیں کہ عورتوں کو مارنے کا عمل سب سے زیادہ مغربی ملکوں میں ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس طرح انسانی سماج کا یہ عمومی ظاہرہ بتاتا ہے کہ مخصوص اور استثنائی حالات میں عورت کے حق میں

تنبیہی ضرب ضروری ہے۔ ورنہ خاندان کا نظام چل نہیں سکتا۔

میں نے کہاکہ اس معاملہ میں اسلام کی عظیم مثبت دین یہ ہے کہ اس نے یہ تعلیم دی کہ عورت کی طرف سے نشوز (نافرمانی) کا مظاہرہ ہو تو ابتداءً ہر قسم کی پرامن تدبیریں کرو۔ اگر پرامن تدبیروں سے اصلاح نہ ہو تو آخری مرحلہ میں انتہائی استثنائی تدبیر کے طور پر عورت کو مار سکتے ہو۔ مگر یہاں بھی اسلام نے اس کی حد مقرر کردی۔ اور وہ یہ کہ بس مسواک یا ٹوتھ برش جیسی چیز سے مارنا۔ یعنی علامتی مار نہ کہ حقیقی مار۔

آج ستمبر ۱۹۹۳ کی ۲۷ تاریخ ہے۔ مجھ کو دہلی سے نکلے ہوئے دس دن ہوچکے ہیں۔ امت کی موجودہ حالت اور قیامت کی ہولناکی کو یاد کرکے دل کا عجیب حال ہوا۔ میں نے سوچا کہ حشر کے میدان میں جب لوگ گروہ درگروہ جمع ہوں گے تو کوئی شخص ہوگا جو متمردین کے گروہ کا جھنڈا لے کر آئے گا۔ کوئی منافقین کا سردار بن کر چل رہا ہوگا۔ اسی طرح کوئی وہاں منحرفین کا گروہ ہوگا، کوئی محرفین کا گروہ اور کوئی مستغلین کا گروہ۔ میں نے کہاکہ خدایا، مجھے عاجزین کے ساتھ اٹھائیے۔ حشر کے دن میں عاجزین کے گروہ کے پیچھے اس احساس کے ساتھ چل رہا ہوں کہ شاید میرے عجز پر خدا کو رحم آجائے اور وہ مجھے بخش دے۔

اس سفر کے دوران یورپ کے دو ملکوں (اٹلی اور انگلینڈ) کو دیکھنے کا مجھے موقع ملا۔ میرا احساس یہ ہے کہ انگریزوں کی نفسیات برتری کی نفسیات ہے، اور اطالویوں کی نفسیات مقابلۃً تواضع کی نفسیات۔ سچائی کو قبول کرنے کے لئے برتری کی نفسیات ہمیشہ رکاوٹ بنتی ہے اور تواضع کی نفسیات ہمیشہ مددگار ہوتی ہے۔ نوآبادیاتی دور کے خاتمہ کے بعد مسلمان بہت بڑی تعداد میں انگلستان میں آئے۔ کیوں کہ یہاں ان کو مادی نفع کے مواقع زیادہ دکھائی دئے۔ اگر ان مسلمانوں کی نظر دعوتی مواقع پر ہوتی تو شاید وہ سب سے زیادہ اٹلی کے شہروں میں جاتے۔

ایک مجلس میں ایک صاحب نے قاہرہ کی چھپی ہوئی ایک کتاب دی۔ اس کا نام تھا: تصفیۃ الوجود الاسلامی (عبدالرحمٰن عبدالوہاب) کھول کر مختلف مقامات پر اسے دیکھا تو کتاب جہاد کے نام پر سیف وقتال کی باتوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھاکہ

اسلام کی تاریخ صرف تلواروں نے بنائی ہے، اسلام کی تاریخ صرف جنگ نے بنائی ہے۔
(ان تاریخنا لم تصنعه الا السیوف، ان تاریخنا لم یصنعه الا القتال) صفحہ ۱۴۶

میں نے کہا کہ یہ بات لغویت کی حد تک غلط ہے۔ میں نے اسلامی تاریخ کے کچھ واقعات بیان کرنے کے بعد کہا کہ کیسی عجیب بات ہے کہ آرنلڈ اور کیتھ جیسے مسیحی تو یہ کہہ رہے کہ اسلام کی تاریخ اس کی نظریاتی طاقت کے ذریعہ بنی اور مسلم دانشور یہ کہہ رہے کہ اسلام کی تاریخ تلوار کی طاقت نے بنائی ہے۔ یہ سن کر حاضرین میں سے ایک عرب نوجوان نے کہا: فکأن المسیحیین یعظّمون الاسلام والقادۃ المسلمون یصغرون الاسلام (عادل محمد الربانی)

۲۴ ستمبر کی شام کو ایک عرب نوجوان نے سوال کیا کہ رسول اللہؐ کے بعد ہمیں دنیا میں انذار وتبشیر والا دعوتی کام نظر نہیں آتا۔ پھر بعد کی غیر مسلم قوموں کا انجام کیا ہوگا۔ اس سلسلہ میں میرے جواب کا خلاصہ یہ تھا: السؤال یرجع الی علماء ھٰذہ الامۃ۔ لان الداعی اذا لم یقم بعمله فسوف یکون ھو المسئول دون المدعو۔ فسوف تسئل عن علماء الامة الذین عاصروا الامم۔ لِمَ انتم فشلتم وما استطعتم ان تقوموا للشھادۃ امامَ الامم۔ فلعل الامم سوف توقف یوم القیامة فی قاعة الانتظار والعلماء سوف یجدون انفسھم فی قاعة الاستجواب۔

اٹھارویں صدی میں ہندستان کے لوگ خاص طور پر مسلمان، انگریزوں کو صرف ظالم اور لٹیرے کے روپ میں دیکھ رہے تھے۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ اس وقت انگریز قوم کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ جہالت کی تاریکی سے نکل کر ایک علم دوست قوم بنے ہوئے تھے۔ آج بھی یہ حال ہے کہ یہاں کے بہت سے لوگ ۸۰ سال کی عمر میں بھی نئی معلومات حاصل کرنے کے شوق میں ایوننگ کلاس میں داخلہ لے لیتے ہیں۔

۱۸۵۷ میں ہندستان میں انگریزوں کے خلاف بغاوت منظم کی گئی۔ عین اسی سال یہاں کی قدیم برٹش لائبریری میں مشہور راؤنڈ ریڈنگ روم (round reading room) بن کر تیار ہوا تھا جس میں ڈکنس، لینن، مارکس، تھیکرے، شا، ہارڈی جیسے نامور لوگوں نے بیٹھ کر مطالعہ کیا۔ برطانیہ کے شہروں میں بے شمار تعداد میں پبلک اور پرائیویٹ لائبریریاں قائم ہیں۔

ٹی وی کے موجودہ دور میں بھی یہاں کتابوں کے مطالعہ کا وسیع ذوق پایا جاتا ہے۔ لوگ بہت بڑے پیمانہ پر کتابیں خریدتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔ ایک اخباری رپورٹ میں میں نے حسب ذیل سطریں پڑھیں کہ ایک کتابی ادارہ نے ایک انوکھا منصوبہ بنایا۔ اس نے اعلان کیا کہ کتاب خرید کر اپنے گھر لے جاؤ۔ دیکھنے کے بعد کتاب پسند نہ آئے تو اس کو لوٹا کر اپنی رقم واپس لے لو۔ یہ اندیشہ بہت مبالغہ آمیز ثابت ہوا کہ ہر آدمی دوبارہ کتاب لے کر اپنی رقم واپس مانگنے آجائے گا:

> One chain offered a unique plan. Buy a book, take it home and if you are not happy, get your money back. The fears that every one will come back to claim a refund were exaggerated.

وگن میں مجلہ احداث العالم الاسلامی کا شمارہ ۱۹۹۳ دیکھا۔ یہ مجلہ ۷۰۰ سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔ وہ ہر سال چھپتا ہے۔ اس کا پتہ یہ ہے:

دار الاعتصام، ۸ شارع حسین حجازی، القاہرہ ۱۱۵۱۱۔

اس میں مختلف ملکوں سے متعلق اسلامی خبریں درج تھیں۔ اٹلی کے عنوان کے تحت ایک خبر یہ تھی کہ ایک اطالوی خاتون نے اپنی ریسرچ کے نتائج چھاپے ہیں۔ اس میں بتایا گیا کہ یورپ میں سب سے پہلا عربی قرآن اٹلی میں ۳۸ - ۱۵۳۷ میں چھاپا گیا تھا۔ یہ ۲۳۲ صفحہ پر مشتمل تھا۔ یہ ساڑھے چار سو سال پہلے کی بات ہے۔ چھپنے کے بعد اس قرآن کے نسخے پوپ کے حکم سے جلا دئے گئے تھے۔ تاہم اس قرآن کا ایک نسخہ مذکورہ خاتون کو اطالوی کتب خانہ میں ملا ہے جس کی نشاندہی انھوں نے اپنے مقالہ میں کی ہے۔

مجلہ احداث العالم الاسلامی (۱۴۱۳ھ، ۱۹۹۳) میں ایک باب کشمیر کے بارہ میں تھا۔ اس میں کارنامۂ جہاد کے طور پر درج تھا کہ کشمیر کے مجاہدین نے ہندو فوج کے دس ہزار سے زیادہ افراد کو قتل کیا (ان العمليات الجهادية ادت الى قتل اكثر من عشرة آلاف من الجنود الهندوس) صفحہ ۲۴

اس کو پڑھ کر میں نے کہا کہ اسلام میں جہاد کا عمل یہ تھا کہ "دس ہزار" انسانوں کو خدا کے دین میں داخل کیا جائے۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مجاہدوں کے نزدیک جہادی عمل یہ ہے کہ دس ہزار انسانوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا جائے۔

۲۸ ستمبر کو وگن سے برمنگھم کے لئے روانگی ہوئی۔ دوپہر کے وقت جب ہماری گاڑی برمنگھم میں داخل ہوئی تو سڑک کے عین کنارے مسجد کا منظر دکھائی دیا۔ ساتھیوں نے بتایا کہ یہ یہاں کی گرینڈ ماسک ہے۔ اس کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اس کے بیرونی سمت میں لاالٰہ الااللہ محمد رسول اللہ لکھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ دوسری طرف جلی حرفوں میں انگریزی میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:
قرآن پڑھئے، آخری عہد نامہ:

Read AL-QURAN THE LAST TESTAMENT

برمنگھم میں میرا قیام جناب شمشاد خاں صاحب کے یہاں تھا۔ وہ مکمل طور پر دعوتی مزاج کے آدمی ہیں۔ اپنی پوری زندگی دعوہ ورک کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں۔ ہر جگہ وہ دعوت کے کام کا موقع نکال لیتے ہیں۔ برمنگھم میں وہ اپنا نیا مکان بنوا رہے تھے۔ مختلف قسم کے کاریگر اس میں لگے ہوئے تھے جو سب کے سب مسیحی تھے۔ ایک روز انھوں نے ان مسیحی کاریگروں سے کہا: دیکھو، تمہاری کلرجی نے تم کو کیسا بیوقوف بنا رکھا ہے۔ اس براہ راست جملہ پر وہ لوگ چونکے۔ انھوں نے کہا کہ وہ کیسے۔ شمشاد خاں صاحب نے کہا کہ یہ بتاؤ کہ اگر میں ایک قتل کروں اور اس کی سزا تم کو دی جائے تو کیا یہ انصاف کی بات ہوگی۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں۔ شمشاد خاں صاحب نے کہا کہ پھر دیکھو، تمہاری کلرجی کا کہنا ہے کہ مسیح کو گناہ کے کفارہ کے لئے صلیب پر چڑھایا گیا۔ یعنی گناہ تو دوسرے انسانوں نے کیا اور اس کی سزا حضرت مسیح کے اوپر ڈال دی گئی۔ کیا یہ انصاف ہے اور کیا ایسا کہہ کر کلرجی تم کو بے وقوف نہیں بنا رہی ہے۔ ان لوگوں نے فوراً کہا: مسٹر خان، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں (Mr. Khan, you are right.)

چند سو سال پہلے مذہبی موضوعات پر اس طرح آزادانہ گفتگو نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ جدید فکری انقلاب کا کرشمہ ہے جس نے اس طرح آزادانہ انداز میں مذہب پر تبادلۂ خیال کا موقع دے دیا۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے ساری دنیا میں قومی جھگڑوں کی جو سیاست چلا رکھی ہے وہ اس فضا کو درہم برہم کر رہی ہے۔

برمنگھم کی ایک مجلس میں میں نے کہا کہ کچھ لوگ میرے بارہ میں یہ پروپگنڈہ کر رہے ہیں کہ میرے اندر بڑائی کا احساس ہے۔ میں اپنے آپ کو بہت قابل سمجھتا ہوں۔ حالاں کہ یہ سراسر الٹی

بات ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو اتنا زیادہ عاجز سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنا وجود بالکل بے معنی نظر آتا ہے۔ شعر و شاعری مجھے پسند نہیں۔ مگر اپنی تنہائیوں میں اکثر فارسی کا یہ شعر میری زبان پر آجاتا ہے:

نہ گلے نہ برگ سبزے نہ ثمر نہ سایہ دارم　　در حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

برمنگھم کے اردو ماہنامہ "صراط مستقیم" کے شمارہ جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۹۳ میں ایک رپورٹ دیکھی۔ یہ برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کے بارہ میں تھی۔ اس رپورٹ کا ایک حصہ یہ تھا:

"یہاں شادیوں کے لئے بڑے بڑے ہال بک کرائے جاتے ہیں، چھ ماہ پہلے ہی بُک کرانے کے لئے تگ و دو شروع ہو جاتی ہے۔ شادی کے دن عورتیں، بڑے زرق برق لباس پہن کر آتی ہیں۔ آدمی خوب اپنی عورتوں، بہنوں اور بچیوں کو ہار سنگار کرا کر میک اپ لگا کر لاتے ہیں، جیسے انہیں کسی منڈی میں لے جا رہے ہیں۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں خوب بن ٹھن کر آتے ہیں۔ مختلف ٹولیوں میں ایک دوسرے کی تصاویر کھینچتے ہیں اور مختلف پوز بناتے ہیں۔ ویڈیو فلمیں بھی خوب بنائی جاتی ہیں۔ جہاں نوجوان فیشن پرست لڑکیاں دیکھیں ان پر کیمرے خوب چلتے ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ یاد کے لئے رکھتے ہیں۔ حقیقت میں بے حیائی اور بے غیرتی کو تحفظ دینا مقصود ہوتا ہے۔ گھر کے اندر نوجوان بیٹھ کر شادی کی فلمیں دیکھتے ہیں، پھر لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں، ان سے تعلقات بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں"۔

برمنگھم میں ان دنوں کافی سردی تھی۔ یہاں کے موسم کے مطابق اکثر ہلکی بارش ہوتی رہتی تھی۔ رات کو میں اپنے بستر پر لیٹا تو جناب شمشاد محمد خاں صاحب نے گرم پانی کی تھیلی (Hotwater bottle) لا کر دی اور کہا کہ اس کو بستر میں رکھ لیں۔ پہلے میں نے خیال کیا تھا کہ شاید موجودہ لحاف کے ساتھ مجھے ایک کمبل کا اضافہ کرنا پڑے۔ لیکن گرم پانی کی تھیلی بالکل کافی ہو گئی اور بستر اچھی طرح گرم ہو گیا۔

یہ طریقہ مجھے معلوم نہ تھا۔ مگر اس تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ یہ سخت سردیوں میں بستر کو گرم کرنے کا نہایت آسان اور سستا طریقہ ہے۔ کشمیر کے لوگ رات کو بستر میں کانگڑی رکھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ گرم پانی کی تھیلی اس کے مقابلہ میں زیادہ مفید ہے اور بے ضرر بھی۔

کراچی سے ایک اردو ماہنامہ الفاروق شائع ہوتا ہے۔ اس کا شمارہ محرم۔صفر ۱۴۱۴ھ دیکھا۔ اس میں ایک مسلمان مقیم برطانیہ (برنلے) کا مضمون تھا۔ اس کا عنوان تھا: برطانیہ کی روز افزوں تباہی کے دو اہم اسباب، سودی قرض اور کتوں کی کثرت۔ برطانیہ کے نفرت انگیز تعارف کے بعد آخر میں مضمون اس جملہ پر ختم ہوا تھا: اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے مسلمانوں کو اس بلا سے محفوظ رکھے۔ اللّٰہمّ حفظنا منہ، آمین (صفحہ ۲۸)

میں نے برطانیہ کی ایک مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ میں نے پایا کہ یہاں بھی مسلمان اسی طرح "کافروں اور مشرکوں" اور یہود و نصاریٰ کے خلاف بد دعا کرنے میں مشغول ہیں جس طرح ہندستان میں دکھائی دیتا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمان جس ملک میں رہتے ہیں اس سے نہ تو ان کو وطنی محبت ہے اور نہ ان ممالک کے باشندوں کے حق میں ان کی زبان سے دعائیہ کلمات نکلتے ہیں۔ ان کے یہاں صرف اپنی قوم کے لئے دعائیں ہیں۔ انھیں شاید معلوم نہیں کہ جو لوگ دوسروں کے حق میں نیک دعائیں نہ کرسکیں ان کی نیک دعائیں خود اپنے حق میں بھی قبول نہیں ہوتیں۔

مذکورہ رسالہ میں "تبلیغی جماعت" کے بارہ میں ایک مضمون تھا۔ اس کے آخر میں امت کو دعوت کی محنت پر ڈالنے کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ دعا کی گئی تھی: اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو اپنے دین کے لئے قبول فرمائے (صفحہ ۸) رسالہ کی اشاعت کے نویں سال پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا گیا تھا کہ: اللہ تعالیٰ ہمیں امت مسلمہ کی مزید خدمت کی توفیق نصیب فرمائے، آمین (صفحہ ۳)

اس قسم کی باتوں کو جب میں سنتا ہوں یا پڑھتا ہوں تو میرے دل سے ایک آہ نکلتی ہے۔ میں سوچنے لگتا ہوں کہ مسلمانوں نے اسلام کو اپنا قومی افتخار بنالیا ہے۔ اور جو مذہب قومی افتخار بن جائے وہ نہ خدا کو مطلوب ہوتا ہے اور نہ خلق کو۔

مسٹر پرویز عالم (علیگ) بی بی سی میں ہندی سکشن کے پروڈیوسر ہیں۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے برٹش سوسائٹی کے بارہ میں کئی باتیں بتائیں۔

انھوں نے کہا کہ سلمان رشدی کے خلاف جب مسلم دنیا میں تحریک چل رہی تھی تو

یہاں کے مسلمانوں نے بھی اس کے خلاف جلوس نکالا۔ اس کو تمام انگریزوں نے ٹی وی پر دیکھا۔ اس میں انھوں نے دیکھا کہ مسلمان لکڑی میں باندھ کر سلمان رشدی کی کتاب اٹھارہے ہیں۔ اس میں آگ لگاتے ہیں۔ پھر اس کو زمین پر گرا کر اس کو پیروں کے نیچے روندتے ہیں۔ چیختے چلاتے اور نعرہ لگاتے ہیں۔ وغیرہ۔

اس قسم کے مناظر تمام انگریزوں نے ٹی وی پر دیکھا تو لوگوں کے درمیان مسلمانوں کے خلاف سخت نفرت پیدا ہوگئی۔ وہ سمجھنے لگے کہ یہ کوئی وحشیانہ مذہب ہے۔ اب بھی جب کوئی اسلام یا مسلمان کی بات آتی ہے تو اس کے ساتھ بار بار وہ مناظر سامنے لائے جاتے ہیں۔ کبھی انگریز دیکھتا ہے کہ مسلمان اچھل اچھل کر جلتی ہوئی کتاب کو پیروں کے نیچے روند رہے ہیں۔ کبھی لوگ دیکھتے ہیں کہ ایک داڑھی والا مسلمان قصائی ہاتھ میں چھری لئے ہوئے ہے اور کہہ رہا ہے : میں تم کو مار ڈالوں گا (I will kill him.)

میں نے یہاں کے ایک مسلمان سے اس کا ذکر کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہ کچھ مسلمانوں نے کیا تھا نہ کہ سارے مسلمانوں نے۔ میں نے کہا کہ بقیہ مسلمانوں نے اس کے خلاف مذمتی بیان کیوں نہیں دیا۔ اور جب بقیہ مسلمانوں نے اس کی مذمت نہیں کی تو اسلام کی رو سے وہ بھی اس مجرمانہ فعل میں شریک ہیں۔ حدیث کی زبان میں وہ گونگے شیطان ہیں۔

ناگپور کے ایک ادارہ انڈیا پیس سنٹر (India Peace Centre) نے گاندھی پیس فاؤنڈیشن (نئی دہلی) اور انسٹی ٹیوٹ آف گاندھین اسٹڈیز (واردھا) کے تعاون سے نومبر ۱۹۹۳ میں ایک چھ روزہ اسٹڈی کیمپ منعقد کیا۔ اس اسٹڈی کیمپ میں ملک کے تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس کی تھیم تھی ــــــ قومی دھارا اور اقلیت :

Minorities in India and the national mainstream.

اس کے منتظمین کی طرف سے مجھے دعوت نامہ ملا تھا کہ میں ۶ نومبر کو اس کے آخری اجلاس میں اختتامی خطاب (Valedictory address) پیش کروں۔ اس کے لئے مجھے ایک گھنٹہ کا وقت دیا گیا تھا۔ سفر سے پہلے دہلی میں میں نے ایک پیپر لکھنا شروع کیا۔ مگر محسوس ہوا کہ یہ موضوع بے حد مشکل ہے۔ کوشش کے باوجود پیپر تیار نہ ہوسکا۔ برمنگھم میں جب کہ میں جناب شمشاد محمد خاں صاحب

کے مکان میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اچانک ایک روز صبح کو محسوس ہوا کہ پورا مضمون بیک وقت ذہن میں اتر آیا ہے۔ میں قلم کاغذ لے کر بیٹھا اور اسی وقت اس کو لکھ ڈالا۔ یہ مضمون برمنگھم میں ۳۰ ستمبر ۱۹۹۳ کی شام کو مکمل ہوا۔ یہ مقالہ الرسالہ اردو اور انگریزی میں شائع ہو چکا ہے۔

احمدیہ موومنٹ (قائم شدہ ۱۸۸۹) کا ایک انگریزی ماہنامہ لندن سے نکلتا ہے۔ اس کا نام ہے: (The Review of Religions) اس ماہنامہ کے شمارہ جولائی ۱۹۹۳ میں پادری جوناتھن ڈریپر (Rev. Dr. Jonathan Draper) کی ایک تقریر چھپی تھی جو انھوں نے لندن مسجد (London Mosque) میں یکم مئی ۱۹۹۳ کو کی تھی۔

اس تقریر میں انھوں نے کہا کہ کھلا پن (Openness) اینگلیکن ٹریڈیشن کی امتیازی خصوصیت ہے۔ انھوں نے اس پر خوشی کا اظہار کیا کہ آپ لوگ یہاں عیسائیت کے بارہ میں میری تقریر سننے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ اسی طرح میں امید کرتا ہوں کہ آپ میرے چرچ میں آئیں اور ہم کو اسلام کے سمجھنے میں مدد دیں:

> But in the same way that you are now spending time learning about Christianity in its various forms, I hope that one day soon some of you will come to my church to help us learn something of Islam. (p. 18)

یہ زمانہ آزادانہ طور پر سننے اور سنانے کا زمانہ ہے۔ اس کو ہمیں پوری طرح استعمال کرنا چاہئے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ہم دوسروں کے اجتماعات میں شریک ہو کر سنجیدگی کے ساتھ ان کی بات سنیں۔ اس طرح تعلق بڑھانے کی صورت میں اپنے آپ مختلف صورتوں میں یہ مواقع نکلیں گے کہ ہم اسلام کی بات دوسروں تک پہنچا سکیں۔ حتی کہ دوسرے لوگ خود اپنے اجتماعات میں ہمیں بلائیں گے کہ آئیے اور ہمیں بتائیے کہ اسلام کیا ہے۔ جیسا کہ اسی سفر میں میرے ساتھ اٹلی میں پیش آیا۔ مگر اس جدید امکان کو استعمال کرنے کے لئے دو چیزوں کی لازمی ضرورت ہے — صبر اور حکمت۔

ریاض عبد السلام احمد ایک عرب نوجوان ہیں جو انگلستان میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ خلیجی جنگ کے بعد ۱۹۹۱ میں لندن میں مصر کے شیخ عمر عبد الرحمن آئے۔ ان کا ایک

ویڈیوٹیپ میں نے دیکھا۔ اس کے مطابق، مجلس میں انھوں نے کہا کہ کافروں کے ساتھ ہمارا تعلق صرف قتل اور جنگ کا ہے۔ ایک مسیحی نے کھڑے ہوکر کہا کہ یا شیخ، آپ کیوں صرف قتال کی آیتیں قرآن سے لیتے ہیں اور عفو اور نرمی اور محبت کی آیتوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ شیخ عمر عبدالرحمٰن تردد میں پڑ گئے اور کہا کہ کافروں کے ساتھ معاملہ کے لئے ہمارا طریقہ یہی ہے:

قال الشیخ عمر عبد الرحمٰن: علاقاتنا مع الکافرین القتل وغیرھا من اسالیب العنف۔ فقام رجل مسیحی وقال یا شیخ انا ممن تعدونھم کافرین ولٰکن یا شیخ، لما تذھب الیٰ آیات القتال و تعرض عن آیات العفو و التسامح و الحب۔ فارتبك الشیخ وقال۔ ھٰذا منھجنا فی التعامل مع الکافرین۔

ایک مجلس میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے تمام مسلم دانشور اس اعلان میں مشغول ہیں کہ موجودہ زمانہ ایک اسلام دشمن زمانہ ہے۔ امریکہ اسلام کا دشمن نمبر ایک ہے، اسی لئے وہ اسرائیل کی سرپرستی کر رہا ہے۔ برطانیہ اسلام کا پشتینی دشمن ہے، اسی لئے وہ سلمان رشدی کو پناہ دئے ہوئے ہے۔ مگر عین اسی وقت مسلمان بہت بڑی تعداد میں ان ملکوں میں آکر آرام کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ چنانچہ امریکہ میں چھ ملین مسلمان آباد ہیں اور برطانیہ میں دو ملین مسلمان۔

ذاتی معاملہ اور ملی معاملہ میں یہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسلمان اپنی ذات کے لئے مواقع کو دیکھتے ہیں اور اسلام کے لئے مسائل کو۔ ذات کے معاملہ میں وہ مسائل کو نظر انداز کرو اور مواقع کو استعمال کرو کی پالیسی کو اختیار کئے ہوئے ہیں اور جب اسلام کا معاملہ ہو تو فوراً مسائل کو لے کر دوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ اپنی ذات کے معاملہ میں وہ مسٹر نو پرابلم بنے ہوئے ہیں اور اسلام کا معاملہ ہو تو وہ فوراً مسٹر پرابلم بن جاتے ہیں۔ مسلمانوں کا یہی تضاد موجودہ زمانہ میں تمام ملی مصیبتوں کا اصل سبب ہے۔ ذات کے معاملہ میں انھوں نے فطرت کے اصول کو اختیار کیا اس لئے ذات کے معاملہ میں وہ کامیاب ہیں۔ اسلام کے معاملہ میں وہ فطرت کے اصول کو اختیار نہ کر سکے اس لئے انفرادی ترقی کے باوجود بحیثیت ملت انھیں ترقی حاصل نہ ہو سکی۔

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب بنو آدم کو زمین پر بسانے کا ارادہ کیا تو فرشتوں نے کہا: أتجعل فيها من يفسد فيها ويسفك الدماء ونحن نسبح بحمدك ونقدس لك۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انسان کو آزاد مخلوق کی حیثیت سے زمین پر بسایا جانے والا تھا۔ اور فرشتے جانتے تھے کہ آزاد مخلوق لازماً اپنی آزادی کا غلط استعمال کرے گی اور زمین پر فساد برپا کرے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے اس شبہہ کی تردید نہیں کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرشتوں کا شبہہ درست تھا اور بعد کی تاریخ میں وہ عملی طور پر درست ثابت ہوگیا۔

اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی اس بات کو قبول نہیں کیا کہ نحن نسبح بحمدک و نقدس لک۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فرشتے اضطراری حامد اور اضطراری مسبح تھے۔ اب خدا کو ایسی مخلوق درکار تھی جو اختیاری حامد اور اختیاری مسبح ہو۔ پوری تاریخ اگر فسادیوں سے بھر جائے اور صرف تھوڑے سے مطلوب انسان مل سکیں تب بھی وہ اس قابل تھا کہ تاریخ بشری کا یہ عظیم ہنگامہ وجود میں لایا جائے۔

برطانیہ میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً دو ملین ہے۔ ان میں سے زیادہ تر پاکستان، انڈیا، بنگلہ دیش سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے بعد ترک اور عرب ہیں۔ تقریباً دس ہزار وہ انگریز ہیں، جنھوں نے اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر اسلام قبول کرلیا۔

۳۵ سال پہلے برطانیہ میں صرف دس مسجدیں تھیں۔ مگر آج یہاں ۵۱۴ مسجدیں موجود ہیں۔ برطانیہ کی پہلی مسجد ووکنگ میں ۱۸۹۰ میں بنائی گئی تھی۔ لندن کی پہلی مسجد غالباً ۱۹۳۴ میں بنی۔ اس کے علاوہ پورے برطانیہ میں ۲۰۰۰ کی تعداد میں اسلامی مرکز قائم کئے جا چکے ہیں۔ حتی کہ یہاں روایتی انداز کا دارالعلوم بھی قائم ہے۔ جس میں طلبہ کی تعداد ۳۵۰ ہے۔ مجموعی طور پر برطانیہ میں ایک درجن کی تعداد میں بڑے مدرسے قائم ہو چکے ہیں۔ لندن کا مرکز سب سے بڑا اسلامی مرکز ہے، یہاں مختلف قسم کی اسلامی سرگرمیاں سال بھر جاری رہتی ہیں۔ اس کی لائبریری میں دس ہزار سے زیادہ کتابیں ہیں۔ اس کے مطالعہ کے ہال میں بیک وقت ایک ہزار آدمی بیٹھ کر مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ایک اندازہ کے مطابق، ہر سال تقریباً ۲۰ ہزار انگریز طلبہ

المرکز الثقافی الاسلامی میں اسلام کے بارہ میں جاننے کے لئے آتے ہیں۔

آپ دنیا کے جس حصہ میں بھی جائیں ہر جگہ ایک چیز ضرور دکھائی دے گی۔ اور وہ مسلمانوں کے اوپر غیر مسلموں کے ظلم کی داستان ہے۔ برطانیہ میں قیام کے زمانہ میں مجھے ایک کتاب ملی۔ اس میں برما کے مسلمانوں پر مظالم کی داستان بتائی گئی تھی۔ اس کا نام تھا — مسلمو بورما: حملات ابادہ۔

اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ برما کی حکومت وہاں کے مسلمانوں کو فنا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مگر یہ واقعہ کا نصف ثانی ہے۔ اصل یہ ہے کہ برما کے ایک حصہ میں مسلمانوں نے علیٰحدگی کی تحریک چلائی۔ اس کے نتیجہ میں وہ وہاں معتوب ہوگئے۔ اس سے پہلے وہ برما میں امن کے ساتھ رہ رہے تھے۔

ایک عرب نوجوان نے ایک رپورٹ پڑھنے کے لئے دی۔ اس کا عنوان تھا: بریطانیا — مشکلات المسلمین۔ اس کے مطابق برطانیہ کا کیس مسلمانوں کے لئے گویا مشکلات کا کیس تھا۔ اس میں برطانی مسلمانوں کی مشکلات کے ذیل میں بغض، سیکولر تعلیمی نظام، نسل پرستی اور تشدد کو شمار کیا گیا تھا اس کے بعد کہا گیا تھا کہ برطانیہ کے مسلمان اگر ان مشکلات کو حل کرلیں تو یہاں اسلام کے لئے عظیم مستقبل ہے (ان الاسلام فی بریطانیا سیکون له مستقبل عظیم اذا تمکنوا من حل المشکلات السابقة) صفحہ ۴۹۲

اس کو پڑھنے کے بعد میں نے کہا کہ ان الفاظ میں موجودہ زمانہ کے مسلم دانشوروں کی سب سے بڑی غلطی کا راز چھپا ہوا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مستقبل کی تعمیر کا آغاز مشکلات کو ختم کرنے سے ہوتا ہے۔ حالاں کہ مستقبل کی تعمیر کا صحیح آغاز یہ ہے کہ مشکلات کو نظرانداز کرکے مواقع کو استعمال کیا جائے:

زعماء المسلمین یعتقدون ان بناء المستقبل یبدأ من حل المشاکل۔ والصحیح ان بناء المستقبل یبدأ من الاعراض عن المشاکل واستغلال الفرص۔

۲۹ ستمبر کو فجر کی نماز برمنگھم کی سنٹرل مسجد (مرکزی مسجد) میں پڑھی۔ اس میں بیک وقت تین ہزار آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اب ایک اور مسجد بنائی جا رہی ہے جس میں پانچ ہزار آدمیوں کے لئے گنجائش ہوگی۔

نمازیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ نماز ختم ہوئی تو چھ آدمی حلقہ بنا کر بیٹھ گئے۔ وہ روزانہ اجتماعی

طور پر قرآن پڑھتے ہیں۔ سب کے سب زیادہ عمر کے تھے جن کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ یہ غالباً وہ لوگ ہیں جو اپنے بیٹے یا رشتہ داروں کے ساتھ یہاں مقیم ہیں۔ ان میں کوئی بھی نوجوان موجود نہ تھا۔ مجھے بار بیڈوز کے ایک نوجوان کا قصہ یاد ہے جس کا باپ اس کو اپنے ساتھ مسجد میں لے آیا۔ وہ ایک کنارے الٹارخ کر کے بیٹھ گیا۔ کسی نے سبب پوچھا تو کہا کہ : me not

مسجد میں مذکورہ منظر دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کہ کچھ بوڑھے اور ریٹائرڈ لوگ تو قرآن میں دلچسپی لے رہے ہوں اور نوجوان نسل کہہ رہی ہو کہ: یہ میرے لئے نہیں۔

نماز کے بعد ایک مجلس میں میں نے کہا کہ فجر کی نماز کے بارہ میں ایک بڑی عجیب حدیث ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ من صلی الصبح فھو فی ذمۃ اللّٰہ (جس نے صبح کی نماز پڑھ لی وہ خدا کی ذمہ داری میں آگیا۔) گویا فجر کی نماز اللہ کی طرف سے حفاظت کی گارنٹی ہے۔

پھر میں نے کہا کہ یہ کوئی پر اسرار بات نہیں بلکہ ایک ایسی بات ہے جو غور وفکر سے سمجھ میں آتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز آدمی کے اندر وہ صفات پیدا کرتی ہے جس کے بعد آدمی لوگوں کی دست برد سے محفوظ ہو جائے۔ مثلاً نماز کی چند باتوں کو لیجئے۔ آپ بستر سے اٹھ کر سب سے پہلے وضو کرتے ہیں۔ وضو گویا ایک علامتی فعل کے ذریعہ اس بات کا عزم ہے کہ آپ اخلاقی اور روحانی اعتبار سے پاک رہیں گے۔ پھر نماز میں بار بار اللہ اکبر کہتے ہیں۔ یہ اس بات کا اظہار ہے کہ آپ اللہ کی بڑائی کے احساس میں جئیں گے اور تواضع کی روش اختیار کریں گے۔ پھر آپ ہر رکعت میں الحمد للّٰہ رب العالمین کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ہر حال میں اللہ کا شکر کریں گے۔ جو بھی اللہ نے دیا ہے اس پر قانع رہیں گے۔ آخر میں آپ دونوں طرف رخ کر کے کہتے ہیں کہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ گویا کہ آپ اہل عالم کو یہ بتا رہے ہیں کہ ان کے لئے آپ کے دل میں صرف رحمت اور سلامتی کا جذبہ ہوگا۔

صبح کی نماز میں جو لوگ اس قسم کے اخلاق کی تربیت پا کر نکلیں ان کا یہ اعلیٰ انسانی اخلاق خود ہی ان کی محبوبیت اور حفاظت کی ضمانت بن جائے گا۔

برمنگھم میں میں اپنی رہائش گاہ کے حمام میں گیا تو وہاں جو صابن تھا اس کا نام عنبر تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا، الصابون الحلال، خال من الدھن الحیوانی:

Halal soap, without animal fat.

صابن کے کاغذی ڈبہ پر عربی اور فرنچ اور انگلش میں الرجاء الانتباہ کے تحت لکھا ہوا تھا کہ اکثر صابون کاسٹک سوڈا اور حیوانی چربی کے ذریعہ بنائے جاتے ہیں۔ مگر عنبر صابون حلال اسلامی صابن ہے جو خالص نباتی تیل کے ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اس کے انگریزی الفاظ کسی قدر فرق کے ساتھ یہ تھے:

Most soaps are produced by using caustic soda and animal fat. Animal fat is not desirable due to religious objections. Amber Soap is specially for molated using pure vegetable oil to satisfy the religious objections and contains no animal fat.

یہ گویا صابن کا اسلامائزیشن تھا۔ یہ اسلامی صابن ایک برٹش فرم نے بنایا ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر ہم یہ واضح کر سکیں کہ اسلامی اصول تمہارے لئے مفید اصول ہیں تو دنیا تمام تعصبات کو چھوڑ کر اسلامی اصول کو اختیار کر لے گی۔

جو لوگ مغربی ملکوں میں ہیں وہ مسلم ملکوں کے مقابلہ میں اپنے بچوں کے دین کے لئے زیادہ چوکنا رہتے ہیں۔ شمشاد صاحب کے گھر میں ایک بار میں حمام سے نکل کر اپنے کمرہ کی طرف چلا تو دوسرے کمرے سے آواز آئی۔ مسز شمشاد اپنے صاجزادے سے کہہ رہی تھیں:

جھوٹ بولنے سے کیا ملا، گناہ ملا نہ، لکھ گیا اوپر۔

برمنگھم کی ایک تقریر کے بعد ایک صاحب نے سوال کیا کہ مغربی ملکوں میں ہمارے بچے یہاں کے کلچر سے بہت تیزی سے متاثر ہو رہے ہیں۔ اس سے حفاظت کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ میں نے مذکورہ واقعہ بتاتے ہوئے کہا کہ یہی ماحول ہر گھر میں پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ بچہ کے دل میں بچپن سے یہ ڈال دیں کہ تمہارا قول و فعل اوپر لکھا جا رہا ہے تو وہ ساری زندگی کے لئے اس کا چیک بن جائے گا۔

میں نے کہا کہ اس معاملہ میں ہم کو حقیقت پسند بننا چاہئے۔ مثلاً اگر آپ یہ مطالبہ لے کر اٹھیں کہ ہمیں سی این این اور بی بی سی کو اسلامائز کرنا ہے تو بظاہر وہ بہت شاندار معلوم ہوتا ہے۔ مگر ایسا مطالبہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اس لئے ہمیں وہ کرنا ہے جو ممکن ہے اور ہمارے

بس میں ہے۔ اور ممکن اور بس کی چیز یہی ہے کہ ہر گھر کو تربیت گاہ اور دینی مدرسہ بنا دیا جائے۔

ایک عراقی تاجر ابراہیم تھامس نے ایک بڑی عجیب بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ حدیث جبریل میں قرب قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ لونڈی اپنا آقا جنے گی (وان تلد الامۃ ربتھا) اس پر سوچتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ اس سے مراد غالباً (surrogate mother) کا ظاہرہ ہے جو موجودہ زمانہ میں وجود میں آیا ہے۔

جدید مغربی سماج میں دولت مند خاندان کی عورتیں جو بچہ کے حمل کی مصیبت اٹھانا نہیں چاہتیں اور اسی کے ساتھ یہ چاہتی ہیں کہ ان کے پیٹ کی شیپ خراب نہ ہو وہ اس قسم کی تدبیر اختیار کر رہی ہیں۔ خاص طور پر امریکہ میں اس کا رواج دولت مند لوگوں کے یہاں بڑھ رہا ہے۔ اس طریقہ میں یہ کیا جاتا ہے کہ مرد کا اسپرم اور عورت کا ایگ لے کر لیبوریٹری میں فرٹائل کیا جاتا ہے۔ پھر اس کو عورت کے رحم womb میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس طرح وہ عورت کے رحم میں پرورش پا کر اپنے وقت پر پیدا ہو جاتا ہے۔ دولت مند عورتیں اپنی ملازمہ عورت سے یا کسی غریب عورت کو کچھ رقم دے کر ایسا کرتی ہیں۔

اس تشریح کی صورت میں مذکورہ حدیث بالکل لفظی طور پر صادق آتی ہے۔ کیوں کہ اس میں ماں کی حیثیت فی الواقع لونڈی کی ہوتی ہے اور اس کے پیٹ سے جو بچہ نکلتا ہے وہ فی الواقع اس کا آقا ہوتا ہے۔

۲۰ سال پہلے تک سروگیٹ مدر کا تصور موجود نہ تھا۔ ایسی حالت میں ۱۴ سو سال پہلے عرب کے ایک شخص کی زبان سے یہ جملہ نکلنا اس کا قطعی ثبوت ہے کہ وہ شخص خدا کا پیغمبر تھا۔ اس کے سوا اس کی کوئی اور توجیہ نہیں کی جا سکتی۔

یہاں کے ایک شخص مسٹر فریڈ نے جناب شمشاد خاں صاحب سے سوال کیا کہ برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے کہ گناہ کرنا اگر گناہ ہے تو گناہ کی بات سوچنا بھی گناہ ہے۔ خدا جب کہتا ہے کہ فلاں کام گناہ ہے اس کو مت کرو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے خود بھی گناہ کیا۔ کیوں کہ گناہ کا خیال ذہن میں لائے بغیر گناہ نہیں کیا جا سکتا۔

شمشاد خاں صاحب نے جواب دیا کہ ایک مینوفیکچرر ایک سامان بناتا ہے اور اس کے ساتھ

ایک گائڈ بک رکھ دیتا ہے کہ اس سامان کو اس طرح استعمال کرو اگر اس کے خلاف کروگے تو سامان خراب ہو جائے گا۔ ایسی حالت میں کیا مینوفیکچرر مجرم ہے۔ نہیں۔ کیوں کہ مینوفیکچررنے جو کچھ کیا تمہارے فائدے کے لئے کیا۔ ایسی گائڈ دینے کی بنا پر خود اس کو جرم میں شریک نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اس مثال سے تم خدا کے معاملے کو سمجھ سکتے ہو۔ خدا نے جب انسان کو بنایا تو انسان کے لئے جو مفید ترین ہدایات تھیں وہ بھی اس کو پیغمبروں کے ذریعہ بتا دیں۔ پھر جب تم مینوفیکچرر کو ہدایت نامہ دینے کی بنا پر مجرم نہیں مانتے تو خدا کو ہدایت نامہ دینے کی بنا پر کیوں ایسا کہہ رہے ہو۔

شمشاد خاں صاحب کے اندر دعوہ ورک کا جذبہ بہت زیادہ ہے۔ ان کا اگرچہ مستقل بزنس ہے مگر ان کی دل چسپی سب سے زیادہ دعوت کے کام سے ہے۔ انھوں نے اس مقصد کے لئے ایک خوب صورت مرکز (اسلامک پروپیگیشن سنٹر) برمنگھم میں قائم کیا ہے۔ ان کے ذریعہ اب تک تقریباً ۵۰۰ لوگ اسلام قبول کر چکے ہیں۔ وہ ایک زبردست کام کر رہے ہیں جس کا نام ہے: گھر گھر اسلام کا تعارف نامہ پہنچانا:

door to door leaflet drop

گویا کہ یہ وہ کام ہے جس کو حدیث میں ادخال کلمہ کہا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ انگریزی الرسالہ کی بھی مختلف چیزیں پھیلاتے رہتے ہیں۔ مثلاً انگریزی الرسالہ (مارچ ۱۹۹۳) میں تین صفحہ کا وہ مضمون جس کا عنوان تھا :

From denial to belief

دعوتی کام کے سلسلہ میں انھوں نے کئی عجیب قصے بتائے۔ مثلاً ایک انگریز جس کا قدیم نام ڈیوڈ مورس Dawid Morris تھا۔ ان سے شمشاد خاں صاحب کا ربط قائم ہوا۔ ایک عرصہ تک گفتگو اور مطالعہ کے بعد آخر انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اب نام کا مسئلہ تھا۔ شمشاد خاں صاحب نے کہا کہ نام بدلنا کوئی ضروری نہیں ہے۔ مگر انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں ہپوکریٹ (منافق) بن کر رہنا نہیں چاہتا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد مجھے اپنا نام بھی بدلنا ہے۔ اس کے

کچھ دنوں بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ کسی مسجد میں داخل ہوکر وضو کر رہے ہیں۔ اتنے میں عربی لباس میں ایک بزرگ آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نماز کے لئے جماعت تیار ہے، آجاؤ۔ یہ بزرگ ان کو ڈیوڈ موریس نہیں کہتے۔ بلکہ ان کو محمد اسلام کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس خواب سے وہ نہایت خوش ہوئے اور اپنا نام محمد اسلام رکھ لیا۔ وہ نیو کیسل میں رہتے ہیں اور ایک بڑی سروس میں ہیں۔

ایک صاحب نے بتایا کہ پاکستان کے ایک صاحب روزگار کی تلاش میں سعودی عرب گئے۔ وہاں عرصہ تک وہ پریشان رہے کیوں کہ کوئی کام نہیں ملا۔ اس وقت مکہ میں ایک ہندستانی بزرگ رہتے تھے۔ وہ ان سے دعا کے لئے ملے اور ان کو تحفہ کے طور پر دال روٹی پیش کیا۔ بزرگ نے اس کو خوشی سے قبول کرتے ہوئے کہا کہ تمہارا کام بن گیا۔ تم دال لائے ہو۔ اس کے شروع میں د کا حرف ہے۔ اسی طرح دین، دولت، دنیا، سب کے شروع میں د ہے۔ تم کو تینوں چیزیں مل گئیں۔

اس کے بعد مذکورہ صاحب کو ایک اچھی سروس مل گئی۔ انھوں نے کافی ترقی کی۔ اس طرح کے واقعات میں بچپن سے سنتا آیا ہوں۔ لوگ ان کو بزرگ کا کرشمہ سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ وہ محض اتفاق ہے۔

شمشاد خاں صاحب تعلیمی لحاظ سے انجنیئر ہیں۔ چنانچہ ان کے اندر یہ خاص ملکہ ہے کہ کسی بات کو نہایت درست الفاظ اور انداز میں بیان کرسکیں۔ ایک روز ان سے منافقت پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے کچھ تجربات بتائے۔ میں نے کہا کہ آپ کو اگر ایک جملہ میں منافق کی تعریف کرنا ہو تو آپ کیا کہیں گے۔ انھوں نے ان الفاظ میں منافق کی تعریف کی:

One, who, for some ulterior motives, makes pretences, continuously.

میں نے کہا کہ واقعی یہ منافق انسان کی بہت صحیح اور جامع تشریح ہے۔

پاکستانی روزنامہ جنگ کے لندن اڈیشن (۲۹ ستمبر ۱۹۹۳) میں "لندن نامہ" کے عنوان سے ایک مضمون تھا۔ اس کا پہلا فقرہ یہ تھا:

" برطانیہ اور یورپ میں آباد پاکستانیوں اور کشمیریوں کو اس بات کا احساس ہونا چاہئے

کہ جس معاشرہ میں وہ رہتے ہیں، یہ نہ تو پاکستانی معاشرہ ہے اور نہ ہی اسلامی معاشرہ۔ اس لئے زندگی گزارنے کے لئے ہمیں بہر حال مقامی معاشرہ کے ساتھ ساتھ چلنا ہوگا۔ یہ ہماری مجبوری ہے (صفحہ ۳)

باہر کے ملکوں میں ہر جگہ مسلمان اس "مجبوری" کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ مگر اپنے ملک میں وہ اس کے لئے تیار نہیں۔ تاہم میں کہوں گا کہ کم از کم ہندستان کی حد تک یہ مجبوری کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہاں مکمل آزادی ہے۔ یہاں مسلمانوں کو صرف یہ جاننا ہے کہ زندگی کا سب سے اہم اصول ایڈجسٹمنٹ ہے۔ اس اصول کی ضرورت ہندستان میں بھی ہے اور پاکستان میں بھی اور دوسرے تمام ملکوں میں بھی۔

روزنامہ جنگ (۲۸ ستمبر) کی ایک رپورٹ سے معلوم ہوا کہ پاکستان کی ایم کیو ایم میں ایک بنیادی تبدیلی آئی ہے۔ حتی کہ انھوں نے اپنا نام بدل دیا ہے۔ ایم کیو ایم کا لفظ بدستور باقی رہے گا۔ مگر پہلے اس کا مطلب یہ ہوتا تھا ___ مہاجر قومی موومنٹ۔ اور اب اس کا مطلب ہوگا متحدہ قومی موومنٹ۔ ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین جو آجکل لندن میں مقیم ہیں ۳ اکتوبر ۱۹۹۳ کو پشاور کے ایک جلسہ سے لندن سے ٹیلیفون پر خطاب کریں گے۔ اس تحریک کے لیڈر پہلے مہاجر قومیت ہونے کو اپنی شناخت بنائے ہوئے تھے۔ مگر یہ تحریک ناکام ہوگئی۔ اب وہ پاکستانی قومیت کو اپنی شناخت بنا رہے ہیں۔ جنگ (۲۹ ستمبر) میں ایک مضمون میں بتایا گیا ہے کہ "بالآخر ایم کیو ایم نے مہاجر قومی موومنٹ سے متحدہ قومی موومنٹ کی شکل اختیار کرلی۔"

میں سمجھتا ہوں کہ ہندستان کے مسلمانوں میں بھی ایک اعتبار سے یہی عمل جاری ہے۔ اب تک وہ ہندستان کی عمومی قومیت سے الگ اپنی انفرادی قومیت پر اصرار کرتے رہے تھے۔ مگر ۱۹۹۲ کے بعد ان کی سوچ میں نمایاں تبدیلی آئی ہے۔ علیحدہ قومیت کے بجائے اب وہ ہندستانی قومیت کو اپنی شناخت بنانے کی طرف تیزی سے جا رہے ہیں۔ یہ ایک صحت مند نقطۂ نظر ہے۔ جیسا کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ نے کہا تھا: قومیں اوطان سے بنتی ہیں نہ کہ مذہب سے۔

شمشاد خاں صاحب کے یہاں ایک کرسچین خاتون ہفتہ وار صفائی کے لئے آتی تھی۔

اس کا نام پرل تھا۔ وہ اپنی ذاتی کار پر آتی تھی۔ میں نے صاحب خانہ سے پوچھا کہ یہ گھروں میں صفائی کرنے والے لوگ جاہل ہوتے ہیں یا پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہ خاتون جو ہمارے یہاں آتی ہے وہ باقاعدہ تعلیم یافتہ ہے اور اس سے پہلے وہ ایک آفس میں سکریٹری تھی۔ اس نے کسی وجہ سے سروس چھوڑ دی۔ اب وہ گھروں میں صفائی کا کام کر رہی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ لوگ کام میں کوئی عیب نہیں سمجھتے۔ آپ ایک شخص کو دیکھیں گے کہ وہ صفائی کا کام یا اور کوئی بظاہر چھوٹا کام کر رہا ہے۔ حالاں کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوگا۔ اس کے پاس کار اور ذاتی مکان ہوگا۔

یہ بات انڈیا جیسے ملک کے لئے بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہاں ایسی حیثیت کا کوئی آدمی صفائی کا کام کرنا کبھی پسند نہیں کرے گا۔ اس قصہ پر مجھے اقبال احمد سہیل مرحوم کی ایک نظم یاد آئی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ہمارے اسلاف کس طرح کام کو عار نہیں سمجھتے تھے۔ اس کا ایک شعر یہ تھا:

تھے امام بوحنیفہ کون اک بزاز تھے　　　اور فرید الدین سا شیخ اجل عطار تھا

۲۸ ستمبر کی شام کو برمنگھم میں پہلا خطاب تھا۔ یہ اینڈرٹن روڈ (Anderton Road) پر سپارک بروک سنٹر میں رکھا گیا تھا۔ مقامی مسلمانوں کے علاوہ باہر سے بھی کچھ افراد اس میں شریک ہوئے۔ چھ روزہ قیام کے دوران یہاں اس نوعیت کے چھ خطاب رکھے گئے ہیں۔

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ موجودہ زمانہ میں اگرچہ ہمارے لئے بہت سی مشکلات ہیں۔ مگر مشکلات زندگی کا حصہ ہیں۔ وہ کسی ایک یا دوسری صورت میں ہمیشہ دنیا میں باقی رہتی ھیں۔ زیادہ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ قانون فطرت کے تحت یہاں عسر کے ساتھ یسر بھی لازمی طور پر موجود رہتا ہے۔ اس لئے ہمارے لئے کسی بھی حال میں مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔ آخر میں سوال وجواب کا پروگرام تھا۔

اسی کے ساتھ اسلامی مرکز کی انگریزی کتابوں اور انگریزی الرسالہ کا اسٹال بھی رکھا گیا تھا۔ بہت سے لوگوں نے یہاں سے کتابیں حاصل کیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ آج ہر جگہ یہ کوشش ہو رہی ہے کہ مسلم نسلوں کو اسلام سے بیگانہ

کر دیا جائے اس کے بارہ میں آپ کیا کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اسلام دین فطرت ہے۔ کوئی بھی طاقت اس پر قادر نہیں کہ وہ فطرت کو بلڈوز کر سکے۔ ترکی اور روس کی مثالیں اس کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔

۲۹ ستمبر کی شام کو والسل (Walsall) کے اسلامک کلچر سنٹر میں دوسرا خطاب ہوا۔ یہاں میں نے اتحاد کے موضوع پر خطاب کیا۔ میں نے کہا کہ آج ساری دنیا میں مسلمان ایک بلین کی تعداد میں ہیں۔ حالات نے ان کو دنیا کے ہر گوشہ میں پہنچا دیا ہے۔ ان کے پاس ہر قسم کے وسائل ہمیشہ سے زیادہ موجود ہیں۔ اس کے باوجود مسلمان جدید دور میں عزت کا مقام حاصل نہ کر سکے۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ان کے درمیان اتحاد و اتفاق نہیں۔

میں نے کہا کہ لوگ کوئی ایک یا دوسری شکایت لے کر باہم لڑنے لگتے ہیں۔ گویا وہ سمجھتے ہیں کہ اتحاد اس وقت ہوگا جب سرے سے شکایت کا خاتمہ ہو جائے۔ مگر ایسا ہونا کبھی ممکن نہیں۔ پھر میں نے صحابہ کے بہت سے واقعات بتائے کہ کس طرح وہ شکایتوں کے باوجود متحد رہتے تھے۔ مثلاً حضرت خالد کو سرداری کے عہدہ سے ہٹا دیا گیا، مگر اس کے باوجود وہ بدستور مل کر جہاد کرتے رہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی نظر عہدہ پر نہیں ہوتی تھی بلکہ ثواب پر ہوتی تھی۔ وہ سوچتے تھے کہ عہدہ نہیں تو اس سے کیا فرق پڑا۔ ثواب تو ان شاء اللہ مجھے حاصل ہے۔ آج لوگوں کی نظر ثواب کے بجائے عہدوں پر ہو گئی ہے۔ اس لئے ان میں اتحاد نہیں ہونے پاتا۔

۳۰ ستمبر کی شام کو دار العلوم (Coventry Road) میں خطاب تھا۔ اس کا موضوع تھا اسلام میں علم کی اہمیت۔ میں نے کہا کہ عرب کے ایک سفر میں میری ملاقات ایک عرب عالم سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت مسلمان طرح طرح کی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ ہر طرف ان کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔ ایسی حالت میں سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ ہم اپنے عمل کا آغاز کہاں سے کریں۔ (من این نبدأ)

میں نے کہا کہ اس کا جواب تو قرآن میں موجود ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی وحی اتری تو عرب میں بہت سے مسائل تھے۔ کعبہ میں ۳۶۰ بت، رومیوں اور ایرانیوں کا تدخل

یہود ونصاریٰ کی عرب میں موجودگی ۔ سماج میں مختلف قسم کے جرائم ۔ مگر قرآن میں جو پہلی آیت اتری وہ یہ نہیں تھی کہ ـــ طهر الكعبة من الاصنام یا قاتل الفرس و الرومان یا اخرج الیهود و النصارٰی من جزیرة العرب یا نفذ حدود الله علی المجرمین ۔ اس کے بجائے قرآن کی پہلی آیت یہ تھی کہ پڑھ (اقرأ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسائل خواہ کتنے ہی زیادہ ہوں مگر عمل کا آغاز علم سے کرنا چاہئے ۔ یہی طریقہ پہلے بھی اختیار کیا گیا اور یہی طریقہ آج بھی اختیار کرنا ہے ۔

ایک مسلمان تاجر سے ملاقات ہوئی ۔ انھوں نے یہاں بڑی تجارتی کامیابی حاصل کی ہے ۔ وہ اعلیٰ معیار کی زندگی گزارتے ہیں ۔ ایک صاحب نے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا : اللہ نے ان کو بہت نوازا ہے ۔

میں نے کہا کہ آپ لوگوں کی یہ سوچ قرآنی سوچ نہیں ۔ کیا آپ مجھے قرآن کی کوئی آیت بتا سکتے ہیں جس میں دنیوی ترقی کو " نوازش " کہا گیا ہو ۔ وہ کوئی ایسی آیت نہ بتا سکے ۔ میں نے کہا کہ دنیا میں زیادہ ملنا نہ تو نوازش ہے اور نہ کم ملنا غیر نوازش ۔ قرآن کے مطابق دونوں حالتیں ابتلاء کی حالتیں ہیں ۔ اقتصادی تنگی کو اہانت سمجھنا بھی غلط ہے اور اقتصادی خوشحالی کو اکرام سمجھنا بھی غلط (الفجر ۱۵ - ۱۶)

حدیث میں ہے کہ لکل امة فتنة وفتنة امتی المال ۔ اس حدیث میں اس آنے والے دور کی پیشین گوئی ہے جب کہ لوگوں کے لئے سب سے بڑی چیز مال بن جائے گا ۔ آج وہی زمانہ ہے ۔ تمام لوگ مال کو اپنی دلچسپی بنائے ہوئے ہیں ۔ مسلمانوں کا حال بھی یہی ہے ۔ اس ظاہری فرق کے ساتھ کہ کچھ مسلمان دولت پرستی کے ساتھ " دین داری " کا ضمیمہ بھی اپنے ساتھ لگائے ہوئے ہیں ۔ اور کچھ لوگ اس ضمیمہ کے بغیر دولت پرستی کے کام میں مشغول ہیں ۔

ٹائمس (The Times) کے شمارہ ۳۰ ستمبر ۱۹۹۳ کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ بوسنیا ہرزے گووینا میں ۱۷ مہینے کی جنگ کے بعد اس کا ۹۰ فیصد حصہ سرب اور کروٹ کے قبضہ میں چلا گیا ہے ۔ موجودہ پیس پلان میں قدیم یوگوسلاویہ تین نسلی حصوں میں بٹ جائے گا ـــ سرب ، کروٹ اور مسلمان ، مسلم لیڈرشپ تقسیم پر راضی ہوگئی ہے ۔ مگر وہ

چاہتی ہے کہ سرب فوج نے جن علاقوں پر قبضہ کرلیا ہے اس کو وہ خالی کرے اور سمندری ساحل کا چار فیصد حصہ اس کو دیا جائے۔ مگر سرب فوج اس پر راضی نہیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے جہاں بھی اس قسم کی تحریک اٹھائی ہے، ہر جگہ ان کو پسپائی اختیار کرنی پڑی ہے۔ اراکان (برما) میں، فلپائن میں، فلسطین میں، بوسنیا میں۔ ہر جگہ یہی ہوا ہے کہ مسلم لیڈروں نے زیادہ کی طرف چھلانگ لگائی اور آخر میں صرف کم ہی ان کے حصہ میں آیا۔ یہی اب کشمیر میں ہونے والا ہے۔

مسلمان اس کو اقدام کی سیاست سمجھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اس کا نام اقدام کی سیاست ہو تو پسپائی کی سیاست آخر کس چیز کا نام ہوگا۔

برطانیہ کے مسلمانوں میں اکثریت پاکستان (بشمول بنگلہ دیش) کی ہے۔ اسلامی مملکت میں پاکستانی اور بنگلہ دیشی ایک ساتھ مل کر نہ رہ سکے۔ لیکن انگریز مملکت میں دونوں نہایت اطمینان کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں جب پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تو اس کے پیچھے ڈاکٹر محمد اقبال کا یہ ذہن تھا کہ:

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر   خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

برصغیر کے مسلمانوں نے بہت بڑے پیمانہ پر یہ مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کو اپنے تشخص کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے ایک علاحدہ خطۂ زمین کی ضرورت ہے۔ مسٹر محمد علی جناح اور دوسرے لوگوں نے اس کی زبردست وکالت کی۔ یہاں تک کہ پاکستان کی صورت میں ایک مسلم ہوم لینڈ بن گیا۔ مگر مسلم ہوم لینڈ بننے کے بعد مسلمانوں نے اس کو صرف زینہ کے طور پر استعمال کیا۔ اور ہر شخص جس کو موقع ملا وہ پرواز کرکے دوبارہ "اقوام مغرب" کی دنیا میں پہنچ گیا۔

یہ بلاشبہ ایک جرم تھا جو اسلام کے نام پر کیا گیا۔ اس میں مسلمانوں کے لیڈر اور عوام دونوں شریک ہیں۔ اس جرم کی کم سے کم تلافی یہ ہے کہ صاف لفظوں میں اس کا اقرار کرکے اللہ تعالیٰ سے اس کی معافی کی دعا کی جائے۔

برطانیہ میں مقیم ایک عرب کو کچھ سفید فام نوجوانوں نے وحشیانہ طور پر قتل کر دیا۔ ان نوجوانوں

سے انٹرویو لیا گیا جس کو باقاعدہ ٹی وی پر دکھایا گیا۔ ان سے پوچھا گیا کہ تم نے اس کو کیوں قتل کر دیا۔ نوجوانوں نے صاف کہا کہ ان ایشیائیوں کو ہمیں اپنے ملک سے نکالنا ہے۔ کیوں کہ وہ ہمارے لئے مسئلہ بن گئے ہیں۔ وہ جہاں سے آئے ہیں وہیں چلے جائیں ورنہ بزور انھیں نکلنے پر مجبور کر دیا جائے گا۔

برطانیہ میں ایک پارٹی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس کا نام ہے — برٹش نیشنل پارٹی (BNP) یہ نسل پرست لوگوں کی تنظیم ہے۔ وہ باہر سے آنے والے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کو ایشیائی (Asians) کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارا مقصد ان ایشیائی لوگوں کو برطانیہ سے نکالنا ہے کیوں کہ وہ ہماری اقتصادیات پر بوجھ بن چکے ہیں۔ یہ لوگ اکثر ایشیائیوں پر حملے کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ خوف زدہ ہو کر یہاں سے بھاگ جائیں۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد برطانیہ کو اپنی اقتصادی مشین چلانے کے لئے لیبر کی سخت ضرورت تھی۔ انھوں نے ایشیائیوں کی آمد کی حوصلہ افزائی کی۔ چنانچہ بڑے پیمانے پر ایشیائی ملکوں کے لوگ یہاں آ گئے۔ ان میں سب سے زیادہ تعداد پاکستان، بنگلہ دیش اور انڈیا کی تھی۔ مگر اب خودکاری (automation) کا دور آ گیا اور اس کے نتیجہ میں انھیں بیرونی کارکنوں کی ضرورت نہ رہی۔ چنانچہ یہ باہر سے آئے ہوئے لوگ ان کی نظر میں غیر مطلوب (unwanted) بن گئے۔

یہ زبردست خطرہ ہے جو ایشیائیوں کے سر پر منڈلا رہا ہے اور جو سب سے زیادہ مسلمانوں کے حصہ میں آنے والا ہے۔ اس کے جواب میں یہاں کے مسلمانوں میں احتجاج کا ذہن ابھر رہا ہے۔ مگر احتجاج اس مسئلہ کا حل نہیں۔ اس کا حل صرف ایک ہے، اور وہ دعوت ہے۔ مسلمانوں کو یہاں داعی بن کر رہنا ہوگا۔ اگر انھوں نے احتجاجی سیاست کا طریقہ اختیار کیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ ان کا وہی حال نہ ہو جائے جو بوسنیا میں مسلمانوں کا ہوا۔

یکم اکتوبر کو جمعہ کا دن تھا۔ آج برمنگھم کی مرکزی مسجد (central mosque) میں خطاب کا پروگرام تھا۔ اسی مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی۔ خطبہ سے پہلے آدھ گھنٹہ نماز کے موضوع پر تقریر کی۔ میں نے کہا کہ قرآن وحدیث کے مطابق، نماز صرف ایک ظاہری عمل کا نام نہیں ہے بلکہ ایک اسپرٹ کا نام ہے۔ ظاہری اعمال کا پیمانہ یہی روحانی اور اخلاقی اسپرٹ ہے۔ اگر نماز سے یہ اسپرٹ پیدا

ہو رہی ہو تو وہ مطلوب نماز ہے اور اگر یہ اسپرٹ پیدا نہ ہو تو حدیث کی زبان میں اس سے کہا جائے گا : ارجع فصلّ فانّك لم تصلّ۔

نماز سے فراغت کے بعد کئی لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ اکثر لوگوں نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ ایک صاحب ملے۔ انھوں نے کہا کہ میرا ایک سوال ہے۔ میں اس کا جواب چاہتا ہوں۔ میں نے کہا فرمائیے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے قرآن کے ترجمہ میں ایک جگہ "شیطان کی اولاد" پڑھا ہے، تو کیا شیطان میں بھی شادی بیاہ کا سلسلہ ہے۔

پوچھنے والوں کو یہ پوچھنا چاہئے کہ شیطان کی تلبیسات کیا ہیں اور ان سے بچنے کی تدبیر کیا ہے۔ مگر لوگ عجیب وغریب طور پر یہ پوچھ رہے ہیں کہ شیطان کے یہاں کیا شادی بیاہ اور اولاد کا سلسلہ جاری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں میں نہ صحیح دینی فہم پیدا ہوا اور نہ صحیح علمی مزاج۔

جمعہ کی نماز ختم ہوئی تو نماز جنازہ کا اعلان ہوا۔ لوگ اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد دو اسٹول لاکر اگلی صف کے آگے بچھائے گئے۔ پھر کچھ آدمی خوبصورت قسم کا ایک لمبا بکس لائے اور اس کو اسٹول کے اوپر رکھ دیا۔ یہ عمدہ لکڑی کا بنا ہوا تابوت تھا۔ اس کے اندر میت تھی اور اس کو نہایت مضبوطی کے ساتھ پیک کر دیا گیا تھا۔ تمام لوگوں نے نماز جنازہ پڑھی۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہاں کے قانون کے مطابق، جس طرح عیسائی لوگ اپنی میت کو تابوت میں دفن کرتے ہیں، اسی طرح مسلمانوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ اپنی میت کو تابوت میں رکھ کر دفن کریں۔ یہ قانون شعبۂ ماحولیات (environmental department) کی طرف سے بنایا گیا ہے۔ یہ تابوت مخصوص کارخانوں میں اہتمام کے ساتھ بنائے جاتے ہیں۔ اور وہ بہت مہنگے ہوتے ہیں۔ یعنی ہندستانی روپیہ کے لحاظ سے ۲۵ ہزار روپیہ سے لے کر پچاس ہزار روپیہ تک۔

انڈیا کی حکومت اگر ماحولیاتی تحفظ کے نام پر اس قسم کے تابوت کو ضروری قرار دے تو ہندستان کے نام نہاد رہنما اس کو "شریعت میں مداخلت" قرار دے کر فوراً اس کے خلاف احتجاجی تحریک چلا دیں گے۔ مگر برطانیہ کے دو ملین مسلمان اس کو بلا احتجاج قبول کئے ہوئے ہیں۔ اسی کا نام ایڈجسٹمنٹ ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لئے ایڈجسٹمنٹ ایک ملک میں جائز ہے اور دوسرے ملک میں ناجائز۔

یکم اکتوبر کو پہلی بار برطانی اخبارات میں انڈیا کے بارہ میں نمایاں خبر پڑھی۔ یہ بھونچال کی خبر تھی۔ مہاراشٹر کے اضلاع لاتور اور عثمان آباد میں شدید بھونچال کے نتیجہ میں ۲۰ دیہات میں زبردست تباہی آئی۔ چھ دیہات کا وجود مٹ گیا۔ تقریباً ۳۰ ہزار آدمی ہلاک ہوگئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

زلزلہ کا سبب زمین کی قدرتی بناوٹ ہے۔ زمین اوپر سے بظاہر ٹھوس دکھائی دیتی ہے مگر اس کے نیچے بہت بڑی مقدار میں پگھلا ہوا مادہ ہے۔ زمین کی پرت پلیٹوں کی مانند اندر کی نرم تہ پر پھسلتی رہتی ہے۔ جب یہ پلیٹیں آپس میں رگڑ کھاتی ہیں تو زمین میں دراڑ پڑ جاتی ہے۔ اس وقت زمین کی تہوں کے سرکنے سے زلزلہ آتا ہے۔

زلزلہ کی تباہی سے کوئی چیز بچ نہیں سکتی۔ جو کچھ ممکن ہے وہ صرف یہ کہ مکانات کی تعمیر اس طرح لچکدار انداز میں کی جائے جو زلزلہ کے جھٹکے کو سہار سکے۔ اور ہل کر اپنی جگہ کھڑی رہے جس طرح آندھی کے مقابلہ میں گھاس کرتی ہے۔ کیلی فورنیا (امریکہ) میں زلزلے عام ہیں۔ مگر اسی طرز تعمیر کی بنا پر آجکل وہاں جانی نقصان بہت کم ہوتا ہے۔ زلزلوں کا شکار اب زیادہ تر وہ قومیں ہوتی ہیں جہاں منصوبہ بند تعمیر کا فقدان ہے۔

محمود صاحب ایک پاکستانی میکانیکل انجنیئر ہیں۔ وہ ٹریننگ کے تحت تین سال کے لئے اوساکا (جاپان) میں رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک کارخانہ میں وہ تربیت کے لئے جاتے تھے۔ وہاں وہ دیکھتے تھے کہ روزانہ ایک بوڑھا آدمی آتا ہے۔ وہ خالی بیگ سمیٹ کر جمع کرتا ہے اور ان کو اٹھا کر لے جاتا ہے۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ کوئی لور گریڈ کا ملازم ہے جو اسی کام کے لئے مقرر ہے۔ اس کے بعد ایک روز ایسا ہوا کہ انھیں کسی ضرورت سے کارخانہ کے چیف انجنیئر کے یہاں جانا پڑا۔ انھوں نے حیرت کے ساتھ دیکھا کہ وہی بوڑھا آدمی چیف انجنیئر کی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے جس کو وہ کارخانہ میں صفائی کرتے دیکھا کرتے تھے۔ محمود صاحب کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ میں جب آفس آتا ہوں تو لوگوں کو ضروری ہدایات دینے کے بعد میرے پاس وقت رہتا ہے۔ اس وقت کارخانہ چلا جاتا ہوں اور وہاں لوگوں کا ہاتھ بٹاتا ہوں۔ اس کا ایک خاص فائدہ یہ ہے کہ مجھے ہر چیز کی فرسٹ ہینڈ معلومات ہوجاتی ہے جو بحیثیت چیف انجنیئر مجھے اپنی ڈیوٹی کی انجام دہی میں کام آتی ہے۔

انھوں نے بتایا کہ ایک بار کارخانہ کے ورکروں نے ہڑتال کر دی۔ چھ گھنٹہ تک جاری رہنے کے بعد ہڑتال ختم ہوگئی۔ اگلے دن وہ کارخانہ آئے تو انھوں نے دیکھا کہ لنچ کے وقت ورکروں نے چھٹی نہیں کی۔ وہ لگاتار کام کرتے چلے جا رہے ہیں۔ انھوں نے ایک ورکر سے پوچھا کہ آج تم لوگوں نے لنچ کا وقفہ کیوں نہیں کیا۔ اس نے کہا کہ کل کی ہڑتال کی کمی پوری کرنے کے لئے۔ محمود صاحب نے کہا کہ اس ہڑتال میں تو مینجمنٹ کی غلطی تھی۔ ورکر نے کہا کہ غلطی جس کی بھی ہو جب کام کم ہوگا تو ٹوٹل آوٹ پٹ کم ہوگا۔ اور پھر پوری قوم کو اس کا انجام بھگتنا پڑے گا۔

یکم اکتوبر کی شام کو نماز مغرب کے بعد برمنگھم کی مسلم خواتین کا اجتماع تھا۔ اس اجتماع کا انتظام جناب شمشاد خاں صاحب کے مکان پر کیا گیا تھا۔ خواتین مکان کے ایک بڑے کمرہ میں جمع ہوگئیں۔ ایک اور کمرہ میں مائک کا انتظام تھا۔ یہاں سے میں نے مائک پر اپنی تقریر کی۔ کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ مرد بھی اس اجتماع میں شریک تھے۔

میں نے کہا کہ اسلام پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے عورت کا درجہ گھٹایا ہے۔ مگر یہ ایک لغویات ہے۔ میں نے کہا کہ ایک چیز ہے عورت کا احترام اور اس کے حقوق۔ دوسری چیز ہے ورک پلیس کا مسئلہ۔ اسلام میں عورت اتنی ہی محترم اور معزز ہے جتنا کہ مرد۔ البتہ ورک پلیس کے معاملہ میں دونوں میں فرق کیا گیا ہے۔ اور اس کی وجہ دونوں کا حیاتیاتی فرق ہے۔

پھر میں نے کہا کہ مغرب میں کہا جاتا ہے کہ (Ladies first) مگر اس اصول کو اسلام میں زیادہ بڑے پیمانے پر قائم کیا گیا ہے۔ اور اس کی مثال یہ ہے کہ دنیا بھر کے تمام مسلمان جو حج کے لئے مکہ جاتے ہیں وہاں وہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں۔ یہ ایک خاتون کے نقش قدم کی پیروی ہے جن کا نام ہاجرہ تھا۔

حضرت ہاجرہ کو یہ عظیم مرتبہ کیوں ملا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے ایک نئی نسل بنانے کے لئے قربانی دی تھی۔ وہ اس مقولہ کی بہترین مثال تھیں کہ:

There is a woman at the beginning of all great things.

میں نے کہا کہ آج مسلم خواتین کو حضرت ہاجرہ کے اسی رول کو دہرانا ہے۔ انھیں دوبارہ اپنے بچوں کو تربیت دے کر ایک نئی نسل تیار کرنی ہے جو دور جدید میں اسلام کی عظمت قائم کر سکے۔

۲ اکتوبر کی دوپہر کو یہاں احمد دیدات صاحب کا ایک ویڈیو کیسٹ دیکھا۔ اس سے پہلے عرب امارات میں ایک بار ان کی تقریر سن چکا ہوں۔ آج جو کیسٹ دیکھا وہ لندن کے البرٹ ہال کی تقریر تھی۔ اس کا عنوان تھا:

How Rushdie fooled the West.

اس تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ سلمان رشدی نے اپنی کتاب شیطانی آیات میں صرف اسلام کے ساتھ بے ہودگی نہیں کی ہے بلکہ خود مغرب کے ساتھ بھی بے ہودگی کی ہے۔ جس نے اس کو انعام دیا اور جو اس کو پناہ دئے ہوئے ہیں۔ دیدات صاحب نے کہا کہ آپ خود کیوں اس کا کیس اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہیں۔ آپ تو مغرب کو رشدی کے سیاہ کارنامے بتائیے اور پھر ان کو اس سے نمٹنے دیجئے:

and let them do the job

مجھے یہ بات پسند آئی۔ ایک ایسا مسئلہ جو دوسروں کے ذریعہ زیادہ بہتر طور پر حل کیا جا سکتا ہو اس کو اپنے ہاتھ میں لینا کوئی عقلمندی نہیں۔ اس قسم کا غیر ضروری فعل وہی لوگ کر سکتے ہیں جو سوچے بغیر کوئی کام کریں۔ جن کے اعمال کا سرچشمہ ان کے جذبات ہوں نہ کہ ان کی عقل۔

عبداللہ یوسف علی کا انگریزی ترجمہ جو سعودی عرب کی طرف سے بہت بڑی تعداد میں چھاپ کر پھیلایا گیا ہے۔ اس میں بہت سے اجزاء حذف کر دئے گئے ہیں۔ برمنگھم میں مجھ کو ابتدائی نسخہ ملا۔ اس کو میں نے مختلف مقامات سے دیکھا۔ مجھے اس کے تفسیری حواشی بہت پسند ہیں۔

اس میں عبداللہ یوسف علی کا ابتدائی دیباچہ (preface) شامل ہے۔ اس پر ۴ اپریل ۱۹۳۴ کی تاریخ درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ اور تفسیر ان کے چالیس سالہ مطالعہ اور تفکیر کا نتیجہ تھا۔ انھوں نے نہایت سخت حالات میں اس کو لندن میں مکمل کیا اور آنسوؤں کے ساتھ اس کو لکھا۔ چنانچہ دیباچہ میں یہ الفاظ ہیں کہ اس کے مسودات آنسوؤں سے سینچے گئے:

...watered by tears.

اس دیباچہ میں انھوں نے قرآن کی بابت کئی باتیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ قرآن ہماری روحانی آنکھوں کو کھولتا ہے:

The Qur'an opens our spiritual eyes.

یہ قرآن کی نہایت عمدہ تشریح ہے۔ قرآن کا اصل مقصد انسان کی روحانی بصیرت کو زندہ کرنا ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے جس کی روحانی بصیرت زندہ ہوجائے وہی دراصل قرآن کا قاری ہے۔

۲ اکتوبر کی شام کو نماز مغرب کے بعد برمنگھم کے مسلم کیمونٹی سنٹر اور جمعیۃ اہل حدیث مرکز (Green Lane) میں خطاب کا پروگرام تھا۔ میں نے کہا کہ سلطان ٹیپو ۱۷۹۹ میں انگریزوں سے لڑکر شہید ہوگئے۔ اس وقت سے لے کر آج تک مسلمان ساری دنیا میں اپنے مفروضہ دشمنوں سے لڑرہے ہیں۔ مگر اس دوسو سالہ جنگ نے مسلمانوں کو تباہی کے سوا کچھ اور نہیں دیا۔

مسلمان آخر اس بے فائدہ لڑائی میں کیوں مشغول ہیں۔ اس کی وجہ ہمارے رہنماؤں کی ثنائی طرز فکر (dichotomous thinking) ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہاں ان کے لئے دو ہی ممکن صورت ہے۔ سلطان ٹیپو کے الفاظ میں، یا تو شیر کی طرح لڑکر مرجانا یا گیدڑ بن کر رہنا۔ دوسرے لفظوں میں جنگ یا بزدلی۔ چوں کہ بزدل بن کر رہنا انھیں پسند نہیں، اس لئے وہ بہادری کی موت مر رہے ہیں۔

مسلم رہنماؤں کو معلوم نہیں کہ یہاں ایک تیسرا انتخاب بھی ہے۔ اور وہ ہے ٹکراؤ کو اوائڈ کرکے تیاری کرنا۔ مسائل کو نظرانداز کرتے ہوئے امکانات کو استعمال کرنا۔ یہ گویا "تھرڈ آپشن ہے" اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی بتاتی ہے کہ اس طرح کے حالات میں آپ نے ہمیشہ اسی تھرڈ آپشن کو اختیار کیا ہے۔

تقریر کے بعد ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ کہہ رہے ہیں کہ رسول اللہ کا طریقہ جنگ کا طریقہ نہیں تھا۔ حالاں کہ حدیث میں ہے کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں بار بار لڑوں اور بار بار شہید کیا جاؤں۔ میں نے کہا کہ مطالعہ کا یہ طریقہ صحیح نہیں۔ اسی کے ساتھ آپ یہ دیکھئے کہ رسول اللہ کو بار بار شہید ہونے کا موقع ملا۔ پھر کیوں آپ نے اس سے اعراض کیا۔ ابتدائی دور میں آپ مکہ

میں نماز باجماعت قائم کرتے تو وہ لوگ آپ کے قتل کے درپے ہوجاتے۔ کمزور مسلمانوں کو ستایا جارہا تھا۔ اگر آپ اس میں عملی مداخلت کرتے تو وہ آپ کے ساتھ وہی کرتے جو انھوں نے آل یاسر کے ساتھ کیا۔ اسی طرح ہجرت، حدیبیہ، خندق، وغیرہ میں لڑکر شہید ہونے کے مواقع آئے، مگر کبھی آپ نے ایسا نہیں کیا۔ جب تک دونوں پہلوؤں کو نہ دیکھا جائے کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔

مدرسہ قاسم العلوم (Washwood Heath Road) کی دعوت پر ۳ اکتوبر کی صبح کو وہاں جانا ہوا۔ وہاں اہل علم کی ایک مجلس کی صورت میں بات چیت ہوئی۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کی اصلاح کا طریقہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ جہاں تک کام کا تعلق ہے وہ تو عملاً جاری ہے۔ ہمارے یہاں ادارے قائم ہیں۔ بہت سی بڑی بڑی جماعتیں سرگرم ہیں۔ برطانیہ میں ایک ہزار مسجدیں ہیں جو اسلامی سنٹر کے طور پر چل رہی ہیں۔ مگر ان سرگرمیوں کا بہت کم فائدہ ہم کو مل رہا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ظاہری عمل تو بہت ہے مگر اسپرٹ موجود نہیں۔ مثال کے طور پر لوگوں میں جلن کا جذبہ بہت بڑے پیمانہ پر پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے ایسا ہے کہ کوئی بھی دوسرے کے کام کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہر ایک کو اپنا کام زیادہ نظر آتا ہے اور دوسرے کا کام کم۔ اس مزاج کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر لوگوں کے اندر جلن کے بجائے خیر خواہی بے اعترافی کے بجائے اعتراف کا مزاج پیدا ہوجائے تو موجودہ سرگرمیوں سے ہم کو چوگنا فائدہ ملنے لگے گا۔

الہجرہ اسکول (Hob Moor Road) میں ۳ اکتوبر کی سہ پہر کو خطاب کا پروگرام تھا۔ تعلیم یافتہ افراد بڑی تعداد میں آگئے تھے۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ دوسری قومیں اسلام کے خلاف سازش کررہی ہیں۔ مگر میرے نزدیک اسلام کا زیادہ بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ذہین طبقہ اسلامی جدوجہد میں شریک نہیں۔ برطانیہ میں ایک ہزار مسجدیں اور اسلامی مرکز ہیں۔ مگر ان مسجدوں اور اسلامی اداروں سے زیادہ تر غیر ذہین طبقہ وابستہ ہے۔ ذہین طبقہ اس سے دور رہے۔

میں نے کہا کہ چند سال پہلے میں بار بیڈ وز گیا۔ وہاں میری ایک تقریر تھی۔ ایک آدمی اپنے پندرہ سال کے لڑکے کو پکڑ دھکڑ کر لے آیا۔ وہ آیا تو حاضرین کے ساتھ نہیں بیٹھا بلکہ کنارے اپنا رخ الٹی طرف کر کے بیٹھ گیا۔ کسی نے پوچھا کہ تم اس طرح الگ تھلگ کیوں بیٹھے ہوئے ہو۔ اس نے کہا کہ می ناٹ (me not) یہی اس طبقہ کے بیشتر لوگوں کا حال ہے۔ وہ می ناٹ کلاس بنے ہوئے ہیں۔

ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اسلام کو اب تک اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے قابل فہم (understandable) نہ بنا سکے۔ روایتی انداز کی تقریریں اور مضامین اس طبقہ کو اسلام کی طرف نہیں لا سکتے۔ آج اسلام کی ری ڈسکوری کی ضرورت ہے۔ اسلام قدیم ذہنوں کو بھی مطمئن کرنے کی طاقت رکھتا تھا اور آج کے ذہنوں کو بھی مطمئن کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر آج ایسے داعیوں کی ضرورت ہے جنھوں نے اسلام کو ری ڈسکور کیا ہو۔ اس سلسلہ میں میں نے کئی مثالیں دے کر اس معاملہ کو واضح کیا۔

برطانیہ میں جو مسلمان آباد ہیں ان میں شاید ہی آپ کو کوئی ایسا آدمی ملے جو سکون کی نیند سوتا ہو اور جس کو مسرت کی زندگی حاصل ہو۔ یہاں کی پوری زندگی سودی قرضوں پر قائم ہے۔ گھر، کار اور تمام قیمتی چیزیں قرضوں سے حاصل کی جاتی ہیں اور ساری زندگی آدمی کما کما کر ان کا قرض مع سود ادا کرتا رہتا ہے۔ دوسری طرف گورنمنٹ ٹیکسوں میں عام آدمی کی کمائی کا ۳۰ فیصد اور زیادہ کمائی والوں کا ۶۰ فیصد وصول کر لیتی ہے۔ انڈیا اور پاکستان کی طرح یہاں یہ ممکن نہیں ہے کہ رشوت یا غلط حساب کے ذریعہ آدمی ٹیکس سے بچ جائے۔ یہاں کا نظام ایسا ہے کہ ہر آدمی کو بہر حال ٹیکس کی رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس طرح تمام لوگ ایک قسم کے اقتصادی ٹریپ (trap) میں پھنس کر زندگی گزار رہے ہیں۔

دوسرا بہت بڑا مسئلہ اولاد کا ہے۔ یہاں کی سوسائٹی کا سب سے بڑا مسئلہ آزادی ہے۔ مطلق آزادی کو یہاں سب سے بڑی انسانی قدر سمجھا جاتا ہے۔ ٹی وی، اسکول اور پورے سماج سے وہ آزادی کا سبق حاصل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ماں باپ کے لئے آزاد مخلوق بن جاتا ہے۔ ماں باپ اگر اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات کہیں تو وہ فوراً جواب دے گا کہ تم اپنا کام کرو، تم

سے اس کا کوئی تعلق نہیں:

Mind your own business.
Its nothing to do with you.

ماں باپ اس طرح کے جواب سنتے ہیں اور برداشت کرتے ہیں۔ کیوں کہ اگر وہ بچہ کے ساتھ سختی کریں تو بچہ کے ایک ٹیلیفون پر پولیس آئے گی اور ماں باپ کو پکڑ لے جائے گی۔

۱۹ اگست کی صبح کو ناشتہ سے فراغت کے بعد ہم لوگ شہر دیکھنے کے لئے نکلے۔ سڑک پر آئے تو پہلا منظر یہ دکھائی دیا کہ ادھیڑ عمر کا ایک آدمی ایک بھیڑیا نما کتے کو اپنے ساتھ لئے ہوئے فٹ پاتھ پر چل رہا ہے۔ مغربی ملکوں میں کتا زندگی کا جزء بن گیا ہے۔

میں نے سوچا کہ یہ آدمی جس طرح ایک بھیڑیا نما کتے کو لے کر بے خوف چلا جارہا ہے۔ کیا اسی طرح وہ کسی بھیڑیے کو لے کر بھی چل سکتا ہے۔ دل نے کہا کہ نہیں۔ اس کی وجہ دونوں کی فطرت کا فرق ہے۔ کتے کو خدا نے اپنے مالک کے لئے وفادار بنایا ہے جب کہ بھیڑیا صرف ایک خوں خوار جانور ہے۔ وہ ایک عام انسان کے لئے خونخوار ہے اور مالک کے لئے بھی غیر وفادار۔

اس دنیا میں بھیڑیا بھی ایک قابل پیشین گوئی کردار کا حامل ہے اور کتا بھی قابل پیشین گوئی کردار کا حامل۔

المرکز الاسلامی کے نام سے یہاں ایک سنٹر ہے جس کو عربوں نے قائم کیا ہے۔ ۱۹ اگست کو اسے دیکھا۔ یہاں ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے۔ ۱۹ اگست کو یہاں دو رکعت نماز ادا کی اور حسب توفیق دعائیں کیں۔ یہ مسجد ایک ہشت پہل ہال میں بنائی گئی ہے۔ جمعہ کے منبر کی جگہ لکڑی کی ایک چھوٹی سی کرسی رکھی ہوئی ہے۔ پوری مسجد میں قالین کی صفیں بچھی ہوئی تھیں۔ اس مسجد کا نام مسجد الرحمٰن ہے۔ پورے اٹلی میں غالباً صرف دو مسجد ہے۔ ایک میلان کی موجودہ مسجد اور دوسرے روم کی مسجد جو حال میں تعمیر ہوئی ہے۔ اٹلی میں یہ سارا کام عربوں کے تعاون سے ہو رہا ہے۔

اس مسجد سے متصل ایک مرکز ہے۔ یہاں مسلم مرد اور مسلم عورتیں کثرت سے موجود تھیں۔ معلوم ہوا کہ آج اطالوی مسلمانوں کا اجتماع ہے۔ اس قسم کا یہ پہلا اجتماع تھا۔ مرکز کے ڈائرکٹر السید عبد الفتاح

مجھ کو جانتے تھے اور میری عربی کتابیں پڑھے ہوئے تھے۔ وہ اتفاق سے وہاں موجود تھے۔ انھوں نے دوپہر کے اجتماعی کھانے میں شریک کیا۔ اور اصرار کیا کہ اجتماع سے خطاب کروں۔ وقت بہت کم تھا کیوں کہ مجھ کو کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں بیٹھنا تھا۔ میں نے اسی وقت بیٹھ کر ایک فل اسکیپ کاغذ پر ایک عربی تقریر لکھی اس کے بعد اسٹیج پر آیا۔ ابتداءً کچھ کلمات انگریزی میں کہے اس کے بعد عربی میں لکھی ہوئی تقریر پیش کی۔ ایک عرب عالم نے فوری طور پر اس کا اطالوی زبان میں ترجمہ کیا۔

ایک ایشیائی نے اہل مغرب کے تعصب کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ یہاں کا میڈیا ویسٹرن فریم ورک کے سوا کسی اور ڈھنگ پر کسی بات کو بتانا جانتا ہی نہیں :

There is a lot of reluctance in the media to explain anything outside the western framework.

میں نے کہا کہ ایشیائی ملکوں میں کونسا ملک ہے جہاں یہ مزاج موجود نہیں ہے۔ ہندستان والے ہندستانی نقطۂ نظر سے ہر چیز کو بیان کرتے ہیں۔ پاکستان والے پاکستانی نقطۂ نظر سے ہر معاملے کی تشریح کرتے ہیں۔ یہی تمام قوموں کا حال ہے۔ پھر اس کے لئے آپ اہل مغرب کی شکایت کیوں کر رہے ہیں۔

میرے ٹکٹ کا جو ریزرویشن تھا، اس میں اٹلی، انگلینڈ اور مالٹا شامل تھے۔ مگر درمیان سفر میں بعض وجوہ سے میلان میں مالٹا کو حذف کر کے مجھ کو نیا ٹکٹ بنوانا پڑا۔ اس طرح سفر مزید جاری نہ رہ سکا۔

" مالٹا " کا لفظ ہندستان کی آزادی کی جدوجہد میں ایک تاریخی علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندستان میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی باقاعدہ جدوجہد کو اگر سلطان ٹیپو سے مانا جائے تو وہ ۱۷۹۹ میں شروع ہوئی جبکہ سلطان انگریزی فوج سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ اس کے بعد مسلسل یہ جنگ مسلح ٹکراؤ کی صورت میں جاری رہی۔ مولانا محمود حسن دیوبندی اس ناکام شمشیری جنگ کی آخری کڑی تھے۔ اسی کے جرم میں ان کو تقریباً ساڑھے تین سال تک مالٹا کے قلعہ میں قید کی زندگی گزارنا پڑا۔

مالٹا سے رہا ہوکر وہ ۸ جون ۱۹۲۰ کو دوبارہ بمبئی کے ساحل پر اترے۔ اس وقت مہاتما گاندھی ہندستان کی سیاست میں داخل ہو چکے تھے۔ انھوں نے جدوجہد آزادی کے طریق کار میں انقلابی تبدیلی پیدا کی۔ اس کو تشدد کے بجائے عدم تشدد کے اصول پر قائم کردیا تھا۔

اس وقت کے مسلم رہنماؤں نے اس تبدیلی کو قبول کرلیا۔ مولانا محمود حسن دیوبندی مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد علی جوہر اور دوسرے تمام لوگوں نے مہاتما گاندھی کی قیادت کو تسلیم کرلیا۔ اس طرح سوا سو سال کی ناکام قربانیوں کے بعد آزادی کی تحریک پرتشدد اصول کو ترک کرکے عدم تشدد کے اصول پر چلنے لگی اور آخر کار ۱۹۴۷ میں کامیابی کے مرحلہ تک پہنچی۔

اسی قسم کا معاملہ آزادی کے بعد بھی مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ ہندستانی مسلمانوں کو یہ احساس ہوا کہ اس ملک میں وہ اکثریتی فرقہ کے تعصب اور زیادتی کا شکار ہو رہے ہیں۔ مسلم لیڈروں نے دوبارہ لفظی جنگ کی صورت میں ایک جوابی تحریک شروع کردی۔ یہ مطالبہ، احتجاج، عوامی مظاہرہ کے اصول پر چلائی گئی۔ یہ پرشور جنگ پچاس سالہ قربانیوں کے باوجود مکمل طور پر ناکام ہوگئی ہے۔ اس سے مسلمانوں کے نقصان میں اضافہ تو ہوا مگر اس سے مسلمانوں کو کچھ حاصل نہ ہوسکا۔

اب دوبارہ مسلم سیاست میں ایک تبدیلی کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ مسلمان اپنی جدوجہد کو اصولِ احتجاج کے بجائے اصولِ تعمیر پر قائم کریں۔ اب وہ خارجی مطالبہ کے بجائے داخلی تعمیر پر محنت کریں۔ وہ مبنی بر غیر سیاست کو چھوڑ کر مبنی بر خویش سیاست کو اختیار کرلیں۔ لیبیا کے ایک صاحب کو میں نے گرہی لال جین کا یہ اقتباس دکھایا:

اب ہمارے لئے کیا راستہ ہے۔ کیا ہم اپنی پرانی دنیا کی طرف واپس چلے جائیں، مانوس فراریت کی دنیا کی طرف یا ہم کٹرپن سے ٹکراؤ کی طرف بڑھیں۔ یہ پہلا انتخاب نہیں جس کی ایک شخص تمنا کرسکتا ہے۔ اور تیسرا انتخاب افق پر موجود نہیں۔ الا یہ کہ مایوسی کے عالم میں ہم یہ خیال کریں کہ آئندہ کبھی قذافی کی ہوا نکل جائے اور لیبیا دنیا میں ایک نئے آغاز کا نقیب بن جائے:

Where then do we go from here? Back into our old, familiar escapism, or forward into confrontation with obscurantism. It is not a choice I for one would wish to make. And a third option is not on the horizon unless in our desperation we regard the deflation of Col Gaddafy in far away Libya as a harbinger of a new beginning in the world.
Girilal Jain, *The Times of India,* May 7, 1992, p. 8.

ایک مجلس میں میں نے یہ حدیث سنائی کہ من صمت نجا (جو آدمی چپ رہا اس نے نجات پائی) لوگ بولنے کو کام سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ چپ رہنا بھی ایک کام ہے۔ کسی کا قول ہے کہ جب میں چپ ہوتا ہوں تو میں سوچ رہا ہوتا ہوں اور جب میں بولتا ہوں تو میں نہیں سوچتا:

While I am quiet I think,
while I talk, I do not.

سوچنا گویا بولنے کی تمہید ہے۔ سوچنا گویا بولنے کی تیاری ہے۔ اگر آپ نے سوچنے کا مرحلہ طے کیا ہے تو آپ نے اپنے اندر یہ قابلیت پیدا کی ہے کہ آپ بولیں۔ سوچنا آپ کو بتاتا ہے کہ آپ کیا بولیں اور کس طرح بولیں۔ اگر آپ نہ سوچیں تو آپ یہ بھی نہیں جانیں گے کہ مسئلہ کیا ہے۔ اور جو آدمی مسئلہ کی حقیقت ہی سے واقف نہ ہو وہ بولنے کا اہل کیونکر ہو سکتا ہے۔

بولنا آسان ہے مگر سوچنا بے حد مشکل ہے۔ بولنا جلد بازی کا عمل ہے اور سوچنا صبر کا عمل۔ ایک غیر سنجیدہ آدمی بھی بولنے کا کام کر سکتا ہے۔ مگر سوچنے کا کام صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو سنجیدہ ہوں۔

رومن کیتھولک چرچ میں اب تک یہ قاعدہ تھا کہ پادری کے لئے مجرد رہنا ضروری تھا۔ مگر ایسے اسکینڈل کی تعداد بڑھنے لگی جب کہ پادریوں نے عورتوں سے ناجائز جنسی تعلقات قائم کر لئے۔ چرچ کے ذمہ دار اس کو روکنے میں ناکام ثابت ہوئے۔ چنانچہ جولائی ۱۹۹۳ میں ویٹکن کے پوپ جان پال دوم نے ایک بیان جاری کیا ہے جس میں پادریوں کو نکاح کی اجازت دیدی گئی ہے۔

روم میں میں نے ایک پادری سے یہ بات کہی۔ اس نے جواب دیا کہ ہاں، مگر پوپ نے یہ بھی کہا ہے کہ غیر شادی شدہ رہ کر ایک پادری زیادہ اچھی طرح اپنی خدمات انجام دے سکتا ہے۔ پادری کی ذمہ داری مجرد رہ کر زیادہ بہتر طور پر ادا کی جا سکتی ہے:

But Pope has also added that being single is more suited to carrying out a priest's duties. The needs of the Priesthood are better served by celibacy.

اس سفر میں کئی ایسے تجربے ہوئے جن کے درمیان محسوس ہوا کہ یورپ میں عربوں کے ساتھ آج وہی آئی پی جیسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اس پر مجھے ایک قصہ یاد آیا۔ مولانا شبلی نعمانی نے ۱۸۹۲ میں ترکی وغیرہ کا سفر کیا۔ اس سفر کی مفصل روداد "سفرنامہ روم ومصر وشام" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ بحری سفر کے ذریعہ وہ ۲۳ مئی ۱۸۹۲ کو قسطنطنیہ پہنچے اور وہاں تین مہینہ قیام کیا۔ ایک روز قسطنطنیہ کے مکتب حربیہ کے سکریٹری ذکی پاشا سے ملنے گئے۔ موصوف پہلے سے مولانا شبلی سے واقف نہ تھے۔ چنانچہ بوقت ملاقات ایک عجیب واقعہ گزرا جو مولانا شبلی کے الفاظ میں یہ تھا:

اتفاق سے ذکی پاشا باہر جا چکے تھے۔ آدمی نے کہا کہ ذرا ٹھیر جائیے، شاید جلد آجائیں۔ اسی اثنا میں وہ آپہنچے۔ گاڑی سے اترنے کے ساتھ انھوں نے ہماری طرف رخ کیا۔ شیخ علی طبیان اور میں دونوں عربی لباس میں تھے۔ اگرچہ میرے سر پر ریشمی عمامہ اور کمر میں سنہری پیٹی تھی لیکن قفطان اور عبا کی وجہ سے مجموعی صورت سے ہیں عرب معلوم ہوتا تھا۔ ذکی پاشا کو اس وقت نہایت جلدی تھی۔ سلام علیک کے ساتھ ہی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ مجیدیان (ترکی سکہ) نکالیں۔ پہلے تو مجھے سخت تعجب ہوا۔ پھر خیال آیا کہ نعوذ باللہ، انھوں نے ہم کو عام عربوں کی طرح گداگر سمجھا۔ اس خیال کے ساتھ مجھ کو نہایت رنج اور رنج کے ساتھ غصہ آیا۔ میں نے چلا کر کہا: ماجئنا لهذا ، لسنا من الفقراء (ہم اس لئے نہیں آئے، ہم محتاج نہیں ہیں) پاشا موصوف اگرچہ عربی نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن چہرے کی ہیئت اور لہجۂ کلام سے سمجھے کہ یہ امر اس کو ناگوار گزرا۔ شیخ علی طبیان کی طرف متوجہ ہوئے کہ یہ غیظ میں کیوں ہیں۔ شیخ علی طبیان ٹوٹی پھوٹی ترکی بول لیتے تھے۔ میرے آنے کی غرض بیان کی۔ پاشا موصوف نہایت شرمندہ ہوئے۔ (صفحہ ۴۴ - ۴۵)

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سو سال پہلے عربوں کی عام تصویر کیا تھی۔ غالباً ۱۹۴۱ کی بات ہے، اعظم گڈھ میں خود میرے یہاں اسی قسم کے ایک "عرب مسافر" آئے تھے اور ان کو میں نے ایک رات اور ایک دن اپنے مکان پر ٹھہرایا تھا۔ اور ان کی خدمت کی تھی۔ صبح کو جب میں ان کے کمرہ میں گیا اور پوچھا کہ رات کیسی گزری تو انھوں نے کہا: ما کان النوم معنا باللیل۔ معلوم ہوا کہ مچھر کی وجہ سے وہ رات کو ٹھیک سے نہ سو سکے۔

مگر آج عربوں کی تصویر اس سے سراسر مختلف ہے۔ "عرب شیخ" کا لفظ اب دولت کا نشان بن چکا ہے اور اسی کے ساتھ عزت واحترام کا بھی۔

۴ اکتوبر ۱۹۹۳ کو واپسی ہوئی۔ صبح کو فجر سے کچھ پہلے برمنگھم سے لندن کے لئے روانگی ہوئی۔ ہم کو لندن سے دہلی کے لئے جہاز لینا تھا۔ برمنگھم سے جناب شمشاد خاں صاحب کے ساتھ بذریعہ روڈ سفر کیا۔ راستہ میں ایک جگہ لکھا ہوا تھا۔ آگے فلاں سڑک پر ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ تاحد نظر کاریں کھڑی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ شمشاد خاں صاحب نے فوراً اپنی گاڑی موڑی اور نئے راستہ پر سفر کرتے ہوئے ایرپورٹ پہنچے۔

لندن ایئرپورٹ پر جناب شمشاد خاں صاحب سے رخصت ہو کر اندر داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ ایئر انڈیا کی فلائٹ ۴ گھنٹہ لیٹ ہے۔ ہم کو ایئرپورٹ پر مزید انتظار کرنا ہوگا۔ پھر مجھے ترکی کے صدر کا قصہ یاد آیا۔ وہ امپورٹڈ کار میں بیٹھ کر گھر سے دفتر کے لئے روانہ ہوئے۔ راستہ میں معلوم ہوا کہ کار میں پٹرول ختم ہو گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ گاڑی تو ہم نے باہر سے خرید کر حاصل کر لی مگر پٹرول ڈالنا ہمارا کام تھا اور یہاں ہم فیل ہو گئے۔ یہی حال ایئر انڈیا کا ہے۔ جہاز تو ہم نے باہر سے خرید کر منگا لئے۔ مگر اس کو صحیح طور پر چلانے کے لئے ہمیں اپنا حصہ ادا کرنا تھا۔ یہاں ہم فیل ہو گئے۔

لندن ایئرپورٹ کی انتظار گاہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ دیوار پر لگے ایک بورڈ پر نظر پڑی۔ برٹش ایئرویز کے چیف ایگزیکٹو سر جان ایگن کی دستخط سے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے۔
اپنے ایئرپورٹ کی سروس پر ہم اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتے جب تک آپ مطمئن نہ ہوں:

"We won't be satisfied with the service at our airports until you are."

Sir John Egan
Chief Executive
BAA plc.

بہتر کارکردگی کا یہی واحد معیار ہے۔

لندن سے ایئر انڈیا کی فلائٹ ۱۱۲ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ یہ جہاز پورے پانچ گھنٹہ لیٹ تھا۔ لندن سے دہلی کی دوری ۷۰۵۳ کیلومیٹر ہے۔ یہ بڑا جہاز تھا۔ مگر اس کی تقریباً آدھی سیٹیں خالی تھیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ایئر انڈیا کی سروس بہت بدنام ہوگئی ہے۔ اس کا ایک تجربہ مجھ کو آج کے سفر میں ہوا۔ لندن کے مقرر وقت سے یہ جہاز پانچ گھنٹہ تاخیر سے روانہ ہوا۔

جہاز جب فضا میں بلند ہو کر دلّی کی طرف روانہ ہوا تو خیال آیا کہ میں دہلی۔لندن۔دہلی کا ٹکٹ لے کر روانہ ہوا تھا۔ اب میں اپنی آخری منزل کی طرف جارہا ہوں۔

پرواز کے دوران ایک مسافر کی طبیعت خراب ہوگئی۔ جہاز کے عملہ کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ مسافروں میں اگر کوئی ڈاکٹر ہو تو وہ فوری مقام پر آجائیں۔ ان کی مدد کی ضرورت ہے۔ فوراً تین آدمی اپنی اپنی سیٹ سے اٹھ کر وہاں پہنچ گئے۔

۵ اکتوبر کو صبح چار بجے ہمارا جہاز دہلی ایئرپورٹ پر اتر گیا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ کیوں کہ یہ میرے لئے غیر معمولی طور پر لمبا سفر تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں کسی دوسری دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ اپنی دنیا میں دوبارہ واپسی ایک موہوم سی چیز نظر آتی تھی۔

لندن کے مضافات سے تعلق رکھنے والی زیادہ عمر کی ایک برٹش خاتون جلین رائٹ (Ms Gillian Wright) نے بتایا کہ پچاس سال پہلے برٹش سوسائٹی آج سے بہت زیادہ مختلف تھی۔ اس وقت ہم اپنے گھروں میں تالا نہیں لگاتے تھے۔ سماجی تشدد کا نام ونشان نہیں تھا۔ جوان لڑکیاں رات کو ادھر سے اُدھر جاتی تھیں مگر انھیں اس کا ڈر نہیں ہوتا تھا کہ کوئی انھیں چھیڑے گا۔ آج یہ سب ختم ہوچکا ہے۔ اب یہ حال ہے کہ آج ہی رات کو کچھ لڑکوں نے میرے گھر پر پتھر پھینکے۔ انھوں نے کہا کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد سے یہ

تبدیلی ہماری سوسائٹی میں آئی ہے۔

قدیم زمانہ میں جنگ شہروں سے باہر میدان جنگ میں صرف دو فوجوں کے درمیان ہوتی تھی۔ آج لڑائی ہوتی ہے تو پوری کی پوری آبادی اس میں شامل ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں جو عمومی ہنگامی حالت پیدا ہوتی ہے اس سے ساری روایتیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ یہی موجودہ زمانہ میں اکثر ملکوں میں پیش آیا۔ جنگوں کے دوران ہر قسم کی کارروائی کرنی پڑی۔ اس سے قدیم اخلاقی روایتیں ٹوٹ گئیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں ہر جگہ جہاد کے نام پر لڑائی کا مزاج بنا ہوا ہے۔ ہر جگہ کسی نہ کسی صورت میں لڑائی جاری ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہر قسم کی اخلاقی اور انسانی روایتیں ٹوٹ رہی ہیں۔ یہ لڑائیاں بالفرض فتح پر ختم ہوں تب بھی ان کا یہ نقصان یقینی ہے کہ اس کے بعد ہر جگہ ایک ایسا انسانی معاشرہ بنے گا جو تمام اعلیٰ روایتوں سے خالی ہوگا۔ یہاں تک کہ لوگ چیخ اٹھیں گے کہ اس اسلامی نظام سے تو قدیم غیر اسلامی نظام ہی اچھا تھا۔

سفر سے واپسی کے بعد ۱۱ اکتوبر ۱۹۹۳ کو میں نے جناب شمشاد محمد خاں صاحب (برمنگھم) کے نام ایک خط روانہ کیا تھا۔ اس میں سفر کے کئی تجربات درج تھے۔ یہ خط یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"برمنگھم میں جو دن آپ لوگوں کے ساتھ گزرے وہ میری زندگی کے یادگار دن تھے۔ حدیث میں ہے کہ جو آدمی کسی شخص سے ملا اور اس نے اس سے کچھ نہیں چکھا تو گویا وہ مردہ سے ملا۔ اس حدیث کے مطابق، آپ سے میری ملاقات ایک زندہ شخص سے ملاقات تھی۔ یقیناً میں نے آپ سے بہت سی باتیں جانیں، آپ سے بہت سی نئی نئی باتیں سیکھیں۔

ہجری کیلنڈر کے اعتبار سے اب میری عمر ۷۱ سال ہو چکی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ دوبارہ آپ سے ملاقات ہوگی یا نہیں۔ بہر حال اگر دنیا میں دوبارہ ملاقات مقدر نہ ہو تو دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آخرت میں جنت میں یکجا کر دے۔ اور وہاں ملاقات کا موقع نصیب فرمائے۔ کیونکہ جنت کی ملاقات ہی اصل ملاقات ہے۔

لندن ایئرپورٹ پر آپ سے رخصت ہو کر اندر داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ ایئر انڈیا کی فلائٹ پانچ گھنٹہ لیٹ ہے۔ یہ سارا وقت ایئرپورٹ پر انتظار میں گزارنا پڑا۔ میں نے سوچا

کہ اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو برمنگھم میں آپ حضرات کے ساتھ مزید کچھ وقت گذار سکتا تھا۔ مجھے قرآن کی یہ آیت یاد آئی کہ کہہ دو کہ اگر میں غیب کو جانتا تو بہت نفع حاصل کرتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی (الاعراف ۱۸۸)

یہ آیت بتاتی ہے کہ اس دنیا میں سوء سے بچنے اور خیر کو پانے کا تعلق تمام تر مستقبل بینی سے ہے۔ یہی معاملہ آخرت کا بھی ہے۔ جو شخص پیغمبر کی پیشگی خبر پر یقین کرکے اخروی مستقبل کو اپنا concern بنائے اور اس کے مطابق اپنی زندگی کی تشکیل کرے وہی زندگی کے طویل تر مرحلہ میں کامیاب رہے گا۔

لندن ایئر پورٹ پر میں انتظار گاہ میں بیٹھا ہوا تھا، دیکھا تو لوگ چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ ان کے چہروں پر بے فکری کے آثار تھے، میں نے سوچا کہ ان کی اس بے فکری کا راز کیا ہے۔ میری سمجھ میں آیا کہ اس کا راز یہ ہے کہ ہر ایک شعوری یا غیر شعوری طور پر سمجھتا ہے کہ اس کی جیب میں پونڈ اور ڈالر موجود ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے وہ دنیا کی ہر وہ چیز حاصل کرسکتا ہے جس کو وہ چاہے۔

کاش لوگوں کو معلوم ہوتا کہ عنقریب وہ ایک اور دنیا میں داخل کر دئے جائیں گے جہاں پونڈ اور ڈالر کی کچھ بھی قیمت نہ ہوگی۔ وہاں کا سکہ بالکل دوسرا ہوگا۔ اور جس آدمی کے پاس وہاں کا سکہ نہ ہو وہ وہاں بالکل مفلس ہو کر رہ جائے گا۔ خواہ دنیا میں اس کا بینک بیلنس کتنا ہی زیادہ ہو۔

جہاز فضا میں اڑ کر لندن سے دہلی کی طرف روانہ ہوا تو خیال آیا کہ میرے پاس دہلی۔ لندن کا ریٹرن ٹکٹ تھا۔ اس کے مطابق اپنا سفر پورا کرکے میں اپنے وطن واپس جا رہا ہوں۔ اسی طرح میرے پاس اور تمام انسانوں کے پاس ایک اور ریٹرن ٹکٹ ہے۔ یہ ریٹرن ٹکٹ آخرت۔ دنیا۔ آخرت کے سفر کے لئے ہے۔ اس دوسرے ریٹرن ٹکٹ سے آدمی آخرت سے نکل کر دنیا میں آیا۔ اور پھر دوبارہ وہ آخرت کی طرف لوٹ جائے گا۔ جس طرح میرے لئے دہلی کی طرف واپسی کی تاریخ مقرر تھی اسی طرح میری اور تمام انسانوں کی آخرت کی طرف واپسی کی تاریخ بھی مقرر ہے۔ جس دن یہ تاریخ آئے گی تو قرآن کے الفاظ میں، لوگ نہ ایک گھڑی پیچھے ہوں گے اور نہ ایک گھڑی آگے (یونس ۴۹)

جہاز ابھی درمیان میں تھا کہ وہ صورت پیش آئی جس کو ہوا بازی کی اصطلاح میں updraft, downdraft کہا جاتا ہے۔ جہاز تیزی سے نیچے اور اوپر ہونے لگا۔ دل سے یہ دعا نکلی کہ خدایا، خیریت کے ساتھ مجھ کو دہلی پہنچا۔ دنیا سے لے کر آخرت تک خیریت کا معاملہ فرما۔ ہر مرحلہ میں اور ہر پہلو سے میری مدد فرما۔

جہاز کے کیپٹن نے اعلان کیا کہ ہمارا جہاز ۵۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دہلی کی طرف جارہا ہے۔ اس کو سن کر خیال آیا کہ عین اسی وقت ہر مسافر ایک اور سفر طے کر رہا ہے۔ یہ آخرت کا سفر ہے۔ زمین مزید تیزی کے ساتھ ۱۰۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتی ہوئی علامتی طور پر بتا رہی ہے کہ آخرت کا سفر اس سے بھی زیادہ سرعت کے ساتھ مسلسل جاری ہے۔

میں نے سوچا کہ جس طرح جہاز کا کیپٹن اعلان کرکے لوگوں کو سفر دنیا کی حقیقت سے باخبر کر رہا ہے، کاش اسی طرح تمام انسانوں کو سفر آخرت کے بارے میں بتایا جاسکے۔ کاش ایسا ہو کہ اس دنیا کا کوئی کان نہ ہو جس نے اس اعلان کو نہیں سنا، اور کوئی آنکھ نہ ہو جس نے اس خبر کو نہیں پڑھا۔ پھر خیال آیا کہ لندن ایئرپورٹ کی ایک دیوار پر میں نے برٹش ایئرویز کے ایگزیکٹیو Sir John Egan کے دستخط سے ایک بورڈ پر یہ الفاظ پڑھے تھے:

We won't be satisfied with the service at our airport until you are.

میں نے سوچا کہ دعوت کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ دعوت صرف اس وقت مکمل ہوتی ہے جب کہ مدعو اس بات کا اعتراف کرلے کہ مجھے پیغام پوری طرح پہنچا دیا گیا۔ دعوت کی تکمیل داعی کے دعویٰ کی بات نہیں ہے بلکہ مدعو کے اقرار کی بات ہے، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے کہ اور تاکہ لوگ کہہ دیں کہ تم نے پڑھ دیا (الانعام ۱۰۵)

راستہ میں لندن کے اخبار ڈیلی میل (۴ اکتوبر ۱۹۹۲) میں ایک سبق آموز رپورٹ پڑھی۔ اس کا عنوان تھا: (height of inhumanity)، رپورٹ کا خلاصہ یہ تھا کہ ایک برطانی خاتون کے بچہ کا انتقال ہوگیا۔ اس کا تابوت کچھ بڑا تھا، اس لئے اس کو بچوں کے خوبصورت قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت نہیں ملی۔ اس کا سات سالہ بچہ بڑوں کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ یہ اگرچہ قانون کے مطابق تھا۔ مگر خاتون کو اس کا نہایت سخت صدمہ ہوا:

In death, as in his short life, Barrie Lockwood has been set apart from other children. His family were denied permission to bury the seven-year-old victim of cerebral palsy alongside other youngsters because his coffin was six inches too long. Officials of Harrogate council in North Yorkshire refused to bend the rules, which state that 4ft is the maximum for burial in the children's section of Ripon cemetery. Instead he was laid to rest 200 yards away among adult graves up to 100 years old, his teddy bear-shaped headstone surrounded by more formal monuments. At the time, in January, Barrie's mother Valeri, of Aismunder by Close, Ripon, was too distraught to argue following his death from a chest infection. But now she is campaigning on behalf of other bereaved parents for a change in the regulations. 'In times of great distress it can be a consolation to know your child rests with others of his generation, but my son has been denied even that,' she said. 'Because of his condition, his life didn't involve much contact with other children, so surely it wasn't asking too much to be buried next to those whose lives were also cut short? 'The children's cemetery is so pretty, as much more appropriate for a boy of seven than placing him among adults' graves dating back generations. (John Woodcock)

اس رپورٹ کو پڑھنے کے بعد میں نے سوچا کہ ایک ماں کو یہ پسند نہیں کہ اس کا بچہ مرنے کے بعد ایک غیر pretty قبرستان میں دفن ہو۔ مگر عین اسی وقت بے شمار مائیں اس پر راضی ہیں کہ ان کا محبوب بچہ مرنے کے بعد آگ میں جلے اور جہنم کا گڑھا اس کا ابدی ٹھکانا ہو۔ شاید ہماری دنیا میں اس سے زیادہ عجیب تضاد کی کوئی اور مثال نہیں ملے گی۔

طویل سفر کے دوران کئی بار تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے نیند آئی۔ ایک بار جھپکی کے ساتھ نیند آئی تو میں نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میں فضا کی بلندی میں سفر کر رہا ہوں۔ مگر یہ سفر ہوائی جہاز میں نہیں ہو رہا ہے بلکہ آپ کے ساتھ موٹر کار میں ہو رہا ہے۔ آپ اپنی کار چلا رہے ہیں۔ آپ کے پاس سامنے کی سیٹ پر ثانی اثنین ہیں۔ اور میں پیچھے کی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہوں۔ کار ہم کو لئے ہوئے ہوائی جہاز جیسی تیزی کے ساتھ فضا میں اڑتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔

اس قسم کے مختلف احساسات کو لئے ہوئے میرا سفر جاری تھا۔ یہاں تک کہ ۵ اکتوبر کی صبح کو ۴ بجے ہمارا جہاز دہلی ایئر پورٹ پر اتر گیا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے میری دعا قبول کر لی۔ وہ خیریت کے ساتھ مجھے دہلی سے لے گیا اور خیریت کے ساتھ دوبارہ دہلی

پہنچا دیا۔

دہلی ایئرپورٹ پر کسٹم کی جانچ بہت سخت ہوتی ہے۔ میں نے ایک ٹرالی پر اپنا بیگ اور کتابوں کا ایک بنڈل رکھا اور آہستہ آہستہ آگے کی طرف چلنے لگا۔ یہاں تک کہ میں وہاں پہنچا جہاں راستہ کے دونوں طرف کسٹم کا عملہ تیز نگاہوں کے ساتھ ہر مسافر کو دیکھنے کے لئے موجود رہتا ہے۔ یہاں میں کھڑا ہوگیا۔ اتنے میں کسٹم کا ایک کارندہ میری طرف بڑھا، اس نے روکھے انداز سے سوال کیا کہ یہ کیا چیز ہے بنڈل میں۔ میں ابھی کچھ بولا نہیں تھا کہ قریب کھڑے ہوئے افسر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا: جاؤ بابا، تم جاؤ۔

میں نے کہا کہ خدایا، آخرت میں بھی میرے ساتھ ایسا ہی معاملہ فرما۔ حشر کے میدان میں جب میں ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ نظریں جھکائے ہوئے آگے کی طرف بڑھوں اور روکنے والے مجھے روکنے کے لئے میری طرف متوجہ ہوں تو تیری طرف سے آواز آئے: میرے اس بندے کو جانے دو، اس کو جانچ کے لئے مت روکو۔

باہر نکلا تو ہمارے انتظار میں ایک صاحب وہاں موجود تھے۔ کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ آسانی کے ساتھ ایئرپورٹ سے روانہ ہوکر گھر آگیا۔ دوبارہ دل سے دعا نکلی کہ کاش اللہ کی رحمت سے ایسا ہو کہ جب میری زندگی کے جہاز کی واپسی کا وقت آئے اور وہ دنیا سے روانہ ہوکر آخرت کی زمین پر اتر جائے تو وہاں خدا کے فرشتے میری رہنمائی کے لئے موجود ہوں۔ وہ مجھ کو اپنے ساتھ لے کر چلیں۔ یہاں تک کہ مجھے جنت کے اندر پہنچا دیں۔ بے شک اللہ کے لئے کچھ مشکل نہیں کہ وہ اپنے عاجز بندہ کے ساتھ اس قسم کا رحمت کا معاملہ فرمائے۔ میری یہی دعا اپنے لئے بھی ہے اور یہی دعا آپ لوگوں کے لئے بھی۔

یورپ کے اس طویل سفر میں مجھے بار بار جدید تمدن کے پر رونق مناظر دیکھنے کو ملے۔ ان کو دیکھ کر مجھے قرآن کی یہ آیت یاد آتی تھی کہ اللہ آئندہ تم کو آخرت کی نشانیاں دکھائے گا تو تم اس کو پہچان لوگے (۲۷ : ۹۳) میں نے سوچا کہ صنعتی تمدن کی یہ رونقیں ایک اعتبار سے جنت کا تصویری تعارف ہیں۔ یہ تصویریں اس لئے تھیں کہ ان کو دیکھ کر انسان جنت کی پہچان حاصل کرلے۔ مگر انسان ان تصویروں ہی کو حقیقت سمجھ کر ان کے اوپر ٹوٹ پڑا۔

دور اول کے اہل ایمان نے جنت کی تصویریں دیکھے بغیر جنت پر یقین کیا تھا۔ آج کے لوگ جنت کی تصویریں دیکھنے کے باوجود اس پر یقین کرنے میں ناکام ہیں۔ کیسی عجیب تھی پچھلے لوگوں کی کامیابی اور کیسی عجیب ہے موجودہ لوگوں کی نامرادی۔"

وحید الدین

۱۱ اکتوبر ۱۹۹۳

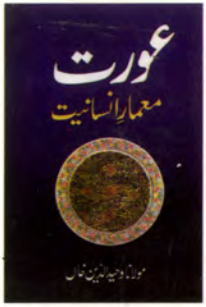
عورت
معمارِ انسانیت
مولانا وحیدالدین خاں

رہنمائے حیات
مولانا وحیدالدین خاں

مُطالعۂ حدیث
مولانا وحیدالدین خاں

पवित्र
कुरआन
अनुवादक
मौलाना वहीदुद्दीन ख़ाँ

مولانا مودودی
شخصیت اور تحریک، ایک علمی جائزہ

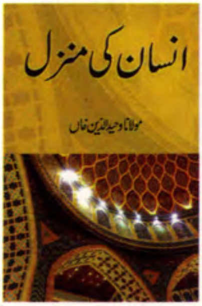
انسان کی منزل
مولانا وحیدالدین خاں

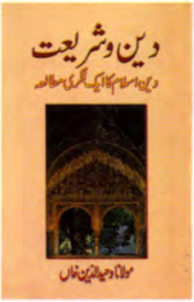
دین وشریعت
دینِ اسلام کا ایک فکری مطالعہ
مولانا وحیدالدین خاں

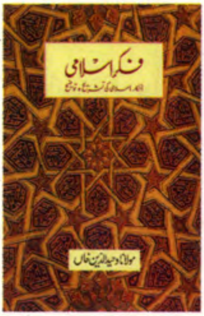
فکرِ اسلامی
مولانا وحیدالدین خاں

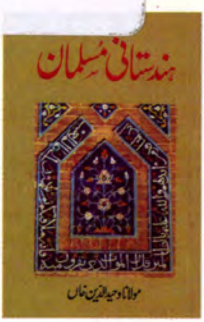
ہندستانی مُسلمان
مولانا وحیدالدین خاں

امنِ عالم
مولانا وحیدالدین خاں

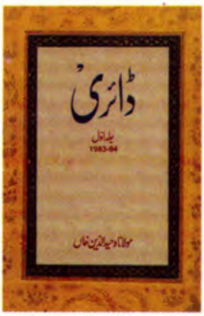
ڈائری
جلد اول
1983-84
مولانا وحیدالدین خاں

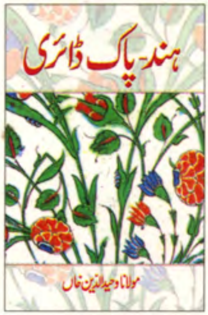
ہند-پاک ڈائری
مولانا وحیدالدین خاں

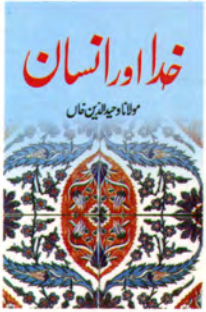
خدا اور انسان
مولانا وحیدالدین خاں

ڈائری
۱۹۹۳-۹۴
مولانا وحیدالدین خاں

ڈائری
۱۹۸۹-۱۹۹۰
مولانا وحیدالدین خاں

ڈائری
۱۹۹۱ - ۱۹۹۲
مولانا وحیدالدین خاں